مکالمہ

کراچی

کتابی سلسلہ

اکادمیِ بازیافت

مکالمہ

کراچی

کتابی سلسلہ: ۲ ۱۹۹۷ء

مجلسِ مشاورت

قیصر عالم

طاہر مسعود

آصف فرخی

ترتیب و تالیف

مبین مرزا

یکے از مطبوعات : اکادمی بازیافت

مکالمہ : ۲

دسمبر ۱۹۹۷ء

کمپوزنگ

میر اکبر علی

سرورق

نوشاد الرحمٰن

طباعت

ابنِ حسن پریس - کراچی

پاکستان میں :

220 روپے فی شمارہ

800 روپے سالانہ

غیر ممالک کے لیے

20 امریکی ڈالر فی شمارہ

80 امریکی ڈالر سالانہ

ڈرافٹ / پے آرڈر / چیک بنام "مکالمہ" ارسال کریں۔

رابطے کے لیے : آر 20 - بلاک 18، فیڈرل بی ایریا، کراچی، پاکستان۔

فون : 6349835

خاکے

غزلیں

محسن احسان

رضی اختر شوق

ظفر اقبال

حنیف اسعدی

توصیف تبسم

افتخار عارف

جمال پانی پتی

سحر انصاری

امجد اسلام امجد

پیرزادہ قاسم

حمیرا رحمان

ثروت حسین

صابر ظفر

اعتبار ساجد

عرفان صدیقی

احمد جاوید

رشیدہ عیاں

معین الدین احمد

شوکت عابد

احمد نوید

محیط اسماعیل

اجمل سراج

عزم بہزاد

خالد معین

نقد و نظر

سوال یہ ہے

تجزیاتی مطالعہ

نظمیں

افسانے

☆☆☆

حرفِ آغاز

مکالمہ۔۲ پیشِ خدمت ہے۔

اس کتابی سلسلے کی اولین اشاعت کے موقع پر ہم نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ سہ ماہی رسالے کی طرح اس سلسلے کی ایک کتاب ہر سہ ماہی کے اختتام پر ہم قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے لیکن اپنی تمام تر کوشش اور خواہش کے باوجود ہم اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہو سکے اور "مکالمہ" کی اشاعتِ ثانی میں تاخیر کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ اس تاخیر کے اسباب تو بہت سے ہیں مگر ہم ان مسائل و معاملات کی تفصیل میں جانے کی بجائے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کریں گے کہ ع

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

"مکالمہ" کی پہلی کتاب کو ادیبوں، دانش وروں اور ادب دوست قارئین کی طرف سے جو پذیرائی حاصل ہوئی وہ بلاشبہ ہماری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ پذیرائی نہ صرف ہمارے لیے طمانیت و تفاخر کا باعث ہے بلکہ اس امر کی عکاس بھی ہے کہ سیاسی میگنا کارٹا اور نظریاتی barriers کے بغیر پیش کیے گئے معیاری ادب کا ہمارے معاشرے میں آج بھی چشم روشن اور دلِ شاد کے ساتھ استقبال کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ حقیقتِ حال اس خیال کو بھی تقویت پہنچاتی ہے کہ ڈش، سیٹیلائٹ، انٹرنیٹ، سائبرنیٹ اور پرنٹ میڈیا کی ارزانی اور ہماہمی کے باوصف ہمارے ہاں ادب کے اثر و نفوذ کے امکانات بدستور موجود ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ پیش کیا جانے والا ادب بامعنی اور معیاری ہو۔ ہمارے نزدیک ادب کے زندہ اور فعال ہونے کا یہ نہایت مستحکم جواز ہے۔

ہر عہد اور ہر معاشرے کا معیاری ادب اس کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا ناقد و مبصر بھی ہوتا ہے جو اس کی طرزِ زندگی، اقدار، تہذیب اور اخلاقیات کا نہ صرف یہ کہ اعلیٰ انسانی تہذیب و اقدار کے تناظر میں جائزہ لیتا ہے بلکہ ان معیارات کی روشنی میں اس کی صورتِ حال کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا ہے۔ تاہم یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب اس عہد و معاشرہ کے مختلف مکاتبِ فکر کے ادیب و شاعر اور دانش ور باہمی احترام کی فضا کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے اپنے موقف کا اظہار یکساں آزادی کے ساتھ کر سکیں۔ یہاں ایک بار پھر اس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ مکالمہ کا اجرا اسی مقصد کے حصول کی کوشش سے عبارت ہے۔ مکالمہ کے صفحات ان سب ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کی نگارشات کے لیے حاضر ہیں جو ادب کو انسانی تہذیب و اقدار کی بقا کے لیے کام کرنے والی motive powers میں شمار کرتے ہیں اور معاشرے میں فکر و احساس کی روشنی اور قلب و نظر کی

بالیدگی کا سامان عام کرنے کے آرزومند ہیں۔

اب آخر میں ایک گزارش...... "مکالمہ-۱" کے لیے اظہارِ پسندیدگی کے بے شمار خطوط ہمیں نہ صرف یہ کہ ان تمام پاکستانی شہروں سے جہاں "مکالمہ" پہنچ سکا بلکہ ہندوستان' امریکا' کینیڈا' انگلینڈ' متحدہ عرب امارات' کویت اور سعودی عرب وغیرہ سے بھی موصول ہوئے ہیں۔ ہم ان تمام دوستوں کے شکرگزار ہیں جنھوں نے ہمیں خطوط بھیجے۔ "مکالمہ" کے لیے ان کی تعریف و ستایش یقیناً ہمارے لیے اطمینان و افتخار کا باعث ہے لیکن طے یہ کیا گیا ہے کہ "مکالمہ" میں صرف وہی خطوط شایع کیے جائیں گے جو کسی نہ کسی حوالے سے گفتگو طلب یا کسی بحث کا محرک بن سکتے ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ "مکالمہ" پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس امر کو ملحوظِ نظر رکھیں۔

اس عرصے میں دانش و ادب کے افق سے جو روشن اور تابندہ ستارے رخصت ہوئے ان میں ڈاکٹر عبدالسلام' مولانا امین احسن اصلاحی' ڈاکٹر نصیر احمد ناصر' محمود ایاز' عرش صدیقی' عطا شاد' فارغ بخاری' افضل منہاس' الیاس احمد گدی' انصار ناصری' ڈاکٹر وحید اختر' منظر سلیم' آنند نارائن مُلّا' بلال احمد زبیری' سجاد حیدر' انعام درانی' منظر سلیم' ش مظفرپوری' منظر امکانی' ممتاز مرزا' عبداللہ انور بیگ' سیدہ رابعہ نہاں' نصرت علی' شہزاد منظر' شیخ ایاز' دلاور فگار' جمال احسانی اور ظہیر بابر ایسے نام شامل ہیں۔ یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے طور سے علم و ادب اور فکر و فن کی خدمت میں مصروف رہے۔ ان کے اظہار کے ذرایع تو ضرور مختلف تھے لیکن ان سب کی کاوش و جستجو کے باطن میں جو مقصد کارفرما تھا اور جو آرزو ان سب کو ایک سرخوشی و سرمستی سے اپنے کام میں مگن رکھتی تھی' وہ مشترک تھی..... یعنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ بامعنی بنانے کی تڑپ۔ راہِ شوق کے اس سفر میں کس نے کون کون سی منزلیں سر کرلیں اور کہاں تک پہنچ کر سفر تمام کیا' یہ آنے والا زمانہ دیکھے گا۔ تاہم اپنے اپنے کام سے ان کی لگن اور خلوص کا احترام و تذکرہ تو ان جانے والوں کا ہم پر قرض ہے۔ اور یہی احترام و تذکرہ ہمارے لیے اور ہمارے بعد آنے والوں کے لیے اس راہ و منزل کے اثبات و اعتبار کا باعث بھی ہوگا جس پر یہ لوگ سفر کرتے تھے' جس پر ہم لوگ سفر کررہے ہیں۔ ادارہ ان سب جویانِ فکر و فن کی وفات پر گہرے دکھ اور ان کے پس ماندگان سے افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

جمال پانی پتی

نعتِ رسولؐ

متاعِ دو جہاں پائی تری مدحت سرائی سے
کمائی اور کیا دنیا میں اچھی اس کمائی سے

تمہارا نام آقاؐ دل کی تختی پر لکھا ہم نے
محبت کے قلم سے آرزو کی روشنائی سے

نبیؐ کا نور کیا ظلمت سرائے دہر میں چمکا
جہاں روشن ہوا سارا جمالِ مصطفائی سے

ترے نورِ ہدایت سے زمانے کو ملی منزل
نشانِ حق ملا دنیا کو تیری رہنمائی سے

تری عقدہ کشائی سے کھلے عقدے سبھی دل کے
ہوئیں سب مشکلیں آساں تری مشکل کشائی سے

وہ دولت بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں ملتی
جو ملتی ہے گداؤں کو ترے در کی گدائی سے

پئے گلدستۂ نعتِ نبیؐ چُن چُن کے لایا ہوں
ذرا دیکھو تو کیا کیا پھول باغِ مصطفائی سے

جمال اس کے علوئے مرتبت کا ہو بیاں کیسے
پرے ہے مرتبہ جس کا تخیل کی رسائی سے

انور سدید

نعت

ہیں مانگ رہے جودو سخا تازہ بہ تازہ
وہ لوگ جو کرتے ہیں خطا تازہ بہ تازہ

پھر آئی مدینے سے ہوا تازہ بہ تازہ
پھر دل ہوا اُمید کشا تازہ بہ تازہ

اک کیف سا ہوجاتا ہے طاری دل و جاں پر
جب ہونٹ کریں نعت ادا تازہ بہ تازہ

لے جاتے ہیں افلاک پہ پھر اس کو فرشتے
نکلے جو مرے دل سے صدا تازہ بہ تازہ

تعظیم فراواں سے جھکی ہوں مری آنکھیں
آجائے مرے لب پہ دعا تازہ بہ تازہ

میں رخت سفر باندھ کے تیار کھڑا ہوں
سندیس کوئی لائے صبا تازہ بہ تازہ

اب معصیت دہر میں دم گھٹنے لگا ہے
آقا مرے! کر دے یہ فضا تازہ بہ تازہ

امت پہ کرم آپ کا ہو اور زیادہ
انور کو ہے مطلوب عطا تازہ بہ تازہ (نذر حفیظ تائب)

رشیدہ عیاں

نعت

عجب زندگی کا قرینہ ہوا ہے
نظر کعبہ اور دل مدینہ ہوا ہے

نہ ہو جس میں طیبہ کا دیدار اے دل
وہ جینا بھلا کوئی جینا ہوا ہے

نہ ہوتے اگر وہ، تو دنیا نہ ہوتی
بھلا بن سمندر سفینہ ہوا ہے

جسے دید طیبہ میسر ہوئی ہے
حقیقت میں وہ شخص بینا ہوا ہے

فراقِ محمدؐ میں آنکھیں رواں ہیں
نہ مرنا ہوا ہے، نہ جینا ہوا ہے

وہ بحرِ عطا، موج در موج رحمت
عیاںؔ دل مرا آبگینہ ہوا ہے

☆

سفرنامہ/رپورتاژ

انتظار حسین

پربتوں کے بیچ ایک مکالمہ

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا۔ بس اسی کے بیچ کسی چوٹی پر ہم اکٹھے ہوئے تھے' برصغیر کے چار ملکوں سے آئے ہوئے کچھ لکھنے والے' کچھ تصویریں بنانے والے' کچھ سوچنے والے' چہار درویش کی مثال کہ برصغیر کی کالی رات میں اس کے میدانوں سے گزر کر پہاڑوں میں سرجوڑ کر بیٹھے تھے' اداس اداس سوچ رہے تھے اور بیان کر رہے تھے کہ اجودھیا میں کیا عمارت تھی کہ ڈھائی گئی' اور کیا آگ ہے کہ پاکستان' ہندوستان' بنگلہ دیش سب کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ دن ڈھل رہا تھا اور بحث جاری تھی کہ اچانک شور اٹھا گوری شنکر نے درشن دیے ہیں۔ سب اٹھ کر کھڑے ہوئے اور پہاڑوں کی طرف کھلتے ہوئے دریچے کی طرف دوڑے۔ میں نے حیران ہو کر دریچے پر امنڈتے ہجوم کو دیکھا۔ سدھیر اور گیتا نجلی دونوں میرے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ گیتا نجلی اٹھتے اٹھتے بولی۔ "انتظار صاحب اٹھیں۔ گوری شنکر کے درشن کر لیں۔"

"گوری شنکر کے درشن؟" میں حیران حیران گیتا نجلی کی صورت تکنے لگا۔

تب سدھیر نے مجھے سمجھایا "گوری شنکر ہمالہ کی فلک بوس چوٹی ہے۔ سمجھ لیجئے کہ ماؤنٹ ایورسٹ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ یہاں سے اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود وہ نظر نہیں آتی۔ مستقل طور پر کہرے میں لپٹی رہتی ہے۔ وہ بڑی نادر گھڑیاں ہوتی ہیں جب کہرے کی چادر پھٹتی ہے اور گوری شنکر اپنے درشن دیتی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے یہاں ہوتے ہوئے آج ایسی گھڑی آگئی ہے۔"

گیتا نجلی کی انگلی کی سیدھ میں' میں نے دیکھا۔ دور افق میں ایک سنہری روپہلی دھاری جھلملا رہی تھی۔ گوری شنکر نے مجھے درشن دے دیے تھے۔ بس اس درشن کے ساتھ ہی ایک دیومالائی سے میرے اندر جگمگایا۔ میں نے سوچا شاید یہی وہ چوٹی ہے جہاں بیٹھے بیٹھے شنکر نے گوری کو رامائن سنائی تھی' اجودھیا سے لنکا تک کی' اور لنکا سے اجودھیا تک کی پوری کہانی۔ تو کیا گوری نے پھر ضد کی ہے کہ ہے سوامی اجودھیا میں اس سمے جو گھٹنا ہوئی ہے وہ کیا ہے۔ مجھے ہے سوامی اب کی کتھا سناؤ۔ اور شنکر نے اجودھیا کی نئی کتھا سنانی شروع کر دی ہے۔

اور اب مجھے ورکشاپ یہاں منعقد کرنے کی رسم سمجھ میں آ رہی ہے' ورنہ جب دعوت نامہ موصول ہوا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ فرقہ وارانہ امن و آشتی کے مسئلہ پر یہ بھاری پتھر دور کیوں ہو رہی

ہے۔ قصہ زمیں بر سرِ زمیں۔ ایودھیا کے آس پاس کہیں منعقد کی جاتی۔ لیکن اب سمجھ میں آیا کہ وہاں تو بلا تخصیص ملک، برصغیر کی فضا مسموم ہے اور یہاں سے وہاں تک دھواں اٹا ہوا ہے کہ واضح طور پر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہمالہ کی بلندیوں میں فضا صاف ہے۔ یہاں نظر صحیح کام کرتی ہے۔ گوری شنکر کی چوٹی تک تو رسائی ممکن نہیں۔ آس پاس کی کسی نچلی چوٹی پر بیٹھ جائیے۔ وہاں سے بھی نظریں صحیح کام کریں گی۔

دعوت نامہ اکفود (ایشین کلچرل فورم آن ڈیولپمنٹ) اور نیٹ ورک کلچر (ایشیا) کی طرف سے تھا۔ میرے لیے دونوں ہی نام اجنبی تھے۔ مذہبی بنیاد پرستی نے جو برصغیر میں آفت بو رکھی ہے اس پر اظہار افسوس اور فرقہ وارانہ امن و آشتی کی ورکشاپ میں شرکت کی دعوت۔ بس اس دعوت نامہ کے ساتھ کھٹمنڈو میرے لیے مسئلہ بن گیا۔ عجب شہر ہے۔ رجھا بھی رہا تھا ڈرا بھی رہا تھا۔ یہ شہر اپنے بھید بھرے مندروں کے ساتھ کب سے مجھے للچا رہا تھا۔ لیکن اب جب وہاں جانے کی تقریب پیدا ہوئی تو میں جکتم میں پڑ گیا۔ جاؤں کہ نہ جاؤں۔ بلندیوں کے سفر سے میں سدا سے خائف ہوں۔ اس سفر سے خوف دلانے میں یاروں نے اپنی طرف سے اضافے کیے۔ جس سے ذکر کیا اس نے فوراً "پی آئی اے کے اس جہاز کا حوالہ دیا جو کھٹمنڈو میں اترتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک دوست نے اس سفر کا عجب نقشا کھینچا۔ آپ کھٹمنڈو جا رہے ہیں۔ راستا بہت تنگ اور پُر پیچ ہے۔ پہاڑوں کے بیچ میں سے جہاز کو گذرنا پڑتا ہے۔ ایئرپورٹ اونچی چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے۔ جہاز جیسے سرنگ میں اتر رہا ہو۔ اندھیرا ہوتا ہے۔ وہاں لائٹ لگوانے کا منصوبہ تھا۔ پتا نہیں لگ گئی یا نہیں لگی۔ بس مت پوچھیے۔ دل میں ہولیں اٹھنے لگیں۔ سوچا کیا کروگے جاکے۔ لاہور میں اے ایس آر کا دفتر ہے جس کا ان تنظیموں سے رابطہ ہے۔ اسے فون کیا کہ صاحب واپسی کے لیے مناسب تاریخ کی سیٹ نہیں مل رہی۔ انھیں بتا دیجیے کہ میں نہیں آسکوں گا۔ جی آپ کیسے نہیں جائیں گے۔ بنگلور سے جو ہمیں میسیج آیا ہے اس میں آپ کے سلسلے میں خاص طور پر تاکید کی گئی ہے۔ سیٹ کیسے نہیں ملے گی۔ پی آئی اے کے سوا بھی فلائٹیں ہیں۔ ہم انتظام کرتے ہیں۔ اور انھوں نے اپنے ایجنٹ کے ذریعے تڑاتڑ سے واپسی کی سیٹ بک کرا کے میرے لیے سفر سے منحرف ہو جانے کے سارے راستے بند کر دیے۔ دل کو دلاسا دیتے ہوئے میں نے سوچا کہ اچھا میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ اکیلے سفر سے بھی تو میں ڈرتا ہوں۔ نیلم احمد بشیر بھی تو ہمراہ ہوگی۔ یہ سہارا اس وقت کتنا غنیمت نظر آیا۔ دل پھر بھی دھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔ مگر جاتے جاتے جب کراچی میں سعید کے گھر دوستوں سے ملاقات ہوئی اور ان دوستوں کے بیچ کرار صاحب کو دیکھا اور ان کی اشیرواد لے لی تو خوف ایسے زائل ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ پھر بھی جہاز میں بیٹھتے ہوئے نادعلی پڑھ لی تھی۔ کبھی کبھی میں ایسا کام کرلیا کرتا ہوں۔

سیٹ میں نے کہہ کر کھڑکی کے برابر کی لی تھی، یہ سوچ کر کہ ہمالہ کی ہیبت و جبروت سے آنکھیں نہیں چرانی چاہییں۔ دیکھنا چاہیے کہ کیسا کیسا پہاڑ راہ میں آتا ہے۔ ہمالہ کی حدوں میں جہاز کس وقت داخل ہوا، مجھے مطلق پتا نہ چلا، ٹورسٹوں نے اس کا احساس دلایا۔ اپنے اپنے کیمرے لے کر کھڑکیوں پر امنڈ پڑے۔ ایک ٹورسٹ میرے سر پہ آکھڑا ہوا۔ تو گویا میں اب ہمالہ کی بلندیوں میں اڑ رہا ہوں۔ نیچے

نظر ڈالی تو دھیرے دھیرے چوٹیوں گھاٹیوں کے خطوط نکھرتے لگے تو گویا اتراؤ شروع ہو گیا۔ مگر وہ اونچی چوٹیاں کہاں ہیں جن کے بیچ سے جہاز کو گذرنا تھا' اور وہ سرنگ جس میں جہاز کو اترنا تھا۔ ارے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ اتنا بھی نہیں جتنا اسلام آباد جاتے ہوئے جہلم کے آس پاس ہمارے جہازوں کو ہوا کرتا ہے۔ کس آرام سے میں جہاز سے اتر کر جملہ مراحل طے کر کے باہر آیا اور اپنے میزبانوں کو ڈھونڈنے لگا۔

اب میری مزید خود اعتمادی ملاحظہ فرمایئے۔ مگر یہ خود اعتمادی نیلم کی مرہون منت تھی۔ اگر تم اکیلے ہوتے اور کوئی میزبان نظر نہ آتا تو پھر ہم دیکھتے تم کتنے بہادر ہو۔ ایسے گھبراتے جیسے کھٹمنڈو تمہیں کھا جائے گا۔ مگر نیلم ساتھ تھی۔ اور میں نے باہر آ کر ادگرد ایسے نظر ڈالی جیسے لاہور کے ایئرپورٹ پر ہوں کہ کوئی عزیز کوئی دوست لینے کو آیا ہے تو فبہا ورنہ بے تکلف ٹیکسی پر بیٹھیں گے اور گھر کی راہ لیں گے۔ سو جب اس اجنبی شہر میں کسی اجنبی نے ظاہر ہو کر اپنے آپ کو میزبان کے طور پر متعارف نہیں کرایا تو میں نے بلا وقت ضایع کیے ٹیکسی کو اشارہ کیا۔

نیلم نے کہا۔ "انتظار صاحب' میرے پاس تو نیپالی کرنسی ہے نہیں۔ یہ خیال تھوڑا ہی تھا کہ خود جانا پڑے گا۔ آپ کے پاس ہے؟"

"پروا مت کرو۔ ایسی آڑے وقت کے لیے ہم نے گھر میں پڑی انڈین کرنسی جیب میں رکھ لی تھی۔ وہ چلے گی۔ ہاں میاں ٹیکسی والے تری پوریشور چلنا ہے۔"

"تری پوریشور میں کس جگہ۔"

"ہوٹل اور چڈ۔ کیا لوگے؟"

صاحب کمال ہے ٹیکسی والے نے ٹھیک اتنی ہی رقم بتائی جتنی منتظمین نے پیشگی اپنے مراسلہ میں اپنے اندازے سے ہمیں بتائی تھی۔ یعنی اس شہر میں ٹیکسی والے مقررہ کرایوں کے حساب سے چلتے ہیں۔ اجنبیوں کے ساتھ ہیرا پھیری کی کوشش نہیں کرتے۔ تو لیجئے صاحب ہم ہوٹل اور چڈ پہنچ گئے۔ اپنا اپنا نام بتایا' رجسٹر کرایا۔ اپنے اپنے کمرے میں چند گھنٹے آرام سے گذارے۔ کھانا کھایا' سو بھی لیے۔ اٹھ کر سہ پہر کی چائے بھی پی لی۔ میزبان نام کا کوئی چڑیا کا بچہ بھی ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔

تب میں نے نیلم سے کہا کہ "ارے ہم ہوٹل میں اپنا وقت کیوں ضایع کر رہے ہیں۔ اس مہلت کو غنیمت جانیں۔ اور باہر نکل کر شہر کو دیکھیں۔ سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں۔"

"چلو کہاں چلیں۔ ہمیں تو کچھ بھی نہیں معلوم۔"

"چلو میں تمہیں لکھنؤ کی ایک بی بی سے ملاتا ہوں۔"

"وہ کون ہیں؟"

اب سے سو برس ادھر ۱۸۵۷ء کی قیامت میں لکھنؤ سے نکلی تھیں۔ انگریزی فوجوں سے لڑتی بھڑتی پسپا ہوتی ہوئی نیپال میں آنکلیں۔ لکھنؤ کی مٹی کھٹمنڈو میں آ کر آسودہ خاک ہوئی۔ نام تھا بیگم حضرت محل۔ اس شہر میں ان کا مزار ہے۔

تو بھی تقریب فاتحہ کو چل

بخدا واجب الزیارت ہے

اب یوجھو کہ ہمیں اس کا کیسے پتا چلا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے جو تذکرے پڑھے تھے اس میں بس اتنا ہی لکھا دیکھا تھا کہ کتنے نمازی کتنے لزبہت کے پکے نکلے۔ انگریز کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ نیپال کے جنگلوں میں جا کر کھیت ہو گئے۔ ابھی پچھلے دنوں پی جے او ٹیلر کی دو کتابیں "کرونیکلز آف دی میوٹنی" اور "اے سٹار شیل فال" میرے ہاتھ پڑ گئیں۔ یہ صاحب سلطنت برطانیہ کے آخری دور کی پیداوار ہیں۔ ہندوستان میں فوج میں رہ کر اچھا وقت گذارا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے معرکہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس پر اچھی خاصی تحقیق کر رکھی ہے۔ سوچا کہ جن کے تذکرے پڑھے وہ پرانے تھے۔ چلو اس سو برس بعد کے انگریز کی تحقیق کو بھی پڑھ لو۔ مگر نیپال کی طرف نکل جانے والوں کے ذیل میں اس نے اتنا ہی بتایا ہے کہ پسپا ہونے کے بعد باغی بڑی تعداد میں ترائی کے جنگلوں میں نکل گئے اور ہندوستان کی سرحد پار کر کے نیپال میں جنگلوں میں لپ چھپ گئے۔ ان کی تعداد اس نے ستر ہزار بتائی ہے۔ ان میں تین ایسے ہیں جنھیں ہم قائدین بغاوت کے طور پر جانتے ہیں۔ نانا صاحب، عظیم اللہ خاں اور بیگم حضرت محل۔ ان پناہ گیروں کو یہ جنگل راس نہیں آئے۔ ان کی مضر صحت آب و ہوا میں یہ لوگ جلدی ہی مر کھپ گئے۔ ٹیلر کا خیال ہے کہ "نانا صاحب اور اس کے بھائی بالا راؤ شاید جلدی ہی دم توڑ گئے۔ اور شاید عظیم اللہ خاں کو بھی وہیں موت نے آلیا۔" حضرت محل کے متعلق ٹیلر کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ اسے نیپال کے راجہ نے کسی قدر تامل کے بعد پناہ دینا منظور کر لیا تھا اور وہ ۱۸۷۹ء تک زندہ رہی اور یہ کہ نیپال ہی میں اس کا انتقال ہوا۔

اب پوچھیے کہ میں نے کیسے طے کر لیا کہ حضرت محل کھٹمنڈو میں دفن ہے۔ اصل میں میری معلومات کا ماخذ اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی "گردِ راہ" ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے کچھ وقت کھٹمنڈو میں بھی گذارا تھا۔ وہاں سے وہ معلومات لے کر پھرے کہ عظیم اللہ خاں ۱۹۴۷ء کے بعد تک زندہ رہا۔ کہیں ۵۰ء کے آس پاس اس کا انتقال ہوا۔ اس نے اپنی یادداشتیں بھی قلم بند کی تھیں جو اس نے ۴۷ء کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کو بھجوا دی تھیں۔ اب کوئی محقق ہی اس پر تحقیق کر کے کچھ بتائے۔ یہ ظاہر تو یہ بیان واقعہ سے دور ہی نظر آتا ہے۔ ہاں حضرت محل کی قبر کے متعلق جو انھوں نے رقم کیا ہے وہ درست نکلا۔ ابھی ڈیڑھ دو سال پہلے آصف فرخی نے مجھ سے ذکر کیا کہ میں کھٹمنڈو جا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ اچھا ایک کام ہمارا کرنا۔ اختر حسین رائے پوری کا بیان ہے کہ اس شہر میں حضرت محل کی قبر ہے جو بیگم کی قبر کے نام سے مشہور ہے۔ ذرا اس کا پتا چلانا۔ آصف فرخی نگر نگر گھومنے والا نوجوان ہے۔ اجنبی شہروں میں جا کر مقامات تلاش کرنے کا اسے ملکہ ہے۔ سو اس نے وہ قبر ڈھونڈ نکالی اور واپس آ کر مجھے اس کا اتا پتا لکھوا دیا۔ تو صاحب میں نے اس پتے کے حساب سے ہوٹل والوں سے جامع مسجد کا پتا لیا کہ شہر میں ایک ہی ہے اور وہاں جا پہنچا۔ مسجد کے گیٹ پر دو داڑھی والے کھڑے تھے۔ ان سے علیک سلیک کی

اور پوچھا کہ "بھائی' یہاں کہیں بیگم کا مزار ہے۔"
"ہاں ہے۔ مگر وہ یہاں نہیں۔ آگے ایک مسجد اور ہے۔ اس کے قریب ہے۔"
"وہ مسجد کہاں ہے۔"
ان دو میں ایک کو ہم پر تھوڑا ترس آیا۔ کہا "چلو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

یہ مرد مسلمان نیپالی تھا اور نام اس کا عابد تھا۔ قریب ہی ایک اور مسجد تھی۔ اس کے متصل ایک وسیع احاطہ تھا جہاں ہر طرف ملبہ بکھرا پڑا تھا۔ اس ملبے میں سے ایک بزرگ نمودار ہوئے۔ لمبا قد' چھریرا بدن' کرتا' تنگ موری کا پاجامہ۔ ان سے تعارف ہوا۔ نام ہاشم خاں تھا۔ اصلاً" بہاری تھے۔ کھٹمنڈو میں آ کر بس گئے ہیں۔ ٹوپی اور رومال بیچتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں ساتھ لیا اور اس احاطہ کے ایک اجاڑ گوشے میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ ایک زنگ آلود جنگلا۔ اس کے بیچ ایک تباہ حال قبر۔ قبر کے تعویذ میں دو درخت کھڑے ہوئے' پستہ قد' جھاڑی کی طرح کے گرد آلود۔ کتبہ مندرجہ ذیل تھا۔

مقبرہ حضرت محل مرحومہ بیگم نواب واجد علی شاہ مرحوم

۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۲ء

قبر اونچی بنی ہوئی تھی۔ کسی وقت میں شان دار ہوگی۔ اب بوسیدہ حالت میں ہے۔ ارد گرد یہاں بھی ملبہ ہی نظر آیا۔ ہاں اس سے ذرا پرے پانوں کی ایک دکان نظر آئی۔ لگتا تھا کہ یہ آس پاس رہنے والے مسلمانوں کا اڈا ہے۔ سامنے وہ مسجد نظر آ رہی تھی جو ابھی تعمیر کے مراحل سے گذر رہی تھی۔ اچھی خاصی بلند و بالا مسجد تھی۔ یہاں بسنے والے مسلمانوں نے مسجد تو کھڑی کر لی مگر اس قبر کو قابلِ اعتنا نہیں جانا۔ نقشا کچھ اس قسم کا ہے کہ۔

بر مزارِ ما غریباں نے چراغ نے گلے

ارد گرد شہتیر پڑے دیکھ کر میں نے عابد نیپالی سے پوچھا کہ یہاں کیا کوئی عمارت بننے والی ہے۔ بولا کہ "ہاں یہ سپر مارکیٹ بنے گا۔"
"اور بیگم کی قبر کا پھر کیا بنے گا۔"
رکا۔ بولا "قبر اپنی جگہ پر رہے گی۔" مگر بولا ایسے لہجے میں جیسے اسے یقین نہ ہو۔

احاطہ سے نکلتے نکلتے میں نے سوچا کہ جامع مسجد کو جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں تھوڑا دیکھ ہی لیا جائے۔ تو ہم پھر مسجد کی طرف ہو لیے۔ وہاں خالی مسجد نہیں تھی۔ اندر گئے تو ایک دو مزار بھی تھے۔ اور کس خضوع و خشوع سے ایک بی بی نے موم بتیاں جلائیں اور سجدے میں چلی گئی۔ آگے بڑھے تو ایک اور مزار نظر آیا۔ اور پھر وہی بی بی۔ اسی طرح موم بتیاں جلائیں اور پھر سجدے میں چلی گئی۔

تو کھٹمنڈو میں جتنی مسلمانی تھی' اس سے ہماری ملاقات ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ ترائی کی طرف جاؤ تو وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ شام ہو چلی تھی۔ سواری کی تلاش میں ہم فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے۔ کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان نظر آئی تو نیلم مچل گئی کہ میں تو کتابیں دیکھوں گی۔ اچھا بی بی دیکھ لو۔

مگر میں نے دکان میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک آواز آئی "انتظار صاحب آپ؟ آپ یہاں کہاں ہیں؟"

میں نے آنکھیں مل کر دیکھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ ٹیلی فون گھماتے گھماتے ان کی انگلیاں رک گئی ہیں اور مجھے حیرت و مسرت سے دیکھ رہے ہیں۔ ویسے تو مجھے ان صاحب کو فوراً پہچان لینا چاہیے تھا۔ ابھی چند مہینے ہی تو ہوئے ہیں اور ہارپر کولنز میں کام کرنے والے ہر مرد اور ہر بی بی سے ایسے مل رہا تھا جیسے ان سے ایک زمانے سے میل ملاقات ہے۔ مگر میں بھی تو یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ دلی کے کسی شناسا سے یوں کھٹمنڈو میں فٹ پاتھ پر چلتے چلتے مڈھ بھیڑ ہو جائے گی۔ یہ تھے ہارپر کولنز کے جنرل منیجر آر کے مہرا صاحب کے پرسنل سکریٹری مسٹر سنگھ۔

"مہرا صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ بات کراؤں۔"

"اچھا، واقعی۔ ضرور بات کراؤ۔"

لیجیے فوراً ہی فون پر رابطہ ہو گیا۔ اس اچانک مڈھ بھیڑ پر ادھر وہ خوش ادھر میں خوش۔ نیپال پر انھوں نے کوئی کتاب شائع کی تھی۔ ابھی اس کی مورت ہونے کو تھی۔ طے ہوا کہ وہ اپنا فنکشن ختم کر کے اور چڑھ پہنچیں گے۔ اور ادھر اور چڑھ میں ہم نے قدم رکھا تو دیکھا کہ مہمان میزبان سب لان میں اکٹھے ہیں۔ ایک دوسرے سے تعارف ہو رہا ہے۔ ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔ ارے یہ تو اننت مورتی ہیں۔ ایسے ملے جیسے پرانے یار بچھڑ گئے تھے۔ ایک دوسرے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمالہ پربت میں آکر ملے ہیں۔ اننت مورتی سے ابھی تھوڑے مہینے پہلے دلی میں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یاترا ایوارڈ کے بڑے منصف وہی تھے۔ تو انھوں نے اس تقریب سے پہلے میری کہانیاں پڑھ لی تھیں۔ میں نے ان کا صرف ایک ناول "سنسکار" انگریزی ترجمے میں پڑھا ہے۔ کہتے ہیں کہ کنٹر فکشن میں یہ ناول ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی کے چیئرمین ہیں اور لیجیے اصغر علی انجینئر بھی ان کے ساتھ ہیں۔ چیزی اور دودو۔ اور یہ جو لمبو قسم کے صاحب نظر آرہے ہیں، اوپر سے داڑھی، یہ اصل میں سدھارت ہیں۔ بنگلور سے آرہے ہیں وہاں نیٹ ورک کلچرز (ایشیا) کے انچارج ہیں۔ سمجھ لو کہ اس ورکشاپ کے کرتا دھرتاؤں میں سے ہیں۔ دوسرے تنبور صاحب ہیں۔ دوپہر سے ہم انھیں ڈھونڈ رہے تھے کہ یہ بھی کرتا دھرتاؤں میں سے ہیں۔ یہاں آکر ملے ہیں۔ بنگلہ دیش کی مٹی ہیں۔ تھائی لینڈ میں ایکو فوڈ کے انچارج ہیں۔ تعارف تو خیر ہوتا رہے گا۔ سب سے تو ایک دم سے ملنا اور تعارف کرنا ممکن بھی نہیں۔ فی الحال تو ان کرتا دھرتاؤں سے یہ سنتے ہیں کہ یہاں آتو گئے، اب کرنا کیا ہے۔ اننت مورتی کہ ان سب کے بزرگ ہیں بتا رہے ہیں کہ ہم یہاں جمع کیوں ہوئے ہیں۔ دھیرج سے بولتے ہیں اور بڑی سچائی کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ دوستوں سچی بات یہ ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کا واقعہ ہماری روحوں میں گہرا اتر گیا ہے۔ ایک مسجد منہدم نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ بہت کچھ ڈھ گیا ہے۔ مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں نے مل کر جو مشترکہ سمبلز تخلیق کیے تھے وہ بھی مسجد کے ساتھ ڈھ گئے۔ اب کیا کریں۔ مذہب کی نفی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مذہب کی نفی کر کے تو بس چند ہی لوگ آپس میں مل پاتے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش میں یہ جو اتنی بہت سی خلقت بسی

ہوئی ہے وہ تو مذہب میں ایمان رکھتی ہے۔ تو کیا ہم ہندو اور مسلمان رہتے ہوئے آپس میں نہیں مل سکتے۔ مسلمان مسلمان رہے' ہندو ہندو رہے اور پھر ملیں۔ مذہب کی اس طرح کی قبولیت ہی سے سیکولرازم کو تقویت حاصل ہوگی۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اس میں تضاد نظر آئے۔ مگر مجھے اس میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا' تو آئیں سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں۔

اور ہاں بتایا جا رہا ہے کہ نیپال میں کیوں جمع ہوئے ہیں۔ بس سوچا یہ کہ کشیدگی اور منافرت کے مقامات سے دور کسی گوشے میں بیٹھ کر ٹھنڈے دماغ اور کشادگیِ قلب کے ساتھ سوچیں۔ ہاں کھٹمنڈو میں بیٹھ کر بھی نہیں سوچیں گے۔ شہر سے دور کوئی خاموش گوشے تلاش کرتے ہیں۔ بجا کہا۔ شہر پھر شہر ہے چاہے وہ ہمالہ کی کسی چوٹی' کسی وادی ہی میں کیوں نہ ہو۔ تو لیجئے کھٹمنڈو میں تو ایک رات کا بسیرا تھا۔ صبح ہوتے ہی کھلے بستر پھر بندھ گئے۔ وین میں بیٹھ کر کھٹمنڈو سے نکلتے ہیں اور پہنچتے ہیں اس خاموش گوشے میں جسے دھولی خیل کہتے ہیں۔ کھٹمنڈو میں تو پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کسی پہاڑی مقام پر ہیں۔ اب یہاں آئے ہیں تو پتا چل رہا ہے کہ پہاڑوں کے بیچ آن پہنچے ہیں۔ یہاں سے بلند و بالا پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں نظر آتی ہیں کہ انھیں میں گوری شنکر بھی ہے جس نے اپنے اردگرد کہرے کی چادر تان رکھی ہے۔ اونچے نیچے راستے۔ جہاں تہاں ریسٹ ہاؤس قسم کی عمارتیں کہ کوئی چوٹی پر ٹکی ہوئی ہے' کوئی گہری کھائی میں دھنسی معلوم ہوتی ہے۔ ہماری وین نیچے اترتی چلی جا رہی ہے۔ اتنی گہرائی میں آخر کہاں جا رہے ہیں۔ مگر یکایک ایک کشادہ احاطہ میں وین داخل ہوتی ہے۔ سامنے ریسٹ ہاؤس نظر آ رہا ہے۔ تو یہ ہے ہمارا ٹھکانا۔ لیکن ابھی تعمیر کے عمل میں ہے۔ کمرے کم ہیں ہم تعداد میں زیادہ ہیں۔ سو ہم میں سے چند ایک کو قریب ہی ایک ایسے ہی ریسٹ ہاؤس میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ان میں میں بھی ہوں۔ یہ بیشک پچھلے ریسٹ ہاؤس کے مقابلے میں زیادہ آرام دہ اور پُر فضا جگہ ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ساری سرگرمی کا مرکز تو وہی پچھلا ریسٹ ہاؤس ہے اور جن دوستوں سے میں گھل مل گیا وہ بھی وہیں ہیں۔ یہاں تو بس اپنے ساتھ اصغر علی انجنیئر ہیں' نیلم ہیں' بنگلہ دیش سے آئی ہوئی دو بیبیاں اور ایک بابا ہیں کہ اپنی لمبی داڑھی اور اپنی شکل و شباہت سے ٹیگور نظر آتے ہیں۔

یہاں آ کر مجھے جلدی ہی پتا چل گیا کہ میں ان ادیبوں میں سے نہیں جنھیں خوردوں کی تلاش ہوتی ہے کہ وہ ان کے مرید ہوں اور جو ان کے بیچ مرشد۔ تو میں نیلم سے دور اور اصغر علی انجنیئر سے قریب ہوتا جا رہا ہوں جو اپنی ہر ادا سے ایک بزرگ نظر آتے ہیں۔ مگر ہاں ایک ٹولی اور ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور میں بھی اس کی طرف کھنچتا چلا جا رہا ہوں۔

"آپ انتظار صاحب ہیں؟"

"جی۔"

"میں گیتا نجلی ہوں۔"

"گیتا نجلی؟"

ہے۔"
"جی ہاں گیتا نجلی شری۔ گمان بھی نہیں تھا کہ آپ سے یہاں ملاقات ہو جائے گی۔ بہت خوشی ہو رہی ہے آپ کو دیکھ کر۔"

خوشی تو مجھے بھی تھی اور حیرت بھی کہ ٹیگور کی شاعری جیتی جاگتی سامنے کھڑی ہے۔ ویسے تو زیادہ حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ہمالہ پربت ہے۔ مدتوں سے یہاں دیو مالائی کھیل جاری ہے۔ گودی میں کھیلتی ہیں اس کے ہزاروں ندیاں۔ کتنے کو ندیاں مگر ان میں کوئی اپسرا ہے کوئی دیوی۔ کچھ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک جانی پہچانی صورت نمودار ہوئی۔ "ارے غلام شیخ صاحب آپ۔ آپ سے تو ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔ حیدر آباد میں میکس مرحون کے سیمینار میں ملے تھے۔"
"ارے صاحب کہاں ملے تھے۔ میں گیتا نجلی اور سدھیر سے یہی کہہ رہا تھا کہ حیدر آباد میں تو یہ ہاتھ آئے نہیں۔ بہت لیے دیے رہتے تھے۔ یہاں پکڑنا ہے۔" بس اس کے ساتھ نوٹس دے دیا کہ اب آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ تو میں ان کے ساتھ ہوں۔ ان میں کوئی اکیلا نہیں ہے۔ غلام شیخ مصور ہیں۔ بڑودہ میں رہتے ہیں۔ ان کی بیگم ان کے ساتھ ہیں کہ وہ بھی مصور ہیں۔ گیتا نجلی کو دیکھ کر تو یہی لگتا تھا کہ کوئی نوخیز لکھنے والی ہے۔ اور یہ جو سدھیر صاحب ہیں اپنی بھلی سی کالی داڑھی کے ساتھ پتا نہیں ان سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ ایک دوسرے سے جڑے نظر آتے ہیں۔ پتا چلا کہ بہ ظاہر دوست ہیں' اصل میں میاں بیوی ہیں۔ اور گیتا نجلی اتنی نوخیز نہیں۔ خیر سے ہندی ناول کے میدان میں سات آٹھ سال سے ہے۔ خوب ٹولی ہے۔ ادھر ورکشاپ سے فارغ ہوئے ادھر منجھو نے کہ نیپالی شاعر ہے اور موسیقار بھی' ستار سنبھالا اور اپنا لکھا ہوا کوئی نغمہ کوئی ترانہ الاپنا شروع کر دیا۔ دوسرے ادھر مصروف۔ یہ ٹولی ایک ایک کر کے سرکتی ہے۔ کبھی سدھیر کی طرف سے کبھی گیتا نجلی کی طرف سے اشارہ ہوتا ہے۔ میں بھی یہاں سے سٹک لیتا ہوں۔ اب چھت تلے سے نکل کر آسمان تلے سبھا جمی ہے۔ ہندی کی جانی مانی ناول نگار کرشنا سوبتی بھی کہ دلی سے آئی ہیں آن پہنچی ہیں۔ اور سندیپ صاحب بھی کہ بمبئی سے آئے ہوئے ہیں آن موجود ہوتے ہیں۔ لیجیے محفل آراستہ ہو گئی۔ مگر ہوتا یوں تھا کہ جہاں رات جگنی شروع ہوئی اصغر علی انجینئر کی طرف سے پیغام موصول ہوا کہ وین جانے لگی ہے۔ آجائیے۔ اپنے ٹھکانے پہ چلیں۔ میں بے چارگی سے سدھیر کو' گیتا نجلی کو' غلام شیخ کو دیکھتا ہوں اور اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ ہوتے ہوتے آخری شام آگئی۔ یہ ٹولی رت جگے کے موڈ میں تھی۔ میں معذرت کر رہا تھا کہ سواری تو اس وقت ہو گی نہیں۔ رات گئے میں اپنے ٹھکانے پہ کیسے پہنچوں گا۔

"ارے انتظار صاحب۔" گیتا نجلی فوراً بولی۔ "آج تو پورنماشی کی رات ہے۔ پوری ٹولی آپ کے ساتھ چلے گی۔ ہم آپ کو آپ کے ٹھکانے پہ پہنچا کے آئیں گے۔"

پورنماشی کی رات' ہمالہ پربت' دوستوں کی ٹولی۔ اچھی سیر ہو گی۔ بس میں گیتا نجلی اور سدھیر کے ساتھ انجینئر صاحب سے آنکھ بچا کر سٹک لیا۔ خطرے کی حدود سے نکل کر اطمینان کا سانس لیا۔ مگر سانس درمیان میں رہ گیا۔ پیچھے سے آواز آئی۔ "انتظار صاحب آپ کہاں جا رہے ہیں۔ بہت رات ہو گئی ہے۔

ٹھکانے پہ چلنا نہیں ہے۔" میں نے بہ حسرت و یاس پہلے گیتانجلی کو پھر سدھیر کو دیکھا اور انجنیئر صاحب کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

اب ذرا سوچئے کہ پیدل تو مجھے پھر بھی چلنا پڑا۔ سواری جو ہمارے لیے رات کو مہیا ہوتی تھی اپنی ڈیوٹی پوری کر کے جا چکی تھی۔ انجنیئر صاحب' ٹیگور بابا' ان کی بٹیا اور میں۔ چڑھائی اور اترائی میں جلد ہی میرا سانس پھول گیا۔ مگر یہ تینوں کس اطمینان سے چل رہے تھے بلکہ ٹیگور بابا تو مجھے اب سہارا دینے کے لیے تیار تھے۔ وہ کیوں نہیں تھکتے تھے' اس کی وجہ انھوں نے بتائی کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ ٹیگور بابا اور اصغر علی انجنیئر دونوں کی عمریں سن کر میں بہت جز بز ہوا۔ ٹیگور بابا سے تو میں نے خیر کچھ نہیں کہا مگر انجنیئر صاحب سے فوراً" باز پرس کی۔ "انجنیئر صاحب" آپ نے مجھے بہت دھوکا دیا۔ میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھ رہا تھا۔ آپ تو مجھ سے بہت جونیئر ہیں۔"

اصغر علی انجنیئر میں ثقاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لائٹ موڈ میں کبھی ہوتے ہی نہیں۔ نہ کبھی مسکراتے ہیں نہ کوئی ذاتی بات کرتے ہیں۔ بڑے مسائل نے ان کے دل و دماغ پر اتنا غلبہ کر رکھا ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ بہرحال میں نے اس کے بعد بہت کوشش کی کہ اپنی اور ان کی عمر کی تفاوت کے اعتبار سے اپنی حیثیت کو بحال کروں مگر انھوں نے اپنی بزرگانہ متانت اور شفقت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ ہار کر میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر یہ بھی سوچا کہ اب تو آخری دن ہے۔ جہاں اتنے دن انھیں بزرگ سمجھ کر گذار دیے ایک دن اور سہی۔ ویسے اصل بات یہ ہے کہ بزرگی کا عمر سے کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق بنیادی طور پر آدمی کے رویّے سے ہے۔ جن کے یہاں بزرگی کا مادہ ہوتا ہے وہ ہوش سنبھالتے ہی بزرگوں کے طور اپنا لیتے ہیں۔ جن میں یہ مادہ نہیں ہوتا ان کی عمر گزر جاتی ہے اور وہ بزرگ نہیں بن پاتے۔ آپ میری حالت کا اس سے اندازہ لگائیں کہ شوی نے جب مجھے بار بار انکل کہا تو میں بہت سٹپٹایا۔ اس خطاب سے مانوس ہونے میں مجھے کسی قدر وقت لگا۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ بھانجوں اور بھانجیوں کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے میں ماموں کے خطاب سے تو مانوس چلا آتا تھا بلکہ عین زمانۂ جوانی میں دور قریب کی کتنی لڑکیوں نے میرے کسی بھانجے یا بھانجی کے کلاس فیلو ہونے کے بہانے مجھے ماموں کہنا شروع کر دیا اور مجھے یہ جعلی رشتا قبول کرنا پڑا۔ مگر انکل کہلانے کا یہ پہلا تجربہ تھا اور اب اس میں مضایقہ بھی کیا تھا۔

اب آپ پوچھیں گے کہ یہ شوی کون تھی اور میں اس کا انکل کیسے بنا۔ مت پوچھئے۔ ایک درد بھری داستان کی طرف آنا پڑے گا۔ یہ پہلی ہی شام کی بات ہے۔ ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو دیکھا کہ نیلم بنگلہ دیشی خواتین کے ساتھ گھل مل بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھا تو آواز دی۔ "انتظار صاحب ان سے آپ نہیں ملے۔" برابر میں بیٹھی ہوئی اس باوقار خاتون کی طرف اشارہ کیا جو بنگلہ دیشی خواتین میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ "یہ ہنا قیصر ہیں۔ شہید اللہ قیصر کی بیگم۔ آپ شہید اللہ قیصر کو جانتے تھے؟"

شہید اللہ قیصر' اس نام پر میں چونکا۔ پھر اس خاتون کو دیکھا۔ میں نے تھوڑا اپنے آپ کو یک جا کیا پھر ان

سے کہنے لگا کہ "اچھا آپ شہید اللہ قیصر کی بیگم ہیں۔ دیکھئے ان سے میری ملاقات تو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان کے ایک مشہور صحافی اور مشہور لکھنے والے کی حیثیت سے میرے لیے اور ادھر ہم سب ہی کے لیے وہ بہت جانی بوجھی شخصیت تھے۔"

"آپ لوگوں کو وہ خبر پہنچی تھی کہ ڈھاکا میں مشہور دانش وروں اور ادیبوں کے ایک پورے گروہ کے ساتھ جو واردات گذری تھی۔"

"ہاں یہ خبر وہاں پہنچی تھی اور اس خبر نے سب ہی صحافیوں' ادیبوں اور سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو بہت پریشان کیا تھا۔"

"ڈھاکا کے فال سے صرف دو دن پہلے یہ واقعہ ہوا۔ رات کو گھر پہ دستک ہوئی۔ میرے شوہر باہر گئے۔ دیر تک واپس نہ آئے تو میں پریشان ہوئی۔ پھر وہ واپس آئے ہی نہیں۔"

ہم سب ہی چپ ہو گئے۔ ایک افسردگی کی فضا پیدا ہو گئی۔ پھر وہ خود ہی بولیں۔ "ابھی میری شادی کو صرف دو سال ہوئے تھے۔ اسی سال شومی پیدا ہوئی تھی۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔

پھر کھانا آ گیا۔ ہم لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانے کے بعد میں نے جگہ بدلی اور دوستوں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ بس اسی دوران ایک لڑکی چپکے سے میرے قریب آ بیٹھی۔ بولی "انکل' میری امی کہہ رہی ہیں کہ آپ میرے ابو کو جانتے تھے۔ آپ انھیں جانتے تھے؟"

بالکل جیسے کوئی بچی ہو اور بھولپن سے کسی اجنبی سے پوچھ رہی ہو۔ "تم نے میرے ابو کو دیکھا تھا۔" مگر اس معصومانہ سوال نے مجھے گڑبڑا دیا۔ میرے لیے وہ سوال آن کی آن میں کچھ سے کچھ بن گیا۔ اے ء کے نامبارک سال میں ڈھاکا میں پیدا ہونے والی ایک بچی جس کے دنیا میں آنے کے ساتھ اس کا باپ دنیا سے چلا گیا۔ اب وہ پاکستان سے آنے والے ایک اجنبی سے پوچھ رہی تھی۔ "انکل' آپ میرے ابو کو جانتے تھے؟" اور پھر میں خود اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ شومی جو پاکستانی پیدائش تھی اور اب بنگلہ دیشی ہے' اس کے پاکستانی باپ کو میں کتنا جانتا تھا۔ جانتا بھی تھا یا جھوٹ موٹ اس سے کہہ رہا ہوں کہ میں انھیں بہت جانتا تھا۔

صبح کا وقت ہے۔ اصغر علی انجینئر اور میں اپنے ریسٹ ہاؤس کے سبزہ زار میں برف پوش چوٹیوں کے رخ بیٹھ کر چائے پی رہے ہیں' سورج کی پہلی کرن کھیلتی کھیلتی ہماری چائے کی پیالیوں کے پاس آ گئی ہے۔ اچانک شومی نمودار ہوتی ہے۔ جینز اور شرٹ میں ملبوس' کیمرہ گلے میں ڈالے ہوئے۔ "انکل آپ ذرا کھڑے ہو جائیں۔ ذرا اس طرف اور انکل آپ بھی۔" اور ہم دونوں شومی کی ہدایات کے مطابق کھڑے ہو جاتے ہیں اور تصویر کھنچواتے ہیں۔ اور لیجئے وہ ہنا قیصر اور روبی رحمان نمودار ہو گئیں۔ "اماں ادھر آئیے اور آنٹی آپ بھی۔ انکل آپ بھی۔" اور شومی نے کھٹ کھٹ کئی تصویریں کھینچ ڈالیں۔

ورکشاپ میں شریک ہونے کے لیے ہم وین میں بیٹھے۔ شومی غائب۔ ہنا قیصر پریشان ہو رہی ہیں

کہ شوی کدھر نکل گئی۔ جب وین سڑک پر آئی تو دیکھا کہ شوی کیمرہ گلے میں ڈالے اونچی نیچی راہوں پر تیز تیز چلی جارہی ہے۔

"شوی وین میں آجاؤ۔"

"نہیں اماں' میں پیدل انجوائے کر رہی ہوں۔"

لیکن آخری صبح جب میں چائے پینے کے لیے سبزہ زار میں گیا تو دیکھا کہ کوئی دوسری ہی شوی کھڑی ہوئی ہے۔ آج اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ میں نے اسے سر سے پیر تک حیرت سے دیکھا۔ "شوی' یہ تم ہو۔ میں تو تمھیں اسکول گرل کے طور پر treat کر رہا تھا۔"

شوی متانت سے مسکرائی۔ اس وقت وہ کھلنڈری لڑکی نہیں تھی۔ اس نے پرس سے اپنا وزٹنگ کارڈ نکالا "انکل یہ میرا کارڈ ہے۔"

میں نے کارڈ دیکھا۔ شوی قیصر' ایکٹرس' رائٹر۔ شوی ایم اے کر چکی ہے۔ اب ٹی وی کے لیے ڈراموں میں ایکٹ کرتی ہے۔ لکھتی بھی ہے۔

لیجیے دوستوں سے تعارف کے چکر میں میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ پہلے تو مجھے یہ بتانا چاہیے کہ جس ورکشاپ کا ڈول ڈالا گیا تھا وہ کیسے منعقد ہوئی۔ وہاں ہوا کیا۔ کس نے کیا کیا۔ صاحب یہ تو لمبی داستان ہے۔ ایسے موقعوں پر جب بولنے والے بولنے پر آتے ہیں تو پیٹ بھر کر بولتے ہیں۔ اس سب کو یاد رکھنا اور پھر انھیں دہرانا' اس میں تو بوریت ہی بوریت ہے۔ سچ پوچھو تو وہاں مختصر بولنے والا تو میں ہی تھا۔ مگر وہ تو میری مجبوری ہے۔ لمبا بولنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

ہاں یہ سن لیجیے کہ ورکشاپ کا انداز کیا تھا۔ ہم جب ہال میں داخل ہوئے یعنی ریسٹ ہاؤس کے اس بڑے کمرے میں جہاں یہ ورکشاپ ہوئی تھی تو دیکھا کہ کرسیاں قطار اندر قطار بچھی ہوئی ہیں۔ "کرسیِ صدارت' ڈائس۔" سدھارت جی نے ناک بھوں چڑھائی۔ "یہ کرسیاں بچھانے کے لیے کس نے کہا تھا۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ کر بھلا بات کریں گے۔ اٹھاؤ ان کرسیوں کو۔"

جلدی جلدی کرسیاں اٹھائی گئیں۔ ڈائس ایک طرف سرکایا گیا۔ دری' اس پر چاندنی۔ چند ایک گاؤ تکیے۔ سب دائرہ بن کر بیٹھ گئے۔ کسی نے پوچھا کہ موضوع کیا ہے۔ کیا پہلے مقالے پڑھے جائیں گے۔ اور پھر ان پر سوال ہوں گے اور بحث ہوگی۔

مقالے؟ کیسے مقالے۔ پھر سدھارت جی نے ناک بھوں چڑھائیں۔ نہیں صاحب مقالے وقالے کوئی نہیں ہوں گے۔ بس ہم باتیں کریں گے۔ ادب کے حوالے سے' آرٹ کے حوالے سے' تاریخ کے حوالے سے جو بھی حوالہ سمجھ میں آئے اسی حوالے سے اپنی روایات کو دیکھیں گے۔ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ ہماری روایت کیا ہے اور ہم کدھر جارہے ہیں۔ اور دیکھیے ہم اس بحث سے کوئی نتائج نکال کر کوئی فیصلے نہیں کریں گے' کوئی قرارداد منظور نہیں کریں گے۔ دیکھتے ہیں کہ ہماری بحث ہمیں کہاں لے جاتی ہے اور کیا اس سے برآمد ہوتا ہے۔

تو صاحب گفتگو شروع ہو گئی۔ پھر چل سو چل۔ بولنے والوں میں اصغر علی انجینئر پیش پیش تھے۔ یہاں انھوں نے اسلام کی کیسی جامع تفسیر پیش کی۔ ہندو دانش ور تو کچھ زیادہ ہندو نظر نہیں آ رہے تھے۔ اچھا ایک کرشنا سوبتی کو چھوڑ کر جو دلّی سے آئی تھیں یہ سب جنوبی ہند کے تھے اور سیکولر مزاج والے۔ مگر اصغر علی انجینئر یہ طے کر کے آئے تھے کہ اسلام کے متعلق جو دوسرے لوگوں میں غلط فہمیاں ہیں انھیں دور کیا جائے اور بتایا جائے کہ یہ کتنا معقولیت پسند اور لبرل قسم کا مذہب ہے۔ ممکن ہے دوسرے یہ سوچ کر انھیں خاموشی سے سن رہے ہوں کہ ہندوستان کے ایک اقلیتی گروہ کا نمایندہ بول رہا ہے' اس کی بات سنی چاہیے' مروت ہی سہی۔ مگر ایک شخص ایسا تھا جو پُر خلوص قلب کے ساتھ سن رہا تھا۔ جیسے اس کے یہاں اسلام کے سلسلے میں ایک کرید ہو۔ وہ سوال اٹھاتا۔ اصغر علی انجینئر تفصیل سے اس سوال کا جواب دیتے اور وہ شخص یکسوئی کے ساتھ کان لگا کر بات سنتا۔ یہ اننت مورتی تھے۔

بے چینی کا اظہار ایک مسلمان ہی کی طرف سے ہوا۔ غلام شیخ کسمسائے' لمبی جماہی لی' پھر آہستہ سے بولے۔ "انجینئر صاحب کے ساتھ ایک مشکل یہ ہے کہ ان کے پاس ہر سوال کا جواب موجود رہتا ہے' بعض سوال ایسے بھی تو ہوتے ہیں کہ جن کے شاید بنے بنائے جواب موجود نہ ہوں۔ وہ فکر کے طالب ہوتے ہیں۔ تو بس انھیں غور و فکر کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔"

اس سے سدھیر کو شہ ملی۔ بات اسلام ہی کی ہو' مگر منھ کا مزہ تو بدلنا چاہیے۔ شاید یہ تھا اس عزیز کا خیال کہ اس نے درمیان میں آنے والے ایک وقفہ سے فائدہ اٹھایا اور میری طرف لڑھکا دیا۔ "انتظار صاحب' آپ بتائیے کہ آپ کا اسلام کس نوعیت کا ہے۔"

"میرا اسلام؟" میں سٹپٹایا۔

"مطلب یہ ہے کہ آپ کس قسم کے مسلمان ہیں۔ اسلام کو آپ کس طریقے سے دیکھتے ہیں۔"

میں نے بہت رسّا تڑانے کی کوشش کی لیکن سدھیر نے مجھے اس طریقے سے گھیرا تھا کہ بھاگنے کا کوئی رستا نہیں مل رہا تھا۔ پھر کیا کیا جائے اس مشکل وقت میں صلاح الدین محمود میرے بہت کام آئے۔ میں نے کہا کہ دیکھیے اپنے اسلام کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا۔ کبھی اس طریقے سے سوچا ہی نہیں تھا۔ لیکن اپنے ایک ہم عصر شاعر کی بات آپ کو سنائے دیتا ہوں۔ یہ اچھی طرز کے شاعر ہیں صلاح الدین محمود۔ گہرا مذہبی احساس رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کا نام زبان پر آجائے تو جسم میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ انھیں میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ صاحب میرا اسلام تو میرا بائی کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔

"کیا کیا۔" سدھیر کے کان ایک دم سے کھڑے ہوئے۔

میں نے کہا کہ دیکھیے سدھیر صاحب میرے دوست صلاح الدین محمود تو بہت سچے اور پکے مسلمان ہیں۔ میں کچا پکا مسلمان ہوں۔ مگر ہوں مسلمان ہی' سیکولر دانش ور بہرحال نہیں ہوں۔ مگر ہم پیدا ہوئے ہیں بلکہ اُگے ہیں اس برصغیر کی مٹی سے۔ تو ہمارے اسلام میں اس مٹی کی بھی سوندھ شامل ہو گئی ہے۔ اردو کے ایک شاعر کا مصرع ہے ع

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لیے

اب یہ بات اس برصغیر میں پیدا ہونے والا شاعر ہی کہہ سکتا تھا۔ کوئی عرب یا ایرانی شاعر یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ تو ہم جیسے مسلمانوں کے ساتھ یہ قصہ چلتا ہے۔ شاعر نے تو اپنی شاعرانہ زبان میں اسے کفر کہا۔ مولوی اسے پوری سنجیدگی کے ساتھ کفر کہے گا۔ میں اسے کیا کہوں گا' یہ میں سوچ کر بتاؤں گا۔ بہرحال میرا بائی کا بھجن سنتے ہوئے مجھے بھی کچھ ہونے لگتا ہے۔ مگر کیا ہونے لگتا ہے ع

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع

پتا نہیں۔

ویسے ایک مقام اور آیا تھا جب میرا بولنے کو جی چاہا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے اور دانش وروں کو سنتے سنتے یوں ہی خیال آیا کہ برصغیر کی سیاست نے یہ عجب گل کھلایا ہے کہ ساری فرقہ پرستی اور مذہبی تنگ نظری مسلمان کے نام لکھ دی گئی ہے ع

ہمیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا

کہ مسلمان گائے کو ذبح کرتا ہے اور مسجد کے آگے باجا بجایا جائے تو لڑنے مرنے پہ تیار ہو جاتا ہے مگر یہ جو اس برصغیر میں مسلمانوں کی تخلیقی روح نے تصوف کی' فنون کی' شعر و ادب کی اتنی بڑی روایت پیدا کی ہے اور بڑے استعارے تخلیق کیے ہیں وہ کسی حساب ہی میں نہیں ہیں۔ اور اننت مورتی جی نے صوفیوں اور یوگیوں کے تعمیر کردہ استعاروں کا تو ذکر کر دیا مگر مسلمان شاعروں نے جو ایک زرخیز لبرل روایت کو جنم دیا اس کا بھی تو کچھ ذکر فکر ہونا چاہیے۔ میں نے سوچا کہ یہاں سندھ سے آیا ہوا ایک نوجوان دانشور جاوید بھٹو موجود ہے۔ وہ سندھی شاعری کے حوالے سے بات کرے گا۔ اور یہ نیلم آخر احمد بشیر کی بیٹی ہے۔ صوفی پنجابی شعرا کے بارے میں مجھ سے بہتر بات کر سکتی ہے۔ مجھے اردو سے چند ایک مثالیں پیش کر دینی چاہییں۔ تو چلا تو تھا میں قلی قطب شاہ کی غزل سے مگر میرؔ' غالبؔ' نظیرؔ تک آتے آتے میں نے پٹڑی بدل لی۔ غزل کی لبرل روایت سے تو آپ سب ہی آشنا ہیں۔ مگر شاید آپ کو یہ پتا نہ ہو کہ خالص مذہبی شاعری میں بھی مسلمان شاعروں نے کیا کام انجام دیا ہے۔ نعت ایک ایسی صنف ہے جس میں شاعر آنحضرت صلعم کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔ سارے اشعار کا مرکز و محور آپ ہی کی ذات اقدس ہوتی ہے مگر ایک نعت گو شاعر گذرا ہے محسن کاکوروی۔ ذرا اسے دیکھیں کیا استعارہ تخلیق کیا ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

متھرا میں سری کرشن جی کا جنم منانے کی تیاریاں ہیں۔ سری کرشن جی کا قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بادل متھرا پہ جھکا ہوا ہے کہ اسے سری کرشن جی کے حضور اپنی شردھا کے پھول پیش کرنے ہیں۔ پھر وہ متھرا پر برستا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔

کیا جھکا کعبہ کی جانب کو ہے قبلا بادل

سجدے کرتا ہے سوئے یثرب و بطحا بادل
سبزۂ چرخ کو اندھیاری لگا کر لایا
شہسوارِ عربی کے لیے کالا بادل

سدھیر نے پھر جھرجھری لی۔ "کیا نام بتایا شاعر کا؟"

"محسن کاکوری اس کا نام ہے۔"

سدھیر کو محسن کاکوروی کے متعلق تفصیل سے جاننے کی خواہش ہے۔ میں کہتا ہوں' ذرا ٹھہریئے۔ علامہ اقبال سے بھی تو ایک مثال لے لیں۔ ہمارے شاعر اسلام نے "جاوید نامہ" میں اپنے روحانی مرشد مولانائے روم کا وشوامتر رشی سے مکالمہ کرا ڈالا ہے۔ مگر بھائی ع

ایسی باتوں سے کہیں دردِ جگر جاتا ہے

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ بابری مسجد کی تو تقدیر میں ڈھایا جانا لکھا تھا۔ سو وہ ڈھائی گئی۔

"دیکھیے انتظار صاحب' میں تاریخ کا آدمی ہوں۔ اور اس موضوع پر میں آج کل کام کر رہا ہوں۔ محسن کاکوروی کے ایسے سارے شعر آپ مجھے لکھ کر بھیجیں گے۔ اور آپ نے یگانہ کا جو حوالہ دیا تھا اس کے شعر بھی۔"

اور میں یہ شعر دیوان سے صحیح نقل کر کے بھیجنے کا وعدہ کرتا ہوں۔

شمع گردش کرتے کرتے ہنا قیصر کے سامنے پہنچ گئی۔

'پر ہوں میں شکوے سے یوں' راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

اے ء کے داغ دل میں لیے بیٹھی تھیں۔ بس اسی واسطے سے شروع ہو گئیں۔ اس سے سارا رنگِ محفل ہی بدل گیا۔ ان کے خاموش ہو جانے کے بعد دیر تک کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات کی جائے۔ مسٹر سندیپ نے تجویز پیش کی کہ اس وقت کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ بہتر ہے کہ کارروائی تھوڑی دیر کے لیے موقوف کر دی جائے۔ وقفہ کے بعد بات کریں گے۔ لیجئے وقفہ ہو گیا۔ مگر اظہارِ خیال تو بہرحال ہونا تھا' وقفہ کے بعد ہی سہی۔

میں تذبذب کے عالم میں ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ یہ تو اک مشکل مرحلہ آ گیا۔ مجھ سے اظہار خیال کے لیے ضرور کہا جائے گا۔ مجھے کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں کہنا چاہیے۔ اصل میں مجھے کبھی کسی سرکاری وفد کے ساتھ کہیں جانے کسی بین الاقوامی اجتماع میں شریک ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ جہاں بھی گیا ہوں نجی حیثیت ہی میں گیا ہوں۔ اس لیے مجھے پتا نہیں کہ ملک کی نمائندگی کے تقاضوں سے کس طرح عہدہ برا ہوا جاتا ہے۔ یہاں بھی میں نجی حیثیت ہی میں آیا ہوں۔ مگر یہ صورتِ حال ہی ایسی ہے کہ میں جو کچھ کہوں گا اس کی نوعیت نجی نہیں ہو گی۔ تو کیا مجھے اے ء کی تلخ حقیقتوں سے انکار کر کے یا انھیں نظرانداز کر کے بات کرنی چاہیے۔ وہ میں کیسے کروں گا۔ انھی دنوں میں نے حسن ظہیر کی تازہ تصنیف

پڑھی۔ سو مشرقی پاکستان میں ان برسوں میں جو ہوا اور اس Separation of East Pakistan سے پہلے جو ہوتا رہا وہ سارا منظر میرے سامنے ہے۔ پھر؟ مگر لیجیے نیلم نے بولنا شروع کر دیا ہے۔ نیلم کے بعد جاوید بھٹو شروع ہو گئے۔ دونوں نے مناسب لفظوں میں اپنے ردِ عمل کا اظہار کر دیا ہے۔ اچھا کیا۔ کیا ضروری ہے کہ ہم سب ہی اظہارِ خیال کا فرض ادا کریں۔ مگر نہیں۔ سدھیر ہمارا دوست مطمئن نہیں ہے۔ وہ ایک مرتبہ تقاضا کرتا ہے۔ میں سنی ان سنی کر دیتا ہوں۔ وہ دوسری دفعہ "بستی" کا حوالہ دیتا ہے اور پھر اپنے تقاضے کو دھراتا ہے۔ "بستی" حوالہ تو صحیح دیا مگر وہاں تو سارا اظہار احساس کی سطح پر ہے۔ اسے میں منطقی اور استدلالی محاورے میں کیسے منتقل کروں۔ سدھیر کا اشارہ "بستی" کے جس کردار کی طرف تھا وہ بنگالی نہیں تھا۔ مگر کیا اس کے لیے یہ تجربہ کم اذیت ناک تھا۔ پاکستان ٹوٹنے کا سانحہ۔ شکست مگر فتح و شکست کا کھیل تو چلتا ہی رہتا ہے۔ یہاں پاکستان نے خالی اپنا آدھا حصہ گم نہیں کیا' اپنی روح کو بھی گم کر دیا۔ اور ان فرزندوں کو جو اس قیامت میں اس سے بچھڑ کر الگ ہو گئے۔ شاید اسی نہج پر سوچتے ہوئے میں نے چند جملے کہے تھے اور چپ ہو گیا تھا۔ اور گیتا نجلی نے گھور کے سدھیر کو دیکھا " تمھیں انتظار صاحب کو بولنے کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمھیں پتا نہیں کہ یہ کتنا نازک مسئلہ ہے۔" اور اسی آن میں نے دیکھا کہ شوبی میرے قریب آبیٹھی ہے اور کہہ رہی ہے۔ "انکل' شاید میری اماں کی باتوں سے آپ کو تکلیف ہوئی ہے۔" میں پھر گڑبڑا جاتا ہوں کہ اسے کیا جواب دوں۔ یہ لڑکی اپنی معصومیت میں کوئی ایسی بات کہہ جاتی ہے یا کوئی ایسا سوال کر بیٹھتی ہے کہ اس کا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہنے لگی "انکل' پاکستان میں نئی جنریشن کو کیا یہ نہیں بتایا جاتا کہ ۷۱ء میں کیا ہوا تھا۔"

"تم نے یہ کیسے طے کر لیا کہ ان سے یہ سارا سانحہ خفیہ رکھا گیا ہے۔"

"بات یہ ہے کہ پچھلے دنوں پنجاب یونی ورسٹی سے کچھ طالبات ڈھاکا آئی تھیں۔ میں نے جب ان سے اس واقعے کا ذکر کیا تو انھیں بہت تعجب ہوا۔ کہا کہ ہمیں تو بالکل پتا نہیں ہے کہ ایسا ہوا تھا۔"

مگر شوبی کی باتوں سے مجھے احساس ہوا کہ اس سے پہلے کی مشترکہ تاریخ کا اسے کچھ پتا نہیں ہے۔ مشترکہ تاریخ کے کچھ حصے پاکستان والوں کو وارا نہیں کھاتے اور کچھ حصے بنگلہ دیش والوں کو وارا نہیں کھاتے تو تاریخ کے ساتھ شاید دونوں ہی طرف ایک سا سلوک ہو رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ مجھے تاریخ کی ایک بوالعجبی کا خیال آیا۔ لیکن ابھی نہیں۔ یہ جو میرے برابر میں ایک ہندوستانی مسلمان بیٹھا ہے پہلے اسے سن لوں۔

غلام شیخ نے اب تک بولنے سے گریز کیا تھا۔ مگر شمع گھومتی پھرتی اب ان کے سامنے آگئی تھی۔ غلام شیخ کی اس ادا کا میں حیدر آباد سے گھائل چلا آ رہا ہوں کہ عمومیات میں نہیں پھنستے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے نجی تجربوں کی دنیا میں رہ کر بات کرتے ہیں اور کس خوب صورتی سے کرتے ہیں۔ انھیں اپنی بستی کا وہ پیڑ یاد آگیا جو ایک وقت میں انھیں بہت خوب صورت نظر آیا تھا اور جسے انھوں نے بہت ڈوب کر مشاہدہ کیا تھا اور پینٹ کیا تھا۔ اس وقت انھیں اپنے مصور ہونے کے سوا اور کوئی احساس ہی نہیں تھا۔

چیزوں کو، منظروں کو اسی حساب سے دیکھتے تھے اور تصویر بناتے تھے۔ مگر پھر دنیا بدلنی شروع ہوئی اور بدلتی چلی گئی۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد بالکل ہی بدل گئی۔ اب اپنے مصور ہونے کا احساس کم ہوتا چلا جارہا ہے اور یہ احساس بڑھتا چلا جارہا ہے کہ وہ ایک اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہنے لگے۔ "تو اب میں سوچ رہا ہوں کہ شاید اب میں اس پیڑ کو اس طرح پینٹ نہ کرسکوں، جس طرح اس وقت پینٹ کیا تھا۔ جب ساری دنیا ہی بدل گئی تو وہ پیڑ بھی تو بدل گیا ہوگا۔"

یہ ایک فرد کا قصہ نہیں تھا۔ سارے ہندوستانی مسلمانوں کا المیہ بیان کیا جارہا تھا۔ اور مجھے احساس ہوا کہ یہ مجھے سنایا جارہا ہے کہ اصل میں ہندوستانی مسلمانوں کے سارے مصائب کا ذمہ دار میں ہوں۔

یہاں سے مجھے تاریخ کی ایک بوالعجبی کا احساس ہوا۔ ویسے تو تاریخ کا مشغلہ ہی یہ ہے۔ بوالعجبیاں دکھاتی ہے۔ عجب عجب گل کھلاتی ہے۔ مگر بالعموم یہ کام لمبے وقفے کے ساتھ کرتی ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ تاریخ ہمارے ساتھ کیا کرگئی۔ مگر اس زمانے میں ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے کئی گل کھلا ڈالے۔ اس وقت یہاں مسلمان کے تین برانڈ جمع ہیں اور مجھے وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب تحریک پاکستان کے رہنما پُرجوش تقریریں کرتے تھے اور اعلان کیا کرتے تھے کہ پشاور سے ڈھاکا تک اور ہمالہ سے راس کماری تک کے مسلمان ایک قوم ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں یہ نعرہ کتنے برسوں تک فضا میں گونجتا رہا اور دل و دماغ میں نفوذ کرتا چلا گیا۔ مگر ۱۴ اگست ۴۷ء کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ پشاور سے ڈھاکا تک کے مسلمان بے شک ایک قوم ہیں لیکن اس میں وہ مسلمان خلقت شامل نہیں ہے جو واہگہ اور ڈھاکا کے درمیان ہمالہ سے راس کماری تک بکھری ہوئی ہے۔ اب دیکھئے انسانی ذہن کوئی مشین تو ہے نہیں کہ مثلاً" جیسے گھڑی ہوتی ہے کہ کل مروڑ کر سوئی کو دم کے دم میں ایک ہندسے سے کسی دوسرے ہندسے پر ٹکا دیا۔ پھر بھی پاکستانی قوم کو داد دینی چاہیے کہ اس نے اس نئی حقیقت کا بڑی تیزی سے ادراک کیا۔ البتہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس کے ادراک میں بہت وقت پیش آئی۔ اور اس ادراک میں انھوں نے جتنی دیر کی اتنا ہی ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بہرحال پاکستانی قوم نے ۴۷ء میں نئی حقیقت کے ادراک میں جو پھرتی دکھائی تھی وہ ۷۱ء میں اس کے بہت کام آئی۔ کیوں کہ اس نامبارک برس میں پشاور سے ڈھاکا تک کا محاورہ دم توڑ گیا۔ پتا چلا کہ صرف پشاور سے واہگہ تک کے مسلمان ایک قوم ہیں۔ کتنی تیزی سے ہمارے ذہن کی سوئی نے حرکت کی اور کتنی جلدی اس نئی حقیقت سے ہماری مفاہمت ہوگئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ہم نے چھوڑا، ہمیں بنگالی مسلمان چھوڑ گئے۔ اور یاروں نے یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا، چلو اچھا ہوا، تم روٹھے ہم چھوٹے۔ مگر بابری مسجد کو سلام کہ اس نے شہید ہو کر بچھڑے ہوؤں کو ایک چھت تلے سر جوڑ کر بیٹھنے کی تقریب پیدا کردی۔ میرے برابر غلام شیخ بیٹھے ہیں اور سامنے اصغر علی انجینئر بیٹھے کس فصاحت سے اسلام پر گفتگو کررہے ہیں۔ اور ادھر ہنا قیصر، روبی رحمان بیٹھی ہیں، صبور صاحب ہیں، سراب صاحب ہیں۔ اور یہ دھان پان بی بی کہ عینک لگائے بیٹھی ہیں کون ہیں، ان کا تو نام ہی میں بھول گیا۔ یہ سب بچھڑے قافلہ کے فرد ہیں کہ یہاں آئے

بیٹھے ہیں۔ غلام شیخ اور اصغر علی انجنیئر سے میں بے تکلف اردو میں باتیں کر رہا ہوں۔ احساس ہی نہیں ہے کہ ہم دو مختلف قوموں کے لوگ ہیں۔ ہاں سدھیر اور گیتا نجلی سے بھی اسی زبان میں باتیں ہو رہی ہیں مگر جب ہنا قیصر سے مخاطب ہوتا ہوں تو پٹری بدل کر انگریزی پر آجاتا ہوں۔ ویسے جنوبی ہند سے آئے ہوئے دوستوں سے بھی تبادلۂ خیال اسی زبان میں ممکن ہے۔ ممکن ہے وہ میری اردو کو تھوڑی رعایت دے دیں۔ مگر پھر انھیں گیتا نجلی کی ہندی کو بھی رعایت دینی پڑے گی۔ مجھے بالکل گمان نہیں تھا کہ جنوبی ایشیا کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اتنی شدت سے انگریزی بولنی پڑے گی۔

چلو بہت انگریزی بول لی۔ محفل اب برخاست ہوتی ہے۔ بابری مسجد کے حوالے سے اتنی بہت سی گفتگو ہوگئی۔ گوری شنکر کے بھی درشن ہوگئے۔ کلماتِ تشکر کی رسم بھی ادا ہوگئی۔ اب اور کیا کرنے کے لیے رہ گیا۔ سوور کشاپ کا دفتر لپٹتا ہے۔ اب یاروں کا دوسرا موڈ ہے۔ منجھو ستار لے کر بیٹھ گیا ہے۔ کنتا ڈوب کر نغمہ الاپ رہا ہے۔ اور اے لو یہ تو پوری محفل کھڑی ہو کر ناچنے لگی۔ اور تو اور کرشنا سوبتی بھی بہ ایں جثہ و بہ ایں بزرگی رقص کر رہی ہیں۔ اور انھیں پارٹنر کون ملا ہے۔ دراز قد اننت مورتی اور پستہ قد کرشنا سوبتی۔ کیا خوب شتر گربہ ہے۔ میں اردگرد نظر ڈالتا ہوں۔ سوائے میرے سب ناچ گا رہے ہیں۔ اچھا تو مجھے بھی لگ رہا ہے۔ اور دل سے میں اس کا قائل ہوں کہ کبھی کبھی پاسبانِ عقل سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے لیکن اگر آدمی کے اندر محکمۂ احتساب جما بیٹھا ہو تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ اور اس کے بعد کا احوال تو میں سنا ہی چکا ہوں۔ سدھیر اور گیتا نجلی ایک طرف، اصغر علی انجنیئر دوسری طرف۔ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر۔ کفر ہار گیا۔ صبح گیتا نجلی نے بتایا کہ رات چار بجے تک محفل جمی رہی۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اصغر علی انجنیئر اب کوئی دم میں رخصت ہونے والے ہیں۔ راوی آیندہ دو دنوں کے لیے کفر ہی کفر لکھتا ہے۔ کافروں کی یہ ٹولی ہوگی، میں ہوں گا اور مندر ہوں گے۔ ارے ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ مندروں کے ایک نگر کی خاک تو ورکشاپ کے بیچ ہی ہم نے چھان لی تھی۔ اور اس سے بھی پہلے کیا ہوا۔ اصل میں دل تو شروع ہی سے مندروں میں اٹکا ہوا تھا۔ ایک روز صبح ہی صبح دروازے پہ دستک ہوئی۔ جھانکا تو ہنا قیصر کھڑی تھیں۔ "کیوں، مندر دیکھنے کے لیے نہیں چلنا ہے۔"

"بالکل چلنا ہے۔ مگر اتنی سویرے؟"

"قریب ہی بستی ہے۔ میٹنگ کے وقت سے پہلے پہلے دیکھ کر آجانا ہے۔ سو جلدی ہی چلنا چاہیے۔"

"تو آپ نیچے چلیں۔ بندہ ابھی حاضر ہوا۔"

کیسا نہانا دھونا۔ کیسی چائے۔ جھٹ پٹ کپڑے بدل آہستہ سے کمرہ بند کر دبے پاؤں نیچے اتر گیا۔ آخر اصغر علی انجنیئر کا بھی تو کھٹکا لگا ہوا تھا۔ نیچے بنگلہ دیشی قافلہ مع نیلم کے منجھو کی سربراہی میں پیدل چلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

مندر تو کیا دیکھے، بس دھولی خیل کی دھول پھانک لی۔ کوئی ایسا مندر تو تھا نہیں کہ میرا دل دھڑکتا۔ لیکن کھٹمنڈو سے دور پہاڑیوں کے بیچ آباد ایک بستی، اس کی گلیاں، اس کے کوچے، کوئی اونچا کوئی نیچا، چھوٹا

موٹا سا ایک بازار۔ بازار کیا بس چند دکانیں مگر ہمیں خراب کرنے کے لیے یہ چند دکانیں ہی بہت کافی تھیں۔ اصل میں بیبیوں کے ساتھ کسی بازار سے گذرنا سخت خطرناک کام ہے۔ مال و اسباب سے بھری دکانوں میں عورتوں کے لیے عجب کشش ہوتی ہے۔ وہ چاہیں یا نہ چاہیں کوئی مقناطیسی قوت انھیں کھینچ کر ان کے بیچ لے جاتی ہے۔ اور جب تک ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر نہ دیکھ لیں اور اس کا بھاؤ معلوم نہ کرلیں ان کی تسکین نہیں ہوتی ہے۔ خریداری شرط نہیں۔ اصل چیز مال و اسباب کو دیکھنے بھالنے' بھاؤ تاؤ کرنے' پسند کرنے اور پسند کر کے مہنگی ہونے کا بہانہ کر کے نہ خریدنے کا پورا عمل ہے جس سے گذرنے کے بعد ایک روحانی آسودگی میسر آتی ہے۔ مگر یہاں تو کوئی بھی دکان مال و اسباب سے بھری نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک گوشے میں ہی چھپی ایک بے معنی سی دکان نے جاتے دور سے کیا جلوہ روپی رحمان کو دکھایا کہ بس وہ اس کی طرف کھنچتی چلی گئیں۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ایک بی بی کے بعد دوسری بی بی' دوسری بی بی کے بعد تیسری بی بی سب ہی باری باری دکان میں گئیں اور گم ہو گئیں۔ ہر بی بی یہ کہہ کر گئی کہ میں انھیں پکڑ کر لاتی ہوں۔ آخر ناشتا بھی کرنا ہے اور ورکشاپ کا وقت بھی ہونے لگا ہے۔ مگر جو گئی واپس نہیں آئی۔ منجھو بھاؤ تاؤ میں ان کی مدد کر رہے تھے۔ رہ گئے ہم دو گنگ میں اور ٹیگور بابا۔ پھر ٹیگور بابا بھی اپنے قبیلے سے جا ملے۔ میں نے اپنے لیے مصروفیت نکالی کہ آس پاس کی گلیوں کو کھوندنا شروع کیا۔

تو صاحب مندر برائے نام دیکھے' دھولی خیل کی گلیاں اور چوبارے دیکھتے تھکے ہارے واپس آئے اور اسی حال میں ورکشاپ میں جو شروع ہو چکی تھی جا شریک ہوئے۔ اصغر علی انجینئر نے مجھے گھور کر دیکھا۔ آج صبح انھیں اکیلے بیٹھ کر چائے پینی پڑی تھی۔

خیر کچھ مندر تو ہم نے اسی روز دیکھ لیے۔ بحث کرتے کرتے یار درمیان میں مندروں کا مضمون لے آئے اور تقاضا کرنے لگے کہ یہ بحث تو لمبی کھنچتی چلی جا رہی ہے۔ قریب میں جو مندروں کی ایک بستی ہے وہاں جانے کے لیے بھی تو وقت نکالنا چاہیے۔ سوسہ پہر کی نشست موقوف ہوئی۔ اور پورا قافلہ چلا امتا نگر کی طرف۔ امتا نگر تو مندروں کا نگر نکلا۔ جدھر جاؤ ادھر مندر۔ گلی گلی مندر' کوچہ کوچہ مندر۔ نارائن مندر' دتاتریہ مندر' لکشمی مندر۔ مگر چند ہوں تو نام گنائے جائیں اور ان کی تفصیلات بتائی جائیں۔ یہاں تو مندر ہی مندر تھے۔ چند باتیں سب میں مشترک تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہر مندر پر دائیں بائیں دو نگہبان کھڑے تھے دونوں شیر۔ اور مندر کے عین سامنے ایک اونچی لاٹھی۔ اس پر گرڑ مہاراج اپنے شہپر سمیٹے دو زانو بیٹھے ہیں اور ہاتھ جوڑ کر اس دیوتا کو یا اس دیوی کو جس کا وہ مندر ہے ڈنڈوت کر رہے ہیں۔ ویسے مجھے تو سب سے بارعب مندر سدھی لکشمی کا مندر نظر آیا۔ کتنی اونچی کرسی پر بنا تھا جیسے ہمالہ کی چوٹی پہ ٹکا ہو۔ مندر میں پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بلکہ پورا زینہ۔ پاسبانوں کے نام پہلے دو مرد جو دائیں بائیں لاٹھیاں لیے کھڑے ہیں پھر دائیں بائیں کھڑے دو شیر' پھر اور بلندی پر دائیں بائیں کھڑے دو ہاتھی۔ پھر ہاتھی۔ اور پھر ہاتھی۔ اور پھر چکر۔

مگر غلام شیخ کو دتاتریہ مندر نے پکڑ رکھا تھا۔ کتنی دیر تک اس کا جائزہ لینے کے بعد ٹہلتے ہوئے میرے پاس آئے۔ "آپ نے دتاتریہ مندر دیکھا؟"

"ہاں دیکھ لیا۔"

"نہیں دیکھا۔ آپ ذرا پیچھے جا کر دیکھیں۔"

میں نے پیچھے جا کر مندر کی اونچی دیوار کا جائزہ لیا تو میرے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ نرناری کے جوڑے قطار اندر قطار رنگا رنگ جوڑے۔ رنگا رنگ آسن۔ آسنوں کی ایک پوری ندی۔

تو اسنا نگر کی سیر تو ہم نے ورکشاپ کے بیچ ہی کر لی تھی۔ اب ہم دھولی خیل سے نکل آئے ہیں۔ اب پہاڑیاں' اونچی چوٹیاں آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ واپس پھر کھٹمنڈو میں اور اسی پرانے ٹھکانے اور چوک میں۔ مگر اب یہاں فضا دوسری ہے۔ آئے ہوئے مہمانوں میں سے کتنوں نے اپنا بستر بوریا سمیٹ لیا ہے' کتنے سمیٹ رہے ہیں۔ انھیں آج ہی واپس چلا جانا ہے۔ سلیم کو آج ہی واپس جانا ہے۔ مگر جاوید بھٹو اس فکر میں ہیں کہ انھیں یہاں قیام کا ایک دن اور مل جائے۔ ہاں اصغر علی انجینئر بھی جا رہے ہیں۔ تو اب ہماری ٹولی سر جوڑ کر بیٹھتی ہے اور طے کرتی ہے کہ کھٹمنڈو کی خاک کس طور چھانی ہے۔ کوئی شہر اپنے درشن یوں ہی تو نہیں کرا دیتا۔ اس کے لیے جتن کرنا پڑتا ہے۔ میں نے یہ ساری منصوبہ بندی سدھیر' گیتا نجلی اور غلام شیخ پر چھوڑ رکھی ہے۔

سدھیر' گیتا نجلی' غلام شیخ' نیلما شیخ اور میں پانچ کی ٹولی نکل کھڑی ہوئی ہے۔ گھومتی پھرتی اس علاقے میں جا نکلی ہے۔ اے لو میں تو علاقے کا نام ہی بھول گیا۔ مگر نام سے کیا لینا۔ مطلب تو یہ ہے کہ پھر ہم مندروں کے نرغے میں ہیں۔ مندروں کا جو نگر کل دیکھا تھا یہ نگر بھی اس سے کم نہیں ہے۔ ویسے نقشا وہی ہے۔ صدر دروازے پر دائیں بائیں دو شیر بیٹھے ہوئے۔ مقابل میں ایک لاٹھ کھڑی ہوئی۔ اس پر گرڑجی اسی اپنے پوز میں گھٹنے ٹیکے بیٹھے ہوئے' شردھا کے ساتھ مندر کے دیوتا کو ڈنڈوت کرتے ہوئے۔ ایک مندر کے سامنے لاٹھ پر گرڑ کی بجائے راجہ اسی زاویے سے بیٹھا ڈنڈوت کرتا نظر آیا۔ اس پر ناگ پھن پھیلائے سایہ فگن ہے۔ پھن پہ چڑیا بیٹھی ہے۔

ان مندروں میں عجب عجب شکلیں نظر آ رہی ہیں۔ بعض سیدھی سادھی کسی پرند' چرند یا درندے کی شکل۔ بعض شکلیں ایسی ہیں کہ ایک شکل میں کئی کئی جانوروں کی شکلیں شیر و شکر ہو گئی ہیں۔ کسی کسی مندر کے صدر دروازے پر پاسبانی کرتے شیر بھی ایسے نظر آئے جیسے خالی شیر ۔ ۔ ہیں۔ خالی شیر شیرنی ہوتے تو ان کے جنسی اعضا ایسے ہوتے کہ اچھے خاصے مرد عورت نظر آ رہے ہیں۔ اچھا خیر ان شیر شیرنی کو چھوڑیے جو شیر شیرنی بھی ہیں اور مرد عورت بھی ہیں۔ یہ گرڑ کون سی مخلوق ہے کہ پنچھی بھی ہے اور آدمی بھی ہے۔ اتنا کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ یہ وشنو جی کی سواری ہے یعنی اگر شو جی بیل پر بیٹھ کر سفر کرتے ہیں تو وشنو جی گرڑ پر بیٹھ کر اڑتے ہیں۔ مگر شو جی کا بیل تو صرف بیل ہے۔ وشنو جی کی سواری کیسی ہے کہ نیم انسان نیم پرندہ۔ یہ مہابھارت بتائے گی کہ یہ مخلوق کون ہے۔ اس کی اصل کیا ہے مگر یہ تو پھر وہی

حکایت آگئی جس کا اڑتا اڑتا سا ذکر میں نے راجہ باسک کے سلسلے میں کیا تھا۔ حکایت اصل میں مشترک ہی ہے اس لیے کہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں اگرچہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ مگر کیوں۔

پرجاپتی کی دو بیٹیاں تھیں۔ کدرو اور ونا تا۔ دونوں کیشب رشی کی بیویاں بنیں۔ کدرو نے خواہش کی کہ اس کے ہزار بیٹے ہوں اور وہ بیٹے سانپ ہوں۔ ونا تا نے خواہش کی کہ اس کے بس دو بیٹے ہوں مگر ایسے کہ جسامت اور طاقت میں کدرو کے ہزار بیٹوں پر بھاری ہوں۔ کیشب نے دونوں کی خواہش کو پورا کیا۔

کدرو نے ہزار انڈے دیے۔ ان انڈوں سے ہزار سانپ بر آمد ہوئے۔ ونا تا نے دو انڈے دیے۔ مگر ونا تا بے صبری نکلی۔ اسے پانچ سو سال تک یہ انڈے سینے تھے۔ مگر اس سے صبر نہیں ہوا۔ ایک انڈا اس نے وقت سے پہلے ہی توڑ دیا۔ انڈے کے اندر سے جو بچہ نکلا اسے بہت غصہ آیا۔ کہا کہ اے میری ماں' تو نے وقت سے پہلے انڈا توڑ دیا۔ اب تجھے باندی بن کر عمر گذارنی پڑے گی۔ ہاں اگر تو نے پانچ ہزار سال تک صبر کیا اور انڈا نہ توڑا تو اس میں سے جو بچہ بر آمد ہو گا وہ تجھے غلامی سے نجات دلائے گا۔

وہ بچہ یہ کہہ کر آکاش کی طرف اڑ گیا اور سوریہ دیوتا کا رتھ بان بنا۔ اب ونا تا کی سنو۔ ایک گھوڑے کی رنگت کے بارے میں اس کی بہن سے شرط لگ گئی۔ ونا تا کہتی تھی کہ گھوڑا سفید ہے۔ کدرو کہتی تھی کہ کالا ہے۔ دونوں میں شرط لگ گئی کہ جو ہار جائے وہ باندی بن جائے۔ گھوڑا اصل میں سفید تھا۔ کدرو کو جب یہ پتا چلا تو اس نے ایک چال چلی۔ اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم کالے ہو۔ سو تم گھوڑے کی دم سے لپٹ جاؤ کہ وہ کالی نظر آئے۔ بیٹوں نے ایسا ہی کیا۔ کدرو نے ونا تا سے کہا کہ دیکھا گھوڑا کالا ہے۔ اب تو باندی بن جا۔ سو ونا تا باندی بن گئی۔ پانچ ہزار سال تک وہ یہ دکھ سہتی رہی اور اپنے دوسرے انڈے سے بچے کے نکلنے کا انتظار کرتی رہی۔ پانچ ہزار سال بعد اس انڈے سے جو بچہ نکلا وہ گرڑ تھا۔ اس نے سانپوں کو مارا جن کی وجہ سے اس کی ماں کو باندی بننا پڑا تھا۔ گرڑ بلندیوں میں پرواز کرتا ہے اور زمین پر رینگنے والے سانپ کو جہاں دیکھتا ہے کھا جاتا ہے۔ سو ہمالہ کی بلندیوں میں تو اس کا راج ہونا ہی چاہیے۔ سو اگر وہ ہندوستان کے مندروں سے زیادہ یہاں رچا بسا نظر آتا ہے تو صحیح نظر آتا ہے۔

دن مندروں کو دیکھنے بھالنے میں گذر گیا۔ کبھی اس مندر میں جھانکا کبھی اس مندر میں۔ بہت مندر دیکھے پھر بھی کم دیکھے۔ ابھی شہر کے کتنے نامی گرامی مندر دیکھنے باقی ہیں۔ خیر وہ کل۔ آخری مندر یاترا کل ہوگی۔ اس کل کی بھی سن لیجیے۔ جب میں صبح کو جاگا تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ ساتھی تو سب چلے گئے۔ چڑیاں تھیں کہ اڑ گئیں۔ اور ہوٹل جیسے بھائیں بھائیں کر رہا ہو۔ اصغر علی انجنیئر چلے گئے۔ صبح کی چائے کا جب ساتھ ہی چلا گیا تو صبح کی چائے کیا پئیں۔ سو صبح کی چائے کے خیال ہی کو رفع دفع کر دیا۔ اور صبح کا ناشتا؟ نیلم بھی جا چکی ہے۔ اور رہ گئی اپنی ٹولی تو انھوں نے کل ہی اس ہوٹل سے منتقل ہو کر کسی ریسٹ ہاؤس میں پڑاؤ کا بندوبست کر لیا تھا۔ باقی رہ گئے بنگلہ دیشی دوست تو ان کی اپنی برادری ہے۔ تو میں اکیلا ڈائننگ ہال میں بیٹھا ناشتا کر رہا ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ یہ تنہائی عارضی ہے۔ اب ہمارے یاروں کی ٹولی

آتی ہوگی۔ بس پھر کھٹمنڈو پاترا شروع ہوگی۔ اے لو وہ آگئے۔

تو صاحبو' اب ہماری انسم مندر یاترا شروع ہوتی ہے۔ یہ اس شہر میں میرا آخری دن ہے۔ کل صبح مجھے یہاں سے اڑ جانا ہے۔ تو اس شہر کی جتنی خاک پھانکنی ہے آج پھانک لو۔ پھر تم کہاں یہ شہر کہاں۔ عجب شہر ہے۔ بہ قول شخصے یہاں جتنے گھر ہیں ان سے زیادہ مندر ہیں۔ اور جتنے لوگ یہاں بستے ہیں ان سے زیادہ دیوی دیوتا یہاں رچے بسے ہیں۔ قصہ کہانیوں کی' لیجنڈ کی یہاں ریل پیل ہے۔ کسی شے کو ہاتھ لگاؤ اس کے ساتھ ہی کوئی ایک لیجنڈ چپٹی چلی آئے گی۔ اور خود یہ دیس نیپال اور یہ شہر کھٹمنڈو اس کے گرد کتنی لیجنڈز منڈلا رہی ہیں۔ آخر ہمالہ کی بلندیوں میں یہ دیس کیسے آباد ہوا۔ کہتے ہیں کہ پہلے تو یہاں ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ اور وہ جھیل ناگ دیوتاؤں کا مسکن تھی۔ کہیں سری کرشن جی کا ادھر گذر ہوا۔ انھیں عجب سوجھی کہ اپنے سدرشن چکر سے اس جھیل میں ایسی دراڑ ڈالی کہ جھیل کا سارا پانی یہاں سے بہہ گیا۔ یہیں کہیں ہمالہ کی کسی کھوہ میں نی منی بیٹھے تھے کہ سری کرشن جی کے بھگت تھے۔ سری کرشن جی نے بھگت سے کہا کہ یہاں آکر بیٹھو اور ایک نگر بساؤ۔ سونی منی نے کھٹمنڈو کی وادی میں آکر ڈیرے ڈال دیے۔ اور لیجیے دیکھتے دیکھتے ایک نگر آباد ہوگیا۔ اور نگر کے گرد ایک پورا دیس جس کا نام منی جی کی نسبت سے نیپال پڑا۔

مگر بدھ لوگ کہتے ہیں کہ غلط بالکل غلط۔ اس جگہ کو تو مہاتما منجو شری نے کہ تبّت سے آئے تھے' آباد کیا تھا۔ اور نیپال تو دو لفظوں کا مجموعہ ہے نی اور پال۔ نیپالی زبان میں نی کا مطلب ہے برف اور پال کے معنی ہیں گھر۔ برف کا گھر یعنی نیپال۔

یہاں کے بدھوں کی اپنی روایات اور کہانیاں ہیں۔ آخر یہاں کی مذہبی روایت میں' یہاں کے کلچر میں ان کا بھی تو بہت عمل دخل ہے۔ ہونا بھی تھا کہ مہاتما بدھ نے یہیں سے تو ظہور کیا تھا۔ کپل وستو نیپال ہی کی حدود میں ہے۔ اور لومبینی' مہاتما بدھ کی جائے پیدائش۔ راجہ ترھودن کی رانی مایا دیوی کپل وستو سے نکلیں اور چلیں رتھ میں سوار ہو کر اپنے میکے بچہ پیٹ میں تھا۔ لومبینی کے مقام پر کہ کپل وستو سے زیادہ دور نہیں دم لینے کے لیے رکیں۔ بس وہیں دردِ زہ نے ستایا۔ سال کے پیڑ کی ایک جھکی شاخ کو تھاما۔ لیجیے وہ تو بچہ پیدا ہوگیا۔ اور صاحب عجب بچہ تھا۔ پیدا ہوتے ہی چلنے بھی لگا۔ روایت یوں ہے کہ بچے نے پیدا ہو کر اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالی' پھر سات قدم چلا۔ ہر قدم پر کنول کے پھول کھل اٹھے۔ اب سوچیے جس مقام کے ساتھ ایسی روایت وابستہ ہو اسے تو زیارت گاہِ خاص و عام بننا ہی ہے۔ ایک میں بد قسمت تھا کہ کھٹمنڈو کو چھوڑ کر واپس ہونے لگا تھا۔ آدمی کھٹمنڈو جائے اور لومبینی کی زیارت کو نہ جائے اور کپل وستو کا پھیرا نہ لگائے مگر کیا کیا جائے مجبوری۔ مسافروں کی بہت مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اور سدھیر' گیتا نجلی' نیلما شیخ' غلام شیخ کو دیکھو کہ لومبینی کے جانے کا پروگرام کس ذوق و شوق کے ساتھ بنا رہے ہیں اور مطلق نہیں سوچ رہے کہ ان کے برابر بیٹھا ایک شخص آتشِ حسد میں جل رہا ہے۔ یہ لوگ جو آج میری دوستی کا دم بھر رہے ہیں کل مجھے فراموش کر کے لومبینی روانہ ہوں گے۔ اور میں لومبینی کو اور

کپل وستو کو دور سے سلام کر کے کراچی جانے والے جہاز میں بیٹھ جاؤں گا۔ خیر کل کی کل دیکھی جائے گی۔ اس خیال سے آج کی مندر یاترا کو کیوں کھوٹا کیا جائے۔

تو صاحبو ہم اپنی یاترا پر چل پڑے ہیں۔ آج ہم نے واقعی کھٹمنڈو کی خاک چھان ڈالی۔ مندروں سے آراستہ اونچی چوٹیوں کو چھوا۔ گلیوں بازاروں کو کھوندا۔ راج دربار گئے۔ ہنومان ڈھوک کی دید کی۔ مگر ٹھہریئے' اس علاقے سے سرسری کیسے گذر جائیں۔ ارے یہ علاقہ کھٹمنڈو کا دل ہے۔ مندروں کا گہوارہ۔ ہنومان ڈھوک آنے سے پہلے ہی ہم نے ٹیکسی کو رخصت کیا اور چلے بھرے بازار میں سٹ پٹ کرتے۔ بازار میں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ مگر یہ کھوے نیپالیوں کے کم اور مغربی ٹورسٹوں کے زیادہ تھے۔ اور اس بازار سے گذرتے ہوئے وہ بھی دیکھ لیا جو ابھی تک اس شہر میں نہیں دیکھا۔ نیلم نے اصل میں اس طرف میری توجہ دلائی تھی۔ "انتظار صاحب' یاں مجھے کوئی بھکاری نظر نہیں آرہا۔"

میں نے غور کیا۔ واقعی شہر کے کسی نکڑ پر ہم نے کسی مانگنے والے کو نہیں دیکھا۔ مگر ہنومان ڈھوک کے قریب میں آکر دیکھ لیا۔ عجب مانگنے والا تھا۔ ایک لنگوٹی کے سوا بدن لباس سے آزاد' داڑھی اور سر کے بال الجھے ہوئے' گلے میں اژدہا۔ اگر انگ بھبھوت مل لیا ہوتا تو اس پر شوجی کا گمان ہوتا۔ اپنے اژدہا کے ساتھ جس دکان میں داخل ہوتا فوراً "عقیدت مند نذرانہ پیش کرتے۔

تو لیجئے یہ دربار چوک آگیا۔ دربار کے دروازے کے عین برابر ہنومان جی کی مورتی لالوں لال کھڑی ہے مگر تجریدی رنگ لیے ہوئے ہے کوئی واضح شکل نہیں۔ بس سمجھ لو کہ یہ ہنومان جی ہیں۔ سامنے کرشن مندر ہے۔ اور یہ جہاں تہاں سادھو سنت کھڑے ہیں۔ یہ مورتیاں ہیں یا جیتے جاگتے آدمی۔ حرکت تو بالکل نہیں کر رہے۔ بس جیسے زمین سے چپکے ہوئے ہیں۔ ایک سادھو قلابازیاں کھا رہا ہے اور ٹورسٹوں سے داد اور دان وصول کر رہا ہے۔

تھوڑا آگے چلو اور کماری کو دیکھ لو۔

جیتی جاگتی ننھی دیوی۔ یہ ننھی دیوی کون ہے۔ یہ اٹھارھویں صدی کے بیچ کا واقعہ ہے۔ راجہ جے پرکاش مل نیپال میں راج کرتا تھا۔ ایک رات عجب گھڑی آئی کہ رانی نے اعلان کر ڈالا کہ میں جگت ماتا ہوں۔ راجہ نے شردھا سے سر جھکا دیا۔ لیکن اگلے دن اس نے ایک ننھی لڑکی کو دیکھا کہ اسی لہجہ میں اعلان کر رہی تھی کہ میں جگت ماتا ہوں۔ راجہ کو اس پر سخت غصہ آیا حکم دیا کہ یہ لڑکی شہر سے نکل جائے۔ لیجئے نکل گئی۔ مگر اگلے دن کیا ہوا۔ راجہ کو احساس ہوا کہ اس سے کوئی بڑا پاپ ہو گیا ہے۔ لڑکی کو جھٹ پٹ بلوایا اور بھرے دربار میں اس کے آگے ماتھا ٹیک دیا۔ حکم دیا کہ ہمارے راج محل کے پاس اس کے لیے ایک شان دار گھر تعمیر کیا جائے۔ ننھی لڑکی کو اس میں رکھا گیا۔ سال کے سال تیوہار منایا جاتا اور راجہ ننھی جگت ماتا کے سامنے سیس نواتا۔

مگر ایک دوسری روایت بھی ہے جو ایک الگ کہانی سناتی ہے۔ کہتے ہیں کہ راجہ نے یعنی اسی راجہ جے پرکاش مل نے کوئی ایسی حرکت کی کہ وہ جو نیپال پر کرپا کرنے والی دیوی تھی تلجا بھوانی وہ ناراض

ہو گئی۔ وہ حرکت کیا تھی۔ اصل میں تلجا بھوانی ایک سندر ناری کے روپ میں راجہ کے پاس آیا کرتی۔ پھر دونوں مل کر چو سر کھیلتے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ راجہ اس کی سندرتا پر ایسا موہت ہوا کہ دست درازی کر بیٹھا۔ بس پھر کیا تھا۔ دیوی نے تاؤ کھایا اور غائب ہو گئی۔ راجہ نے اپنا سر پیٹ لیا کہ اس نے دیوی کا اپمان کر دیا۔ کتنا اس نے انتظار کیا۔ پھر دیوی نے اسے درشن نہیں دیے۔ ہاں ایک آواز سنائی دی کہ راجہ تیرے دن پورے ہوئے۔ اپنے پاپ کا اپائے چاہتا ہے تو ایسا کر کہ کسی ایسی بالی عمر والی لڑکی کی پوجا کر جس نے کوئی پاپ نہ کیا ہو۔

نیپال کے نواریوں میں یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ لڑکی اس عمر تک جس عمر تک اسے ماہواری نہیں آتی پوتر ہوتی ہے۔ تو اب رسم یہ پڑی کہ کسی پاک گھرانے سے بچی کا انتخاب کیا جائے۔ اور شاکیہ گھرانے سے پاک گھرانا کون سا ہو گا کہ مہاتما بدھ اسی گھرانے سے تھے۔ تو شاکیہ خاندان سے جو بدھ خاندان ہے تین چار برس کی کسی بچی کو انتخاب کیا جاتا ہے۔ ہنومان ڈھوک والے راج محل میں کسی کوٹھری میں جہاں اردگرد خون میں لت پت ڈراؤنی مورتیاں ہوتی ہیں اسے بند کر دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اس عالم میں خوف کا شکار نہ ہو تو بس پھر وہ کماری کا مرتبہ پائے گی۔ اپنے ماں باپ سے دور پروہت کی نگرانی میں دیوی بن کر رہے گی۔ راجہ پر جا سب اس کے سامنے سیس نوائیں گے اور جب تک اسے ماہواری نہیں آتی اس کی پوجا کرتے رہیں گے۔

ننھی دیوی جی کو دیکھنے ہم بھی گئے۔ زینے پر چڑھنے والے تھے کہ ایک نوٹس نظر آیا کہ غیر مذہب والا دیوی کے درشن نہیں کر سکتا۔ اب کیا کریں۔ مگر سدھیر اور گیتا نخلی جو ساتھ تھے بس ہمت کر کے سیڑھیوں پہ قدم رکھا اور زن سے اوپر مگر وہاں دیکھا کہ سنگھاسن خالی پڑا ہے دیوی جی غائب ہیں۔

وہاں جو پنڈت پروہت تھے سدھیر نے ان سے کچھ مذاکرات کیے اور انھیں شیشے میں اتارا۔ لیجیے ننھی دیوی ترت پھرت آئی اور سنگھاسن پہ بیٹھ گئی۔ مگر دیوی والا جو روایتی بانا ہوتا ہے وہ اس وقت تن پر نہیں تھا۔ بہرحال دیوی کو دیکھ لیا۔ تھوڑی دیر سنگھاسن پہ بیٹھ کر کے دور سے آنے والوں کو درشن دیے اور پھر پھرتی کے ساتھ اٹھ کر پردے میں چلی گئی۔

لیجیے دیوی کے درشن ہو گئے۔ اب ہم ہنومان ڈھوک سے نکلتے ہیں اور چلتے ہیں سوئمبھو ناتھ مندر کی طرف، مگر پہاڑی پہ چڑھتے چلے جا رہے ہیں اور مندر اب آتا ہے نہ تب آتا ہے۔ کتنی اونچائی تک تو ٹیکسی گھوم گھام کر لے گئی تھی۔ اب پیدل کی چڑھائی ہے۔ ایک مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک ستون کھڑا ہے۔ اس پر آنکھیں بنی ہیں کہ چاروں سمت پوری کائنات کو دیکھ رہی ہیں۔ بدھ جی کی آنکھیں ہم سمجھے کہ مندر آ گیا۔ پتا چلا کہ اصلی مندر تو ابھی بہت اوپر چڑھ کر آئے گا۔ سو پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔

جب اونچی چوٹی پہ پہنچے تو سچ مچ خدا یاد آ گیا۔ ہم تو ڈھیر ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ صاحب یہ بدھ مندر ہے اور کہتے ہیں کہ دو ہزار سال پرانا ہے۔ کھٹمنڈو سے تین میل پرے ستر میٹر اونچی ایک پہاڑی پر ٹکا ہوا ہے۔ کلس پر تانبے کا ملمع ہے۔ دھیرے دھیرے کر کے ہوش آیا۔ پہلے ایک دو بندر دکھائی دیے۔ پھر اکا

دکا کتنا۔ ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ اتنے مندر دیکھے مگر بندر نظر نہیں آیا۔ مندر بلا بندر' کچھ عجب سی بات نظر آئی۔ پہلی بار سونمبھو مندر میں بندر کی صورت دکھائی دی۔ مگر یہ بندر کچھ زیادہ گرم جوش دکھائی نہیں دیتے تھے۔ بس جیسے مندر میں ہونے کی رسم پوری کر رہے ہیں۔ پھر دیکھا کہ ایک عورت اس گاؤ دم ستون کا جس پر تانبا رنگ کلس جھلملا رہا تھا طواف کر رہی ہے اس طور سے کہ ہر قدم پر جھکتی ہے اور پٹ لیٹ جاتی ہے۔ ایک طرف عقیدت مند آنکھیں موندے بیٹھے ہیں اور بھجن ہو رہے ہیں۔

لیجئے سونمبھو ناتھ مندر دیکھ لیا۔ اب دیکھنے کو کیا رہ گیا۔ ہاں وہ بڑا مندر جسے پشوپتی ناتھ مندر کہتے ہیں۔ وہاں پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ سمجھ لو کہ وہاں ہماری مندر یاترا کا انت تھا۔ مگر یہ مندر باقی مندروں سے الگ نظر آیا۔ یہاں نیپالی رنگ سے زیادہ ہندوستانی رنگ کا غلبہ دکھائی دیا۔ اب دیکھیے ایک تو یہاں صدر دروازے پر نگہبانی کرنے والے شیر نہیں تھے اور نہ لاٹھ پہ بیٹھے گرڑ جی ڈنڈوت کرتے نظر آئے۔ ہاں اندر قدم رکھتے ہی نندی بیل کو دیکھا۔ پیتل کا چمکتا ہوا بیل اور کیا کیم شحیم تھا کہ اس بیچ چار ہاتھی سما جائیں۔ اور لیجیے یہاں بندروں کی بھی ریل پیل ہے۔ جیسے کھٹمنڈو کے سارے مندروں سے یہاں سمٹ آئے ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ سب مندروں کو فراموش کر کے انھوں نے اس ایک مندر کو کیوں اپنی آماجگاہ بنایا ہے۔

ایک بندر کتنی دیر سے بائیں والے درخت سے اتر کر دائیں سمت میں جانا چاہتا تھا لیکن جب بھی وہ قدم بڑھاتا یاتریوں کی کوئی ٹولی گذرتی ہوتی اور وہ ٹھٹھک جاتا۔ لگتا تھا کہ کوئی بہت ضروری کام ہے کہ اگر وہ رستا پار کر کے ادھر نہ گیا تو وہ کام انجام ہونے سے رہ جائے گا۔ اور ضروری کام کیا ہوگا۔ بس یہی کہ ادھر کے درخت کی شاخوں پہ بہت جھول لیے۔ اب ذرا منھ کا مزا بدلنے کے لیے دائیں والے درخت پہ جا کے جھولنا چاہیے۔ مگر نہیں۔ ایک ضروری کام اور تھا۔ ایک دفعہ یاتریوں کا تانتا ذرا ٹوٹا تو اس نے پھریری لے کر دوڑ لگائی اور دم کے دم میں دائیں سمت والے پیڑ پر جھولتا نظر آیا۔ مگر یہ منزلِ مقصود نہیں تھی۔ اصل میں نندی بیل پر سواری کا شوق اسے اس سمت میں لایا تھا۔ اس بڑے بیل پر تو چڑھنا اسے ممکن نظر نہیں آیا۔ ہاں اسی کے آگے جو منی سائز والا نندی بیل بیٹھا تھا اس پر اس نے اچھل کر اطمینان سے سواری گانٹھ لی اور شوجی کے درشن کے لیے جاتے ہوئے یاتریوں سے باقاعدہ مکالمہ شروع کر دیا۔

مندر یاترا تمام ہوئی۔ دن بھر سارا اسی میں کٹا کہ ایک مندر سے دوسرے مندر' دوسرے مندر سے تیسرے مندر۔ کبھی پہاڑی پر چڑھ رہے ہیں' کبھی گھاٹی میں اتر رہے ہیں۔ بس جیسے سارے کھٹمنڈو کو کھوند ڈالا ہو۔ اب رات اتر رہی ہے اور ہم تھکے ہارے ہوٹل اور چھ کے سبزہ زار میں پسرے ہوئے ہیں۔ یہ اس شہر میں ہماری آخری سمجھا ہے۔ کل یار اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ وہ لومبینی کی یاترا پہ نکلیں گے' کپل وستو کی طرف جائیں گے۔ ہم واپس گھر کی طرف۔ سو ان گھڑیوں کو غنیمت جانو اور جتنا ہنس بولنا ہے ہنس بول لو۔ رات بھیگنے لگی ہے اور جیسے رات کے بھیگنے کے ساتھ یاروں کی جان میں جان آ رہی ہے۔

"بس میں اگلے مہینے لاہور آ رہی ہوں۔" گیتا نجلی نے مجھے نوٹس لیا۔

"بہت اچھی بات ہے۔ مگر آنے کا کوئی بہانہ بھی تو ہونا چاہیے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سفر ایسے نہیں ہوتا کہ منھ اٹھایا اور چل کھڑے ہوئے۔"

"اصل میں دلّی میں ایک تھیٹر گروپ ہے۔ اس کا پروگرام یہ ہے کہ لاہور جا کر امراؤ جان ادا' اسٹیج کیا جائے۔ اس کا سکرپٹ میں نے لکھا ہے۔ اس گروپ کو لاہور کی طرف سے invitation ہے۔"

"لاہور کی طرف سے invitation اور اس موسم میں۔ سمجھ میں بات نہیں آرہی۔ لاہور آرٹ کونسل کی طرف سے ان دنوں ایسی کوئی دعوت بھیجی جائے' وہ تو ناممکن ہے۔ پھر آپ کو کس نے دعوت دی ہے؟"

"وہ ہمارے گروپ کی انچارج کو پتا ہے۔ مجھے پتا نہیں ہے۔ بہرحال ہم آرہے ہیں۔"

"اور میں بھی آرہی ہوں۔" نیلما شیخ نے ٹکڑا لگایا۔ "اس پروڈکشن میں' میں نے بھی کچھ حصہ لیا ہے۔"

"جگ جگ آؤ۔ مگر ویزا کا بندوبست ہو گیا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ ہمارے گروپ کی پاکستان کے سفیر سے بات ہو گئی ہے۔"

"گیتانجلی کتنے تیقّن سے بات کر رہی تھی اور میں اس کا منھ تک رہا تھا۔"

اچھا بہت باتیں ہو گئیں۔ رات بھیگ رہی ہے۔ ہماری سبھا آخری دموں پر ہے۔ آخر یاروں کو اپنے ٹھکانے پر بھی تو جانا ہے۔ اس ہوٹل میں تو سارے مہمانوں میں سے بچا کھچا میں ہی رہ گیا ہوں' اور مت پوچھو کہ ان چار یاروں کے رخصت ہو جانے کے بعد اپنا کیا حال ہو۔ جیسے سنسان بیابان میں بھٹکتی کوئی اکیلی جان۔ جیسے یہ ہوٹل نہ ہو کہ ہوٹل میں تو آنا جانا لگا رہتا ہے' چار رخصت ہوئے تو چار نئے آگئے' تو جیسے یہ ہوٹل ہو نہ گھر ہو جہاں ایک دم سے بہت سے مہمان آن اترے تھے اور پھر چار دن کی اِی جی کے بعد ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے ماسوا ایک کے کہ بھائیں بھائیں کرتے گھر میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ وہ تو یہ کہیئے کہ جلدی نیند آگئی۔ دن بھر کا تھکا ہوا جو تھا۔

صبح سویرے آنکھ کھلی۔ فوراً" ہی دریچے کا پردہ ہٹایا کہ باہر کی فضا سے رشتا قایم کیا جائے۔ رات جن کرسیوں پر ہم بیٹھے دنیا جہان کی ہانک رہے تھے اب وہ خالی پڑی تھیں۔ ہری گھاس میں ایک کالی چڑیا اپنی سفید دھاری اور اٹھی دم کے ساتھ پھدکتی پھر رہی تھی۔ اپنے آپ میں مگن جیسے اسے کسی دوسرے دم کی سنگت کی مطلق ضرورت نہ ہو۔ مگر دوسرا دم شاید کہیں آس پاس ہی تھا۔ دوسری چڑیا لپک کر اس کے پاس پہنچتی ہے اور کان میں کچھ کہتی ہے۔ پتا نہیں اس کے کان میں کیا پھونکا کہ فوراً" ہی اڑ گئی بلکہ دونوں ساتھ ہی ساتھ اڑیں۔ یہی کہا ہو گا کہ میدانوں سے کوئی اجنبی آگیا ہے۔ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ چلویاں سے اڑ چلیں۔ تو چڑیاں اڑ گئیں۔ اب میں بالکل اکیلا ہوں اور سامنے وہ کرسیاں جن پر ہم بیٹھے رات گئے تک گھل مل کر باتیں کرتے رہے تھے' خالی پڑی ہیں۔ اور درمیان میں پڑی میز کسی ویٹر نے ابھی تک اسے صاف کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ مگر میں وہاں کیا دیکھ رہا ہوں۔ مجھے جلدی جلدی اپنا سامان باندھنا چاہیے' واپسی کے سفر کی تیاری کروں۔

کھٹمنڈو کو آخری سلام۔ اس کے مندروں کو بندروں کو' دھولی خیل کی پہاڑیوں' گھاٹیوں کو' اسنا نگر کو بھگتا نگر کو اور وہاں حضرت محل کے شکستہ مزار کو۔

☆ ☆ ☆

داؤد رہبر

تین ہفتے پاکستان میں

میرے عزیز بھانجے نوید ریاض صاحب بڑے زندہ دل بھانجے ہیں۔ سنگیت اور ناٹک دونوں سے ان کو شغف ہے۔ ہر سال ایک ڈراما انگریزی کا تختاتے ہیں اور اس میں اداکار ہو کر خود بھی اسٹیج پر آتے ہیں، ڈراموں کی ہدایت کاری بھی کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، یہ ضیا محی الدین کے بھانجے ہیں براہ راست یعنی یہ ضیا محی الدین کی بہن ثریا کے بیٹے ہیں۔ ہمارے بھی یہ بھانجے ہیں لیکن ذرا سا گھوم کر، وہ یوں کہ ضیا اور ثریا ہمارے تایا ابا کی اولاد ہیں۔

قہقہہ نوید ریاض کا کھرا اور زوردار ہوتا ہے یعنی ان پر اچھا لطیفہ ضایع نہیں ہوتا۔ یہ ان عزیزوں میں سے ہیں جن کے پاس بیٹھتے ہی میری طبیعت سُر میں آجاتی ہے۔

انھوں نے یہ مہربانی مجھ پر کی کہ میری حیات کے اواخر میں لاہور سے دعوت نامے مجھے بھجوائے، پہلے دسمبر ۱۹۹۳ء کی دو تقریبوں کے لیے اور پھر نومبر دسمبر ۱۹۹۶ء کی چند تقریبوں کے لیے، ان کی تجویزوں کی تائید پروفیسر غزالہ عرفان صاحبہ نے کی، آپ سنگیت کے مربی حیات احمد خاں صاحب کی دختر ہیں، پنجاب یونی ورسٹی اور لمس (LUMS) (۱*) میں فلسفہ کی پروفیسر ہیں۔ پاکستان فلوسوفیکل کانگریس کی جنرل سیکرٹری اور آل پاکستان میوزیکل کانفرنس کی جوائنٹ سیکرٹری ہیں۔

یکم دسمبر ۱۹۹۳ء کو موصوفہ نے الحمرا ہال میں میری گلوکاری کا مظاہرہ کرایا اور دوسرے روز فلوسوفیکل کانگریس کے زیر اہتمام مجھ سے پروفیسر قادر میموریل لیکچر دلوایا۔ اس لیکچر کا عنوان تھا "ٹوئن بی کے فلسفہ تاریخ میں بعض جذباتی باتیں۔" لیکچر میں یہ عرض کیا گیا کہ باوصف وسعت علم پروفیسر ٹوئن بی کی فہم مذاہب عالم کے بارے میں سطحی ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف "مذہب ایک مؤرخ کے زاویہ نظر سے" (۲*) کی ایک عبارت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا ذکر اہانت کے ساتھ کیا ہے۔ اسے فرار قرار دے کر اپنی کج فہمی اور کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ ہندومت کی تنقیص میں بھی موصوف کی فہم کی کوتاہی ظاہر ہے۔ ہندو اپنے دیوتا مہادیو شو مہاراج کو تباہ کار کہتے ہیں اس لیے کہ وہ کل جگ والی گندی دنیا کو تباہ کرتا ہے۔ پروفیسر ٹوئن بی نے پوری بات نہ سمجھی اور شو مہاراج کو ایک بھوت قسم کی شخصیت جان لیا حالاں کہ شو تو ایک جوگی مزاج دیوتا ہے اور ہندو مساکین کا ہر دل عزیز معبود ہے۔ (۳*)۔

نومبر ۱۹۹۶ء میں لاہور کی زیارت لمس کی دعوت سے نصیب ہوئی۔ جب دعوت نامہ موصول ہوا تو میں نے اسے پڑھ کر کہا۔

عمر بھر یار نے چھونے نہ دیا ہاتھ اپنا
ہائے کس عمر میں ہے لمس کی دعوت آئی

گفت و شنید کے اوائل میں عزیزم نوید ریاض نے جب لمس کے سربراہ ڈاکٹر وسیم اظہر صاحب کے آگے مجھے مدعو کرنے کی تجویز رکھی تو ڈاکٹر صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں لاہور آ کر لمس میں ایک کورس عالمی مذاہب کے بارے میں تقابلی مطمع نظر سے پڑھاؤں۔ ان کی یہ خواہش مجھ تک پہنچائی گئی تو میں نے جواب دیا کہ جس آزاد خیالی کے ساتھ یورپ اور امریکا کی یونی ورسٹیوں میں مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا اور کرایا جاتا ہے پاکستان تو کیا بھارت کی یونی ورسٹیاں بھی ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سارے بھارت میں صرف چنڈی گڑھ کی پنجابی یونی ورسٹی میں ایک پروفیسری تقابلی تحقیق ادیان کی سکھوں کی ہمت سے قایم ہوئی ہے جو گورو گوبند سنگھ چیئر کہلاتی ہے۔ تقابلی چنے چبانا آسان نہیں۔ اس چیئر پر آج کل کون صاحب فائز ہیں اور مذاہب پر کس ذہنیت کے ساتھ لیکچر دیتے ہیں مجھے معلوم نہیں۔ کاش چنڈی گڑھ جا سکوں اور ان کے چند لیکچر سن سکوں۔

بھارت کی کسی اور یونی ورسٹی میں ایسی تقابلی کرسی موجود نہیں۔ اگر قایم ہو جائے تو سوال اٹھے گا کہ کرسی نشین کوئی پنڈت ہو یا مولانا۔ اس کرسی پر بیٹھ کوئی پنڈت قرآن مجید اور انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کرام پر لیکچر دے یا کوئی مولانا ویدوں اور شاستروں اور اوتاروں اور بھگتوں پر بے لاگ لیکچر دیں' تصور میں نہیں آسکتا۔

ادھر یورپ اور امریکا میں نقشا ہی اور ہے۔ مسیحی اور یہودی اور دہریے محققین بے باکی کے ساتھ شرق اوسط' ہندوستان' چین اور جاپان اور دیار مغرب کے مذاہب کی ریسرچ اور تدریس میں مشغول ہیں۔ ان میں سے کسی کسی پروفیسر کی تحقیق اور تدریس میں تعصب چور دروازے سے داخل ہو جاتا ہے لیکن بہت سے روشن دماغ پروفیسر روادار بھی ہیں۔ بہرحال ذہنی آزادی کی فضا کے یہاں موجود ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لمس کے سربراہ ڈاکٹر وسیم اظہر صاحب کو جب عزیزی نوید ریاض صاحب نے بتایا کہ مجھے تقابلی چنے چبانا منظور نہیں تو ڈاکٹر صاحب نے میرے عزیز سے کہا اچھا تو پھر معلوم کرو کہ تمھارے ماموں یہاں آکر کن موضوعوں پر لیکچر دینا چاہیں گے۔ پیغام مجھے ملا تو میں نے سوچا کیوں نہ اپنے دیس کی کلاسیکل موسیقی کی تفہیم کا ایک پروگرام لمس کے طلبہ کے لیے تجویز کروں۔ میں نے اس کا خاکہ بنا کر نوید ریاض صاحب کو بھیجا۔ تجویز یہ تھی کہ دو دو گھنٹوں کی چار نشستیں رکھی جائیں۔ ان میں سے دو وقت سحر اور دو شام کو تاکہ صبح اور شام دونوں وقتوں کی راگنیاں سمجھائی جاسکیں۔ پانچویں نشست میں صرف میرا گانا ہو' درس اس میں شامل نہ ہو۔ پانچوں نشستوں کے لیے سازندوں کی سنگت درکار ہوگی۔ طبلہ نواز' سارنگی نواز' ستار نواز اور ہارمونیم نواز' ہر نشست میں یہ موجود رہیں تاکہ سنگت کا حساب سمجھایا جاسکے۔

میں نے خط میں بتایا کہ بیس برس بوسٹن یونی ورسٹی میں' میں نے سنگیت کا ایک کورس اپنی تدریس

میں شامل رکھا۔ اس تجربے سے فایدہ اٹھا کر میں چار نشستوں میں لمس کے طلبہ کا تعارف اپنے ہاں کے سنگیت سے انشاء اللہ ایسا کرادوں گا کہ آیندہ سنگیت سبھا میں وہ کلاسیکل موسیقی حیران ہو ہو کر نہ سنیں گے سمجھ کر سنیں گے اور اچھی طرح اس کا مزا لیں گے۔

اس خط کا جواب آیا کہ لمس کے احاطے میں سنگیت کے درس کا یہ پروگرام مداخلت بے جا بخانہ دیگر والی بات ہوگی۔ کوئی اور موضوع تجویز کیجیے۔ یہ جواب پا کر میں نے آہ بھری اور سوچتا رہا کہ مہذب ملک کے نوجوان اپنے دیس کی موسیقی کے اصول سے نابلد رہیں کیسی افسوس کی بات ہے۔ کون سی تال بج رہی ہے۔ بول بانٹ، خالی بھری اور سم کا حساب کیا ہے، آستھائی کسے کہتے ہیں اور انترہ کسے، خیال کے بول کیا ہیں، خیال اور ٹھمری کا فرق کیا ہے۔ ٹھمری کے خاص راگ کون سے ہیں۔ بیچ بیچ میں سرگم کیوں گائے جاتے ہیں۔ گویا کس گھرانے کے اسلوب میں گا رہا ہے؟ ان باتوں کی واقفیت میں آخر خرابی کیا ہے؟ سماع تو بہرحال ہو ہی رہا ہے۔

موسیقی والی تجویز منظور نہ ہوئی تو میں نے سات موضوع سات لیکچروں کے لیے سوچے اور ڈاکٹر وسیم اظہر صاحب کو لکھ بھیجے، انھوں نے سارے موضوع پسند فرمائے اور مجھے لکھا کہ ان میں سے پہلے پانچ لیکچر "اخلاقیات اور اقدار" کے اس کورس میں شامل کیے جاسکتے ہیں جو پروفیسر غزالہ عرفان کے سپرد ہے۔ آخری دو موضوع کے بارے میں انھوں نے تجویز فرمائی کہ ان پر دو پبلک لیکچر دیے جائیں۔ موضوعوں کی فہرست یہ تھی۔

کلاس روم کے لیکچر

(۱) بادشاہی دور میں خلایق کے لیل و نہار
(۲) ہمارے زمانے میں جمہوری اقدار اور شاہانہ اقدار کا خلط ملط
(۳) مذاہب عالم آج کن آزمایشوں سے گزر رہے ہیں
(۴) خوبیِ کردار سے صرف عظیم شخصیتیں ہی متصف نہیں ہوتیں
(۵) شخصیتوں میں دلکشی کن اوصاف سے آتی ہے

پبلک لیکچر

(۶) کون سا ادب سب سے بڑھ کر متمدن انسان کے مطالعہ کے لایق ہے
(۷) اخلاقیات اور اقدار

لمس کا تعلیمی پروگرام تجارت سے متعلق ہے۔ یہاں طلبہ کو تاجرانہ بندوبست کے جدید ترین اصول سکھائے جاتے ہیں۔ پروفیسر غزالہ عرفان صاحبہ نے ایک روز مجھ سے کہا لمس کا سانچہ امریکی یونی ورسٹیوں والا ہے جو ساز و سامان امریکی یونی ورسٹیوں میں مہیا ہیں وہ سب یہاں بھی مہیا کیے گئے ہیں اور

تعلیم کا معیار بھی ویسا ہی ہے۔

لمس کے مہمان خانے میں دو ہفتے گزار کر میں پروفیسر غزالہ عرفان کی کہی ہوئی بات کا قائل ہو گیا۔ البتہ یہ کہوں گا کہ اس احاطے کی فضا امریکی یونی ورسٹیوں اور کالجوں کی فضا سے بہرحال مختلف ہے۔ یہاں تعلیم مخلوط ضرور ہے لیکن اس سے کون انکار کرے گا کہ یہاں لڑکوں کے مراسم لڑکیوں سے امریکا کے تعلیمی اداروں والے نہیں۔ سب طالبات شلوار کرتے اور دوپٹے میں ملبوس یہاں دیکھنے میں آئیں۔ لڑکے سب قمیص پتلون پہنے ہوئے دکھائی دیے لیکن لڑکیوں کی جانب ان کے رویئے میں حرمت کی کوئی کمی نظر نہ آئی۔ امریکی دانش گاہوں کے احاطوں میں بے خواری عام ہے۔ لمس میں طلبہ کی بے خواری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ذریعۂ تعلیم، لمس کے تمام کورسوں میں انگریزی ہے۔ کلاس روم میں بحث اور سوال جواب سب انگریزی میں ہوتے ہیں۔ کلاس روم سے باہر نکل کر پنجابی بولی جاتی ہے یا اردو اور شامی کباب کھائے جاتے ہیں۔ میں نے بھی لیکچر سب انگریزی میں دیے۔ پہلے دو لیکچر (٭٭) میں لکھ کر لایا تھا کیوں کہ ان کے موضوع وسیع تھے اور مآخذ کے حوالوں کے بغیر ان پر کچھ کہنا ممکن نہ تھا اور اقتباسات ان دونوں میں لازم تھے۔ یہ لکھے ہوئے لیکچر میں نے کلاس کے آگے پڑھ دیے۔ باقی سارے لیکچر برجستہ دیے گئے۔

سات لیکچروں میں 'میں نے کیا کہا' بالتفصیل بتانے لگوں تو کہانی کی بڑھت میں رکاوٹ ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ ان لیکچروں کا ایک کتابچہ الگ بنے۔ تاہم اجمال کے ساتھ اتنا بتا دینا برمحل ہو گا کہ لیکچروں کے موضوع کیا سوچ کر چنے گئے۔

پہلا لیکچر: یہ لیکچر بادشاہی دور پر تھا۔ اس کا منشا یہ بتانا تھا کہ بادشاہی دور میں شائستگی کے گہوارے بعض منور بادشاہوں کے دربار تھے۔ وہ دور ختم ہوا تو خود بدولت لوگ اب سیٹھ ہی رہ گئے ہیں۔ سیٹھ خود شائستہ نہ ہوں گے تو وہ شائستگی کی پاسبانی کیسے کریں گے؟

دوسرا لیکچر: اس کا عنوان تھا "ہمارے زمانے میں جمہوری اقدار اور شاہانہ اقدار کا خلط ملط۔" یہ الجھاؤ تو آج دنیا بھر کے ممالک کی معاشرت کے ہیں۔ خود ہندوستان اور پاکستان میں ان کے شواہد ہمارے سامنے ہیں۔ پچاس منٹوں کے لیکچر کے لیے میں نے گزشتہ سو سال کی تاریخ ایران کو بہ طور مثال چنا۔ بیس ویں صدی کے آغاز (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۹ء) میں محمد علی شاہ قاچار نے ایران کے جمہوری انقلاب سے کس ہٹ دھرمی کے ساتھ جنگ لڑی اور کس بے شرمی سے مجلس ملی کے بنائے ہوئے آئین کی اہانت کی اور کیسے قاچاریوں کے بعد دو پہلوی شاہوں نے مجتہدین کی جمہوری سپرٹ کا زور توڑنے کو اہل ایران کے دلوں میں آریائی جذبہ ابھارنے کی کوشش کی اور قرآن مجید کو بالائے طاق رکھنے اور اس کی بجائے شاہ نامہ کی تلاوت کا سبق دیا۔

تیسرا لیکچر: عالمی مذاہب جن آزمائشوں سے گزر رہے ہیں اس لیکچر میں ان کا بیان منظور تھا۔ آبائی

دین سے اہلِ روس اور اہلِ چین کی برگشتگی' اتاترک کی قیادت میں تعلیم یافتہ ترکوں کا دین سے بے زار ہو جانا' یورپ اور امریکا میں رندانہ اطوار کی وبا اور وہاں مسیحیت سے برگشتہ طبقات میں ہندوؤں کے اساطیر اور گوتم بدھ کی دہریت کی مقبولیت' ذہنی بیماریوں اور ان کے معالج نفاس (*۵)' نفاسوں کے انداز فکر کا زور پکڑنا' منشیات کے استعمال کی وبا' گرہست کے احترام کا تنزل۔

چوتھا لیکچر: اس سے یہ جتانا منظور تھا کہ عظیم شخصیتوں کی خوبیِ کردار کے اعلان تو چار سو ہوتے رہتے ہیں لیکن ان غیر معروف اشخاص کے حسن اخلاق کا اعتراف کم ہی ہوتا ہے جن کے دم سے محلے کی برکت ہوتی ہے۔ جمہوری زمانے میں یہ تغافل افسوس ناک ہے۔

پانچواں لیکچر: اس میں' میں نے لمس کے طلبہ کی توجہ آداب محفل اور فن گفتگو کی اہمیت کی طرف دلائی اور اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ آداب محفل اور فن گفتگو اسلامی فنون لطیفہ میں سرفہرست ہیں۔ تعلیم صرف کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی کی ہو تو یہ ہنر حاصل نہیں ہوتے۔ دیکھ لینا ٹیکنالوجی تمھیں تھکا دے گی۔ درد سر کے حال میں انسان اچھی گفتگو پر قادر نہیں ہوتا۔ ٹیکنالوجی میں الجبرا بہت ہے۔ عمر خیام الجبرا کا ماہر تھا۔ الجبرا کی ورزش کے ساتھ رباعیاں کہنے کا لطف بھی اٹھاتا تھا۔ ادبیات اور موسیقی سے لگاؤ رکھو کہ طبیعتوں میں شگفتگی بھی رہے اور صحبتِ دوستاں میں بور ہونے سے بچے رہو۔ اچھی تفریح شائستہ گفتگو سے حاصل ہوتی ہے اور شخصیت میں دلکشی اسی سے آتی ہے۔

دو پبلک لیکچر

چھٹا لیکچر: اس میں سوانح عمریوں کی اہمیت جتائی گئی۔ کسی بزرگ کی سوانح عمری پڑھنے سے اس بزرگ کی روح سے رابطہ قائم ہوتا ہے۔ متعدد سوانح عمریاں پڑھنے سے ذہن آباد ہو جاتا ہے۔ ناول اپنی جگہ ہے لیکن ناول خوانی اور سیرت خوانی کی نفسیات اپنی اپنی ہیں۔ افسانوی کرداروں کے بارے میں قاری کا شعور پوچھتا رہتا ہے کس حد تک یہ کردار من گھڑت ہیں اور کس حد تک حقیقی۔ اور یہ کہ کہانی میں افسانہ نویس نے احوال واقعی میں احوال خیالی کی ملاوٹ کتنی کی ہے؟ افسانہ میں احوال واقعی کتنی ہی صداقت سے کوئی لکھنے والا بیان کرے یہ بہرحال "نام بدل" کہانی رہے گا۔ گودان کے ہوری کی روح سے ہمارا رابطہ محکم بنیاد پر کیسے ہو جب کہ ہمارا من کہتا رہے گا ہوری ایک خیالی کردار ہے۔ سوانح عمری پڑھتے ہوئے سیرت سے شناسائی کا عالم اور ہوتا ہے۔ سیرت اس میں کھلی ہوئی حقیقت ہو کر تجربے میں آتی ہے۔ ہوری نام کا ایک کسان اگر ایک فرضی شخص نہ ہوتا اور منشی پریم چند اس کی سوانح عمری لکھتے تو اس سوانح عمری کو پڑھ کر ہماری دوستی ہوری کی روح سے ہو جاتی۔ فرضی شخص کی روح بھی فرضی ہوگی اور فرضی روح سے ہماری دوستی بھی فرضی ہی رہے گی۔

ساتواں لیکچر: آفرینش کائنات اور حیات بعد ممات کے تصورات بڑے بڑے مذاہب میں کیا ہیں؟ اس

لیکچر میں مختصراً" اس سوال کا جواب پیش کیا گیا۔

لمس کے مہمان خانے میں مجھے ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ لاہور میرا مولد ہے' وہاں میرے کئی اقربا اور احباب کے گھر ہیں۔ ان میں سے کئی گھر ایسے ہیں جن میں سے کسی کو بھی اپنا گھر سمجھ کر میں اس میں قیام کر سکتا تھا لیکن عزیزوں کے گھروں میں اوقات پر کنٹرول مشکل ہو جاتا ہے۔ خلوت کا امکان ان میں کم ہوتا ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ گپ کی نشست آدھی رات سے پہلے ختم ہو جائے۔ لمس کے مہمان خانے میں قیلولہ بلا ناغہ میسر آیا۔ شب زندہ داری پر وہاں مجبور کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ستر سال کی عمر کو پہنچ کر راتوں کی دھما چوکڑی میں شریک ہونے کو کس کا جی چاہتا ہے۔

طعام کی سہولت بھی یہاں بہترین رہی۔ مہمان خانے سے چار قدم پر طلبہ کا ڈائننگ ہال ہے۔ ناشتا اور دو وقتوں کا کھانا اکثر وہیں کھایا۔ لیکچر اس تعلیم گاہ میں سب انگریزی میں دیے جاتے ہیں لیکن طلبہ ڈائننگ ہال میں پلاؤ' قورمہ' نان اور پراٹھا کھا کر تازہ دم رہتے ہیں۔ بہ قول اکبر۔

دھن ویس کی یہ اک دن گاتا تھا اک دہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

میں نے لمس کے طلبہ کو قدرے اداس پایا۔ اس اداسی کی ایک بدیہی وجہ یہ ہے کہ اپنے ماں باپ کے ان لاڈلے بیٹوں اور بیٹیوں پر آنا" فانا" ٹیکنالوجی سوار ہو گئی ہے۔ کمپیوٹر والی ٹیکنالوجی' الجبرا کی پابند ہے۔ بزم مشاعرہ کے خوگروں کو الجبرا سیکھنا پڑا ہے۔ جبرا" الجبرا فان مع الیسر عسرا۔ ٹیکنالوجی کے شکنجے میں آکر دماغ پھر باغ نہیں رہتا' مشین ہو جاتا ہے۔ میں نے امریکا کی صحبتوں کو آزما کر کئی برس پہلے کہا تھا۔

فرنگی دوست! اس صحبت میں تو خوش ہے تو میں ناخوش
تری باتوں میں انجن ہے' مری باتوں میں گلشن ہے

یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ٹیکنالوجی سے باز رہنے کا سبق دے رہا ہوں۔ ٹیکنالوجی سیکھے بغیر اب کوئی قوم فعال قوموں سے قدم ملا کر نہ چل سکے گی۔ لیکن آثار کہتے ہیں کہ دانش گاہوں کے نصابوں میں ٹیکنالوجی کا تفوق طلبہ کو خوش گفتاری کی صلاحیت سے بے بہرہ کر دے گا۔ تیس برس امریکا کی درس گاہوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد میں نے یہ بات کہی ہے۔ میں نے پانچویں لیکچر میں لمس کے طلبہ کے آگے ان خیالات کا اظہار کیا تو اسے سنتے ہوئے ان کے قیافے کہہ رہے تھے۔

علاج درد سر تجھ سے مسیحا ہو نہیں سکتا
کہ کمپیوٹر سے چھٹکارا ہمارا ہو نہیں سکتا

لمس کے سربراہ ڈاکٹر وسیم اظہر صاحب سے میری مختصر ملاقات ان کے دفتر میں ہوئی۔ انھوں نے فرمایا "مارکٹنگ (*٦) کے کورس میں ابھی ایک لیکچر ہو گا' اسے جا کر سنئے۔ لمس کے طریق تعلیم کا آپ کو اس سے کچھ اندازہ ہو گا۔" میں تعمیل فرمائش کو اس کلاس روم میں جا بیٹھا۔ لیکچر امریکا کے ایک کارخانے کی ترقیوں کے بارے میں تھا۔ اس کارخانے کا بنا ہوا دہی سارے امریکا میں فروخت ہوتا ہے *٧

اس کارخانے کی تاریخ پر ایک مقالہ طلبہ گھر سے پڑھ کر کلاس روم میں آئے تھے۔ پروفیسر صاحب چاک لے کر بلیک بورڈ کے پاس کھڑے طلبہ سے سوالات پوچھتے جاتے تھے اور جواب سن سن کر بلیک بورڈ پر الجبرا قسم کے فارمولے لکھتے جاتے تھے۔ اس قدر فارمولے انھوں نے خرید و فروخت اور نفع نقصان کے لکھے بورڈ پر مزید کچھ لکھنے کو جگہ نہ رہی۔

دی کو الجبرا میں مبتلا دیکھ کر میں بے حد محظوظ ہوا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا۔ طلبہ کی دیکھا دیکھی میں نے ہاتھ کھڑا کیا کہ اجازت ہو تو میں بھی کچھ کہوں۔ پروفیسر صاحب نے کہا۔ "کہیے۔" میں نے کہا۔ "اس کمپنی کو راتبا بنانے کا نسخہ کیوں نہ بتایا جائے؟" میرا ریمارک الجبرا سے بہت ہٹ کر تھا۔ پروفیسر صاحب نے جواب میں کچھ نہ کہا، مسکرائے تک نہیں، طلبہ کے دھیان میں بھی میرا سوال مخل ہوا۔ رات کو تکیے پر سر رکھ کر پروفیسر صاحب کو میرا "بے ہنگم" سوال یاد آیا ہوگا۔

لمس کے مہمان خانے کے چودہ روزہ قیام کے دوران میں میری بیوی کے چھوٹے بھائی خالد غیاث میری خاطرداری کو وہاں پہنچتے رہے، لمس کا احاطہ شہر کے پرانے علاقے سے خاصا دور ہے۔ یہ اپنی کار لے کر آتے نہ رہتے تو بار بار ٹیکسی منگانی پڑتی۔ تین چار مرتبہ یہ دوپہر کے کھانے کے لیے مجھے جم خانے لے گئے جو اگلے وقتوں میں جم خانہ کلب بھی تھا اور جم خانہ کلب بھی۔

جم خانہ کلب کی رکنیت شہر کے باحیثیت لوگوں ہی کو حاصل ہے۔ متموّل تاجر اور گورنمنٹ کے بارتبہ صاحبان اور مشہور فن کار کھانے کے اوقات میں یہاں آتے ہیں۔ سارے رکن ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ایک مظاہرہ یہاں دیکھا جو یورپ اور امریکا میں کم ہی دیکھنے میں آیا۔ وہ یہ کہ جوں ہی دو رکن آمنے سامنے آئے جھٹ گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہو گئے۔ معانقہ کو پنجابی میں جپھی کہتے ہیں اور معانقہ کرنے کو جپھی پانا یعنی جپھی ڈالنا' جم خانہ کلب میں جپھی کا سلسلہ دن بھر جاری رہتا ہے۔ ایک روز میں نے دو صاحبوں کو صبح گیارہ بجے جپھی ڈالتے دیکھا' اسی روز خالد میاں مجھے پچھلے پہر پھر وہاں لے گئے تو پھر وہی دو صاحب جپھی میں یک جان و دو قالب دکھائی دیے۔ میں نے خالد سے کہا کیا ایک دن میں ایک دوست سے ایک جپھی کافی نہیں؟ خالد میاں نے ہنس کر کہا۔ "نہیں۔" "اس لیے کہ خالد سے زیادہ جپھی آمادہ انسان کوئی ہے ہی نہیں۔ بیسیوں گھر لاہور میں ایسے ہیں جنھیں اپنا گھر سمجھنے میں خالد میاں کو کوئی پس و پیش نہیں۔ ان گھروں کے اندرون تک ان کی رسائی بلا دستک ہے گویا سارا شہر ان کی سسرال ہے۔ جم خانہ کلب میں بعض اغنیا شلوار کرتا پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں اور بعض سوٹ' بوٹ اور نکٹائی میں ملبوس ہو کر۔

خالد میاں دو تین مرتبہ مجھے ایک طعام خانے میں لے گئے جس کے انگریزی نام (*۸) کا ترجمہ اردو میں گاؤں ہوگا۔ اس میں کرسیوں' میزوں والا کمرہ ایک آنگن سے متصل ہے۔ آنگن کے اوپر شامیانہ ہے۔ شامیانے میں دیگیں گرم رہتی ہیں اور کڑھاؤں کڑکڑاتی ہیں۔ طرح طرح کے سالن' اقسام کباب' انواع نان' حلوے' کھیر' فیرنی' موسمی پھل' سب فراہم رہتے ہیں۔ اندر پہنچو اور گھوم پھر کر اپنی

تھالی پر اپنی پسند کی چیزیں ڈالتے جاؤ۔ تھالی خالی ہو جائے تو حسب اشتہا مکرر اسے پر کرلو۔ جو کچھ اور جتنا جی میں آئے کھاؤ۔ بل کا حساب دریافت کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ خالد میاں جانیں ' ہم کیا جانیں۔ یہ ہمیں یہاں لے کر نہ آتے تو ہم یہاں کیوں کر آتے۔ بہنوئی کو کھلا کر خوش ہیں تو ہم کیوں بولیں اور بوا کیوں ٹوکیں۔ ان کا آنا جانا یہاں متواتر ہے۔ نہایت چٹورے آدمی ہیں۔

اعجاز حسین بٹالوی کے ہاں

بحمد اللہ لاہور میں میرے دو اور خاص میزبان موجود ہیں۔ اعجاز حسین بٹالوی اور ضیا محی الدین۔ ان دونوں کے برکت کدوں میں چند شامیں گزاریں۔ اعجاز صاحب پہلے ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے۔ اب شادمان کالونی میں کشادہ کمروں والی کوٹھی بنوا کر اس میں شاد آباد ہیں۔

اس کوٹھی میں دوستوں کی پذیرائی کے لیے ایک "گول کمرہ" ہے۔ مطالعہ کے لیے ایک کشادہ کمرہ الگ ہے جس میں انگریزی اور اردو ادبیات کی کتابیں از فرش تا سقف خوب صورت الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ گھر میں یہ ادیب ہیں اور دفتر میں وکیل' بلکہ نعم الوکیل' موکلوں سے کاروباری گفتگو زیادہ تر دفتر میں کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا دفتر ہائی کورٹ کی عمارت کے قریب ٹرنر روڈ پر ہے۔ قانون کی کتابیں انھوں نے گھر میں نہیں دفتر میں رکھی ہیں۔ مجھ پر ان کی مہربانیوں کا کوئی شمار ہی نہیں۔ امریکا میں جب بھی ان سے ملنے کو جی بے قرار ہوتا ہے ٹیلی فون کر کے ان سے چند منٹ باتیں کرلیتا ہوں۔ مجھے اردو کی اچھی اچھی کتابوں کے عطیے بھیجتے رہتے ہیں۔

ان کے برادر آغا بابر صاحب نیویارک کے قریب ایک بستی میں رہتے ہیں جس کا نام نیری ٹاؤن ہے۔ ان سے فون پر لمبی لمبی گفتگوئیں ہفتہ وار ہوتی ہیں۔ ایک روز میں ان سے کہہ رہا تھا کیسی کیسی مزے دار غیبتیں ہم فون پر کرتے ہیں۔ اگر یہ سب ریکارڈ ہو جاتیں تو ان سے نہایت چٹ پٹی کتاب بنتی۔

ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی مرحوم سے بھی میرا ارتباط رہا۔ میری قلم کاری کی تشویق میں تینوں بھائیوں کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے توسط سے اور بہت سے اچھے دوست مجھے نصیب ہوئے۔

اعجاز صاحب کے گھر میں اب کے زندگی میں پہلی بار حمید نسیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اعجاز سے ان کی قرابت داری بھی ہے۔ ریڈیو کے محکمے میں شرکت کار سے دونوں میں دوستی بھی ہوئی۔ حمید نسیم صاحب کی آپ بیتی پڑھ کر میری ان سے مراسلت شروع ہوئی۔ اس سے دونوں جانب ملنے کا اشتیاق ہوا۔ کراچی سے یہ اپنی نواسی کی شادی میں شرکت کرنے کو اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔ میری آرزوئے ملاقات انھیں معلوم تھی۔ اسلام آباد سے واپس کراچی جاتے ہوئے آپ لاہور میں ٹھہر گئے کہ کچھ وقت مل بیٹھیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ یہ ملاقات اعجاز کے گھر میں ہوئی۔ ان کے رہوار قلم کی دوڑ تو ان کی نگارشوں سے معلوم ہو ہی چکی تھی' اب ان کے پاس بیٹھ کر معلوم ہوا کہ ان کی گفتار بھی تیز ہوتی ہے۔ افکار کے اظہار سے حوادث کے اذکار اور حوادث کے بیان سے پھر سوچ بچار' بے تکان اور لگاتار ایسا

سلسلہ ان کی گفتار کا رہتا ہے۔ حافظہ ان کا آباد ہے اور مطالعہ وسیع' بات سے بات نکالتے چلے جاتے ہیں۔ لاہور میں تین دن گزار کر آپ کراچی چلے گئے۔ وہاں بھی ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

اعجاز کے ساتھ ماڈل ٹاؤن کی سیر

اب ماڈل ٹاؤن کی اس سیر کا قصہ کہنے کو جی چاہ رہا ہے جو اعجاز بٹالوی نے جمعہ کی چھٹی کے روز اپنی موٹر پر بٹھا کر کرائی۔ ماڈل ٹاؤن پہنچنے کا راستا فیروز پور روڈ ہے' فیروز پور شہر تو بھارت کا شہر ہو کر رہ گیا' فیروز پور روڈ لاہور میں باقی ہے۔

خیال زلف بتاں میں نصیر پیٹا کر
نکل کے سانپ گیا ہے' لکیر پیٹا کر

نہر کے کنارے کنارے گلبرگ کی جو سڑک ہے اس پر سے ہوتے ہوئے نہ جانے کون سا موڑ مڑے (کہ اب لاہور کے بیسیوں موڑ میرے لیے ان جانے موڑ ہیں) نہر کے پل پر سے ہم فیروز پور روڈ پر آگئے۔ پھر ایک موڑ مڑے تو اعجاز نے کہا اب ہم پنجاب یونی ورسٹی کے نئے احاطے میں ہیں۔ جمعہ کی تعطیل کی وجہ سے یونی ورسٹی کا احاطہ سنسان پڑا تھا۔ کوئی بھی متنفس اس میں دکھائی نہ دیا' عمارتیں بند اور مقفل پڑی تھیں۔ ایک دوسری سے ہٹ کر' چھٹی کا دن نہ ہوتا تو تعلیمی فضا کا اندازہ ہوتا اور ممکن ہے بعض اساتذہ کو سلام کرنے کا موقع بھی ملتا۔

احاطے کا نقشا خدا جانے کس نے بنایا اور کس کمیٹی نے اسے منظور کیا؟ سچ کیوں نہ کہہ دوں یہ نقشا میرے دل کو نہ لگا۔ مختلف شعبوں کی عمارتیں ایک دوسری سے روٹھی ہوئی معلوم ہوئیں۔ نہ ہی سبزہ زار والی کوئی بات احاطے میں نظر آئی۔ اگر اس کی وجہ استطاعت کی کمی ہے تو سوائے دعائے خیر کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ اس احاطے سے باہر نکلے تو ایک گنڈیریوں والی ریڑی دکھائی دی۔ میں نے اعجاز سے کہا گنڈیریاں لینی چاہئیں۔ اعجاز موٹر خود چلا رہے تھے اور ڈرائیور پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اعجاز نے اس سے کہا چار سیر گنڈیریاں لاؤ۔ گنڈیریاں خریدی گئیں اور ان کا لفافہ موٹر کی پچھلی گدی پر رکھ دیا گیا۔

اس موڑ سے جو ماڈل ٹاؤن کے جے بلاک کا موڑ ہے ہم ماڈل ٹاؤن میں داخل ہوئے۔ دو منٹوں میں گول سڑک آگئی۔ وہاں بسوں کے اڈے پر اگلے وقتوں میں صرف ایک پان بیڑی سگریٹ اور سوڈے کی دکان تھی۔ اب کئی دکانیں ہیں اور یہ چوک بارونق ہو گیا ہے۔ گول سڑک کے حاشیے جو میری یاد میں تھے کچی مٹی اور گھاس والے تھے۔ اب سڑک کے گرداگرد پیادوں کے لیے سیمنٹ کی پختہ پٹڑی بن گئی ہے۔ کرۂ ارض کا چپہ چپہ پختہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دھرتی کا دم گھٹنے لگا ہے۔ گول سڑک نے آن کی آن میں ہمیں جی بلاک پہنچا دیا جس میں ہمارے گھر کا نمبر ۱۳ تھا۔ ادھر سے گزرتے ہوئے ہم قبرستان جا پہنچے۔ وہاں والد مرحوم اور تایا ابا مرحوم اور بھائی عاشق مرحوم (**) کی قبروں پر فاتحہ پڑھی۔ مجاور ہمیں دیکھتے ہی پانی بھری

پانی اور ڈول لے کر آیا اور والد صاحب اور تایا ابا کی قبروں کو اس نے دھویا۔ مٹی سے اٹے ہوئے کتبے دھل کر صاف ہوئے' بارشوں نے ان کے حروف کی سیاہی مٹادی تھی' تایا ابا کی قبر کا سنگ لحد اکھڑ کر گرا پڑا تھا۔ اعجاز نے کہا میں ان دونوں قبروں کے کتبوں میں سیاہی بھروادوں گا اور اکھڑے ہوئے پتھر کی مرمت بھی کرادوں گا۔ میں امریکا واپس آچکا تو فون پر اعجاز نے کہا میں بھائی آغا بابر کے ہاتھ ایک کتاب تم کو بھیج رہا ہوں "خفتگان خاک لاہور" اس کو پڑھ کر تمہیں معلوم ہو گا لاہور کا کون سا نام ور کون سے قبرستان میں مدفون ہے۔ قبرستان سے نکل کر میں نے اعجاز سے کہا۔ "چلو اب اپنے لڑکپن والے مکان کی زیارت کرلیں۔ جی بلاک میں اس کا نمبر ۱۳ے ہے۔" قبرستان سے موٹر پر وہاں پہنچنے میں دو منٹ لگتے ہیں۔ شہتوتوں والی سڑک پر ایک گیٹ پر نمبر ۱۳ے کا تختہ نظر آیا۔ لیکن اب نقشا ہی اور تھا' کھتوں کی گھنی باڑ کی جگہ اب دس فٹ اونچی دیوار ہے۔

گیٹ اس وقت بھڑا ہوا تھا لیکن مقفل نہ تھا۔ اندر ایک معمر صاحب اپنے دو پوتوں کے ساتھ گیند بلا کھیل رہے تھے۔ اعجاز نے ان سے اندر آنے کی اجازت مانگی اور بتایا کہ ان کا ہمراہی اپنے لڑکپن کی یاد تازہ کرنے آیا ہے۔ میری شناخت معلوم کرکے ان صاحب نے بتایا کہ یہ فوج میں کرنل ہو کر ریٹائر ہوئے۔ اور پھر بیان کیا کہ جن صاحب نے آپ کا مکان خریدا تھا انھوں نے دو اور مکان اسی پلاٹ پر بنوا کر کرائے پر چڑھا دیے اس لیے کہ پلاٹ دس کنال کا ہے اور اس میں اتنی گنجایش تھی۔ ان کے انتقال کے بعد وارثوں میں جائداد کے مقدمے کھڑے ہوئے' بالآخر آپ کا مکان ڈھا دیا گیا۔

جہاں ہمارا دو منزلہ مکان تھا وہاں اب سوائے سوکھی گھاس کے کچھ باقی نہ تھا۔ میں نے کرنل صاحب سے کہا۔ پچھواڑے میں' میں نے کھجور کی ایک گٹھلی بوئی تھی۔ اس کا نتیجہ ایک بالغ بار آور نخل تھا جو ۱۹۷۵ء میں آکر میں نے دیکھا' وہ کیا ہوا؟ انھوں نے کہا' وہ کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ میں نے اطراف احاطہ کو غور سے دیکھا تو جامن کا ایک ضعیف بڈھا درخت پہچان لیا' اور کہا اس احاطے کے گرد دس بارہ درخت جامن کے تھے وہ کیا ہوئے؟ کرنل صاحب نے کہا چودہ درخت جامن کے یہاں تھے' اب صرف یہی ایک رہ گیا ہے۔ کرنل صاحب کا شکریہ ادا کرکے ہم نے اجازت چاہی' باہر نکلتے ہوئے میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ع

تو اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں

اعجاز سے میں نے کہا چلو اب تمھارے ایف بلاک والے بنگلے کی زیارت بھی کرلیں۔

پروفیسر بلدون ڈھینگرا کا بنگلہ (83-F) جو ۱۹۴۷ء میں اعجاز بٹالوی کا مسکن قرار پایا

اس بنگلے سے ہماری وابستگی کی کہانی سنیے۔ یہ بنگلہ گورنمنٹ کالج کے پروفیسر بلدون ڈھینگرا صاحب نے انگریزی کاٹیج کے نمونے پر بنوایا تھا۔ چھوٹے سے قد کے یہ پروفیسر صاحب بڑے طرار آدمی

تھے' ان کے باپ مہاراجا دربھنگہ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ گورنمنٹ کالج میں ڈھینگرا صاحب سے ہم نے انگریزی پڑھی۔ انگریزی میں یہ شاعری فرماتے تھے۔ پنجابی ان کی مادری زبان تھی لیکن کسی مجبوری کی حالت ہی میں پنجابی بولتے تھے۔ ماڈل ٹاؤن کی بس پر کوئی انگریزی سمجھ سکنے والا ان کا ہم سفر ہوتا تو نہایت برٹش لہجے میں بلند آواز سے مسلسل اس کے ساتھ انگریزی بولتے رہتے اور گٹ پٹ سے ناخواندہ دیہاتی ہم سفروں کو مرعوب رکھتے۔ پورے دیسی صاحب بہادر تھے' سانولے سلونے بہادر' بالوں کی ایک لٹ ان کے ماتھے پر اچھلتی رہتی تھی' سر جھٹک جھٹک کر اسے ماتھے سے ہٹانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

میرے بڑے بھائی محمد یعقوب مرحوم کے بھی یہ استاد تھے۔ بھائی یعقوب صاحب کو اپنی عمر سے بڑی عمر کے لوگوں سے دوستی گانٹھنا خوب آتا تھا۔ ڈھینگرا صاحب کی طرف ان کا دل کھنچا' دونوں کی ایسی دوستی ہوئی کہ بھائی یعقوب صاحب انھیں بلدون کہہ کر ان سے مخاطب ہوتے۔ دونوں کی گفتگو زیادہ تر انگریزی میں ہوتی' بیچ بیچ میں کوئی جملہ اردو میں ہو جاتا۔

ڈھینگرا صاحب ماڈل ٹاؤن کے کلب ہاؤس میں ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ اس کلب گھر میں بیئر بھی ملتی تھی۔ ایک روز وہاں میں ان دونوں کے پاس جا بیٹھا۔ یعقوب بھائی نے مجھ سے کہا تم بھی پیو' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ انھوں نے گلاس میں دو انچ بیئر ڈال کر اس میں بہت سا پانی ملایا اور گلاس میرے آگے رکھ دیا (دودھ میں پانی ملا کر اسے بیچنے والے بے ایمان کہلاتے ہیں' بیئر میں پانی ملانے والے کو کیا کہیں گے؟) میرا تامل دیکھ کر ڈھینگرا صاحب نے پنجابی میں مجھ سے کہا۔ "پی لے کاکا پی لے۔" (ارے بالک' پی لے' پی لے)۔ میں نے گلاس خالی کیا اور نشے کے انتظار میں رہا۔ بیئر آخر اس میں تھی ہی کتنی' ذرا سی تو تھی' زیادہ تو پانی ہی تھا۔ اسے گناہ کبیرہ کیوں کہیے۔ برسوں بعد اس واقعہ کو یاد کرکے میں نے یہ شعر کہا۔

کیا سادہ دل تھے ہم بھی اے دل نواز مینا
اصرار پر کسی کے ساغر پڑا تھا پینا

ڈھینگرا صاحب گرمیوں کی تعطیل کسی پہاڑ پر گزارا کرتے تھے اور ہمسایوں سے کہہ جاتے ذرا میرے بنگلے کا خیال رکھنا۔ ۱۹۴۵ء کی گرمیوں میں بنگلے کی رکھوالی یعقوب بھائی کے سپرد کر گئے۔ ۱۹۴۶ء میں پھر ایسا ہی کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ایسا نہ کیا بلکہ بنگلہ ایک سردار جی کو تین مہینوں کے لیے کرائے پر دے گئے۔ ۱۵ اگست کے فوراً بعد جب ہندو اور سکھ لاہور چھوڑ کر بھاگے تو سردار جی' ڈھینگرا صاحب کا مکان کھلا چھوڑ کر نکل بھاگے (ٹھیک محاورہ نکل بھاگے ہے یا بھاگ نکلے؟) یہ زمانہ لوٹ مار کا تھا۔ یعقوب بھائی کف افسوس مل مل کر کہتے تھے' ڈھینگرا صاحب بنگلہ کرائے پر کیوں چڑھا گئے۔ ایسا نہ کرتے تو میں اس کی رکھوالی کرتا۔

عین انھی دنوں ایک روز اعجاز بٹالوی بائیسکل پر سوار ہو کر بھاگڑ میں میرے پاس ماڈل ٹاؤن آئے اور کہا کوئی اچھی کوٹھی بتاؤ جسے اس کا ہندو مالک چھوڑ کر بھاگ نکلا ہو۔ بٹالہ ادھر رہ گیا' ہمارا موروثی مکان

ہاتھ سے گیا' یہاں اس کی جگہ کوئی مکان الاٹ کراتا ہے۔ مجھے معاً" ڈھینگرا صاحب کے بنگلے کا خیال آیا۔ میں نے اعجاز کو اس بنگلے کی کہانی سنائی اور کہا اس پر فوراً" قبضہ کرلو۔ ابھی تک اس کا سامان لٹا نہیں' یہ علم و فضل والا گھر ہے۔

اسے الاٹ کرانے میں انھیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اعجاز کے سب سے بڑے بھائی ذوالقرنین صاحب سی آئی ڈی کے چیف تھے۔ جلد ہی اعجاز اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ اس بنگلے میں آن بسے۔ برابر کی کوٹھی ماڈل ٹاؤن کو آپریٹو سوسائٹی کے پریذیڈنٹ کی تھی۔ یہ ہندو تھا۔ ایک آفریدی چوکیدار کو وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ کوٹھی اعجاز کے بڑے بھائی خادم حسین صاحب کو الاٹ ہوئی تو پٹھان چوکیدار نے مزاحمت کی۔ بھائی خادم صاحب بھی پولیس کے افسر تھے۔ انھوں نے چوکیدار سے کہا۔ خاں صاحب کس خیال میں ہو۔ پریذیڈنٹ صاحب اب واپس نہیں آئیں گے۔ تمھاری ذمہ داری ختم ہوئی۔ پریذیڈنٹ والے گھر کے مشرق کی طرف ڈھینگرا صاحب والا بنگلہ تھا اور مغرب کی جانب ایک اور کوٹھی تھی۔ یہ اعجاز کے بہنوئی بھائی عبداللہ کو الاٹ ہوئی۔ اس طرح تین گھر بٹالوی برادری کے پہلو بہ پہلو آباد ہوئے۔ اعجاز کے گھر میرا پیدل آنا جانا اب قرب کی وجہ سے ممکن ہوا۔

پچاس برس بعد اعجاز کے ہمراہ اب اس گھر کی زیارت ہو رہی تھی۔ اس میں اب ایک ایجنسی اشتہاروں کی ہے۔ اعجاز کے فرزند سلمان اس ایجنسی کے مالک ہیں۔ جمعے کی تعطیل کی وجہ سے آج دفتر بند تھا۔ بنگلے کے عقب میں ملازموں کے کوارٹر ہیں۔ اعجاز نے ملازموں کے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کہہ کر حال پوچھا۔

پچھواڑے میں کھجور کا ایک چھوٹا سا درخت مجھے دکھا کر اعجاز نے کہا۔ "تم نے اپنے گھر کے پچھواڑے میں کھجور کی گٹھلی بو کر ایک نخل اگایا تھا' دیکھو ہم نے بھی کھجور کا بوٹا لگایا ہے' اس کی کہانی سنو۔ شہر سے باہر میں نے کچھ زمین خریدی' اس کے ایک حصے میں آموں کا باغ لگایا۔ دوسرے حصے میں کھجوروں کے بوٹے ملتان سے منگا کر لگائے۔ ایک بوٹا کھجور کا اس گھر کے باغیچے کے لیے بچا رکھا۔ یہاں جس روز یہ لگایا جا رہا تھا ڈاکٹر جاوید اقبال کا بیٹا اتفاق سے ادھر آنکلا' اسے دیکھ کر میں گھر کے اندر سے "بالِ جبریل" کا نسخہ نکال کر لایا اور جاوید کے بیٹے سے کہا یہ دیکھو تمھارے دادا کی نظم ہے۔

عبدالرحمان اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت

سرزمینِ اندلس میں (۱۰*)

ہم بھی کھجور کا بوٹا لگا رہے ہیں۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر یہ نظم ہم سب کو سناؤ۔" سب نے خوش ہو کر نظم سنی۔

میری آنکھوں کا نور ہے تو — میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں — میرے لیے نخلِ طور ہے تو

مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا صحرائے عرب کی حور ہے تو!
پردیس میں ناصبور ہوں میں پردیس میں ناصبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بارور ہو
ساقی تیرا نم سحر ہو!
عالم کا عجیب ہے نظارہ دامان نگہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مبارک پیدا نہیں بحر کا کنارہ!
ہے سوز دروں سے زندگانی اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبح غربت میں اور چمکا ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے!
مومن کا مقام ہر کہیں ہے!

ماڈل ٹاؤن کا کلب گھر

اعجاز کے اس گھر کی زیارت ہو چکی تو انھوں نے کہا اور کون سا کوچہ مالوف دیکھنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا بعض جگہیں اے بلاک کی طرف ہیں۔ ادھر جاتے ہوئے رستے میں کلب ہاؤس بھی کیوں نہ دیکھتا چلوں جہاں پروفیسر ڈھینگرا نے مجھ سے گناہِ صغیرہ کرایا تھا۔

کلب ہاؤس کی گنبد والی عمارت کے سامنے موٹر رکی تو میں نے اتر کر اس کے کمپاؤنڈ کا ایک چکر لگایا۔ موٹر کار کے پاس واپس آکر میں نے اعجاز سے کہا۔ "وہ دیکھو' کلب گھر کے سامنے جو کوٹھی ہے اس میں دیوان کھیم چند رہتے تھے۔ یہ ماڈل ٹاؤن کے بانی تھے اور اس کوٹھی کے مشرق کی جانب سڑک پار جو مکان ہے کوآپریٹو سوسائٹی نے نمونے کے طور پر بنوایا تھا۔ والد مرحوم نے یہ مکان ۱۹۲۶ء میں کرائے پر لیا اور اس میں کرایہ دار ہو کر تین برس رہے اور ۱۹۲۹ء میں اپنے بنوائے ہوئے مکان میں منتقل ہوئے۔ سوسائٹی والے مکان میں پھر ماڈل ٹاؤن کا اسکول آگیا۔ پہلے درجے سے چھٹے درجے تک اس عمارت میں' میں پڑھتا رہا۔" پھر میں نے بتایا۔ "۱۹۲۶ء میں چودھری ظفراللہ خاں کی کوٹھی ابھی تعمیر نہ ہوئی تھی۔ کلب ہاؤس کی دوسری منزل پر ایک کمرہ کرائے پر لے کر چودھری صاحب اس میں رہتے تھے۔ والد صاحب اور چودھری صاحب کی صحبت وہاں رہتی تھی۔" اب موٹر سٹارٹ ہوئی اور گول سڑک پر اے بلاک کی طرف دوڑی تو میں نے کہا۔ "ہمیں نصیر آباد جانا ہے جو فیروز پور روڈ پر ہے۔ اے بلاک کے بس اسٹاپ سے ایک سڑک نکلتی ہے جو فیروز پور روڈ سے جا ملتی ہے۔" بس اسٹاپ سے اس سڑک پر چلے تو معلوم ہوا کہ آگے ایک پارک بن گیا ہے۔ پارک کے گرد جنگلہ ہے۔ فیروز پور روڈ کو پہنچنے کا راستا ادھر سے نہیں رہا۔

نصیر آباد اور نصیر خاں کا گھر

دوسری طرف سے ایک لمبا چکر کاٹ کر ہم فیروز پور روڈ پر آئے۔ اس پر آبادی اتنی مسلسل ہو گئی

ہے کہ نصیر آباد کی حدود کا پتا ملنا آسان نہ تھا۔ آہستہ رفتار سے آدھا میل طے کیا اور متلاشی آنکھوں سے مکانوں اور دکانوں کو یہ غور دیکھا کہ محمد نصیر خاں کا وہ گھر پہچانوں جس میں' میں اسکول کے دنوں میں آیا جایا کرتا تھا۔ اعجاز نے کہا۔ واپس مڑ کر ایک بار پھر دیکھیں' اس نے موٹر واپس موڑ لی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ نصیر خاں نے گھر سے ملحق ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔ اس کا مینار دکھائی دے تو گھر مل جائے۔ نظریں پھر ڈھونڈتی رہیں۔ مایوس ہو کر میں نے کہا۔ چلو جانے دو پھر کبھی ادھر آنا ہوا تو ڈھونڈ لیں گے۔ قسمت آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ یکایک ڈرائیور کو ایک چھوٹا سا مینار دکھائی دیا۔ اس نے کہا۔ "وہ رہی مسجد"۔ اعجاز نے موٹر ٹھہرائی' میں نے اتر کر دروازے سے مسجد کا صحن جھانک کر دیکھا۔ اندر سامنے کی دیوار پر ایک کتبہ مسجد نصیر خاں کا دکھائی دیا۔ میں نے اعجاز سے کہا۔ میں دریافت کرتا ہوں نصیر خاں کے کوئی وارثین ادھر ابھی تک رہتے ہیں یا نہیں۔ سگریٹ سوڈے کی دکان والے سے پوچھا تو اس نے کہا۔ مسجد کے برابر دروازہ ہے وہاں پوچھئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں نے دستک دی تو ایک ضعیفہ نے آواز دی۔ "نجیب' دیکھنا کون آیا ہے۔" اندر سے تین نوجوان لڑکے نکلے۔ میں نے پوچھا۔ "نصیر خاں کا گھر یہی ہے؟" انھوں نے کہا۔ "جی ہاں' وہ فوت ہو گئے۔ یہ گھر ان کے بیٹے وزیر خاں کا ہے۔ ہم وزیر خاں کے بیٹے ہیں۔" میں نے کہا۔ میں شاعری میں نصیر خاں صاحب کا استاد تھا۔ اب امریکا میں رہتا ہوں۔ چند روز کے لیے لاہور آیا۔ جی چاہا کہ نصیر آباد بھی دیکھ لوں۔ جب میں یہاں آیا کرتا تھا آنگن میں ایک بھینس بندھی ہوتی تھی۔ لڑکوں نے کہا اندر تشریف لے آیئے۔ آنگن کی راہ سے ہم ایک بیٹھک میں داخل ہوئے جو قالین اور صوفوں سے آراستہ تھی۔ لڑکوں نے تواضع کرنی چاہی۔ میں نے بتایا کہ اعجاز حسین بٹالوی صاحب باہر موٹر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں ان سے پوچھ لوں کہ انھیں فراغت ہے یا نہیں۔ باہر جا کر میں نے اعجاز سے کہا۔ ذرا اندر آجاؤ' چند منٹ بیٹھیں گے جو باتیں ہوں گی تم بھی سنو۔ اعجاز اندر آگئے۔

اب میں نے لڑکوں سے کہا۔ "۱۹۷۵ء میں' میں نے تین مہینے امریکا سے آکر پاکستان میں گزارے۔ اس وقت آپ کے دادا نے اپنے کلام کی کتابت کرا رکھی تھی۔ کاتب کی لکھی ہوئی کاپیاں انھوں نے مجھے دکھائیں اور کہا۔ استاد جی آپ ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ میں نے کاپیوں کا پیکٹ ان سے لے لیا۔ ایک مہینہ لائل پور میں رہا۔ امریکا جانے کا وقت آیا تو نصیر آباد آیا۔ معلوم ہوا کہ نصیر صاحب حج کو چلے گئے ہیں۔ اس روز آپ کے والد وزیر خان بھی گھر پر نہیں تھے۔ کراچی پہنچ کر میں نے پیکٹ کا پارسل بنایا اور رجسٹری کرا کر نصیر آباد کے پتے پر بھیج دیا اور ماڈل ٹاؤن کے پوسٹ ماسٹر صاحب کو چٹھی لکھی کہ پارسل محفوظ رکھا جائے۔ نصیر خاں صاحب حج سے واپس آئیں تو انھیں پہنچا دیا جائے۔ معلوم نہیں وہ کلام پھر چھپا یا نہیں۔"

بڑے لڑکے نے کہا۔ "جی وہ چھپ گیا۔" یہ سن کر میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ میں نے پوچھا آپ کے پاس اس کا کوئی نسخہ ہے؟ انھوں کہا۔ "جی' دو تین نسخے یہاں موجود ہیں۔ بڑا لڑکا اندر سے ایک نسخہ نکال کر لایا اور مجھے پیش کیا۔ اس نے نسخے کے اندر اپنا نام اور اپنے تین بھائیوں کے نام لکھ دیے۔

محمد نجیب خاں، محمد عالم گیر خاں، محمد دستگیر خاں، محمد منیر خاں کلام نصیر کے اس مجموعے کا عنوان "ہم کلام" (۱۱۴) ہے۔ مکتبہ اسلامیہ سعودیہ عربیہ (مزنگ روڈ، لاہور) نے جنوری ۱۹۸۰ء میں شایع کیا۔ سرسری ورق گردانی کی تو معلوم ہوا کہ بیش تر حصہ اس کا میرا دیکھا ہوا نہیں ماجد الباقری صاحب کا اصلاح یافتہ ہے۔ مجھ سے اصلاح لینے کا سلسلہ تو ۱۹۴۹ء میں ختم ہو گیا تھا کہ ۱۹۴۹ء کے بعد تو میں پاکستان میں رہا ہی نہیں۔ مجموعہ ۳۶۱ صفحات کا ہے۔ اس میں غزلوں سے زیادہ نظمیں ہیں۔ حمد اور نعت کی بہت اچھی چیزیں اس میں ہیں۔ خلوص اور سادگی اس کلام کی خوبی ہے۔ دیباچے پر نظر دوڑائی تو اس میں اپنا ذکر خیر پاکر خودی بلند ہوئی۔ اس کا ایک حصہ بلند آواز سے پڑھ کر اعجاز نے نصیر خاں کے پوتوں کو سنایا۔

لڑکوں نے بہت چاہا کہ اگلے روز میں ان کے ہاں آکر کھانا کھاؤں۔ میں نے افسوس کے ساتھ معذرت کی کہ اب لاہور میں صرف دو دن اور ہوں، کئی رشتا داروں کے گھروں میں سلام کرنے مجھے جانا ہے، آیندہ جب لاہور آیا تو پھر آپ سے ملنے آؤں گا۔ تینوں سے گلے مل کر رخصت ہوا۔

نصیر خاں نے جب اپنا مکان فیروز پور روڈ پر بنوایا تو اس وقت فیروز پور روڈ پر اس مکان کے آس پاس اور کوئی مکانات نہ تھے۔ ایک تختے پر جلی حروف میں "نصیر آباد" لکھوا کر انھوں نے تختہ اپنے مکان کے سامنے ایک کھمبے پر نصب کر دیا، اس امید میں کہ آیندہ اور مکانات بن گئے تو ایک بستی ان کے نام سے منسوب ہو کر ان کا نام زندہ رکھے گی۔ یہ ترکیب کامیاب رہی۔ اب نصیر آباد ایک معروف بستی ہے۔

مجھ سے اپنے تعلق کی کہانی نصیر خاں نے "ہم کلام" کے دیباچے میں کہی ہے۔ لکھتے ہیں:

> میں ریاست مالیر کوٹلہ کا رہنے والا ہوں اور ایک متوسط درجہ کے خاندان کا فرد ہوں۔ میرے والد محمد امیر خاں ریاستی فوج میں بینڈ ماسٹر تھے۔ میں ناخواندہ ہوں، میری تعلیم کچھ بھی نہیں۔ تیسری جماعت میں تھا کہ اسکول چھوڑ دیا کچھ دنوں کے بعد والد صاحب کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا اس لیے سلسلۂ تعلیم قطعاً ختم ہوا۔ میرے والد نے مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لیے میرے خالو جمشید خاں صاحب کے ہاں بھیجا تھا۔ میرے خالو صاحب موضع برج حکیم کے نمبردار تھے۔ انھوں نے موضع آنڈلو کے پرائمری اسکول میں مجھے دوسری جماعت میں داخل کرادیا۔ میری اردو کی کتاب میں جو نظمیں تھیں میں اکثر انھیں خوش الحانی سے پڑھا کرتا تھا جس کی بھنک میرے خالو صاحب کے کان میں بھی پڑ گئی۔ انھوں نے ایک روز مجھے اپنے پاس بلا کر وہ نظمیں سنیں اور بہت خوش ہوئے۔ چناں چہ پھر ان کا روز کا یہی معمول ہو گیا کہ وہ مجھے اپنے پاس بیٹھک میں بلا لیتے اور نظمیں اور گیت وغیرہ جو بھی مجھے یاد ہوتے، مجھ سے سنتے۔ پھر ہوتے ہوتے گاؤں کے لوگ بھی جمع ہونے لگے اور یوں سارے گاؤں میں میری خوش الحانی کی شہرت پھیل گئی۔

میرے خالو صاحب نے مالیر کوٹلہ آکر میرے والد صاحب سے بھی یہ ذکر کیا کہ آپ کا لڑکا تو بہت خوش گلو ہے اور خوب گاتا ہے۔ چناں چہ والد صاحب نے جو خود بھی فن موسیقی کے ماہر تھے' مجھ سے گیت اور نظمیں سنیں۔ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مجھے حافظ شیرازی کی ایک فارسی غزل لکھ کر دی جس کا پہلا شعر تھا۔

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

پھر انھوں نے یہ غزل مجھ سے سنی اور بہت خوش ہوئے۔ وہ اکثر مجھ سے یہ غزل سنا کرتے اور خوش ہوتے۔ ہوتے ہوتے میں غزلیں' نظمیں اور نعتیں پڑھنے میں خاصا مشہور ہو گیا اور شہر میں کوئی محفل یا جلسہ یا میلاد ایسا نہ ہوتا تھا جس میں میری موجودگی یا میری ضرورت نہ ہوتی ہو۔

چوں کہ طبیعت قدرتی طور پر شاعرانہ تھی' چناں چہ بعض اوقات میں خود بھی بے ساختہ شعر کہہ جاتا۔ اس وقت غالباً" میری عمر اکیس یا بائیس سال ہو گی جب میں نے چند غزلیں اور نعتیں ٹوٹی پھوٹی سی زبان میں لکھیں۔ اس زمانے کی چند غزلیں اور نعتیں میں نے دیوان میں بھی شامل کی ہیں۔

والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد گردش ایام نے آن گھیرا اور طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۹۲۷ء میں مجھے میرے ایک دوست عبدالرحمان صاحب نے لاہور کی نواحی بستی ماڈل ٹاؤن بلا لیا اور مجھے معمار کے کام پر لگا دیا۔ خدا کے فضل سے عقل و فہم اچھی تھی' قدرت الٰہی نے بھی دستگیری فرمائی اور ۳۲-۱۹۳۱ء میں' میں نے معمولی پیمانے پر ٹھیکہ داری کا کام شروع کر دیا اور یوں صحیح معنوں میں میری خود مختار کاروباری زندگی کا آغاز ہوا۔

پھر خدا کے فضل اور ذاتی محنت و جاں فشانی کی بدولت میں روز بہ روز ترقی کرتا گیا۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں' میں ماڈل ٹاؤن کے اے بلاک کی جامع مسجد تعمیر کرا رہا تھا۔ اس دوران جہاں اور شرفا سے روابط قایم ہو چکے تھے' وہاں جناب شیخ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب' پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کے ساتھ بھی بہت اچھے مراسم تھے۔ ان کے ہاں آنا جانا تقریباً" روز کا معمول تھا۔ ان کے کئی لڑکے تھے جو سب کے سب خدا کے فضل سے خوب لایق و فایق ہوئے۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک لڑکے محمد داود رہبر' جو ان دنوں غالباً" نویں یا دسویں جماعت میں تعلیم پا رہے تھے ایک روز مجھ

سے کہنے لگے کہ میں نے ایک نظم لکھی ہے آپ سنیں۔ انھوں نے نظم سنائی جس کا مصرع اولا تھا۔

ناروے پہ نا روائی ہو گئی

اس پر میں نے مذاقاً کہا کہ میں بھی اسی زمین میں ایک نظم لکھوں گا...... چناں چہ دوسرے روز میں نے بھی اپنی نظم ان کو سنائی اور ان کے مصرع اولا کے ساتھ یوں گرہ لگائی۔

"ناروے پہ ناروائی ہو گئی"
ڈنکرک کی بھی صفائی ہو گئی
بلجیم کا ہو چکا قصہ تمام!
اب تو پیرس پہ چڑھائی ہو گئی

اس نظم کی رہبر صاحب نے اصلاح کی۔ اس طرح وہ میرے استاد بنے اور پھر اصلاح کا سلسلہ چل نکلا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پندرہ سولہ سال کی عمر کا استاد اور قریباً چالیس سال کی عمر کا شاگرد! استاد تو خدا کے فضل و کرم سے کافی قابلیت کا مالک تھا اور شاگرد قطعی ناخواندہ لیکن تھا فطرتاً شاعر۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں نے ایک ہی وقت اپنی اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ شاگرد اپنا ٹوٹا پھوٹا کلام استاد کی خدمت میں پیش کرتا' وہ اس کی اصلاح فرما دیتے۔ استاد صاحب کا تخلص راہبر تھا اور میں نے اپنے نام ہی کو اپنا تخلص بنا لیا۔ چناں چہ دن گزرتے گئے۔ دونوں نے اپنے اپنے دیوان تیار کر لیے۔ استاد صاحب نے اپنے دیوان کا نام "لحن داؤدی" رکھا اور شاگرد نے "ہم کلام" رکھا اور یہ استاد ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو میں آج شاعروں کی صف میں کھڑا ہوں ورنہ ع

میں کہاں اور تری جلوہ گہِ ناز کہاں

یوں یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ شاعر بنائے سے نہیں بنتا بلکہ شاعر فطرتاً ہی شاعر ہوتا ہے۔

استاد راہبر صاحب کچھ عرصہ بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ چلے گئے اور اس طرح وہ اپنا دیوان شائع نہیں کرا سکے۔ ان کی چند نظمیں اب بھی میرے پاس بہ طور تبرک محفوظ ہیں۔

ٹھیکہ داری اور شاعری

جنگ کے دن تھے اور ماڈل ٹاؤن کے چند باذوق نوجوانوں نے ادب کی

جوت جگانے کا اہتمام کیا اور "بزم ادب" کے نام سے ایک انجمن بنائی جس نے گاہ گاہ مشاعرے منعقد کیے۔ چناں چہ ایک مرتبہ ماڈل ٹاؤن کے کلب ہال میں ایک بڑے مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ اچھے اچھے نام ور شعرا کو اس مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ سر شیخ عبدالقادر کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ شعرا کافی تعداد میں تھے۔ ماڈل ٹاؤن کلب ہال میں ایک جانب مستورات کی نشستیں تھیں اور دوسری جانب مردوں کی' مجموعی طور پر سامعین کی تعداد کافی تھی۔

مشاعرہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ شعرا اپنا اپنا کلام سنانے لگے۔ تقریباً" گیارہویں' بارہویں نمبر پر میری باری آئی۔ میری نظم کا عنوان تھا "امیروں کی بستی"۔ میں نے ترنم سے نظم پڑھنی شروع کی۔ پہلے تو میں نے امیروں کی بستی کی خوش منظری پر روشنی ڈالی پھر جب یہ اشعار پڑھے۔

زمانے کی حالت عیاں کر رہا ہوں
حقیقت ہے جو کچھ بیاں کر رہا ہوں
بگاڑا ہے دختر کو فیشن سکھا کر
نئی روشنی کے کرشمے دکھا کر

تو مردوں کی جانب سے داد کا یہ عالم ہو گیا کہ ہر ایک شعر پر تمام ہال گونج اٹھتا۔ جب ذرا سکون ہوتا تو میں اگلا شعر پڑھتا۔ عورتوں کے بارے میں اشعار پڑھنے کے بعد میں نے مردوں کے بارے میں اشعار پڑھنا شروع کیے مثلاً"۔

یہ اوصاف مردوں کے منھ پر عیاں ہیں
نہ مونچھ اور نہ داڑھی کے کوئی نشاں ہیں
حقیقت میں مرد اور صورت میں زن ہیں
کہو یہ بھی دنیا میں جینے کے فن ہیں؟

اب مستورات کی جانب سے اس قدر داد ملی کہ ہال گونج اٹھا۔ یہ سلسلہ ہر شعر کے ساتھ جاری رہا۔ جب ذرا سکون ہوتا تو اگلا شعر پڑھتا۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں' میں نے شرکت کی تھی۔ اور مجھے داد کا وہ منظر اب بھی خوب یاد ہے!

مشاعرے سے فارغ ہو کر استاد راہبر جب اپنے گھر پہنچے تو وہاں ان کے والد ڈاکٹر اقبال صاحب موجود تھے۔ انھوں نے مشاعرے کی کیفیت پوچھی اور سوال کیا کہ سب سے زیادہ داد کسے ملی؟ تو استاد صاحب نے فرمایا کہ "سب سے زیادہ داد تو نصیر صاحب کو ملی۔" ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور فرمایا۔ "خوب!

شاگرد اپنے استاد سے بازی لے گیا۔"

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد حاجی تاج دین صاحب' صدر مشاعرہ عبدالقادر کو گھر چھوڑنے کے لیے اپنی کار میں بٹھا کر چلے تو راستے میں شیخ صاحب نے فرمایا کہ "مولانا" نے تو خوب رنگ جمایا۔ اس پر حاجی تاج دین صاحب نے جو ماڈل ٹاؤن کی جامع مسجد کی تعمیر کے منتظم بھی تھے فرمایا۔ "شیخ صاحب! یہ مولانا نہیں یہ تو ٹھیکہ داری کرتے ہیں۔ یہ ہماری جامع مسجد تعمیر کرا رہے ہیں۔" اس پر شیخ صاحب نے فرمایا۔ "بھئی خوب! ٹھیکہ داری اور شاعری!"

میرے کئی دوست احباب بھی اکثر مجھ سے میرا کلام سن کر یہی کہتے۔ "بھئی عجیب بات ہے' ٹھیکہ داری اور شاعری!"

یک نظم بہ عنوان "شکوہ" بھی اس مجموعہ کلام میں دکھائی دی۔

لندن جاکر حضرت رہبر دیس پرانا بھول گئے
وہ اپنے عزیزوں ہم یاروں سے ملنا ملانا بھول گئے
مغرب کی فضاؤں میں رہ کر ایسے مخمور اور مست ہوئے
وہ اپنے وطن کے نظارے اور وقت سہانا بھول گئے
لندن کے حسینوں کے منظر نظروں میں سمائے رہتے ہیں
اس واسطے ہم بے چاروں کو خاطر میں لانا بھول گئے
افسوس! ہمیں تو آج تلک خط سے بھی نہ تم نے یاد کیا
کیا جانئے! کیوں اتنی جلدی الفت کا فسانہ بھول گئے
جس دن سے حضرت رہبر نے رخ اپنا ہم سے پھیر لیا
اس دن سے ہم بھی "بزم ادب" میں شعر سنانا بھول گئے
چھوڑو بھی نصیر ان شکووں کو اب حد سے نہ آگے بڑھ جانا
استاد ہیں وہ! تم شاگردی کا اپنا زمانہ بھول گئے

اس مجموعے میں ان کی بیٹی کا مرثیہ پڑھا تو اس بیٹی کے جنازہ میں اپنا شریک ہونا یاد آیا۔ ماڈل ٹاؤن ہی کے قبرستان میں یہ بیٹی مدفون ہوئی۔ جنازہ کی نماز ہو چکی اور میت کو سپرد خاک کرنے کا وقت آیا تو نصیر خاں کا ایک عزیز میت قبر میں اتارنے کو پائنتی جا کھڑا ہوا' نصیر خاں نے مجھ سے کہا۔ "استاد جی' آپ سرہانے کی طرف سے اسے تھام کر قبر میں اتاریئے۔" ایسے التماس کی مجھے ہرگز توقع نہ تھی' جیتے جی ان کی یہ دختر پردہ نشیں تھی اور اب کفن پوش' کفن میں لپٹے ہوئے اس پیکر عفت کا سر ہاتھوں میں لے کر میں نے اسے قبر میں اتارا اور اسے نیچے لٹا کر باہر آیا' اب مرثیہ پڑھئے اور باپ کے دل کا درد دیکھیے۔

آہ! زیب النساء

ہوگئے بدحال! اے لختِ جگر تیرے بغیر
گھر کے سب چھوٹے بڑے ہیں نوحہ گر تیرے بغیر
آہ! ظالم موت نے گل کردیا گھر کا چراغ!
ہر طرف اندھیر ہے دیکھا جدھر تیرے بغیر
آہ! تجھ بن آج ساری انجمن خاموش ہے
کس قدر تاریک ہیں دیوار و در تیرے بغیر
دیکھ! آ کر آج گھر کا رنگ ہی کچھ اور ہے
آہ! تیری ماں کی حالت ہے دگر تیرے بغیر
ہر طرف تاریک منظر اور وحشت کا سماں
گھر میں رونق ہی نہیں ویراں ہے گھر تیرے بغیر
موت نے تیری کیا ہم کو شکستہ و زار
مضطرب بے چین ہیں با چشمِ تر تیرے بغیر
کون اب سب سے کرے گا شوخیاں اور چھیڑ چھاڑ
اب کہاں باقی وہ لطفِ شور و شر تیرے بغیر
کون اب ماں سے کرے گا میٹھی میٹھی گفتگو
کون دل جوئی کرے گا وقت پر تیرے بغیر
دل کی دولت لٹ گئی یہ خانہ ویراں ہوگیا
دل ہوا افسردہ! اے لختِ جگر تیرے بغیر
ہر گھڑی ہے آہ و زاری ہر گھڑی آہ و فغاں
ہر گھڑی بے چین ہیں قلب و جگر تیرے بغیر
غم زدہ غم ناک ہیں غم گین ہیں غم خوار ہیں
ہر گھڑی بے کل ہیں اے نورِ نظر تیرے بغیر
اب بہاروں اور خوشیوں کی نہیں کوئی اُمید
اب نہ راحت ہوگی حاصل عمر بھر تیرے بغیر
وقتِ پیری میں ہمیں وہ غم دیا "زیب النساء"
زندگی جس سے ہوئی اپنی دگر تیرے بغیر
دن پریشانی میں شب ہوتی ہے نالوں میں بسر

زندگی بے کیف ہے اب کس قدر تیرے بغیر

طفیلی بن کر شادی کی ضیافت میں شرکت

طالب علمی کے زمانے میں اعجاز حسین بٹالوی نے دو تین بار مجھے ولیمے کے تناول میں شریک کیا۔ گر یہ بتایا کہ سفید پوش ہو کر مسکراتے ہوئے شادی والے گھر میں پہنچو' وہاں دلہن والے سمجھیں گے کہ تم دولہا والوں کی طرف سے مدعو ہو کر آئے ہو اور دولہا والے سمجھیں گے کہ تم دلہن والوں کے بلائے ہوئے آئے ہو' لیکن اب اعجاز کی نام وری اتنی ہے اور وسعت مراسم ایسی کہ شادیوں کے موسم میں ایک ہی دن میں انھیں تین تین شادیوں میں مدعو ہو کر از راہ مروت پہنچنا ہوتا ہے' پر خوری کے لیے نہیں' صرف منھ دکھانے کو۔

اب کے ایک روز انھوں نے کہا۔ آج شام تمھیں ایک شادی میں لے جائیں گے' وہاں تمھاری ملاقات تمھارے دو پرانے دوستوں سے ہوگی' میں نے کہا کون سے دوست' تو انھوں نے کہا ابھی نہ بتاؤں گا۔

شادی والے گھر کو جاتے ہوئے ایک کوٹھی کے سامنے اعجاز نے موٹر ٹھہرائی اور موٹر سے نکل کر کہا آؤ میرے ساتھ' میں نے کہا یہ تو شادی والا گھر نہیں لگتا' یہاں نہ شامیانے ہیں نہ شادیانے۔ اعجاز نے کچھ جواب نہ دیا' بے تکلف گھر میں داخل ہوئے۔ بیٹھک میں چار پانچ یار باش بیٹھے تھے' سامنے راجا تجمل حسین (۱۲*) براجمان تھے۔ ان کی محفل آرائی مشہور ہے۔ یہ گورنمنٹ کالج میں میرے ہم جماعت تھے۔ اردو کے انعامی مباحثوں کے لیے کالج کی طرف سے دو مقرروں کی ٹیم دوسری یونی ورسٹیوں کو بھیجی جاتی تھی۔ ٹیم ہو کر تجمل اور میں نے ہندوستان میں جابجا ریل کے سفر کیے اور ٹرافیاں جیت جیت کر گورنمنٹ کالج کا نام روشن کیا۔

تجمل اٹھ کر گلے ملے اور بیٹھ کر منھ پھیر لیا' مجھ سے نظر نہ ملائی' میں جانتا تھا اداکاری ہو رہی ہے۔ ایک منٹ اس کا مزا لے کر میں نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ شریر ہنسی ہنس کر بولے میں نے تمھاری چیزیں علامت میں پڑھی ہیں۔ بعض چیزیں پڑھ کر کہا۔ "خوب" اور بعض چیزیں پڑھ کر کہا۔ "یہ........ اب تک وہی ہے۔" لفظ یہ کے ساتھ ایک پیار کی گالی بھی انھوں نے جڑ دی۔ پھر کہا چار پانچ دن میرے پاس آ کے ٹھہرو (۱۳*)۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور ڈاکٹر جاوید اقبال داخل ہوئے۔ اب معلوم ہوا کن دوستوں سے ملنے کی پیش گوئی اعجاز نے کی تھی۔ جس گھر میں یہ بیٹھک جمی ہوئی تھی صباح الدین (عرف صبی) کا گھر ہے۔ یہ بھی گورنمنٹ کالج میں ہمارے ہم جماعت تھے۔ جاوید صاحب کی بہن منیرہ صباح کے بھائی صلاح الدین (عرف صلی) سے بیاہی ہوئی ہے۔ صلاح اور صباح میاں امیرالدین مرحوم کے فرزند ہیں جو لاہور کے میئر تھے۔

جاوید صاحب کیمبرج میں میرے ہم جماعت تھے۔ ان کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ چہرے کی تابانی

اور بشاشت اور لذت آشنائی میں عمر سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ قدم زنی میں وہی خود اعتمادی ہے جو جوانی میں تھی۔ مجھ سے گلے ملتے ہوئے بولے۔ "یہ بدلا نہیں' ویسے کا ویسا ہے۔" صوفے پر اعجاز کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ انھیں "شاہ جی" کہہ کر ان کے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ دوستی کا مزا ہی کیا اگر پہلو میں بیٹھے ہوئے دوست کے گھٹنے پر آدمی ہاتھ نہ مار سکے۔ دوست کو شاہ جی یا بادشاہو کہنا اور اس کے گھٹنے پر ہاتھ مار دینا پنجاب میں عام ہے۔

جاوید صاحب کے آنے کا انتظار تھا۔ یہ آئے تو تین چار منٹ بعد سب موٹروں میں بیٹھ کر آن کی آن میں شادی والے گھر پہنچ گئے۔ شامیانے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے اعجاز سے کہا ہمارے میزبان کون صاحب ہیں؟ اعجاز نے جواب دیا۔ "خواجہ صاحب۔" میں نے پوچھا کون سے خواجہ صاحب؟ اعجاز نے کہا پروانہ کرو۔ بس کہہ دیا خواجہ صاحب' اب کھانا کھاؤ۔

اکڑوں بیٹھا ہوا ایک مستعد لڑکا جھپا جھپ تنور میں روٹیاں لگا رہا تھا اور تنور سے نکال نکال کر طلب گاروں کو تھما رہا تھا۔ میں پلاؤ اور قورمے اور سیخ کباب سے بھری ہوئی تھالی ہاتھ میں لیے کھاتا رہا اور نان بائی بچے کی کارگزاری دیکھتا رہا۔

لاہور چھاؤنی میں ضیا محی الدین کا گھر

برسوں انگلستان میں گزار کر ضیا محی الدین ریٹائر ہوئے اور لاہور چھاؤنی کی ایک کوٹھی میں آن بسے۔ لُبس کا مہمان خانہ میسر نہ ہوتا تو میں ضیا کے گھر میں قیام کرتا۔ انگلستان میں' میں ان کی میزبانی سے متمتع ہو چکا تھا' اب چھاؤنی میں ان کے گھر پہنچتے ہی میں نے فرمایش کی صندل کا شربت پلاؤ۔ اگر گھر میں نہیں تو کہیں سے لا کر پلاؤ۔ انھوں نے کہا دکانوں میں شربت یہاں صرف گرمیوں میں ملتے ہیں۔ کوشش کریں گے۔ خوش ادا بھابی (عذرا) نے کہا شربت روح افزا کی بوتل آدھی باقی ہے۔ میں نے کہا اچھا وہی سہی۔ جتنی بار وہاں گیا روح افزا کا گلاس میرے سامنے رکھا گیا۔ وعدہ ہوا کہ آیندہ لاہور آؤ گے تو صندل کے شربت سے تواضع کی جائے گی۔ قدرت کی صناعی کے کیا کہنے۔ صندل کی لکڑی میں بھینی بھینی خوشبو رچا دی۔ پھر بشر کو ایسا دماغ دیا جس نے اس لکڑی کا چورا کر کے اس کی اگر بتی بنائی۔ اور پھر صندلی خوشبو والا شربت ایجاد کیا ع

تو گل آفریدی ایاغ آفریدم

پاکستان میں مال دار لوگوں کے گھروں میں لوزیات' کبابیات' مٹھائیات' مشروبات اور فواکہ سے لدی ہوئی دو منزلہ نرالی مہمان کے آتے ہی بیٹھک میں آ پہنچتی ہے۔ ضیا کے گھر میں بیٹھک باورچی خانے سے متصل ہے۔ پہلی بار میں شام کو ان کی بیٹھک میں جا بیٹھا تو تھوڑی دیر میں باورچی خانے کی طرف سے لکڑی کے پہیوں والا عتیقات قسم کا ایک ٹھیلا سامان ضیافت سے لدا ہوا نمودار ہوا۔ یہ ٹھیلا اتنا لمبا ہے کہ جب یہ پورا اندر آ چکا تو پھر وہ باورچی دکھائی دیا جو اسے دھکیل کر لایا تھا۔ میں جب اس ٹھیلے کو یاد کرتا

ہوں تو مجھے لاہور کے ریلوے سٹیشن پہنچنے والی ریل گاڑیاں یاد آتی ہیں۔ ضیا کو میری تجویز ہے کہ باورچی کو ایک سیٹی اور ایک گھنٹی خرید دی جائے۔ ٹھیلا باورچی خانے سے روانہ ہو تو باورچی سیٹی بھی بجائے اور گھنٹی بھی۔

میزبانی کا سلیقہ ضیا کو خوب ہے۔ میرے چہرے پر تھکن دیکھی تو کہا تھوڑا سا قیلولہ کرو۔ ساتھ والے کمرے میں مجھے لے گئے جو مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔ پلنگ کے سرہانے ٹیبل لیمپ اپنے ہاتھ سے روشن کیا۔ ٹھنڈے پانی کی صراحی سرہانے والی میز پر ایک گلاس کے ساتھ لا رکھی۔ دراصل قیلولہ کے لیے مجھے لٹایا اس لیے کہ انھیں خود اپنے قیلولہ کے لیے خلوت درکار تھی۔

لاہور کے امریکن سنٹر میں ایک ڈراما دیکھا

لمس کے قیام کے آخر میں ایک شام امریکن سنٹر کے ہال میں اسٹیج پر ایک طربیہ دیکھنا بھی نصیب ہوا (*۱۴) اس کا مصنف مشہور امریکی ڈراما نگار نیل سائمن ہے (*۱۵)۔ ڈرامے کا خاص کردار ایک بوڑھا ایکٹر ہے۔ اس کا ایک بھانجا اس کا ایجنٹ ہے جو اسے کسی فلم میں پارٹ دلانے کے لیے کوشاں ہے۔ بوڑھا سنکی ہے۔ ریہرسل پر آمادہ ہونے میں نہیں آتا۔ اس کی جھلاہٹ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ ڈرامے میں بوڑھے ایکٹر کا پارٹ ہمارے بھانجے نوید ریاض صاحب نے مشاقانہ خوبی سے ادا کیا۔

بندہ اپنی سسرال کے ہاں

لمس کے مہمان خانے میں میرا قیام ۱۵ر نومبر سے ۲۷ر نومبر تک رہا۔ ۲۸ر نومبر کی صبح میری بیوی اور خالد غیاث کے بھائی بریگیڈیر خورشید غیاث مجھے اپنے ہاں لے گئے' چار روز اس کشادہ کوٹھی میں مجھے رکھا۔ یہ کوٹھی لمس کے کمپاؤنڈ سے بہت قریب لاہور کے اس نئے علاقے میں ہے جو ڈیفنس (*۱۶) کہلاتا ہے۔ خورشید غیاث اب ریٹائر ہو چکے ہیں (*۱۷)۔ اپنے بزرگ والدین (میرے خسر اور ساس) کو اپنے گھر میں رکھ کر اور ان کی خدمت کر کے ثواب کما رہے ہیں۔

میرے خسر بزرگوار پروفیسر آغا غیاث الدین احمد صاحب کی تاریخ ولادت ۱۹۰۰ء ہے۔ پوری بیسویں صدی کا زمانہ انھوں نے دیکھا۔ میری ساس ان سے دس برس چھوٹی ہیں۔ چناں چہ ان کی عمر بھی اب نوے کے قریب پہنچ چکی ہے۔ آغا صاحب لدھیانہ کے ایک راجپوت خاندان سے ہیں اور میری ساس کا خاندان جالندھر کے پٹھانوں کا ہے۔ اپنی بیوی سے ایک روز ایک بات سن کر بڑا لطف آیا۔ کہنے لگی ہم پٹھانوں میں بیٹی اور بیٹے کا رشتہ ہڈی دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا بی بی تیری شادی مجھ سے ہوئی تو یہ اصول ٹوٹ گیا۔ ہم شہر قصور کے شیخ ہیں۔ ہم لوگوں کی ہڈی کی مضبوطی ہرگز مسلم نہیں۔

آغا صاحب کے خد و خال سے ان کا راجپوت ہونا فوراً پہچانا جاتا ہے۔ پھر یہ آغا صاحب کیوں کہلائے؟ قیاس یہ ہے کہ راجپوتوں کی شادیاں جب پٹھانوں سے ہوئیں تو ان کی اولادوں نے مسلمانوں کی حکومت کے زمانوں میں اپنے خون میں افغانی عنصر کو برتر سمجھا اور ناموں سے آغا کا سابقہ جوڑ لیا۔

آغا صاحب کے دادا (یعنی میری بیوی کے پردادا) جالندھر کے گورنمنٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ہمارے دادا اسی اسکول میں فارسی کے استاد تھے۔ اپنی شادی سے پہلے مجھے اس تعلق کا علم نہ تھا۔ ہماری ساس صاحبہ کے والد (یعنی میری بیوی کے نانا) شجاع الدین خان بمبئی کے پوسٹ ماسٹر جنرل تھے۔ میں نے بابائے اردو کو بتایا تو انھوں نے کہا ہاں بمبئی میں' میں ان کے گھر گیا تھا۔

ہمارے تایا ابا پروفیسر خادم محی الدین سے آغا صاحب کا میل جول کئی برس لائل پور میں رہا۔ آغا صاحب لائل پور کے زراعتی کالج میں نباتیات کے پروفیسر تھے اور تایا ابا گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے۔

آغا صاحب کی شخصیت ایسی ہے کہ ان کی زندگی پر پورا ایک ناول لکھا جا سکتا ہے۔ میری شادی ۱۹۵۰ء میں ہوئی اور شادی کے بعد میں پاکستان میں رہا ہی نہیں۔ دو چار بار زائر ہو کر وہاں گیا تو مختصراً" آغا صاحب کو قریب سے دیکھا۔ بہت سی باتیں ان کی مجھے میری بیوی نے بتائیں۔

ان کے والد بزرگوار فیروزالدین صاحب پولیس انسپکٹر تھے۔ آغا صاحب پہلوٹھی کے فرزند تھے اور باپ کے چہیتے' باپ نے انھیں وکالت کی تعلیم کے لیے لندن بھیجا۔ وہاں سے یہ کامیاب ہو کر آئے۔ پہلا مقدمہ جو انھوں نے لیا اس کی کارروائی دیکھنے کو ان کے والد صاحب بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ آغا صاحب نے اپنے موکل کی حمایت کا ذمہ تو لے لیا لیکن ان کی ہم دردی دراصل اس موکل کے حریف سے تھی۔ یہ ہم دردی انھوں نے اپنی تقریر میں ظاہر کر دی۔ جج صاحب بے حد محظوظ ہوئے لیکن آغا صاحب کے والد صاحب سر پکڑ کر رہ گئے۔

وکالت کے پیشے سے بیٹے کی طبیعت کو مناسبت نہ تھی۔ یہ دیکھ کر باپ نے اب انھیں زراعت کی تعلیم کے لیے امریکا بھیجا۔ کیلے فورنیا یونی ورسٹی سے اس فن میں بی اے کی ڈگری لے کر یہ واپس آئے اور لائل پور کے زراعتی کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ میاں افضل حسین صاحب اس کالج کے پرنسپل تھے۔ آغا صاحب کو میاں صاحب سے جو تقرب نصیب ہوا اور کسی کو نہ ہوا۔ آغا صاحب مضبوط ہڈی والے جوان تھے۔ دراز قد' گٹھا ہوا کسرتی وجود' تناور شیشم کا سا' جبھی تو پٹھانوں نے انھیں داماد بنانا پسند کیا۔ برجس پہننے کا انھیں بہت شوق تھا۔

تھے تو یہ نباتیات کے لیکچرار لیکن طلبہ کو نشست و برخاست کے مغربی آداب اور وضع قطع کے سبق بھی دیتے رہتے تھے' پتلون استری کرتے رہا کرو' جوتا روز پالش کرو' کھانا فرش پر دسترخوان بچھا کر نہ کھاؤ' کرسی پر بیٹھ کر میز سے کھاؤ' چھری کانٹے کا صحیح استعمال کرو' ڈھیلی چال نہ چلو' تن کر چلو۔ ان کی یہ باتیں میاں افضل حسین صاحب کو بے حد اچھی لگیں۔

پنجاب یونی ورسٹی میں جن دنوں طلبہ کی فوجی ٹریننگ کے محکمہ (۱۸*) کا افتتاح ہوا میاں صاحب وائس چانسلر بن چکے تھے۔ انھوں نے آغا صاحب کو اس محکمہ کا ڈائریکٹر بنا دیا۔ اس عہدے کے کرسی نشیں کو ملٹری تنظیم کی طرف سے آنریری لیفٹیننٹ کرنل کا رتبہ تفویض ہوتا ہے اور فوجی وردی پہننے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ آغا صاحب پہلے تو صرف پروفیسر آغا غیاث الدین احمد کہلاتے تھے اب **لیفٹیننٹ**

کرنل آغا غیاث الدین احمد کہلائے۔ پاکستان کے جرنیلوں سے ان کی دوستی ہوئی۔

زراعتی کالج کے احاطہ کا رقبہ سولہ مربع میل ہے۔ اس میں کاشت کاری کی تعلیم کے لیے کھیت بھی ہیں، پھلوں کے باغ بھی، ایک ڈیری بھی ہے اور ایک بیکری بھی۔ مہنگائی سے قبل کے زمانے میں یہاں پروفیسر عیش کرتے تھے۔ برسوں لائل پور میں مہمان نوازیوں اور ضیافتوں کی زندگی گزار کر ۱۹۵۳ء میں آغا صاحب ریٹائر ہوئے۔ کچھ عرصہ پنشن پر گزارا، پھر میاں افضل حسین صاحب نے انھیں امداد دیہات کے سرکاری پروگرام (۱۹*) کا ڈائریکٹر بنوادیا اور کئی برس اس عہدے کے مزے بھی انھوں نے لیے۔

ٹمس کے مہمان خانے سے ۲۸ر نومبر کو جب میں ان کی رہائش گاہ میں منتقل ہوا تو یہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ضعیفی اتنی ہے کہ زیادہ وقت اب ان کا بستر ہی پر گزرتا ہے۔ میری آمد کی اطلاع ان کو دی گئی تو انھوں نے کہا اسے ادھر بھیجو۔ میں نے اندر جا کر سلام کیا تو لیٹے لیٹے مجھے گلے لگایا۔ یہ پچھلے سال (نومبر ۱۹۹۶ء) کی بات ہے جب ان کی عمر چھیانوے تھی (اب ستانوے ہے)۔ فرمایا میں نے ایجوکیشن پر ایک تقریر لکھی ہے، وہ سن لو۔ لیٹے لیٹے انھوں نے مجھے سنائی۔ چار منٹوں کی یہ تقریر انگریزی میں تھی اور انھیں ازبر تھی۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ تعلیم خاص خاص پیشوں کی استعداد کے لیے ہونی چاہیے۔ تقریر جاری تھی کہ میری ساس صاحبہ نے آکر مجھ سے کہا ادھر آجا، خورشید کے بچوں کے پاس بیٹھ۔ آغا صاحب نے جھڑکی دے کر ان سے کہا۔ ''ادھر جا، بات پوری کرنے دے۔'' تقریر ختم ہوئی تو بولے۔ ''اب جاؤ، اماں جی کے پاس بیٹھو۔''

چار روز بعد جب میرے رخصت ہونے کا وقت آیا تو آغا صاحب برآمدے میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ میں ناشتا کر چکا تو مجھے بلایا اور پاس بیٹھنے کو کہا۔ پوچھا مذاہب پر اپنے لیکچروں میں تم کیا کہا کرتے ہو؟ ایسے ''دریاؤ'' سوال کا جواب انکل ہی سے دیا جا سکتا تھا۔ میں نے کہا چشمے کا پانی جب میدان میں آکر دریا بن جاتا ہے تو وہ کھیتیاں سیراب کرتا ہے لیکن پینے کے لائق نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ گدلا ہو چکا ہوتا ہے۔ مذہب ہمارے تزکیہ میں کوشاں رہتا ہے کبھی کامیاب ہوتا ہے کبھی ناکام۔ کوئی زمانہ برکت کا ہوتا ہے کوئی بے برکتی کا۔

میری بات سن کر انھوں نے کہا۔ میں نے بھی مذہب کے مقصد پر غور کیا ہے۔ مذہب کا مقصد ہے کہ چین حاصل ہو۔ پھر فرمایا میں نے امریکا میں ایک کتاب پڑھی، اس میں ایک باب ٹرانس مائیگریشن (۲۰*) پر ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ جب انسان کو غصہ آتا ہے تو وہ ایک اور ہی عالم کو انتقال کر جاتا ہے۔ یہ ٹرانس مائیگریشن ہے اور جب غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو یہ بھی ٹرانس مائیگریشن ہے۔

عابدہ پروین کا مراقبہ

اگلے روز سویرے خالد غیاث نے کہا۔ آج آپ کی ملاقات عابدہ پروین سے کرائیں گے۔ میں نے کہا۔ وہ کہاں اور کس سلسلے میں؟ تو بولے۔ میں نے آپ سے ملاقات کرانے کے لیے اسے ایک جگہ لنچ

کی دعوت دی ہے۔ میں نے جی میں کہا سسرال کے گھر میں آ کر وہ آزادی نہ رہی۔ خالد میاں نے اس لنچ کا تہیہ مجھ سے پوچھے بغیر کر لیا۔

عابدہ پروین کا نام تو میں نے امریکا میں سن رکھا تھا' ان کے گانے کا کوئی ریکارڈ کبھی نہ سنا تھا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ یہ غزلیں گاتی ہیں یا کافیاں گاتی ہیں یا گیت گاتی ہیں یا ماہیا گاتی ہیں۔ خالد میاں ساڑھے گیارہ بجے مجھے اس ہوٹل لے گئے جہاں عابدہ پروین صاحبہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ اسی ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا گیا۔ سارا وقت موصوفہ آنکھیں بند رکھ کر مراقبے کے حال میں رہیں۔ گفتگو پر آمادہ نہ ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ صوفیوں والا یہ انداز انھوں نے حال ہی میں اختیار کیا ہے۔ میں نے سنگیت کے استادوں کا ذکر چھیڑا کہ شاید دلچسپی لیں۔ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ پھر میں نے کہا میں نے راگوں میں خیال کے بول بنائے ہیں۔ اپنے بنائے ہوئے راگ ٹوڈی کے بول میں نے سنائے۔

اپنے آپ سے
گنگنا کر کرے
باتیں اپنے حال چال کی
سوچ بچار سُر تال کی
آپ ہی اپنی سبھا بن جاؤ

بول سن کر آپ نے آنکھیں کھولیں اور بولیں ایک بار پھر پڑھئے۔ میں نے اسے مشاعرے کی داد سمجھ کر بول دہرا دیے۔ انھوں نے آنکھیں بند رکھ کر سنے۔ کھانے کے دوران میں خالد میاں ہی بولتے رہے۔ ایسا لگا کہ نثر میں رباعیاں کہی جا رہی ہیں۔ خود عابدہ پروین صاحبہ صرف دو بار اپنے آپ لب کشا ہوئیں۔ پہلی بار شاہ عبداللطیف کے سندھی کلام سے کچھ پڑھا۔ دوسری بار اتنا کہا۔ میں گانا استاد سلامت علی سے سیکھتی ہوں۔

لنچ کے بعد ہوٹل سے رخصت ہوئے تو موٹر چلاتے ہوئے خالد میاں نے کہا آپ کا سُر اس سے نہ ملا۔ میں نے کہا کوئی مضایقہ نہیں۔ زندگی آزمایش کا نام ہے۔

اورینٹل کالج کی زیارت

میری پکی نیت تھی کہ ایک روز کچھ وقت اورینٹل کالج میں جا کر گزاروں گا۔ وہاں صبح دس بجے پہنچا۔ اردو ادبیات کے پروفیسر اورنگ زیب عالم گیر صاحب سے کچھ مراسلت رہ چکی تھی۔ باہر برآمدے میں کھڑا ان کی آمد کا انتظار کرتا رہا اور اس لان کو دیکھ کر اس کے وہ دن یاد کرتا رہا جب اس پر کھڑے ہو کر شیرانی صاحب اور پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ سگریٹ نوشی کیا کرتے تھے (موہن سنگھ صاحب کا کھلم کھلا سگریٹ پینا ایک عجوبے سے کم نہ تھا اس لیے کہ سکھ قوم میں تمباکو نوشی کی تحریم سختی سے ہے)۔ اب اسی لان پر تیس چالیس طالبات علم اورینٹل کالج کی جمع تھیں۔ میں جب یہاں پڑھتا تھا کالج میں طالبات علم کی

تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی۔

پروفیسر عالم گیر صاحب ایک کلاس کو پڑھا کر فارغ ہوئے تو مجھے خبر ہوئی۔ بے حد تپاک سے ملاقات ہوئی۔ یہ مجھے شعبہ فارسی کے صدر نشین ڈاکٹر آفتاب اصغر صاحب کے کمرے میں لے گئے۔ یہ وہی کمرہ ہے جس میں ڈاکٹر ولنر صاحب اور مولوی شفیع صاحب پرنسپل ہو کر بیٹھے۔ ہمارے والد صاحب پرنسپل ہوئے تو یہ کمرہ خالی پڑا رہا۔ انھوں نے اپنے پرانے کمرے کو چھوڑ دینا خلافِ وضع سمجھا۔ ایک سال سے زیادہ پرنسپل والا خالی کمرا میرے استعمال میں رہا۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں' میں نے عربی شاعری کا کورس ایم اے کی کلاس کو اسی کمرے میں بیٹھ کر پڑھایا اور خانۂ خالی کو دیو کے قبضے سے بچائے رکھا۔

پروفیسر عالم گیر صاحب اور پروفیسر آفتاب اصغر صاحب نے کہا۔ اسٹاف روم میں چل بیٹھتے ہیں وہاں دیگر اساتذہ فراغت کے اوقات میں آجاتے ہیں ان سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔ اسٹاف روم میں ایک فارسی کے لیکچرر بیٹھے تھے انھوں نے تھوڑی دیر بعد یہ کہہ کر اجازت چاہی کہ اب ان کے درس کا گھنٹہ ہے۔ پروفیسر آفتاب اصغر صاحب نے ان سے کہا۔ اپنی کلاس یہیں کیوں نہیں لے آتے۔ ہم اپنے مہمان کی باتیں سن رہے ہیں کیوں نہ آپ کی کلاس بھی سننے میں شریک ہوں۔ لیکچرر صاحب تین چار منٹوں میں دوسری منزل سے کلاس کو اتار لائے۔ اسٹاف روم میں تیس چالیس کرسیاں مہیا ہیں۔ طلبہ بیٹھ گئے تو پروفیسر آفتاب اصغر صاحب نے جدید فارسی میں میرا تعارف کرایا اور پھر اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں کالج کے گزشتہ ایام کی کچھ یادیں بیان کروں۔

مجھے اپنی تقریر کا پہلا جملہ یاد ہے۔ "کہاں سے شروع کروں؟" جس سٹاف روم میں اب ہم بیٹھے تھے اسی کے در و دیوار نے تمہید جما دی۔ میں نے کہا میں اس کالج میں ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء ایم اے عربی کا طالب علم تھا پھر میکلوڈ پنجاب عربک اسکالر کی حیثیت سے ۴۸-۱۹۴۷ء میں' میں نے یہاں عربی شاعری والا کورس پڑھایا۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی گاہے گاہے میں اس سٹاف روم میں آ بیٹھا کرتا تھا۔ جن اساتذہ کو اپنے مخصوص کمرے میسر نہ تھے وہ وقتاً فوقتاً یہاں استراحت کے لیے آ بیٹھتے تھے' لیکن خاموش ہی رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے کچھ تو عربی کے استاد تھے کچھ سنسکرت کے۔ اپنے اپنے سمندروں کے غواص' درس نظامیہ کے فارغ التحصیل مولانا محمد رسول خاں یاغستانی آخر شاستروں کے وِدوان پنڈت سوریا کانت سے کیا کہتے۔ جانبین ایک دوسرے کو الٹے لوگ سمجھتے تھے۔ کتراتے تھے اور نظریں نہ ملاتے تھے۔ اورینٹل کالج میں ہر تدریسی سال کے اختتام پر تقسیم انعامات کا جلسہ ہوتا تھا اور سارے طلبہ کے ساتھ اساتذہ کا گروپ فوٹو کھینچا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے اپریل میں جو گروپ فوٹو کھینچا گیا میرے پاس امریکا میں محفوظ ہے۔ یہ یادگار فوٹو ہے۔ یہ آخری موقع تھا کہ ہندو' سکھ اور مسلمان طلبہ اور اساتذہ سبھی گروپ فوٹو میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے بعد یکایک کالج کی فضا بدل گئی۔ سنسکرت' ہندی اور گورمکھی کی تدریس متروک ہوئی۔ ہندو اور سکھ طلبہ اور استادوں کی موجودگی داستان ہو کر رہ گئی۔

اس تمہید کے بعد میں نے والد صاحب اور مولوی شفیع صاحب کے تعلقات کا ذکر چھیڑا۔ دونوں

بزرگوں کا وطن قصور تھا اور پنجابی دونوں کی مادری زبان تھی لیکن چھ سال علی گڑھ کالج میں تعلیم پاکر والد صاحب اردو والوں ہی سے میل جول پسند کرنے لگے تھے۔ ان کے بہترین دوست سب اردو کے اہل زبان تھے۔ شمس العلما مولوی عبدالرحمان' مولوی عبدالعزیز میمن' حافظ محمود خاں شیرانی' ڈاکٹر برکت علی قریشی' بابائے اردو مولوی عبدالحق' ڈاکٹر اظہر علی' ڈاکٹر ہادی حسن۔

ہلکا سا اشارہ میں نے اس رقابت کی طرف بھی کیا جو والد صاحب اور مولوی شفیع صاحب کے درمیان کیمبرج ہی میں شروع ہوگئی تھی جو سرکاری وظیفہ کیمبرج کی تعلیم کے لیے مولوی شفیع صاحب کو ۳۲ر سال کی عمر میں ملا تھا وہی والد صاحب کو ۲۴ر برس کی عمر میں مل گیا۔ ایک اور بات یہ ہے کہ پرنسپل کی حیثیت سے شفیع صاحب بہت سخت گیر تھے اور غصیلے آدمی تھے۔ بہرحال تحمل والد صاحب کا شیوہ تھا۔ دونوں بزرگوں کے درمیان مغائرت نہ تھی بلکہ کچھ کچھ محبت بھی تھی۔

شفیع صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے ان کی میسن روڈ والی کوٹھی میں حاضر ہونا شروع کیا اور پانچ مہینے ایم اے عربی کے نصاب کی بعض عبارتیں ان کی مدد سے پڑھتا رہا۔ میرے اس تلمذ سے مولوی صاحب کو بہت خوشی حاصل ہوئی۔ ریٹائر ہو کر تنہائی آپ کو بہت محسوس ہو رہی تھی۔ میری آمد و رفت سے ان کا جی بہلا۔ پھر میں نے والد صاحب اور شیرانی صاحب کی دوستی کا تذکرہ کیا۔ والد صاحب ۱۹۲۲ء میں کیمبرج سے فارغ التحصیل ہو کر لاہور آئے۔ شیرانی صاحب اسی سال لاہور کے اسلامیہ کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ دونوں کی دوستی اسی سال شروع ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں شیرانی صاحب بھی اورینٹل کالج میں آگئے اور یہاں سے ۱۹۴۰ء میں ریٹائر ہوئے۔

والد صاحب ۱۹۲۶ء میں (جو میرا سن ولادت ہے) انار کلی بازار کے ایک کرائے والے مکان سے اٹھ کر ماڈل ٹاؤن منتقل ہو گئے۔ ماڈل ٹاؤن کی آبادی کا ابھی آغاز تھا' زیادہ تر وہاں جنگل ہی تھا۔ شیرانی صاحب کو شکار کا بہت شوق تھا۔ شکاریوں کی لمبی ٹارچ اور بندوق لے کر سنیچر کی شام آجاتے اور اتوار کی شام تک ہمارے ہاں رہتے' خرگوش کا شکار کھیلا جاتا۔

والد صاحب ہر جمعرات کو پچھلے پہر شیرانی صاحب کے فلیمنگ روڈ والے گھر جاتے۔ شربت پیتے اور دو گھنٹے وہاں گزارتے۔ چودہ برس یہ معمول دونوں کے درمیان رہا۔ ریٹائر ہوئے تو شیرانی صاحب کا جی لاہور چھوڑنے کو نہ چاہتا تھا۔ اہل و عیال کو ٹونک بھیج کر خود ماڈل ٹاؤن میں ہمارے گھر آ ٹھہرے۔ ساری گرمیاں یہیں گزاریں۔ ٹونک سے بلاوا سخت ہوا تو دل پر پتھر رکھ کر رخصت ہوئے۔

ان گرمیوں میں تحقیق اور مقالے نگاری جاری رکھی۔ ہمارے گھر کے پائیں باغ میں جامن کے درخت کے نیچے کھری چارپائی پر بیٹھ کر مطالعہ کرتے۔ میں پاس بیٹھا رہتا۔ والد صاحب کی لائبریری میں فارسی شعرا کے کئی تذکرے موجود تھے۔ ان میں سے کسی کی ضرورت پڑتی تو مجھ سے کہتے۔ "شیخ' فلاں کتاب لاؤ۔" کبھی مجمع الفصحاء' کبھی نفحات الانس' کبھی مجالس المومنین' کبھی تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔ یہیں جامن کے درخت کے نیچے انہوں نے مجھے رباعی کی تقطیع کا وہ طریقہ سمجھایا جو ان کی

اپنی اختراع تھا۔ مجھ سے کہا اردو کی کوئی رباعی یاد ہے؟ میں نے مرحوم کی ایک رباعی پڑھ دی جس کے صرف پہلے دو مصرعے اب مجھے یاد ہیں۔

آٹا مصنوعی اور گھی مصنوعی
مل جاتے ہیں دودھ اور دہی مصنوعی

اس کے چاروں مصرعوں کی تقطیع اپنے ایجاد کیے ہوئے فارمولے کے حساب سے کرکے سمجھائی۔ تبرکاً یہ فارمولا یہاں درج کیا جاتا ہے۔

	مفاعلاتن	فعلن
مستفعلتن	مفعولاتن	فعلن
مفعولاتن	مفتعلاتن	فعلان
		فعلان

شیرانی صاحب کے تذکرہ کے بعد میں نے کیمبرج کے ان تین استادوں کا ذکر کیا جن سے اولاً سر محمد اقبال کو، پھر مولوی شفیع صاحب کو اور ان کے بعد میرے والد صاحب کو تلمذ رہا۔ پروفیسر براؤن، پروفیسر نکلسن اور پروفیسر بے ون۔ میں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ مولوی شفیع صاحب نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پروفیسر براؤن اور پروفیسر بے ون کو تو بے حد عقیدت مندی سے یاد کیا لیکن پروفیسر نکلسن کو اپنا استاد نہیں مانا۔ اس بارے میں میرا جو قیاس تھا میں نے بیان کیا، وہ یہ کہ ممالک اسلامیہ سے جو طلبہ کیمبرج آتے تھے پروفیسر نکلسن صاحب اپنی ریسرچ میں ان سے مدد لیتے تھے لیکن اپنی تصانیف میں اس مدد کا اعتراف نہ کرتے تھے۔ مثنوی معنوی کے انگریزی ترجمہ اور ترجمہ کے حواشی کے لیے انھیں مثنوی کی شرحوں کو دیکھنا تھا۔ اس میں انھوں نے ایرانی طلبہ اور علما سے مدد لی ہوگی۔ اس مدد کا کوئی اعتراف ترجمے کے دیباچے میں نہیں کیا۔

میرے ذہن میں اس قیاس کی تائید اس بات سے ہوئی کہ والد صاحب نے بھی نکلسن صاحب کا ذکر مجھ سے کبھی نہ کیا۔ پروفیسر براؤن اور پروفیسر بے ون ہی کے حسن اخلاق اور تبحر کی تعریف کی۔

میں نے سامعین کو اس بات سے آگاہ کیا کہ ایم اے عربی کا جو نصاب مولوی شفیع صاحب کی تجویز سے ۱۹۱۸ء میں پنجاب یونی ورسٹی نے قرار دیا وہ انھی منتخبات پر مشتمل تھا جو شفیع صاحب نے اور والد صاحب نے کیمبرج کے تین استادوں سے پڑھے۔ ۱۹۴۵ء میں ایم اے عربی کے لیے میں اورینٹل کالج میں داخل ہوا تو وہی نصاب برقرار تھا۔ اس میں مندرجہ ذیل کتابوں کے کچھ حصے شامل تھے۔ ابن قتیبہ کی کتاب "الشعر والشعراء" "المبرد کی کتاب "الکامل" "البلاذری کی "فتوح البلدان" "دیوان الطفیل الغنوی" اور "دیوان الطرماح ابن الحکیم"

کالج کے اسٹاف روم کی اس تقریب نے مجھے موقع دیا کہ یہاں کے طلبہ اور اساتذہ کرام کو اپنی عزیز یادوں میں شریک کروں۔ اس کے لیے میں پروفیسر آفتاب اصغر صاحب اور پروفیسر اورنگ زیب عالم

کیر صاحب کا احسان مند ہوں۔ اس تقریب کے بغیر اس زیارت میں کچھ بات جچ والی پیدا نہ ہوتی۔

مکتبہ سنگِ میل میں سموسے

اورینٹل کالج کی زیارت سے فارغ ہو کر میں ہائی کورٹ کے عقب میں اعجاز حسین بٹالوی صاحب کے دفتر پہنچا' موٹر پر بٹھا کر یہ مجھے سنگ میل کے دفتر لے گئے۔ وہاں گرامی جناب شیخ نیاز احمد صاحب نے تکریم کے ساتھ پذیرائی فرمائی۔ ان کی مہربانی سے میرے اردو مکاتیب کی کتاب "سلام و پیام" ابھی دنوں چھپ کر بازار میں آچکی تھی۔ شیخ صاحب کے دو فرزند بھی وہاں بیٹھے تھے۔ اعجاز نے وہاں بیٹھے ہوئے پوچھا۔ "دوپہر کا کھانا تم نے کھایا یا نہیں؟" میں نے کہا "نہیں۔" شیخ صاحب نے سنتے ہی گرم گرم بہترین سموسے منگائے۔ اعجاز نے ایک کھایا۔ میں نے دو کھائے۔

نیشنل کالج آف آرٹس میں ایک لیکچر

دوسرے روز صبح لاہور کے نیشنل کالج آف آرٹس میں ایک لیکچر مجھ سے وہاں کے پروفیسر مظفر غفار صاحب نے دلوایا۔ مظفر غفار صاحب راگ دار آدمی ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۹۳ء میں ہوئی تھی اور انھوں نے شاکر علی میوزیم میں میرے گانے کی ایک محفل منعقد کرائی۔ اب پھر ان کی فرمائش تھی کہ گانا ہو جائے۔ میں نے بعض وجوہ سے تامل کیا تو انھوں نے کہا' گانا نہیں منظور تو ہمارے کالج میں ایک لیکچر ہی دے دیجئے۔ میں نے کہا۔ اچھی بات' میرے لیکچر کا موضوع ہو گا "بعض انگریز اور امریکی اسکالروں کے مزاجوں کا پتا ان کی تصانیف میں"۔

آرٹس کا کالج "بھنگیوں کی توپ" کے سامنے لاہور میوزیم کے احاطے میں ہے۔ اگلے وقتوں میں یہ میو اسکول آف آرٹس (*۲۱) کہلاتا تھا۔ احاطے میں داخل ہوا تو بڑی گہما گہمی نظر آئی۔ لس کے احاطے والی اداسی یہاں نہ تھی۔ یہ کلا کاری کا کالج ہے کاروبار کا کالج نہیں۔ فیض احمد فیض کی دختر سلیمہ ہاشمی صاحبہ اس کی پرنسپل ہیں۔ مظفر غفار صاحب مجھے ان کے پاس لے گئے۔ آپ ایک چوکس اور فرض شناس نگہبان کی طرح اپنے معاونین کو اور طلبہ کو ہدایات دے رہی تھیں اس لیے ان سے باتیں نہ ہو سکیں۔ ان کے اشارے سے چائے منگائی گئی۔ دو گھونٹ میں نے پیئے۔ مظفر غفار صاحب نے کہا۔ چلیے' حاضرین منتظر ہیں۔ جلسہ کے ہال میں پہنچا تو بہت بڑا مجمع موجود تھا۔

یہ لیکچر راہ چلتے بغیر تیاری کے دیا گیا۔ حافظے کی گٹھری میں ہاتھ ڈال کر جو موضوع ہاتھ لگا اسی پر بولنے لگا' اس امید میں کہ تقریر شروع کروں گا تو بات سے بات نکلے گی۔ یہ لیکچر اس خیال کا اظہار تھا کہ کلا کاروں کی طرح اسکالروں کے بھی مزاج ہوتے ہیں اور ان کی تصانیف ان کے مزاجوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس کی مثالیں اردو میں لکھنے والے مصنفین کے زمرے سے بھی دی جا سکتی تھیں لیکن جی میں آئی کیوں نہ دو ایک مغربی اسکالروں سے تعارف کرایا جائے۔

پروفیسر وولفرڈ صمتھ صاحب (*۲۲) کے ذکر خیر سے بات شروع کی۔ ان سے کئی برس میرا میل جول

رہا۔ یہ ایک پادری کے بیٹے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں کینیڈا میں پیدا ہوئے۔ ہارورڈ یونی ورسٹی سے ریٹائر ہو کر اب کینیڈا کے شہر ٹورانٹو میں رہتے ہیں۔

آغازِ شباب میں یہ علی گڑھ کی ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ (*۲۳) اور لاہور کے فورمن کرسچن کالج سے لیکچرار کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ ماڈل ٹاؤن کے ایف بلاک میں چار سال مقیم رہے۔ انھوں نے علی گڑھ اور لاہور میں اردو سیکھی۔ ایف سی کالج کے استاد فرزند علی صاحب سے مسدس حالی کا سبق لیا۔ ہمارے دیس کی آزادی سے ذرا پہلے ان کی تصنیف "دورِ جدید میں ہندی مسلمانوں کا اسلام" (*۲۴) لاہور کے ایک مطبع (*۲۵) سے چھپی۔ یہ کتاب مارکسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی۔ ایک گفتگو میں سمتھ صاحب نے مجھے بتایا کہ اپنے لڑکپن کے دنوں میں کینیڈا کے بعض نوجوانوں کی مارکسی تحریک سے متاثر ہو کر یہ مارکسی ہو گئے تھے۔

ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ اور فورمن کرسچن کالج مشنریوں کے ادارے تھے۔ سمتھ صاحب مشنری تنظیم کے بھیجے ہوئے ہندوستان آئے تھے۔ جب ان کی کتاب سے مشنریوں کو ان کے مارکسی خیالات کا علم ہوا تو فورمن کرسچن کالج میں ان کی لیکچراری کا خاتمہ ہوا۔ امریکا پہنچ کر مصر کی صحافت سے متعلق مقالہ لکھ کر انھوں نے پرنسٹن یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی پھر کینیڈا کی میک گل یونی ورسٹی کے شعبہ الٰہیات میں پروفیسر ہو گئے۔ اس یونی ورسٹی میں انھوں نے اسلامیات کی انسٹی ٹیوٹ کی بنا ڈالی' یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

چند سال بعد یہ ہارورڈ یونی ورسٹی کے ادارۂ تحقیقاتِ مذاہبِ عالم (*۲۶) کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس منصب کے فرائض سے ان کی دلچسپیوں میں تبدیلی آئی۔ اسلامیات سے ان کا جو خاص تعلق پہلے تھا برقرار نہ رہا' سارے مذاہب کی شناسائی لازم ہوئی۔ ہندومت اور بدھ مت سے مانوس ہونے لگے۔

ان کی بیش تر نگارشوں کا مقصد قارئین کو اس بات سے خبردار کرنا ہے کہ مذہب جامد نہیں ہوتے' عہد بہ عہد نئے رنگ لاتے رہتے ہیں۔ چناں چہ یوں بات کرنا کہ اسلام یوں کہتا ہے اور ہندومت یوں کہتا ہے اور بدھ مت یوں کہتا ہے اور مسیحیت یوں کہتی ہے' بے معنی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ فلاں عہد کے اور فلاں ملک کے مسلمان یا ہندو یا مسیحی کیا کہتے ہیں اور فلاں مسلمان کا دل کیا کہتا ہے اور فلاں ہندو کا دل کیا کہتا ہے اور فلاں مسیحی کا دل کیا کہتا ہے۔ اصول تو سمتھ صاحب کا معقول ہے لیکن ان کے لکھے ہوئے مباحث میں مثالوں کا فقدان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا علم کتابی رہا اور ان کے مراسم دوسری ملتوں کے خواص و عوام سے نہایت محدود رہے' پھر مثالوں کے لیے حکایات کہاں سے آتیں؟

ان کی نگارشات میں آزاد خیالی کی تبلیغ ہے۔ عمر بھر یہ چین کے متلاشی رہے لیکن ان کا اضطراب دور نہ ہوا۔ لڑکپن میں یہ مارکسی ہوئے اور آگے چل کر مارکسی خیالات سے ان کا جی اچاٹ ہوا۔ سرکشی ان کی طبیعت میں تھی لیکن یہ رند نہ ہو پائے۔ پادری کے بیٹے تھے' مزاج زاہدانہ اور ناصحانہ رہا' بذلہ

سمجھی نہ آئی۔ کوئی ہم نشیں لطیفہ سنا کر انھیں ہنسائے تو ہنستے ہیں خود لطیفہ کبھی نہیں سناتے۔

ارادہ تو تھا کہ سمتھ صاحب کے تذکرے کے بعد اسلامیات کے اور دو تین اسکالروں سے تعارف کراؤں لیکن سمتھ صاحب کے تذکرہ میں بیس منٹ نکل گئے۔ باقی آدھ گھنٹے میں میں نے سامعین کو اپنی بعض گفتگوؤں کی یاد میں شریک کیا جو بعض اسکالروں سے ہوئیں۔ بہ طور مثال صرف ایک گفتگو یہاں دہراتا ہوں۔

امیریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنسز کا ایک سالانہ اجلاس بوسٹن میں ہوا۔ اس کے ایک رکن نے مجھے اس اجلاس میں مہمان کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی۔ اجلاس میں علم الانسان (*۲۷) کے ماہر پروفیسر کلی فورڈگی ارٹز (*۲۸) صاحب کا لیکچر جاوا کے مسلمانوں کے بارے میں ہوا۔ انھوں نے جاوا جا کر وہاں کی معاشرت کا جائزہ لیا تھا اور اپنے مشاہدات قلم بند کر کے ایک کتاب شایع کی تھی جس سے خوش ہو کر اسی سال اکیڈمی نے انھیں ایک خاص اعزاز سے نوازا تھا۔

اس لیکچر میں انھوں نے کہا کہ امریکا میں تو فرد کا مرتبہ اس کے کسب کمال اور کارگزاری سے متعین ہوتا ہے لیکن جاوا کے مسلمانوں میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں تعین اس حساب سے ہوتا ہے کہ تم شیوخ کی اولاد سے ہو یا سادات ہو یا چودھریوں کے خاندان سے ہو یا حکیموں کی نسل سے ہو یا کسی قاضی کے پڑپوتے ہو یعنی اپنے مورثوں کی بڑائی جتا کر وہاں فرد اپنی حیثیت بناتا ہے۔

ان کے لیکچر کے بعد سوال جواب ہوئے تو میں نے اٹھ کر کہا۔ اس لیکچر میں اندھی تعمیم ہے۔ ایسا حساب کسی بھی معاشرے میں نہیں ہو سکتا۔ محلے میں یا پورے قصبے میں فرد کی حیثیت اس کے کردار سے بنتی ہے۔ وہ دیانت دار ہے یا بد دیانت' ملنسار ہے یا روکھا' ہنس مکھ اور شگفتہ ہے یا رونی صورت' مہماں نواز ہے یا مردم بے زار' کنبہ پرور ہے یا غیر ذمہ دار' ذی علم ہے یا انجان' دلیر ہے یا بزدل' خوب رو ہے یا سادہ رو' خوش گفتار ہے یا بے مزہ گفتگو کرتا ہے وغیرہ۔ جاوا کا معاشرہ اس سے مستثنیٰ کیسے ہو سکتا ہے۔

جناب سعید شیخ صاحب کے گھر میں ایک شام

آرٹس کالج کے اس لیکچر کے بعد تقریر بازی سے مجھے فراغت ہوئی۔ باقی وقت میں خوش نصیبی سے ایک نہایت اچھی شام رسالہ "علامت" کے مدیر جناب سعید شیخ صاحب کے گھر میں گزری۔ اتفاق سے مشفق خواجہ صاحب کراچی سے اور افتخار عارف صاحب اسلام آباد سے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ شیخ صاحب نے ضیافت کے لیے انھیں مدعو کیا تو اعجاز بٹالوی صاحب کو اور مجھے بھی بلایا۔ دعوت میں ریاض احمد صاحب' جیلانی کامران صاحب اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اور لاہور کے پوسٹ ماسٹر جنرل نصیرالدین شیخ صاحب بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اس صحبت میں شوق ظاہر کیا کہ اقبال اکیڈمی میں ان سے آکر ملوں۔ دوسرے روز دوپہر کے وقت وہاں پہنچا۔ چند ادیب ان کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ وحید صاحب نے تلی ہوئی چٹ پٹی مچھلی سب کے لیے منگائی۔ سب نے مزے لے کر کھائی۔ اقبال

اکیڈمی کی مطبوعات کی فہرست وحید صاحب نے میرے سامنے رکھ کر کہا جو عنوان پسند آئے اس پر نشان لگا دیجئے۔ میں نے چند عنوانوں پر نشان لگائے۔ ان عنوانوں والی کتابوں کا عطیہ چند منٹوں کے بعد میرے آگے میز پر لا کر رکھ دیا گیا تو میں شکر گزار ہوا۔

الحمرا ہال میں میرا گانا

عروس البلاد لاہور کے اس قیام کی تان وہیں آکر ٹوٹی جہاں اسے ٹوٹنا چاہیے تھا۔ آل پاکستان میوزیکل کانفرنس کے اہتمام سے یکم دسمبر کی شام الحمرا ہال میں مجھے گلوکاری کا موقع دیا گیا۔ میں نے اپنی پسند کی بعض راگنیاں خیال گائیکی میں پیش کیں۔ سنگت کے لیے بہترین سازندے میرے ساتھ بیٹھے۔ استاد ناظم نے سارنگی پر سنگت فرمائی۔ یہ اعزاز پروفیسر غزالہ عرفان اور حیات احمد خاں صاحب کی مہربانی سے مجھے دسمبر ۱۹۹۳ء میں بھی حاصل ہوا تھا۔

اگلے روز (۲ر دسمبر کو) پچھلے پہر میں طیارہ سوار ہوا اور دو گھنٹوں میں کراچی کے ہوائی اڈے پر جا اترا۔

چار روز کراچی میں

کراچی کی فرودگاہ پر مرحبا کہنے کو میرے محسن اور قدردان گرامی جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب تشریف لائے۔ آپ نے اپنے کرم نامے میں مجھے لکھا تھا کہ میں آپ کے گھر میں قیام کروں۔ میں نے اپنے خط میں اظہار تشکر کے ساتھ گزارش کی تھی کہ کراچی میں میرا اپنے بھائی محمد ایوب کے ہاں ٹھہرنا مناسب ہے۔ ۱۹۸۸ء کے بعد اس سے ملنا نہیں ہوا۔ ہمارے تین بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں' یہی ایک بھائی اب زندہ ہے۔ یہ مسکین اور نادار ہے' اس کے ہاں نہ ٹھہرا تو اس کا جی برا ہوگا۔ فرودگاہ پر یہ بھائی اپنی بیٹی کے ساتھ میرے استقبال کو موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے میں ایوب کی موٹر میں سوار ہو گیا۔

ایوب مجھ سے ڈیڑھ برس بڑا ہے۔ بچپن میں اس کی رفاقت گھر میں تو تھی ہی لیکن اسکول اور کالج میں بھی ایسی رہی گویا ہم ایک دوسرے کے ہم زاد تھے۔ والد صاحب نے ماڈل ٹاؤن کے پرائمری اسکول کے پہلے درجے میں ہم دونوں کو ایک ہی وقت داخل کرا کر ہم جماعت کر دیا۔ ہم میٹرک تک اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج میں انٹرمیڈیٹ کے دو برس "بلا ناغہ" ہم جماعت رہے۔ مسلسل ایک ہی کلاس روم میں' بارہ برس ہم جماعت رہنے سے یاروں کی شرکت غیر معمولی ہوئی۔ دو بھائیوں کے درمیان ایسی شرکت کی مثال تاریخ عالم میں مشکل سے ملے گی۔ اسکول اور کالج میں' میں محنتی نہیں تھا۔ صورت حال یہ تھی۔

ہم نے تصویریں بنائیں اور دو نغمے لکھے
مدرسے میں مولوی جی درس کچھ دیتے رہے

برعکس اس کے ایوب کی مستعدی اور فرض شناسی مثالی تھی۔ مطالعہ پورے دھیان سے کرتا۔ ماسٹر صاحبان "گھر کا کام" دیتے تو اسے پوری دیانت سے کر کے اسکول لے جاتا۔ ریاضی کے ماسٹر جو گھر کا کام

دیتے تھے اسے میں نے ہمیشہ بے کار سمجھا۔ ایوب کی طبیعت کو اس سے موافقت تھی۔ یہ سوالات حل کر چکتا تو میں اس سے کاپی لے کر سب کچھ نقل کر لیتا۔ خوشی سے یہ اس "چوری" کی اجازت دیتا۔ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول میں ریاضی کے ماسٹر غضنفر علی صاحب تھے۔ میرے بھائی کی صابر صورت دیکھ کر کلاس روم میں کبھی کبھی یہ شعر گنگنایا کرتے تھے۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے واسطے محبوب کیا
صبرِ ایوب کیا' گریۂ یعقوب کیا

انٹرمیڈیٹ پاس کرکے میں بی اے کے لیے گورنمنٹ کالج ہی میں رہا۔ یہ پنجاب یونی ورسٹی کے ہیلی کالج آف کامرس میں داخل ہو گئے۔ وہاں فارغ التحصیل ہونے میں تین سال لگتے تھے۔ اس کالج کے طلبہ کی تعداد تین سو کے قریب تھی۔ ذرا خیال فرمایئے مسلمان طالب علم تین برس کے عرصے میں سارے کالج میں صرف میرا یہ بھائی ہی تھا۔ باقی سب کے سب ہندو تھے۔ ایسی وجوہ ہی سے تو پاکستان کا بننا ضروری ہوا۔ اس کالج میں اپنی بے مثال سلامت طبع اور سنجیدگی کی بدولت محمد ایوب صاحب بغیر کسی کوشش کے طلبہ کی یونین کے صدر منتخب ہوئے۔

ہمارے والد صاحب کی ان کو وصیت تھی دیکھو نوکری نہ کرنا' تاجر بن کر خوب کمانا اور مخیر ہو کر ہسپتال اور درس گاہ کھلوانا۔ پاکستان کے قایم ہوتے ہی یہ حبیب بینک میں نوکر ہو گئے۔ ضیا محی الدین کے بہنوئی اشرف ریاض صاحب نے اپنی تجارتی کمپنی میں انھیں شرکت کی پیشکش کی۔ انھوں نے قبول کر لی اور حبیب بینک کی نوکری چھوڑ دی۔ اس کمپنی کا ایک دفتر کراچی میں تھا ایک ڈھاکے میں۔ ڈھاکے والا دفتر ایوب کے سپرد ہوا۔ بڑی دیانت سے کام کرتے رہے۔ چند سال بعد اس شرکت سے الگ ہو کر لاہور میں انھوں نے مشینوں اور ان کے پرزوں کی درآمد کی تجارتی کمپنی کھولی۔ اس کاروبار میں خاطر خواہ کام یابی نہ ہوئی۔ کئی عیار تاجروں نے ان کی مسکینی کا فایدہ اٹھایا' بڑی بڑی رقمیں مار لیں۔ مقدمہ بازی ان کے مزاج میں نہ تھی۔ رشوت دینے کو گناہ کبیرہ سمجھتے تھے' پھر کام یابی کیسے ہوتی ع

پاک سرزمین شاد باد

اب یہ ریٹائر ہو کر کراچی میں رہتے ہیں۔ سنگیت کا انھیں بھی شوق ہے۔ دل رُبا بجاتے ہیں۔ اس پر بہت ریاض کیا اور ہاتھ رواں ہو گیا۔ البتہ یہ ریاض طبلے کی سنگت کے بغیر ہوا۔ اس لیے دل رُبا پر جو کچھ بجاتے ہیں الاپ ہی ہوتا ہے۔

ان کے بچپن کی ایک بات یاد آئی جو ضبط تحریر میں آجانی چاہیے۔ ۱۹۳۲ء میں (جب ان کی عمر سات برس تھی) والد صاحب نے کینوس کی چھت والی بے بی آسٹن (۲۹*) موٹر کار خریدی' یہ صرف سات ہارس پاور والی کار تھی یعنی اس کا زور سات گھوڑوں کے زور برابر تھا۔

کار آئی تو اس کا "ہوٹا" لینے کو گھر کے سب اطفال بے تاب ہو گئے (کسی گاڑی پر خالصاً تفریح کے لیے سواری کی جائے تو پنجابی میں اسے "ہوٹا لینا" کہتے ہیں)۔ بے بی آسٹن گھر کے احاطے سے نکل کر

دو فرلانگ چلی ہوگی کہ ایوب نے سرخوشی کا ثبوت یہ کہہ کر دیا۔

"ہن اسی وی گھٹا اڑایا کراں گے"

(اب ہم بھی گرد اڑایا کریں گے)

طبع کی ایسی رسائی اللہ کی دین ہے۔

حمید نسیم صاحب کی مہمان نوازی

ان کی مہربانی سے دو ضیافتیں قیام کراچی کے چار دنوں میں ہوئیں۔ ایک کراچی کے ایک کلب ہاؤس میں۔ یہاں میزبانی حمید نسیم صاحب کی تصانیف کے ناشر طارق رحمان صاحب نے فرمائی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب، مشفق خواجہ صاحب اور مشتاق احمد یوسفی صاحب بھی شریک ہوئے۔ دوسری ضیافت حمید نسیم صاحب کے گھر میں ہوئی۔ بلایا تو انھوں نے چائے کی دعوت کہہ کر لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ چائے ڈنر کے پیمانے پر تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اپنی موٹر پر بٹھا کر حمید نسیم کے گھر لے گئے۔ مشفق خواجہ صاحب اور آفتاب احمد خاں صاحب بھی تشریف لائے۔ تکلف یہاں سامان ضیافت میں ضرور تھا گفتگو میں ہرگز نہ تھا۔

حمید نسیم صاحب کی زبان سے پہلے لاہور میں اور پھر کراچی میں دو انکسار دو تین بار سنے۔

"میں نادار آدمی ہوں۔"

"میں گنہ گار آدمی ہوں۔"

ان کے دل سے نکلے ہوئے یہ جملے سن کر ان سے ہم دردی ہوئی۔ ناداری کی پہلی بات تو یہ ہے کہ اسے دور کرنا دنیاداری کے بغیر نہیں ہو سکتا اور دوسری یہ کہ اس کے بغیر آدمی درویش نہیں کر سکتا۔

انکسار، ایثار، فقر اور ترکِ دنیا خوب ہیں

پر کسی کی بے کسی سب سے بڑی سچائی ہے

اور گنہ گاری کا قصہ یہ ہے کہ ہم سب گنہ گار اور بخشش کے امیدوار ہیں۔ پیدا کرنے والے نے حمید نسیم صاحب کو شاعر کا دل اور مترنم طبیعت دی تو ان کا خشک زاہد ہو کر رہ جانا ممکن نہ تھا۔ اعتراف تو اس بات کا کرنا چاہیے کہ جمال پرستی کے ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے اور سوچنے کی جتنی ریاضت عمر بھر انھوں نے کی اس کی مثال پاکستان کے گزشتہ پچاس برسوں میں کم ہی کسی کی زندگی میں ملے گی۔ ان کی آپ بیتی اور دیگر آثار قلم کے بارے میں، میں نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ چند قسطیں اس کی رسالہ "علامت" میں چھپ چکی ہیں۔ آٹھ دس قسطوں کا لکھنا باقی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی طرف سے خاطرداریاں

کراچی میں ٹھہرا تو میں اپنے برادر محمد ایوب کے گھر میں لیکن میزبانی میں صاحب جود و سخا ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب سحر و شام شریک رہے۔ چار روز کے قیام میں جہاں جہاں مجھے پہنچنا تھا اپنی کار میں بٹھا کر

پہنچایا اور ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ ۵؍ دسمبر کی شام اپنی کوٹھی میں پچیس تیس احباب کو میرا گانا سنوانے کے لیے مدعو فرمایا' سنگت کے لیے حمید نسیم صاحب ریڈیو سٹیشن سے سازندوں کو لے آئے۔ یوں تو جتنے مہمان وہاں جمع ہوئے سب سنگیت کا ذوق رکھتے ہیں لیکن حمید نسیم صاحب' ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب' لطف اللہ خاں صاحب' بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری اور عذرا ضیا محی الدین کا اس محفل میں موجود ہونا معمولی بات نہ تھی۔ یہ سب راگ دار لوگ ہیں۔ بڑی بڑی محفلیں سنگیت کی انھوں نے دیکھی ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب مجھے بتا چکے تھے کہ سابق میں اسی گھر میں شاہد احمد دہلوی نے کئی بار گایا اور استاد بندو خاں صاحب نے کئی بار یہاں آکر سارنگی سنائی۔ اس لیے اس گھر کے در و دیوار سے میں اس میں داخل ہوتے ہی مانوس ہو گیا۔ میرے گانے کے دوران میں مشفق خواجہ صاحب نے کئی فوٹو کھینچے۔ ڈیڑھ گھنٹے گانا ہو چکا تو شرکائے محفل ڈائننگ روم میں پہنچے۔ ضیافت کی کشادہ میز الوان نعمت سے معمور تھی۔ نمکین اور میٹھی چیزیں سب بیگم صاحبہ نے اپنے ہاتھ سے تیار کی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب میرے محسن ہیں۔ جب میں نے ریٹائر ہو کر فلوریڈا میں رہائش اختیار کی تو ان دنوں آپ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین کی حیثیت سے اسلام آباد میں رہتے تھے۔ امریکا سے آغا بابر صاحب وہاں گئے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کی دعوت کی۔ آغا صاحب نے امریکا آکر مجھے فون کیا اور کہا ڈاکٹر صاحب خواہش مند ہیں کہ تم "نیا دور" کے لیے کوئی مضمون لکھ کر انھیں بھیجو۔ اس پیغام سے میرا اردو میں لکھنے کا شوق تازہ ہوا۔ قلم اٹھایا تو پھر لکھنا کئی مہینے جاری رہا اور پانچ چھ ابواب لکھ کر میں نے ڈاکٹر صاحب کو بھیجے۔ اس سلسلہ کا عنوان "کلچر کے روحانی عناصر" رکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سارے ابواب یک جا کر کے "نیا دور" کے ایک خاص شمارہ میں اپنی بڑی قدر افزا تقریظ کے ساتھ چھپوا دیے۔ ان کی اس قدر دانی سے میری اردو نویسی جو کئی سال رکی رہی تھی پھر چل پڑی۔ یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے۔

گانے کی محفل میں ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اور ان کے فرزندِ اقبال مند ڈاکٹر آصف فرخی صاحب بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کی فرمائش کی تعمیل میں میں نے رسالہ "اردو" کے لیے میرزا داغ کا تذکرہ لکھا۔ "اردو" کے دو شماروں میں شامل ہو کر یہ تذکرہ شایع ہوا۔ یہ فرمائش بھی احسان تھی۔ تلطف کا جو برتاؤ لاہور اور کراچی میں میرے ساتھ ہوا میں نے اسے اپنی اردو نگاری کا انعام سمجھا۔

محفل موسیقی کے بعد اگلے روز ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب شام کو مجھے اپنے گھر لے گئے وہاں آپ کی بیگم صاحبہ نے مجھے یاقوت کا ایک ہار دے کر کہا یہ انیسہ بٹی کے لیے ہے۔ میں نے فلوریڈا پہنچ کر بٹی کو یہ ہار دیا تو اسے اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے مطالعہ کا کمرا بھی دکھایا۔ اس کمرے کی ساری دیواروں پر فرش سے چھت تک شیلف جڑے ہوئے ہیں۔ ایک مضبوط چوپایہ سیڑھی شیلفوں کے بالائی حصوں سے کتابیں اتارنے کے لیے موجود ہے۔ بیش تر حصہ ڈاکٹر صاحب کی لائبریری کا اس کمرے میں ہے لیکن بہت سی کتابیں گھر میں اس کمرے سے متصل رقبے میں شیلفوں پر آراستہ ہیں۔ قلمی نسخوں کی الماری الگ

ہے۔ غیر مجلّد کتابوں اور ادھڑی ہوئی جلدوں والی پرانی کتابوں کی خوب صورت جلد بندی انھوں نے کرا کر انھیں محفوظ کیا ہے۔ یہ لائبریری اردو ادبیات کی ہے لیکن اس میں فارسی کتب بھی شامل ہیں۔ کتابوں کی تعداد چھتیس ہزار کے قریب ہے۔

۱۹۸۸ء میں، میں مشفق خواجہ صاحب سے ملنے ناظم آباد گیا تو وہاں ان کی ذاتی لائبریری بھی دیکھی۔ وہ بھی زبردست لائبریری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ بعض کتابیں جو وہاں نہیں ہیں یہاں موجود ہیں اور جو یہاں موجود نہیں وہ وہاں موجود ہیں۔

وجیہہ الدین احمد صاحب (ابنِ مولانا صلاح الدین احمد)

کراچی میں چند گھنٹے خلوت میں اپنے بچپن کے ہم جولی وجیہہ الدین احمد کے ساتھ بھی گزارے۔ یہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی ضیافت میں بھی موجود تھے۔ میں نے شنکرا کا خیال گایا، اس کی آستھائی کے بول ہیں :

گون چراوے ہری ہواری

گانا ہو چکا تو وجیہہ نے کہا شنکر تو شو مہاراج کا نام ہے۔ کرشن مراری کی کہانی کے بول شنکرا راگ کے لیے مناسب نہیں۔ میں نے کہا۔ تم ٹھیک کہتے ہو، میراثی لوگوں نے بہت سے بے تکے بول بنائے ہیں۔ وجیہہ کا دماغ بات کی تہ کو کھٹ سے پہنچتا ہے۔ شنکرا کا خیال سن کر انھوں نے جو تبصرہ کیا ان کی ژرف بینی کی مثال ہے۔

انھوں نے ایم اے سائیکالوجی میں پاس کیا۔ ان کی پہلی نوکری لکھنؤ کے جیل سے وابستہ تھی۔ پاکستان سول سروس میں آکر انھوں نے سرحدی علاقوں میں کافی وقت گزارا۔ سرحدی لوگوں کی صحبتیں انھیں بہت پسند آئیں۔ پشتو بول کر انھیں مزا آیا۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دور کے آخر میں یہ راولپنڈی کے کمشنر تھے۔ ایوب خاں صاحب سے وفاداری کی پاداش میں یہ بھٹو صاحب کے معتوب ہوئے۔ سول سروس سے الگ کردیے گئے تو یونائیٹڈ نیشنز کے ملازم ہو کر دس برس قاہرہ میں رہے اور پھر جنرل ضیاء الحق نے انھیں صحافت کی نگرانی کا کوئی عہدہ دیا۔ پریس پر جو پابندیاں تھیں ان کی زیادتی سے بے لطف ہو کر مستعفی ہوگئے۔ اب کراچی میں خلوت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

انگریزی اور اردو میں ان کا مطالعہ حیرت انگیز ہے۔ ڈاکٹر جانسن کی طرح کئی طرح کی چیزیں پڑھتے ہیں۔ گزشتہ تین چار سال انھیں سید احمد شہید کے قافلہ کی داستان سے شغف رہا۔ اس سے متعلق انھوں نے بہت کچھ پڑھا۔ خواہش رکھتے تھے کہ اس پر کچھ لکھیں لیکن اب ضعیفی بڑھ گئی ہے اور لکھنے کی سکت نہیں۔ کم سخن ہیں لیکن کسی موقعے پر زبان کھولتے ہیں اور اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو سننے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ افسوس اہلِ قلم نہ ہوئے، اگر لکھتے تو مبصروں میں ممتاز ہوتے۔

چوں کہ سائیکالوجی ان کا خاص مضمون ہے، میں نے اب کے ان سے پوچھا کارل یونگ کے بارے

میں تمھاری کیا رائے ہے؟ بولے "یونگ بہت بڑا فراڈ ہے۔" یہ برملا تبصرہ سن کر مزا آ گیا۔ تخلص رکھ کر میں تو صرف نام کا رہبر ہوں۔ میرے لڑکپن کے زمانے میں تفریح اور تفنن کے اشغال میں وجیہہ الدین احمد میرے رہنما تھے۔

انجمن ترقیٔ اردو کی نئی عمارت کی زیارت

یہ عمارت جو گلشن اقبال میں ہے 'اب کے میں نے پہلی بار دیکھی۔ میری یادیں تو شاردا مندر (ہسپتال روڈ) سے وابستہ تھیں جہاں ۱۹۴۷ء میں دریا گنج دہلی سے ہجرت کر کے انجمن پناہ گزیں ہوئی تھی۔ ہسپتال روڈ کا نام اب بابائے اردو روڈ ہے۔ بابائے اردو کا مزار اسی پرانی عمارت کے ایک گوشے میں ہے۔ انجمن کی نئی عمارت میں ایک تقریب میری خوشی کے لیے جناب آفتاب احمد خاں (حالاً "صدر انجمن) اور جناب مشفق خواجہ صاحب (سابقاً "صدر انجمن) کی مہربانی سے ممکن ہوئی۔

آفتاب احمد خاں گورنمنٹ کالج میں چار سال میرے ہم جماعت رہے۔ ان سے بڑی مزے کی دوستی تھی۔ ان کے والد صاحب کی سرکاری ملازمت دہلی میں تھی اور ان کے ماموں پروفیسر عبدالمجید خاں لاہور کے فارمن کرسچن کالج میں پڑھاتے تھے۔ آفتاب صاحب کالج کے زمانے میں اپنے ماموں کے ساتھ رہتے تھے۔ مستی ان کی گھٹی میں پڑی تھی جب بھی ان کو دیکھا ترنگ کے حال میں پایا۔ میر کا یہ مصرع اکثر ان کے زبان پر رہتا ع

یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں

کالج کے قابل ترین طلبہ میں سے تھے۔ انھیں باری تعالیٰ سے قوی حافظہ عطا ہوا تھا۔ اس پر مطالعے کا غیر معمولی شوق۔ اقتصادیات میں انھوں نے انتہائی امتیاز کے ساتھ ایم اے پاس کیا۔ اس فن میں ان کی قابلیت سے حکومت پاکستان مستفید رہی۔ لیکن ان کی علمیت اقتصادیات ہی میں نہ تھی' انگریزی اور اردو ادبیات کا مطالعہ اپنے شوق سے انھوں نے جاری رکھا۔

مشفق خواجہ صاحب سے میری مراسلت برسوں رہی لیکن پہلی ملاقات ۱۹۸۸ء میں ان کے مسکن مبارک میں ہوئی جو ناظم آباد میں ہے۔ اس روز یہ قمیص اور پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اب کے انھیں لاہور اور کراچی میں سوٹ میں ملبوس دیکھا۔ آپ کی مہربانی سے انجمن کا رسالہ "قومی زبان" کئی برس مجھے امریکا بھجوایا جاتا رہا جس سے اردو کی خبریں مجھے ملتی رہیں۔ لاہور میں ان سے ملتے ہی میں نے کہا تھا انجمن کی تقریب کے لیے میں ایک مضمون اورینٹل کالج کے ڈاکٹر مولوی شفیع صاحب کے علمی کارناموں کے بارے میں لکھ کر لایا ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ وہاں کے سامعین کو مولوی شفیع صاحب کے کارناموں سے کچھ ایسی دلچسپی نہ ہوگی۔ اس محفل میں آپ بابائے اردو سے اپنے اور اپنے والد صاحب کے تعلقات پر گفتگو کریں۔ میں نے کہا بہتر۔

انجمن کی محفل میں گفتگو

اس محفل میں بیس پچیس ادیب تشریف لائے۔ صدر انجمن آفتاب احمد خاں' انجمن کے معتمد اعزازی جمیل الدین عالی صاحب' خازن انجمن ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اور حمید نسیم صاحب رونق افروز ہوئے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو حیدر آباد (سندھ) جانا تھا وہ شریک نہ ہو سکے۔ کاش وہ بھی موجود ہوتے۔ میں نے کہانی کا آغاز ۱۹۲۰ء کے وفد خلافت کے ذکر سے کیا۔ مولانا محمد علی کی قیادت میں یہ وفد اس سال مارچ کے مہینے میں لندن پہنچا۔ مولانا سلیمان ندوی اور سید حسن امام بھی اس وفد کے رکن تھے۔ یہ تینوں بزرگ پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن سے ملنے کیمبرج بھی پہنچے' (۳۰*) پروفیسر براؤن فارسی اچھی طرح بول سکتے تھے۔ انھوں نے میرے والد صاحب کا تعارف ان مہمانوں سے بہت اچھے الفاظ میں کرایا۔

پروفیسر براؤن جن دنوں "تاریخ ادبیات ایران" کی تیسری جلد کے ابواب لکھ رہے تھے' والد صاحب نے مولانا شبلی کی "شعرالعجم" ہندوستان سے منگا کر براؤن صاحب کو پیش کی اور اس کی بعض عبارتوں کا ترجمہ انگریزی میں کر کے براؤن صاحب کو شبلی کی سخن فہمی سے متعارف کیا۔ پروفیسر صاحب بہت متاثر ہوئے۔ سلمان ساوجی اور خواجہ حافظ کے کلام پر مولانا شبلی کے تبصرہ کی بعض عبارتیں ترجمے کی صورت سے اپنی کتاب میں شامل کیں۔

ہندوستان واپس آکر والد صاحب کو معلوم ہوا کہ مولانا نے پروفیسر براؤن کی "تاریخ ادبیات ایران" کی عبارتیں کسی ترجمان سے پڑھوا کر سنیں اور اس تصنیف کو "واقعات کی کھتونی" کہہ کر اس کی تحقیر کی۔ اس سے والد صاحب کی طبیعت مکدر ہوئی۔ شیرانی صاحب نے تنقید "شعرالعجم" کا سلسلہ شروع کیا تو والد صاحب کا جی خوش ہوا۔ شیرانی صاحب سے ان کی دوستی ہو ہی چکی تھی۔ دیکھا دیکھی "شعرالعجم" کے عمر خیام والے باب پر ایک تنقید والد صاحب نے بھی لکھ ڈالی اور استاد کی تحقیر کا بدلہ لیا۔ شیرانی صاحب کی صلاح سے یہ تنقید انھوں نے رسالہ "اردو" میں اشاعت کے لیے مولوی عبدالحق صاحب کو بھیج دی' یہیں سے مولوی صاحب سے ان کے مراسم کا آغاز ہوا۔ یہ تنقید رسالہ "اردو" میں چھپ گئی۔

سید سلیمان ندوی صاحب نے یہ تنقید پڑھ کر ندوۃ المصنفین کے رسالہ "معارف" میں ایک نوٹ لکھا۔ وہ نوٹ کچھ یوں تھا کہ کیمبرج میں ایک نوجوان طالب علم محمد اقبال سے ہمارا تعارف بڑی تعریف کے ساتھ کرایا گیا اور ہم نے اسے رشید اور سعادت مند سمجھا۔ اب "اردو" میں "شعرالعجم" کے ایک باب پر اس کی لکھی ہوئی تنقید پڑھی تو افسوس ہوا کہ خردوں کے دلوں سے بزرگوں کی فضیلت کا احترام جاتا رہا۔ سید صاحب کا یہ نوٹ "معارف" میں پڑھ کر والد صاحب کو عمر بھر ندامت رہی۔

والد صاحب کا عاشق اردو ہونا مولوی عبدالحق صاحب کو شیرانی صاحب سے معلوم ہوا۔ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاسوں میں بابائے اردو سے والد صاحب کی ملاقاتیں ہوئیں۔ دل ایک دوسرے کی طرف کھنچے۔ والد صاحب ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے منظور نظر شاگرد تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں

علی گڑھ یونی ورسٹی کورٹ کا ممبر ہوا دیا تھا۔ کورٹ کی میٹنگ کے لیے والد صاحب ہر سال علی گڑھ جایا کرتے تھے۔ وہاں بھی والد صاحب کا اچھا ذکر مولوی عبدالحق صاحب کے کانوں میں پڑتا رہا۔

علامہ اقبال کی تجویز پر ادارہ معارف اسلامیہ قایم ہوا تو اس کی انتظامیہ کمیٹی نے والد صاحب کو اس کا سیکریٹری بنا دیا۔ ۱۹۳۸ء میں اس کا اجلاس سوم دہلی میں منعقد ہوا۔ یہاں مولوی صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ والد صاحب کے مراسم ہمارے ہندوستان کی یونی ورسٹیوں کے اساتذہ عربی و فارسی سے کیسی محبت کے ہیں۔

مولوی صاحب اوّل اوّل جب کبھی لاہور آتے تھے "ہمایوں" کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد صاحب (فرزند جسٹس شاہ دین ہمایوں) کے ہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ وہاں ایک ملاقات میں والد صاحب نے ان سے کہا۔ اگلی بار آپ آئیں تو میرے ہاں ٹھہریں۔ مولوی صاحب نے یہ دعوت قبول فرمائی اور کچھ مدت بعد لاہور آکر ماڈل ٹاؤن میں ٹھہرے۔

والد صاحب کی سحر خیزی کی عادت' صبح اٹھ کر ان کا سیر کے لیے جنگل کی طرف نکل جانا' واپس آکر بجلی کی کیتلی میں پانی ابال کر اپنے ہاتھ سے چائے بنانا' یہ باتیں مولوی صاحب کو بہت اچھی لگیں۔ طبیعتوں کی موافقت سے دل مل گئے۔ ہماری والدہ کی وفات جب ہوئی والد صاحب کی عمر پینتیس تھی۔ انھوں نے دوسری شادی نہ کی۔ مولوی صاحب کو ان کا "تجرد" بھی پسند آیا اور پھر ایک بڑی بات یہ ہے کہ والد صاحب باوجود خلوت پسندی کے اپنے محبوب دوستوں سے بہترین گفتگو کرتے تھے۔

دوسری بار مولوی صاحب ماڈل ٹاؤن آکر ہمارے گھر میں ٹھہرے تو میری عمر چودہ برس تھی۔ میں ان کی بزرگانہ شان سے ذرا نہیں اس لیے کہ ان کی گفتگو اور ان کے بشرے میں شریر بچوں والی کچھ بات تھی۔ میں ان دنوں باغ بانی کیا کرتا تھا۔ میں نے ان سے کہا آیئے میں آپ کو پھول مٹر کی قطاریں دکھاؤں۔ چودہ پندرہ قطاریں اپنی سینچی ہوئی میں نے دکھائیں' مولوی صاحب کا دل باغ باغ ہوا۔ گھوم کر واپس آرام کرسی پر آبیٹھے۔ سید ہاشمی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ انھوں نے خندۂ دلاویز کے ساتھ کہا۔ "میاں تیاں!" مولوی صاحب نے والد صاحب سے کہا۔ اپنا یہ بیٹا مجھے دے دیجیے' والد صاحب بولے یہ معاملہ آپ کے اور اس کے درمیان ہے۔ میں بیچ میں کیوں بولوں۔

اگلی بار مولوی صاحب تشریف لائے تو حسب معمول ان کے ہاتھ میں ایک پرانی گھسی ہوئی اور میلی چھتری تھی۔ والد صاحب نے انھی دنوں ایک نئی چھتری خریدی تھی۔ مولوی صاحب سے ان کی پرانی چھتری لے کر انھوں نے رکھ لی اور نئی چھتری انھیں پیش کی۔ ایک حقہ بھی خرید کر پیش کیا۔ پرانی چھتری ہمارے گھر میں ایک الماری کے پیچھے چند روز پڑی رہی۔ اس کو دیکھ کر میں نے مولوی صاحب کو اپنی زندگی میں پہلا خط لکھا کہ میں اس چھتری کو متبرک جان کر محفوظ رکھوں گا اور میری خواہش ہے کہ میں آپ کا عصائے پیری بن جاؤں۔

کچھ مدت بعد ایک اور سلسلے میں ان سے مراسلت ہونے لگی۔ والد مرحوم کے بڑے بھائی پروفیسر

خادم محی الدین نے انجمن سے پروفیسر براؤن کی "تاریخ ادبیات ایران" کی تیسری جلد کا اردو ترجمہ کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔ بعض وجوہ نے انھیں ترجمہ جاری رکھنے سے مانع رکھا۔ کوئی دو سال گزر چکے تھے اور تیس چالیس صفحات سے زیادہ ترجمہ نہ ہو پائے تھے۔ مجھے علم ہوا تو میں نے مولوی صاحب کو لکھا کہ میں یہ ترجمہ کر دیتا ہوں۔ انھوں نے بہ خوشی اجازت دے دی۔ ۱۹۴۳ء کی گرمیوں میں کشمیر جا کر میں نے بیش تر حصے کے ترجمے کا مسودہ تیار کر لیا۔ ۱۹۴۵ء میں مبیضہ بھی مکمل ہو گیا۔ اس دوران میں مولوی صاحب سے مراسلت برابر جاری رہی۔

انجمن نے ۱۹۴۶ء کی اشاعتوں کے پروگرام میں اس کا اعلان کیا لیکن اس سال دلی میں بلوے ہوئے۔ ۱۹۴۸ء تک قیامت آئی رہی۔ انجمن کا دفتر لوٹ مار سے بچا نہ رہا۔ مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ میرے ترجمے کا مسودہ بچ رہا ہوگا۔ دلی سے مولوی صاحب کا خط آیا تو میں نے ایک خط لکھ کر ان سے درخواست کی کہ میرا مسودہ اگر مل جائے تو مہربانی فرما کر اپنے ساتھ لاہور لیتے آئیے گا۔ مولوی صاحب ماڈل ٹاؤن آئے، بستر کھول کر اس میں سے ایک پیکٹ نکال کر مجھے دیا۔ مسودہ صحیح سلامت میرے پاس آگیا۔ اس کی کتابت اور چھپائی لاہور میں میری نگرانی میں ہوئی۔ ۱۹۴۹ء میں یہ ترجمہ شایع ہوا۔ پاکستان آکر انجمن نے مطبوعات کا جو سلسلہ شروع کیا اس کی بسم اللہ اس ترجمے کی اشاعت سے ہوئی۔

مولوی صاحب کی اور کئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ میں نے تقریر کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ تقریر کے بعد چار پانچ منٹ سوال جواب ہوئے۔ پھر شرکائے محفل نے چائے پی۔

چائے نوشی کے دوران میں جناب جمیل الدین عالی صاحب (جو نواب علاء الدین خاں علائی کے نواسے ہیں) مجھے دو تین منٹوں کے لیے برابر والے کمرے میں لے گئے۔ وہاں انھوں نے میز پر ایک بہت بڑی تقطیع والا ایک کاغذ کھول کر مجھے دکھایا۔ یہ لوہارو خاندان کا شجرہ تھا۔ نواب شمس الدین خاں کے نام پر انگلی رکھ کر انھوں نے کہا دیکھ لیجیے اس شجرہ میں ان کی کسی نرینہ اولاد کا نام درج نہیں۔ مطلب اس جملے کا یہ تھا کہ خاندان کے لوگوں نے داغ کو شمس الدین خاں کا پسر تسلیم نہیں کیا۔

معانقوں اور ضیافتوں اور متفرق تقریبوں سے بھرے تین ہفتے لاہور اور کراچی میں گزار کر ۲ر دسمبر کو بندہ صبح سویرے نور کے تڑکے کراچی کی فرودگاہ پر پہنچا۔ طیارہ مجھے اور میرے ہم سفروں کو لے کر جانب امریکا اڑا تو رکھوالن نے مجھ سے پوچھا آپ کو کوئی اخبار چاہیے؟ میں نے نفی میں سر ہلایا کہ سیاست کی خبروں سے منھ کا مزا کیوں خراب کروں۔

بے نظیر بھٹو کا خیال کیوں نہ آتا! اس خیال سے میری سوچ رام پور کے باغ بے نظیر کے میلے کی طرف گئی۔ یہ باغ نواب احمد علی خاں نے لگوایا تھا۔ اس میں ہر سال بڑے ٹھاٹھ کا میلہ لگتا تھا جو بے نظیر کا میلہ کہلاتا تھا۔ سارے ہندوستان کے کمال یہاں اپنے ہنر دکھانے آتے تھے۔ ڈیرہ دار طوائفیں سازندوں کے طائفے لے کر آتی تھیں۔ اسی میلے میں مرزا داغ کی ملاقات منی بائی حجاب سے ہوئی تھی۔ سب میلے اپنے اپنے وقت کے میلے ہیں۔

حواشی

*۱۔ Lahore University of Management Sciences.

*۲۔ An Historian's Approach to Religion.

*۳۔ یہ مقالہ انگریزی میں ہے۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (لاہور) کے رسالہ "المعارف" میں چھپ چکا ہے۔ (جنوری، مارچ ۱۹۹۳ء)

*۴۔ ان کے عنوان یہ تھے:

1. Life in The Days of Monarchy.
2. The Confusion of Monarchical and Democratic Values in Our Times.

*۵۔ Psychiatrist

*۶۔ Marketing

*۷۔ Dannon Yogurt Company

*۸۔ Village

*۹۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

*۱۰۔ "بالِ جبریل" میں اس عنوان کے نیچے اقبال نے یہ نوٹ لکھا ہے:

یہ اشعار جو عبدالرحمان اوّل کی تصنیف سے ہیں تاریخ المقری میں درج ہیں۔ مندرجہ ذیل اردو نظم ان کا آزاد ترجمہ ہے (درخت مذکورہ مدینۃ الزہرا میں بویا گیا تھا)۔

*۱۱۔ اتفاق سے صبا اکبر آبادی کے ایک مجموعۂ کلام کا عنوان بھی یہی ہے۔

*۱۲۔ الطاف گوہر صاحب کے چھوٹے بھائی۔

*۱۳۔ اعجاز نے بتایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر قبل نے مری کے قریب ایک بنگلہ بنوایا (شاید نتھیا گلی میں) وہاں یہ احباب کی میزبانیاں کرتے رہتے ہیں۔

*۱۴۔ The Sunshine Boys

*۱۵۔ Neil Simon

*۱۶۔ Defense مجھے معلوم نہیں اس علاقے کا نام ڈیفنس کس وجہ سے ہے۔

*۱۷۔ ان کا آخری عہدہ گورنمنٹ میں یہ تھا:

Principal, Wapda Administration and Staff College, Lahore

*۱۸۔ Officers Training Corps

*۱۹۔ Village Aid Programme

*۲۰۔ Transmigration۔ تناسخ۔

*۲۱۔ Mayo School of Arts

*۲۲۔ Wilfred Cantwell Smith

*۲۳۔ Henry Martyn Institute of Islamic Studies

*۲۴۔ Modern Islam in India

*۲۵۔ Civil and Military Gazette Press, Lahore

*۲۶۔ Center for the Study of World Religions

*۲۷۔ Anthropology

*۲۸۔ Clifford Geertz

*۲۹۔ Baby Austin

*۳۰۔ والد صاحب نے مجھے بتایا کہ وہاں ایک گروپ فوٹو کھینچا جانے لگا تو مولانا محمد علی سگار پی رہے تھے۔ فوٹو گرافر نے کہا۔ دھوئیں سے فوٹو خراب ہو گا' سگار آپ کے ہاتھ میں نہیں ہونا چاہیے۔ گروپ کے پیچھے چند طالب علم کھڑے ہوئے تھے۔ مولانا نے گردن موڑ کر سگار ایک ہندوستانی طالب علم کو تھما دیا۔ ایک لمحے کے بعد پھر مڑ کر اس سے کہا۔ "میاں اسے پھینک نہ دینا۔ غریب مسلمانوں کا روپیہ ہے۔"

جمیل الدین عالی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

"اے مرے دشتِ سخن" اور جمیل الدین عالی

جمیل الدین عالی رواں صدی کے نصف آخر کے ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے منفرد اسلوب اور اندازِ فکر کی بنا پر سب سے الگ نظر آتے ہیں۔ الگ نظر آنے کے یہ معنی نہیں کہ جن لوگوں کے درمیان وہ رہ بس رہے ہیں یا جس فضا میں سانس لے رہے ہیں' ان سے لاتعلق ہیں۔ مراد یہ ہے کہ بات کہنے کا لب و لہجہ' طرزِ فکر اور الفاظ کا فنی برتاؤ معاصر شعرا سے بہت الگ ہے۔ لہجے کی تازگی' فکر کی توانائی اور لفظوں کی موسیقیت نے باہم مل کر عالی کی شاعری میں ایک ایسا آہنگ' ایسا تیکھا پن' ایسی چاشنی اور ایسا ذائقہ پیدا کر دیا ہے کہ ان کی شاعری پچھلی پچاس سالہ اردو شاعری کے انبار میں آسانی سے پہچان لی جاتی ہے۔ چناں چہ یوں تو ان کے یہاں کہیں کہیں فیض احمد فیض کا دھیما لہجہ بھی مل جائے گا' بعض مقامات پر ن م راشد کی فارسی بردوش لفظی پیکر تراشی اور میراجی کے اظہار کی بے باکی اور ایک آدھ جگہ جوش ملیح آبادی کے رومانی اندازِ فکر و نظر کا پرتو بھی دکھائی دے گا' لیکن یہ چیزیں عالی کی شاعری میں اس طور پر نہیں آئیں کہ عالی کو فیض و راشد یا جوش و میراجی کا خوشہ چیں کہا جا سکے۔ عالی کی شاعری کی ڈگر ان سب سے الگ ہے۔

قومی و ملی نغموں سے قطعِ نظر' عالی کے چار شعری مجموعے اب تک سامنے آ چکے ہیں۔ "غزلیں' دوہے' گیت" "لاحاصل" "جیوے جیوے" اور "اے مرے دشتِ سخن"۔ یہی آخر الذکر شعری مجموعہ اس وقت پیشِ نظر ہے۔ ہرچند کہ اس مجموعے میں بھی وہی اصناف شامل ہیں جن سے اس سے پہلے کے مجموعے مزین ہیں لیکن یہ اس کی ظاہری صورت ہے۔ باطن و معنی کے اعتبار سے "اے مرے دشتِ سخن" عالی کے دوسرے مجموعوں سے بہت مختلف ہے۔ دوسرے مجموعوں سے صرف یہی نہیں کہ مطالعے سے قبل ہی ان کے مشمولات کا واضح اندازہ ہو جاتا ہے بلکہ بعض ناموں خصوصاً "لاحاصل" جیسے نام سے تو وہ تاثر بھی ڈھکا چھپا نہیں رہتا جو خود شاعر نے ان سے قبول کیا ہے لیکن "اے مرے دشت سخن" کا معاملہ جدا ہے۔ اس کے تیور یکسر بدلے ہوئے ہیں۔ اس کے نام کا ندائیہ لہجہ داد و فریاد یا ترحم طلبی کا لہجہ نہیں بلکہ مصافِ زندگی میں بے خطر کود پڑنے اور ناسازگار حالات سے پورے مقاومت کے ساتھ نبرد آزمائی کا لہجہ ہے۔ یہ دشت وہ دشت نہیں جو اپنی فتح مندی و سیرابی کی خبریں' علامہ اقبال سے لے کر فیض احمد

فیض تک اس طور پر دیتا رہا ہے کہ۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے
(اقبال)

ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں
(فیض)

عالی کے پاس کسی خاص موضوع کو مہارتِ فن کا محور بنا لینے کے حوالے سے وہ نسب نامہ بھی نہیں کہ وہ میر انیس کی طرح یہ ادعا کر کے ذرا دیر کو اپنا جی خوش کر لیتے کہ۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

رہ گیا' وحشتِ دل اور جنونِ عشق کے حوالے سے دشت کا وہ عمومی استعارہ جس نے اردو کو اس نوع کے بعض خوب صورت اشعار دیے ہیں۔

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد
(ہوس' شاگرد میر)

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت' پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
(ذوق)

سو' یہ استعارہ بھی اردو فارسی شعرا کے کثرتِ استعمال سے ایسا پامال ہوا کہ اپنی افادیت کھو بیٹھا اور اس میں جرأتِ رندانہ و ہمتِ مردانہ کا جو عنصر کار فرما تھا وہ بھی بے قدر و بے اثر ہو گیا اور پھر جب استعارے کے اس عنصر پر غالب نے یہ کہہ کر۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

ضرب کاری لگا دی تو اس استعارے کی رہی سہی وقعت بھی باقی نہ رہی۔ البتہ جس وقت جنوبی ایشیا میں سال ہا سال کی غلامی کے بعد سامراج کے خلاف جمہور کی آواز بلند ہوئی اور مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی تو علامہ اقبال نے اپنے اس نوع کے اشعار۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

کے ذریعے دشت کے استعارے کو از سرِ نو حیات افروز بنادیا۔ اسی نوع کے بعض حیات افروز استعارے، اقبال سے پہلے غالب کے یہاں بھی مل جاتے ہیں لیکن اس وقت جنوبی ہند کے مسلمانوں پر ایسی گہری نیند طاری تھی کہ غالب کے اس نوع کے شعر بھی۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

دیوانے کا خواب لگے اور انھیں بیدار نہ کرسکے۔ نتیجتاً محکومی و غلامی نے ان کے اجتہادی فکر کے سوتوں کو تادیر منجمد رکھا البتہ جیسے ہی غلامی کی زنجیر ٹوٹی اور مسلمانوں کو آزاد مملکت کے شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملا تو ان کے اجتہادی سوچ کے وہ دروازے جو ان پر کئی سو سال سے بند ہو چکے تھے، دوبارہ کھل گئے نئی علوم کی تازہ ہواؤں نے ان کے دل و دماغ میں تازگی و بالیدگی پیدا کی، سائنس و فلسفہ سے لے کر تصوف و مابعد الطبیعیات تک سارے مسائلِ حیات کے بارے میں ان کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ چناں چہ اسی بدلے ہوئے اندازِ فکر کی ایک تازہ مثال عالی کا مجموعۂ کلام "اے مرے دشتِ سخن" ہے۔

"اے مرے دشتِ سخن" اسم علم کی صورت میں ایک ندائی فقرہ ہے لیکن اس ندائی فقرے کا لب و لہجہ اس انداز کا نہیں ہے کہ "چل مرے خامے بسم اللہ" بلکہ اس کا انداز زندگی کے خطرات و مسائل سے بے جھجک آنکھ ملانے، ان کے حل میں اجتہادِ فکر سے کام لینے اور اپنے عہد کے ہمرہانِ سست گام کو غالب کا یہ شعر سنا کر آگے بڑھ جانے کا انداز ہے۔

عشق اگر مرد است، مردے تابِ دیدار آورد
ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد
(غالب)

اس اندازِ نظر کا سائبان بہ حیثیتِ مجموعی "اے مرے دشتِ سخن" کی ساری فضا پر چھایا ہوا ہے اور صاف پتا دیتا ہے کہ عالی نے پچھلے پچیس تیس برسوں میں بہت پڑھا ہے، بہت سوچا ہے اور جو کچھ سوچا اور پڑھا ہے اسے جذبات میں تحلیل کرکے شعر کا قالب دے دیا ہے۔ سائنس کی روز افزوں ایجادات و تکنیکی فتوحات سے ان کو بہت گہری اور خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ چناں چہ تاریخ انسانی کے جلو میں انھوں نے ان ایجادات و فتوحات کو جس طرح دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے اور جس انداز سے شعر کا موضوع بنایا ہے، ان کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی نے بنایا ہو۔ خاص بات یہ ہے کہ نئے علوم و مطالعات کے اخذ کردہ خیالات کو انھوں نے خام مواد کے طور پر الفاظ پر خواہ مخواہ لادنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسی وقت کچھ کہا ہے جب کہ یہ خیالات، جبرِ اندروں کے تحت خود بہ خود زبان پر آ گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ فکرِ تازہ اور مسائلِ نو کے حوالے سے عالی نے جو کچھ کہا ہے وہ درونِ خانہ کے ہنگاموں کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا ہے۔ اس لیے اگر وہ یہ دعویٰ کریں کہ۔

مجھے انفعالِ غم نے ہے عرضِ حال بخشی
ہوسِ غزل سرائی تپشِ فسانہ خوانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی
(غالب)

تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ "اے مرے دشتِ سخن" میں بہت کچھ کہہ دینے کے بعد بھی عالی جی جتنا کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کہہ نہیں سکے۔ ان کی سوچ کی بھٹی ابھی اسی طرح دہک رہی ہے اور وہ ہم سے یہ کہتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ۔

غزلے زدم کہ شاید بنوا قرار آید
تبِ شعلہ کم نہ گردد ز گسستنِ شرارہ
(اقبال)

چناں چہ اگر آپ ان سے سوال کیجئے کہ آپ کو آخر کیا چیز مستقلاً "بے تاب و مضطرب رکھتی ہے اور آپ کس قسم کے غم کی آگ میں جل کر اندر سے پگھلے اور راکھ ہوئے جارہے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ کچھ نہ بتا سکیں گے اور سوال کے جواب میں غالب کا یہ شعر سنا کر خاموش ہو جائیں گے کہ۔

نہ شرر رفتہ ز جا و بجا ماندہ رماد
سوختم لیک نہ دانم بچہ عنوانم سوخت
(غالب)

عالی کے بارے میں یہ باتیں بلا دلیل نہیں کہی جارہی ہیں۔ "اے مرے دشتِ سخن" کا ورق ورق ان کا شاہد ہے اور پورا مجموعہ قاری سے اپنے مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو پھر قاری کو کم از کم اس کتاب کی چند نظموں خصوصاً "ایک سادہ سی تقریب" "جھجی" "امکان" "چھپکلی کا دماغ" "گوار کے بھٹکے" اور "بے یقینی" پر ایک نظر ضرور ڈال لینی چاہیے کہ ان سے عالی کی رسائیِ فکر اور علوئے فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جن نظموں کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے یہ نظمیں اپنی فنی حیثیت یعنی اظہار و ابلاغ کے باب میں نہ تو خالص استعاراتی ہیں نہ بیانیہ، نہ تو انھیں ترچھی ٹیڑھی (oblique) کہا جاسکتا ہے نہ راست (direct) بلکہ دونوں کے بین بین ہیں اور ان کا اسلوبِ فکر و فن، قاری کو ایسے انبساطِ ذہنی اور نشاطِ روح سے ہم کنار کرتا ہے کہ وہ داد دینے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ نظموں کی طرح غزلوں اور دوہوں کی بھی یہی کیفیت ہے لیکن اس کتاب کا بیشتر حصہ چوں کہ نظموں پر محیط ہے اس لیے اس جگہ صرف بعض نظموں کے حوالے ہی سے کچھ کہنے کی کوشش کی جائے گی۔

"اے مرے دشتِ سخن" کی پہلی نظم جسے عالی نے "ایک سادہ سی تقریب" کا نام دیا ہے ایک مکالماتی بیانیہ نظم ہے۔ اسے خود عالی کی وضع کردہ اصطلاح میں نہاں خانۂ دل کا اظہاریہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہ نظم الفاظ کی سطح پر فی الواقع ایک سادہ سی نظم ہے مگر جب اس کے باطن میں جھانک کر دیکھیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ نظم سادہ نہیں بہت پُرکار اور بہ اعتبارِ معنی پرت در پرت ہے۔ یہ سادہ سی تقریب صرف عالی کی تقریب نہیں ہے اور نہ اس کا ہیولا محض تخیلاتی ہے بلکہ اس کا ایک ایک مصرع فکر کے رشتے سے جڑا ہوا ہے اور یہ رشتۂ فکر دنیا کے سارے اہلِ قلم، سارے اہلِ نظر، سارے اہلِ کمال اور سارے تخلیقی فن کاروں کی جبلی خواہش اور شعوری آرزومندی سے ہم رشتہ ہے۔ اس نظم میں جس "جلسۂ وداع" کا تذکرہ ہے اس کا تعلق کسی خاص زبان، کسی خاص فرد یا کسی خاص طبقے کے نمایندوں سے نہیں بلکہ رنگ و نسل اور زبان و علاقہ کی سطح سے بلند تر سطح پر دنیا کے ان سارے خلاق ذہنوں سے ہے جنھوں نے بارہا یہ سوال اٹھایا ہے کہ زندگی اور آرٹ کی ماہیت کیا ہے؟ ان دونوں میں کیا رشتہ ہے؟ اور ان میں سے کون دریا ہے؟ یہ سوال نیا نہیں بہت پرانا ہے اور تاریخِ انسانی کے ہر دور میں اٹھایا گیا ہے اور شاید یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کی تلاش میں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہی ہے۔ عالی نے بھی ایک صاحبِ فکر شاعر کی حیثیت سے یہی سوال اٹھایا ہے اور سوال کو ماضی، حال اور مستقبل سے منسلک کرکے دیکھا ہے، سوچا ہے اور اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش کے بہانے انھوں نے اردو کو ایک بالکل اچھوتے موضوع پر نہایت خوب صورت اور فکر انگیز نظم دے دی ہے۔ ہر چند کہ وہ بھی دنیا کے دوسرے صاحبانِ فکر و نظر کی طرح سوال کا حتمی جواب تلاش نہیں کرپائے اور نظم کے اختتام پر یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں کہ ع

یہ کون جانے ازل جانے یا ابد جانے

اور آخر کار اسی مقام پر واپس آگئے ہیں جہاں سے چلے تھے لیکن ان کی یہ لاجواب واپسی، سوچنے سے باز نہیں آئی۔ "اے مرے دشتِ سخن" کا لفظ لفظ پتا دیتا ہے کہ یہ سوچ عالی کا برابر پیچھا کرتی رہی ہے اور ان کی غزل، گیت، نظم اور دوہا سب کے تخلیقی عمل میں ساتھ لگی رہی ہے۔ چناں چہ اس سوچ نے عالی کی شاعری پر تأمل و تفکر کا ایک ایسا سایہ کردیا ہے جو عالی کے دوسرے شعری مجموعوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔

"اے مرے دشتِ سخن" کی دوسری اہم نظم "تہجی" ہے جو اشارہ ہے حروفِ تہجی یعنی الف، بے، تے کا اور کنایہ ہے آغازِ کار کا۔ یہ نظم پہلی نظم کی بہ نسبت کئی گنا بڑی ہے۔ "ایک سادہ سی تقریب" میں صرف چھتیس مصرعے ہیں۔ جب کہ "تہجی" میں دو سو سے زاید ہیں۔ ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ پہلی نظم قافیہ و ردیف کی پابند مثنوی کی کلاسیکی ہیئت میں ہے جب کہ "تہجی" ایک جدید طرز کی آزاد نظم ہے۔ مصرعے حسبِ ضرورت چھوٹے بڑے ہیں لیکن نظم کی بحر سے بے بہرہ نہیں ہیں یعنی ایک ہی بحر کے ارکان میں سے ہیں۔ یہ تو اس نظم کی ظاہری صورت ہے لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے اگر اس نظم کو "ایک سادہ سی تقریب" کی توسیع کہا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس میں اس قسم کے سوال کو قدرے تفصیل سے موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ جس کا مجمل تذکرہ "ایک سادہ سی تقریب" میں آیا ہے۔ البتہ

علامہ اقبال کے اس فلسفۂ حیات کو کہ ع

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل

کو ذہن میں رکھ کر غور کریں تو یوں لگتا ہے جیسے حالی کی پہلی نظم کا "جلسۂ وداع" حقیقتاً "وداعِ غنچہ" کے جلسے کی روئداد ہے اور دوسری نظم "تجلی" رازِ آفرینشِ گل کو پالینے کی کوشش کا منظرنامہ ہے۔ ایسا منظرنامہ جو علومِ جدید کی اعانت' سائنس کی حیرت انگیز فتوحاتِ ارضی اور تسخیرِ فلکی کی معاونت کے باوجود' ذہنِ انسانی کی طمانیت کے باب میں ہنوز بے اثر و بے ثمر ہے۔

اس منظرنامے میں تاک جھانک لگانے والے سوال' ایک دو نہیں متعدد ہیں اور یہ سوالات محض طبیعیاتی نہیں مابعدالطبیعیاتی بھی ہیں۔ مختصر یہ کہ "تجلی" میں بھی پہلی نظم کی طرح کے سوالات زیرِ بحث آئے ہیں اور اس میں بھی شاعر کی بنیادی کھوج یہی رہی ہے کہ انسان حقیقتاً کیا ہے اور کیوں خلق کیا گیا ہے' خلق کیا گیا تھا تو پھر اسے مقامِ احسن پہ لے جا کر اسفل کی کھائی میں کیوں پھینکا گیا اور کاغذی پیرہن دے کر نقشِ فریادی کیوں بنا دیا گیا۔ ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں صوفیانِ باصفا سے لے کر جویانِ علم و حکمت تک سبھی سرگرداں رہے ہیں۔ انفرادی سطح پر مجاہدے' مکاشفے اور مراقبے کیے گئے ہیں اور اجتماعی سطح پر مکالمے' معارضے اور مناظرے ظہور میں آئے ہیں۔ غرض کہ انسان' کائنات اور خدا کے وجود اور ان کے باہمی رشتوں پر ہر زمانے میں اہلِ فکر و نظر کے ہر حلقے میں غور کیا گیا ہے' سب نے ان کے کنہ و ماہیت کا سراغ لگانے پر اپنے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں اور کبھی کبھی شارحینِ عقل و عشق نے رسائی فکر کے باب میں ایک دوسرے کی برتری کا اعتراف بھی کیا' اس اعتراف کے شواہد میں سے ایک بہت مشہور واقعہ یہ بھی ہے کہ جب اپنے وقت کے دو ہم عمر و ہم سبق نابغۂ روزگار مولانا ابوسعید ابوالخیر اور حضرت بوعلی سینا مناظرے کے بعد محفل سے باہر آئے تو حاضرین میں سے بعض نے بوعلی سینا سے' ابوسعید ابوالخیر کے علم و فضل کے بارے میں سوال کیا۔ بوعلی سینا نے جواب دیا "جو کچھ میں سوچتا ہوں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔" یہ ایک بندۂ خدا کے بارے میں دوسرے بندۂ خدا کا اعتراف ہے لیکن علتِ اولیٰ کی غایت سے آگاہی کے بارے میں دونوں ہی نے اپنے اپنے عجز کا اعتراف کیا۔ گویا ان میں سے ہر ایک نے جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی' جانتے بھی' تو کیسے جانتے جب کہ۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
سنی حکایتِ انساں تو درمیاں سے سنی
(شاد)

بلکہ زیادہ درست یہ ہے کہ۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم
(فانی)

گویا بے خبری کی تصدیق و توثیق کردی گئی۔ اس لیے اس بحث کو کہ زندگی اور کائنات کو کون کیا سمجھا ہے اور کیا نہیں سمجھا، سردست یہیں چھوڑ کر عالی کی نظم "جیجی" پر غور کریں تو کہنا پڑتا ہے کہ ارتقائے تہذیب انسانی کا وہ تاریخی شعور جس نے قرۃ العین حیدر سے جنوبی ایشیا سے وابستہ تاریخ تہذیب کے زیر اثر "آگ کا دریا" لکھوایا اور جس نے انسانی زندگی کے سارے نشیب و فراز کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی کوشش میں آخر آخر خود ناول نگار کو تاریخ کے شکنجوں میں جکڑ لیا اور یہ ناول نگار اپنے قاری کو زندگی کے ایک دھندلے مبہم پیچیدہ اور منفی تصور سے زیادہ کچھ اور نہ دے سکا، وہی تاریخی شعور جمیل الدین عالی کی اس نظم کا محور ہے لیکن اس نظم کا خالق تاریخ کی کثیف و عمیق غار میں پناہ گزیں ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ اپنی غیر معمولی قوتِ متخیلہ کی مدد سے فکر و فن کی لطیف و جمیل سطح پر کامیابی کے ساتھ ابھر آیا ہے اور اپنی نظم کی وساطت سے اپنے قاری کو تہذیبی زندگی کا ایک ایسا تاب ناک شعور دے گیا ہے جسے ایک بڑا تخلیقی فن کار اپنے عہد کو تاب ناک تر بنانے کے لیے اپنے تخیل میں ہمیشہ سجائے رکھتا ہے۔

عالی کی نظم سے قاری کو جو مجموعی تاثر ملتا ہے اسے تاب ناک پیام شعور سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ عالی نے اگرچہ انسان و کائنات نیز ان کی تخلیقی غایت کے سلسلے میں طرح طرح کے سوالات اٹھائے ہیں اور ان سوالوں کے جوابات کی تلاش میں ذہنِ انسانی سے ان گنت صدیوں کی مسافت بھی طے کرائی ہے اور اس لمبی مسافت میں ہرچند کہ سوالوں کے خاطر خواہ جوابات بھی نہیں مل سکے، بااین ہمہ فکرِ انسانی کی اس ناکامیاب تگ و تاز سے عالی ایک لمحے کے لیے بھی بے دلی و مایوسی کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ اس کے معترف ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ صدیوں سے اپنی کھوج میں سرگرداں رہنے کے باوجود انسان کو اب تک ذات و کائنات کا کوئی سچا عرفان حاصل نہیں ہو سکا۔ بلکہ یوں لگتا ہے جیسے انسان نے حقیقت جوئی کے سلسلے میں اب تک ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا اور یہ ہزاروں صدیاں جو بیت گئیں وہ آغازِ سفر کے بالکل ابتدائی مرحلے یعنی الف، بے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس اعترافِ حقیقت کے باوصف عالی نے نہ تو خود کو کبھی ایک لمحہ کے لیے درماندہ و دل گرفتہ محسوس کیا اور نہ اپنے پیش رووں کی ناکامی کو اپنے آپ پر یا اپنے بعد کی نسلِ انسانی پر منطبق کرنے پر آمادہ ہوئے۔ اس سلسلے میں دو سو مصرعوں کی لمبی نظم جیجی کے صرف آخری چند مصرعے دیکھیے۔

خداوندا!!

خیال اک زائر خوش گفتگو گو بے تسلّی اک حریفِ آرزو نکلا

میں کچھ سمجھا مگر پھر بھی نہیں سمجھا

مجھے تو میرے ہی آئینوں میں عکسِ نمود کھلا

مجھے تو چند صدیاں دے ہی دے جن میں مجھے جتنے بھی حرف و لفظ آجائیں

انھی سے اک زباں تعبیر ہر کون و مکاں، اپنی بناتی ہے

مجھے سب ہوش مندانِ زر افشاں جس قدر بھی دے گئے اور جو بھی دیں منظور ہے لیکن

مرے دل میں سوالوں کی جو دنیا ہے وہ ماضی حال مستقبل سے وابستہ سہی پھر بھی
مری اپنی لگن میں اور جلن ہی میں مقیّد ہے
دوانی ہے
مگر اس کا دوانہ پن بھی تو تیری تلاشِ بے کراں ہی کی کمانی ہے

....

یہ صدیاں تو الف بے تھیں
اور نقل کیے ہوئے مصرعے غالب کے اس شعر کے مصداق ہیں کہ۔

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

لیکن عالی کے ان مصرعوں سے تھکن یا درماندگی کا اظہار ہرگز نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس وہ سوالوں کے جوابات کی تلاش میں ہر لحظہ سرگرم و ہمہ وقت آمادہ سفر نظر آتے ہیں اور ان کے ذہن کا ایک ایک سوال اور ان کی نظموں کا ایک ایک مصرع یہ التجا کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اوپر دیے ہوئے مصرعوں میں عالی نے اپنی درازیٔ عمر کی دعا یا کچھ دنوں اور جینے کی جو مہلت مانگی ہے وہ بھی خود غرضانہ نہیں بلکہ صرف اس غرض سے ہے کہ کارِ جہاں دراز و پیچیدہ ہے۔ نہ صرف دراز و پیچیدہ ہے بلکہ سائنس کی تازہ دریافت کے مطابق اس جہاں کے ہر ذرے میں اور ذرے کے ہر جزو میں ایک نہیں' کئی کئی جہاں آباد ہیں اور ان میں سے ہر جہاں اپنی تازہ کاری و گرہ کشائی کے لیے ذہنِ انسانی سے وقت کا طالب ہے۔ یہ ہی وہ آگہی و زاویہ نظر ہے جس کے سبب عالی اپنے پیش رووں کی ناکام مہمات سے آزردہ و فسردہ خاطر نہیں ہوتے بلکہ تازہ دمی کے ساتھ نئی مہم کے لیے آمادہ سفر رہتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ کہ جس ذہنِ انسانی نے ذات و کائنات کے بارے میں نئے نئے سوالات اٹھائے ہیں وہی ذہنِ انسانی' آج نہ سہی کل سہی' بہرحال ان کے جوابات بھی ڈھونڈ نکالے گا۔ پھر اس سلسلے میں جو تھوڑا سا وقت طلب کیا ہے اور جینے کی مہلت مانگی ہے اس میں علامہ اقبال کی طرح یہ کہہ کر کہ "کارِ جہاں دراز اب مرا انتظار کر" کی روشِ مدعیانہ اختیار نہیں کی بلکہ غالب کے اس شعر کے مصداق۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

اپنی عاجزانہ استدعا کو سراپا التجا بنالیا ہے' خدا کرے ان کی یہ التجا قبول ہو۔

فکر و نظر کے حوالے سے عالی کی دوسری نظموں' غزلوں اور دوہوں کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے لیکن اب میں اس جگہ ان اصنافِ سخن کو چھیڑنے کی بجائے عالی کی اس طویل نظم کے بارے میں کچھ کہنا

چاہوں گا جو "انسان" کے عنوان سے "اے مرے دشتِ سخن" میں شامل ہے اور جو اپنے قامت' موضوع اور حسنِ بیاں کے اعتبار سے اردو شاعری میں ایک بے مثال اضافہ ہے۔ یہ نظم اپنی قد آوری' ارتفاعِ فکری اور عظمتِ فن کے لحاظ سے چونکا دینے والی نظم ہے اور اس مجموعے کے ایک سو تین صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

جدید اردو شاعری میں اگر عالی کی اس نظم سے مماثل جدید و طویل نظمیں تلاش کی جائیں تو صرف گنتی کی نکلیں گی۔ اس سلسلے میں یوں تو جوش کی نظم "حرفِ آخر" علی اختر حیدر آبادی کی نظم "قولِ فیصل" سردار جعفری کی نظم "نئی دنیا کو سلام" اور اختر الایمان کی نظم "سب رنگ" وغیرہ کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں لیکن ان میں قابلِ توجہ صرف جوش اور سردار جعفری کی نظمیں ہیں۔ اس لیے کہ یہ نظمیں بھی خاصی طویل ہیں اور اپنے اندر بہت سے مسائلِ حیات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ زندگی' کائنات' انسان' خدا اور ان کے باہمی رشتے کیا ہیں؟ اسی نوع کے بعض سوالات کسی نہ کسی نہج سے ان نظموں میں زیرِ بحث آئے ہیں اور یہ نظمیں لطفِ سخن کے ساتھ ساتھ اپنے قاری کو بہت کچھ سوچنے کو بھی دیتی ہیں لیکن یہاں بھی عالی کا اندازِ فکر اور ان کی شاعری کا دکش' جوش یا سردار جعفری سے ذرہ برابر متاثر نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ عالی نے اپنی نظم میں فطرتِ انسانی کے ان سارے متضاد و متناقص' مثبت و منفی' خوف ناک و مہلک اور تعمیری و تخریبی پہلوؤں کو ذہن میں رکھا ہے جن کے عمل اور ردِ عمل کے نتیجے میں آج کا انسان اپنی موجودہ منزل تک پہنچا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عالی کی سوچ کی range جوش اور سردار کی بہ نسبت بہت دور رس ہے اور اس کا سبب عالی کے فکر و مطالعہ کی گہرائی اور وسعت ہے۔

جوش کی طویل نظم "حرفِ آخر" ان کی دوسری نظموں کی طرح شکوہِ لفظی اور طمطراق تشبیہات سے ایسی سجی ہوئی ہے کہ جوش کے حذاقتِ لسانی کا لوہا منواتی ہے لیکن معنی و موضوع دبے دبے سے رہتے ہیں اور بہ اعتبارِ موضوع و معانی یہ نظم اتنی طویل نہیں جتنی کہ لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ جوش کی نظم اگرچہ عدم آباد یا دوسرے لفظوں میں ازل سے شروع ہو کر وجود کے آغاز و ارتقا تک پہنچتی ہے لیکن اس کی معنوی سطح' بسیط و عریض نہیں' اس لیے یہ نظم صنعت گرانہ اطناب کے باوصف تازہ جہاتِ معنی کی فتح مندی سے محروم رہتی ہے۔ اس کے برعکس عالی کی نظم الفاظ کی سطح پر سادہ ہو کر بھی نہایت فکر انگیز و پُر کار ہے اور قاری کو اس کے ماضی بعید سے لے کر مستقبل قریب تک' غور و فکر کا ایسا سامان فراہم کرتی ہے جو عالی کے معاصر شعرا کے یہاں تو نہیں' ہاں ممتاز و ہم عصر ناول نگار' قرۃ العین حیدر کے بعض ناولوں خصوصاً "آگ کا دریا" میں ضرور نظر آتا ہے لیکن اس جگہ نثر نہیں' شاعری زیرِ بحث ہے اس لیے قرۃ العین اور عالی کے فکری رویوں اور مسافتوں کا تقابل درست نہ ہوگا۔ البتہ جوش کی نظم "حرفِ آخر" کے ساتھ عالی کی نظم کو رکھ کر دیکھنا نامناسب نہ ہوگا۔

اول اس لیے کہ جوش کی طرح عالی کی نظم بھی بہ اعتبارِ تعدادِ اشعار بہت طویل ہے اور ایک نشست یا ایک سانس میں نہیں کہی گئی بلکہ اس کے تکملے میں سال ہا سال صرف ہوئے ہیں اور یہ ہنوز

نامکمل ہے۔ دوسرے یہ کہ جس طرح جوش کی نظم کے مختلف اجزا مختلف رسائل و جرائد میں شایع ہوتے رہے ہیں اسی طرح حالی کی نظم "انسان" کے جستہ جستہ حصے بھی اخبارات و رسائل میں پچھلے چالیس برسوں سے چھپتے رہے ہیں اور اردو کا قاری اس کے موضوع و اسلوب سے مانوس رہا ہے لیکن جوش کا ذکشن ان کی عام شاعری کی طرح کچھ اتنا پُر جلال اور پُر شور و پُر شوکت ہے کہ نظم کے معنی دبک کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں اور قاری کو اس سے معنوی حظ اٹھانے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس حالی کی نظم کے مصرعے بیشتر چھوٹے چھوٹے اور نہایت فکر انگیز و تہہ دار ہیں' ان کی یہ تہہ داری یقیناً کہیں کہیں قاری کو الجھن میں ڈالتی ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ قاری مصرعوں کے سیاق و سباق ہی کو بھول جائے اور معنی تک رسائی محال ہو جائے۔

ایک اور بات حالی کی نظم کو جوش کی نظم سے الگ کرتی ہے' وہ یہ ہے کہ جوش کی طویل نظم شروع سے آخر تک پابند ہے یعنی مروجہ بحروں میں قوافی و ردیف کا پورا پورا التزام ہے لیکن بہ صورتِ مثنوی کسی ایک بحر میں نہیں ہے بلکہ اس میں چھوٹی بڑی کئی بحریں استعمال ہوئی ہیں۔ نظم کے جو اجزا چھوٹی بحر میں ہیں وہ بہت خوب صورت ہیں اور جوش کے کمالِ فن کا اعتراف کرواتے ہیں مثلاً "جوش کی نظم کا وہ ابتدائی ٹکڑا جس کا عنوان ہے "سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب" تخلیقِ فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں جوش نے تخلیق سے پہلے عدم و وجود میں جو کشاکش و کشمکش ہوئی ہے' اس کی بہت خوب صورت تصویر کشی کی ہے۔

ایک افسوں بدوشِ ظلمت میں
ایک گہرے سکوت کا عالم
روئے خنداں نہ دیدۂ گریاں
جلوۂ گل نہ رشحۂ شبنم
سازِ دیوانگی نہ سوزِ خرد
نغمۂ سرخوشی نہ نوحۂ غم
سوزِ تخلیق ساز در پردہ
اور بظاہر نہ کوئی زیر نہ بم
جامد و پا بہ گل عناصر میں
اک ابھرتا ہوا سا جذبۂ رم
خود سے کُلتی ہوئی سی اک زنجیر
خود سے کھلتا ہوا سا اک عالم
ایک تعمیر بے در و دیوار
ایک تشکیلِ بے حدوث و قدم

اک حکایت بغیرِ گوش و زباں
اک کتابت بغیرِ لوح و قلم
ایک نادیدہ عقدہ بے ناخن
ایک آوارہ رازِ بے محرم
اور اس آوارہ راز کے اندر
قلبِ خالق کا جنبشِ پیہم

یہ جوش کی نظم "حرفِ آخر" سے چھوٹی بحر کا ایک نمونہ تھا اب قدرے طویل بحر کا ایک بہت چھوٹا سا ٹکڑا دیکھیے۔ اس میں عناصرِ اربعہ کے ایک عنصر یعنی "آگ" کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

آگ جولانی' حرارت' مسکراہٹ روشنی
آگ ہستی سرخوشی' مستی' جوانی زندگی
آگ' آبِ چہرۂ شب' آگ تابِ حسنِ روز
موجِ رقص و موجِ رنگ و موجِ ساز و موجِ سوز
گرم' گل گوں گل چکاں' گل بار گل رخ گل صفات
ہم ہمہ' جدت' حرارت' حوصلہ' اچھل' حیات
آگ حرفِ اولینِ خطبۂ خلاقِ نور
سرخیِ افسانۂ ایجاد و پیغامِ ظہور

اس نوع کے اشعار' لفظی مرصع سازی کے سوا کسی فکرِ بلند یا خوب صورت خیال کے حامل نہیں۔ صرف تشبیہوں کا ایک بے کیف سلسلہ ہے جس سے جوش کی صناعانہ قوتِ تخلیق کا تو اندازہ ہوجاتا ہے لیکن اس میں قاری کے جذبات میں ارتعاش پیدا کرنے والی شاعری کے اجزا بہت کم ہیں۔

سردار جعفری کی نظم "نئی دنیا کو سلام" بلاشبہ ایک خوب صورت اور فکر انگیز نظم ہے۔ یہ نظم خاص پس منظر میں کہی گئی ہے اور ایک مخصوص فضا کی تخلیق ہونے کی بنا پر مقبول بھی ہوئی ہے۔ لیکن جیسے ہی فضا بدلی' نظم بھی پردۂ اخفا میں چلی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس نظم کی فضا کا تعلق نفسیاتِ انسانی اور اس کے مسائل و اقدار سے اتنا نہ تھا جتنا کہ خاص نوع کے سیاسی موسم اور اس کی تبدیلی کے حالات و اثرات سے تھا۔ یہ نظم جیسا کہ اس کا نام اس طرف واضح اشارہ کرتا ہے حقیقتاً اگست ۱۹۴۷ء میں بیرونی سامراج سے آزاد ہونے کی خوشی میں اہلِ پاک و ہند کی تحریکِ آزادی کے مجاہدوں' غازیوں اور شہیدوں کے لیے' ایک شاعر کی طرف سے ایک قسم کا نذرانۂ عقیدت و پیغامِ تہنیت ہے۔ پوری نظم' ہنگامی و رومانی شاعری کا وہی جوش و خروش رکھتی ہے جو سردار کی شاعری کا عمومی طرۂ امتیاز ہے۔ کتابی صورت میں یہ نظم سردار کی ایک اور نظم "جمہور" کے ساتھ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ پوری کتاب میں ایک سو چھبتر صفحات ہیں جن میں سے ایک سو بیس صفحات زیرِ بحث نظم "نئی دنیا کو سلام" کو دیے گئے ہیں۔ نظم کا مجموعی

تاثر خاصا خوش گوار ہے اور صاف پتا دیتا ہے کہ یہ نظم رسمی یا مصنوعی انداز میں نہیں کہی گئی بلکہ سچے جذبات و محسوسات نے اسے جنم دیا ہے۔ نظم کا اسلوب رمزیہ و تمثیلی ہے اور یہ کچھ اس انداز سے پیش کی گئی ہے کہ اسے منظوم ڈراما بھی کہا جا سکتا ہے۔ گویا اسلوب کی سطح پر نظم' عالی کی نظم سے ملتی جلتی ہے لیکن جعفری کی نظم کا کینوس بہت مختصر ہے اور پھر یہ کینوس اس انداز کا بھی نہیں جس میں بنی نوعِ انسان کے سارے ازلی و ابدی مسائل منسلک ہو کر ایک محور پر آ گئے ہوں اور ان میں مقامیت سے بلند سطح پر آفاقیت کے آثار پیدا ہو گئے ہوں۔ البتہ آزادی اور آزادی کی تحریک کے حوالے سے ساکنانِ پاک و ہند کو ان کے روشن مستقبل کی خوش خبری سنائی گئی ہے اور یہ خوش خبری شاعری کی ایسی ہیئت و اسلوب میں ہے جسے قدیم و جدید کا سنگم کہا جائے گا اس لیے کہ اس کے بعض اجزا کلاسیکی طرز پر، بحر و قافیہ و ردیف کے پابند ہیں اور بعض اجزا آزاد یعنی بلینک ورس میں ہیں۔

جوش اور سردار کی نظموں کے برعکس عالی کی نظم فکر و نظر کا بہت بڑا افق رکھتی ہے اور حیاتِ انسانی کے نہایت بسیط و عریض عالم پر محیط ہے۔ اس میں آفرینش آدم سے لے کر آج تک کے انسان کی ارتقائی منزلوں کا جائزہ ایسے تاریخی شواہد و نفسیاتی کوائف' عمرانی و سماجی اصول' فلسفیانہ تاملات اور سائنسی توجیہات کے ساتھ لیا گیا ہے کہ عالی کی ژرف نگاہی' بشریات و سماجیات سے ان کی آگاہی' معاشرتی و معاشی مسائل و عوامل سے ان کی وابستگی' علوم جدیدہ سے ان کی واقفیت' مشرق و مغرب کے مطالعے کی وسعت اور اس وسعت کو شاعری کی زبان میں ڈھالنے کی غیر معمولی صلاحیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

عالی کی اس نامکمل نظم میں سردست دس ہزار مصرعے ہیں اور اس کے چند اجزا ۱۹۵۰ء سے لے کر آج تک مختلف رسائل و جرائد کے ذریعے منظرِ عام پر بھی آ چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "اے مرے دشتِ سخن" میں بھی نظم کے صرف چار حصے یا چار اجزا شامل ہیں اور ان اجزا میں نظم کا تقریباً" پانچواں حصہ سما گیا ہے پھر بھی نظم کا بیشتر حصہ جو کہ سات آٹھ ہزار مصرعوں پر مشتمل ہے' ہنوز سامنے نہیں آیا۔ اس لیے صرف پیشِ نظر اجزا کی مدد سے پوری نظم کے مشمولات کا مکمل ادراک مشکل ہے۔ پھر چوں کہ عالی کی پوری نظم تقریباً" استعاراتی ہے اور یہ سب جانتے ہیں استعارہ متعدد معنی کا حامل ہونے کے سبب پرت در پرت ہوتا ہے اس لیے اس کے حقیقی معنی کا ادراک آسان نہیں ہوتا' وجہ یہ ہے کہ ایک استعارہ کسی خاص شخص کے ذاتی تجربات' مشاہدات اور مطالعات کا زائیدہ ہوتا ہے اور جب تک کوئی شخص اپنے مطالعے' مشاہدے اور تجربے میں ان منزلوں سے نہ گزرا ہو جن میں کوئی خاص استعارہ وجود میں آیا ہے' اس وقت تک وہ شخص استعارے کے حقیقی معنی یا استعارہ تخلیق کرنے والے شاعر کے معنودِ ذہنی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ تبھی تو فانی نے کہا تھا کہ۔

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں
اک بے قرار تڑپا اک بے قرار رویا

کم و بیش یہی صورت علامت، رمزیہ اور تمثیل کی ہے کہ یہ سب استعارے کی ذرّیات میں سے ہیں۔ عالی کی نظم کے استعاراتی اسلوب سے قطعِ نظر ایک اور پہلو نظم کی تفہیم کو مشکل بنا دیتا ہے۔ اس پہلو کی طرف خود عالی نے یہ کہہ کر اشارہ کر دیا ہے کہ

اس پورے نظمیے میں منظرنامے، کرداروں کی حرکات و سکنات، جلیے اور ڈرامائی متعلقات قاری کی تفہیم و تصور پر چھوڑے گئے ہیں۔

(اے مرے دشتِ سخن، ص ۱۵۴)

ایسے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محض چند اجزا کو نظر میں رکھ کر عالی کی نظم "انسان" کے بارے میں نہ تو کوئی حتمی یا کلی رائے قایم کی جا سکتی ہے اور نہ اسے دنیا کی بڑی نظموں کے مقابل رکھ کر جانچنا پرکھنا ممکن ہے۔ یہ کام اس وقت ہو سکتا ہے جب عالی کی مکمل نظم ہمارے سامنے آجائے، پھر بھی اس زاویۂ نظر سے کہ ۔

ہر جز کو، کل کے ساتھ یہ معنی ہے اتّصال
دریا سے دُر جدا ہے یہ ہے غرق آب میں
(خواجہ میر درؔد)

جزو کی روشنی میں کل کے بارے میں کلی اور حتمی طور پر نہ سہی جزوی اور ضمنی طور پر سہی، کوئی نہ کوئی رائے بہرحال قایم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ نظم پر طائرانہ نظر ڈالی جائے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کے عنوان و موضوع یعنی "انسان" کی پیدایش و غایت اور ارتقا کے نظریات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے تاکہ نظم کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

انسان اور اس کے عالمِ وجود میں آنے کے مسئلے پر غور کرنے والوں میں صوفیا کرام، علما و فقہا، فلسفی، سائنس داں اور شاعر و ادیب سبھی شامل رہے ہیں۔ ان سب کو ان کے اندازِ فکر کی روشنی میں دو خاص طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ایک طبقہ وہ ہے جو مذہبی صحیفوں اور آسمانی کتابوں کی روشنی میں یہ حکم لگاتا ہے کہ انسان یا آدم کو اوّل اوّل اسی شکل و صورت میں پیدا کیا گیا جس شکل و صورت میں آج وہ موجود ہے۔ کیسے اور کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ اس سوال کے جواب میں مذہب نے کہیں تو یہ بتایا کہ آدمی کو پانی سے بنایا گیا، کہیں یہ کہ اسے مٹی سے بنایا گیا اور کہیں یہ بتایا کہ اسے پانی اور مٹی کے گارے سے بنایا گیا، کہیں یہ کہ اسے کھنکھناتی ہوئی مٹی کی سخت ٹھیکری سے بنایا گیا اور کہیں قدرے تفصیل سے یہ بتایا گیا کہ آدم کی تخلیق کے لیے پہلے خمیری مٹی کا ایک قالب تیار کیا گیا، پھر اس مٹی کے قالب میں روح پھونکی گئی نتیجتاً" یہی قالب گوشت پوست والا انسان بن گیا۔ اس طرح کی اور کئی روایتیں دینی کتابوں اور ان کی تفسیرات میں ملتی ہیں اور ان سب کا خلاصہ یہی ہے کہ ابتدا" انسان کو ویسا ہی پیدا کیا گیا جیسا کہ وہ آج نظر آتا ہے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ وہ بہ طریقِ احسن خلق کیا گیا، ساری مخلوقات سے افضل قرار دیا گیا۔ زمین کی سرداری و

خلافت عطا کی گئی۔ امانتِ الٰہی کے اس بارِ گراں کو اٹھانے کا اہل ٹھہرایا گیا جسے اٹھانے سے فرشتوں اور دوسری مخلوق نے انکار کر دیا تھا۔ اسماالحسنیٰ کا درس دے کر اسے دستارِ علمی سے سنوارا گیا۔ بعد ازاں مسجود ملائک کے مرتبے پر فائز کر کے اسے ابلیس کی سرکشی کا مدِمقابل اور اس کی مذموم شری حرکتوں کا مانع و دافع بنا دیا گیا۔

یہ تکوینِ آدم کے مسئلے کا ایک رخ ہے اور بنی نوعِ انسان کے ایک طبقے کا ترجمان ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اس مسئلے کو عقاید سے یکسر الگ کر کے خالص علمی و سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس طبقے کے نزدیک آدم اپنی ابتدائی تخلیق میں ایسا نہ تھا جیسا کہ آج وہ ہے بلکہ وہ ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزر کر جانوروں کی متعدد صورتیں اختیار کرتا ہوا اپنی موجودہ شکل و صورت تک پہنچا ہے۔ اس نظریے کا سب سے مشہور و ممتاز داعی و مفسر' مغربی اسکالر ڈارون ہے۔ ڈارون کی دی ہوئی تفصیل کے مطابق موجودہ انسان دراصل بندر کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ ڈارون کے اس نظریے کو خالص مغربی اور مادہ پرستانہ جان کر علمائے مشرق خصوصاً" علمائے دین نے اس سے اختلاف کیا اور اسی نقطۂ نظر کے قائل رہے جو انھیں اپنی کتابوں سے ملا تھا لیکن ڈارون کے نظریے کو خالص مغربی علم و فکر کا حاصل جاننا درست نہیں معلوم ہوتا' اس لیے کہ خود مشرق میں اس کے ابتدائی نشانات موجود تھے خاص طور پر مولانا روم نے ڈارون سے بہت پہلے ارتقائے انسانی کے باب میں اسی طرح کی باتیں کہہ دی تھیں۔

آمدہ اول بہ اقلیمِ جماد
وز جمادے در نباتے اوفتاد
وز نباتے چو بہ حیواں اوفتاد
نامدش حالِ نباتے ہیچ یاد
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت
تاشد اکنوں عاقل و دانا و زفت

مولانا روم کے بعد بیدلؔ عظیم آبادی نے تو اپنے ایک شعر میں تقریباً" بالکل وہی بات کہہ دی تھی جو ڈارون نے ایک مدت کے بعد اپنی کتاب میں کہی' بہ قول بیدلؔ۔

ہیچ شکلے بے ہیولیٰ قابلِ صورت نہ شد
آدمی ہم پیش ازاں کادم شدہ بوزینہ بود

تکوینِ آدم کے باب میں ان نظریات کے بارے میں رائے زنی نہ ہمارا مقصد ہے نہ اس جگہ اس کا موقع۔ اس لیے اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہنا صرف یہ ہے کہ آفرینشِ آدم کے باب میں نظریاتی اختلافات کچھ بھی ہوں اس امر پر سارے علمائے مشرق و مغرب کا اتفاق ہے کہ انسان ہی کائنات کی بہترین مخلوق ہے اور عقل و حکمت کا یہ خاکی پیکر ایسے عمل و کردار کا مکلّف ہے کہ اس کا وجود بے سبب و بے مقصد یا محصور و مجبورِ محض نہیں بلکہ اپنے عمل و ارادہ میں آزاد و مختار ہے۔ مخلوق ہونے سے پہلے تک یا عمل

تخلیق کے درمیانی عرصے میں یقیناً وہ مجبور و غیر مکلّف کہا جا سکتا ہے۔ لیکن خلق ہونے کے فوراً بعد وہ اپنے عمل و ارادہ میں با اختیار ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ پیدا ہوتے ہی وہ اپنے تحفظ و دفاع کے لیے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا یہ جبلی عمل تربیت و تجربے کی معرفت آخر کار اسے شعور کی منزل تک لے جاتا ہے اور شعور کی پختگی کے بعد کبھی اس میں اپنے وجود کی عظمت کا یہ احساس ابھرتا ہے۔

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

(میر)

اور کبھی عجز و فروتنی کی یہ لہر اس کے سکون کا باعث بن جاتی ہے کہ۔

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

(میر)

گویا رفتہ رفتہ اس میں نیک و بد میں تمیز کرنے کی ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسے مکافاتِ عمل کے قانونِ فطرت کو سمجھ لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور وہ جیسی کرنی ویسی بھرنی کے اصول پر ایمان لے آتا ہے۔ یہی ایمان اس کو جبر و اختیار کی حدود سے آشنا کر کے اسے حقوق کی ادائیگی اور فرائض کی بجا آوری کے ساتھ زندگی کا سلیقہ سکھاتا ہے' اپنی اہمیت و افادیت کا احساس دلاتا ہے اور اس کے ذہن سے یہ بات نکال دیتا ہے کہ اس کی تخلیق یا اس کا وجود بے مقصد و بے معنی ہے۔ خاص طور پر جب اس میں یہ احساس ابھر آتا ہے کہ اللہ نے اپنی سب سے عظیم المرتبت صفت "علم" سے نواز کر اور اشیا کا علم عطا کر کے اسے فرشتوں سے برتر اور ابلیسی و طاغوتی قوتوں سے عظیم تر کر دیا ہے تو اس کی مشکل پسند اور دشوار طلب طبیعت میں غضب کی خود اعتمادی و خود نگری اور بلا کی غیرت مندی و خودداری جاگ اٹھتی ہے اور اس کے اندر تسخیرِ کائنات کے باب میں اپنی فاتحانہ بے کرانی کا ایسا شعلہ لپک اٹھتا ہے کہ گاہے گاہے وہ اقبال کے الفاظ میں یہ کہہ اٹھتا ہے کہ۔

این جہاں چیست صنم خانۂ پندارِ من است
جلوۂ او گرو دیدۂ بیدارِ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے او را
حلقۂ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ ما
چہ زمان وچہ مکاں شوخیِ افکارِ من است

یہ ہے وہ انسان جس کے علم و فکر کا مجمل ذکر اوپر آیا اور جسے جمیل الدین عالی نے اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے اور روزِ آفرینش سے لے کر آج تک کے انسان کی داستانِ فتح و شکست کو اس انداز سے

قلم بند کردیا ہے کہ اس کا قاری انسان ہونے کے ناتے خود کو اس سے مانوس بھی پاتا ہے۔ اس کی زندگی کے بلند و پست اور خوب و ناخوب پہلوؤں کو اپنی ہی زندگی کا جزو خیال کرنے لگتا ہے اور اس کی احسن و اسفل صورتوں کو اپنے اعمالِ خیر و شر کا آئینہ جان کر اس میں اپنا چہرا بھی دیکھنے لگتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ ایک انسان جب عالی کی زبانی انسان کی کہانی سنتا ہے تو وہ اسے اپنی کہانی سمجھ کر کبھی خوش ہوتا ہے کبھی افسردہ۔ کبھی اس کے اندر غم و غصہ کروٹ لیتے ہیں کبھی ملائمت پہلو بدلتی ہے۔ کبھی نفرت کی آگ بھڑکتی ہے کبھی محبت کی شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کبھی رشک کبھی حسد' کبھی بدی کبھی نیکی' کبھی عداوت کبھی محبت' کبھی اطاعت کبھی بغاوت' کبھی سرکشی کبھی خود سپردگی' کبھی رعونت کبھی فروتنی' کبھی جبر اور کبھی اختیار' غرض کہ طرح طرح کی نفسی کیفیات سے انسان دوچار ہوتا ہے اور کچھ ایسی نہج سے دوچار ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ اس امر کا اقرار کرلیتا ہے کہ "اے مرے دشتِ سخن" میں جو کہانی سنائی گئی ہے وہ کسی خاص فرد یا صرف عالی کی کہانی نہیں' بلکہ دنیا کے سارے دردمند اور سوچتے ہوئے دل و دماغ رکھنے والوں کی کہانی ہے اور یہ کہانی اس انداز سے سنائی گئی ہے کہ جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے۔

عرض کیا جاچکا ہے "اے مرے دشتِ سخن" میں دس ہزار مصرعوں پر مشتمل عالی کی طویل نظم "انسان" پوری کی پوری شایع نہیں ہوئی بلکہ مشکل سے اس کا پانچواں حصہ ہمارے سامنے آیا۔ یہ پانچواں حصہ بھی چار اجزا میں تقسیم ہے اور ہر جزو کم از کم چھ سو مصرعوں پر مشتمل ہے اور ماضی و حال سے بحث کرتا ہو نفسِ انسانی کے درجنوں پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتا ہے اور زندگی و کائنات اور انسان و خدا کے باہمی رشتوں کے بارے میں ایسے سنجیدہ و مابعد الطبعیاتی سوال اٹھاتا ہے کہ نظم کے مختصر سے مختصر جزو کی تفصیل میں جانا بھی اس وقت ممکن نہیں' اس لیے نظم کے مطبوعہ حصے کے آخری دو جزو یا آخری دو نظموں پر اجمالاً" اظہارِ خیال کیا جائے گا۔

پہلی نظم جسے کتاب میں تیسرا باب قرار دیا گیا ہے کم و بیش پینتالیس صفحات پر محیط اور چھ سو سے زاید مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے جمالی کے روپ میں' زندگی' انسان' کائنات اور فرد و معاشرہ کے آغاز و ارتقا اور عروج و زوال پر گفتگو کی ہے۔ خالق و مخلوق کے باہمی رشتوں' رشتوں کی استواری و بودین' فکرِ انسانی کی رسائی و نارسائی' جدید علم و فکر کی مدد سے ذہنِ انسانی کی فتوحات اور اس کی کارکشائی کے امکانات پر ایک دو نہیں درجنوں سوالات اٹھائے ہیں' اور بعض نسوانی کرداروں اور ہیولائی صداؤں کی مدد سے بہت دلچسپ و فکر انگیز مکالموں کی معرفت سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

عالی کے اٹھائے گئے سوالات اور ان کے جوابؔ تلاش کا سلسلہ نیا نہیں' بہت پرانا ہے۔ ہر دور' ہر زمانے اور ہر انسانی معاشرے میں یہ سوالات زیرِ بحث رہے ہیں اور ان کے اپنے بالغ ترین و بہترین ذہنوں نے ان سوالوں کے تحت موضوعِ گفتگو بننے والے مسائل کے حل میں زور مارا ہے۔ سوالات و مسائل ایسے پیچیدہ و مشکل ہیں کہ غیر معمولی دل و دماغ کے مالک اور جدید و قدیم علم و فکر سے پوری طرح

بہرہ مند اشخاص کے سوا کسی دوسرے کے لیے جوابات کی تلاش تو دور کی بات ہے سوال کرنا بھی آسان نہیں ہے' اس لیے کہ سوالات خواہ کسی قسم کے ہوں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کا ذہن موضوعِ زیرِ بحث سے خاطر خواہ آگہی کے ساتھ حصولِ جواب کے لیے ہمہ وقت مضطرب بھی رہتا ہو اور جس کے پاس کسی نہ کسی شکل میں ان سوالوں کے جوابات بھی موجود ہوں۔ جمیل الدین عالی ایک ایسے ہی بالغ نظر اور مضطرب ذہن کے مالک شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی مکالماتی نظم میں انسان و حیات اور ان کی تخلیق و غایت کے بارے میں صرف سوالات نہیں اٹھائے بلکہ اپنے آپ کو کبھی ضمیر متکلم کبھی ضمیر مخاطب اور گاہے ضمیر غائب کی صورت میں رکھ کر بحث و استدلال کے ذریعے' سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مکالماتی پس منظر میں جو موضوعات بہت نمایاں ہو کر قاری کے سامنے آئے ہیں ان میں مندرجہ ذیل خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

○ بہ اعتبارِ فکر و نظر اور بہ لحاظِ تسکینِ جسم و روح' شاعر کی تنہائی اور تنہائی کے احساس کا کرب شدید۔

○ فرد یا ذات کی خرد افروزی و سعیِ بے نہایت کے ذریعے کوئی انمٹ' یادگار اور پیغمبرانہ کارنامہ چھوڑ جانے کا شوقِ مضطرب۔

○ جبر و اختیار کے مسئلے کے حوالے سے حشر و نشر' حساب و کتاب' ثواب و عذاب' جزا و سزا اور حقوق و فرائض کی ادائیگی میں فرد کو ذمہ دار ٹھہرانے کا جواز' عدل و انصاف کے ترازو کی تلاش اور تقلید و اجتہاد کا آشوب۔

○ غم اور خوشی کی حقیقت' ان کے بدلتے ہوئے روپ فرد بہ فرد اور طبقہ بہ طبقہ بدلتے ہوئے ان کے مفاہیم' مفاہیم کے بامعنی و بے معنی اسباب و جواز' تشریحات' توجیہات اور نظریات کی معنویت۔

○ تازہ علم و فکر اور جدید سائنسی تجربات کے ہاتھوں نظامِ حیاتِ انسانی کے شب و روز تغیرات' افکار و جذبات اور اقدار زندگی کی بے ثباتی و ناقدری اور اقدار کے کسی عنصر حتیٰ کہ جذبۂ عشق کو بھی مطلق و ابدی خیال کرنے کے عقیدے کا تزلزل۔

○ جہل و لاعلمی کے سبب انسان کی ہنوز اپنی ذات و صفات کی قدر و قیمت سے بے خبری اور علوم کی مبادیات سے بے خبری کے باوصف انسان کا دعویٰ خود شناسی کا مضحکہ و ماتم۔

○ جدید علم النفس اور جدید سائنس کی فتوحات و تجربات کی روشنی سے بے نیاز کسی قوم یا فرد کی بے خبری کی صورتِ حال اور علم و خرد کی کاملیت اور مدلل عقلیت پسندی کے عنصر کسی مسئلے پر غور و فکر کے نتائج کا مفید ہونے کے بجائے مہلک ہونا۔

○ انسانی فکر و دانش کے ایک نہ ایک دن کامیاب ہونے اور زندگی کی تیرگی کو روشنی میں بدل کر انسانیت کو مسرتِ ابدی سے ہم کنار کر دینے کی امید و بشارت۔

یہ ہیں بالاختصار وہ مباحث و مضامین جنھیں شاعر نے موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ گفتگو کی صورت یہ رہی ہے کہ مکالماتی مباحثے میں شاعر کے ساتھ مختلف مرئی و غیر مرئی کردار شریک رہے ہیں۔ نوع بہ نوع سوالات قایم

کیے گئے ہیں پھر واقعاتی دلائل اور تاریخی شہادتوں کے ذریعے ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش خشک مزاج فلسفیوں یا کم علم ملاؤں جیسی نہیں بلکہ نہایت خوش ذوق و بالغ نظر اسکالر جیسی ہے اور عالی کی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت' حیرت انگیز وسعت مطالعہ اور لائق تحسین طرز استدلال پر دلالت کرتی ہے۔ مذکور بالا موضوعات و نکات کی خوش آہنگ اور دل آویز بحث کے ثبوت میں نظم کے طویل اقتباسات کو اس مضمون میں جگہ دینا ممکن نہیں پھر بھی مختلف نکات و موضوعات سے متعلق نظم کے اجزا سے چند متعلقہ مصرعے اور اشعار نیچے درج کیے جاتے ہیں۔ ان کی مدد سے یقین ہے کہ شاعر کے ذہن میں کلبلاتے ہوئے سوالات و جوابات کا ایک مختصر سا اشاریہ ضرور قاری کے سامنے آجائے گا اور اس سے پوری نظم کو سمجھنے میں یک گونہ آسانی ہو جائے گی۔

جمالی

کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مرا دم ساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے میری ہی آواز

ہیولیٰ

بہ طور خاص یہ حرف اساس یاد رہے
جو اپنی اپنی صلیبوں کو خود ہی لے کے پہنچ جائیں قتل گاہوں تک
انھی میں سے کوئی پاتا ہے وہ لب اعجاز
جو اس کی ذات سے اس کا مکالمہ بھی کرائے
اور ایک روز کوئی کتب حیات بھی منسوب اس سے ہو جائے

جمالی

یہ جو بھی بول رہا ہے وہ سامنے بھی آئے
مری طلب کی تو بنیاد میں وہ شعلے ہیں
جو سازگار ہواؤں سے پرورش پا کر
سواد کون و مکاں میں وہ روشنی پھیلائیں
کہ سارے چاہنے والے جدائیوں کے سمندر عبور کر آئیں
سنا ہے ایسی ہی شعلوں کی آنچ سے بھی ابھرتے رہے ہیں پیغمبر

ہیولیٰ

خبردار اگم رہ تحقیق
ابھی نہیں ترے بس کے یہ نکتہ ہائے دقیق
نہیں عزیز! ابھی تو نہیں ہے اس قابل
کہ اتنی بات بھی سمجھے جو ہم نے کہہ دی تھی

ہے تیری عمر ابھی ہاؤ' ہو ہی کرنے کی

جمالی

بزرگوار کہاں میں کہاں مسائلِ ایمان و کفر کے بیچاک
نہ میں ہوں کوئی مفکر نہ دہریہ' نہ مجھے وہمِ دانش و ادراک
بس آسماں کے حوالوں سے مسئلے نہ اٹھا

وہی ہزاروں خیال
وہی سوال' وہ تقلید و اجتہاد کے آشوب میں امور سے بھرپور
شرحوں سے معمور
شاہدوں سے دلائل سے تجربات سے چور
کہ ہیں قدیم مگر آج تک ہیں لاینحل

ایک ہیولیٰ

ہمارے علم مکمل نہیں تو کیا معلوم
ہمارے فیصلے کتنے درست ثابت ہوں
کہیں زیادہ ہو نقصان فایدہ کم ہو
تمام عمر ہر اک فیصلے کا ماتم ہو
ہر ایک بات پہ شک کر
تمام باتوں کے
ہزار پہلو ہیں
تاریک بھی ہیں روشن بھی
اور ایسے بھی ہیں جو تاریک ہیں نہ روشن ہیں
تو پھر شکوک کی دنیا بسائے جا پیارے
نہ کوئی حق ہو نہ باطل نہ کوئی خیر نہ شر
روایتوں سے
اصولوں سے
کلیوں سے
مگر

دوسرا ہیولیٰ

رچا ہوا ہے جب انساں میں شیطنت کا خمیر

جب آج تک بھی نہیں طے کہ چیز کیا ہے ضمیر
ضمیر یعنی وہ بے شرطِ مصلحت کوئی اندر کی رہنما تاثیر
رہی نہ ہو جو کسی جبر و تربیت کی اسیر
کوئی بتائے حقیقت اور اس کے ساتھ ضرورت ہی خیر کی کیا ہے
خوشی کے جتنے ہیں مفہوم ہر نظر میں الگ بلکہ مختلف متضاد
ہر ایک دور میں بدلی ہوئی بدلتی ہوئی قدرِ نیک و بد کی نہاد

جمالی

میں سوچتا تھا کہ ان مسئلوں کو بھی سمجھوں
اگر ملے وہ ترازو جو خیر و شر تولے
اگر ملے کوئی مکتب جہاں کوئی استاد
مری حدود میں رہ کر مری زباں بولے
تو میں بھی دیکھوں کہ وہ مجھ پہ رمز کیا کھولے

مرے خدا
تو اگر ہے تو صرف یہ بتلا
کہ خود ہی نطفہ و بیضہ میں اتصال کیا
کہ مجھ سے پیشِ حیات ایک مشورہ نہ لیا
مجھے فسانۂ میثاق خود ہی بخش دیا
اور اس کے ساتھ یہ مشقِ حیات و موت کی مجھ کو ہی مل رہی ہے سزا
مرے خدا تو اگر ہے تو صرف یہ بتلا
میں جبرِ زیست سے مجبور، اسیرِ عقل و جنوں
کہاں تک ایسے سوال و جواب میں تڑپوں

ہیولیٰ

بتا کہ تیرے کھرب در کھرب وہ ہم نفساں
جو تیرے غم سے زیادہ غموں سے گزرے ہیں
نہ جانے کتنے ارب سال اور گزریں گے
تو کیا علاجِ غمِ دل ہے جبرِ بے خبری
تو کیا دوام ہی کر دیں ہم اپنی بے اثری
نہیں نہیں یہ نہ ہوگا مآلِ جامہ دری

کبھی تو کام دکھائے گی سعیِ چارہ گری
جو بے الف کے پڑھے میم نون کرتے ہیں
وہ صرف و نحو و معانی کا خون کرتے ہیں
میں اتفاق و مشیت کو کیسے پہچانوں
میں ابتدا کے بغیر آج کیا ہوں کیا جانوں
رہی یہ بات کہ دیدارِ یار کب ہوگا
تو جب ہوا وہ اسی ذہن کے سبب ہوگا
کہ ذہن منطق و ایماں کی واردات بھی ہے
مشاہدے، نظریات، تجربات بھی ہے
یہ مہرومہ یہ ثریا یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم کیوں نہ ہو یہ پردہ بھی چاک

جمالی

مجھے یہ ذہن کی توہین بھی پسند نہیں
کہ ذہن پر تو کوئی فتح باب بند نہیں
سب اہلِ درد کو اک دن یہ بھید پاتا ہے
کہ جسم و روح کی تاریخ و مدعا کیا ہے

جمالی

نہ جانے عمر ہے کتنی طویل اور کب تک
اسی طرح سے شب و روز مجھ سے جنگ کریں
حقیقتیں جو بہت بے حیا ہیں تنگ کریں
سنا یہ ہے کہ جنھیں انتظارِ مرگ رہے
انھی سے موت کو اکثر گریز رہتا ہے

سیما

ہاں مری جان یاد ہیں تم کو
اپنے وہ فلسفے وہ سب باتیں
جن کو دیں ہم نے کتنی ہی راتیں
اپنے اعلان یاد ہیں تم کو
تم تو کہتے تھے عشق مطلق ہے
عشق بے نفس و بے تمنا ہے

عشق بے قید ہر زمان و مکاں
عشق بس عاشقوں کی روحِ رواں
عشق بیگانۂ وصال و فراق
عشق ہر قہر و زہر کا تریاق
عشق کچھ ماسوائے عشق نہیں
عشق میں مدعائے عشق نہیں

حسینہ ہنسی میں تلخیِ آلام کو چھپائے ہوئے
چلے چلو یونہی بارِ حیات اٹھائے ہوئے

جمالی

ہوئی طلوع نہ وہ صبح جس کی حسرت تھی
ہر ایک رات گزرتی ہے لو لگائے ہوئے

مندرجہ بالا مصرعے یا اشعار جس نظم سے لیے گئے ہیں' جیسا کہ اوپر بھی ذکر آچکا ہے اس میں قضاو قدر' جبر و اختیار' حادث و قدیم' تقلید و اجتہاد' عقل و وجدان' ذات و صفات' فرد و کائنات' بندہ و خدا' مبدا و معاد' خیر و شر اور سزا و جزا کے سینکڑوں نکتے اور بہت نازک و پیچیدہ مسائل زیرِ بحث آئے ہیں اور امکان اس کا تھا کہ اس بحث میں عالی کسی نہ کسی جگہ پھنس کر رہ جائیں گے لیکن چوں کہ وہ ہر مسئلے کے بارے میں کھلا ہوا خود اعتماد ذہن رکھتے ہیں اور جن مباحث کو موضوعِ سخن بنایا ہے وہ سب ان کے علم و فکر کی سطح پر ستارے کی طرح روشن ہیں' اس لیے وہ ہر طرح کی نظری و فکری گرہی سے بچ نکلے ہیں اور اپنے قاری کو وہ کچھ دے دیا ہے جس کی انسان جیسے بسیط و عظیم موضوع پر' نظم کہنے والے ایک عظیم شاعر سے توقع کی جاسکتی تھی۔

یقیناً اس نظم میں بعض بہت نازک اور سخت مقامات آئے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے رہروِ راہِ محبت کا بچ کر نکلنا مشکل ہوگا لیکن عالی کی تخلیقی صلاحیت' لسانی جمالیات' ہمتِ عالی اور وسعتِ مطالعہ انھیں نہایت خوش اسلوبی سے ہر دشوار گزار مرحلے سے نکال لے گئی' خصوصاً" لائقِ تحسین یہ امر ہے کہ تخیل و تفکر کی اس صبر آزما طویل مسافت میں کسی ایک جگہ بھی نہ تو ان کے قدم ڈگمگائے نہ ان پر واماندگی طاری ہوئی اور نہ قنوطیت و روائیت ہی کو انھوں نے اپنے قریب آنے دیا۔ ہر چند کہ جبر و اختیار کے مسئلے کو انھوں نے بار بار چھیڑا ہے اور قضا و قدر کو کئی جگہ موضوعِ سخن بنایا ہے لیکن عقیدے کی جبریت ان کی فکرِ آزاد اور تصورِ اختیار کو ایک جگہ بھی بے اثر نہیں بنا سکی اور معقولات کی ہر بحث میں بہ ہر مقام ان کا معقولاتی ذہن غالب رہا ہے بلکہ فرد کی اہمیت اور اس کے علم فکر کی برتری کے اظہار کے باب میں تو وہ واضح طور پر کہیں کہیں معتزلائی فکر کے بہت قریب ہوگئے ہیں۔ لیکن معتزلائی فکر سے قریب ہونے کا یہ

مفہوم ہرگز نہیں کہ وہ عقلیت پسندی کے سلسلے میں بعض دوسروں کی طرح انتہا پسندانہ زاویۂ نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے جمال پرستارانہ مزاج اور طبعی نرم خوئی کی وجہ سے شاید ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے عقلیت پسندی میں معتزلائی علما کے فکر کا وہ راستا اختیار کیا ہے جو درمیانی یا اوسط الامور کا راستا کہلاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ منقولاتی مفکرین کے برعکس سارے معقولاتی علما' خواہ ان کا تعلق کسی طبقے سے ہو قضا و قدر کے باب میں تین خاص طبقوں میں تقسیم نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جن کے نزدیک انسان کاملاً" خود مختار ہے۔ دوسرا وہ جو انسان کو کلیتاً" مجبور یعنی حکم الٰہی کا تابع جانتا ہے۔ تیسرا وہ جو انسان کو قضا و قدر کا پابند بھی سمجھتا ہے اور آزاد بھی۔ جمیل الدین عالی کو ہم اس تیسرے گروہ سے وابستہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے جبر و اختیار کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے عموماً" اسی نقطۂ نظر سے خود کو ہم آہنگ رکھا ہے۔ لیکن اس جگہ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم جمیل الدین عالی نامی کسی متکلم یا فیلسوف کے خیالات سے بحث نہیں کر رہے بلکہ ہمارا موضوع حقیقتاً وہ جمیل الدین عالی ہے جو ہمارے دور کا ایک عظیم شاعر ہے اور جس نے اردو کو "انسان" کے عنوان سے ایک فکر انگیز طویل نظم دی ہے۔

زیرِ بحث مطبوعہ نظم کا آخری جزو' جسے "دشتِ سخن" میں چوتھا حصہ یا چوتھی نظم کہا گیا ہے' ابتدائی تین حصوں کے مقابلے میں سادہ بھی ہے اور مختصر بھی۔ سادہ ان معنوں میں کہ اس کا موضوع اور عنوان "حسد" ہے اور یہ عنوان خود آپ اپنا انکشاف ہے۔ مختصر یوں کہ اس کے مصرعوں کی تعداد دوسری نظموں کی بہ نسبت کم تر ہے۔ پوری نظم کو بہ اعتبار ہیئت طویل منظوم ڈرامے کا جزو بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاعر اور شاعر کے ہم زاد کے مابین مکالماتی نظم کا نام بھی دے سکتے ہیں اور ریڈیائی منظوم فیچر سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ پوری نظم میں صرف "حسد" کا موضوع' اپنے جملہ معاشرتی اسباب و علل اور انسان کے طبعی و فطری خصائل کے سیاق سباق میں زیرِ بحث رہتا ہے اور اس بحث میں صرف دو کردار بوڑھا اور جمالی حصہ لیتے ہیں۔ دونوں کے بول حقیقتاً شاعری کے بول ہیں جو گلستان و بوستان کے شیخ سعدی کی طرح زندگی کے مختلف سماجی مسائل کو زیرِ بحث لاکر' ان کے نفع و ضرر کے سارے پہلوؤں کو اس طرح کھول کر رکھ دیتا ہے کہ قاری' اصل داستان گو کو بھول کر صرف داستان اور داستان سنانے والے ضمنی کرداروں کے ساحرانہ مکالموں میں اس طرح کھو جاتا ہے' گویا سعدی کو بھول کر سعدی کی تخلیق کردہ حکایات اور حکایت سنانے والے بادشاہوں' وزیروں' درباریوں اور مشیروں کو حقیقی کردار سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح کا جادو جمیل الدین عالی نے اپنی نظم "حسد" میں جگایا ہے۔ اس میں بوڑھا اور جمالی "حسد" کے موضوع پر کچھ ایسے فن کارانہ اسلوب اور شاعرانہ سلیقے سے گفتگو کرتے ہیں کہ حقیقی شاعر یکسر پس منظر میں چلا جاتا ہے اور پوری نظم سے لطف اندوزی کے ساتھ سیراب ہو جانے کے بعد یہ راز قاری پر کھلتا ہے کہ بوڑھا اور جمالی حقیقتاً دونوں ہی شاعر کے روپ ہیں۔ ایک روپ نوخیز نو آموز اور حصول علم و آگہی کی منزلوں کے نوجوان راہی کا ہے دوسرا روپ ایک جہاں دیدہ' تجربہ کار اور سرد و گرم چشیدہ' عمر رسیدہ بزرگ کا ہے۔ دونوں میں "حسد" کے حوالے سے کیسی خوب صورت عالمانہ اور سچی بحث ہوتی ہے

اجمالا" اس پر ایک نگاہ ڈالتے چلیے۔

بوڑھا

حسد سے خبردار رہنا
حسد سے خبردار رہنا
مری جاں
پڑھی ہے کبھی بوستاں اور گلستاں

سہیلی
نہیں پنج تنتر
کلیلہ و دمنہ
حکایاتِ ایسپ
ہزاروں ہی قصے
اور ان کے وہ دانش فزا ایسے حصے
جو ہم نے سنے اور پڑھے تھے شپاشپ

مری جاں
چلو میں ہی ڈالوں تمھاری جوانی کے توشے میں کچھ سازو ساماں
بہت سے سبق ہیں کچھ آساں ہیں اور کچھ ادق ہیں

چلوں اب کہ بھائی تمھارا مسلسل جمالِ سماعت' جلالِ خموشی
مجھے بھی لگا دے نہ آزارِ سرمہ گلوئی و پنبہ بگوشی

جمالی

حضور آپ کو جو بھی کہنا ہو کہیے

بوڑھا

یہ بابِ حسد ہے
حسد یعنی اک زندہ ناسور جو ازرہِ جوشِ ازل تا ابد ہے
میں فطرت نہیں اس کو کہتا کہ فطرت بتانے کے رستے میں حائل
بڑی سخت مشکل

اسی بحثِ تخلیق، اسی مکتبِ ارتقا کی وہی شدّ و مد ہے

میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اس سمندر میں میرے بنائے ہوئے چپوؤں سے مسلّح
مگر اپنی نادر توانائیاں مجتمع کر کے کشتی چلائے

چلو آؤ آگے چلیں

یہ بابِ حسد ہے
حسد جو کبھی اک سبب ہے، کبھی اک وتد ہے
ہوا یہ ہے بھیّا
کہ جو ساتھ والے ذرا دیکھ لیں کوئی پڑھنے لگا اُن کی مرتی ہے میّا
عزیز اور دوست اور بچپن کے ساتھی
بہن بھائی ماں باپ میں بھی فقط ماں کو ہی چھوڑ کر

سگے رشتے دار اور کزن یارِ غار اور وہ تایا چچا خالہ خالو
وہ پھوپھا وہ مامے
اگر تجھ کو اپنے سے شمّہ بھر آگے نکلتے ہوئے دیکھ لیں
جل مریں گے
چھپی اور ظاہر ہزار ایسی باتیں کریں گے
کہ تجھ تک وہ بن بن کے پہنچیں فسانے تو تیری شرافت ہزار ان کو چھانے
ہے اغلب کہ ان کے تواتر سے خود نفرتی میں ہی پھنس جائے
تجھے کیا بتاؤں حسد کے رتوندے میں بیمار
ہو جاتے ہیں کس قدر خوار
سرِعام صد کذب و افواہ کے کارخانے بنائیں
اور اس ہوشیاری سے ہر سمت تشہیر کروائیں
کہ ہردم پریشانیاں اور بغیرِ گنہ بھی پشیمانیاں
اور حیرانیاں
تیرے چاروں طرف دلدلیں بن کے ابھری چلی آئیں
اور ترا ماضی و حال اور آنے والا زمانہ

سبھی
ان میں دھنس جائیں

اب معاصر
معاصر عجب چیز ہے میرے بھائی
اور ان میں سے جو دوست بنتا ہے تیرا
مگر ہاں وہ تو بھی ہو سکتا ہے میرے پیارے
کبھی یہ سمجھ لے کہ بس تو ہے محسود و حاسد ہیں سارے
رہے یاد یہ نکتۂ گفتگو بھی
معاصر جو اکثر کسی سے بھی خود کو کسی طرح کم تر نہ مانیں

وہ جب بھی کسی بھی معاصر کا دیکھیں کوئی کارنامہ
اگر ان میں دم ہے تو ایسے تڑپتے ہیں جیسے ہوا تار تار ان کے امکاں کا جامہ
ابھی آگے چل کر بتاؤں گا ان کی کئی وارداتیں
میاں میں بنا تا نہیں تم سے باتیں
عجب ان کے حیلے، عجب ان کی گھاتیں
یہی جاننے میں تو میں نے گزارے بغیرِ نتیجہ
کوئی ساٹھ صدیوں کے دن اور راتیں
مگر خیر اس وقت تم صرف تیار رہنا
خبردار رہنا

جمالی
مگر یہ تو فرماتے چلیے کہ یہ سب ہوا کیا
کسی کو اگر کچھ ملا ہے کسی نے اگر کچھ کیا ہے تو اس کی خطا کیا

بوڑھا
تو بس ایک صحبت میں سب کچھ بتادوں
یہاں کوئی ایسا بھی ہو گا، جو سب جانتا ہے
میاں دیکھتے ہو یہ بوڑھا بھی کس دھوپ میں کیسے بوسیدہ
خیموں کی کیسی چھتیں تانتا ہے

کوئی بھی ذرا سی ذہانت کا مارا معاصر کسی دوسرے کا کوئی حق
ارفع نہیں جانتا ہے
اگر جبر یا صبر یا مصلحت یا نمائش کی پابندیاں ہوں
تو جیسا بھی ظاہر کرے
سچ یہی ہے یہی ہے یہی ہے
کہ وہ اپنے اندر کی چھلنی میں صرف اک حسد چھانتا ہے
وہ سچائی کے ساتھ پوری صدی میں فقط اپنا چہرا ہی پہچانتا ہے
حسد سے خبردار رہنا
کہ بیٹے
اگر تم نہیں نکلے قسمت کے ہیٹے
تو سب کا حسد تم کو کھانے لگے گا

جمالی

مناسب تو اب پھر حسد کی طرف آئیے اور بتلائیے
کس طریقے سے ممکن ہے یہ پیچ در پیچ احوال سہنا

بوڑھا

وہ نسخے یہ ہیں مجمل و مختصر
نسخۂ اوّلیں
ایک داروئے صبر
جس میں محنت مشقت محبت کے ہمراہ
ایک جزوِ اعظم ہے
اظہارِ ردِ عمل پر بڑا سخت جبر

دوئمش
العطش العطش
سخت دھوپوں میں چلتے چلے جاؤ اور مت رکو
نرم راتوں میں بستر سے ہٹ کر تڑپتے رہو اور کہو
اے خدا!
عالمِ اندروں

تو ہی مجھ کو پرکھ تو ہی مجھ کو بتا

کیا کروں

یا الٰہی اگر میں غلط چل رہا ہوں تو پھر راست رستے دکھا

ورنہ مجھ کو مری راہ پر تیز تر اور محکم چلا

ابتدائے سفر میں ہے اک شے ضمیر

وہ بھی دیتا ہے سب خامیوں کا پتا

وہ بھی بانگِ خودی

وہ بھی صوتِ خدا

اس کو مرنے نہ دے

اس کو اک زخم ہی کی طرح دل میں رکھ اور بھرنے نہ دے

جب رسے گا بڑا ہی غضب ڈھائے گا

جانے کن کن دکھوں میں تجھے کیسا کیسا مزا آئے گا

حسد کا وہ حملہ وہ غوغا مٹے گا تو کیا

ہاں تری خلوتِ فکر و تخلیق میں بار کم پائے گا

عالی کی مندرجہ بالا نظم کا موضوع نیا نہیں ہے۔ روز مرہ کی گفتگو سے لے کر نثر اور شاعری دونوں میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے اور جیسا کہ خود عالی کی نظم سے ظاہر ہے' ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ حسد کے حوالے سے غالب کے یہ شعر تو غالباً "سارے صاحبانِ ذوق کے حافظے میں ہوں گے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

....

حسد سزائے کمالِ ہنر ہے کیا کیجیے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

آخری شعر میں تو غالب نے وہی سب کچھ مجملاً" کہہ دیا ہے جسے عالی نے مکالمے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ نثر میں تو حسد کا موضوع مذہبیات و سماجیات سے لے کر حکمت و نفسیات تک سب میں زیرِ بحث آیا ہے اور بیشتر اسی رنگ و رخ کے ساتھ زیرِ بحث آیا ہے جو عالی کے یہاں ملتا ہے۔ سورہ فلق کی آخری آیت میں "من شر حاسد اذا حسد" تو ہر مسلمان کے ذہن میں ہوگی جس کا مطلب یہ ہے کہ "میں پناہ مانگتا ہوں حاسد سے جب کہ وہ حسد کر رہا ہو۔" تفسیرِ قرآنی میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ جب حاسد اپنی قلبی کیفیت کو ضبط نہ کر سکے اور عملی طور پر حسد کا اظہار کرنے لگے یعنی دوسروں کو ملی ہوئی نعمتِ الٰہی و سرفرازی کے زوال و تباہی کی آرزو کرنے لگے تو اس کے شر سے پناہ مانگنا چاہیے اس لیے کہ اس

نوع کا حسد کسی شخص کی عظمت و نعمت کو حقیقتاً کوئی نقصان پہنچا سکے یا نہ پہنچا سکے لیکن ذہنی تکدر اور پریشانی کا سبب ضرور بن جاتا ہے۔

حسد کے اس خوف ناک و مہلک اثرات کے واقعاتی ثبوت پند و نصائح کی حکایتوں سے لے کر مقدس صحیفوں اور آسمانی کتابوں تک سبھی میں موجود ہیں خصوصاً" حالی نے اپنی نظم میں جن کتب و مجموعہ ہائے قصص کے حوالے دیے ہیں ان میں تو حسد اور اس کے مضر نتائج کے سینکڑوں شواہد ملتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحب زادگان یا برادرانِ یوسف علیہ السلام کے واقعات کا بنیادی محرک بھی ان کے بھائیوں کا حسد ہی رہا ہے لیکن حسد کے سلسلے میں مردوں کی تخصیص نہیں خواتین کے کارنامے اس سلسلے میں مردوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ حالی نے شاید طوالت کے خوف سے خواتین سے متعلق حسد کی بحث نہیں چھیڑی اور جمالی سے صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں کہ۔

میں لایا نہیں عورتوں میں حسد کے مسائل
اگر میں جیا اور ہم آگے چلے تو بھی ان کے تیروں سے بھی تم کو کردوں گا گھائل
یہاں تو ابھی ایک محدود سی جستجو اور معاد کے اطوار پر گفتگو ہے

لیکن حسد کے بارے میں علم النفس کے ماہرین' مذاہب و تواریخ اور ادبیات و شعریات کی روایات سے الگ بلکہ ان سے یکسر مختلف زاویۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک حسد ایک جبلی عمل ہے اور اس کی جذباتی کیفیات اکتسابی نہیں بلکہ فطری ہیں اور یہ کیفیات معاشرے اور فرد دونوں کے ارتقا و ارتفاع میں مثبت اور بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ خود زندگی کا مقصودِ اصلی' بقائے زندگی ہے یعنی زندگی کو بہر صورت' بہر عالم اور ہر لمحہ برقرار رکھنا ہے اور خود زندگی کی تخلیق چوں کہ اشتیاقِ زندگی کے وفور و اشتعال سے ہوئی ہے اس لیے زندگی خود اپنی زندگی کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہے۔ یہی صورت زندگی کے سب سے فعال مظہر' انسان کی ہے۔ وہ کسی قیمت پر مرنا نہیں چاہتا اور اسی لیے فطرت کی طرح وہ خود بھی تخلیق یا تخلیقی عمل کو اپنے لیے مستقل وظیفہ بنائے رکھتا ہے' جس طرح فطرت بہ ذات خود۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

بالکل اسی طرح انسان بھی اپنی ذات و صفات کی بقا کے لیے ہمہ وقت سرگرم عمل ہے اور یہ تخلیقی سرگرمی صرف اس لیے ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ادب و شاعری کی اصل غایت بھی یہی بتائی گئی ہے کہ وہ حقائق سے گریز پائی کا دوسرا نام ہے۔ یہ گریز پائی مرنے کے بعد جیتے رہنے کی آرزو مندی کے سبب ہوتی ہے اور ایک ادیب یا شاعر صرف اس لیے تخلیقی عمل میں تسکین و انبساط محسوس کرتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہے گا۔

بقائے زندگی کی اس آرزو مندی یا کوشش میں جب ایک تخلیقی ذہن کا مالک شخص عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی خودی کو اپنی بقا کے لیے دوسروں کی خودی سے متصادم ہونا پڑتا ہے۔ اس تصادم میں

اگر آدمی کامیاب و سرخ رو ہو گیا تو اس میں تفاخر و انبساط کے جذبات موج زن ہو جاتے ہیں اور وہ آدمی زندگی میں کام گار و کام یاب کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس بقائے حیات کے تصادم میں ناکامی ہوئی تو پھر آدمی احساسِ کمتری و فسردگی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں دوسروں کے خلاف غم و غصہ، نفرت و عداوت اور رشک و حسد کے جذبات ابھر آتے ہیں اور وہ مدِّ مقابل کے زوال کی آرزو کرنے لگتا ہے، لیکن اگر تخلیق کار ذہین و باشعور ہو تو دوسروں کے زوال کی خواہش میں مبتلا رہنے کی بجائے اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدل دینے کی تازہ کوشش شروع کر دیتا ہے اور غم و غصہ یا رشک و حسد کے جذبات کو، ترفیع و تصعید کی ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس میں اپنے حریف و مدِّ مقابل سے مقاومت و نبرد آزمائی کی نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اختراع و ایجاد کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور آخرِ کار وہ حاسد کا مدِّ مقابل بن جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کا جذبۂ حسد اپنے محسود کے حق میں ہمیشہ مضرو مہلک ہی نہیں ہوتا بلکہ محسود میں مسابقت و مقاومت کی ایک نئی طاقت پیدا کر کے نامساعد حالات سے آنکھ ملانے اور اپنی انا کو جراحت سے محفوظ رکھنے کا ایسا سلیقہ بھی سکھا دیتا ہے کہ محسود نہ صرف یہ کہ حاسد کی زد سے اپنے آپ کو بچالے جاتا ہے بلکہ خود کو حاسد سے برتر و افضل ثابت کر دکھاتا ہے۔

حسد کے اس مثبت و تعمیری پہلو کی طرف شاید عالی کی نظر نہیں گئی ورنہ وہ حسد کے اثرات سے نوجوان جمالی کو بوڑھے کے پند و نصائح سے اس طرح خوف زدہ نہ کرتے جیسا کہ انھوں نے اپنی نظم میں کیا ہے۔ پھر بھی جہاں انھوں نے جمالی کو معاصرین کے حسد سے محفوظ و مامون رہنے کے نسخے بتائے ہیں وہاں اس امر کا اظہار بھی ہو گیا ہے کہ عالی کے نزدیک حسد کا مرض لاعلاج نہیں ہے بلکہ انھیں یقین ہے کہ اگر محسود محبت اور محنت و مشقت کا دامن استقامتِ کردار کے ساتھ تھامے رہے تو وہ اپنے ضمیر اور اپنی انا کو حاسدوں کی ضرب و زد سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

عالی کی نظم "حسد" سے ایک اور بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان کی نظم محض تخیلاتی نظم نہیں ہے یعنی اس کا انداز وہ نہیں ہے جو عموماً" فطری و غیر مرئی موضوعات مثلاً" "زندگی، موت"، "خزاں، بہار"، "غم، خوشی"، "نفرت، دشمنی" اور "کذب و صداقت" جیسے موضوعات پر کہی گئی نظموں کا ہوتا ہے بلکہ اس نوع کی نظموں سے بہت مختلف ہے۔ ان کی نظموں کے متعدد اجزا اور درجنوں مصرعے ایسے ہیں جو اس بات کا واضح سراغ دیتے ہیں کہ "حسد" ان کی عملی زندگی کے تجربے کا حصہ ہے اور وہ گھر سے لے کر باہر تک اپنے حسنِ سیرت و صورت اور کمالاتِ فکر و فن کی بنا پر نو عمری ہی سے حسد کا نشانہ بنے رہے ہیں۔ کبھی قریبی عزیزوں نے، کبھی دوستوں نے، کبھی رفقائے کار نے، کبھی ہم عمروں اور ہم چشموں نے، کبھی ہم عصروں اور ہم رتبہ ساتھیوں نے ان پر حسد کے زخم لگائے ہیں۔ ان زخموں میں بیشتر مندمل ہو گئے ہیں لیکن بعض ناسور بن گئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، عالی خود کو حاسدوں کے ہر گروہ اور ہر فرد سے بچالے گئے ہیں اور اپنے دفاع و تحفظ میں انھوں نے صبر و ضبط، تحمل و برداشت اور مشقت و محبت کے انھیں نسخوں کے استعمال سے کام لیا ہے جو انھوں نے ایک بوڑھے اور تجربہ کار مردِ دانا

کی حیثیت میں جمالی کو بتائے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ عالی نہ تو خاندان کے حاسدوں کے سامنے کبھی سپرانداختہ ہوئے اور نہ ہم عمروں اور ہم عصروں یا ہم رتبہ و ہم مشربوں کے حاسدانہ حربوں اور رویوں سے خوف زدہ ہوئے۔ مشکلیں بہت سی آئیں، مصائب بہت سے ٹوٹے اور عذاب طرح طرح کے جھیلے لیکن اپنی ذہانت اور ان تھک محنت کی مدد سے اپنے ضمیر اور اپنی انا کو حاسدوں کی گزند سے بچائے رکھا نتیجتاً" وہ اپنے عہد کے ایک نہایت معتبر و منفرد شاعر، صاحبِ مطالعہ و باشعور دانش ور ہر دل عزیز نغمہ نویس و گیت نگار اور موقر و معتبر اظہاریہ نویس کی حیثیت سے ابھرتے چلے گئے اور آخرِ کار فکر و فن کے ایسے بلند منصب پر فائز ہوگئے کہ پوری پاکستانی قوم اور پوری اردو دنیا کے لیے قابلِ احترام و لایقِ تقلید مثال بن گئے۔ اللہ انھیں تادیر صحت و توانائی کے ساتھ سلامت رکھے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

جمیل الدین عالی اور آٹھویں سُر کی جستجو

ایک عجیب راگ ہے ایک عجیب گفتگو
سات سُروں کی آگ ہے آٹھویں سُر کی جستجو

اگر "لا حاصل" کو بیچ میں سے نکال دیا جائے تو "اے مرے دشتِ سخن" "غزلیں' دوہے' گیت" کے تقریباً" چار دہائیوں کے بعد شائع ہوا ہے۔ حرفِ آغاز میں وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو کہنا چاہیے تھا' لیکن ذکر نہیں ہے تو "غزلیں' دوہے' گیت" کا جس نے جمیل الدین عالی کو جمیل الدین عالی بنایا اور عالی کی شاعری کی وہ پہچان متعین کی جس کے قائل محمد حسن عسکری' ابنِ انشا' سلیم احمد سب تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ پہچان عالی کے لیے بوجھ بن گئی یا عالی آگے بڑھنے کے لیے اس کو بھلا دینا چاہتے ہیں یا ان کے اندر کی بھیرویں کچھ اور کہتی ہے' یا یہ ردِ تشکیل کا وہ عمل ہے جسے طویل سفر طے کرنے والوں کی تخلیقیت اکثر روا رکھتی ہے؟ عالی میرے دوست ہیں اور دوستوں کے بارے میں بے تعلقی سے قلم اٹھانا بہت مشکل امر ہے' معروضیت تو ویسے بھی ناممکن ہے۔ عالی کے دوہے کے قائل ان کے مخالفین بھی ہوں گے' جس شخص نے ایک قدیم سنسکرت یا پراکرتی صنف کو اردو وایا اور اردو اصنافِ شعری کا حصہ بنا دیا اور اوائل عمر میں ہی رجحان ساز ہونے کا درجہ بھی پا لیا' اس کو شاعری سے اور کیا چاہیے؟ لیکن اگر واقعی ایسا ہوتا تو عالی دوسرے دیوان کا نام "لاحاصل" نہ رکھتے۔ حاصل اور لاحاصل کا یہ کیسا کھیل ہے؟ کیا کہیں کوئی داغ ناتمامی ہے جو اندر ہی اندر سلگ رہا ہے؟ شاعر کو اکثر اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کی مغفرت کس حوالے سے ہوگی اور ہوگی بھی کہ نہیں۔ پچھلی بار عالی پر قلم اٹھاتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ عالی کی شہرت دوہے سے ہوئی ہے لیکن عالی کا بنیادی محاورہ غزل ہے۔ تغزل کا جوہر عالی کی سائیکی میں جاگزیں ہے' دوہا بھی دلی اور لوہارو کی روایت سے آیا ہوگا' اور بھگتی اور شرنگار رس کا کھیل غزل کے پہلو بہ پہلو کسی اجنبیت کا حامل نہیں۔ حقیقتاً یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ کب چت پٹ ہو جاتی ہے اور پٹ چت' شاعری یہ کھیل شاعر کو بتا کر نہیں کھیلتی کیوں کہ شاعر جب کہہ چکتا ہے تو اس کا کام ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا عمل شروع ہو جاتا ہے قارئین کا' جسے ہم اردو میں "زمانہ" یا "عہد" بھی کہتے ہیں۔ وسط بیسویں صدی میں دوہے میں خلا تھا' اس کی بازیافت اس وقت زمانے کو راس آئی۔ شہرت خوشی دیتی ہے مگر ہر خلش کا علاج نہیں۔ میرا خیال ہے عالی کی طبیعت غزل میں بھی برابر زور مارتی رہی' مگر زمانہ کی

قبولیت (reception) کا عالم نرالا ہے جس کو توقعات کی جس خراد پر اتار لے۔ لگتا ہے عالی کی تشنگی برابر بنی رہی۔ پھر دوہا غزل کے مقابلے میں ہے بھی تو حاشیائی کردار، قلب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ عالی کی تشنگی کو بڑھاوا ملا ان کی سماجی مصروفیات' خدمت خلق' اردو اداروں کی عہدہ داری اور گلڈ اور انجمن کی سرداری و سربراہی سے' نیز کالم نویسی اور اخبار بازی سے۔ کہاں شاعری اور کہاں شوق صحافت کی فراوانی اور آئے دن کا بہتا پانی۔ غرض یہ کہ ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا' اور تشنگی بنی رہی۔ عالی کی اخبار بازی ہو یا اردو اداروں کی صورت گری یا عہدہ سازی' فن کار اچھا ہو اور اس سے توقع شاعری کی ہو تو کوئی رعایتی نمبر دے بھی کیوں؟ اردو ویسے بھی اس معاملے میں زیادہ روادار نہیں۔ ادھر عالی نے چاہا تو بہت لیکن نہ اداروں کو چھوڑا نہ اخباروں کو' اور حق شاعری کا بھی ادا کرنا چاہا تو اندر کا تصادم اور اضطراب ایک irony میں ڈھلتا چلا گیا جو عالی نسبی اور خاندانی وجاہت کی وجہ سے پالکی سے نیچے پیر بھی رکھنے نہیں دیتی اور طعنۂ نایافت بھی سننے نہیں دیتی۔ چناں چہ وہ پہلے ہی سے خود کو رد تشکیل (deconstruct) کردیتی ہے۔ دوہا تو دشت امکاں میں فقط ایک نقش پا تھا' عالی کی شاعری ایک اضطراب زدہ روح ہے جو تمنا کا دوسرا قدم اٹھانے کے لیے بے تاب رہی ہے' ایسا نہ ہوتا تو اس مجموعے کا نام "اے مرے دشت سخن" ہی کیوں ہوتا۔ مزید یہ کہ آٹھویں سر کی جستجو بھی آسان نہ تھی...... ایک عجیب راگ ہے ایک عجیب گفتگو' اندر کی آگ برابر جلتی رہی۔ اس نے کیا کیا نظمیہ شکلیں اختیار کیں' اس کا ذکر تو آگے آئے گا' پہلے اس درد کو سمجھنا ضروری ہے جس نے عالی میں ایک خاص طرح کی حس مزاح پیدا کی ہے خود شکنی کی' اپنے آپ کو رد کرنے کی' آگے بڑھنے اور خود پیچھے ہٹ جانے کی' یہ فقط حسن کی تغافل آزمائی نہیں جو بے خودی و ہشیاری کو ایک ہی آن میں نبھالے جاتی ہے بلکہ جو بلند حوصلگی کے احساس اور حالات و حوادث کے پیش نظر اس احساس کے شکست ہونے یا تکمیل کے امکاں اور رد امکاں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا ذکر میں اس لیے بھی چھیڑ رہا ہوں کہ یہ irony عالی کے یہاں ایک شعری محرک بھی ہے' کہیں ظاہر کہیں مضمر' ظاہر ان نظموں میں جہاں معاصرین کا ذکر آیا ہے اور مضمر ساری شاعری میں۔ بہ ظاہر کچھ نظمیں سوانحی لگتی ہیں لیکن سوانحی نہیں ہیں۔

دل دیوانہ من
کہہ نہ افسانہ من

سننے والوں کو بھلا کیسے یقیں آئے گا......

ہر طرف کذب و نمائش کا وہ غلبہ ہے کہ سچ مضحکہ اڑوائے گا
ان کے آگے نہیں چلتی ہے کوئی سعی فقیرانہ من

دل دیوانہ من
کہہ نہ افسانہ من

....

جیتے جی میرے کھلے گا نہ ذرا گلشن ویرانہ من.....

دل دیوانہ من

کہہ نہ افسانہ من

آج تک خشک ہے زردانہ من

یوں ہی روئے گا عزاخانہ من

دل دیوانہ من

کہہ نہ افسانہ من

(آشوب)

یوں تو "حد ادب" میں بھی یہی کیفیت ہے اور "نذر بابائے اردو" میں بھی، لیکن "نذر مشفق خواجہ"، "ایک سادہ سی تقریب" اور "گواہی" اس پائے کی نظمیں ہیں جہاں یہ درد سرشاری کی حدوں کو چھونے لگتا ہے اور شعری طاقت اپنا جواز خود بن جاتی ہے۔ "نذر مشفق خواجہ" مزے کی نظم ہے۔ سلیم وانشا کا احوال بر سبیل تذکرہ ہے، اصل معاملہ اپنے درد دل کا ہے۔ دوست باقی رہے نہ دوستیاں، زماں سیل رواں ہے، گزر رہا ہے، دوسرے نہیں رہے تو ایک دن شاعر بھی نہیں رہے گا۔ چناں چہ اس کی خواہش ہے کہ جہاں اس کی شاعری کو یاد کیا جائے وہاں دوسرے کاموں کو بھی نگاہ میں رکھا جائے تاکہ پلڑا سبک نہ ہو :

تم پہ حق نہیں اتنا

مانگتا ہوں میں جتنا

میرے بعد جینا ہے

زہر زیست پینا ہے

مجھ کو یاد کر لینا

مختصر ہی کہہ دینا

انجمن کے دفتر میں

کالجوں کے محشر میں

ساتھ ساتھ راہوں میں

صبر میں کراہوں میں

جس قدر بھی دیکھی ہے

وہ جو مجھ پہ گزری ہے

غور طلب ہے کہ "نذر مشفق خواجہ" ہو یا "ایک سادہ سی تقریب" یا "گواہی" ان تینوں نظموں میں تصور اختتام سفر یعنی موت کا ہے اور اپنی جمع پونجی یعنی شعری کمائی کا یعنی اثاثہ کیا ہے یا پیچھے کیا سرمایہ چھوڑا ہے؟ ان نظموں میں چوں کہ منظر کاری بھی ہے اور جذبے کا فشار بھی، تینوں کی ہیئت مثنوی کی ہے

جس میں عالی کی قدرت بیاں کے جوہر کھلتے ہیں۔ ایک تو درد کی زیریں لہر' پھر بے نیازی اور خود شکنی' ساتھ ہی روانی' سلاست اور گھلاوٹ' ملاحظہ ہو :

چلا جو میں تو مرا جلسۂ وداع ہوا
کئی ہزار زبانوں کا اجتماع ہوا

....

پھر اپنے اپنے پھریرے ہوا میں لہرائے
اور ان کے سائے میں لاکھوں مصنفین آئے
پھر ایک وفد ز انبوہ قارئین آیا
اور ایک مجمع تنظیم ناقدین آیا

(ایک سادہ سی تقریب)

اور اس کے بعد یہ انکسار جو دعویٰ کمال کا پہلو بھی رکھتا ہے اور عالی نسبی کا بھی :

میں ہاتھ جوڑ کر ان سب کے سامنے آیا
حضور کیا ہے جو مجھ پر کرم یہ فرمایا
مجھے کبھی نہ کوئی دعویٰ کمال ہوا
نہ کچھ کسی سے تقابل کا ہی خیال ہوا
میں آپ سب کا کہاں تک لگا سکوں گا سراغ
مری متاع یہی ہیں بجھے بجھے سے چراغ

(ایک سادہ سی تقریب)

اس نظم کا اختتام بھی نہایت عمدگی سے شاعرانہ پیرائے پر ہوا ہے۔ مانا جانا نہ مانا جانا' شہرت پانا نہ پانا یہ سب اضافی باتیں ہیں' اصل چیز تو جذبہ شوق اور اندر کی تڑپ ہے اور اس میں سے کتنا زندہ رہ پاتا ہے' اس کی کسی کو خبر نہیں۔ فن تو اصلاً " ہے ہی باب ناتمام سے' یہ تو احساس کا زخم ہے' ہرا رہنا جس کا مقدر ہے :

تو کیا ہوا کہ ہر اک سمت سے صدا آئی
اور اپنے ساتھ عجب رنگ اک فضا لائی
چل آ کہ تو بھی اسی باب ناتمام سے ہے
یہاں تو سب کو غرض اپنے اپنے کام سے ہے

(ایک سادہ سی تقریب)

"گواہی" میں اس خلش نے ایک اور مسئلہ کو چھیڑا ہے اور بڑے بڑوں سے مثالیں دی ہیں کہ ان میں سے بھی بعضے ایک صنف کے پابند نہیں تھے۔ شاعر چاہتا ہے کہ اس نے جو نثر لکھی ہے اس کا حق بھی اس کو دیا جائے یعنی ذہن انسانی کی کچھ تازہ دریافتیں اور ڈسکورس (discourse) ایسے ہیں کہ انھیں

عوام کی سطح تک عوام کی زبان میں لے جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ہر کسے را بہر کارے ساختند' عالی نے جگہ جگہ جو شعر نکالے ہیں ان کی شعریت کی داد نہ دینا ظلم ہے :

سنا تھا ذہن میں کچھ خام مال ہوتا ہے
اسی میں صد ورق صد خیال ہوتا ہے
ودیعت ازلی' گرد و پیش کے احوال
اگر سلیقے سے آمیز ہوں تو وحی مثال
کبھی وہ آب سے اولہ بنا کے دیتا ہے
کبھی وہ کوئلے کو ہیرا بنا کے دیتا ہے
میں اپنی حد میں غزل دوہے گیت کہتا تھا
خود اپنے سحر گلو میں بھی مست رہتا تھا
سوائے اس کے کوئی نثر کا خیال نہ تھا
غم عوام جزوں سے شریک قال نہ تھا
خدا گواہ یہ اقرار استفادہ ہے
نہیں کہ اپنا ہی کچھ کیف و کم زیادہ ہے
شگاف سینہ فقط نظم ہی سے بھر نہ سکا
صغیر تھا کوئی فتح کبیر کر نہ سکا
میں ایک ذرہ صحرائے بے کران سخن
سوائے حسن طبیعت ملا نہ علم نہ فن

(گواہی)

یہ سارے مقامات وہ ہیں جہاں آپ بیتی شاعری بن گئی ہے۔ نظم منطق نہیں کہ دلیل کی تعمیر کو دیکھا جائے کہ کلیت کار شاعر کے حق میں جاتی ہے کہ نہیں اور جو منصفین ہیں وہی قارئین بھی ہیں' تاہم کون ہے جس پر خود شکنی اور دردمندی میں گندھی اس نظم کا جادو نہ چلے گا اور کون ہے جو اس کی خستگی کی داد نہ دے گا :

ہزار تفرقے' ناخواندگی' خرد بندی
زمیں پہ قبضہ بنام حق خداوندی
سو ان سے کشمکش صد جہات جاری ہے
بہ حفظ علم کہ اک وہ بھی ذمہ داری ہے
ادھر کچھ ایسے بھی ہیں کہ ذہن میں خارش
"خراب کردہ جہلے و فارغ از دانش"

تو میں جو مجلہ گہہ شعر میں ہی رہ نہ سکا
سبب وہی ہے کہ بس اتنے بوجھ سہہ نہ سکا
ملی جنھیں نہ کوئی بات قابل تحریر
وہ قتل شعر سے ہی اس کی کر گئے تعبیر

....

وہ زور جتنا عیوب و صفات پر رکھیں
ذرا سی کلیت کار پر نظر رکھیں

اس منظرنامے کے بعد آیئے دیکھیں کہ جس نئے طبیعیاتی سائنسی ڈسکورس پر عالی نے دسترس حاصل کی ہے اور جس کو وہ اردو میں لے آئے ہیں' شاعری میں اس کی ترغیب ذہنی کا عمل کیا ہے اور اس سے اثر پذیری کی کیا شکلیں بنتی ہیں؟ اس مجموعے کی خصوصیت خاصہ عالی کی شاعری کی یہی نئی جہت ہے۔ مجموعے میں ایسی نظموں کی اچھی خاصی تعداد ہے' لیکن شعری تشکیل کے اعتبار سے میرے نزدیک "امکان" اور "حجی" بے مثال ہیں۔ "امکان" خلا کے موضوع پر ہے :

خلا خالی نہیں ہے
اس میں ایسے ایسے عنصر' بے ظہور' اس طرح رہتے ہیں
کہ جیسے بعض شاعر بے لکھے بس ذہن ہی میں دل کے انگارے ملا کر شعر کہتے ہیں
وہ کہتے ہیں وہ عنصر بے محرک' بے قوانین طبیعیات' ایک شوق خود وجودی میں
ابھر کر رقص کرتے ہیں

عناصر کا یہ رقص بغیر آغاز اور بغیر انجام کے ہے بلکہ زماں یا مکاں کا یہ پیمانہ ہی نہیں ہوگا تو ہجر و وصال کی معنویت بھی بدل جائے گی :

اور اس کے بعد یا جب چاہیں ہم اک ساتھ ہی چھپ جائیں
دوبارہ کوئی قالب لیں نہ واپس آئیں
یہ ممکن ہے وہی وصل مسلسل ہو
ہماری نامکمل زندگی یعنی یہ بعد اختلاط جسم' آغاز و نشاط تشنگی' شاید وہاں
جا کر مکمل ہو

"حجی" خاصی طویل نظم ہے۔ متکلم خداوند سے خطاب کر کے اپنے عجزیاں کی معذرت چاہتا ہے کہ اس کی مشق سخن تنگ سخن نکلی کہ اس نے دانش مینا سے بھی سیراب ہونا چاہا اور جس صنف کو جتنا بھی اپنایا وہ مثال دلبریاں شکن نکلی۔ وہ جمع گہرہائے بزرگاں کا احترام کرتا ہے کہ ان کے دبستان مراتب' صد مناقب' سجدہ تعظیم کے ارکان واجب اپنا اپنا ایک عالم ہیں' وہ ان سے فیض اٹھا کر ان سے اونچا جانا جاتا

بکال۔

ہے لیکن :

کہاں ان کے خزانے اور کہاں میرے یہ بے رس' بے تراوش' کشتگان جمل اور
محروم ایمائیت افسانے

جمال فن سے بیگانے

موودب ان نقوش پا سے اک لمس جبیں کو بھی غنیمت جان کر تھا گزر تا ہوں

یہ خود شکنی ایک شعری تحت بیانی بھی ہے جس کے پردے میں آدم اپنے حوصلوں' امنگوں کی بات کرتا ہے :

خداوندا

مجھے تو کم سے کم اتنی ہی صدیاں اور دے

دیکھوں' پڑھوں' سوچوں' لکھوں' کچھ کام کر جاؤں

اگر انعام ہوتے ہیں تو کوئی کارنامہ لائق انعام کر جاؤں

نہیں میں یہ نہیں کہتا کہ اب یا عہد آئندہ میں کوئی نام کر جاؤں

مگر ممکن تو ہے تیرے کرم سے جرم گاہ زندگی میں خود کو بے الزام کر جاؤں

یہ صدیاں تو الف بے تھیں

خود کو بے الزام کر جانے کی خواہش عالی کی کلیدی خواہش ہے اور اسی نے عالی سے سائنسی نظموں کی جہت کھلوائی ہے۔ اس کے بعد شاعر کہکشاؤں ماوراؤں کی بات کرتا ہے کہ یہ کیسے بنتے اور خلا میں گھومتے رہتے ہیں' ہماری تقویموں میں ان کی ساعتوں صدیوں کے پیمانے آتے ہی نہیں' ان کے سامنے سے روشنی گزر جائے تو اس کو بھی اندر کھینچ لیتے ہیں۔ یہ کھیل صدیوں سے جاری ہے اور صدیاں تو الف بے تھیں' اصل تہجی تو ابھی باقی ہے۔ اس کے بعد جلوہ معنی کے حوالے سے سنگولے ریٹی (Singularity) کا قصہ چھیڑا ہے تو توانائی کا مسئلہ گویا قصوں کا قصہ ہے :

کر دیا ثابت توانائی

سمجھ میں آ کے بھی اب تک نہیں آئی

وہ کیا شے تھی

وہ کیا ہے کیوں متحرک ہوئی کیوں پھیلتی ہی جا رہی ہے

کیا کبھی واپس بھی آئے گی جب آئے گی تو اس کی وجہ کیا اور شکل کیا ہوگی

اس نظم میں ثابت وسیار اور پھر "انتشار" کی پوری داستان سمودی ہے۔ اس موضوع پر اس وضع کی دوسری نظم اردو میں نہ ملے گی۔ شاعر ہر صفحہ معنی کو الٹ کر دیکھتا ہے کہ مفہوم سے محروم رہنا تو مقدر انسانی ہے۔ اب تک صدیوں کا الٹ پھیر تو پہلی یا دوسری کروٹ تھی' کائنات کے رازوں کو سمجھنے

کے لیے مزید وقت چاہیے تاکہ ایسی زبان یا ایسا محاورہ بن سکے جو ہر کون و مکاں کے اسرار کی تعبیر پر قادر ہو' اب تک کی صدیاں تو محض الف بے تھیں 'انسان کی تلاش بے کراں کا سفر جاری ہے 'کیا معلوم یہ تہجی مکمل بھی ہو یا نہیں۔

خداوندا!

خیال اک زائر خوش گفتگو کو بے تسلی اک حریف آرزو نکلا
میں کچھ سمجھا مگر پھر بھی نہیں سمجھا
مجھے تو چند صدیاں دے ہی دے جن میں مجھے جتنے بھی حرف و لفظ آجائیں
انھی سے اک زباں' تعبیر ہر کون و مکاں' اپنی بنانی ہے
مجھے سب ہوش مندان زر افشاں جس قدر بھی دے گئے اور جو بھی دیں منظور ہے لیکن
مرے دل میں سوالوں کی جو دنیا ہے وہ ماضی حال مستقبل سے وابستہ سہی پھر بھی.....
مگر اس کا دوانہ پن بھی تو تیری تلاش بے کراں ہی کی کہانی ہے
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

طویل نظمیہ "انسان" بھی شعر عالی کی نئی جہت کا حصہ ہے۔ سو اس کا ذکر بھی تجربی آزاد نظموں کے ساتھ کرنا مناسب ہے۔ "اے مرے دشت سخن" میں "انسان" کے چار حصے شامل ہیں جو تقریباً" سوا سو صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں تین مسلسل ابواب ہیں اور چوتھا حصہ جس کا عنوان "حسد" ہے اس کی ترتیب ہنوز طے نہیں ہے۔ عالی اس نظمیے کو ایک مدت سے لکھ رہے ہیں اور اس کے اجزا وقتاً" فوقتاً" رسائل و جرائد میں شائع ہو کر توقعات پیدا کرتے رہے ہیں۔ اس پورے نظمیے میں منظرناموں' کرداروں وغیرہ کی حرکات و سکنات' حلیے اور ڈرامائی متعلقات کو بہ قول مصنف قاری کی تفہیم و تصور پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ پہلا اور دوسرا باب تقریباً" بیس پچیس صفحوں پر مشتمل ہیں' حسد والا ٹکڑا بھی تقریباً" اتنا ہی ہے' لیکن تیسرا باب پچاس صفحوں کو حاوی ہے۔ مکالمے چوں کہ منظوم ہیں' پورے نظمیے کو غنائیے کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ موضوع و مفاہیم کے اعتبار سے یہ ایک نادر الوجود اور بلند حوصلہ کاوش ہے' خصوصاً" ایسے دور میں جب طویل نظم پر توجہ بہت کم ہے اور روایتی رسمی شاعری کی ہوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ "انسان" کا کینوس ہی ایسا ہے کہ بہت سی توقعات پیدا کر دیتا ہے' لیکن چوں کہ نظمیہ ہنوز نامکمل ہے' حتمی رائے دینا خارج از بحث ہے۔ یوں بھی سوا سو صفحات پر پھیلی ہوئی نظم کے مباحث و نکات سے انصاف کرنے کے لیے الگ سے مضمون کی ضرورت ہے۔ نظمیہ میں جمالی اور سیما دو بنیادی کردار ہیں' جمالی جسمانی طور پر اور سیما روحانی یا تصوراتی طور پر' کیوں کہ اس کی یادیں بار بار لوٹ کر آتی ہیں۔ کئی مقامات پر سیما کی آواز مکالمے کو آگے بھی بڑھاتی ہے اور اس میں مزاحم بھی ہوتی ہیں۔ نظمیے میں کئی دوسرے نسوانی اور مرد کردار بھی ہیں جو مباحث اٹھاتے اور سوال و جواب کرتے ہیں۔ اسرار اور چند نوجوان احتجاجی صدائیں ہیں اور کئی آوازیں اور ہیولے بھی ہیں جو بار بار ابھرتے ہیں اور ڈرامائی فضا کی

تشکیل کرتے ہیں۔ جمالی اور اسرار ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جمالی اسرار کو ذلیل' سیاہ باطن' مکروہ شکل والا کہتا ہے اور اسرار جمالی کو بیوقوف سمجھتا ہے۔/ کہ بس اتنی سی لونڈیا کے لیے مول لی اپنی بھی پائمالی/ لیکن حسینہ اس احتجاجی صدا کے بارے میں کہتی ہے / انھیں بھی جمالی سے کم مت سمجھئے۔ جمالی شاعر کا alter ego بھی ہو سکتا ہے اور نظمیہ "انسان" اس حوالے سے اولادِ آدم کے عذابوں' ثوابوں' خوابوں' امنگوں' حوصلوں' خیالوں اور خلا کے رازوں کی داستان ہے :

کوئی مری داستان لکھے
کوئی مری داستان لکھے
جو میری مانند اور لاکھوں شکست کھائے ہوؤں کی تاریخ بھی رہے گی
جنھوں نے کس کس عذاب کو اک بہشت امید کی خوشی میں دبا رکھا تھا

بیچ بیچ میں عالی کی حس مزاح اور خود شکنی کے چھینٹے بھی ہیں :

میں کیسی الجھن میں مبتلا ہوں
مجھے یہ کیسی روایتوں اور حکایتوں کے سنپولے اندر سے ڈس گئے ہیں
یہ میری کم مائیگی کے قریوں میں کن بزرگوں کے لاؤ لشکر مجھے ڈرانے کو بس گئے ہیں

تاہم شاعر کی بلند حوصلگی لائق داد ہے کہ وہ ایسا بیان چاہتا ہے جو اپنی مثال آپ ہو :

جیسے زمیں کے مظلوم باسیوں کا فسانہ خود آسمان لکھے
کوئی مری داستان لکھے!

پہلے باب میں کون و مکاں اور تسخیرِ طبیعیات کی نئی دریافتوں کی طرف شاعرانہ اشارے ہیں' اس کا موثر ترین حصہ اس کا اختتامیہ ہے جب جمالی کہتا ہے :

چلو بھی اب تم ہی اٹھو سیما
مری توانائی طلب سے تمام پردوں کو چاک کردو
یہ پتھروں کی سلیں مری آتشِ تمنا سے خاک کردو

....

ہوا اگر اس کے بعد کوئی نیا دھماکا
تو وہ ہمارے لیے ہو جشنِ ابد اور اک ساتھ ہی چلیں ہم
زمین' شمس و قمر' سدا ایم
کوئی سمجھتا ہو ان کو تخلیق کوئی کہتا ہو ان کو دائم
یہ میرے جوشِ غضب کے آگے نہ رک سکیں گے
ہمیں تو وہ دوسرا دھماکا عطا کرے گا

ہمارے سر اور سنگتوں کا اک ایسا شدھ اور ایک ایسا کامل
عجب عالم
جو آج ان کہکشاؤں کے رقص میں بھی بے بھاؤ اور بدھم
چھپا ہوا ہے

دوسرے باب کی جان وہ مکالمہ ہے جو نسوانیت پر حسینہ اور معینہ میں قایم ہوا ہے۔ حسینہ اپنا دکھڑا روتی ہے اور معینہ ہمت بندھاتی ہے۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ مفاہیم جب موج در موج آتے ہیں تو صنف مثنوی کا قالب اپناتا ہے اور مست و بے خود ہو کر داد سخن دیتا ہے :

معینہ

فرق طبقات ہی نہیں ہے غضب
شاونیت کا ارتقا ہے عجب
کیا لقب کیا حسین چابک ہے
صنف نسواں تو صنف نازک ہے
کی مقرر ز راہ سرشوری
جسم کی وضع خاص کم زوری
جب کہ اس میں تحمل کی طاقت ہے
بارہا زچگی کی قوت ہے

....

کم نہ تحقیر میں تھا مشرق بھی
اک مثل مغربی بھی خوب چلی
"شاخ اخروٹ' عورتیں' کتے
جتنا پیٹا انھیں وہ ٹھیک رہے"
پچھلی صدیوں کا جو بھی ماتم ہے
اس صدی میں بھی روشنی کم ہے
اک مسز پینکھرسٹ پائی ہے
اک سموں دی بوار آئی ہے

....

اپنے ہاں ایک عصمت چغتائی
ان کے ہاں امرتا پریتم لائی

کچھ ادا جعفری کی سعی بیاں
عورتوں کو وہی عورتوں کی زباں
مادرِ ملت ایک روح زماں
جن سے ڈرتا تھا لشکر مرداں
ایک گرزِ گراں سی بن کے رہیں
پھر بھی افواج ظالماں ہیں وہیں
ایک حلف بھی نہیں بنی ہے ابھی
جنگ کرنی بہت بڑی ہے ابھی

....

اور یہ عشق و شق کے ہفوات
یہ جو ہے ایک ادارہ جذبات
کچھ کثافت یہاں بھی وجونی ہے
اس کی تطہیر بھی تو ہونی ہے

....

کیوں رہے یہ چمن مراعاتی
رنگ و بو اس کے ہیں مساواتی
نعرہ یہ ہے رعایتیں مت دو
جو ہمارا ہے ہم کو واپس ہو

حسینہ

سیدھی سادی سی اک حقیقت ہے
مجھ کو اک شخص سے محبت ہے
وہ کسی اور کا اسیر ہوا
چھوٹنا مجھ سے ناگزیر ہوا
پھر بھی ہر وقت اس کی یاد آئے
اور ہر ہر نفس میں بس جائے
میں کہ خود اک حسین لڑکی ہوں
پڑھتی لکھتی ہوں اور سوچتی ہوں
اہل جاگیر کی نشانی بھی

یعنی معروف خاندانی بھی
کیسے کھودوں جو اس کو پا نہ سکوں
کیا کروں گر اسے بھلا نہ سکوں

....

ایسی باتوں کی کیا زباں ہوگی
کیا کچھ آرائش بیاں ہوگی
سیکس کی شرح و داستاں ہوگی
یا کوئی اور این و آں ہوگی

....

حسیات نوی کے کیا معنی
کیا نہیں میرے دکھ ہی بامعنی

یہ اقتباسات قدرے طویل ضرور ہوگئے' لیکن یہ بحثیں کتنوں نے اٹھائی ہیں اور اس حسن معنی اور لطف کلام کے ساتھ۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دیگر مباحث بھی کس سطح پر ہوں گے' آفرینش کائنات اور ثوابت وسیار کے لامختتم اسرار' انسانی فطرت' آگہی' خالق کون و مکاں' مذاہب عالم کی روایتیں' فلسفوں کے سلسلے' تناسخ' تشکیک اور بیسیوں دوسرے مسائل تیسرے باب میں آئے ہیں۔ یہ سب ایک طرح کی خود کلامیاں بھی ہیں کہ عالی نے یہ سب مباحث ساز شوق کی دھن پر چھیڑے ہیں :

نہ بھولیو کہ مسلسل ہے ساز شوق کی دھن
بس ایک تار ہے ساری ردائے زیست نہ سن
سرور آگہی دیں گے نہ چند پیمانے
ہزارہا خم مستی ہزار ہے خانے

تاہم اردو نظم میں سائنسی فکر اور خرد افروزی کی بنا ڈالنے کو یہ چند پیمانے ہی بہت ہیں۔ شاعری اس سے زیادہ کی متحمل ہو بھی نہیں سکتی۔ عالی نے جسے عذاب خرد پرستی کہا ہے' اس آتش کدہ خیال سے نکل کر عالی نے شاعری میں ایک پوری نئی گزرگاہ کو روشن کیا ہے۔ فکر و جذبہ' نیز تخیل و تجرید کی اس آمیزش سے شعر کا ڑھنا آسان نہ تھا۔ عالی کی جگر کاوی اور سینہ فگاری کی داد آگے چل کر ایک زمانہ دے گا۔ "انسان" اگر مکمل نہ بھی ہوئی تو بھی ایک مثالی نمونہ کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔

اب آخر میں کچھ ذکر عالی کی مقبول صنف دوہے کا بھی ہوجائے جو عالی کے شعور کی زبان ہے' اور پھر چلتے چلاتے ایک جھلک غزل کی جو عالی کے لاشعور کی زبان ہے۔ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ عالی موسیقی سے دوہے کی طرف گئے یا دوہے سے موسیقی کی طرف آئے' ان دونوں میں گہرا رشتا ہو نہ ہو' عالی کی سائیکی میں سنگت کے سر گھلے ہوئے ہیں۔ اس کی نشانیاں جگہ جگہ "اے مرے دشت سخن" میں بکھری

ہوئی ملتی ہیں اور ان کی معنویت جیسی اس مجموعے میں نظر کر سامنے آتی ہے اس سے پہلے ایسا نہ تھا۔ ویسے تو عالی نے اس کو سربستہ راز رہنے دیا ہے لیکن "گھنگھرو" سے پتا چلتا ہے کہ مسلک خواہ یہ رہا ہو کہ ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو' لیکن یہ سلسلے حضرت دہلی سے پونہ اور حیدر آباد تک پھیلے ہوئے تھے/ اب سے مری روح میں وہ گھنگھرو/ کبھی بجتے ہیں کبھی روتے ہیں / یعنی کچھ ایسی آوازیں بھی ہوتی ہیں جو ماورائے سخن ہوتی ہیں :

خود جھومیں گے پائل گھنگھرو ٹھمری اور کھماج
سر مرے جا کر گت تیری داسی میں گاؤں تو ناچ

ایک نظم راگ "بجے بجے ونتی" پر ہے جسے استاد فیاض خاں مرحوم کی نذر کیا ہے / من جھومے لہرائے' رے شیاما / یاد تمھاری آئے' رے شیاما / سر بھی ایک سعادت ہے جس کی معنویت فقط اس پر کھلتی ہے جسے یہ دولت نصیب ہو۔ عالی نے یہ مسئلہ "سر کیسے بنا" میں چھیڑا ہے۔ اسی طرح "نذر امیر خسرو" اور "نذر شاہ لطیف" خاص ٹھاٹھ میں ہیں / یہ کافی ٹھاٹھ کی سندر راگنی / مدھم اور کھرج میں گاؤں .... ذرے جاؤں / بلاشبہ یہ نغمے وہ ہیں جو ہر روح میں نہیں گونجتے۔ دہلی کے دو تاریخی واقعے میری یادداشت کے ہیں' ایک موقع پر میں شریک تھا دوسرے میں' میں شریک نہ تھا۔ عالی کا قیام میرے یہاں تھا' ان کے ایک دوست تھے رجی (راجندر کمار) بے حد باذوق انسان' زبردست حس مزاح کے مالک' باتوں باتوں میں اڑتی چڑیا کے پر کتر لیتے تھے' جیوتش بدیا کے گنی' جوہروں کے جوہری' حیات ریجنسی میں ٹھکانہ تھا' امرکی یورپی بالائیں طواف کرتیں تھیں' بہرحال سنگیت کے ایسے رسیا کہ کوئی استاد کیسا کم آمیز ہو' رجی کی سب سے آشنائی تھی۔ (افسوس ...... آں قدح بشکست و آں ساقی نماند) عالی سے ایسی گاڑھی تھی کہ عالی دہلی میں جہاں ہوں جس جگہ ہوں' یہ کھوج نکالتے اور قدر مشترک فقط اتنی تھی کہ راگ انوراگ سنگیت کے دونوں رسیا۔ بہرحال مشہور فلم اسٹار کبیر بیدی کے یہاں محفل تھی جس بن پروتما بیدی تو تھیں ہی' مشہور اداکارہ اور کسی زمانے کی شعلہ جوالہ وجینتی مالا بھی بھارت ناٹیم کر رہی تھیں۔ انھیں جو پھول بھینٹ ہوئے تھے' جب عالی جی کا تعارف کرایا گیا تو انھوں نے وہ پھول عالی جی کو پیش کر دیے۔ "کالی داس نئے شکنتلا کے" والے دوہے اسی موقع کی یادگار ہیں۔ ان دوہوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ باوجود شدائد کے ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کی آس سنگیت کی مٹھاس میں کی گئی ہے :

کلا جہاں ہو پیار کریں گے اگر لیا پہچان
کلا کا سورج دیش نہ دیکھے وہ جگ بھر کی جان
ہندوستان اور پاکستان پہ سے گزرے کیوں آئے
آج نہ سمجھیں کل سمجھیں گے عالی کے ادھیائے
جلتا ہے بس نیتا ہے رس کیسے ملے مٹھاس
اے دونوں ہمسایو پھر بھی گھولتے رہنا آس

دوسرا موقع وہ ہے جب عالی دہلی کلاتھ مل کے مالک لالہ بنسی دھرے کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے' موریہ شیرٹین میں استاد اللہ رکھا اور طبلہ نوازی کے نوجوان جادوگر ذاکر حسین کا پروگرام تھا۔ عالی کی نظم "یہ خسرو کی ایجاد" جس میں دیواریں' ضربیں' گونیں' نوک جھونک' خالی وغیرہ عالی نے کچھ نہیں چھوڑا' اسی موقع کی نظم ہے جب ذاکر حسین کی انگلیوں کے رقص نے سماں باندھ دیا تھا۔ عالی کی تخلیقیت کا موسیقی سے جو رشتا ہے' اس بارے میں غزل کے ان دو شعروں میں بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے :

اتنی بڑی بزم موسیقی میں تیری
اپنی یہی لے مدھم مدھم کافی ہے
جیون راگ کے تان پلٹ کیا سمجھو گے
عالی صاحب تم کو سرگم کافی ہے

سُر سرگم سے عالی کا جو رشتا ہے اسی کے پیشِ نظر ذیل کے دوہوں کی لفظیات اور اصطلاحوں اور فضا سازی پر غور کرنا خالی از لطف نہ ہوگا :

مجھ میں کچھ سُر کھوئے ہوئے ہیں وہی لگائیں آگ
نا یہ پہاڑی نا بھٹیالی یہ ہے دوہا راگ

....

سُر اور شبد اور دھیان کی اگنی شعلے جن کے لاکھ
خسرو پر جو جلیں پتنگے عالی ان کی راکھ

ان دوہوں کو مزید دیکھیے کہ اول تو عالی نقطے گننے والوں کو کس خوبی سے لاجواب کر رہے ہیں کہ چیزیں جب ایک کلچر سے دوسرے کو منتقل ہوتی ہیں تو نہ صرف وضع قطع بدل جاتی ہے بلکہ جمالیات بھی کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ اور شاعری ہو یا سنگیت' سارا کھیل رس یعنی تاثیر کا ہے' یہ نہیں تو خالی لفظوں سے کچھ نہیں ہوتا :

تانپورہ بھی گھر میں رکھا سارنگی بھی لائے
اے بھئی گائک سُر کے بنا سُر کھیل نہ کھیلا جائے

....

طبلے رے طبلے تیری گمک سے پڑے ہے دل پر چوٹ
پگلے رے پگلے یوں بھی نہ ہو تو ہم دونوں میں کھوٹ

....

میرے ماترے گننے والے تو سچا پر یار
جب خسرو کے ہاتھ سے گزری وینا ہوئی ستار

یہ تو سنگیت سے رشتے کی بات تھی' ورنہ دوہے میں عالی کی جو حیثیت ہے' وہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے کوئی کافر بھی انکار نہیں کر سکتا (ویسے پچی داد دینے والوں میں ایک کافر بھی ہے) عالی کے دوہوں' عشق و عاشقی کے پیرایوں' پریم رس اور بھگتی رس کے بارے میں اتنا لکھا گیا ہے کہ سامنے کی باتوں کی تکرار عبث ہے' یہ فصل کبھی کی کٹ چکی اور اب تو اٹھا چکے ہیں زمین داران زمینوں کو' سوائے اس کے کہ سردست زیر نظر مجموعے سے میں اپنی پسند کے کچھ دوہے نشان زد کرلوں۔ ان کی معنویت اکہری نہیں' اور اس بارے میں فقط اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میرے نزدیک یہ تمام دوہے اچھے خاصے پولیٹکل ہیں اور مٹی سے جڑے ہوئے ہیں :

ایسا تجھے بنا کر اتنے خوش تھے اور حیران
تیرے من میں نرمی رکھنا بھول گئے بھگوان

....

گوری تیری بھینٹ کو شبد اور دھیان کہاں سے لائیں
سندرتا کی سبھی مثالیں خود تجھ سے شرمائیں

....

جتنا راج بھی راجا جیسا اصل سمجھ نہ پائے
جو آنکھوں کی سوئیاں نکالے وہی رانی بن جائے

....

جب تک سے نہیں دیتا ان نیتاؤں کو چھانٹ
تاش کے ہیں وہی باون پتے جیسے بھی دو بانٹ

....

دوڑنے والو دوڑو پر یہ دھیان نہ جانے پائے
آخر میں بس وہی جیتے گا جس کو سے جتائے

....

میں نہیں کوئی کٹر پنتھی سنو مرا ادھیائے
مسجد کو مندر کہہ دینے سے خدا نہ بدلا جائے

پھر بھی دوہا دوہا ہے اور غزل غزل۔ اتنا تو پہلے کہہ چکا ہوں کہ غزل عالی کے دل کا چور ہے' وہ مغل بچے ہیں' دوہے کی سندرتاؤں اور راس لیلاؤں کو انھوں نے جوانی ہی میں مار رکھا تھا' چھیڑ خوباں سے بھی جاری رہی' گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ یہ حسرت بھی شاعری میں بڑے بڑے کام کرالے جاتی ہے۔ دوہا عالی کی دھرتی ہے تو غزل عالی کی زمین ہے۔ عالی کی درویش صفت قلندری نے دھرتی سے نبھائی ہے تو زمین سے بھی ناتا نہیں توڑا۔ البتہ آٹھویں سُر کی تلاش میں انھوں نے زیادہ خونِ جگر نظم میں کھپایا ہے۔

اس کم نگہی کے باوجود جب جب غزل ہوئی ہے' لطف و اثر اور آزادگی و بے نیازی کا چشمہ پھوٹ بہا ہے۔ ان شعروں پر کس کی نگاہ نہ ٹھہرے گی :

ساری رات ستاروں آگے کیا رونا
صبح ہی کرلے گریہ شبنم کافی ہے
ابھی ترے انکار پہ کیوں روؤں مجھ میں
اپنے آپ پہ ہنسنے کا دم کافی ہے
لطف نگہ کی خواہش تھی سو کب کرتے
آج تلک وہی چشم برہم کافی ہے

اس غزل میں کراچی کا اشارہ نہ بھی آتا تو بھی فضا کہہ رہی ہے کہ کس درد نے یہ شعر کہلوائے ہوں گے :

دوزد کہ سے کشوں کے شرار نفاق سے
اک آگ سی خبر ہے کہ سے خانہ جل گیا
محدود رکھ نہ اپنے سیاق و سباق میں
ہر خواب کی قسم کہ ہر افسانہ جل گیا
مابین والیان چمن کیا تپش ہے یہ
ایک ایک میرے پھول کا زردانہ جل گیا
روکو یہ آگ ورنہ کراچی کے ساکنو
جنت سا ایک شہر جعیمانہ جل گیا
آب حیات جیسے وہ معمار واپس آئیں
دیکھیں کہ کتنی جلد یہ کاشانہ جل گیا

جس طرح دوہوں کا حصہ میں نے اپنے پسندیدہ دوہوں پر ختم کیا تھا' اب شعروں کے انتخاب سے رسوا ہونا ہی ہے تو پھر پسندیدہ غزل بھی سہی۔ ملاحظہ ہو عالی نے غالب کی زمین میں بہ تغیر قافیہ کیا گل بوٹے نکالے ہیں' ان اشعار میں برش و روانی اور جزالت و خستگی اس درجہ ہے کہ بہائے لیے جاتی ہے اور پھر انسان سوچتا ہے کہ حسن و لطافت کی جو پرچھائیں سی گزر گئی' اس کی معنویت کے پیچھے تو کیے نہیں :

گزر گیا ہے جو وقت اس میں جا کے دیکھتے ہیں
طرح قبول غزل آزما کے دیکھتے ہیں
دکان کم سخنی کی بھی منفعت مت پوچھ
ہم اپنے آپ کو برسوں گنوا کے دیکھتے ہیں
ہر آدمی پہ ہوئی وحی کائنات ارزاں
سب اپنے طور سے جلوے خدا کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے کہ تحریر خود کو لکھوائے
مجھے بتا، مرا دیوان اٹھا کے دیکھتے ہیں
دل تباہ و فسردہ تمھیں قبول نہیں
کہو تو عطف و اضافت ہٹا کے دیکھتے ہیں
ہم اہل بزم کو کیوں اپنے اعتماد میں لیں
کہ وہ بھی تو ہمیں نظریں جھکا کے دیکھتے ہیں
جن اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا
انھیں یہ سسی و پنوں سنا کے دیکھتے ہیں

عالی نے بہت پہلے کہا تھا / کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مرا دم ساز / ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز۔ عالی کی شاعری کی غالب کیفیت خود کلامی کی ہے' اور اب تو انھوں نے دشت تحن کو آواز دی ہے' ان کی تحت بیانی بھی اسی حوالے سے ہے' مرزا غالب اور خواجہ میر درد دونوں سے ان کا رشتا ہے' ایک سے ددھیالی دوسرے سے ننھیالی' کلاسیکی رچاؤ میں اس روایت سے اثر لینا برحق' لیکن راہ عالی نے ہمیشہ اپنی لی ہے۔ اختر الایمان ان کے دلی کالج کے ساتھی تھے' ان سے دوستی بھی بہت تھی' اور اپنے عہد پر اختر الایمان کا اثر بھی ہے' لیکن نہیں ہے تو عالی پر۔ عالی فیض' راشد' میرا جی سب کا احترام کرتے ہیں لیکن وہ مانتے صرف میرا جی کو ہیں۔ ایک جگہ کہا ہے / میرا جی کو ماننے والے کم ہیں لیکن ہم بھی ہیں / فیض کی بات بڑی ہے پھر بھی اب ویسا کون آئے گا / ایک اور نظم' جو "بولے مارا جائے" میں صاف اقرار کیا کہ سب تو میرا جی کو بھول گئے' لیکن مجھ جیسا معتوب زماں میرا جی کو یاد کرتا ہے :

اب فیض بھی ہیں اور راشد بھی
وہ بہت بڑے پر میرا جی!
ہاں میرا جی وہ چمکتے ہیں
کیا کیا ہیرے کیا کیا موتی کس شان کے ساتھ دمکتے ہیں!

میرا جی سے یہ نسبت کس حوالے سے ہے؟ یہ قول میرا کرے ہے جس کو ملامت جہاں وہ میں ہی ہوں / اجل رسیدہ' جفا دیدہ' اضطراب زدہ / اس ملامتیہ احساس کا کچھ رشتا (عالی جی کے اشرافیہ سے ہونے کے باوجود) ان کی خود شکنی' بے نیازی اور خستگی سے ہو سکتا ہے' یا پھر میرا جی کا غیر رسمی نرم لہجہ' یا تجربیت یا تازہ کاری' یا پھر دھرتی کا رس اور لوک رشتوں کی جڑوں میں اترا ہوا ہونا' بہر حال مطابقتیں یا جزوی مناسبتیں اتنی سادہ نہیں ہوا کرتیں کہ حتمی طور پر بیان میں آجائیں۔ عالی کا رول ماڈل جو بھی رہا ہو' انھوں نے شعر کی وادی میں اپنی راہ سینے کے بل طے کی ہے اور اپنی ڈگر الگ بنائی ہے۔ دوہا نگاری کو اردو میں اس طرح رچا بسا دینا کہ وہ اردو کی صنف ہو جائے' عالی کا ایسا تاریخی کارنامہ ہے جس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ لیکن انھوں نے اس پر قناعت نہیں کی' غزل تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے' مثنوی کو بھی انھوں نے

بت تجھایا اور اب نظم میں سائنسی فکر کی جہت کھول کر ایسا معنی خیز تخلیقی تجربہ کیا جس کے آیندہ امکانات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شاعری میں جو کچھ ہوتا ہے اندر کی آگ سے ہوتا ہے۔ عالی کا کہنا ہے کہ "سات سُروں کی آگ ہے آٹھویں سُر کی جستجو" آٹھویں سُر کی جستجو گویا ناممکن کو ممکن بنانے کا عمل ہے' اور یہی سچی شاعری کا منصب ہے' جس کا عزم عالی نے کیا ہے۔

☆ ○ ☆

خاکے

ڈاکٹر آفتاب احمد

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

غالب نے ایک جگہ اپنے بارے میں کہا ہے۔

دبیرم' شاعرم' رندم' ندیمم' شیوہ ہا دارم

فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیوہ ہا دارد' وہ استاد تھے اور انھوں نے پہلے چند برس سنٹرل ٹریننگ کالج اور پھر ایک طویل عرصے تک گورنمنٹ کالج لاہور میں ہزاروں طلبہ کو فارسی اور اردو پڑھائی تھی۔ وہ دوست تھے اور ایسے کہ دوستی ان کی زندگی میں ایک طرزِ زندگی بن گئی تھی۔ وہ نہ صرف اپنے ہم قبیلہ اور ہم عمروں بلکہ اپنے شاگردوں کے بھی دوست تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی صاحب کے پرانے شاگرد' استادی شاگردی کا رشتا ختم ہونے کے بعد بھی' ان کی طرف کھنچے آتے تھے اور انھیں خلوص و محبت سے ملتے تھے۔ وہ میزبان تھے اور ان کی میزبانی میں ایک ایسی معصوم بے ساختگی تھی کہ یہ ان کا فطری تقاضا معلوم ہوتی تھی۔ گھر میں کسی مہمان کے بغیر کھانے پر بیٹھنا ان کے لیے محال تھا۔ اگر دوست احباب میں سے کوئی نہ ہو تا تو ہمسائے میں سے کسی کو پکڑ کے لے آتے۔ یہ مبالغہ نہیں امرِ واقعہ ہے۔ میری چھوٹی چچا زاد بہن اور اس کے میاں کمن آباد میں ان کے گھر کے قریب رہنے لگے۔ صوفی صاحب ان کو نہیں جانتے تھے مگر وہ چوں کہ صوفی صاحب کو پہچانتے تھے لہٰذا جہاں کہیں انھیں ملتے' ادب سے سلام کرتے۔ میری بہن بتاتی ہے کہ ایک شام صوفی صاحب نے ان کے دروازے پر دستک دی اور دونوں میاں بیوی کو اپنے ساتھ یہ کہہ کے کھانے پر لے گئے کہ آج گھر میں شب دیگ پکی ہے۔ وہاں جا کر باتوں باتوں میں صوفی صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ میری بہن ہے' اس کے بعد تو وہ گویا ان کی بیٹی بن گئی۔

مہمانوں کے معاملے میں صوفی صاحب کا دل بڑا وسیع تھا۔ صرف دوست احباب ہی نہیں وہ ایسے حضرات کی میزبانی کے لیے بھی تیار رہتے تھے' جن سے ان کے کوئی ذاتی تعلقات نہ ہوں۔ اس میں ان کو بڑی طمانیت حاصل ہوتی تھی۔ سید سلیمان ندوی لاہور آئے تو صوفی صاحب ہی کے ہاں قیام کیا۔ فراق صاحب بھی ۱۹۴۶ء میں ریڈیو کے مشاعرے کے لیے آئے تو انھی کے ہاں ٹھہرے۔ ڈاکٹر نذیر احمد جھنگ سے آئے تو اپنے ساتھ ٹھہرانے کے لیے اس زمانے کے ایک شاعر جعفر طاہر کو بھی لے آئے' جو جھنگ میں ان کی دریافت تھے۔ اس کے بعد بھی جعفر طاہر اکثر صوفی صاحب ہی کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ مہمانوں کا

خاطر تواضع میں صوفی صاحب جس خوش دلی کا مظاہرہ کرتے تھے وہ میں نے کسی اور میں بہت کم دیکھی ہے۔

میں پہلے پہل صوفی صاحب سے اس وقت ملا جب میں اسلامیہ کالج کا طالب علم تھا اور وہ پروفیسر حمید احمد خاں کی دعوت پر بزم فروغ اردو کی ایک محفل میں صدارت کے لیے آئے تھے، جہاں میں نے اختر شیرانی پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ پھر میں جب گورنمنٹ کالج کا طالب علم ہوا تو صوفی صاحب سے زیادہ ملاقات ہونے لگی اور میں ان کے گھر پر بھی آنے جانے لگا۔ گورنمنٹ کالج کی مجلس اقبال میں، میں نے صوفی صاحب کی فرمائش پر یکے بعد دیگرے دو مضمون پڑھے "غالب، بجنوری" اور "غالب کی عشقیہ شاعری"۔ بعد میں پہلا مضمون "ادب لطیف" میں شایع ہوا اور دوسرا "ساقی" میں مگر صوفی صاحب سے زیادہ قریبی تعلق میرے گورنمنٹ کالج کے اسٹاف میں بہ طور لیکچرار شامل ہونے کے بعد استوار ہوا۔ اس زمانے میں صوفی صاحب کواڈرینگل ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور وہیں رہتے تھے میرا گھر چوں کہ کالج سے دور تھا لہٰذا میں دوپہر کے کھانے کے لیے کواڈرینگل میس کا ممبر بن گیا چناں چہ اب صوفی صاحب سے روزانہ ملاقات ہونے لگی۔ میں ان کے دفتر پہنچ جاتا۔ صوفی صاحب کا کھانا گھر سے آتا اور میرا میس سے اور ہم دونوں مل کر کھانا کھاتے اور گپ بھی کرتے۔ اکثر یہ ہوتا کہ صوفی صاحب کسی نہ کسی دوسرے اسٹاف ممبر کو بھی بلا لیتے۔

ایک دن میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یو۔ کرامت صاحب ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہونے والے ہیں۔ کرامت صاحب پنجاب کے نامور جاٹ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی سردار حبیب اللہ زمیندارہ لیگ کے کرتا دھرتا تھے۔ کرامت صاحب بڑے وجیہ آدمی تھے۔ سرخ و سپید رنگ، لمبا قد، بھرا ہوا اور زشی جسم کہ اپنے زمانے میں ٹینس کے کھلاڑی رہ چکے تھے۔ پنجابی ان کی مادری زبان تھی اور کبھی کبھی بول بھی لیتے تھے۔ اردو سے انھیں کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی گفتگو کی زبان انگریزی تھی اس لیے کہ ان کی اسکول کی تعلیم بھی انگلستان میں ہوئی تھی جس کے بعد انھوں نے کیمبرج سے اقتصادیات میں ڈگری حاصل کی۔ واپسی پر اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرار ہو گئے، جہاں وہ میرے بڑے بچازاد بھائی کے استاد رہے تھے جن کی زبانی میں نے ان کی انگریزیت کے بہت سے قصے سن رکھے تھے۔ اپنے طور طریقوں اور گفتار و کردار میں وہ واقعی خاصے انگریز واقع ہوئے تھے۔ ان کا نام دراصل کرامت اللہ تھا۔ روایت یہ تھی کہ انگلستان پہنچے تو ان کو وہاں مسٹر اللہ کہا جانے لگا۔ اس مضحکہ خیز خطاب سے نجات پانے کے لیے انھوں نے یہ اصل نام سے پہلے منتقل کر لیا اور اس طرح وہ یو۔ کرامت بن گئے۔ اسلامیہ کالج میں لیکچراری کے بعد وہ گورنمنٹ سروس میں آ گئے اور آخر لدھیانہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ تقسیم کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ اقتصادیات کے صدر اور وائس پرنسپل کی حیثیت سے آئے۔

میں نے کرامت صاحب کی انگریزیت کی صراحت اس لیے کی کہ بہ ظاہر صوفی صاحب کا ان سے کوئی میل نہیں تھا اور نہ ان کے درمیان کوئی قدر مشترک تھی سوائے اس کے کہ دونوں گورنمنٹ کالج

کے استاد تھے مگر صوفی صاحب اپنی خوئے میزبانی سے مجبور تھے' انھوں نے کرامت صاحب کو بھی اپنے دفتر میں کھانے پر مدعو کرلیا۔ اس دن صوفی صاحب نے لاہوری دروازے کے باہر امرتسری کشمیریوں کی دکان سے' جو اس زمانے میں بہت مشہور تھی' خاص طور پر تلی ہوئی مچھلی منگوانے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ کرامت صاحب نے کہ لاہور کے جم خانے اور پنجاب کلب میں لنچ اور ڈنر کھانے کے عادی تھے' بھلا اس قسم کی مچھلی کب دیکھی ہوگی مگر صوفی صاحب نے انھیں اس پر لگا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کرامت صاحب بغیر کسی تکلف کے اور بڑی رغبت سے وہ مچھلی کھانے لگے اور انھوں نے اپنی انگلیاں تیل میں تر ہونے کی بھی پروا نہیں کی۔

صوفی صاحب امرتسر کے رہنے والے تھے اور کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا امرتسر کے باشندے بالعموم اور وہاں کی کشمیری برادری کے افرد بالخصوص ان کی بڑی کم زوری تھے۔ وہ امرتسر سے ایف اے پاس کرنے کے بعد بی اے کی تعلیم کے لیے ایف سی کالج لاہور آئے جہاں مجید ملک صاحب اور تاثیر صاحب ان کے ہم جماعت تھے۔ ایم اے فارسی انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا پھر سنٹرل ٹریننگ کالج سے بی ٹی کی سند حاصل کی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ اس کالج میں السنہ شرقیہ کے لیکچرار ہو گئے' تین چار سال کے بعد تبادلے پر گورنمنٹ کالج کے شعبہ فارسی اور اردو میں آ گئے اور ۱۹۵۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس دوران میں وہ لاہور کی تعلیمی' تہذیبی اور ادبی زندگی میں بہ طور استاد اور بہ طور شاعر و ادیب جانے پہچانے لگے۔ نیازمندان لاہور کے حلقہ احباب میں شامل ہوئے اور ان کی ادبی سرگرمیوں میں شریک رہے مگر امرتسر ان کو کبھی نہیں بھولا۔ تقسیم سے پہلے تک وہ تعطیلات میں ہر اتوار کو امرتسر جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی امرتسر کو یاد کرکے لاہور اور لاہور والوں کو صلواتیں بھی سنا دیا کرتے تھے۔ نیازمندان لاہور کے حلقہ احباب سے اور ان میں تاثیر صاحب سے خصوصاً" آخر دم تک بڑی بے تکلفی کی دوستی رہی مگر جو تعلق خاطر ان کو اپنے لڑکپن کے امرتسری دوستوں بابو غلام علی اور فیروزالدین صاحب سے تھا' وہ کسی اور کے ساتھ نہیں تھا۔ فیروز صاحب تو شام کی محفل میں صوفی صاحب کے ہم نوالہ ہم پیالہ بھی تھے' بابو غلام علی البتہ ہم نوالہ ہی ہوتے تھے۔ ان کے ایک اور دوست مولانا محمد حسین عرشی بھی تھے وہ مذہبی عالم تھے' ان سے اور قسم کی رسم و راہ تھی۔

امرتسر سے صوفی صاحب کی دل بستگی کا اندازہ اس واقعے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ انھیں اپنے کسی جاننے والے کے ہاں ولیمہ کی دعوت پر گوال منڈی کے علاقے میں جانا تھا۔ لیکن اکیلے جانا ان کے لیے ہمیشہ مشکل ہوتا تھا' لہٰذا انھوں نے بہت اصرار سے مجھے اپنے ساتھ کرلیا۔ ہم تانگے میں سوار ہوئے تو صوفی صاحب نے امرتسری دعوت کے کھانوں کی خصوصیات گنوانی شروع کردیں تاکہ میں ذہنی طور پر اس نعمت غیر مترقبہ کے لیے تیار ہو جاؤں جو مجھے ارزانی ہونے والی تھی۔ گوال منڈی کے چوک میں پہنچتے ہی صوفی صاحب نے تانگے کو رخصت کردیا' اس لیے کہ اب انھیں کچھ دکان داروں سے علیک سلیک کرنی تھی اور جہاں کہیں حقہ موجود ہو وہاں ایک آدھ کش بھی لگانا تھا کہ یہ بھی اپنائیت کی ایک نشانی ہے۔

صوفی صاحب مختلف دکانوں پر سامان کی ترتیب و آرائش کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے گزر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ بالکل امرتسر کے بازار کا نقشہ ہے' لاہور والوں کو اس طرح دکانیں سجانی نہیں آتیں۔ حد تو اس وقت ہوئی جب ہم گوشت کی ایک دکان کے سامنے سے گزرے' اس پر صوفی صاحب کا تبصرہ یہ تھا کہ کبھی کسی لاہور والے کی دکان میں اس خوب صورتی سے گوشت لٹکا ہوا دیکھا ہے؟ مجھے اس پر ہنسی آ گئی۔ صوفی صاحب نے کسی قدر حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر کہا۔ اصل میں تم نے گھوم پھر کر امرتسر کے بازار نہیں دیکھے اس لیے تمھیں میری باتیں عجیب سی لگ رہی ہیں۔

گورنمنٹ کالج کے بعض دوسرے اساتذہ بھی امرتسر سے تعلق رکھتے تھے' مثلاً" پروفیسر سراج الدین صدر شعبہ انگریزی' پروفیسر قاضی محمد اسلم صدر شعبہ فلسفہ و نفسیات' اسی شعبہ کے ڈاکٹر حمید الدین اور ڈاکٹر عنایت اللہ صدر شعبہ عربی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی صوفی صاحب کی طرح امرتسر کا دل دادہ نہیں تھا۔ سراج صاحب سے تو صوفی صاحب کے تعلقات محض واجبی تھے۔ قاضی صاحب سے البتہ ان کا میل جول زیادہ تھا۔ ان سے گفتگو میں کبھی کبھی امرتسر کی یادیں بھی تازہ کر لیا کرتے تھے مگر ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ڈاکٹر عنایت اللہ سے کچھ بے تکلفی تھی۔ وہ صوفی صاحب کے برابر کے ساتھی تھے مگر قریبی ساتھی نہیں۔ ڈاکٹر حمید الدین شاگرد تھے۔ فیض صاحب کے ہم جماعت اور ہم عمر' ان سے بڑی دوستی تھی۔ وہ ان کی شام کی محفل میں بھی شریک رہتے تھے مگر صوفی صاحب کے سب سے قریبی تعلقات تو کالج کے پرنسپل یعنی پروفیسر اے ایس (پطرس) بخاری صاحب سے تھے اور یہ تعلقات نیاز مندان لاہور کے زمانے سے چلے آ رہے تھے' جب بخاری صاحب یہاں پروفیسر تھے۔ بخاری صاحب عمر میں صوفی صاحب سے کچھ بڑے تھے اور ٹریننگ کالج میں ان کے استاد بھی رہے تھے۔ لہٰذا قریبی تعلقات کے باوجود صوفی صاحب ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور نجی محفلوں میں بھی کسی قسم کی بے تکلفی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بخاری صاحب البتہ ان سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتے رہتے تھے اور کبھی کبھی انھیں اپنے مزاح کا نشانہ بھی بناتے تھے۔

نیاز مندان لاہور کے حلقہ احباب کے بزرگ مولانا عبدالمجید سالک صاحب سے بھی صوفی صاحب کے ادب و احترام کے تعلقات تھے۔ البتہ بے تکلف اور گہری دوستی تاثیر صاحب ہی سے تھی اور انھی سے گلوں شکووں کا دفتر بھی کھلا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دوست محمد حسن عسکری جب لاہور آئے تو میں نے انھیں صوفی صاحب سے ملوایا اور صوفی صاحب نے حسب عادت فوراً" انھیں اور مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی۔ اس محفل میں علاوہ ہم دونوں اور تاثیر صاحب' فیض صاحب اور غلام عباس بھی موجود تھے۔ فیض صاحب تو جلدی چلے گئے مگر ہم سب دیر تک بیٹھے رہے۔ ایک موقع پر تاثیر صاحب نے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ صوفی تم بڑے بے وقوف ہو' صوفی صاحب کو یہ سن کر تاؤ آ گیا اور انھوں نے بگڑ کر انگریزی میں کہا:

You have never allowed me to become wise in the last

twenty five years!

ہم سب تو صوفی صاحب کی برہمی دیکھ کر خاموش ہو گئے اور تاثیر صاحب چہرے پر ہاتھ رکھ کر شرارت سے مسکرانے لگے مگر صوفی صاحب ایک دفعہ شروع ہوئے تو دیر تک رواں رہے۔

بہرحال تاثیر صاحب سے صوفی صاحب کی دوستی گلوں شکووں کے باوجود آخر دم تک قایم رہی۔ حفیظ جالندھری بھی نیازمندان لاہور میں شامل تھے اور اس حلقہ احباب کے عروج کے وقت ان سے بھی صوفی صاحب کی دوستی تھی مگر اس زمانے میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں حفیظ صاحب کے سبھی دوست ان سے الگ ہو گئے تھے' سوائے مجید ملک صاحب کے۔ میں نے لاہور میں ان کو اس حلقہ احباب کی محفل میں نہیں دیکھا۔ ہاں تاثیر صاحب کے انتقال کے موقع پر ضرور موجود تھے۔ مجید صاحب نے ان کو کراچی بلا کے اپنے محکمہ سے وابستہ کچھ کام سپرد کر دیا تھا۔ کراچی ہی کا واقعہ ہے کہ ایک شام حفیظ صاحب مجید صاحب کے ہاں آئے۔ میں بھی اتفاق سے موجود تھا اور دوسرے کچھ ایسے احباب بھی جن کو حفیظ صاحب جانتے تھے۔ حفیظ صاحب موڈ میں آ گئے انھوں نے اپنے گیت سنانے شروع کر دیے اور "بس درشن درشن میرا" سناتے ہوئے رنگ باندھ دیا۔ بہرحال حفیظ صاحب کے باقی پرانے دوست تو صرف ان سے الگ ہی ہوئے تھے مگر صوفی صاحب کی تو باقاعدہ ان سے لڑائی تھی۔

بات یہ ہے کہ صوفی صاحب دوستی میں تو ریشم کی طرح نرم رہتے تھے لیکن اگر کسی دوست سے بگڑ جاتے تو پھر فقرہ بازی' پھبتی اور طعن و تشنیع میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ آخری زمانے میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب' تاثیر صاحب کے بچپن کے دوست تھے' انھی کی وساطت سے صوفی صاحب سے ملے۔ پھر وہ جب گورنمنٹ کالج کے اسٹاف ممبر ہو کے آئے تو وہ صوفی صاحب کے اور قریب آ گئے۔ یہاں سے جھنگ کے کالج میں پرنسپل ہو کر چلے گئے مگر جب لاہور آتے تو صوفی صاحب ہی کے ہاں ٹھہرتے۔ پھر جب صوفی صاحب ان سے خفا ہوئے تو ایسے ہوئے کہ کچھ نہ پوچھئے' ان کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

میں نے صوفی صاحب کی گاہ بہ گاہ کی تلخ کلامی کا ذکر تو کر دیا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ یہ ان کی طبیعت کا ایک عارضی پہلو تھا۔ پل بھر غصہ کرنے کے بعد وہ وہی ہو جاتے تھے۔ نوکروں کو بھی ڈانٹتے ڈپٹتے تھے مگر ان کا خیال بھی بہت کرتے تھے' اور اکثر تو وہ خوش باش اور ہنستے کھیلتے ہی نظر آتے تھے۔ بتایا کرتے تھے کہ میرے استاد نے میرا تخلص اس لیے تجویز کیا تھا کہ میرے چہرے پر عموماً تبسم رہتا تھا۔

میں ابھی ابھی نیازمندان لاہور کا تذکرہ کر رہا تھا اور یہ کہنے والا تھا کہ ان کے ہاں دو شاعروں یعنی حفیظ جالندھری اور تاثیر کا چرچا تھا' بہ طور شاعر صوفی صاحب کی آواز ان دونوں کی آواز میں دب کر رہ گئی تھی۔ حفیظ جالندھری کا معاملہ یہ تھا کہ ایک طرف تو ان کا شاہنامہ اسلام دلوں کو گرماتا تھا اور دوسری طرف ان کے سادہ و پرکار گیت حفیظ کی آواز اور لے کاری میں ایک نئی قسم کا جادو جگاتے تھے۔ تاثیر

صاحب اس زمانے کے نئے اور ترقی پسند شاعر تھے کہ جن کی شاعری کو مغربی شعروادب کے اثرات نے ایک نئی جلا دے دی تھی۔ صوفی صاحب شاعر تو تھے اور نیازمندان لاہور کے حلقۂ احباب میں شامل بھی مگر ان کی سیدھی سادی شاعری میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ لہٰذا اس کا کوئی خاص چرچا نہ ہوا۔ وہ مشاعروں میں حصہ لیتے تھے اور ان کے شاگرد ان کی قدردانی بھی کرتے تھے مگر بہ طور شاعر صوفی صاحب کی شہرت اس زمانے سے شروع ہوئی جب نورجہاں' اقبال بانو' فریدہ خانم اور ناہید اختر' صوفی صاحب کی غزلیں اور نغمے ریڈیو اور ٹی وی پر گانے لگیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران تو صوفی صاحب کے قومی نغمے ہر گھر میں گونجنے لگے اور ان کو وہ شہرت نصیب ہوئی کہ جس کی مثال نہیں۔ نورجہاں کے گائے ہوئے صوفی صاحب کے پنجابی نغموں نے لوگوں کے دل لوٹ لیے۔ ان میں ایک نغمہ "اے پتر ہٹاں تے نہیں وکدے' توں لب دی پھریں بزار کڑے" (یہ سپوت یعنی پاکستانی فوج کے جوان دکانوں پر نہیں بکتے' بی بی تم ناحق ان کو بازاروں میں ڈھونڈتی پھرتی ہو) تو واقعی سچی شاعری کا نمونہ ہے۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ صوفی صاحب کی عام شاعری میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی مگر جب انھوں نے بچوں کی شاعری شروع کی تو اس نے صرف بچوں ہی کو نہال نہیں کیا بڑوں کو بھی چونکا دیا۔ اس لیے کہ بڑوں کو صوفی صاحب کی بزرگی اور عالمانہ حیثیت سے یہ توقع نہیں تھی کہ ان کے اندر کا بچہ ابھی تک زندہ ہے اور یہ کہ وہ اس کی زبان میں اس کے لیے شعر بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہ طور شخص صوفی صاحب کو بچوں سے خاص انس تھا' وہ ان کی آوازوں کو پرندوں کو چہکاریں کہا کرتے تھے۔ اپنے مجموعوں "جھولنے" "ٹوٹ بٹوٹ" اور "تول متول" میں انھوں نے انھی چہکاروں کو نظم کر دیا ہے۔ صوفی صاحب کا کام انھی کی بدولت بچوں کی دنیا میں آج بھی مشہور و مقبول ہے۔ آج بھی اسکولوں کے جلسوں میں بچے ان کی نظموں کو لہک لہک کر گاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

صوفی صاحب نے شاعری کی ابتدا فارسی سے کی تھی۔ امرتسر کے ایک بزرگ فارسی شاعر فیروزالدین طغرائی ان کے استاد تھے۔ صوفی صاحب ان کا نام ہمیشہ بڑی عزت و تکریم سے لیتے تھے۔ اردو شاعری انھوں نے لاہور آنے کے بعد شروع کی۔ انھیں اردو سے زیادہ اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اور اپنی فارسی شاعری پر بھی۔ انھیں یہ دعویٰ بھی تھا کہ پنجابی میں سب سے پہلے انھوں نے غزل لکھی تھی۔ ویسے اردو زبان و محاورہ میں انھیں بڑی دسترس حاصل تھی۔ فیض صاحب بھی ان سے مشورہ کیا کرتے تھے' اور ان سے ہمیشہ شاگردوں ہی کی طرح ملتے تھے۔ صوفی صاحب' اقبال کے حلقے میں بیٹھنے والے تھے اور بتاتے تھے کہ کبھی کبھی اقبال بھی ان کو بعض لفظوں اور محاوروں کی تحقیق اور بعض حوالوں کی تلاش کا کام سپرد کر دیا کرتے تھے کیوں کہ اقبال کو صحت زبان و بیان کا ہمیشہ بہت خیال رہتا تھا۔

صوفی صاحب کالج میں غالب کا اردو کلام تو درسی طور پر پڑھاتے تھے مگر انھیں غالب کے فارسی کلام سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ چناں چہ انھوں نے دو جلدوں میں غالب کی فارسی غزلیات کی شرح لکھی ہے۔ یہ کام صوفی صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں کیا۔ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ خانہ فرہنگ ایران

کے ڈائریکٹر ہو گئے پھر ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ کے طور پر مختلف قسم کے پروگراموں کی ترتیب و تحریر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یحییٰ خان کے مارشل لا کے دوران انھیں اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا۔ پنشن کے علاوہ ریڈیو کا مشاہرہ ہی صوفی صاحب کی باقاعدہ آمدنی کا واحد ذریعہ تھا۔ عین اس موقع پر ان کے ایک پرانے شاگرد رشید احمد کام آئے۔ پروفیسر قاضی محمد اسلم کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ رشید احمد ان کے بڑے بھائی اور اپنے زمانے میں لاہور کے مشہور آنکھوں کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر بشیر احمد کے بیٹے تھے جو ملک کے بڑے صنعت کار سہگل خاندان کے کسی ادارے سے بہ طور مشیر وابستہ تھے۔ وہ رہتے تو کراچی میں تھے مگر جب لاہور آتے تو صوفی صاحب سے ضرور ملتے' بلکہ ان کی خاطر تواضع کا سامان لے کر شام کو ان کے ہاں پہنچتے۔ میری بھی ان سے یاد اللہ تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب صوفی صاحب کو ریڈیو سے فارغ کیا گیا تو اس کے دو چار دن بعد ہی رشید احمد لاہور وارد ہوئے۔ انھوں نے مجھے فون کیا تو میں نے انھیں بتا دیا کہ اس دوران میں صوفی صاحب پر یہ گزری ہے اور وہ کچھ فکر مند ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں شام کو وہاں پہنچ رہا ہوں۔ تم بھی آجاؤ۔ صوفی صاحب کے ہاں ہم جمع ہوئے تو دوران گفتگو رشید احمد نے میرے حوالے سے ریڈیو سے صوفی صاحب کے سبکدوش ہونے کا ذکر کیا اور اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا۔ صوفی صاحب اگر ہمارے ادارے کی طرف سے ریڈیو کے مشاہرے کی رقم آپ کو پیش کر دی جائے تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا؟ آپ اپنی پسند کے مطابق تصنیف و تالیف کا کوئی کام کریں۔ مسودے کی تکمیل پر ہم اسے شایع بھی کر دیں گے۔ میں نے لقمہ دیا کہ صوفی صاحب وہ جو آپ نے غالب کی فارسی غزلیات کی تشریح کا ارادہ کیا تھا وہ مکمل کر دیں۔ رشید احمد نے کہا یہ تو بہت ہی اچھا خیال ہے۔ ایک سال کے بندوبست کا تو ابھی وعدہ کرتا ہوں اگر کام ختم نہ ہوا تو ایک سال اور سہی۔ صوفی صاحب اس پیشکش پر مطمئن ہو گئے اور دوسرے دن سے انھوں کام شروع کر دیا۔ ایک سال گزر گیا مگر مسودہ مکمل نہ ہوا۔ رشید احمد نے مزید ایک سال کے لیے وہی بندوبست جاری کرا دیا۔ اس کے بعد خود ان کا تعلق سہگل خاندان سے ٹوٹ گیا اور وہ تلاش روزگار میں یورپ چلے گئے۔ صوفی صاحب کا مسودہ خوب صورت کاغذ پر ان کے خوب صورت خط میں لکھا ہوا تیار تھا مگر سہگل خاندان اب اس کی اشاعت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے اتفاقاً اس مسودے کا صوفی صاحب کے ایک اور شاگرد سید بابر علی سے ذکر کیا۔ انھوں نے اسے اپنے ادارے پیکیجز کے اشاعتی پروگرام میں شامل کر لیا اور یوں صوفی صاحب کی شرح غزلیات غالب (فارسی) دو جلدوں میں ان کی وفات کے کوئی تین سال بعد ۱۹۸۱ء میں شایع ہوئی۔

صوفی صاحب استاد تھے اور ساری عمر استاد ہی رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے ایران کلچرل سنٹر کی سربراہی کی اور ریڈیو ٹی وی کے لیے کام بھی کیا مگر ان کا مرتبہ بہ طور استاد ہی ان کی اصل پہچان تھا۔ ان کے اکثر شاگرد آخر وقت تک ان سے استفادہ کرتے رہے۔ میں خود اس سلسلے میں انھیں کراچی اور اسلام آباد سے بھی فون کیا کرتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران نیاز مندان لاہور کے اکثر احباب مختلف

قسم کی اعلیٰ ملازمتوں پر لاہور سے باہر چلے گئے تھے مگر صوفی صاحب نے نہ تو اپنا درس و تدریس کا پیشہ چھوڑا اور نہ لاہور میں اپنا گھر۔ دراصل صوفی صاحب پرانی وضع کے گرہستی آدمی تھے۔ انھیں اپنا جما ہوا گھر' اپنے اہل و عیال' اپنے دوست احباب اور اپنی روزانہ زندگی کے معمولات عزیز تھے۔ وہ ان سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ان کو سیر و سیاحت کا بھی شوق نہیں تھا۔ ان کو سفر سے وحشت ہوتی تھی۔ ویسے تو وہ ایران بھی گئے اور اپنے بیٹے سے ملنے امریکا بھی مگر ہر مرتبہ ہوائی جہاز سے' سفر سے نالاں اور بیزار واپس آئے۔ ملک میں تو عموماً" ریل سے سفر کرتے تھے۔ میرے ساتھ البتہ دو تین بار لاہور سے بہ ذریعہ کار پنڈی آئے اور پھر میرے ساتھ ہی واپس گئے۔ میرے قیام کے دوران ایک دفعہ کوئٹہ اور دو دفعہ کراچی بھی آئے۔ ایک دفعہ تو ذوالفقار علی بخاری صاحب کے ہاں ٹھہرے کہ وہ جب لاہور آتے تو عموماً" صوفی صاحب ہی کے ہاں' ان کے نیو ہاسٹل والے فلیٹ پر قیام کرتے۔ صبح سویرے صوفی صاحب حسب معمول بخاری صاحب کے گھر کے سامنے پبلک پارک میں سیر کو نکلے اور سخت جز بز ہو کر لوٹے۔ کہنے لگے چھ فٹ لمبے اور چار فٹ چوڑے قطعہ زمین پر گھاس اگی ہوئی ہے اور اس پر تختی لگا رکھی ہے "گھاس پر چلنا منع ہے۔" صوفی صاحب کو لاہور میں سیر کے دوران کسی نہ کسی باغ میں ننگے پاؤں شبنمی گھاس پر چلنے کی عادت تھی۔ سرکاری ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد جب انھوں نے سمن آباد میں اپنا گھر بنایا تو وہ بھی ایک پارک کے کنارے پر تھا اور وہاں بھی ان کو یہ سہولت میسر تھی۔ دوسری دفعہ کراچی آئے تو اپنے عزیزوں کے پاس بندر روڈ پر سعید منزل کے قریب ٹھہرے۔ وہاں انھوں نے حسب عادت ایک دعوت بھی کر ڈالی' بخاری صاحب' مجید ملک صاحب' غلام عباس اور مجھے بلا لیا۔ مجید صاحب تو آئے نہیں' ہم سب موجود تھے۔ صوفی صاحب نے کراچی کے موسم کی شکایت کی تو غلام عباس جو کراچی کے بڑے شیدائی تھے کہنے لگے کہ آپ دراصل غلط موسم میں آئے ہیں۔ صوفی صاحب نے جواب دیا میں کراچی میں سال کے بارہ مہینوں میں ہر مہینے آیا ہوں' تم اب کوئی تیرھواں مہینہ بتا دو کہ جب میں آؤں تو موسم ٹھیک ہو۔

مختصر یہ کہ اپنا پیشہ' ادبی اور دوسرے معمولات' اپنا کنبہ' اپنے دوست احباب کی صحبت اور مہمان نوازی یہی صوفی صاحب کی زندگی تھی اور اس زندگی کا مرکز ان کا گھر تھا۔ اس مرکز سے جدا ہو کر وہ کچھ اکھڑے جاتے تھے اور بدمزہ رہتے تھے۔ ان کا گھر ان کا قلعہ تھا جس میں وہ بے گانوں سے بھی اپنوں کا سا سلوک کرتے تھے' ان کے روز و شب اسی محور کے گرد گھومتے تھے۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر آفتاب احمد

پروفیسر سراج الدین

پروفیسر اے ایس (پطرس) بخاری کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے جس استاد کا بول بالا ہوا وہ پروفیسر سراج الدین تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج ہی کے پڑھے ہوئے تھے اور بخاری صاحب کے شاگرد بھی رہے تھے مگر وہ ان کے چہیتے شاگردوں میں سے نہیں تھے۔ اس کی ایک وجہ تو دونوں کے مزاج کا اختلاف تھا اور دوسری وجہ شاید یہ ہو کہ سراج صاحب سراسر انگریزی کے آدمی تھے' بخاری صاحب عموماً" اپنے ان طالب علموں کو عزیز جانتے تھے جو یا تو انگریزی کے ساتھ اردو پڑھنے لکھنے میں بھی دلچسپی رکھتے ہوں یا پھر کالج میں ڈرامیٹک کلب کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوں' کیوں کہ ڈراما اور تھیٹر بخاری صاحب کا دوسرا بڑا شوق تھا۔

سراج صاحب نے انگریزی ایم اے میں فرسٹ کلاس کے ساتھ یونی ورسٹی میں اول آنے کا اعزاز بھی حاصل کیا تھا۔ بعد ازاں وہ آکسفورڈ گئے اور وہاں سے انگریزی میں بی لٹ کی ڈگری لے کے آئے۔ واپسی پر گورنمنٹ کالج ہی میں لیکچرار ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء' ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ جب بخاری صاحب آل انڈیا ریڈیو میں ایک اعلیٰ منصب پر تعینات ہو کر دہلی چلے گئے تو سراج صاحب کو لیکچرار ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ بخاری صاحب کے جانے کے بعد ان کو شعبہ انگریزی میں پروفیسر بنا دیا گیا۔ سراج صاحب میں نہ تو بخاری صاحب کی سی ذاتی وجاہت تھی اور نہ شخصیت کی وہ چکا چوند اور نہ تقریر کی وہ لذت کہ جس نے بخاری صاحب کو جیتے جی ایک داستان بنا دیا تھا مگر ان میں ایک انفرادی کشش ایسی ضرور تھی جس کی وجہ سے انھوں نے انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج کے اساتذہ میں ایک منفرد مقام حاصل کر لیا تھا۔ بخاری صاحب کے شاگردوں کی طرح سراج صاحب کے شاگرد بھی اپنی باتوں میں اکثر ان کا تذکرہ کرتے تھے جس کی بدولت ان کا شہرہ بھی لاہور کے دوسرے کالجوں کے طلبہ کے حلقوں تک پھیلا ہوا تھا۔

سراج صاحب سے میرے تعلق کی ابتدا اکتوبر ۱۹۴۴ء سے ہوئی کہ جب میں انگریزی ایم اے کے طالب علم کی حیثیت سے ان کا شاگرد ہوا۔ اس وقت صدر شعبہ تو پروفیسر ارک ڈکنسن تھے' وہ بھی آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے لیکن انگریز صدر شعبہ کے ہوتے ہوئے بھی انگریزی کے شعبے میں سراج صاحب ہی کا طوطی بولتا تھا۔ ڈکنسن صاحب نے مدت سے پڑھنے لکھنے کا شغل چھوڑ رکھا تھا۔ ان سے کبھی

کسی تازہ کتاب کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ بے دریغ فرماتے۔ "Ask Prof. Sirajuddin" ان سے اس سے زیادہ کسی قسم کا استفادہ کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ البتہ لباس میں انھوں نے ایک خاص وضع اپنا رکھی تھی۔ سبز رنگ کی گوا ڈرائے کی جیکٹ، ورسٹڈ کی گرے پتلون، چیک ڈیزائن کی قمیص اور اسی قسم کی ٹائی گرمیوں کی تعطیلات کے بعد جو یہ لباس شروع ہوتا تو اگلے سال کی تعطیلات تک یہی چلتا۔ بیچ میں سردی زیادہ ہو جاتی تو گوا ڈرائے کی جیکٹ کی بجائے ٹویڈ کی جیکٹ آ جاتی۔ خاص تقریبات میں کبھی کبھار سوٹ بھی پہنتے تھے۔ چمڑے کا ایک پرانا بیگ ہاتھ میں لیے کالج کی گذرگاہوں پر سبج سبج چلتے نظر آتے، البتہ شام کو جب اپنی بیگم کے ساتھ مال روڈ پر سیر کو نکلتے تو ہاتھ میں چھڑی لیے ہوتے۔ سراج صاحب نے طالب علمی کے زمانے ہی میں لاہور کی ایک ہونہار مصورہ سے عشق کیا۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد ان سے شادی کی اور جب آکسفورڈ گئے تو انھیں بھی ساتھ لے گئے اور وہیں ایک بیٹے کے باپ بھی بن گئے۔ رضیہ سراج الدین واقعی بڑی ہنرمند، شائستہ اور دھیمے مزاج کی خاتون تھیں۔ ہمیشہ ساڑھی پہنتی تھیں۔ بالوں میں پھول لگاتی تھیں اور بناؤ سنگھار میں ایک خاص وضع کی پابند تھیں۔ وہ عموماً تقریبات کے موقع پر سراج صاحب کے ساتھ دیکھی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر شام کو وہ بھی سراج صاحب کے ساتھ سیر کو نکلتی تھیں جس کے دوران سراج صاحب تو اپنی چھڑی گھماتے اور مستقل بولتے ہوئے سنائی دیتے تھے اور وہ خاموشی سے یا ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سنتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اس زمانے میں خواتین مصوروں میں تو بس وہی ایک تھیں جن کا نام مشہور تھا۔ انھوں نے کبھی اپنی تصویروں کی نمائش بھی شاید کی ہو، البتہ گھر کے ہر کمرے میں ان کی تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک آرٹسٹ بیوی کے شوہر ہونے کی حیثیت سے بھی سراج صاحب کی معروف شخصیت کی کشش میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ میاں بیوی کے علاوہ گھر میں ایک بچے کی رونق بھی تھی۔ مختصر یہ کہ سراج صاحب کی گھریلو زندگی بہ ظاہر بہت دل آویز اور پرسکون انداز میں ایک خاص ڈگر پر چلتی نظر آتی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد دو گھنٹے آرام کے لیے وقف تھے، جس کے دوران خلل اندازی کی اجازت نہیں تھی چناں چہ اس مضمون کا ایک نوٹس بھی گھر کے باہر والے برآمدے میں لگا رہتا تھا۔

کلاس روم میں سراج صاحب کی انفرادیت کا رنگ دوسرا تھا۔ ایک تو ان کے لیکچر کا انداز اور دوسرے انگریزی کا لب و لہجہ جو خاص انھی کا تھا۔ وہ ہر ہر لفظ کو بڑے واضح طور پر ادا کرتے ہوئے ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولتے اور جملے کے آخری لفظ کی آواز کو معمول سے زیادہ ابھار دیتے۔ ان کے ہاتھوں کی جنبش، ان کی زبان کا ساتھ دیتی تھی اور آنکھوں میں شرارت کی لہر، ان کے کاٹ دار جملوں کا۔ یہ سب چیزیں مل جل کر ان کے لیکچروں میں ایک کشش پیدا کر دیتی تھیں اور ان میں وہ سپاٹ اور خواب آور لمحے کبھی نہیں آتے تھے جو بعض دوسرے اساتذہ کے لیکچروں کا خاصہ تھے۔ پھر ان کے لفظوں کا انتخاب کہ جس میں قطعیت کے ساتھ ساتھ ایک ساختہ بے ساختہ پن بھی تھا۔ سراج صاحب بہت اچھے استاد تھے، اس لیے کہ وہ موضوع کی حدود میں بھی رہتے تھے اور ان کو پھلانگ بھی جاتے تھے۔ وہ اشارات (notes) بھی

لکھواتے تھے اور ان سے ہٹ کر موضوع کے ارد گرد گھومتے ہوئے بہت کچھ اور بھی کہہ جاتے تھے اور دراصل اسی میں ان کی تدریس کے جوہر کھلتے تھے۔ میں جب اپنے ملک اور بیرون ملک کی ان تمام درس گاہوں کے اساتذہ کو یاد کرتا ہوں کہ جن سے میں نے استفادہ کیا ہے تو مجھے سراج صاحب کا کوئی بدل نظر نہیں آتا۔ یہ واقعہ ہے کہ انگریزی ادب میں سراج صاحب کے لیکچروں نے میرے لیے فکر و خیال کے نئے دریچے کھول دیے تھے۔

سراج صاحب کے جن لیکچروں کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ دراصل سترہویں صدی کے منفرد انگریزی نثر نگار سر ٹامس براؤن کی کتاب "Religio Medici" کے بارے میں تھے جو ہمارے کورس میں شامل تھی۔ ٹامس براؤن پیشے اور تربیت کے لحاظ سے تو طبیب تھا مگر مزاج کے اعتبار سے فلسفی اور صوفی۔ اس کا زمانہ سائنس اور مذہب کی نظریاتی جنگ کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ اس لیے کہ سائنس کی نئی دریافتوں نے روایتی مذہبی عقاید کو متزلزل کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں ٹامس براؤن پر جو ذہنی ابتلا کا زمانہ گزرا تھا، مذکورہ کتاب اس کی داستان ہے۔ سراج صاحب اس پر بحث کرتے ہوئے سائنس کے طریق کار یعنی مشاہدہ اور تجربہ اور اس سے بڑھ کر عقلی اور منطقی استدلال کے ناکافی ہونے پر زور دیتے تھے۔ اس ضمن میں وہ انیس ویں صدی کی سائنس کے عقل کل ہونے کے دعوے اور اس کے قطعیت پسند رویے پر تنقید کرتے ہوئے یہ بتاتے تھے کہ بیس ویں صدی میں سائنس نے خود اپنا یہ رویہ ترک کر دیا ہے اور اب وہ حیات و کائنات کے بارے میں پہلے سے یقین و ثبات کے ساتھ اپنے نظریات کا اظہار نہیں کرتی۔

ٹامس براؤن کو تو انگریزی نثر کے کورس میں اپنے اسلوب نگارش کی وجہ سے شامل کیا گیا تھا مگر سراج صاحب کے درس میں صرف انگریزی نثر ہی نہیں جدید انگریزی تنقید بھی شامل تھی۔ اس زمانے میں کیمبرج کے مشہور نقاد ڈاکٹر آئی اے رچرڈز اور ان کی دو کتابوں The Principles of Literary Criticism (ادبی تنقید کے اصول) اور Practical Criticism (عملی تنقید) کا بڑا چرچا تھا۔ لہٰذا جب سراج صاحب نے رچرڈز پر اپنے لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا تو اسی نقطہ نظر کا اعادہ ہونے لگا جس کی وضاحت کا آغاز سراج صاحب نے ٹامس براؤن پر اپنے لیکچروں میں کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ رچرڈز نے ادبی تنقید کے میدان میں بھی سائنسی طریقہ کار کے مطابق اصول و ضوابط وضع کرنے کی کوشش کی تھی۔ سراج صاحب اس کوشش کو سراسر بے کار تو قرار نہیں دیتے تھے مگر اس کے نتائج کے بارے میں کچھ زیادہ اطمینان کا اظہار بھی نہیں کرتے تھے۔ انھیں رچرڈز کی Cock Sureness یعنی اپنی رائے پر کامل یقین کا رویہ پسند نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس قسم کا رویہ ادبی معاملات میں روا نہیں۔ مجھے سراج صاحب کی اس تنقید نے اس حد تک متاثر کیا کہ میں کبھی رچرڈز کا بہت زیادہ قائل نہ ہو سکا۔ مختصر یہ کہ اپنی تعلیمی زندگی کے زمانے کی یادوں کے سلسلے میں سراج صاحب کے لیکچر اگر پچاس برس گزرنے کے بعد آج بھی مجھے یاد آتے ہیں تو میرا یہ کہنا کچھ غلط نہیں کہ انھوں نے میرے لیے فکر و خیال کے نئے دریچے کھول دیے تھے۔

میں کلاس روم میں سراج صاحب کے لیکچر بڑے شوق و انہماک سے سنتا تھا۔ کلاس سے باہر بھی ان سے بات کرنے کے موقعے نکلتے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ ان کے گھر پر بھی آنے جانے لگا۔ ان سب باتوں سے ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک شاگرد کی حیثیت سے میں ان کا بڑا گرویدہ ہوں۔ چناں چہ وہ بھی بہ طور استاد مجھ سے شفقت برتنے لگے۔ پڑھنے لکھنے میں میرے شوق و انہماک کو دیکھتے ہوئے خواہ مخواہ انھیں یہ خیال ہونے لگا کہ میں ایم اے فائنل کے امتحان میں شاید فرسٹ کلاس لے جاؤں۔ جدید انگریزی تنقید پر میرا مضمون دیکھنے کے بعد جو میں نے انھی کی سیمینار کلاس کے لیے لکھا تھا' انھوں نے محتاط لفظوں میں اس خیال کا اظہار بھی کر دیا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ہر میدان میں ہندو مسلمان کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ ایم اے انگریزی میں کسی مسلمان کو فرسٹ کلاس لیے زمانہ ہو چکا تھا۔ سراج صاحب کو اس کی بڑی فکر تھی' انھوں نے اسے قومی انا کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ انھوں نے ہمارے ساتھ (ڈاکٹر) عبدالسلام کو ایم اے انگریزی میں داخلہ لینے کی بہت ترغیب دلائی تھی کہ وہ تو یقیناً یہ امتیاز حاصل کر لیں گے مگر وہ نہ مانے' انھوں نے ایم اے ریاضی میں داخلہ لیا۔ ان کی قسمت میں تو نوبل پرائز لکھا تھا' انگریزی میں وہ فرسٹ کلاس فرسٹ کا تمغا تو لے جاتے مگر اس کے بعد کیا ملتا؟ بہرحال سراج صاحب نے مجھ سے یہ امید ناحق لگائی۔ میں اس قبیل کا مرد میدان تھا ہی نہیں۔ اس سال یعنی ۱۹۴۶ء میں وائس چانسلر کے خلاف طلبہ کی ہڑتال کی وجہ سے ایم اے کے دو امتحان ہوئے۔ ایک وائس چانسلر کے فیصلے کے مطابق مارچ میں اور دوسرا طلبہ کے مطالبے پر جون میں۔ گورنمنٹ کالج بلکہ بیشتر طلبہ نے جون میں امتحان دیا اور اس میں کسی کی بھی فرسٹ کلاس نہیں آئی۔ بہرحال میری پوزیشن کالج اور یونی ورسٹی بھر میں خاصی اونچی رہی۔ اس کا صلہ مجھے گورنمنٹ کالج میں بہ طور لیکچرار میرے تقرر کے وقت بنیادی تنخواہ میں پانچ پیشگی ترقیوں کے اضافے کی صورت میں ملا۔

ہمارے ایم اے کے زمانے ہی میں سراج صاحب کی ذاتی زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کی بہ قول ان کے خود' ان کو توقع نہیں تھی۔ پرنسپل جی ڈی سوندھی کی بڑی بیٹی ارملا ایم اے انگریزی کی طالب علم تھیں اور سراج صاحب کی شاگرد۔ ہم لوگ ایم اے کے پہلے سال میں تھے اور وہ دوسرے سال میں۔ جب ہم دوسرے سال میں پہنچے تو پرنسپل سوندھی ریٹائر ہو گئے اور پروفیسر ڈکنسن پرنسپل بنا دیے گئے۔ اس دوران میں کالج کے بعض حلقوں میں سراج صاحب اور ارملا سوندھی کے تعلقات کے بارے میں کچھ چہ مہ گوئیاں ہونے لگیں جنھیں کم سے کم میں نے سنی ان سنی کر دیا۔ انھی دنوں ایک دن سراج صاحب کلاس میں پڑھا رہے تھے کہ ان کے گھر کا ملازم آیا اور ان کے لیے ایک رقعہ لایا۔ سراج صاحب نے رقعہ پڑھتے ہی بیگ سنبھالا اور کلاس سے معذرت کر کے رخصت ہو گئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ سراج صاحب نے لیکچر کے دوران اس طرح کلاس چھوڑی ہو۔ دوسرے دن کلاس میں آئے تو ان کے چہرے پر ایک ہلکا سا زخم تھا' جس پر کسی دوا کا نشان بھی تھا۔ ہم لوگوں نے اسے دیکھا اور یہ سمجھا کہ شاید کوئی چوٹ لگی ہوگی۔ راز اس کا دو چار دن بعد کھلا' وہ یوں کہ میرے ایک ہندو ہم جماعت اور دوست مہاراج کرشن

راجن اور میں یونی ورسٹی لائبریری سے کالج کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں اتفاقاً سراج صاحب اپنی کوٹھی کے گیٹ پر مل گئے۔ ان سے علیک سلیک اور کچھ معمولی بات چیت ہوئی اور وہ باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں کو اپنے ساتھ کوٹھی کے اندر بلکہ اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہاں ہمیں بیٹھنے کو کہا اور خود بھی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے بڑی سنجیدگی سے یہ کہنا شروع کیا کہ شاید تم لوگوں نے ارملا سوندھی اور میرے بارے میں کچھ باتیں سنی ہوں گی۔ تم میرے شاگرد ہو' میں تم لوگوں کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یہ کوئی Mid-Summer Madness (موسم بہار کا دیوانہ پن) نہیں ہے۔ ہم دونوں میں کچھ عرصے سے قرب و محبت کا ایک بڑا سچا جذبہ پرورش پا تا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شروع تو شاگرد اور استاد کے قدرتی لگاؤ سے ہوا تھا اور جب میں نے اس کی شدت اور گہرائی محسوس کی تو میں نے اپنی بیوی رضیہ کو اعتماد میں لیا کیوں کہ میں اس سے درپردہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہتا تھا جس سے اسے تکلیف پہنچے۔ وہ میری زندگی کی ساتھی رہی ہے اور میرے بچے کی ماں ہے۔ وہ شائستہ' مہذب اور سمجھ دار خاتون ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں کوئی آوارہ مزاج آدمی نہیں ہوں' مجھے اس کا احترام ہے اور اسے میرا۔ بہرحال اس نے مجھے خود ہی شادی کی اجازت دے دی ہے مگر ابھی شادی نہیں ہوئی۔ مسٹر سوندھی کو جب ان کی بیٹی نے اس معاملے سے آگاہ کیا تو انھوں نے بہت تاؤ کھایا اور اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ غریب کہاں جاتی' لہٰذا وہ میری بیوی کی مہمان کی حیثیت سے ہمارے ہاں آگئی' اس پر مسٹر سوندھی اور بھی خفا ہوئے۔ چناں چہ وہ رقعہ جو مجھے کچھ دن ہوئے کلاس میں پہنچایا گیا تھا اور میں کلاس چھوڑ کے آگیا تھا' وہ میری بیوی کی طرف سے تھا۔ مسٹر سوندھی نے ہمارے گھر پر دھاوا بول دیا تھا۔ میں یہاں پہنچا تو انھوں نے غصے میں مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ وہ میرے چہرے پر جو زخم تھا وہ انھی کی عنایت تھی۔ میں نے یہ سب کچھ برداشت کیا اس لیے کہ میں ان کی پوزیشن سمجھتا ہوں۔ میں تم لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ یہ ایک آبرومندانہ معاملہ ہے' انسان کی زندگی میں جذبات کا بھی ایک مقام ہے۔ بہت سی ان ہونی چیزیں ہو جاتی ہیں جو کچھ ہوا مجھے خود اس کی توقع نہیں تھی وغیرہ وغیرہ۔

سراج صاحب نے یہ سب باتیں اپنے خاص انداز میں بڑے جذبے اور خلوص کے ساتھ کوئی آدھ پون گھنٹے میں کہیں' میں نے تو محض ان کا ملخص پیش کردیا ہے۔ بہرحال ہم دونوں یہ سوچتے ہوئے رخصت ہوئے کہ جس بات کو ہم نے محض افواہ سمجھا تھا' وہ درست نکلی اور دوسرے یہ کہ سراج صاحب نے اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے ہم دونوں کو کیوں منتخب کیا؟

اپنے بارے میں تو مجھے معلوم تھا کہ سراج صاحب مجھے اپنا طرف دار سمجھتے تھے' راجن پر اعتماد کرنے کی وجہ میری سمجھ میں یہ آئی کہ وہ امرتسر کے ایک کالج سے بی اے کرکے آئے تھے' جہاں وہ سراج صاحب کے ایک آکسفورڈ کے ساتھی پروفیسر کے شاگرد رہے تھے اور انھی کے کہنے پر انگریزی ایم اے کرنے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور آئے تھے۔ ویسے بھی وہ اکثر سراج صاحب سے ملتے رہتے تھے۔ راجن کے متعلق یہاں یہ بتاتا چلوں کہ راجن ان کا تخلص تھا' وہ ہندی میں شعر کہتے تھے۔ تقسیم کے بعد

ہندوستان کی فارن سروس میں اپنے پورے نام مہاراج کرشن رسگوترا کے نام سے آئے اور فارن سکریٹری کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ میری ان سے بہت دوستی تھی' اب بھی جب بھی اور جہاں کہیں ممکن ہو ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ راجن پر سراج صاحب کے اعتماد کے سلسلے میں میرا دھیان تو کہیں تک گیا مگر دوسرے تیسرے دن جب میں سراج صاحب سے اکیلے میں ملا تو میں نے ان سے اس بارے میں پوچھ ہی لیا۔ کہنے لگے کہ یہ اتفاق کی بات تھی کہ تم دونوں مجھے اکٹھے مل گئے اور میں نے سوچا کہ یہ موقع اچھا ہے۔ میں نے اس لیے اس کے سامنے بات کی کہ وہ بھی میرا شاگرد ہے۔ میرا احترام کرتا ہے۔ وہ ہندو طلبہ تک اصل حقیقت پہنچائے گا' جن میں میرے خلاف سخت پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے۔

سراج صاحب کا یہ کہنا درست تھا۔ اس زمانے میں ہندو مسلم کشمکش زوروں پر تھی۔ ارملا اگرچہ عیسائی ماں کی بیٹی تھی مگر مسٹر سوندھی تو ہندو تھے۔ اس فضا میں سراج صاحب کا رومانس واقعی ایک طوفان کھڑا کر سکتا تھا مگر معاملہ کچھ دبا رہا۔ سراج صاحب مستقل اپنی بیگم رضیہ سراج الدین کے ساتھ مال روڈ پر سیر کو نکلتے' ہاں اب وہ کوٹ کے نیچے پتلون کی بیلٹ کے ساتھ ایک پستول لگائے رہتے تھے۔ ان کے رفعیننگ ہیرو ہونے کے کردار کا ایک پہلو یہ بھی تھا!

ایم اے کا نتیجہ نکلنے کے بعد سراج صاحب نے محکمہ تعلیم سے بات کر کے مجھے لائل پور (اب فیصل آباد) کے گورنمنٹ کالج میں بہ طور لیکچرار بھجوانے کا انتظام کر دیا مگر میں اپنے والد کی علالت کی وجہ سے وہاں نہ جا سکا اور میں نے اسلامیہ کالج لاہور کی پیش کش قبول کر لی۔ میں وہاں لیکچرار تھا اور سراج صاحب سے برابر ملتا رہتا تھا۔ جنوری فروری ۱۹۴۷ء میں لاہور میں بھی ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے حالات خراب ہونے لگے۔ میں گرمیوں کی تعطیلات کشمیر میں گزار کر جب ستمبر میں لاہور واپس آیا تو ملک تقسیم ہو چکا تھا اور ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ سراج صاحب سے ملا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا قومی جذبہ عروج پر ہے۔ اسی زمانے میں ایک دن یونی ورسٹی کے احاطے میں سینٹ ہال کے سامنے پروفیسر ایم جی سنگھ پر جو یونی ورسٹی رجسٹرار تھے' قاتلانہ حملہ ہوا۔ وہ مونے سکھ تھے یعنی نہ داڑھی مونچھ تھی اور نہ سر کے بال۔ وہ پنجاب یونی ورسٹی کی تقسیم کے سلسلے میں ابھی تک لاہور میں رکے ہوئے تھے۔ کسی زمانے میں بخاری صاحب کے ساتھ گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر رہے تھے۔ میں نے ان پر قاتلانہ حملے کا منظر دیکھا تو سراسیمہ ہو کر رہ گیا۔ میرا تو ان سے اتنا ہی رابطہ تھا کہ میری ایک ہم جماعت سیتا بیری ان کے عزیزوں میں سے تھی اور انھی کے ہاں رہتی تھی۔ اس سے ملنے جاتا تو ان سے بھی ہیلو ہیلو ہو جاتی تھی مگر سراج صاحب کے تو وہ استاد رہے تھے۔ چناں چہ جب ان کو شدید زخمی حالت میں ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال لے جایا جارہا تھا تو میں ہانپتا کانپتا سراج صاحب کے ہاں پہنچا اور ان کو اس واردات کا حال سنایا۔ میں سراج صاحب کے رد عمل کے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا مگر انھوں نے بڑے تجسس سے صرف یہ پوچھا کہ مر گیا کہ ابھی زندہ تھا؟ اس میں بلی کی جان ہے! میں یہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ سراج صاحب کے اس رد عمل کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس وقت لاہور کی فضا مشرقی پنجاب

کے لٹے لٹائے اور آتش و خوں کے سیلاب سے گزرے ہوئے مسلمان مہاجرین کی آمد سے سخت غم و غصہ سے بھری ہوئی تھی۔ سراج صاحب خود مشرقی پنجاب یعنی امرتسر کے رہنے والے تھے۔ اس فضا میں ان کے اندر نفرت کا جذبہ انسانی ہمدردی کے جذبے پر غالب آ چکا تھا۔

کوئی دو ہفتے بعد سراج صاحب نے گورنمنٹ کالج میں بہ طور لیکچرار میرے تقرر کی تحریک کی۔ اس سلسلے میں مجھے بلایا اور کہا کہ تمہیں پرنسپل بخاری کے سامنے انٹرویو کے لیے پیش ہونا ہو گا۔ وہ لباس اور ظاہری وضع قطع کا بھی خاص نوٹس لیتے ہیں' لہٰذا تم اپنا بہترین سوٹ پہن کے جانا پھر کچھ اور ہدایات بھی دیں۔ سراج صاحب کو میں نے بتایا کہ میں بخاری صاحب سے مل چکا ہوں اور وہ مجھے تھوڑا بہت جانتے ہیں مگر وہ جاننا ان کے خیال میں ایک اور طرح کا جاننا تھا اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ البتہ یہ انھیں معلوم نہیں تھا کہ بخاری صاحب اپنے دوستوں سے مشورے کے بعد مجھے گورنمنٹ کالج میں لینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جیسا کہ میں نے فیض پر اپنے مضمون میں لکھا ہے' میرے تقرر کے بارے میں تحریک چوں کہ سراج صاحب کی تھی' لہٰذا انھیں بخاری صاحب کو ہر لحاظ سے مطمئن کرنے کی فکر تھی۔ مختصر یہ کہ میں اوائل اکتوبر ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ کالج کے اسٹاف میں شامل ہو گیا۔ بہ طور لیکچرار سراج صاحب کو میری کارکردگی کے بارے میں روزانہ بلاواسطہ رپورٹ ملتی تھی کیوں کہ ان کا بیٹا امداد حسین ایف اے کی کلاس میں میرے سیکشن میں تھا۔

اب جب کہ میں اسٹاف کا ممبر تھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اسٹاف روم کے سراج صاحب' کلاس روم کے سراج صاحب سے بہت مختلف ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا اس زمانے میں لاہور کی فضا ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خلاف غم و غصہ کے جذبات سے بھری ہوئی تھی۔ سراج صاحب اس غم و غصہ کے اظہار میں پیش پیش تھے۔ چناں چہ ان کا وہ رویہ جو میں نے ایم جی سنگھ کے قتل کے فوراً" بعد دیکھا تھا' اسٹاف روم میں تقریباً" ہر روز دیکھنے میں آتا تھا۔ ایک دن آئے اور کہنے لگے کہ قوموں کی زندگی میں شدید نفرت بھی ایک مثبت جذبہ بن سکتی ہے۔ اس سے بھی بڑے بڑے تعمیری کام لیے جا سکتے ہیں۔ سراج صاحب دیر تک تاریخ سے مثالیں دے دے کر اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد کشمیر میں جنگ چھڑ گئی۔ سراج صاحب اسٹاف روم میں داخل ہوئے تو کسی نے یہ کہہ دیا کہ It is a dark day for us' سراج صاحب خفا ہو گئے اور بہت جذبے سے کہنے لگے:

Why a dark day It is a great day for us.

Pakistan's history begins from today.

اور اس کے بعد انھوں نے اس موضوع پر تقریر شروع کر دی۔ یہ سراج صاحب کا وہ نیا رنگ تھا جو میں اب دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ تقسیم سے پہلے کا زمانہ اور تھا اور پھر کلاس روم میں تو ہندو مسلم سیاست پر گفتگو کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ہاں ایک دفعہ ایک ہندو لڑکے نے جناح صاحب پر Beverly Nickols کی کتاب پر اعتراض کیا تو سراج صاحب نے اس کا دفاع ضرور کیا تھا مگر بڑے نپے تلے انداز میں۔ مختصر یہ

کہ سراج صاحب کے ہاں قومی جذبے کا ایسا پرجوش اظہار اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد سراج صاحب کے بیٹے امداد نے ایف اے پاس کیا اور وہ آکسفورڈ چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی والدہ مسز رضیہ سراج الدین بھی۔ اس دوران میں ارملا سوندھی سے سراج صاحب کی شادی کا معاملہ بھی طے ہو گیا تھا۔ ان کا اسلامی نام امراؤ بیگم رکھا گیا تھا۔ اب شام کے وقت سراج صاحب سیر کو نکلتے تھے تو وہ ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ مسز رضیہ سراج الدین ایک دفعہ انگلستان گئیں تو پھر لوٹ کر نہیں آئیں۔ آکسفورڈ میں مستقل ایک ہوٹل میں رہتی تھیں۔ سراج صاحب وہاں بھی ان کی کفالت کرتے رہے اور جب تک ممکن ہوا انگلستان جا کر ان سے ملتے بھی رہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ یہ سب کچھ اپنے احساس فرض کی بنا پر کرتے تھے مگر میرا خیال ہے کہ اس میں کچھ احساسِ جرم بھی شامل تھا۔ اس کا اندازہ ان کے ملنے والوں کو ان کی بعض اقوال و افعال سے ہوتا تھا اور ایک واقعہ سے جس کا تذکرہ انھوں نے خود مجھ سے کیا۔ سراج صاحب کا بیٹا امداد ان کے کہنے کے مطابق میڈیم تھا۔ چناں چہ وہ اس کے ذریعے روحوں کو بلا کر ان سے اپنی زندگی اور دیگر حالات کے بارے میں سوال جواب کیا کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ میں نے جب بھی اپنے والد کی روح سے بات کی' اس نے یہی کہا کہ رضیہ تمھاری بہترین دوست ہے! میرا خیال ہے کہ وہ سمجھتے تو یہی تھے مگر ایک خاص دور زندگی میں اپنے grand passion کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ مسز رضیہ سراج الدین واقعی بڑی نیک دل خاتون تھیں۔ میں ایک دفعہ ۱۹۵۵ء کے دوران ان سے لندن میں ملا۔ وہ مستقل سراج صاحب کے گن گاتی رہیں اور کہتی رہیں کہ وہ بڑے کھلے دل کے آدمی ہیں اور میرا بہت خیال کرتے ہیں۔

سراج صاحب کی ذاتی زندگی میں جو انقلاب آیا تھا' ممکن ہے یہ اس کا نتیجہ ہو مگر اب سراج صاحب وہ پہلے والے سراج صاحب نہیں تھے۔ ایک اور وجہ شاید کالج کی وہ نئی فضا ہو جس سے وہ کچھ ایسے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ وہ انگریزی کے صدر شعبہ تو تھے مگر بخاری صاحب بھی انگریزی ہی کے آدمی تھے اور پرنسپل تھے۔ ان کی موجودگی میں سراج صاحب گویا برگد کے سائے تلے آگئے تھے اور کچھ مرجھائے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ پرنسپل سوندھی اور پرنسپل ڈکنسن کے زمانے میں تو وہ بہت آسودہ رہے تھے مگر بخاری صاحب کے زمانے میں سراج صاحب کی خود اعتمادی کی شان کچھ ماند پڑ گئی تھی۔ چند مہینوں کے بعد خواجہ منظور حسین کا تقرر بہ طور پروفیسر ہو گیا' وہ علی گڑھ یونی ورسٹی سے صدر شعبہ انگریزی کا منصب چھوڑ کے آئے تھے۔ وہ بھی آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے اور جیسا کہ میں نے ان پر اپنے مضمون میں لکھا ہے' ان کو بخاری صاحب کا قرب حاصل تھا۔ شعبے میں ان کا نمبر۲ کی حیثیت سے آنا بھی سراج صاحب کو کچھ پسند نہ آیا۔ مجھے یاد ہے کہ سراج صاحب نے خود مجھ سے کسی قدر تلخی سے کہا۔ بخاری' خواجہ منظور کو میرا مقابل بنا کر لائے ہیں۔ ہندوؤں کے زمانے میں اندر موہن ورما کو لایا گیا تھا۔ وہ غریب میرا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ آخر بخاری کو اپنا زمانہ بھی یاد ہے۔ ان کو ایم جی سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا تھا مگر

خواجہ منظور بھی کیا کرلیں گے۔ گویا سراج صاحب جو بخاری صاحب کی موجودگی ہی سے کچھ ایسے خوش نہیں تھے' اب خواجہ صاحب کی آمد سے اور بھی کبیدہ خاطر ہوئے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ بخاری صاحب نے خواجہ صاحب کو ڈرامینک سوسائٹی کا انچارج بنا دیا جو کالج کی سب سے موقر سوسائٹی سمجھی جاتی تھی۔

اسی دوران میں بخاری صاحب نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب کو کواڈرینگل ہوسٹل سے تبدیل کرکے نیو ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ بنادیا جس کے وارڈن سراج صاحب تھے اور مجھے کواڈرینگل ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ جس کے وارڈن پروفیسر قاضی اسلم صدر شعبہ فلسفہ و نفسیات تھے۔ صوفی صاحب کواڈرینگل کے سپرنٹنڈنٹ تھے تو میرا بہت سا فارغ وقت ان کے ساتھ گزرتا تھا' لہٰذا مجھے ہوسٹل کے جھمیلوں کا اندازہ تھا۔ چناں چہ جب بخاری صاحب نے اپنے دفتر میں بلا کر اچانک صوفی صاحب کی جگہ میرے تقرر کا فیصلہ سنایا تو میں سٹپٹا گیا۔ میں نے کچھ عذر کیا تو بخاری صاحب نے یہ کہہ کر مجھے ڈانٹ دیا کہ تعلیمی زندگی محض ادب پڑھانے کا نام نہیں' تمھیں کچھ انتظامی معاملات کا بھی تجربہ حاصل کرنا چاہیے۔ میں کچھ مایوس ہو کر سراج صاحب کے گھر پہنچا کہ ان سے اپنے شعبے کے صدر کی حیثیت سے مدد چاہوں' شاید وہ مجھے اس اضافی ذمہ داری سونپے جانے سے بچا سکیں۔ میں نے جب سراج صاحب سے بات کی تو کہنے لگے کہ مجھ سے تو بخاری صاحب نے اس بارے میں کوئی مشورہ نہیں کیا' لہٰذا میں دخل نہیں دوں گا۔ یہ معاملہ ان کے اور تمھارے مابین ہے اور پھر کسی قدر طنزیہ لہجے میں یہ کہا کہ اس سے صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمھیں بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ تقرر پرنسپل کا تحفہ ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے فایدے ہیں جن سے وہ تمھیں نوازنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مجھے سراج صاحب کی ان باتوں سے ایک قسم کی مغائرت کی بو آئی' جس سے مجھے کوفت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ شاید سراج صاحب کو بخاری صاحب سے میرا قرب پسند نہیں۔ حالاں کہ اس کی وجہ سراسر اردو شعر و ادب سے میری دلچسپی اور بخاری صاحب کے دوستوں تاثیر صاحب' صوفی صاحب اور فیض صاحب سے میری شناسائی تھی جس کا سراج صاحب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بہرحال میں کواڈرینگل کا سپرنٹنڈنٹ ہوگیا۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ اس وقت سراج صاحب نے جو کچھ بھی سوچا ہو' اس کے بعد شعبے کے ایک رکن کی حیثیت سے مجھ سے ان کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب پاکستان کی فارن سروس کی تشکیل کی کارروائی شروع ہوئی تو مقابلے کے امتحان کے علاوہ وزارتِ خارجہ میں افسروں کی کمی پوری کرنے کے لیے مختلف سرکاری محکموں کے افسروں سے درخواستیں طلب کی گئیں۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے سراج صاحب بھی امیدواروں کی صف میں کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے آکسفورڈ سے واپس آکر گورنمنٹ کالج کے اسٹاف میں شامل ہونے کے بعد سے اس وقت تک کبھی کسی اور ملازمت کی خواہش نہیں کی تھی۔ انھیں مکمل طور پر درس و تدریس ہی سے دلچسپی رہی تھی مگر اب ان کو ایک نئی سمت میں نکل جانے کا شوق ہوا۔ اس سے بھی اپنے موجودہ حالات سے ان کی ناآسودگی کے احساس کا اظہار ہوتا

کیا!

ہے۔ اب وہ اس کالج سے رخصت ہونے کے لیے تیار تھے کہ جس میں انھوں نے بہ طور طالب علم اور بہ طور استاد چھتیس برس گزارے تھے۔ اس زمانے میں سراج صاحب نے مجھے بھی مقابلے کا امتحان دینے کا پرزور مشورہ دیا اور اپنی مثال دیتے ہوئے یہ کہا کہ دیکھو حافظ عبدالمجید کالج میں میرا ساتھی تھا اور مجھ سے بہتر طالب علم نہیں تھا۔ اس نے آئی سی ایس کا امتحان دیا کامیاب ہوا اور آج پنجاب کا چیف سکریٹری ہے اور ساڑھے تین ہزار تنخواہ پاتا ہے۔ میں نے آکسفورڈ سے ڈگری لی پروفیسر ہوا اور آج میری تنخواہ ساڑھے سات سو روپے ہے۔ افسوس یہ ہے کہ بعض انتظامی امور کی بنا پر سراج صاحب کی فارن سروس پر لیے جانے کی خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ آخر تک محکمہ تعلیم ہی سے متعلق رہے۔ پروفیسری کے بعد گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہوئے پھر محکمہ تعلیم کے سربراہ، ریٹائرمنٹ کے بعد پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر اور آخر اسی یونی ورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر۔

یہاں میں اپنی ذاتی زندگی کے ایک ایسے واقعے کا ذکر جو کسی دوسرے مضمون میں بھی آیا ہے، اس معذرت کے ساتھ دہرانا چاہتا ہوں کہ اس کا تعلق سراج صاحب سے بھی ہے۔ میں نے مقابلے کا امتحان دیا اور اپنی پہلی ترجیح کے مطابق فارن سروس کے لیے چن لیا گیا مگر اپنے خاندانی حالات میں تبدیلی کی وجہ سے اس پیش کش کو قبول کرنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ لہٰذا میں نے سروس تبدیل کرنے کی درخواست دی اور آخر حکومت کی طرف سے اکاؤنٹس سروس کی پیش کش مجھے بادلِ نہ خواستہ قبول کرنی پڑی اور میں جنوری ۱۹۵۰ء میں لاہور ہی میں ملٹری اکاؤنٹس کے ایک دفتر میں ٹریننگ کے لیے تعینات ہو گیا۔ مجھے یہ تبدیلی سخت ناگوار گزری۔ فارن سروس چھوڑنے کے قلق کے ساتھ یہ صدمہ بھی میرے لیے کچھ کم نہ تھا کہ میں پروفیسر اے ایس بخاری اور پروفیسر سراج الدین کی ماتحتی سے نکل کر حاجی شجاعت علی صدیقی (اس زمانے کے ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل) کی ماتحتی میں آ گیا تھا۔ میری ذہنی حالت کا ترجمان حافظ کا یہ شعر تھا۔

صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا
ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

بہرحال میں نے شتم پشتم چار سال گزارے تھے کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ چناں چہ میں نے کوئٹہ سے کہ جہاں اس وقت تعینات تھا، سراج صاحب کو جو اب پنجاب میں محکمہ تعلیم کے سربراہ تھے، باقاعدہ درخواست بھیج دی کہ مجھے گورنمنٹ کالج میں واپس لے لیا جائے۔ سراج صاحب نے مجھے تو کوئی جواب نہ دیا مگر میرے دوست امجد حسین کو بلا کر کہا کہ آفتاب کو لکھ دو کہ میں اس کے خط پر کوئی کارروائی نہیں کر رہا۔ وہ بے وقوف نہ بنے اور اپنی سروس ہی میں رہے، کالج میں کیا رکھا ہے۔ سراج صاحب کے جواب سے مایوس ہو کر میں نے اپنی بے زاری کا ایک اور علاج سوچا۔ میں ایک سال کی چھٹی لے کر اپنے طور پر لندن اسکول آف اکنامکس میں ایک کورس کرنے چلا گیا اور لندن پہنچنے کے بعد سراج صاحب کی اطلاع کے لیے انھیں برٹش میوزیم کا ایک پکچر پوسٹ کارڈ بھیج دیا۔

میں نے ابھی سراج صاحب کے فارن سروس میں جانے کی خواہش کا ذکر کیا تھا' اس خواہش کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ پاکستان بننے کے بعد ان جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ان جیسی قابلیت کے گنے چنے لوگوں کے لیے اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے بہت سے مواقع پیدا ہو گئے تھے۔ بخاری صاحب گورنمنٹ کالج ہی سے نکل کر یو این میں پاکستان کے سفیر ہو گئے تھے۔ چناں چہ ان کو اپنی خواہش پوری نہ ہونے سے مایوسی ہوئی۔ اس کی ایک اور وجہ میرے خیال میں یہ بھی تھی کہ اب سراج صاحب کا ہاتھ تنگ ہو گیا تھا اور انھیں روپے پیسے کی فکر ہونے لگی تھی۔ ان کی اپنی کمائی تو ہمیشہ محدود ہی رہی تھی مگر جو کچھ انھوں نے اپنے والد سے کہ جن کی وہ تنہا اولاد تھے' ورثے میں پایا تھا اور جس کے سہارے انھوں نے بڑی خوش حالی کی زندگی بسر کی تھی' وہ اب دھیرے دھیرے ختم ہو رہا تھا۔ عام پروفیسروں کے مقابلے میں وہ خاصے ٹھاٹھ باٹھ سے رہا کرتے تھے۔ کالج کی تعطیلات وہ اکثر اپنے بیوی اور بچے کے ساتھ یورپ میں بسر کرتے تھے۔ جنگ کے دوران جب یہ ممکن نہ رہا تو وہ ملک کے دور دراز تفریحی مقامات یا شملے' کشمیر اور مسوری کی طرف نکل جاتے تھے' پھر انھیں کتابیں خریدنے کا بھی شوق تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری ہزاروں کتابوں پر مشتمل تھی۔ مگر اب ان پر اپنے بیٹے کی آکسفورڈ میں تعلیم اور مسز رضیہ سراج الدین کے وہاں قیام کے مصارف کا بار بھی آ پڑا تھا' لہٰذا اب ان کو مالی مشکلات کا سامنا تھا۔

میں لندن سے واپس آیا تو ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۹ء تک میرا تقرر لاہور میں رہا اور میں سراج صاحب سے گاہے بہ گاہے ملتا رہا مگر ظاہر ہے' اب مجھے ان سے وہ قرب حاصل نہیں تھا۔ اس کے بعد میرا تبادلہ کراچی ہو گیا اور وہاں سے میں ۱۹۶۲ء میں تین سال کے لیے امریکا چلا گیا۔ واپسی پر میں اس زمانے کی فنانس سروسز اکیڈمی میں تعینات ہوا جو اب سول سروسز اکیڈمی بن گئی ہے اور چھاؤنی سے ذرا فاصلے پر واقع ہے۔ سراج صاحب اس سے پہلے ہی چھاؤنی میں اپنے ذاتی مکان میں آ چکے تھے۔ میں ایک شام ان سے ملنے گیا۔ بڑی مدت کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ میرا حال احوال پوچھنے کے بعد امریکا میں میرے ڈاکٹریٹ کے کورس کا اور پھر امریکا کے بارے میں میرے تاثرات کا ذکر چل نکلا۔ میرے وہاں جانے سے پہلے سراج صاحب خود بھی امریکی حکومت کے مہمان کے طور پر امریکا کا چکر کاٹ آئے تھے۔ امریکیوں کے کچھ لطیفے سنانے کے بعد کہنے لگے کہ انھوں نے میرا پروگرام کچھ اس طرح بنایا کہ صبح' شام' دوپہر ہر وقت کوئی نہ کوئی مصروفیت۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ دوپہر کا آرام مجھے بہت عزیز ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کا کیا انتظام کیا جائے۔ چناں چہ میں نے ان سے کہا کہ میری ایک مجبوری ہے۔ میں اپنے مذہب کے ایک ایسے مسلک سے تعلق رکھتا ہوں جس میں دوپہر کے دو گھنٹے مجھے meditation میں صرف کرنے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس وقت کے لیے مجھے فراغت چاہیے۔ امریکی اس رعب میں آ گئے اور انھوں نے ہر جگہ میرا پروگرام اس طرح ترتیب دیا کہ دوپہر کی مشقت سے بچ گیا۔

اسی ملاقات میں مجھے ان کی بعض باتوں سے یہ بھی محسوس ہوا کہ سراج صاحب کچھ اور بدل گئے ہیں۔ ان کی طبیعت میں تلخی اور خشونت ابھر آئی ہے۔ وہ دنیا سے بھی کچھ زیادہ ہی خفا نظر آنے لگے ہیں۔

اس پر مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان کے وہ لیکچر یاد آئے جن میں وہ شیکسپیئر کی مشہور لائن ripeness is all کا مفہوم کس سج دھج سے سمجھایا کرتے تھے اور دنیا کے عظیم ادب پاروں کے حوالے سے acceptance and mellowness یعنی قبولیت اور طبیعت کی نرمی اور گداز کا درس دیا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ سراج صاحب ان سب تصورات کا علم و شعور تو رکھتے ہیں مگر وہ ان کو اپنی طبیعت کا جزو نہیں بنا پائے۔ ادب و شعر کی اعلیٰ' حیات افزا اور صحت مند اقدار ادب کے طالب علم کی شخصیت میں رچ بس جائیں اور زندگی میں 'اس کی طرز و روش میں جھلکتی نظر آئیں' یہ بات مجھے خواجہ منظور حسین میں نظر آئی' جیسا کہ میں نے ان پر اپنے مضمون میں لکھا ہے۔ سراج صاحب میں اس کی کمی دیکھ کر مجھے افسوس ہوا' اس لیے کہ اسی کی وجہ سے انھوں نے اپنے لیے ناخوشی کا اتنا سامان پیدا کر رکھا تھا۔

ان کے ہاں اس شام میں نے آٹھ دس پالتو کتے بھی دیکھے۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ یہ میرا ایک پرانا شوق عود کر آیا ہے۔ چند دنوں بعد میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو اب ان کا معمول بن چکا تھا۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ کار میں اس سڑک کے برابر والی سڑک سے گزر رہا تھا جس پر سراج صاحب کا گھر تھا۔ دور سے میں نے دیکھا کہ سراج صاحب اپنے ملازم کے ساتھ کھڑے ہیں اور ان کے گرد گلی کے کتوں کا مجمع لگا ہوا ہے۔ میں نے کچھ فاصلے پر گاڑی روک لی۔ بیوی کو ساتھ لے کر پیدل ان کے پاس پہنچا اور آداب سلام کے بعد اپنی بیوی کو ان سے ملوایا۔ میں نے دیکھا کہ قریب ہی ایک بڑی سی بالٹی رکھی ہے جس میں گوشت اور روٹیاں بھری ہوئی ہیں۔ سراج صاحب اپنی نگرانی میں وہ خوراک اپنے ملازم سے کتوں میں بٹوانے کے لیے لائے۔ میں نے کسی قدر تعجب سے پوچھا کہ سر' کتوں کی ایک کھیپ تو آپ کے گھر میں بھی موجود ہے۔ سراج صاحب کا جواب بڑا دلچسپ تھا۔ کہنے لگے:

But they have become civilised, decadent. These are street dogs. The genuine specimens, the "Majhas and Sajhas" (ماجھے ساجھے) of the breed.

کتوں سے لگاؤ اور ان کی دیکھ بھال کا منظر تو میں نے خود دیکھا اور انسانوں سے خفا رہنے کے بارے میں مجھے ان کے اس زمانے کے کچھ ملنے والوں نے بتایا۔ سنا ہے کہ ماتحتوں سے بھی اب ان کا سلوک کچھ اچھا نہیں تھا اور برابر والوں سے لاگ ڈانٹ رکھنے لگے تھے۔ اور تو اور ڈاکٹر عبدالسلام جب کچھ عرصے کے لیے گورنمنٹ کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہو کے آئے تو سراج صاحب نے انھیں بھی خاصا تنگ کیا اور خراب رپورٹ دی۔ ڈاکٹر امداد حسین' سراج صاحب کے ہم جماعت اور پرانے دوست تھے۔ انھی کے نام پر انھوں نے اپنے بیٹے کا نام بھی رکھا تھا۔ انھوں نے بھی ایک دفعہ کچھ دبے لفظوں میں سراج صاحب کی بدلی ہوئی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ اب ان سے ملاقات پر وہ بات نہیں رہی پھر خاص طور پر ان کی اس سنک کا ذکر کیا کہ ہر روز رات کو ٹی وی کے خبرنامہ کے وقت کاپی پینسل لے کے بیٹھ جاتے ہیں اور جب موسم کا حال نشر کیا جاتا ہے تو مختلف شہروں کے درجہ حرارت نوٹ کیا کرتے ہیں۔

معلوم نہیں کہ ڈاکٹر امداد حسین نے ان سے اس کی غرض و غایت پوچھی تھی یا نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ سراج صاحب کے پاس اس کی کوئی انوکھی توضیح ضرور ہوگی۔

لاہور سے تبادلے پر میں ڈھاکے چلا گیا اور ایک عرصے تک سراج صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں ڈھاکے سے واپسی پر پھر لاہور آیا اور کچھ عرصہ بعد سراج صاحب کو ٹی وی پر ایک انٹرویو دیتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے خاص طور پر اس کا ذکر کیا کہ میں نے کالج کے زمانے میں فارسی بھی پڑھی تھی مگر میری عمر انگریزی پڑھنے پڑھانے میں گزری ہے اور اسی زبان سے مجھے زیادہ شغف رہا ہے۔ مجھے برسوں پرانی بات یاد آگئی کہ ایک اور صرف ایک موقعے پر سراج صاحب نے اپنی فارسی دانی کا ثبوت دے کر ساری کلاس کو حیران کردیا تھا۔ ہوا یوں کہ انھوں نے شیکسپیئر کی ٹریجڈی میکبتھ پڑھانی شروع کی۔ پہلے ہی سین میں تین چڑیلوں کی یہ یک زبان ادا کی ہوئی لائن آتی ہے :

Fair is foul, foul is fair

سراج صاحب اس کی تشریح کرتے ہوئے یہ بتانے لگے کہ شیکسپیئر نے اس وقت کے حالات کا نقشہ کھینچا ہے کہ کس طرح معاشرے کی تمام مروجہ اقدار الٹ پلٹ ہوگئیں تھیں اور پھر انھوں نے موازنے کے طور پر اچانک حافظ کے یہ شعر سنادیے۔

این چہ شور ایست کہ در دور قمری بینم
ہمہ آفاق پراز فتنہ و شری بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالاں
طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم
دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر
پسراں را ہمہ بد خواہ پدر می بینم
ہیچ رحمے نہ برادر بہ برادر دارد
ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسری بینم

سراج صاحب سے آخری بار میں پروفیسر حمید احمد خاں کی وفات پر ملا۔ گورنمنٹ کالج میں ایم اے انگریزی کے دوران حمید احمد خاں ان کے ہم جماعت رہے تھے۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان کسی ربط ضبط کا مجھے علم نہیں مگر جب حمید احمد خاں پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے سراج صاحب کو کہ اس زمانے میں فارغ تھے' یونی ورسٹی کے شعبہ انگریزی کا صدر مقرر کردیا۔ سراج صاحب ان کی وفات پر بڑی محبت سے ان کا ذکر کرتے رہے اور ان کی خوبیوں کو سراہتے رہے۔ پھر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ مرحوم رشتے میں میرے چچا تھے تو انھوں نے بڑی شفقت سے مجھ سے بھی تعزیت کی۔

سراج صاحب اپنے تضادات' اپنی بوالعجبیوں' اپنی محبتوں اور نفرتوں کے ساتھ ایک منفرد اور کئی لحاظ سے ایک جاذب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی میں شادمانیاں اور کامرانیاں بھی آئیں اور

مایوسیاں اور ناکامیاں بھی، جن کی وجہ سے ان کی طبیعت میں تلخی کا عنصر بھی ابھر آیا اور وہ ایسے دل گرفتہ ہوئے کہ شعر و ادب سے اتنے گہرے ربط و تعلق کے باوجود زندگی کو قبول کرنے کی صلاحیت سے ہم کنار نہ ہو سکے مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ادب کے استاد کی حیثیت سے انھوں نے ہزاروں طالب علموں کے دل و دماغ کو "روشنی اور حلاوت" کے سرچشموں سے روشناس کرانے میں ایک عمر بسر کی تھی۔ ان کا یہ نشان امتیاز بھی کچھ کم نہیں کہ وہی لاہور ہے اور وہی گورنمنٹ کالج مگر ان کے بعد اب تک کوئی دوسرا پروفیسر سراج الدین پیدا نہیں ہوا۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر اسلم فرخی

لذت آشنائے تلخیِ دوراں*

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی علیہ الرحمہ نے اپنی ایک مبارک مجلس میں فرمایا تھا کہ "ہر مجمع عام میں ایک خاص بھی ہوتا ہے۔" اس عاجز کو زندگی میں انسانوں کے جس جنگل سے واسطہ پڑا اس میں بعض خاص بھی نظر آئے۔ ایسے ہی ایک خاص کا خاکہ مرتب کرنے کی جسارت کی ہے جو دنیا کی نظروں میں گرا ہوا اور گھٹیا آدمی تھا لیکن وفاداری بہ شرطِ استواری کی روشنی میں بڑا بھی تھا اور اعلیٰ بھی۔ بڑی مدت سے یہ خاکہ مرتب کرنے کا خیال تھا مگر اس مضطرب روح کو گرفت میں لانا ہمیشہ مشکل معلوم ہوا۔ اب ڈرتے ڈرتے ہمت کی ہے۔ نہ جانے اب بھی یہ مضطرب روح گرفت میں آسکی ہے یا نہیں

احمد آنسو پونچھتے ہوئے شوکت کی طرف بڑھے۔ شوکت' بھائی کو بڑھتے دیکھ کر زمین پر لوٹ گئے۔ رونے کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ پچھاڑیں کھانے لگے۔ احمد نے گلے لگایا۔ جیب سے بیس روپے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھے' بولے۔ "اب جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ اللہ نے ابا کی مشکل آسان کردی۔ اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ گھنسار مسجد کی دکانوں میں حاجی جی بیٹھتے ہیں۔ ان سے سارا سامان مل جائے گا۔ کفن' کیوڑے کی بوتل' بیری کے پتے اور پھول لے آؤ۔ کپڑا ذرا دیکھ کر لینا' جھر جھرا نہ ہو۔ جلدی سے سب چیزیں لے آؤ' دیر نہ لگانا۔"

شوکت باہر نکلے تو سامنے سے رحمت آتا ہوا نظر پڑا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹکے پھر رحمت نے پوچھا۔ "ابے یہ محرمی صورت کیوں بنائی ہے۔ کیا ہوا؟" شوکت نے کہا۔ "ابا گزر گئے۔ کفن لینے جا رہا ہوں۔" رحمت نے کہا۔ "ارے تو کیا ہوا بڑے میاں کو ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی تھا۔ اچھا ہوا گزر گئے۔ کھٹیا سے کب تک لگے رہتے۔" شوکت نے قہری نظروں سے رحمت کو دیکھا مگر رحمت پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ کہنے لگا۔ "کفن بھی لے لیں گے۔ میری مانو تو پہلے چنڈو خانے میں چل کر چنڈو کے دو چھینٹے اڑائیں سارا غم غلط ہوجائے گا۔ لگے دم' مٹے غم۔ پھر کفن بھی لے لیں گے۔" تیسرے دن جب شوکت سوجی سوجی آنکھوں اور ڈھیلے ڈھیلے ہاتھ پیروں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے

---

* اسی باعث تو دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنائے تلخیِ دوراں

بھاوج کی نگاہ پڑی۔ اسی سے معجبنا ہوا۔ بھاوج نے شوکت کو دیکھتے ہی سینے پر دوہتڑ مارنا اور بین کرنا شروع کردیا۔ ""آگیا جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسنے۔ موئڑی کاٹے' باوا کے بدلے تجھے موت نہ آئی۔ ارے تجھے ڈھائی گھڑی کی موت آئے۔ ہچ مچاتی کھٹیا نکلے۔ ارے لوگو' یہ کیسا اندھیر ہے۔ موا باپ کے کفن کے روپوں سے چنڈو پی گیا۔ ارے بے شرم تجھے ہیضہ ہو۔ کمینے' خدائی خوار ہمارے منھ میں کالک لگا دی۔ باپ کا مردہ گھر میں پڑا ہے اور سپوت چنڈو خانے میں چھینٹے اڑا رہے ہیں۔ تیرا ستیاناس ہو۔ ""ملاعون"" چنڈو باز" بے غیرت' کیا منھ لے کر آیا ہے۔ ارے کہاں ہو...... اس کمینے کا ہاتھ پکڑ کر باہر کیوں نہیں نکال دیتے۔"" بیوی کی پٹن سن کر احمد کوٹھری سے انگنائی میں برآمد ہوئے۔ شوکت کی سوتی سوتی آنکھوں اور ڈھیلے ڈھیلے ہاتھ پیروں پر نظر پڑی تو بے اختیار پیر سے جوتا اتارا اور شوکت کے سر پر دھڑا دھڑ مارنا شروع کردیا۔ شوکت بت بنے کھڑے رہے۔ چپ چاپ پٹتے رہے۔ احمد مارتے مارتے تھک گئے تو ہاتھ پکڑ کر دروازے سے باہر لے گئے۔ ڈانٹ کر بولے۔ ""اگر شریف کا نطفہ ہو تو کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔""

شوکت گھر سے نکلے تو روتے بسورتے رحمت کے یہاں پہنچے۔ اس نے انھیں دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھائی۔ بولا۔ ""مجھے سب خبر ہے۔ آگئے جوتے کھا کر۔ مرد بچے بنو۔ گھر میں آدھا حصہ تمھارا ہے۔ احمد یوں نہ مانیں تو نالش کردو۔ دماغ درست ہوجائے گا۔"" شوکت خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ کہنے لگے۔ ""میاں میرے میں تو یہ چاہ رہا ہوں کہ دو چار دن تمھارے یہاں رہوں۔"" ""لو بھلا۔ میاں ہوش کے ناخن لو۔ یہاں اپنا ٹھکانا تو ہے نہیں تمھیں کیا طاق میں سجادوں۔ بھائی کوئی اور گھر دیکھو۔ اپنا گھر اجاڑنے سے پہلے کچھ تو سوچا ہوتا۔"" شوکت چپ چاپ وہاں سے کھسک لیے۔ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ رحمت یوں آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لے گا۔ رات محلے کی مسجد میں گزاری۔ بھوکے پیاسے لیٹ رہے۔ صبح کو کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اپنے دور پرے کے رشتے داروں کے پاس گنگا پار چلے گئے۔

....

میں نے بچپن ہی سے شوکت کو اپنے گھر کے ایک لازمی حصے کی طرح دیکھا اور محسوس کیا۔ پرانی روایت کا پابند گھرانا اور ماحول۔ مردانے میں مہمان داری کا زور و شور۔ فتح گڈھ چوں کہ ضلعے کا صدر مقام تھا اس لیے ضلعے بھر کے ہر حصے سے ابا میاں کے ملنے جلنے والے' مقدموں' کاروبار اور دوسرے کاموں سے آتے رہتے تھے۔ تیروا' قنوج' چھبرامئو' سورساے گنج' شمس آباد' قایم گنج' سدرکھ' سترکھ' تال گرام' ہر جگہ سے لوگ آتے تھے۔ کوٹھی کے بڑے دالان سے ملحق چھ بڑے بڑے کمرے تھے ان میں پلنگ' بستر' پانی کی صراحی' لوٹا' گلاس' دو چار مونڈھے اور اسی قسم کا سامان تھا۔ کونے کا کمرہ مولوی صاحب کے تصرف میں تھا۔ باقی کمرے مہمانوں کے لیے تھے۔ قنوج اور قایم گنج دونوں جانب سے ریل صبح نو بجے فتح گڈھ پہنچتی تھی۔ آنے والے پہلے کوٹھی آتے۔ منھ ہاتھ دھوتے' موسم کی مناسبت سے چائے شربت پیتے' پھر کچہری یا بازار چلے جاتے۔ جنھیں ٹھہرنا نہیں ہوتا وہ چار بجے کی ریل سے واپس چلے جاتے۔ جنھیں ٹھہرنا

ہوتا وہ شام کو واپس آجاتے۔ کھانا کھاتے اور کام ختم کرکے اگلے دن جاتے۔ میں بڑی مدت تک اس شش و پنج میں رہا کہ ابا میاں رات کا کھانا اتنی دیر میں کیوں کھاتے ہیں، ساڑھے نو بجے دستر خوان بچھتا تھا، پھر ایک دن یہ معمہ خود بہ خود حل ہوگیا۔ او ہو! یہ رات کے نو بجے آنے والی ریل کے مسافروں کا انتظار کرکے کھانا کھاتے ہیں۔ تیروا، نھنھیا، تال گرام اور چھبرامئو سے آنے والے عموماً رات ہی کو آتے تھے کیوں کہ یہ قصبے ریل سے دور تھے۔ پہلے قنوج یا گورسہائے گنج آنا پڑتا تھا پھر ریل سے فتح گڈھ۔ تین چار بجے نکلتے اور رات کو فتح گڈھ پہنچتے۔ اگر ابا میاں رات کو جلد کھانا کھالیتے تو آنے والے مہمانوں کو بچا ہوا کھانا ملتا اور مہمان نوازی کا حق ادا نہ ہوتا۔ مہمان نوازی کے بھی کیا کیا انداز تھے۔

بعض مہمان ایسے بھی آتے تھے جو ہفتوں نہیں مہینے رہتے تھے۔ مجھے ایک صاحب خاص طور سے یاد آتے ہیں انھیں سب مسافر مصاحب کہتے تھے۔ آتے تو جانے کا نام نہ لیتے اور ہر دوسرے تیسرے دن کبابوں اور ارد کی دال کی فرمائش اندر بھجواتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب بھی ایک دفعہ گھومتے پھرتے آ پہنچے تھے اور مہمان ہوئے تھے۔ نام ان کا سید محمد شفیع تھا جون پور کے رہنے والے تھے، ذی علم تھے۔ تھوڑی بہت زمین داری بھی تھی، سرکاری ملازم تھے۔ گرداور، قانون گو تھے مگر جوانی ہی میں نہ جانے جی میں کیا آئی کہ نوکری چھوڑ دی۔ زمین بہن کے سپرد کردی۔ فقیری لے لی اور دیس دیس کی سیر کرنے نکل کھڑے ہوئے، "بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی" گھومتے پھرتے فتح گڈھ آنکلے۔ ابا میاں کے مہمان ہوئے اور ایسے مہمان ہوئے کہ مر ہی کے نکلے۔

برق جو کہتے تھے آخر وہی کرکے اٹھے
جان دی آپ کے دروازے پہ مرکے اٹھے

سیدھے سچے بزرگ تھے۔ ہم سب بھائی بہنوں کو قرآن شریف انھیں نے پڑھایا تھا۔ میں نے ان سے فارسی بھی پڑھی تھی۔ تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کرتے تھے۔ فال بھی کھولتے تھے۔ ہندو عورتیں اور مردان کے بڑے معتقد تھے۔ مسلمان بھی آتے تھے۔ مولوی صاحب کے پاس بانس کے کاغذ کی ایک قلمی کتاب تھی۔ اسی کو دیکھ کر فال کھولتے تھے۔ آنے جانے والے کچھ نہ کچھ نذر بھی کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا کالا قلم دان روپے، دھیلی اور پاؤلی کے سکوں سے بھرا رہتا تھا۔ مٹھائی بھی بہت آتی تھی۔ میں نے کئی بار مولوی صاحب کی غیر موجودگی میں ان کی کتاب پڑھنے کی کوشش کی مگر میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دراصل مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر کبھی مولوی صاحب نے اپنی تلے دانی کے بارے میں فال کھولی تو انھیں پتا چل جائے گا کہ ایک دن ان کی ڈانٹ سن کر میں نے اسے کنویں میں پھینک دیا تھا مگر نہ انھوں نے فال کھولی نہ پتا چلا۔

مولوی صاحب میں ساری خوبیاں تھیں مگر ایک کم زوری بھی تھی۔ کم زوری یہ کہ وہ افیمی تھے۔ افیم کی گولی بھی کھاتے تھے اور پانی میں گھول کر بھی پیتے تھے۔ چوں کہ ذی علم تھے، معزز تھے، بزرگ تھے اس لیے فتح گڈھ کے تمام افیمیوں نے انھیں اپنا قبلہ گاہ بنا لیا تھا۔ ایک آدھ افیمی ہر وقت ڈٹا رہتا تھا۔

شام کو باقاعدہ محفل جمتی' انگیٹھی پر چائے بنتی۔ کڑھے ہوئے بالائی دار دودھ کی یہ چائے بڑی لذیذ ہوتی تھی۔ لب بند' لب سوز اور ہر پینے والے کے لیے لبالب۔ چراغ جل جاتے تو سارے اہلِ محفل قاعدے قرینے سے اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھتے۔ مولوی صاحب ڈیز کی شفاف چمنی والی لالٹین کی روشنی میں طلسم ہوش ربا پڑھتے۔ موقعہ محل کی مناسبت سے ان کا نرم گرم بیان' سننے والوں کا انہماک۔ جب مولوی صاحب پڑھتے "کشتی مرا......" تو حاضرین صدا لگاتے۔ "وہ مارا مردود کو۔" "لشکرِ اسلام پر کوئی آفت نازل ہوتی تو نعرہ لگتا۔ "بس مدد آیا چاہتی ہے۔ پہنچنے ہی والی ہے۔" گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے یہ داستان جاری رہتی پھر محفل برخواست ہو جاتی۔ اس محفل کے شرکا میں ایسے ایسے زندہ اور توانا کردار نظر پڑے جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ ابا میاں کے دوست احباب کی محفل الگ جمتی تھی' گرمیوں میں کوٹھی کے صحن میں' سردیوں میں دیوان خانے میں۔ دونوں محفلیں دو الگ الگ جزیرے تھیں۔ ابا میاں نے مولوی صاحب اور ان کے حشرات الارض' سے کبھی کوئی پرسش نہیں کی۔ آنے والے انھیں ادب سے سلام کرتے۔ ابا میاں سوال کا جواب دیتے خیریت پوچھتے اور آنے والا مولوی صاحب کی طرف بڑھ جاتا۔ ابا میاں کا انتقال ہو گیا۔ کوٹھی ان کی زندگی ہی میں فروخت ہو کر کورٹ آف وارڈس کی تحویل میں چلی گئی تھی۔ دیسی ریاستوں نے ان کے کارخانے سے بے تحاشا خیمے بنوائے۔ سازو سامان خریدا۔ خریداری مسلسل ہوتی رہی مگر ادائیگی بہت کم ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کارخانہ تباہ ہو گیا۔ کسی ریاست کے خلاف عدالت میں دعویٰ ہو نہیں سکتا تھا۔ وائسرائے کی اجازت ضروری تھی اور کسی وائسرائے نے درخواستوں کے باوجود اجازت نہیں دی۔ ابا میاں قرض میں ڈوب گئے اور کوٹھی کا داغ دل پر لیے چلے گئے۔ ہماری حیثیت مالک کے بجائے کرائے دار کی ہو گئی مگر میرے والد نے جنھیں میں بھائی جان کہتا تھا ابا میاں کے انداز کو قایم رکھا۔ مہمان داری بھی وہی رہی اور انھوں نے مولوی صاحب کو بھی خوش دلی سے وراثت میں قبول کر لیا۔ شوکت بھی اسی وراثت کا حصہ تھے۔

شوکت پہلے پہل مولوی صاحب ہی کے پاس آئے تھے۔ یہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر یہیں رہ پڑے۔ مولوی صاحب کی صحبت میں شین قاف درست ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کی طرح ان کا کھانا بھی اندر سے آنے لگا تھا۔ مولوی صاحب کبھی کبھی انھیں افیم بھی پلوا دیتے تھے۔ پیسے کوڑی سے بھی مدد کرتے تھے۔ کچھ پیسے بھائی جان سے بھی مل جاتے تھے۔ کپڑوں کا بندوبست بھی بھائی جان ہی کرتے۔ عید' بقر عید کو سب کے ساتھ ان کا جوڑا بھی بنتا تھا۔ یہ تو اندر کا حال تھا بہ ظاہر شوکت کسی کے محتاج نہیں تھے سرمہ' مسی بیچتے تھے۔ "من قاش فروش دلِ صدپارہ خویشم" بیچتے کیا تھے دل کے بہلانے کو ایک شغل پال رکھا تھا۔

میں نے شوکت کو جس انداز میں پہلے پہل دیکھا تھا وہی انداز آخر تک قایم رہا۔ ناٹا قد' گھٹا ہوا سر۔ رنگ گہرا سانولا جو افیم کی وجہ سے کلجھواں ہو گیا تھا۔ چیاں سی آنکھیں۔ پچکے ہوئے کلے' تنگ پیشانی۔ ڈھیلے ڈھیلے ہاتھ پیر۔ الجھی ہوئی لٹکواں داڑھی' میرے بچپن میں کالی تھی' میرے دیکھتے دیکھتے سفید

ہو گئی تھی۔ کمر میں ہلکا سا خم' موٹے موٹے ہونٹ۔ کالے کالے دانت جیسے مسی پچتے پچتے خود مل لی ہو۔ آواز میں کرارا پن۔ گرمیاں ہوئیں تو بدن سے ننگے' لنگوٹی لگی ہوئی۔ جاڑوں میں تہ بند بندھا ہوا مگر سر پر دوپلی ضرور ہوتی تھی۔ گردن میلی چکٹ۔ پیٹھ اور پیٹ پر میل کی تہیں جمی ہوئی۔ جاڑوں میں کرتا اور مرزئی۔ جوتے کا روگ نہیں پالتے تھے۔ دھول مٹی میں اٹے رہنے کی وجہ سے پاؤں بالکل سیاہ ہو گئے تھے۔ نہانے کے نام سے دور بھاگتے تھے۔ نہ جانے کبھی منھ بھی دھوتے تھے یا نہیں۔ ادھر کسی نے نہانے کا نام لیا اور انھوں نے کنی کاٹی۔ بڑی گرمی پڑ رہی ہے۔ سب لوگ دن میں دو دو تین تین مرتبہ نہا رہے ہیں۔ علی الصبح گنگا میں اشنان ہو رہا ہے مگر پتھر میں جونک نہ لگی ہے نہ لگے گی۔ کس کی مجال تھی کہ شوکت کو نہانے پر آمادہ کر سکے۔ کسی نے زیادہ اصرار کیا تو کہتے۔ "اب کے جمعہ کو ضرور نہا لوں گا۔" مگر وہ جمعہ کبھی آیا نہیں۔ اور ان پر کیا منحصر مولوی صاحب بھی نہانے کا نام سنتے ہی پانی پانی ہو جاتے تھے۔ جاڑوں میں نہانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عید' بقرعید کے موقعے پر دو تین آدمی انھیں زبردستی پکڑ کر نہلا دیتے تھے اور ان کی زبان سے برا بھلا سنتے مگر نماز کو شوکت پھر بھی نہ جاتے۔

دالان کے آخری کونے میں ایک بڑا سا تخت بچھا تھا۔ یہی شوکت کا ٹھیا تھا۔ رات کو اسی تخت پر لوٹ مارتے۔ تخت کے نیچے ان کی روزی کا ٹھیکرا یعنی پٹاری دھری رہتی تھی۔ اس میں سرمہ' مسی' ایگر' عورتوں کا صابن' کاجل اور نہ جانے کیا کیا مال مسالہ بھرا رہتا تھا۔ مولوی صاحب صبح بھی چائے بنواتے تھے۔ شوکت پہلے تو چائے پیتے' بسکٹ کھاتے' اگر مولوی صاحب افیم کی پیالی ان کی طرف بڑھا دیتے تو وہ پانی ڈال کر جوگے کو خوب گھونٹتے تھے اور زہر مار کر جاتے تھے۔ اگر مولوی صاحب چپکے رہتے تو شوکت پوست کے چھلکے ابلنے رکھ دیتے۔ یہ چھلکے وہ لالہ جیون لال کی دکان سے لاتے تھے۔ افیم کے مقابلے میں بہت سستے ہوتے تھے۔ ان میں کہیں کہیں افیم کے لگے رہ جانے کا احتمال ہوتا تھا۔ چھلکے خوب ابل چکتے اور پانی ذرا سا رہ جاتا تو شوکت اسے ٹھنڈا کر کے پی جاتے۔ ان کے بہ قول اس سے بڑا سرور گھٹتا تھا۔ اس ساری کارروائی میں بالعموم صبح کے دس بج جاتے تھے۔ سورج خاصا بلند ہو جاتا تھا' دھوپ تیز ہو جاتی تھی۔ دھوپ تیز ہوئی اور شوکت نے پینترا بدلا۔ اٹھے' بیٹھے' پھر اٹھے' پھر بیٹھے۔ جیسے بڑی ہمت کر رہے ہوں' پھر آہستہ آہستہ اٹھے۔ ملگجا کرتا پہنا۔ ٹوپی ٹھیک سے سر پر جمائی۔ تہ بند کسا۔ کپڑے کو گول کر کے اینڈوی بنائی' پٹاری سر پر رکھی۔ ایک موٹی سی لکڑی ہاتھ میں لی اور کانکھتے کراہتے دالان سے صحن میں آئے۔ یہاں چھوٹے دالان میں منو میاں' بابو رام اور رام پرشاد خاموشی سے انھیں بڑھتے ہوئے دیکھتے پھر ان میں سے کوئی بڑے زور سے چھینکتا۔ اچھیں۔ شوکت فوراً" پینترا بدلتے۔ بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے۔ چند لمحوں کے لیے ٹھہر جاتے۔ اس اثنا میں پھر چھینک کی آواز آتی۔ اچھیں۔ اچھیں۔ شوکت ہیں کہ سناٹے کے عالم میں ہیں۔ انھیں ٹھہرے دیکھ کر چھینکوں کا سلسلہ عارضی طور پر رک جاتا مگر ادھر انھوں نے قدم بڑھایا اور اچھیں اچھیں ہونے لگی۔ وہ کھسیا کر کہتے۔ "ہت ترے چھینکنے والے کی ناک کانوں۔" مگر چھینکنے والے چھینکتے اور شوکت جھینکتے رہتے۔ تنگ آ کر وہ اپنے تخت کی طرف واپس آ جاتے۔ پٹاری سر سے اتار

کر نیچے رکھ دیتے اور تخت پر بیٹھ کر بڑبڑانے لگتے۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر پھر ہمت کرتے اور باہر نکلتے۔ ادھر سے چھینکنے اور ادھر سے بڑبڑانے کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا مگر اب شوکت لمبے لمبے ڈگ بھرتے تیزی سے باہر نکل جاتے۔ منو میاں اور ان کے ساتھی منھ دیکھتے رہ جاتے۔ یہ تماشا اکثر ہوتا تھا مگر ابا میاں یا بھائی جان کے آنے کا اندیشہ ہوتا تو پھر منو میاں چپکے رہتے اور شوکت پوقدے چلے جاتے۔ کوٹھی سے باہر نکلتے۔ پھاٹک سے باہر ہوتے ہی آواز لگاتے۔ کھرج دار آواز میں۔ "سرمہ بریلی والا' مسی پنجاب والی' انگر بنارس والا' کٹوری بندی آگرے والی" کی گردان کرتے اور جس طرف جی چاہتا چل کھڑے ہوتے۔ کسی قریبی گاؤں کی طرف نکل جاتے۔ ان کے گاہک دیہات ہی کے لوگ ہوتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ چھینکوں کا سلسلہ طول کھینچ جاتا۔ اس دن شوکت دالان میں لوٹ کر پٹاری تخت کے نیچے رکھ دیتے اور بیٹھ کر بڑبڑاتے رہتے یا ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہتے۔ مولوی صاحب کی نظر پڑتی تو وہ پوچھتے۔ "ارے میاں شوکت! آج تم گئے نہیں۔" شوکت منھ بسور کر کہتے۔ "میاں میرے! جاؤں کیسے۔ نکلا تو کم بختوں نے جتے پر ٹوک دیا۔ سویرے سویرے زیاں ہو گئی۔ اب کیا جاؤں۔ جینا حرام کر دیا ہے ان لوگوں نے۔ سالوں کو موت بھی نہیں آتی۔ احسن میاں نے نوکر نہیں رکھے چنڈال چوکڑی جمع کی ہے۔" شوکت بڑبڑاتے رہتے مگر بھائی جان کا نام سنتے ہی مولوی صاحب چپکے ہو جاتے۔ ویسے بھی بھڑوں کے چھتے کو چھونا ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ اللہی آدمی یوں بھی لڑائی جھگڑے سے بہت گھبراتے ہیں۔ مگر ایک دن بیچ مچ جھگڑا ہو گیا۔ ہوا یہ کہ منو میاں نے شوکت کو جاتے دیکھ کر حسب معمول چھینک مار دی۔ اس دن شوکت نے سویرے سویرے یا تو آئینہ دیکھ لیا تھا یا کالی بلی لانگی تھی کہ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پٹاری سر سے اتار کر زمین پر ٹکائی۔ لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبا صحن میں پڑا تھا۔ لپک کر اسے اٹھایا اور منو میاں کے کھوپڑے پر کھینچ مارا۔ ڈبا منو میاں کے سر میں بڑے زور سے لگا اور وہ بہ آواز بلند شوکت کی مرحوم والدہ سے رشتا جوڑتے ہوئے ان سے دست و گریباں ہو گئے۔ شوکت تھے تو مس مسے آدمی مگر وہ بھی اس وقت جان پر کھیل کر لپٹ پڑے۔ قریب تھا کہ دونوں میں لپاڈگی ہو جائے کہ یک لخت بھائی جان اندر سے آگئے۔ انھوں نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" کہاں تو شوکت اور منو لپاڈگی پر آمادہ تھے' کہاں یہ معلوم ہوا کہ دونوں گلے مل رہے ہیں۔ شوکت نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ "احسن میاں! یہ منو مجھے بتا رہے ہیں کہ جب ڈاکو ان سے لپٹ پڑا تھا تو انھوں نے اسے کیسے دے مارا تھا۔" بھائی جان نے منو سے پوچھا۔ "ڈاکو تمھارے لپٹ گیا۔ کب کہاں؟" منو بڑی مری ہوئی آواز میں کہنے لگے۔ "میں ایک دفعہ کنزی میں جا رہا تھا۔" بھائی جان نے کہا۔ "کنزی میں۔ وہاں کیا کرنے گئے تھے۔ ایسی ویسی جگہ مت جایا کرو۔" بھائی جان تو یہ کہہ کر چلے گئے۔ شوکت نے بھی سیدھے بھاؤ اپنا رستا لیا اور چوٹ کھائے ہوئے منو سر سہلاتے رہے۔ بابو رام اور رام پرشاد بھی ان کا سر سہلاتے اور بھیجا کھاتے رہے۔

اس واقعے بلکہ سانحے کے بعد چھینکوں کا سلسلہ کچھ دن بند رہا مگر منو میاں کی انتقامی طبیعت نے ایک نیا طریقہ واردات شروع کر دیا۔ شوکت جب بھی چھوٹے دالان کے سامنے سے گزرتے تو منو میاں

نعرہ لگاتے۔ "خدا نے کرپی کی۔" دوسرے تمام لوگ کورس میں جواب دیتے۔ "پھٹ گئی دھوتی انھی کی۔" کبھی کبھی ادھر ادھر دیکھ کر یہ اطمینان کر لیتے کہ مولوی صاحب یا کوئی اور تو نہیں سن رہا ہے تو پھر دھوتی کی جگہ وہ لفظ استعمال ہوتا جو گھوڑے کھولنے کے محاورے کے ساتھ زبان زدِ خاص و عام ہے۔ شوکت خون کا سا گھونٹ پیے 'سی ان سنی کرتے منہ میں گھنگھیاں بھرے باہر نکل جاتے۔ جب منو میاں اور ان کے ساتھیوں نے دیکھا کہ ان کی انتقامی کارروائی بے اثر ہو گئی ہے تو نعروں کی فراوانی اور شدت میں خاصی کمی آگئی مگر سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ نعرے اور پھبتیاں جاری رہیں۔ شوکت عام طور پر چپ شاہ کا روزہ رکھے رہتے۔ کبھی کبھی برس پڑتے اور خنک پورے کا محاورہ بولنے لگتے مگر منو میاں اینڈ کو زور زور سے قہقہے لگاتے اور شوکت کھسیانے ہو کر رہ جاتے۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہا نہ یہ باز آئے نہ انھوں نے ہار مانی۔

تین چار بجے شوکت پھیری لگا کر لوٹتے۔ ٹھنڈا سی کھانا حلق سے اتارتے۔ کچھ دیر مولوی صاحب کے پیر داتے۔ ادھر شام کے پانچ بجے اور وہ کوٹھی سے نکل کر ہاتھی خانے والے نالے کے سامنے مقصود کی دکان پر جا پہنچے۔ مقصود عرفِ عام میں مقصودا کہلاتے تھے اور اپنے چائے خانے کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھے۔ چائے خانہ کیا تھا ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ دکان کے سامنے دو ایک ٹوٹی پھوٹی بنچیں رکھی تھیں۔ آنے والے انھیں پر ٹک جاتے اور مقصود کی بالائی والی چائے کی چسکیاں لیتے۔ مقصود چائے خود ہی بناتے تھے۔ دہرے جسم کے موٹے تازے آدمی تھے۔ قد کے ناٹے مگر دل کے بڑے۔ ان کے ہاتھ کی چائے کا بڑا شہرہ تھا۔ فقیر محمد خاں جنھیں ہم سب فقیرے ددو کہتے تھے روزانہ اپنے گاؤں یاقوت گنج سے یہ چائے پینے سائکل پر فتح گڑھ آتے تھے۔ دوپہر کوٹھی میں گزارتے' شام ہوتی تو مقصود کے یہاں چائے پیتے اور پھر یاقوت گنج واپس چلے جاتے۔ میں نے ان کے اس معمول میں کوئی ناغہ نہیں دیکھا۔ اسی طرح بعض اور لوگ بھی آتے تھے۔ مقصودا اپنے ہم سنوں اور شوکت جیسے لوگوں سے ہنسی مذاق بھی کرتے رہتے تھے۔ جملہ چپکانے میں بے پناہ تھے مگر جیسا منہ ویسی تھپیڑ کے بھی قائل تھے۔ فتح گڑھ میں دلی کا ہوٹل بھی تھا۔ شرفائے شہر یہیں جمع ہوتے اور بکریوں کے دودھ کی چائے پیتے تھے۔ ریڈیو بجتا تھا۔ اتوار کی دوپہر کو فرمایشی پروگرام سننے ہمارا ٹولہ بھی وہیں جمع ہوتا تھا۔ مقصود کے یہاں ریڈیو تو کیا گراموفون بھی نہیں تھا۔ یہاں شہر کے سارے خدائی خوار جمع ہوتے تھے مگر شرفا بھی نظر آتے تھے۔ ربانی صاحب (غلام ربانی تاباں)' مرزا ضمیر' قمر' مسعود' محبوب اور بعض ایسے لوگ جن کا شہر کے معززین میں شمار ہوتا تھا کبھی کبھی مقصود کے یہاں بھی نظر آتے۔ ربانی صاحب کھڑے کھڑے چائے پیتے اور طنزاً" مجھ سے کہتے۔ "تمھیں اس سیال حلوے میں کیا لطف آتا ہے۔" میں جواب میں کہتا۔ "اس قومی چنڈو خانے میں آنے سے زندگی کے حقایق روشن ہوتے ہیں۔" ربانی صاحب جواب میں کہتے۔ "یارو۔ میری پوزیشن کا بھی کچھ خیال کیا کرو۔"

شوکت چائے خانے کے ایک کونے میں بیٹھے رہتے۔ کوٹھی میں ذرا دبے لچے رہتے۔ یہاں خوب ڈونگتے۔ بات بات پر بمکتے پارہ چڑھ جاتا تو جیب سے اکنی نکال کر پھینکتے اور کہتے۔ "لا یار! چائے پلا۔"

دوسرے آنے والے چائے کی پیش کش کرتے مگر شوکت ٹال جاتے۔ دوسروں کی چائے کبھی نہ پیتے۔ چائے بناتے بناتے مقصود موقع محل دیکھ کر ان کے ایک آدھ چٹکی بھی لے لیتے تھے۔ شوکت بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے۔ "ارے ہاں شوکت۔ سنا ہے سارے انیس لام پر بھیجے جا رہے ہیں۔ ہوشیار ہو جاؤ۔ تمھارا نمبر بھی آنے والا ہے۔" "ہاں میاں میرے، دونوں ساتھ چلیں گے۔ تم توپ چلانا۔ اپن جانب بندوق چلائیں گے۔" ...... "تم تو بیٹھے ہی بیٹھے فیر کرتے رہتے ہو۔ تمھیں بندوق کی کیا ضرورت ہے۔ اٹھ سکے گی تم سے۔" ...... "میاں میرے ہم نے بھی جوانی میں بہت بندوقیں داغی ہیں۔ چائے بنانا اور ہے بندوق داغنا اور ہے۔" ...... "اچھا تو تم جوان بھی تھے۔ لوگ کہتے ہیں تم بڈھے ہی پیدا ہوئے تھے۔" اتنے میں کوئی ایسا گاہک آجاتا جس کی موجودگی میں دونوں کو چپ ہونا پڑتا۔ شوکت آنے والے کو سلام کر کے پکے پل کی ریوڑیوں اور قلعے تلے کے سوہن حلوے کا ذکر چھیڑ دیتے۔ آنے والا چند لمحوں کے لیے ان کی بات دلچسپی سے سنتا اور ان کو چائے پلوانا چاہتا مگر وہ حیلے بہانے سے ٹال جاتے۔ کوئی خر دماغ پھنس جاتا تو وہ شوکت کو جتے ہی پر ٹوک دیتا اور رخ ملا کر بات نہ کرتا۔ شوکت بھی ہوا کا رخ پہچانتے تھے۔ ایسے لوگوں سے چبا چبا کر باتیں کرتے تھے۔ خوددار اتنے تھے کہ فقیر محمد خاں کے علاوہ کسی اور کی چائے پینے کے روادار نہیں تھے۔

مقصود کے چائے خانے میں شوکت اور ان کے جنم جنم کے بیری منو میاں میں بھی کوئی مچینا نہیں ہوتا تھا۔ مقصود اور منو میاں دونوں مکتب میں ہم سبق رہ چکے تھے۔ "ما و مجنوں ہم سبق بودیم در لیلائے عشق" دونوں مکتب چھوڑ بھاگے تھے۔ چائے خانے میں شوکت کے بجائے مقصود اور منو میاں حریف ہوتے تھے۔ منو میاں روزانہ کے حاضرباشوں میں نہیں تھے۔ بھولے بھٹکے آنکلتے تھے۔ ان میں اور مقصود میں ہاتھی خانے کے روزمرے اور محاورے میں مکالمہ ہوتا تھا۔ مقصود منو میاں کی خست پر پھبتی کستا۔ منو میاں جواب میں مقصود کے حلیے پر کوئی گرما گرم فقرہ کہتے اور مقصود انھیں اٹھا کر کندھے پر لاد لیتا، کہتا۔ "ادھار کب ادا کرو گے۔ خدا معلوم اب تک کتنی چائے ڈھکوس چکے ہو۔ آج سارا حساب بیباق کرنا ہوگا۔" منو میاں اوپر تڑپتے رہتے پھر مقصود انھیں آہستہ سے نیچے اتار دیتا۔ چائے بناتا۔ ان کے سامنے رکھتا اور کہتا۔ "لو چڑھا جاؤ۔ کیا یاد کرو گے کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔" منو میاں جواب میں کہتے۔ "تو تو گھر کا رئیس ہے۔" شوکت یہ تماشا چپ چاپ دیکھتے رہتے۔ نہ مقصود کو شہ دیتے نہ منو سے الجھتے۔ منو مرخص ہو جاتے تو ان میں اور مقصود میں بیت بازی شروع ہو جاتی۔

مغرب تک مقصود کے یہاں بڑی رونق رہتی۔ چراغ جلتے تو چھیڑ ہونے لگتی۔ فتح گڈھ میں ان دنوں بجلی عام نہیں ہوئی تھی۔ مقصود کی دکان پر ایک بڑی سی لالٹین جلتی تھی جس کی چمنی اندھی تھی کیوں کہ مقصود کو کبھی لالٹین اور چمنی صاف کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ ادھر مغرب کی اذان ہوئی۔ لالٹین جلی اور ادھر شوکت نے منھ ہی منھ میں کچھ بدبدا کر دونوں ہاتھ منھ پر اس طرح پھیرے جیسے دعا کے خاتمے پر پھیرے جاتے ہیں۔ یہ ان کی رخصت کا اعلان ہوتا تھا۔ منھ پر ہاتھ پھیرتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوتے اور

لوحی کا رخ کرتے۔ یہاں دوسری محفل جمی ہوتی۔ انگیٹھی دہکتی ہوتی۔ پانی چڑھا ہوتا۔ شوکت آتے ہی پیالیاں کھنگالتے۔ دو ایک چھوٹے موٹے کام اور کرتے۔ چائے تیار ہو جاتی اور پیالیوں میں انڈیلی جاتی تو شوکت پیالیاں حاضرین میں تقسیم کرتے اور اپنی پیالی لے کر اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔ طلسم ہوش ربا سنتے جاتے' چائے پیتے جاتے مگر میرا اندازہ ہے کہ طلسم ہوش ربا کی داستان ان کے سر سے گزر جاتی تھی۔ وہ صرف طلسم ہوش ربا کے مصنفوں کی طول کلامی اور بات سے بات پیدا کرنے کے فن کے قائل تھے۔ ایران کی پوچھو توران سے شروع کرتے تھے مگر ابا میاں اور بھائی جان سے بات کرتے تو بڑی احتیاط سے۔ چھوٹی امت کے لوگ جن میں کسی حد تک میں بھی شامل تھا اس انداز تکلم سے ہمیشہ ستائے جاتے تھے۔

ایک دن میں کوٹھی کے پھاٹک پر کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ پھاٹک کے بالکل سامنے شہر کی سب سے لمبی گلی تھی جو اس سڑک سے شروع ہو کر براز ے اور سنگت سے گزرتی گاڑی خانے والی سڑک پر بابو دوار کا ناتھ کے مکان کے سامنے ختم ہوتی تھی۔ اس گلی کے نکڑ پر بائیں ہاتھ کی طرف موٹے گھی والے کی دکان تھی۔ دائیں ہاتھ پر ماسٹر رین کا راما ہوٹل تھا۔ جس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ شوکت اس وقت موٹے گھی والے سے کچھ ہنسی مذاق کر رہے تھے اور راما ہوٹل کا رسوئیا ایک بڑے سے تسلے میں چولھے کی راکھ جمع کر رہا تھا۔ اتنے میں سامنے سے ایک نوجوان نٹنی اتراتی' بل کھاتی' مٹکتی' انھلاتی' کسی کا منہ چڑاتی' کسی کو انگوٹھا دکھاتی نمودار ہوئی اور موٹے گھی والے کی دکان کے بالکل قریب آ پہنچی۔ چہرے پر نمک' کسا ہوا بدن' چولی اور لہنگے میں پھڑکتا ہوا سر پر چاندی کا بڑا سا چھپکا جس میں ماتھے کی طرف ہک کی طرح کی ایک بڑی سی نوک پیروں میں جھانجیں چھن چھن کرتی۔ موٹے گھی والے نے اسے دیکھ کر شوکت سے سرگوشی کی۔ کچھ اشارہ کیا۔ شوکت ایک دم سے اٹھے زقند بھری اور سڑک پر سیدھے اس نٹنی کے بالکل سامنے آ گئے۔ دفعتاً" انھوں نے جھپٹا مارا اور نٹنی کے لہنگے کا سامنے کا حصہ ہوا میں اچھال دیا۔ ہونے والی بات لہنگے کا آگا اچھلا اور چھپکے کی نوک میں اٹک گیا۔ نٹنی کا پورا منہ ڈھک گیا۔ وہ بلبلا کر دوڑی گلی کی طرف۔ وہاں ہوٹل کا رسوئیا راکھ کا تسلہ لیے کھڑا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ تسلے کی راکھ اس نٹنی پر اچھال دی۔ وہ غریب وہیں گلی میں پسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ لہنگے کے آگے کو کانٹے سے چھڑانے لگی۔ وہ بھی کم بخت جھاڑ کا کانٹا ہو گیا۔ ادھر لوگوں نے ہنسنا اور قہقہے لگانا شروع کر دیے۔ وہ ہے کہ کانٹے سے کشتی لڑ رہی ہے اور لوگ ہیں کہ قہقہے لگا رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے کپڑا اس کانٹے سے چھوٹا تو وہ کوستی پیٹتی' گالیاں بکتی' بگڑتی' سنبھلتی' گلی ہی میں جنبت ہو گئی۔ شوکت' مونو بلاؤ بنے گھی والے کی دکان پر چپکے بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔

لگائی بجھائی کرنے والے بھی بڑے غضب کے ہوتے ہیں۔ کسی نے شام کو یہ بات نمک مرچ لگا کر ابا میاں سے جڑ دی۔ انھوں نے پوری بات سن کر پوچھا۔ "اچھا۔ شوکت نے یہ حرکت کی۔" "جی ہاں میاں بڑا بدمعاش آدمی ہے۔" ابا میاں بڑے زور سے ہنسے۔ بولے۔ "سالے میں ابھی کچھ جان باقی

ہے۔" کہنے والے نے منھ کی کھائی۔ چلا تھا آگ لگانے وہاں پانی کا چھینٹا پڑ گیا۔

اگلے دن میں نے شوکت سے پوچھا۔ "کیوں میاں شوکت کبھی عشق وشق بھی کیا ہے۔" بڑے زور سے ہنسے کہنے لگے۔ "بچوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "کیوں کیا میں تمھیں بچہ نظر آتا ہوں۔" بولے۔ "نہیں میاں میرے۔ بچہ تو نہیں مگر یہ باتیں اچھی نہیں ہوتیں۔ گڑے مردوں کو اکھیڑنے سے کیا فایدہ۔" جب انھیں یہ اندازہ ہوگیا کہ یہ تو نیذ پڑ گیا ہے۔ بے سنے دم نہیں لے گا تو ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے۔ "میاں میرے جوانی میں جنگلی جئی سبھی بوتے ہیں۔ میں بھی کوئی نیک اور پارسا تو تھا نہیں، مگر عشق کی بات کچھ اور ہے۔ کیا کیوں نہیں۔ اور تباہ کیوں ہوئے۔" "اچھا۔ وہ کیسے؟"۔ "دوڑ دوڑ کر گنگا پار اور راجے پور کیوں جاتے تھے۔ اماں باوا کہتے تھے مجیب خاں بلاتے ہیں۔ اسلم میاں۔ کیا آدمی تھے مجیب خاں۔ بڑے زمین دار تھے مگر یاروں کے یار۔ میاں میرے ذرا جو غرور ہو۔ دسترخوان پر میرے بغیر نوالہ نہیں توڑتے تھے۔ کیا مزا آتا تھا۔ جاڑوں کا موسم ختم ہوا۔ اکھ تیار ہے۔ گیہوں کی فصل پک گئی پھر گاؤں میں بڑے بڑے کڑھاو چڑھے ہیں۔ رس پک رہا ہے۔ شہر کے یار دوستوں کے لیے رساول تیار ہو رہی ہے۔ گرم گرم رس کیا مزا دیتا تھا اور میاں میرے گرم رس میں گیہوں کی بالی ڈال دو تو سالی جمال گوٹے کا کام کرتی ہے۔ ایک دفعہ کیا ہوا۔ مجیب خاں کے یہاں نخلنو کے ایک بانکے آگئے۔ جامے دار کی شیروانی، آڑا پیجامہ، ریشم کا کمر بند، سر پر دوپلی، بڑے نازک مزاج، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں۔ میں نے کہا۔ "آپ کے لیے گرما گرم رس لاؤں۔" بولے۔ "تمھیں واللہ۔ مجھے بھی کیا کوئی دیہاتی گنوار مقرر کیا ہے۔" پھر تھوڑی دیر کے بعد کچھ سوچ کر بڑے "رعب" سے کہنے لگے۔ "اچھا لے آؤ۔ تم بھی کیا یاد کروگے۔" تو میاں میرے۔ میں نے کیا کیا رس کے گلاس میں ڈالی گیہوں کی بالی اور وہ میرا نخلنو کا بانکا نواب بے کھٹکے پی گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہوئی پیٹ میں کھدبد۔ جب تک وہ اٹھ کر جائیں اس وقت تک ان کا وہ چوڑی دار پیجامہ جو تھا وہ بن چکا تھا۔ بعد میں مجیب خاں کو خبر ہوئی تو پہلے بڑے بگڑے سنبھلے مگر پھر بولے۔ "تم نے اچھا کیا۔ بڑی دون کی لے رہے تھے۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "بات کچھ اور ہو رہی تھی تم نخلنو کے نواب کا قصہ لے بیٹھے۔" شوکت کہنے لگے۔ "میاں میرے۔ بگڑتے کیوں ہو۔ وہی تو سنا رہا ہوں۔ تو وہیں راجے پورے میں ایک لڑکی تھی۔ بس میاں میرے کیا کہوں۔ چلتی تو دھرتی کی چھاتی دھمکتی۔ بولتی تو کانوں میں رس گھل جاتا۔ ہنستی تو پھول کھل جاتے۔ جھولے پر پینگ لیتی تو معلوم ہوتا کوندا لہرا رہا ہے۔ پرستان کی پری معلوم ہوتی۔ گوری بھبھوکا رنگت۔ ہنسنے سے گال میں گڑھا پڑتا تھا۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ پان کھالیتی تو پیک کی سرخی گلے میں دکھائی دیتی۔ آنکھوں میں بجلی کی سی روشنی اور بال تو قیامت تھے قیامت۔ میاں میرے کیا کہوں۔" میں نے کہا۔ "سب کچھ تو کہہ دیا ہے۔ اچھے خاصے شاعر ہوگئے ہو۔" بولے۔ "ہاں میاں میرے سچ مچ شاعر ہوگیا تھا۔ بڑی غزلیں یاد تھیں۔ وہ چلے جھٹک کے دامن..... یاالٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل..... کسی کی خاک میں ملتی جوانی۔ اب تو سب کچھ بھول گیا۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔" میں نے چٹکی لی۔ "تو وہ لڑکی اگر تھی تو تم جیسے مس سے آدمی سے کیسے پیار کرنے لگی۔"

شوکت نے فوراً" پینترا بدلا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ کڑک کر بولے۔ "آج مس سے ہیں مگر آج بھی ماشاء اللہ" اللہ رکھے ہزاروں پر بھاری ہیں۔ میاں میرے جوانی میں مجھے دیکھتے۔" ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے۔ "اب کیا رہ گیا ہے۔ جوانی میں میرے کس بل دیکھتے۔ زمین میں ٹھوکر مار دیتا تو پانی نکل آتا۔ اماں باوا نے بڑے لاڈ سے پالا تھا۔ اصلی گھی کھاتا' خالص دودھ پیتا تھا۔ پہلوان بھی جھونک کھاتے۔ کسی کی مجال تھی جو آنجناب سے پنجہ لڑالے۔ بڑوں بڑوں کی ایسی تیسی کر دیتا تھا۔ ایک دفعہ قنوج گیا تو وہاں دو تین پہلوان آئے۔ بولے سنا ہے تم بہت بڑے پنجہ کش ہو۔ میں نے سوچا کون مصیبت میں پڑے۔ ان سے پنجہ لڑایا تو نجانے اور کتنے آن دھمکیں گے۔ بس تو میاں میرے۔ میں نے کہہ دیا نہیں بھائی میں پنجہ کش انجہ کش نہیں ہوں۔ ہاں ہی بھر لیتا تو انہیں جنم چھوڑ گھسینم میں پڑ جاتا۔" میں نے ٹوکا۔ "شوکت تم بہکتے بہت ہو۔" شوکت نے فوراً" کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "اسلم میاں ایک بات تھوڑی ہے۔ ہاں تو وہ مجھ پر جان دیتی تھی۔ بس چلتا تو میرے گلے کا ہار ہو جاتی۔ میں بھی اس کی محبت میں باؤلا ہو گیا تھا۔"" ارے میاں تو سیدھے سیدھے دو بول پڑھوا لیتے۔"..... "کیسے پڑھوا لیتا۔ یہی تو مشکل تھی۔ میاں میرے غیر قوم سے تھی۔" ..... "اچھا تو پھر۔" "پھر یہ میاں میرے صلاح ہوئی کہ چپ چاپ راتوں رات کہیں باہر نکل جائیں۔ مار پیچھے پکار ہوتی رہے گی اس کو سمجھا بجھا کر میں فرخ آباد گیا۔ سوچا کچھ بندوبست کچھ بیتا کر لوں۔ اماں باوا سے بھی مل لوں۔ گھر آیا تو اماں لب گور دس دن کا کہہ کر آیا تھا دو مہینے لگ گئے۔ پنجرے میں بند بلبل کی طرح پھڑپھڑاتا رہا۔ نجانے اماں کی جان کس چیز میں اٹکی ہوئی تھی۔ خدا خدا کر کے ان کی مشکل آسان ہوئی تو میں سویم کے اگلے دن ہی چل کھڑا ہوا۔ ابا نے بہت روکا۔ بگڑے' سنبھلے' بولے۔ چالیسواں کر کے جانا۔ ابھی سے کیوں جا رہے ہو۔ کل جی بھاوج نے بول مارا۔ جائیں گے کیسے نہیں۔ وہاں سنگل دیپ کی پدمنی جو ان کا راستا تک رہی ہے۔ آندھی بھونچال کی چال چلتا راجے پور پہنچا تو میاں میرے پہنچتے ہی دل پر ایک گھونسا لگا۔ ہر چیز اداسی میں ڈوبی ہوئی تھی جیسے گاؤں کو کوئی لوٹ لے گیا ہو۔ ملنے کے ٹھکانوں پر گیا تو وہاں ویرانی برس رہی تھی۔ بڑا حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر چیز پر اداسی کیوں چھائی ہے۔ گاؤں کی ایک آدھ لڑکی نے مجھے دیکھا تو دانت پیستی تیوری چڑھاتی غصے سے دیکھتی پیر پٹختی چلی گئی۔ میں حق حیران کہ آخر بات کیا ہے۔ ایک سے پوچھنا چاہا تو وہ تنک کر بولی۔ چل دھوکے باز۔ شہر جا کر وہیں کا ہو رہا۔ شرم نہیں آتی تجھے! جا کہیں ڈوب مر۔ یہاں شکل دکھانے سے تو تیرا ڈوب مرنا اچھا ہے۔ تو میاں میرے۔ میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ فدو بھی گیا ہوا تھا۔ اسے ساری بات معلوم تھی مگر وہ گھر پر تھا ہی نہیں۔ پوچھوں تو کس سے پوچھوں۔ خدا خدا کر کے وہ شام کو گھر آیا تو آتے ہی نہ سلام نہ دعا۔ بس مجھ پر برس پڑا۔ کیا ہوتوں سوتوں کے مروے شلا رہے تھے۔ دس دن کا کہہ کر گئے تھے اور اب دو مہینے بعد پلٹے ہو۔" "تو ہوا کیا؟" "ہونا کیا۔ چڑیا اڑ گئی۔ ......" "کیا......" فدو نے اٹک اٹک کر پوری بات بتائی۔ "اس کے ماں باپ کو شک تو پہلے ہی تھا۔ نکل بھاگنے کی بات اس کی ایک سہیلی نے جڑ دی۔ گاؤں کی عزت کی بات تھی۔ باپ نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات کی۔ ہتھیلی پر سرسوں جمائی۔ سگائی بچپن میں کر دی تھی۔

کمہ سن کر ہاتھوں ہاتھ گونا بھی کر دیا۔ وہ سدا کا روگی سینک سلائی آدمی گاؤں کی سندری کو لے اڑا۔ سنا ہے جاتے وقت چھکوں پھکوں رو رہی تھی۔ سارے رستے روتی گئی۔ سارا گاؤں سونا ہو گیا اور تو وہاں شہر میں رنگ رلیاں مناتا رہا۔ بڑا پاپی ہے۔ تیرا تو دل کالا ہے بالکل کالا۔"

"میاں میرے! کیا کہوں دل پر کیا گزر گئی۔ اس دن میں نے پیٹ بھر کر تاڑی پی۔ اول فول بکتا او کتا جب مجیب خاں کے گھر پہنچا تو انھوں نے دروازے کے اندر نہیں گھسنے دیا۔ صورت دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ فدو مجھے اپنے یہاں لے گیا۔ دنوں وہیں پاگل دیوانوں کی طرح پڑا رہا۔ روز روز تاڑی بھی نہیں ملتی تھی۔ افیم کھانے لگا اور میاں میرے ایک دن جھونج میں کیترا پی لیا۔" "کیترا کیا ہوتا ہے؟" "میاں میرے وہ حکیم امین الدین جو روز آتے ہیں جنھیں تم امین چچا کہتے ہو۔ ان سے پوچھنا کیترا کیا ہوتا ہے۔ اس لیے پی لیا کیترا کہ وہ تو مجبور ہو گئی تھی۔ میں بے وفا نہ کہلاؤں۔ عورت کے قابل ہی نہ رہوں۔ ساری زندگی اسی کے نام کی مالا جپتا رہوں۔ بس دے دی قربانی اپنی جوانی کی۔" "پھر کبھی ملاقات ہوئی اس سے۔" "بس دور سے دیکھا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ میاں میرے وہ جو اپنے بہادر شاہ تھے نا۔ ارے وہی نا جنھوں نے کہا ہے۔ مرا رنگ روپ بگڑ گیا۔ تو بس وہی بات تھی۔ گونے کے چھ مہینے بعد بے چاری بدحوا ہو گئی تھی۔ ساس سسرے نے گھر سے نکال دیا کہ ابھاگن ہے پتی کو کھا گئی۔ راجے پور میں کچھ دن سسکتی رہی پھر گذر گئی۔ جب اس کی چتا کو آگ لگائی گئی تو میں بھی دور سے دیکھ رہا تھا۔ آگ کے بڑے بڑے شعلے اسے بھی جلا رہے تھے اور میرا دل بھی جلا رہے تھے۔ وہ چلی گئی۔ اسے جل کر چین مل گیا۔ میں بدنصیب اب تک زندہ ہوں اور جل رہا ہوں۔" شوکت تقریبا روہانسے ہو کر اٹھ گئے اور میں سوچتا رہا۔ آدمی جی دار ہے۔ کسی دوسری عورت سے دل نہیں لگایا۔ وفاداری یہی ہوتی ہے۔ یک در گیر محکم گیر۔ پھر خیال آیا۔ یہ تو اچھی خاصی فلمی کہانی ہو گئی۔ پکی ٹریجڈی۔ شام کو تکن نے سلام کر کے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔" یہ بھی مولوی صاحب کے چیلے تھے۔ گرمیوں میں اسکول میں پنکھا کھینچتے تھے۔ جاڑوں میں کھیر کے پیالے بیچتے تھے۔ ان کی جورو اپلے میں گوشت رکھ کر گھر گھر بیچتی پھرتی تھی۔ بڑی جید عورت تھی۔ ایک دن تکن مولوی صاحب کے پاس پینک میں دنیا مافیہا سے غافل بیٹھے تھے۔ اتنے میں ان کا چھوٹا لڑکا آیا۔ ابا' ابا ایک پیسہ دے دے۔ تکن پینک سے چونک پڑے۔ لڑکے پر خوب خوخیائے' ڈانٹ کر اسے بھگا دیا۔ ذرا دیر میں تکن کی جورو اچار خانے کا تہمد باندھے۔ موٹا سا دوپٹہ لپیٹے' ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لیے آن دھمکی۔ ڈونگ کر بولی۔ "پیسہ کیوں نہیں دیتا ہے۔" تکن نے گھبرا کر تہمد کی انٹی سے پیسہ نکال کر پھینک دیا۔ ماں بیٹا دونوں دفع ہو گئے۔ تکن کی جورو کے تیور دیکھ کر تھرا مولوی صاحب بھی گئے تھے۔ جب وہ دفعان ہو گئی تو بولے۔ "بزرگوں نے اسی لیے عورتوں سے دور رہنے کو کہا ہے۔ جی کا جنجال ہوتی ہیں جی کا جنجال۔ مردمار' قطامہ' آنکھ میں کوئی حیا شرم نہیں۔"

ویسے تکن بھی کچھ کم نہیں تھے۔ بڑے جھوٹے لپاٹنے تھے۔ اسکول میں پنکھا کھینچنے کی تنخواہ سترہ روپے ملتی تھی۔ گھر والی کو گیارہ بتا رکھے تھے۔ ایک دن وہ کسی کام سے انھیں ڈھونڈتی ڈھکولتی اسکول

آمری۔ باہر کھڑے تھے اسکول کے بابوجی۔ ان سے کچھ بات ہوئی تو انھوں نے کہا۔ "سترہ روپے تو ملتے ہیں اور کیا کسی کا گھر لے گا۔" بس وہ وہاں سے تو چپکی چلی آئی مگر شام کو جب تمن گھر پہنچے تو اس نے سنبھالا ڈنڈا اور میاں تمن کی ساری شیخی کرکری کردی۔

شوکت اور تمن میں کچھ لاگ ڈانٹ بھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی کاٹ کرتے رہتے تھے۔ ہنسا" تمن کو اس بات پر تعجب ہوا ہوگا کہ میری اور شوکت کی اتنی لمبی بات کیوں ہوئی۔ میں نے جو پوچھا کیا بات ہے تو بولے۔ "اسلم میاں آج تو شوکت سے خوب گھلم میتھم ہوئی۔ کیا پٹی پڑھا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "پٹی کیوں پڑھا رہا تھا۔ اپنے عشق کا قصہ سنا رہا تھا۔" "جھوٹا۔ سالا۔ یہ کیا جانے عشق کس چڑیا کا نام ہے۔ سدا کا لپاڑیا ہے۔ جانے کیا ہانک رہا ہوگا۔" "نہیں۔ نہیں راجے پور کی کسی لڑکی کا واقعہ سنا رہا تھا۔" "اچھا وہ۔ میاں مجھ سے سنو۔ اماں باوا نے نکھٹو سمجھ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ راجے پور میں مجیب خاں کے گھر پڑا رہتا تھا۔ وہاں ایک لونڈیا پر ڈورے ڈالنے لگا۔ وہ اس سے جتنا دور بھاگتی یہ اتنا ہی چپکنے کی کوشش کرتا۔ وہ گی گاؤں کی پٹھیا' جوان 'جٹی کٹی' چکنی چپڑی' چٹکی لو تو بدن پر ہاتھ پھسل جائے اور یہ۔ سالے مجنوں کی اولاد۔ وہ منھ لگاتی نہیں تھی۔ یہ خواہی نہ خواہی کو نپذ پڑے جاتے تھے۔ تنگ آ کر ایک دن اس نے اپنے باپ بھائی سے کہہ دیا۔ وہ تھے کری اور شورہ پشت۔ ایک دن موقع دیکھ کر ان میاں کو پکڑ لیا اور ایسی ٹھکائی کی' ایسی ٹھکائی کی کہ بچہ جی کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ وہ تو خیر یہ ہوئی کہ کسی نے دوڑ کر مجیب خاں کو خبر کردی۔ وہ دوڑ پڑے۔ تنتو بھنتو کی۔ بڑی مشکل سے اس کی جان بچی ورنہ کری زندہ نہ چھوڑتے۔ ہلدی چونا تھپا اور مجیب خاں نے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا۔ بولے۔ میں ایسے لچے لفنگے کو اپنے ہاں رکھ کر مفت خدا کی بدنامی مول نہیں لے سکتا۔ یہ تو سدا کا بے غیرت ہے۔ کچھ دن بعد پھر انھیں کی جوتیاں چاٹنے لگا۔ وہاں جانے لگا۔ اب بھی جاتا ہے۔ یہ عشق کرے گا۔ نامرد۔ سالا۔ عورت کے قابل تو ہے نہیں۔ عشق کرے گا۔ جوتے خور۔ نکھٹو۔" تمن دل کا بخار نکالتے رہے مگر مجھے یقین ہو گیا کہ شوکت جھوٹا نہیں ہے۔ تمن نے جو کچھ کہا بھناس ہو کر کہا اور الاطونی ہانکی۔

اتفاق سے دوسرے دن سویرے سویرے امین چچا آدھمکے۔ فتح گڑھ میں وہ حکیم سیلانی مشہور تھے۔ کیمیا کے دھتی تھے سارے سارے دن جڑی بوٹیوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہتے تھے۔ گھر میں ہوتے تو چولھے پر کچھ نہ کچھ پکاتے رہتے مگر ایک آنچ کی کسر ہمیشہ رہی۔ ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے۔ "بیٹا سونا تو کب کا بن جاتا مگر سمجھ میں نہیں آتا' بوقلموں کہاں سے لاؤں۔" میں نے کہا۔ "گرگٹ بے شمار نظر آتے ہیں۔ وقت کیا ہے۔ جتنے چاہے پکڑ لیجیے۔" حیران ہو کر کہنے لگے۔ "اچھا بوقلموں گرگٹ کو کہتے ہیں۔" "بس پالا مار لیا۔ مگر ایک آنچ کی کسر پھر بھی رہی۔ ان دنوں وہ ڈھورو جنتر کے چکر میں تھے۔ سب سے پوچھتے رہتے تھے۔ "ڈھورو جنتر کبھی سنا ہے؟" شامت اعمال۔ ایک دن بھائی جان سے بھی پوچھ بیٹھے۔ "ڈھورو جنتر سنا ہے؟" بھائی جان نے کہا۔ "ہاں ہاں۔ کیوں نہیں سنا۔ ڈھور ڈنگر کو جمع کرنے کے لیے جو آواز نکالی جاتی ہے اس کو ڈھورو جنتر کہتے ہیں۔" امین چچا نے یہ فقرہ سنا اور چپکے ہو رہے۔ اس وقت میں

نے ان سے پوچھا۔ "کیترا کیا ہوتا ہے؟ کیا خواص ہیں؟" انھوں نے مجھے تعجب سے دیکھا، بولے۔ "میں نے تم سے بارہا کہا ہے۔ طب کی دوچار ابتدائی کتابیں دیکھ لو۔ اور یہ کیترے کے خواص کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ مزاجاً" سرد خشک ہے۔ مانع خشونت سینہ و حلق ہے۔" "اور....." "اور کیا؟"..... "میاں کتاب دیکھ لو۔" "میں سمجھ گیا' یہ اپنی زبان سے بتانا نہیں چاہتے۔ شوکت سچ کہتا ہے۔ کیترے میں ضرور کوئی مرد شکن خاصیت ہے۔

اس گفتگو کے تین چار دن بعد شوکت کوٹھی کے پھاٹک پر کھڑے تھے۔ سامنے سے دیہاتیوں کا ایک غول جا رہا تھا۔ بولے۔ "اسلم میاں تماشا دیکھو گے۔" میں نے کہا۔ "ضرور"۔ انھوں نے پھاٹک سے ملی ہوئی حافظ عبدالرشید عطار کی دکان سے شربت کی ایک خالی کلھیا لی۔ عورتوں کے غول کے پیچھے ہو لیے۔ پھر انھوں نے آہستہ سے وہ کلھیا اس طرح لڑھکائی کہ وہ ایک لڑکی کے پیر میں لگی۔ لڑکی نے پلٹ کر دیکھا۔ ہنسی اور آگے بڑھ گئی۔ شوکت بولے۔ میاں میرے ہنسی تو...... سمجھتے ہو۔ پھر ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گئے۔ ذرا دیر بعد خود ہی خود بڑبڑانے لگے۔ "اب اور کیا رہ گیا ہے۔ کلھیا میں گڑ چھوڑنا اور خوش ہو جانا۔ ہت تیرے نصیب کی۔"

ایک دن شوکت کی طرم خانی دھری رہ گئی۔ برس کے برس ایک ایسا تیوہار آتا تھا جس میں دیہاتی عورتیں غول در غول' سوپ ہاتھ میں لیے۔ ناچ پھنکتی' گالیاں گاتی شہروں اور قصبوں کا رخ کرتیں جو سامنے پڑ گیا اسی پر گالیاں پڑنے لگی۔ اکے والے' تانگے والے۔ راہ گیر' دکان دار' فقیر' چھوٹے بڑے سب ان گالیوں کی زد میں آتے۔ کچھ خیال بھی نہ کرتے۔ بازار کی گالی ہنس کر ٹالی۔ اتفاق سے اسی تیوہار کا دن تھا۔ شوکت منو میاں کی چینکوں کے گرما گرم گولے کھا کر بھرائے ہوئے پھیری کے لیے جو باہر نکلے تو دیہاتنوں کے ایک غول نے انھیں گالیوں پر دھر لیا۔ گھبرا کر دوسری طرف بھاگے تو وہاں دوسرا غول جو پہلے غول سے بھی بڑا تھا سہرے والے کی مدح خوانی کو تیار تھا۔ دوسری طرف سے بھی مسی اور ایکڑ والے کے لیے محبت کا حرف نا سزا بلند ہو رہا تھا۔ شوکت کبھی ادھر بھاگتے کبھی ادھر جاتے۔ جدھر جاتے وہ نغمۂ شیریں سنتے کہ روح پر وجد طاری ہو جاتا۔ جب یہ دیکھا کہ کہیں جائے فرار نہیں ہے۔ دیہاتنیں ہنس ہنس کر انھیں چٹکیوں اور گالیوں میں اڑا رہی ہیں تو گھبرا کر کوٹھی کے پھاٹک میں پناہ لی۔ کہنے لگے۔ "ہت تری قسمت کی ایسی تیسی۔" دالان میں آئے تو مولوی صاحب نے پوچھا۔ "گئے نہیں۔" بولے۔ "گیا تھا مگر وہ چنڈالنیں پیچھا چھوڑتیں تو آگے بڑھتا۔ سالیوں نے کوئی گالی نہیں چھوڑی۔ اب یہ دن آن لگا ہے کہ دیہاتنیں ہمیں گالیاں سنا رہی ہیں۔ نہ ہوا اگلا سا زمانہ۔ نہیں تو سالیوں کے کلے چیر ڈالتا۔ کوئی مرد ہوتا تو بتاتا۔ ان نکھیائیوں کے منھ کون لگے۔"

شوکت کبھی کبھی دورے پر بھی جاتے تھے۔ راجے پور چلے گئے۔ اللہ گنج چلے گئے۔ اندر گڑھ پہنچ گئے۔ گنگا پار خوب گھومتے تھے۔ اس علاقے سے انھیں بڑا لگاؤ تھا۔ کمال گنج کا پھیرا ابھی کر لیتے تھے۔ مگر نہیں تے تو تین میل دور شہر۔ فتح گڑھ والے فرخ آباد کو شہر کہتے تھے۔ فرخ آباد والے فتح گڑھ کو کمپو کہتے

تھے۔ مرتے مر گئے مگر لال دروازے کے اندر قدم نہیں رکھا۔ ساری دنیا میں ہنڈتے پھرتے مگر فرخ آباد کے قریب بھی نہ پھٹکتے۔ گلی محلّہ تو کیا شہر ہی چھوڑ دیا۔ بھائی جب آتے۔ منت سماجت کرتے۔ بھتیجا سبقت بھی محبت سے بلاتا مگر شوکت سنی ان سنی کر دیتے۔ بھاوج کا بول دل میں زہری بان بن کر اتر گیا تھا۔ "کاہے مارے بول"۔ احمد چھٹے چھماہے ان کے پاس آنکلتے تھے۔ شوکت اپنے تخت سے احمد کو آتے دیکھتے تو بڑبڑاتے۔ "آگئے خدائی خوار۔ اب انھیں دونوں وقت کھانا ٹھساؤ۔ بڑے بڑے نوالے ہڑپ کریں گے۔ بھر بھر قدے چائے ڈھکوسیں گے۔ انیم کھائیں گے اور پھر وہی مدت کا چلہ ہاتھ میں۔" اتنے میں احمد صحن پار کر کے قریب آپہنچتے۔ شوکت بندر کی طرح چھلانگ مار کر آگے بڑھتے۔ "ارے میرا بھیا آگیا۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔" دوڑ کر گلے لگ جاتے۔ احمد سر پر ہاتھ پھیرتے۔ دعائیں دیتے۔ سبقت ساتھ ہوتا تو شوکت اسے بھی گلے لگاتے۔ احمد بڑھ کر مولوی صاحب کو سلام کرتے اور بیٹھ جاتے۔ بالکل منیا پھوس تھے۔ بھویں تو بھویں پلکیں تک سفید تھیں۔ چھوٹے سے قد کے پاکٹ سائز والے آدمی تھے۔ دیکھ کر یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ زور سے ہوا چلی تو اڑ جائیں گے مگر بیٹا سبقت چھاڑ پہاڑ تھا۔ لمبا چوڑا۔ جوانی میں شوکت بھی ایسے ہی ہوں گے۔ سبقت کے نام سے بھی یہ گمان ہوتا تھا کہ شوکت کے نام پر رکھا گیا ہے۔ احمد تھے تو منیا پھوس مگر بڑے کائیاں اور خوراک بھی بڑی ڈبل تھی۔ شوکت سے دگنی تگنی۔ آتے ہی اندر سلام کہلواتے۔ "آپا سے سلام ضرور کہہ دینا۔" آپا جگت آپا تھیں بیگم صاحب نہیں تھیں۔ ہمارے خاندان میں بیگم صاحب صرف اماں جان، ہماری دادی تھیں۔ آپا سلام سن کر ہنستیں۔ "لو۔ اور سنو۔ یہ مردا بھی مجھے آپا کہتا ہے۔" سلام دراصل اس بات کا اعلان ہوتا تھا کہ ہم نازل ہو گئے ہیں۔ ہمارا کھانا بھی دونوں وقت آنا چاہیے۔ شوکت کے کھانے کے ساتھ ان کا کھانا بھی آتا۔ دونوں بھائی کھانے بیٹھتے۔ احمد واقعی بہت بڑے بڑے نوالے کھاتے تھے۔ خدا معلوم نکلتے کیسے تھے۔ سوکھی چپاتی کرتے تھے۔ کیا مجال جو کھانے کے بیچ میں ایک بوند پانی پی لیں۔ پانچ چھ روٹیاں آسانی سے ڈکار جاتے تھے۔ شوکت منہل منہل کر دو روٹیاں حلق کے نیچے اتارتے۔ سبقت بھی کھانے میں احمد کی حقیقی اولاد تھا۔ احمد کو مہمان سمجھ کر مولوی صاحب انیم بھی بلوا دیتے تھے۔ احمد آتے تو سدا بسورتے ہوئے۔ کنگھیاں بناتے تھے۔ سدا یہی روتا روتے رہتے کہ جاپان والے بڑے خبیث ہیں۔ ربڑ کی کنگھیاں بنا بنا کر بھیجتے ہیں۔ سینگ کی کنگھیوں کو اب کوئی نہیں پوچھتا۔ سالوں نے منہ سے رزق چھین لیا ہے۔ مولوی صاحب صلاح دیتے۔ "کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے۔" احمد بسور کر جواب دیتے۔ "میاں کوئی اور کام آتا ہی نہیں ہے۔" تین چار دن موج کرنے کے بعد احمد جب رخصت ہوتے تو شوکت سے ایک آدھ روپیہ بھی جھاڑ لیتے۔ چلتے وقت شوکت کو یاددہانی کراتے۔ "گھر ہو جاؤ۔ تمہاری بھاوج تمھیں بہت یاد کرتی ہیں۔ تم نے تو جیسے قسم کھالی ہے۔ کتنا کتنا کہا۔ کماشدا کے بیاہ میں بھی نہیں آئے سارا گھر سونا سونا معلوم ہوتا تھا۔" شوکت سرہلا کر کہتے۔ "بس دو چار دن میں پھیرا کر دوں گا۔ ہاں! کماشدا اپنے اپنے گھر خوش تو ہیں۔ کوئی بال بچہ؟" احمد آنے کا وعدہ لے کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چل دیتے۔ شوکت انھیں اکیوں کے اڈے پر چھوڑ کر کہتے جھجکتے واپس

آجاتے۔

ایک دفعہ شوکت گنگا پار گئے ہوئے تھے۔ گئے تھے بات کو رہ گئے رات کو۔ ہفتے دس دن کا کہہ گئے تھے۔ ایک مہینہ ہوگیا۔ ایک دن بھائی جان کو خیال آیا۔ مولوی صاحب سے پوچھا۔ "شوکت نظر نہیں آتا۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "احسن میاں! ایک ہفتے کا کہہ کر گنگا پار گیا تھا۔ ایک مہینہ ہوگیا ہے۔" بھائی جان کچھ فکرمند سے ہوگئے۔ کہنے لگے۔ "بیمار ویمار ہوگیا ہوگا۔" پھر مجھ سے بولے "تم صبح راجے پور چلے جاؤ۔ اسے لے آؤ۔" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں گرمیوں کی چھٹیوں کی ابتدا تھی۔ گھر میں بور ہو رہے تھے۔ دوسرے دن صبح سویرے گھٹیا گھاٹ کے کشتیوں والے پل سے گنگا عبور کی۔ دوپہر کو راجے پور پہنچے۔ بڑی کوفت ہوئی۔ معلوم ہوا کہ شوکت یہاں سے آٹھ میل دور کسی اور موضع میں ہیں۔ شام تک وہاں پہنے۔ شوکت وہاں بھی نہیں تھے پھیری پر نکل ہوئے تھے۔ دو چار آدمی اوھر اودھر دوڑائے گئے اور شوکت ہانپتے کانپتے آپہنچے۔ خوشی سے باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ "میاں نے بلایا ہے۔ سنا! میاں میرے۔ یاد آتا چاہتے ہیں شوکت کو۔ ایک مہینے سے نہیں دیکھا تو اسلم میاں کو بھیجا۔ جاؤ لے آؤ جاکر۔ میاں میرے! یہ ہوتی ہے محبت اور میاں میرے خاندانی رئیسوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔" پھر انھوں نے سنایا کہ ایک دن عین دوپہریا میں پھیری لگانے نکلے تو لُو لگ گئی۔ بے ہوش پڑے رہے۔ خدا خدا کرکے ٹھیک ہوئے ہیں۔ شام کو بڑے زور کا کھانا ہوا۔ اتوار کا دن تھا اس لیے گوشت تو ملا نہیں۔ کھانے میں ارد کی دال تھی۔ بھربری۔ ایک ایک دانہ گھی میں تر بتر۔ انڈوں کا سالن۔ گھی سینکی گرماگرم روٹیاں۔ چپڑی اور دو دو۔ خربوزے تھے۔ بیبا پور کے تو نہیں تھے مگر شہد میں ڈوبے۔ آم تھے۔ رات کو سوتے وقت بھینس کا خالص دودھ۔ خوب کڑھا ہوا۔ بالائی دار۔ دوسرے دن ہم لوگ سویرے سویرے نکلے۔ شام ہوتے ہوتے گھر آگئے۔ بھائی جان شوکت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ شوکت تھے کہ خوشی کے مارے ان کے پیروں میں لوٹے جارہے تھے۔ میاں میرے۔ میاں میرے کی رٹ لگائے تھے۔ بھائی جان نے خلافِ عادت شوکت کی حسبِ خیال سنسنی خیز تقریر بھی دل لگا کر سنی۔

شوکت کبھی کبھی کمال گنج کا پھیرا بھی کرتے تھے۔ یہ قصبہ فتح گڑھ سے نو میل کے فاصلے پر ہے۔ محمد خاں بنگش کے چیلے کمال خاں کا آباد کیا ہوا۔ سنا ہے شاہی عہد میں یہاں پانوں کی بڑی منڈی تھی۔ ہمارے زمانے میں منڈی ونڈی ختم ہوچکی تھی۔ منگل اور جمعے کو پینٹھ لگتی تھی۔ یہاں کے ایک حلوائی پیارے کی دکان کی گجیاں بھائی جان کو بہت پسند تھیں۔ کھویا ہی کھویا ہوتا تھا۔ منہ میں رکھا اور گھل گیا۔ پیارے یہ گجیاں آٹھ آنے سیر بیچتا تھا مگر بھائی جان سے چھ آنے سیر کے دام لیتا تھا۔ بعد میں وہ کھوئے کی منڈی میں تولا ہوگیا تھا۔ مٹھائی کا کام چھوڑ دیا تھا۔ بھائی جان ہمیشہ اس بات پر افسوس کرتے تھے۔ کمال گنج کے نمبردار واجد خاں بھائی جان کے بڑے گاڑھے دوست تھے۔ دونوں کے مزاج بالکل الگ تھے مگر دوستی پکی تھی۔ واجد خاں نمبردار بھی تھے' پہلوان بھی تھے۔ گھٹا ہوا سر' ٹوٹے ہوئے کان' شیر کا سا کلہ جبڑا' چوڑا سینہ' چوڑا چکلا ہاڑ۔ بڑے بڑے اور مضبوط ہاتھ پیر مگر شراب کے دھتی تھے۔ بہت پیتے تھے۔ ڈٹ کر پیتے

تھے۔ شرابی کبابی نمبردار کی زمین داری جائیداد سب شراب ۔ جیلے نا۔ جاتی 'مرخدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اکلوتا بیٹا ماجد خاں باپ کے بالکل الٹ نکلا۔ وہ شرابی یہ پارسا۔ وہ فقط کالے اچھر پہچانتے تھے اس نے اپنے شوق سے بھائی جان کی نگرانی میں میٹرک پاس کرلیا۔ باپ لکھ لٹ تھے اس نے قصبے میں بساط خانے کی بڑی سی دکان کھول دی۔ باپ کا دست نگر نہیں رہا۔ آلو کا کاروبار شروع کردیا بڑی ترقی کی۔ باپ طنزا" کہا کرتے تھے راج پوت گھرانے میں سالا بنیا پیدا ہوا ہے۔ سالے بیٹے نے اپنے لیے دو منزلہ مکان بنوالیا۔ خاندانی جائیداد جو واجد خاں کی رنگ رلیوں کی وجہ سے رہن تھی چھڑالی۔ سارے قصبے میں واجد خاں کی بدمستیوں اور ماجد خاں کی بھلمنساہٹ کی دھوم تھی۔

ہم لوگ بھی اکثر کمال گنج جاتے رہتے تھے۔ لاری سے۔ اکیلے سے۔ ریل سے۔ شام کے پونے چار بجے ریل ادھر جاتی تھی۔ پینٹھ کے دن ساڑھے تین بجے گھر سے نکلے۔ ریل میں بیٹھے۔ چار بجے کمال گنج پہنچے۔ اسٹیشن قصبے ہی میں تھا۔ بازار کا چکر لگایا۔ وہیں واجد خاں مل گئے۔ خاطر تواضع ہوئی پھر ماجد خاں کی دکان پر جا کر بیٹھ گئے۔ بھائی جان اپنے دوست داروغہ اولاد احمد سے ملنے پولیس اسٹیشن چلے گئے میری اور ماجد خاں کی اچھی گفتنی تھی۔ مغرب کے بعد کھانا ہوا۔ بات چیت ہوئی۔ ساڑھے آٹھ بجے اٹھے۔ اسٹیشن آئے۔ ٹھیک پونے نو بجے ریل آئی اور ہم لوگ سوار ہو کر نو بجے فتح گڈھ پہنچ گئے۔ سفر بھی ہوگیا۔ تفریح بھی ہوگئی۔

ایک شام ہم لوگ کمال گنج پہنچے تو حسب معمول واجد خاں سے بازار میں ملاقات ہوئی۔ کرسی پر ڈٹے ہوئے تھے اور کسی قدر سرور کے عالم میں تھے۔ یہ ذرا چونکا دینے والی بات تھی کیوں کہ ان دنوں صوبے میں کانگریسی وزارت تھی۔ اس وزارت نے صوبے کے بعض اضلاع میں نشہ بندی کر رکھی تھی۔ فرخ آباد بھی ان اضلاع میں شامل تھا۔ نشہ بندی کے باوجود واجد خاں کا سرور کے عالم میں ہونا واقعی چونکا دینے والے بات تھی مگر یار کی یاری سے کام یار کے فعلوں سے کیا کام کے مطابق بھائی جان کچھ بولے نہیں۔ واجد خاں کے پاس ہی شوکت زمین پر پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ آگے پیچھے پھرتے رہے۔ پھر ہم لوگ ماجد خاں کی طرف چل دیے۔

اس شام کھانے کے بعد باتوں کا سلسلہ ذرا طول کھینچ گیا۔ ہم لوگ دوڑتے بھاگتے اسٹیشن پہنچے تو "گاڑی گزر چکی تھی پٹری چمک رہی تھی۔" پیچھے پیچھے ماجد خاں بھی تیز تیز قدموں سے چلتے آئے۔ بولے۔ "آج رات یہیں رہیں۔ صبح چلے جائیے گا۔ ویسے تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی لاری بھی جائے گی مگر آپ لاری سے نہ جائیں۔" ہم باپ بیٹے ان کے ساتھ واپس چلے گئے۔ انھوں نے اپنے آبائی مکان میں ڈیوڑھی کے پاس والا بڑا کمرا کھلوایا۔ اس میں چھ سات پلنگ بچھے تھے۔ پلنگوں پر صاف ستھرے بستر خوب اچھی روئی بھرے بڑے بڑے لحاف جن پر فرخ آباد کے ریشمی ابرے۔ صاف ستھرا بڑا سا لیمپ۔ رات کو خاصی دیر تک بات چیت ہوتی رہی پھر ماجد خاں سامنے اپنے مکان میں چلے گئے۔ ہم لوگ اپنے اپنے پلنگ پر دراز ہوگئے۔ اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور واجد خاں ڈوگمگاتے ہنکارتے ہاتھ میں بوتل لیے اندر داخل

ہوئے۔ پیچھے پیچھے گلاس لیے ہوئے شوکت۔ واجد خاں شام کو سرور کے عالم میں تھے مگر اس وقت بھائی جان کے بہ قول "آدمی سے الو بنے ہوئے تھے۔" نشے میں لہرا رہے تھے۔ بوتل شوکت کی طرف بڑھا کر بولے۔ "جلدی لا۔" شوکت نے گلاس بھر کر ان کے حوالے کیا اور وہ آہستہ آہستہ پینے لگے۔ ایکا ایکی ان کی نظر ہم دونوں پر پڑی۔ تھوڑی دیر تک تکتے کے عالم میں رہے۔ خالی گلاس شوکت کی طرف بڑھا دیا اور آنسوؤں سے رونے لگے۔ "لعنت ہو ہمارے اوپر۔ لعنت ہو ہمارے اوپر۔ بیٹا لیٹا ہوا ہے۔ "ماشٹر" لیٹے ہوئے ہیں اور ہم بمن .... شراب پی رہے ہیں۔ لعنت ہو ہم پر۔" بھائی جان میٹرک پاس کر کے گورنمنٹ اسکول فتح گڑھ میں ماسٹر ہو گئے تھے۔ ابا میاں بڑے ناراض ہوئے۔ بہت بگڑے مگر بھائی جان اسکول میں پڑھاتے رہے۔ ابا میاں کی گھڑکیاں اور ڈانٹ ڈپٹ جو کام نہ کر سکی وہ ترک موالات کی تحریک نے کیا۔ نان کو آپریشن شروع ہوا تو بھائی جان نے بہت سے نوجوان مسلمانوں کی طرح فوراً "استعفیٰ دے دیا مگر سارا شہر انھیں ماسٹر صاحب کہتا رہا۔ واجد خاں بھی انھیں "ماشٹر" ہی کہتے تھے۔ اب واجد خاں ہیں کہ پئے جا رہے ہیں اور روئے جا رہے ہیں۔ یہی رٹ لگی ہے کہ لڑکا لیٹا ہوا ہے۔ "ماشٹر" لیٹے ہوئے ہیں اور ہم سالے پئے جا رہے ہیں۔ ایکا ایکی شوکت کی طرف جھک پڑے۔ یہ سب اس سالے شوکت کی شرارت ہے۔ پیر سے جوتا اتار کر دھڑا دھڑ شوکت کے سر پر مارنے لگے۔ شوکت ہیں کہ چپ چاپ جوتے کھا رہے ہیں اور نمبردار آنسو بہا رہے ہیں۔ بین کر رہے ہیں اس وقت شوکت کی وہی مثل تھی کہ ناحق چوٹ جلا ہے کھائے۔ بوتل ختم ہو گئی تو بھائی جان نے واجد خاں سے کہا۔ "واجد اب تم سو جاؤ۔" واجد خاں پھر بنکارے۔ "سو کیا جاؤں۔ ارے کیا منھ دکھاؤں تم لوگوں کو۔ زہر کھالوں۔ موت آجائے۔ لڑکا کیا کہے گا دل میں۔" بھائی جان نے سہارا دیا۔ ایک طرف سے شوکت نے ہاتھ لگایا۔ نمبردار کو بستر پر ڈھکیلا پھر بھائی جان نے شوکت کو ڈانٹا۔ لیٹ کیوں نہیں جاتے۔ شوکت فوراً "گڑی مڑی ہو کر نیچے دری پر پڑ رہے۔ نمبردار کب لیٹے کب سوئے یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر میں نے یہ ضرور دیکھا کہ ماجد خاں بت بنے دروازے میں کھڑے ہیں۔ ان کا بس چلتا تو اپنی اور واجد خاں کی جان ایک کر دیتے۔

صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو واجد خاں بے سدھ پڑے زور زور سے خراٹے لے رہے تھے۔ شوکت دری پر سکڑے پڑے تھے۔ ناشتے کے بعد ہم لوگ صبح نو بجے والی ٹرین سے واپس آگئے۔ شوکت دس پندرہ دن غائب رہے۔ اس کے بعد چپ چاپ لوٹ آئے مگر بھائی جان کے سامنے نہیں پڑے چوروں کی طرح چھپتے رہے۔ کب تک چھپتے رہتے ایک دن سامنا ہو گیا بھائی جان نے ان سے کچھ کہا نہیں۔

شوکت موقع محل کی مناسبت سے بل بلاتے بھی تھے اور بلبلاتے بھی تھے۔ بل بلانا اس وقت ہوتا جب وہ اپنی اہمیت جتاتے اور بلبلاتے اس وقت تھے جب ہم میں سے کسی کو تکلیف میں دیکھتے۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ دوپہر کے سناٹے میں ایک لڑکے نے چھوٹے دالان میں رکھی ہوئی ایک الماری کا تالا توڑ لیا۔ اس کی شامتِ اعمال شوکت پینگ سے چونکے تو ان کی نظر پڑ گئی۔ اب جو وہ بل بلائے ہیں تو سارے پاس پڑوس کے آدمی جمع ہو گئے۔ شوکت ہیں کہ بنکار رہے ہیں۔ پولیس والے آگئے۔ ایکا ایکی شوکت کو کچھ خیال آیا۔

زنانے مکان کی طرف دوڑے اور جو بلبلا بلبلا کر پکارنا شروع کیا ہے تو بھائی جان گھبرا کر باہر نکل آئے۔ شوکت نے انھیں چھوٹے والان کی طرف کھینچا۔ بھائی جان کو جب پوری بات معلوم ہوئی تو انھوں نے چاہا کہ لڑکے کو چھوڑ دیا جائے کیوں کہ وہ پاگل مشہور تھا مگر پولیس والے اسے پکڑ کر لے گئے۔ مقدمہ چلا۔ اس لڑکے کو تین مہینے کی سزا ہو گئی۔ مقدمے میں خاص گواہ شوکت تھے جو زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ عدالت میں پیش ہوئے۔ سنا ہے کہ جب وہ عدالت میں میاں میرے' میاں میرے کی گردان کرتے تو حاکم عدالت انھیں تنبیہہ کرتا مگر شوکت تو شوکت تھے اپنی ہی کہتے رہے۔

۳۶ء میں مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ آپا کہتی تھیں کہ جب ۱۹۱۸ء میں بیاہ کر لکھنؤ سے فتح گڈھ آئی تھی تو مولوی صاحب مہمان کی حیثیت سے موجود تھے۔ مولوی صاحب کے مرنے سے شوکت پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بالکل بے سہارا ہو گئے۔ افیم کا آسرا بھی جاتا رہا۔ پیسے کوڑی کو جو سہارا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں ان دنوں لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ واپس آکر شوکت کو دیکھا تو افسوس ہوا۔ ان کی حالت پر نہیں بلکہ صبح شام کی رونق اور مجمع کے اجڑنے پر۔ مولوی صاحب روزانہ صبح "مدینہ" اخبار بہ آواز بلند پڑھتے تھے۔ دو چار سننے والے بھی ہوتے تھے۔ یہ شغل کوئی دو گھنٹے جاری رہتا تھا۔ بیچ بیچ میں فال کھلوانے اور تعویذ لینے والے بھی آتے رہتے مگر اخبار کی پڑھائی جاری رہتی۔ "مدینہ" ہفتے میں دوبار شایع ہوتا تھا' اس کی لوح پر عزیز لکھنوی کا شعر۔

معجزہ شق القمر کا ہے مدینے سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے آپ کو آغوش میں

چھپا ہوتا تھا۔ مولوی صاحب نے ایک دن اس شعر کو مہمل قرار دیا تھا۔ مولوی صاحب کی صبح کی محفل خاص تھی' خاص خاص لوگ آتے تھے۔ شوکت اس میں مارے باندھے شریک ہوتے تھے کیوں کہ اخبار کے مضامین ان کے سر سے گزر جانے والی چیز تھے۔ شام کی محفل میں مجمع زیادہ ہوتا تھا مگر مولوی صاحب کے اٹھ جانے سے دونوں محفلیں اجڑ گئیں۔ کچھ دن تک صبح اور شام کچھ لوگ جمع ہوتے رہے۔ بھائی جان اخبار بھجوا دیتے تھے۔ وحید خاں نے کچھ دن پڑھ کر سنایا پھر وہ قایم گنج چلے گئے اور کوئی پڑھنے والا تھا نہیں۔ شام کو بھی یہی صورت پیش آئی۔ چائے تو خیر جوں توں کر کے بن جاتی مگر طلسم ہوش ربا کون سنائے۔ رفتہ رفتہ دالان میں سناٹا ہو گیا صرف شوکت رہ گئے یا فقیر محمد خاں۔ فقیر محمد خاں نے اپنی وضع داری نہ چھوڑی۔ روزانہ دوپہر کو سائیکل پر یاقوت گنج سے آنا' دالان میں لیٹنا بیٹھنا' حقہ گڑگڑانا' افیم پینا' شام کو مقصود کی دکان پر چائے پینا اور پھر واپس جانا۔ فقیرے ددو کے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا' جس طرح مولوی صاحب کی زندگی میں آتے تھے اسی طرح آتے رہے۔ باقی لوگ رفو چکر ہو گئے۔ کوئی ٹھیا نہیں رہا۔ کبھی کبھی کوئی آن ٹپکتا تو بھائی جان بڑی توجہ سے اس کا حال سنتے۔ شوکت بھی لنگوٹی لگائے آبیٹھتے۔ آنے والے کو چائے پلوانے میں بڑی مستعدی دکھاتے مگر ان کی حیثیت ہارے ہوئے لشکر کے آخری سپاہی کی سی ہو گئی تھی نہ میدان' نہ ہتھیار' نہ ساتھی اور نہ دشمن کیوں کہ ان کی حالت دیکھ کر منو

میاں اور مقصود دونوں نے ان پر فقرے کسنا بند کردیے تھے اور وہ خود بھی ہر وقت منھ لٹکائے رہتے تھے۔ پھیری کو نکلتے تو آواز میں کرارا پن نہ ہوتا۔ مول تول میں بھی جھگڑا کم کرتے تھے۔ کئی کئی دن پھیری پر نہ جاتے۔ تخت پر لیٹے بیٹھے اونگھتے رہتے۔ احمد اور سبقت خیر خیریت کو آتے تو انھیں دیکھ کر بھی گم سم بیٹھے رہتے۔ سیدھے ہاتھ میں رعشہ آگیا تھا۔ بھائی بھی کم دیتا تھا۔ ایک دن بڑے رازدارانہ طریقے سے مجھ سے کہنے لگے۔ "میاں میرے یہ رعشہ رعشہ نہیں ہے۔ مولوی صاحب زندہ تھے تو کسی جن کی مجال نہیں تھی کہ شرارت کرسکے۔ وہ اٹھ گئے تو کسی جن نے یہ شرارت کی ہے۔ اب میاں میرے کوئی توڑ کرنے والا تو ہے نہیں۔ ساری زندگی کو روگ لگ گیا۔ ہائے مولی صاب۔ ہائے مولی صاب۔"

ایک شام شوکت کوٹھی سے نکل کر مقصود کی دکان جارہے تھے۔ کم دکھائی دینے کی وجہ سے کنارے کنارے چل رہے تھے سامنے سے ایک نوسکھیا اناڑی سائیکل لہراتا آرہا تھا ایک دم سے شوکت کے سامنے آگیا بدحواسی میں سائیکل ان کے اوپر چیل دی۔ شوکت وہیں ڈھیر ہوگئے۔ راہ گیر، دکان دار دوڑ پڑے۔ بعض نے اس نوسکھنیے کی پٹائی شروع کردی۔ کسی نے دوڑ کر بھائی جان کو خبر کی۔ بھائی جان شوکت کو فوراً ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر ان کا دوست ہیڈ کمپاؤنڈر مولوی ہدایت اللہ جنھیں سب لوگ میاں کہتے تھے روز کے آنے والے۔ ایکس رے ہوا۔ معلوم ہوا کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ آپریشن ہوا۔ بڑی عمدہ دیکھ بھال ہوئی۔ بڑی توجہ سے علاج ہوا۔ کچھ دن بعد شوکت ہسپتال سے فارغ کردیے گئے۔ خدا معلوم ہڈی صحیح جڑی نہیں یا کوئی اور بات ہوئی کہ شوکت چلنے کے بجائے گھسٹنے لگے۔ دن بھر دالان میں پڑے رہتے۔ دوپہر کو فقیر محمد خاں آجاتے ان سے باتیں کرتے رہتے۔ کچھ دکھ سکھ بیان کرتے۔ کچھ زمانے کی بے وفائی اور کچھ مولوی صاحب کا تذکرہ ہوتا۔ شام ہوتی تو گھسٹتے، کڑھتے مقصود کی دکان پر جا پہنچتے۔ ایک کونے میں بیٹھے رہتے۔ مقصود نے لاکھ چاہا کہ ان سے چائے کے پیسے نہ لے مگر وہ تو ناک پر مکھی بیٹھنے کے روادار نہیں تھے۔ چائے پینے سے پہلے اکنی نکال کر مقصود کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ پیسے آتے کہاں سے تھے۔ یہ ایک معمہ تھا۔ میں نے کئی بار بھائی جان سے پوچھا مگر وہ ہنس کر خاموش ہوجاتے اور اگر کچھ کہتے تو یہ کہ "میاں اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔ کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما۔" میرا خیال ہے کہ وہ برملا اظہار سے اپنی نیکی کا ثواب ضایع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

صبح کو روزانہ بڑی پابندی سے بجن اور جناب علی، شوکت کے پاس آتے۔ بجن ان کے لیے پوست کے چھلکے بھی لاتے تھے۔ جناب علی انھیں ابالتے اور شوکت انھیں نوش فرماجاتے۔ ہفتے عشرے میں تمن بھی پھیرا کرتے تھے۔ دو چار باتیں جلی کٹی کہتے۔ شوکت کھسیا کر کہتے۔ "مرے کو ماریں شاہ مدار۔ تم مجھے جلانے کیوں آتے ہو۔" احمد اور سبقت بھی نازل ہوتے رہتے تھے۔ ایک دن سبقت کچھ روزگار مندا ہونے کا شکوہ کررہے تھے۔ شوکت سنتے رہے سنتے رہے پھر تاؤ کھا کر بولے۔ "میاں میرے کام کوئی ہو محنت کرنا پڑتی ہے۔" پھر کڑک کر بولے۔ "لو لے جاؤ یہ میری روزی کا ٹھیکرا کل سے پھیری لگاؤ۔ اللہ برکت دے گا۔" ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے۔ "سوچا تھا ٹھیک ہوجاؤں گا تو پھیری پر نکلا کروں گا مگر اب

تو میاں میرے یہ دکھائی دیتا ہے کہ قبر کا کونا ہی آباد کروں گا۔ لے جاؤ۔ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔"
سعادت مند بھتیجا چچا کی روزی کا ٹھیکرا خوشی خوشی اٹھا لے گیا۔

پاکستان بنا تو میں کراچی آ گیا۔ نئی زندگی' نئی فضا' نیا ماحول' ایک دن بھائی جان کا خط آیا۔ "پچھلے ہفتے شوکت کا انتقال ہوگیا۔ سائیکل سے ٹکرانے کے بعد معذور ہوگئے تھے۔ شام کو کسی نہ کسی طرح کڑھتے مقصود کی دکان پر چلے جاتے تھے۔ مرتے مر گئے مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ وضع دار تھے۔ اب دالان میں بالکل سناٹا ہوگیا ہے۔ اس طرف خاک اڑتی ہے۔ ہم سب بھی ایک دن خاک ہو کر اڑ جائیں گے۔ وضع داری کی داستانیں کتابوں میں لکھی رہ جائیں گی۔"

یونس جاوید

لاہور کا دروازہ

بابا یونس ادیب لاہور کا چودھواں دروازہ ہے اور باقی سب دروازوں سے زیادہ معتبر اور باوقار کہ اس سے گذرے بغیر کوئی بھی شخص اصلی اور نردل لاہور کی شبیہہ دیکھ سکتا ہے نہ داستان قسم کے محلوں کے ورق الٹا سکتا ہے۔ یہ چودھواں در دکان شیشہ گراں کی طرح ہے۔ آدمی حیرت کدے میں آجاتا ہے۔ دکان کی حسن کاری اپنی جگہ 'مگر بابا کے آئینہ خانے میں آدمی اپنی پرتیں کھلتی دیکھ کر سحرزدہ ہو جاتا ہے۔ جب کبھی بابا کی ذات یکجا ہو تو آدمی کو کیسے باکمال سے واسطہ پڑتا ہے جو نازک چوب کار بھی ہے اور ہتھوڑا مار کہ لوہار بھی۔ وہ کہیں باریک نگینوں کو کومل لفظوں میں جوڑتا چلا جاتا ہے اور کبھی ایک ہی وار سے سب کچھ ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ دوسرے کا چھابا لگاتا بھی ہے...... الٹا بھی دیتا ہے۔ لٰہذا لاہور کا سب سے زیادہ زندہ در...... جو ہر لمحہ وا رہتا ہے یونس ادیب ہے جسے ہم سب پیارے بابا جی کہتے ہیں۔ اس کی پہلودار اور بھرپور شخصیت میں تہہ در تہہ پرتیں ہیں مگر سب پرتوں میں خون ایک ہے۔ انھی پرتوں پر بابا نے دوستوں' دشمنوں' پیروں' فقیروں' راہ گیروں' مزاروں' گلی محلوں اور دیگر بابوں کے نام کندہ کر رکھے ہیں۔ بابا جس کا دوست ہے بس اس کا دوست ہے۔ مگر جس کا دشمن ہے اس کا کھلا دشمن ہے۔ صاف صاف اوپن...... ڈر نہ خوف' لحاظ نہ شرم...... ٹوپی ڈرامہ نہ منافقت...... اس کا چہرہ سدا ایک ہے۔ البتہ جذبوں کی لہریں ہر ایک کے لیے الگ الگ ہیں تاہم چہرے پر دوسری تہہ نہیں ہے۔ اسی لیے دشمنی میں وہ اس قدر کھلا ڈھلا دشمن ہے کہ لمحے بھر میں لاس اینجلس کی طرح پھٹ پڑتا ہے۔ چھپانا چاہے بھی تو نہیں چھپا سکتا۔

کھلی محبت سمندر جیسی...... اور کھلی ڈھلی نفرت اس کا اثاثہ ہے۔ وہ توانا جذبوں کا آدمی ہے' محبت کرتا ہے تو دوسرے کو چوم چوم کر دل میں رکھتا ہے' نفرت پہ آجائے تو ماں بہن ایک کر دیتا ہے۔ یہ اس کی ادا نہیں ہے بلکہ حقیقت پسندی اور عدل کا توازن ہے۔ وہ ڈنڈی نہیں مارتا...... یہی وجہ ہے کہ جس سے وہ نفرت کرے اس کو شاید ہی کوئی گلے لگائے کیوں کہ وہ شخص یا نظریہ...... قابل نفرت نہ سہی قابل مذمت ضرور ہوتا ہے اور اس کی جنگ تو نظریات کی جنگ ہے۔ عدل' انسان دوستی' یا حقوق کی پامالی پر وہ سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہی بابا کی خوبی ہے یہی خوشبو...... یہی ادب' یہی دوستی' یہی مروت' یہی انسانیت۔ انسانیت اس لیے کہ وہ زمانے بھر کے دھتکارے ہوئے لوگوں میں بیٹھنا اٹھنا اپنی معراج سمجھتا

ہے...... سمجھتا ہی نہیں ...... انھی لوگوں میں جیتا جاگتا ہے۔ ان کے دکھ درد بانٹتا ہے خواہ اس کے لیے اسے دوسروں کے سامنے جھولی پھیلانی پڑے' چندہ کرنا پڑے' ساغر صدیقی کے ساغر میلے سے کسی بیوہ کی شادی تک اسے کتنے بھی پاپڑ بیلنے پڑیں' بیلتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ بابا ان دنوں جوان ہو جاتا ہے' لگتا ہے اس نے نیا جنم لے لیا ہے۔ دن' دوپہر' رات اس پر ایک ہی دھن سوار ہوتی ہے مگر وہ کام کی زیادتی سے ہشاش بشاش دکھائی دیتا ہے اور محبت بانٹتا رہتا ہے۔

محبت کی یہ خوشبو پہلی بار مجھے بھی بابا یونس کے گھر سے ہی نصیب ہوئی تھی...... بہت مدت پہلے ...... جب میں اندرون شہر مسجد چنیاں والی میں قرآن پاک حفظ کرتا تھا۔ رہائش اچھرہ میں تھی ...... اندرون شہر اور اچھرہ کے درمیان انار کلی تھی جہاں والد صاحب کا کاروبار تھا۔ صبح ایک آدمی مجھے مسجد پہنچا آتا اور عصر کے بعد انار کلی دکان پر چھوڑ دیتا۔ دکان چوں کہ سٹیشنری کی تھی' عمدہ اور اعلا درجے کے قلم بھی خصوصی طور پر ہمارے ہاں ملتے تھے۔ لہٰذا وہی ...... اہل علم اور اہل قلم کی آمد کا وسیلہ تھے۔ بڑے بڑے شاعر ادیب اساتذہ جنھیں میں جانتا نہ تھا مگر پہلی مرتبہ دیکھا اپنی دکان پر ہی تھا۔ فیض احمد فیض' حفیظ جالندھری' عابد علی عابد' ڈاکٹر سید عبداللہ' ڈاکٹر محمد باقر' علم الدین سالک اور کچھ دوسرے اہل علم اس وقت مجھے یاد آرہے ہیں۔ شاید اس لیے کہ انھیں کئی کئی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ خود والد صاحب کو اعلا اور عمدہ قلم جمع کرنے کا شوق تھا۔ مونٹ بلاں' پارکر ڈوفولڈ' پارکر وی ایس' پارکر سینئر' پارکر جونیئر 51۔ 61' ایور شارپ اور شیفر لائف ٹائم گارنٹی والا اپنے والد صاحب ہی کے توسط سے مجھے ملے اور میں نے انھیں استعمال بھی کیا' اور یہی قلم کا رشتا مجھے کتابوں سے قریب لے گیا۔ مسجد سے دکان پر آتا تو بالکل ساتھ رسائل و جرائد کی دکان تھی (کاشانۂ ادب) جو وقت ملتا ورق الٹاتا...... پڑھنے کی کوشش کرتا۔ انھی دنوں کا ایک واقعہ مجھے اب بھی یاد ہے کہ ایک نوجوان لمبے بال' کرتہ پاجامہ' صاف ستھرا سویٹر' ہاتھ میں رسالہ ادب لطیف کا تازہ سالنامہ لیے کاشانۂ ادب والے مولوی سے مخاطب ہوا۔ "خریدیں گے؟"

مولوی صاحب نے سالنامہ الٹ کر دیکھا قیمت تین روپے درج تھی۔ انھوں نے جھٹ جواب دیا "بارہ آنے۔" وہ شخص بھی مختصراً بولا۔ "ایک روپیہ۔" جواب میں مولوی صاحب نے نفی میں سر ہلایا تو وہ پراسرار شخص چوک کی طرف چلا گیا۔ مولوی نے مجھے مخاطب کرکے بتایا۔ "جانتے ہو یہ شاعر ہے۔"

"شاعر؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... " وہ بولے۔ "اس کا نام ساغر صدیقی ہے۔"

میں ابھی جذبوں کی زبان نہیں سمجھتا تھا مگر جس مایوسی سے اس شخص نے رسالے کو بغل میں دبا کر اور آنا بچا کر پھیکی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تھا...... یہ سن کر کہ وہ شاعر تھا مجھے پہلی مرتبہ اپنے اندر سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ چھوٹے موٹے رسالے خریدنے کا چسکا پڑ چکا تھا۔ حتیٰ کہ فارسی کا رسالہ "ہلال" جو آٹھ آنے میں ملتا تھا اور بے حد خوب صورت ہوتا تھا' میں اس کی خوب صورتی کی بدولت خرید لیا کرتا تھا...... سو میں لپک کر گیا اور ساغر صدیقی کو جا لیا اور فوراً" کہا۔ "ایک روپیہ مجھ سے لے لیجیے۔"

ساغر نے پھیکی مسکراہٹ سے رسالہ میری طرف بڑھا دیا۔ اور روپیہ لے کر بے دلی سے مڑ گیا۔ وہ سال نامہ آج بھی میرے پاس کہیں رکھا ہوگا۔

اس واقعے کو واقعہ معترضہ سمجھ لیجئے۔ مقصود یہ تھا کہ چھپے ہوئے لفظ سے دلچسپی تو تھی، سمجھ نہ تھی۔ البتہ دکان پر آنے جانے والے پروفیسرز کی زبانی میں نے بھی یہ سن لیا کہ دکان سے دو تین سو گز دور اورینٹل کالج میں کوئی ادبی محفل جمنے والی ہے۔ میں بھی ڈرتے ڈرتے وہاں پہنچ گیا۔ ایک تحیر نے مجھے آن گھیرا تھا۔ ایک خواب کی سی فضا تھی، مجھے یاد ہے کہانی اے حمید کی تھی اور غزل شہرت بخاری کی۔ اے حمید نے مفلر گلے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ ان کے بال بے حد خوب صورت لگ رہے تھے اور کہانی پڑھتے ہوئے وہ شہزادہ سا لگ رہا تھا۔ کچھ کہانی کی فضا سحر انگیز تھی، کچھ میرا تحیر پھیل گیا تھا سو کہانی کے حسن، منظرنامے اور مکالمے کا ہر ہر لفظ میرے دل میں کھب رہا تھا۔ لگتا تھا میرا دل خشک سپنج کی طرح ہے کہ سحر کی نمی میں ڈوبے ہر لفظ کو پھیل کر اپنے اندر جگہ دے رہا تھا یا جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا میں ہی نہیں سب سحرزدہ تھے۔ کہانی ختم ہوئی تو ایک دبلا پتلا سمارٹ سا جوان اٹھا اور صدر کی اجازت سے کہانی پر گفتگو کرنے لگا۔ نوجوان آدمی تھا مگر انداز مدبرانہ تھا۔ دلیل سے دلیل جڑی چلی جا رہی تھی۔ جملوں کی ترتیب ایسی بے ساختہ تھی کہ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھ رہا تھا۔ آواز کی گھمبیرتا الگ...... شاید تخلیقی تنقید کی یہ پہلی جھلک تھی جو میں نے سنی۔ بعد میں معلوم ہوا یہ شخص یونس ادیب ہے پھر پروگرام کے مطابق غزل شہرت بخاری نے کھنک دار ترنم سے پڑھی۔ دو شعر نہیں بھولے۔

دھوپ کتنی کڑی ہے کیا ہوگا
راہ ساری پڑی ہے کیا ہوگا
دن تو جوں توں گزر گیا شہرت
رات ساری پڑی ہے کیا ہوگا

خیریات یونس ادیب کی تھی۔ میں اس کی پہلی جھلک اور گفتگو سے مرعوب ہو گیا۔ دل میں جہاں کہانی لکھنے کی خواہش نے سر اٹھایا، یہ بھی دل چاہا کہ کاش میں اس طرح بول سکوں؟ تجزیہ کر سکوں۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ اے حمید کی کہانی کا جادو تھا یا یونس ادیب کی گفتگو کی حرارت کہ میرے راکھ ایسے دل میں بھی چنگاری پھوٹ پڑی...... راکھ ایسا دل اس لیے تھا کہ اب تک گھر میں ناول، افسانہ، شاعری، ڈراما کا داخلہ ممنوع تھا۔ ریڈیو سننے کی مناہی تھی، اس لیے خریدا ہی نہیں گیا تھا۔ رسائل چھپ چھپا کر دیکھ لیتا تھا۔ بعض اوقات لحاف کے اندر ٹارچ جلا کر بھی پڑھا اور گرمیوں میں چاند کی روشنی میں بھی۔ کیا جنون تھا۔

ابا جی چاہتے تھے میں مذہبی عالم بنوں خواہ مجھے جامعہ ازہر ہی کیوں نہ بھجوانا پڑے۔ شاید ان کی اس شدید خواہش اور کتابوں سے دور رکھنے کے جبر نے ہی مجھے کتابوں کے درمیان لا کھڑا کیا۔ مگر میں سمجھتا ہوں یہ ایک وجہ ہوگی، اصل میں تو اے حمید کی کہانی، شہرت کی غزل، یونس ادیب کی گفتگو نے ہی مجھے

کتابوں کی دنیا دکھائی اور میں مسجد میں دوپہر کی چھٹی میں کتابیں پڑھنے لگا اور جو پہلی کتاب ہاتھ لگی وہ میرزا ادیب کی "صحرا نورد کے خطوط" تھی جو فینٹسی ہونے کے باوجود ادیب ساز کتاب ہے کہ کتابوں سے گہری دلچسپی اسی کتاب نے بعض لوگوں میں پیدا کی۔ بات پھر دور نکل گئی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ جو یونس ادیب نے میرا "شہر لاہور" لکھی ہے تو یہ صرف اس کا شہر نہیں ہے' تھوڑا سا میرا بھی ہے کہ میں نے بھی کئی سال چینیاں والی مسجد میں قرآن پڑھا ہے۔ انھی گلیوں' بازاروں میں تھڑوں پر بیٹھ کر کتابیں پڑھی ہیں اور دوپہر کی چھٹی میں دکانوں پر بجنے والے ریڈیو سے سنگیت سنا ہے۔ لہٰذا جب میں اس کتاب کو پڑھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے یہ میرا شہر ہے۔ وہی فضا' وہی بازار' وہی گلیاں' چوبارے' وہی مکان' وہی مکین۔ حالاں کہ یہ سب یونس ادیب کا اسلوب ہے کہ میں اپنے بچپن کی فضا میں سانس لینے لگتا ہوں ورنہ کیا کچھ نہیں بدل گیا اس شہر کا' حتیٰ کہ قدریں بھی۔

یونس ادیب سے میرا دوسری مرتبہ آمنا سامنا اس دن ہوا جب میں اورینٹل کالج کی بزم ادب میں بہ نفس نفیس زندگی کا پہلا افسانہ سنانے کے لیے ڈائس پر آیا۔ یونس کو سامنے دیکھا' کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ یا اللہ خیر۔ یہ شخص تو پرخچے اڑا دے گا۔ میں ان دنوں اورینٹل کالج میں ادیب عالم میں داخلہ لے چکا تھا۔ ہرچند کہ قرآن پاک قریب الاختتام تھا اور مجھے ساتھ ساتھ اسے بھی مکمل کرنا تھا۔ تاہم داخلہ ملتے ہی میں نے اپنے خواب کی تکمیل میں ٹوٹے ٹوٹے جوڑ کر کئی دنوں کی محنت سے افسانہ لکھا تھا۔ سارا اسلوب اور منظر نگاری اے حمید کے تتبع میں تھی۔ محاذ جنگ پہ ایک انسان لڑتے ہوئے دم توڑ رہا ہے اور پیچھے اس کی محبوبہ تصویریں سامنے رکھے خواب بن رہی ہے۔ شاید یہ جنگ کی آلودگیوں کے خلاف میرا پہلا احتجاج تھا مگر یہ یونس ادیب کیوں آ گیا تھا یہاں......؟ ڈرتے ڈرتے میں نے افسانہ شروع کیا اور سردی کے باوجود پسینے میں بھیگنے لگا کہ اچانک یونس ادیب نے سکڑا ہوا مفلر کھول کر دوبارہ گردن کے گرد لپیٹا اور کسی دوست کے ساتھ باہر نکل گیا۔ زندگی میں پہلا افسانہ ...... یونس ادیب کی موجودگی پہلی پریشانی ...... اور اس کا کمرے سے اس طرح اچانک نکل جانا...... سکھ اور اطمینان کا ایسا پرسکوں لمحہ شاید پھر کبھی نہیں ملا۔ لہٰذا سکھ کا پہلا لمحہ بھی وہی تھا کہ مزہ آ گیا۔ میں نے اعتماد سے افسانہ پڑھا' افسانہ طویل تھا۔ جب ختم ہوا صدر نے تنقید کی دعوت دی تو یونس ادیب کی کھرج دار آواز نے کلیجہ ہلا کر رکھ دیا۔ زبان خشک ہو گئی اور دل اداس۔ میں اپنی سیٹ پر واپس آیا۔ ساتھ بیٹھے کسی شخص نے مجھے سگریٹ آفر کیا' جو بلا جھجھک میں نے لے لیا' سلگایا اور زندگی کا پہلا کڑوا کش اناڑی طریقے سے لے کر کھانسا' یونس کی آواز پھیل رہی تھی مگر مجھے سنائی نہ دے رہی تھی۔ اب جو ہمہ تن گوش ہو کر غور کیا تو حیرت سے انبساط تک کی منزل طے ہو گئی۔ دل محبت سے پھیلنے لگا اور ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں کشادہ ہوتے چلے گئے۔ حیرت یونس کے تجزیے پر تھی۔ مسرت بھی اس پر مسرت و انبساط کا یہ لمحہ یونس ادیب کی جادو جگاتی ہوئی گفتگو کی وجہ سے تھا۔ وہ خلاف توقع افسانے کی بنت' کہانی کے اتار چڑھاؤ' زبان' منظر نگاری سب کی تعریف میں بول رہا تھا۔ اس نے نہایت سلجھے ہوئے طریقے سے تنقید کی کہ مجھے زندگی کا پہلا اعتبار بخش دیا۔ یونس ادیب خاموش ہوا تو

ہر طرف سے سامعین نے اس کی تقلید اور کمائی کی تعریف کی کہ گویا میرے وجود کی توثیق کر دی۔

تیسرا موقع تب آیا جب میں وسن پورہ کے دور دراز علاقے میں کسی رسالے کے دفتر پہنچا۔ میں اس وقت یونس جاوید کے بھائی کی حیثیت سے یونس جاوید کا خط لے کر گیا تھا تاکہ اپنے بھجوائے ہوئے افسانے کے بارے میں جواب حاصل کر سکوں اور انا بھی مجروح نہ ہو مگر داخل ہوا تو لمحے کے سوویں حصے میں ریت کی طرح بکھر گیا۔ ایڈیٹری کرسی پر یونس ادیب بیٹھا تھا۔ اس نے عینک کے موٹے شیشوں میں سے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور عزت سے بٹھایا۔ پھر چائے پلائی افسانہ نکال کر جلد جلد پڑھا اور پھر مجھے افسانے کو بنانے سنوارنے کے متعلق کچھ اس طرح کے باوزن مشورے دیے کہ مجھے اپنے لکھنے پر ندامت ہونے لگی مگر اس نے مجھے بے حد پیار سے سمجھایا اور وعدہ لیا کہ افسانہ درست کر کے میں اسے پہنچادوں گا۔ اس نے ہنرمندی کی باتیں بتائیں' حوصلہ دیا' ہمت بڑھائی اور بگلے کا سگریٹ پیش کرتے ہوئے بولا۔ "لکھنے کے لیے اعلیٰ سگریٹوں کی ضرورت ہے نہ عمدہ قلم کی' سگریٹ بگلے کے پیو اور لکھو کچی پنسل سے مگر لکھو ایسا کہ پڑھنے والا تمہارے لفظوں کو تعظیم دے کر تمہاری تخلیق کو مکمل کرے۔" شاید یونس ادیب نے میرا شیفر کا قلم دیکھ لیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بابا کو بھی میری طرح ہی اعلیٰ قلم رکھنے کا جنون ہے مگر وہ لکھتا معمولی قلم سے ہے۔ میں یونس ادیب کی باتوں سے پہلے دل برداشتہ ہوا مگر رفتہ رفتہ واپسی پر جوں جوں غور کیا یہی لگا کہ اس نے ایک مرتبہ پھر میرے اندر تحرک پیدا کیا ہے۔

جب میں اپنے لکھنے کے آغاز کے بارے میں سوچتا ہوں تو ہرچند کہ اے حمید کے افسانے کا جادو' شہرت کی غزل' میرزا ادیب کی کتاب "صحرا نورد کے خطوط" اور دوسری کچھ کتابیں درمیان میں پڑتی ہیں مگر یہ اعتراف کرنے میں کیا حرج ہے کہ یونس ادیب کے تجزیاتی مشوروں اور کبھی ہیرو اور کبھی زیرو بنا دینے والی گفتگو نے میرے اندر لکھنے کی تڑپ کو الاؤ بنا دیا۔ آج بھی میں بابا کی ہر بات کو غور سے سنتا ہوں' اس کا تجزیہ کرتا ہوں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ بابا کوئی عام بابا نہیں ہے۔ کبھی صوفی کبھی رند' کبھی درویش کبھی قلندر اور کبھی کبھی فقیر کے روپ میں اس کی باتیں اقوال کی صورت اختیار کرنے لگتی ہیں۔ اس کا چہرہ کبھی راہ رو کبھی راہ نما بن کے پھیل جاتا ہے اور وہ سب محبتیں دوسروں پر نچھاور کر دیتا ہے۔ وہ سیاست پر گفتگو کرے' ادب پر بولے یا بغیر کسی موضوع کے چھڑ جائے' اس کی کھنک دار آواز' اس کا گھمبیر لہجہ اور اس کا انداز بعض لوگوں کے لیے کڑوا ضرور ہو گا مگر سچائی کی دمک کو آپ کھرچ کر بھی علاحدہ نہیں کر سکتے کہ جدوجہد' تھپیا صعوبتیں اور زندگی کی اجلی ملی حقیقتوں نے اسے ہر دو طرف سے خرچ کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ بابا کی will ہے کہ وہ غم زدہ کر دینے والے المیوں' حالات کے تھپیڑوں اور ان تھپیڑوں سے ملنے والی بیماریوں کے ساتھ لڑتا بھڑتا ...... جی رہا ہے ...... مسکرا رہا ہے ...... سمندر میں ڈٹی نوکیلی چٹان کی طرح ......!

☆ ○ ☆

یونس جاوید

ونجارا

میں ایک ایسے سلیم شاہد کو جانتا ہوں جو سنجیدہ شاعر' بہترین باپ' نو دی پوائنٹ شوہر اور آؤٹ آف دی وے دوست ہونے کے باوجود ہر فن مولا ہے۔ اس نے ہر وہ کام کیا ہے جو کیا جا سکتا ہے یا کم از کم سوچا جا سکتا ہے۔ سوچنا یوں بھی کوئی چھوٹا کام نہیں ہے۔ سوچ کی پرواز ایک دنیا سے دوسری دنیا اور پھر تیسری دنیا تک جا سکتی ہے۔ مگر کائنات تو وہ جگہ ہے جس میں ہزاروں لاکھوں جہاں' ہمارے تصور سے آگے کی اشیا اور دنیائیں آباد ہیں یا نہیں' موجود ضرور ہیں۔ لہٰذا سلیم شاہد کی پہلی سوچ یہ تھی کہ وہ کائنات پر فلم بنائے گا۔

اس نے نہایت سنجیدگی سے مجھے گھر بلایا' بٹھایا' چائے سے تواضع کی اور پھر بے حد رازدارانہ انداز میں مجھے باور کرایا کہ اس نے کائنات پر فلم بنانے کا ارادہ ہی نہیں کیا' ڈھیر سارا مصالحہ بھی جمع کر لیا ہے اور مصالحے پر ہی کیا موقوف' بہت سا کام نمٹا بھی دیا ہے۔ اس نے مخصوص انداز میں سوٹا لگایا اور مجھے یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ "تقریباً" کام مکمل ہے۔"

"مکمل؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "بالکل مکمل ہے۔ بس تم اسکرین پلے لکھنا شروع کر دو۔" میں ممیا کر رہ گیا مگر وہ پر اعتماد سوٹے کے ساتھ پھر بولا۔ "لوگوں میں حوصلہ نہیں ہے کسی نئے آئیڈیے کا....... جو بھی میری بات سنتا ہے حیران ہوتا ہے۔ تم پہلے شخص ہو جو اس قدر حیران نہیں ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ......"

میں نے ہمت کر کے اس کی بات کاٹی۔ "یار یہ موضوع بہت بڑا ہے یہ تو ہالی وڈ والوں کو چاہیے کہ........"

تب اس نے جواب میں میری بات کاٹی اور کہا۔ "ہالی وڈ والے کیا بیچتے ہیں؟ ان کے پاس پروڈکشن ہو سکتی ہے۔ روپیہ ہو سکتا ہے۔ بڑے بڑے مصنوعی سیٹ ہو سکتے ہیں۔ ورلڈ پریس ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارے پاس ٹیلنٹ ہے۔ ذہن ہے۔ لکھنے والے ہیں۔ سوچنے والے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات کہ آئیڈیا ہے۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ مصنوعی سیٹوں کے بجائے صرف اور بجٹل ورک کروں۔ سمجھ آئی یا دھراؤں؟"

میں نے حوصلہ کر کے زبان کھولی اور بات کا رخ تھوڑا سا بدلنے کے لیے پوچھا۔ "ہدایات کس کے ذمے ہیں؟"

تب اس نے کہا۔ "یہی ایک شعبہ تو رکھا ہے میں نے اپنے پاس۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ یہ میرا

ہیڈ آئیک ہے۔" وہ بچوں کی طرح خوش تھا۔ پھر وہ اپنے آئیڈیا کے مختلف روپ' سلولائیڈ پر اتارنے کے مراحل بتانے لگا۔ کیمرہ کس طرح سے کہاں تک جائے گا۔ آسمان' وسعتیں' ستارے' سیارے' زہرہ' مشتری۔ میں نے ایک مرتبہ دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔ "برادر یہ کینوس' یہ منظرنامہ اور اس کے فریم دل ہلا دینے والا کام ہے اور........."

اس نے اس بات پر ہی مجھے دبوچ کر کہا۔ "دل متحرک شے ہے۔ اسے ہلنا دھڑکنا ہی چاہیے۔ جامد دل تو موت ہے۔"

لیکن میں نے زبان کھولی....... اس نے بات کاٹی...... بولا۔ "ہدایت کار ٹیم کا کپتان ہوتا ہے۔ میں اس وقت تمہیں سمجھا نہیں سکتا کہ میرے ذہن میں کیا کچھ ہے۔"

"تم نے فلکیات کا مطالعہ کیا ہے؟" میرا سوال تھا۔ وہ برجستہ بولا۔ "اتنے کچے کہاں توں ہوئیں آں۔" پھر اس نے چمک دار آنکھوں سے مجھے گھورا' کہنے لگا۔ " تمہارا خیال ہے میں بے وجہ شور مچا رہا ہوں...... میاں صاحب میں نے ایسا ایسا ستارا ڈھونڈ نکالا ہے کہ........"

"مگر...... علامہ اقبال اس مقام سے ڈر کر گزرے ہیں۔" میں نے اسے روکنے کے لیے کہا۔

یہ گنبد مینائی' یہ عالم تنہائی

مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

اس نے ہار نہیں مانی۔ کہنے لگا۔ "مولا جب یہ شعر کہا گیا تھا' کوئی انسان چاند پر نہیں اترا تھا۔" یہ بات سچ تھی۔ اس وقت کوئی انسان چاند پر واقعی نہیں اترا تھا۔ مگر میں سوچنے لگا یا اللہ خیر۔ یہ شخص اگر چاند پر اترنے کا تہیہ بھی کر لے تو کودے گا ضرور خواہ چھت سے باہر سڑک پر آن گرے۔ اور اگر خدانخواستہ اس نے اس پراجیکٹ میں کود پڑنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو وہ آباد ہو یا برباد اسے کوئی روک نہیں سکے گا۔ تخت ہو یا تختہ۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو' یار دوست مذاق اڑائیں یا تماشا دیکھیں۔ وہ ریورس گیئر نہیں لگائے گا' لہٰذا میں نے اس کے بچوں کے حق میں خلوص دل سے دعا کی۔ وہ مجھے چپ دیکھ کر بولا۔ "کیمرہ دکھاؤں؟" ...... میں نے مووی کیمرہ تک لے لیا ہے۔" وہ اٹھ کر الماری کھولنا ہی چاہ رہا تھا کہ اس وقت...... بلکہ یوں کہیے کہ بروقت بہت سے مہمان آگئے اور سارا تسلسل ٹوٹ گیا۔ مجھے صرف اس لیے خوشی ہوئی کہ مجھ ایسا فقیر پر تقصیر لکھنے والا کائنات کا منظرنامہ لکھنے سے صاف بچ گیا۔

تاہم مجھے آج بھی یقین ہے کہ میں نے جو اس کے اور اس کے بچوں کے حق میں خلوص دل سے دعا مانگی تھی وہ قبول ہوئی تھی۔ کیوں کہ بعد میں معلوم ہوا کہ سلیم شاہد نے کیمرہ بیچ کر جو بھی کیا ہو اسے نذر نے نہیں کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس موضوع پر ناول لکھنے کی ابتدا کر دی تھی۔ جسے اس نے ریٹائرمنٹ کے بعد مکمل کرنا ہے۔

سلیم شاہد جب کوئی ارادہ کر لیتا ہے تو کوئی کچھ بھی کہے' اس پر پانی کی بوند نہیں ٹھہرتی۔ الطاف قریشی راز دارانہ تدبر اس کے سینے میں منتقل کرے یا اسلم گورداس پوری اس سے شام ادھار مانگے یا بابا

یونس ادیب اسے لچھے دار مشورہ عطا کرے' وہ سب کی سنے گا اور اپنی کرے گا۔ لیکن جب اس کے سامنے چائے کی پیالی سے بھاپ اٹھ رہی ہو' سگریٹ کا پیکٹ سامنے رکھا ہو تو وہ کسی کی کم ہی سنتا ہے اور ایسے ایسے برجستہ جملے اور قلم کائنات جیسے اور بجلی خیالات کی ایسی بوچھاڑ کرتا ہے کہ بعض اوقات تو تیز تر بولنے والا باخبر اور عالم شخص احمد بشیر بھی زچ دکھائی دیتا ہے۔ سنا ہے زچ کرنے کے سارے داؤ پیچ اس نے پہلے الطاف قریشی سے سیکھے پھر احمد بشیر سے دنیائے انقلاب کی کہانی سنی اور اس پر سر بھی دھنا مگر ایک دن' جس کا میں خود بھی گواہ ہوں' اس نے پہلے الطاف کو سیاسی اکھاڑ پچھاڑ پر بحث کرتے ہوئے کہا۔ "تم سیاست کیا جانتے ہو خاک؟" اور جب احمد بشیر نے بات سنبھال کر آفاقی تناظر میں فٹ کرنے کی کوشش کی تو سلیم شاہد نے کہا۔ "بشیر صاحب تسی وی بے خبر آدمی او وقت بڑا اگے جا چکا اے۔"

واقعی وقت آگے جا چکا تھا ورنہ احمد بشیر کو ایسے موقعوں پر چپ ہوتا کسی نے نہیں دیکھا۔ بہ قول سلیم کے اس نے زندگی کا آغاز ایک ڈاکٹر کے کلینک سے کیا تھا جس کی رہائش کلینک کے اوپر تھی وہاں اس پر جوانی آئی۔ اور "اندر بوٹی مشک مچایا" .... تو جادو سر چڑھ کر ہی نہیں بولا .... چوبارے تک چڑھ گیا۔ اس نیک طینت ڈاکٹر نے جو صحیح انسان کہلانے کا مستحق ہے' خاموشی سے فطری تقاضوں کو تسلیم کیا اور سزا کے بجائے جزا سے سلیم شاہد کو یوں نوازا کہ اسٹیٹ بینک میں مستقل ملازم کرا کے گویا اپنے چوبارے کے گرد حصار کر دیا۔

تب سے آج تک وہ سارے اسٹیٹ بینک میں ڈاکٹر سلیم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بینک میں پہلے پہل اس نے ڈسپنسری میں قدم جمائے اور لوگوں کو "آئرن مکسچر" پلا پلا کر مردانہ قوتوں کے راز سے کچھ ایسا آشنا کیا کہ کیا گھر دار اور کیا چھڑا' پہلے مسحور ہوا' پھر مفتوح اور پھر سلیم شاہد کے گرد منڈلانے اور باہر کی دنیا میں پر اشے پکانے لگا۔ بینک والوں کو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہے' علم ہوا بھی تو انھوں نے اس صفت کو در خور اعتنا نہیں سمجھا' اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سلیم شاہد جیل بھی گیا تو کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ڈاکٹر سلیم کیوں چھٹی پر چھٹی لیے جا رہا ہے۔ ویسے بھی وہ بہ یک وقت کئی روپ رکھتا ہے۔ کوئی اسے طالب جالندھری سمجھتا رہا اور کسی نے اسے مہدی حسن سے مشابہ جان کر شراب خانے والوں سے سفارش کرائی کہ "انھیں شراب ادھار دے دی جائے۔" میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آئن اسٹائن بہت پہلے گزر گیا ورنہ اس کے نام پر تو اس کا اچھا خاصا سودا ہو سکتا تھا۔

میں جب پہلی مرتبہ اس سے ملا تھا تو اس نے مجھے شعر سنائے تھے۔ اس کے پہلے شعر سے ہی میں اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

مٹی کا جسم لے کے چلے ہو تو سوچ لو
اس راستے میں ایک سمندر بھی آئے گا

اس کی شاعری سے میں ہی کیا' بہت سے سینئر شاعر بھی مزہ لیتے تھے۔ اور سیف زلفی جو سنا ہے ان دنوں احسان دانش کی نفی کرتا تھا سلیم شاہد کو شاعر مانتا تھا۔ سلیم شاہد .... سیف زلفی کو بافِ زلفی کہتا تھا کہ

اس کے آدھے بال گر چکے تھے۔ جس کے جواب میں سیف زلفی' سلیم کو صاف زلفی کہتا رہا کہ اس کے سر پر ٹاکی مارنے کی گنجائش موجود تھی۔ پھر شہزاد احمد نے جسے سب جونیئر' مینار نور سمجھتے تھے' سلیم شاہد کو اس قدر تسلیم کر لیا کہ ان دونوں کی راتوں کی نشست میکلوڈ روڈ کے کسی ریستوران میں ہونے لگی۔ شہزاد کی سند کے باعث ہی اس نے اپنا پہلا مجموعہ چھاپا' جس کا نام "موتیوں کا جزیرہ" تھا۔ سنا ہے اس کا انتساب بھی شہزاد احمد کے نام تھا۔ وہ مجموعہ ابھی تقسیم نہیں ہوا تھا کہ سلیم شاہد کو اپنے اندر کسی نئے سلیم شاہد کی نوید ملی جو کہیں کہیں شہزاد احمد سے آگے نکل رہا تھا۔ اس نے اس مجموعے کی تمام کاپیاں مع شہزاد احمد کے انتساب کے جلوا دیں اور کبھی ہمارے سامنے ذکر نہیں کیا۔ میں آج اس سے پوچھتا ہوں کہ ایسا کیوں کیا گیا؟........ کیا شاعری کم زور تھی........ یا انتساب ناقص تھا؟ اس جملہ معترضہ کو چھوڑیے........ کتاب جلوا دینا........ اولاد جلوا دینا ہے' یہی بات اس کے ارادے' عزم اور حوصلے کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کو ڈس اون کرنے کی طاقت اور جرات کا ثبوت ہے اور اپنی پہلی اولاد' پہلی شعری واردات کو اتنی آسانی سے عاق کر کے اس نے لن یو تانگ کے اس مقولے کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ "تحریر اپنی اچھی لگتی ہے اور بیوی دوسرے کی۔"

آئرن مکسچر بنانے والا یہ مرد قلندر اپنی انھی باتوں کی بدولت آئرن مین یا مرد آہن لگتا ہے۔ اور انھی باتوں نے اسے اس وقت ہی مستند شاعر بنا دیا تھا جب ہم ایسے ابھی نگینہ بیکری کے باہر کھڑے ادب کو منہ شوں مار رہے تھے۔ اس درویش نے میرا بازو پکڑا اور مجھے نگینہ بیکری سے ٹی ہاؤس لے آیا جو ایک بڑا معرکہ تھا۔ میں ٹی ہاؤس میں داخل ہونے سے گھبراتا تھا جب کہ سلیم شاہد میں بلا کا اعتماد تھا اور ہے۔ حالاں کہ ان دنوں ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے سینئر ادیب و شاعر نئے لوگوں کو گھاس تو کیا ان پر نگاہ بھی نہ ڈالتے تھے مگر سلیم شاہد جس طمطراق سے مجھے اندر لے گیا وہ آج بھی یادگار ہے۔ بہت سے نئے لوگ باہر کے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر اپنے کسی نہ کسی سینئر کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس میری طرح نہ تو اعلیٰ درجے کی کوئی ادبی صنف تھی نہ سند نہ جنس نہ مال پانی........ تقریباً" سب میری طرح چھانگ ہوتے تھے۔ لہٰذا اس دن سے پہلے میرے سمیت سب لوگ حلقہ ارباب ذوق کے جلسے میں جانے سے پہلے فٹ پاتھ کے ایئرپورٹ سے ہی ٹیک آف کرتے تھے' مگر سلیم شاہد نے جس آسانی سے مجھے یہ مرحلہ طے کرایا تھا' میں آج بھی اس کا شکر گزار ہوں۔ اس کے پاس پیسے تھے' خلوص تھا اور سب سے بڑی بات کہ خرچ کرنے کا بے مثال حوصلہ تھا۔ جس کی کوئی نہ کوئی رمق زندگی کے اس اداس کر دینے والے موڑ پر بھی اس میں مل جاتی ہے۔ وہ زندہ بھی ہے اور زندہ دل بھی۔ سیال کوٹی ہونے کے باوجود وہ زندہ دلان لاہور کا کوئی لیڈر معلوم ہوتا ہے۔ ان دنوں ٹی ہاؤس میں داخل ہونا ایک ایسے پرستان کا خواب تھا جس کو بیان کرنا مجھے مشکل ہو رہا ہے۔

کبھی کبھار چندہ جمع کر کے چائے کی میز پر آ بیٹھنا کسی معرکے سے کم نہ تھا۔ دور دور سے ادیبوں کو دیکھنا' ان کی گفتگو کے انداز پر کھنا اور قد آور ادیبوں کی خوشبو سے خود کو مہکائے رکھنا زندگی کی افضل ترین

خوشی محسوس ہوتی تھی جو کم از کم مجھے تو مسحور کردیتی تھی۔ ان دنوں ایک روزنامے کی پیشانی پر باقاعدہ اشتہار چھپا کرتا تھا۔ "ادیبوں اور دانش وروں سے ملاقات کے لیے........ پاک ٹی ہاؤس"

میں اندر اکیلا کیسے جاسکتا تھا۔ میرا حوصلہ بھلا ان ادیبوں کے ادب کا بوجھ کیوں کر اٹھا سکتا تھا۔ رہی دانش وری تو یہ جس قدر میری سمجھ میں آسکی ہے' سلیم شاہد اس میں مکمل طور پر فٹ ہے۔ پہلے روز ہی اس نے دھڑام سے دروازہ کھولا' .... تراخ سے کرسی گھسیٹی' بیٹھا ...... اور کھناک سے یوں سگریٹ بھرا پیکٹ میز پر پھینکا جیسے اس کے نزدیک بے چارے پیکٹ کی حیثیت ہی کیا ہے (حالاں کہ ان دنوں سگریٹ چھپا کر بلکہ دوسروں سے بچا کر رکھنے کی روایت تھی)۔ اس نے چھوٹتے ہی چائے کا آرڈر دے کر ثابت کردیا کہ ریستوران میں ہر شخص ہوتا ہے۔ چائے پیتے اور دھوئیں کے مرغولے اچھالتے ہوئے اس نے کسی کو پرکاہ کی اہمیت نہ دی اور آخر میں بیرے کو چونی کے بجائے دو روپے ٹپ دے کر اسے خوش' مجھے حیران کردیا۔ یہ سلسلہ کچھ اس طرح سے اس نے معمول بنایا کہ الٰہی بخش بیرا ہی اس کا متوالا نہیں ہوا بلکہ اکثر نوں لوگ بھی اس کی میز پر اٹھ آئے۔

لوگوں کو اردگرد جمع کرنے کا گر یا کمال اسے تب سے اب تک حاصل ہے۔ وہ دعوت قبول کرے یا دوسروں کو دعوت دے مگر وہ خود کو مرکز بنا کر رکھتا ہے اور اس سے کم پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ مجھے تو وہ قدم قدم پر حیرت زدہ رکھتا ہے مثلاً" ایک دعوت سے اٹھارہ روز پہلے اس نے کچھ کمال کھٹ مٹھے اخباری بیان داغ دیے تھے۔ میں جب اس دعوت میں اس کے گھر پہنچا تو سب ہی لوگ موجود تھے جن کا تذکرہ بیان میں تھا۔ احمد فراز سے فخرزمان تک اور الطاف قریشی سے الف الا مجراث تک سبھی ایسے لوگ تھے جو اپنے خلاف چھپے بیانوں کے باوجود سلیم شاہد کے گرد جمع تھے۔ جس سے مجھے اس کی مقناطیسی شخصیت کا اندازہ ہوا' ہوسکتا ہے یہ اس کی شاطرانہ کشش ہو' کیوں کہ چوبیس گھنٹے میں سوتے جاگتے اس کا ذہن شاطرانہ داؤ پیچ کے اسرار و رموز میں الجھا رہتا ہے۔ وہ چال چلتا ہے۔ وار کرتا ہے اور پھر کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں محبت اور درگزر کا نمونہ بن جاتا ہے۔ چال چلنا اس کی تلوار ہے اور محبت اور درگزر اس کی ڈھال۔ اس دن سے تو وہ احساس تفاخر میں گندھا گندھا دکھائی دینے لگا تھا جس دن فیض صاحب نے اس کا یہ شعر۔

باہر جو میں نکلوں تو برہنہ نظر آؤں
بیٹھا ہوں میں گھر میں در و دیوار پہن کر

ماسکو کے دورے میں اہل نشست کو سنایا۔ یہ خبر پاکستان پہنچی تو سلیم شاہد چکرا گیا اور اتنا زیادہ کہ بہت دنوں میں نارمل ہوا۔ یہ تفاخر اس کے لیے اتنا بڑا کریڈٹ بنا کہ اس نے اسے پہلے تو کئی دن بے چین رکھا۔ یہی بے چینی' یہی اضطراب نئے عزم کے نئے بادبانوں کی صورت اختیار کرگیا۔ اس نے کشتی تو بنالی مگر بادبان نہ کھل سکے اور بے پتوار کشتی نے اسے شعر کی دنیا سے سمندر کی موج کی طرح اچھالا اور ساحل سیاست پر لا پھینکا۔ وہ اعلیٰ ترین شے یعنی تخلیق اور شعر کی دنیا کو معطل کرکے ایک سطحی نقار خانے میں داخل ہوگیا

جہاں پہلے ہی کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی مگر یہاں اس نے اتنا ضرور کیا کہ مزاحمتی شاعری کو یکجا کر کے سب سے پہلے ایسا قدم اٹھایا جس سے اس کا نام شاعروں کے علاوہ بڑے سیاست دانوں کے دلوں پر بھی ثبت تو ہوا مگر نقش نہ ہو سکا۔ گویا نہ بکنے والے دلوں پر حکومت چھوڑ کر سلیم شاہد نے ایسے دلوں میں جگہ بنانے کی کوشش کی جہاں سیف صاحب کا یہ شعر فٹ آتا ہے۔

ہے سارا زمانہ سوداگر

ہر چیز یہاں بک جاتی ہے

وہ بکا نہیں مگر شعری دنیا اس سے اور وہ شعری دنیا سے اوجھل ہو گیا۔ سلیم شاہد کی ایک خوبی یہ ہے کہ اسے کوئی کام کرنے سے عار نہیں ہے۔ اس نے اون بیچی' عید کارڈ کا اسٹال لگایا' عورتوں کو چوڑیاں چڑھاتے ہوئے تو وہ مجھے روایتی ونجارا لگا۔ یہیں پر اکتفا نہیں' اس نے شربت بیچا ہی نہیں' بنایا بھی۔ پھر کرشمہ اچار اور کرشمہ مربے بنا کر گویا کرشمہ ہی کر دکھایا۔ سوجھ بوجھ حاصل ہوئی تو موسم بدل گیا' اس نے سندھی کڑھائی کے کام کے لیے مختلف نمائشوں میں سٹال لگائے جہاں بابا یونس ادیب روز اس کی مدد کو پہنچتا تھا اور واپسی پر ہمیں گرماتا تھا کہ وہاں "کچ کا سامان" بہت ہے۔

سلیم شاہد کا سب سے بڑا کاروباری رسک 'لبرٹی کی وہ دکان تھی جس کا تجربہ اسے لاکھوں کے نقصان میں ہوا۔ مگر وہ اس پر اس لیے خوش ہے کہ تجربات کرنا اس کی زندگی کا حصہ ہے۔ اسی تجربے کے تجسس نے اسے محمود علی قصوری کی کوٹھی والے جلسے سے گرفتار کرایا اور قید کرایا اور تجربے ہی کی خاطر ایک عید قربان پر اس نے قصائی کا انتظار کرنے کے بجائے ساری فیملی کو وختا ڈال دیا۔ اس کے حکم پر سب بچوں نے بکرے کی ٹانگیں پکڑیں' بھابھی نے گردن دبوچی اور سلیم شاہد نے قربانی کا بکرا ذبح کر دیا' ذبح ہی نہیں پورے بکرے کو گوشت کی پرتوں میں کاٹا اور محلے میں گوشت بانٹتے ہوئے بھابی نے یوں داد پائی کہ ...."بس تہاڈا قصائی بڑا ستھرا اے"۔

سلیم شاہد قصائی کھرا ہو نہ ہو' دل کا کھرا ضرور ہے۔ اسی لیے وہ کسی کی بے وجہ لیڈری پسند کرتا ہے نہ برداشت۔ میں نے اپنے سامنے اس کو بڑے بڑے برج الٹتے دیکھا ہے۔ اسی ٹی ہاؤس میں....... جہاں وہ کبھی گم نام داخل ہوا تھا' آج اس کے نام سے دروازے کے ساتھ والی میز پر سیٹ مخصوص ہے۔ وہ آئے نہ آئے کوئی اس کی سیٹ پر نہیں بیٹھتا اور بیٹھ جائے تو اٹھنے کے قابل نہیں رہتا۔ مگر سب اسے سلیم شاہد کی سیٹ کہتے ہی نہیں' سمجھتے بھی ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ وہ لوگ جو اپنے سامنے کسی کا کتبہ برداشت نہ کرتے ہوں' اس کی سیٹ نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ اس کی عدم موجودگی میں اسے خالی بھی رکھتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ایک شاعر کا دوسرے شاعر سے وہی رشتہ ہے جو اینٹ کا........ اینٹ سے ہے۔ سلیم شاہد نے بہت سے اینٹ پسند مصنفین کو نہ صرف موم کیا ہے بلکہ ان کی اینٹوں کا بار پرو کر مستقل پہن رکھا ہے۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب اس کا وجدان اسے خبر کرتا ہے کہ شہر کی کس کس محفل میں اس کے بارے میں کیا باتیں ہوئیں۔ اس کا وجدان مجھے تو کوئی بریگیڈیر وجدان ہی

دکھائی دیتا ہے کیوں کہ مارشل لا کے دنوں میں سیاست پر گہری گہری گفتگو کرتے وقت وہ کوئی اتنا بڑا دعویٰ کر بیٹھتا تھا کہ سب اس سے خبر کا سورس پوچھنے لگتے تھے۔ وہ فوراً "بریگیڈیئر فلاں یا کرنل فلاں کہہ کر اپنی بات کو با اعتماد بناتا اور بتاتا۔ "صبح ہی فون آیا تھا اس کا" .... مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی کہ سال بھر بعد ہی معلوم ہوا بریگیڈیئر کرنل تو کوئی نہیں صرف اس کا قیاس یا وجدان ہے۔ وجہ وجدان اتنی ہے کہ تکا لگ گیا تو لگ گیا نہیں تو نہ سہی۔ وہ دماغ کو ہمیشہ حاضر رکھتا ہے۔

۱۹۷۶ء میں ایک مرتبہ وہ مجھے مورل سپورٹ کے لیے ساتھ لے کر "ایڈل جی" سے شراب خریدنے گیا۔ شراب کے دو کوارٹر لے کر اس نے ایک میری جیب میں اور دوسرا اپنی میں اڑس لیا۔ ہم دونوں ٹی ہاؤس کے سامنے والے بڑ کے پیڑ کے نیچے تک ہی پہنچے تھے کہ ایک اسکوٹر سوار اے ایس آئی نے ہمیں گھیر لیا۔ میں سر سے پاؤں تک لرز گیا جب کہ سلیم شاہد مسکراتا رہا۔ "شراب ادھر لاؤ۔" انسپکٹر بڑی تہذیب سے بولا (۱۹۷۶ء میں شراب کے کیسوں میں بڑا مہذب انداز اپنایا جاتا تھا)۔ "کس لیے؟" سلیم نے پوچھا۔

انسپکٹر اسکوٹر سے اتر آیا' بولا۔ "یہاں بتادوں یا تھانے لے جاکر۔"

سلیم اسی لہجے میں بولا۔ "برادر یہ شراب میری ہوتی تو ضرور آپ کو پیش کر دیتا بلکہ ساتھ بٹھاتا۔ یہ مساوات کے ایڈیٹر کے لیے ہے۔ اسے پی کر ایڈیٹوریل لکھنا ہے۔ اب بتائیں کیا حکم ہے؟"

اس پر انسپکٹر مسکرایا۔ اس نے نحیف و نزار سلیم شاہد کو ایک ڈھیلا سلوٹ مارا اور اسکوٹر پر بیٹھ کر نکل گیا۔ میرے کانپنے کو دیکھ کر وہ کھل کر ہنسا اور بولا۔ "اگر بادہ خواری کی ہوتی تو یہ حال نہ ہوتا۔ بادہ خوار کو خدا نے بچنے کے سوگر سکھائے ہوتے ہیں۔"

اور یہ سچ ہے۔ وہ کئی مرتبہ شراب کے ہاتھوں ادھر ادھر ہوتے بچا کہ اس کی لک (luck) اور اس کا ذہن ہر وقت جاگتا ہے۔ ایک مرتبہ جب وہ بینک کا ۳۵ کروڑ روپے کا خزانہ کسی دوسرے شہر لے کر جارہا تھا' خزانہ گاڑی میں لدوا کر اور پولیس گارڈ کو اس کی حفاظت پر مامور کر کے سلیم شاہد آزاد ہو گیا۔ گاڑی چھوٹنے میں گھنٹہ بھر تھا سو اس سے رہا نہ گیا۔ رکشا لے کر ریگل چوک پہنچا' شراب خریدی دوبارہ رکشے میں سوار ہوا ہی تھا کہ پولیس والے نے دبوچ لیا اور سول لائن تھانے میں لے گیا۔

جوں جوں گاڑی چھوٹنے کا وقت قریب آرہا تھا' اندر سے اس کی جان نکلی جارہی تھی۔ مگر وہ حاضر ذہن کے ساتھ مسکراتا رہا اور پولیس والوں کو ذرا بھی شبہ نہ ہونے دیا کہ اسے اس قدر جلدی ہے۔ وہ اپنے مضبوط اعصاب کے باعث ان سے کھلی ڈھلی باتیں کرنے لگا۔ اس کے پاس شراب کا ادھا اور سینتیس روپے پچاس پیسے کے علاوہ کچھ نہیں تھا جو پولیس والوں نے لے لیے تھے .... اس نے پہلے خدا کو .... اور پھر اپنے ساتھ کسی محفل میں شریک ہونے والے ڈی ایس پی کو یاد کیا۔ سلیم شاہد نے نگاہ اٹھائی .... اس کا مقدر کہیے یا اتفاق .... ڈی ایس پی سامنے کافی فاصلے پر دکھائی پڑا۔ سلیم شاہد نے مجسم آواز بن کر پوری طاقت سے نعرہ لگایا .... "ڈار صاحب" .... سول لائن کے تھانے نے اتنی

اونچی چانگر کبھی نہ سنی تھی۔ جس میں اس ہرن کی چیخ بھی شامل تھی جو شکار ہونے کو ہوتا ہے۔ ڈار صاحب قریب آئے۔ اس سے پہلے کہ سلیم شاہد کو پہچان پائیں' سلیم شاہد سو آدمیوں کی قوت سے ان سے لپٹ گیا اور یہی وہ منظر تھا جسے دیکھ کر پولیس کے بہت سوں نے بہ ظاہر ڈی ایس پی صاحب کو سلوٹ کیا حالاں کہ اندر سے ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سلیم شاہد کا ماتھا چوم لیں۔

دونوں جدا ہوئے تو ڈار صاحب نے پوچھا۔ "حکم؟"

"میرا ادھا واپس دلا دیں۔" ڈار صاحب نے گھور کر ابھی نہیں دیکھا تھا کہ ادھا سلیم شاہد کی جیب میں آ گیا۔ "آئیں......." ڈار صاحب نے دعوت دیتے ہوئے کہا۔ "اندر میرے کمرے میں آئیں۔"

اندر نہیں ..... سلیم شاہد دھاڑا۔ "باہر..... بس اتنی مہربانی کر دیں کہ میرے سینتیس روپے پچاس پیسے بھی واپس دلوا دیں۔ اور ایک عدد رکشا بھی...... کہ ٹائم کم ہے اور فاصلہ زیادہ ہے۔"

حکم حاکم کا...... جو مزہ سلیم شاہد کو اس دن آیا ہو گا شاید زندگی میں پھر کبھی نہ آ سکے۔ چشم زدن میں مبلغ سینتیس روپے پچاس پیسے مع ایک تیز رفتار رکشے کے حاضر کیے گئے اور بہت سے باوردی اور کچھ بے وردی سپاہیوں نے سلیم شاہد کو یوں الوداع کیا...... جیسے سلیم شاہد حج پر جا رہا ہو۔ سلیم شاہد نے رکشے والے کو راستے ہی میں پیسے چکا دیے تھے تاکہ اسٹیشن پر چھلانگ لگا کر بھاگ سکے اور یقین کیجیے جب وہ پھولتے سینے اور لٹکتی زبان سے بھاگ کر پلیٹ فارم پر آیا تو گاڑی رینگ رہی تھی اور وہ اس میں لپک کر یوں چڑھ گیا جس طرح پہلی مرتبہ لپک کر ٹی ہاؤس میں داخل ہوا ہو گا۔

انھی اتفاقات اور حادثات کی بنا پر میں اسے خوش قسمت کہتا ہوں۔ وہ ایسا زرخیز آدمی ہے کہ واقعات لمحہ لمحہ زنجیر کیے جا سکتے ہیں مگر مسعود منور کے ساتھ سلیم شاہد جب اپنی دانست میں ریگل کی جانب جا رہا تھا کہ دونوں ناصر باغ (گول باغ) پہنچ گئے' ظاہر ہے ہوش میں نہیں تھے۔ مگر اس قدر ہوش ضرور تھا کہ پچاس کا نوٹ اس لیے نہ نکالا کہ جن پولیس والوں سے پالا پڑا تھا' وہ صرف چار روپے مانگتے تھے۔ سلیم شاہد کے پاس پچاس کا نوٹ تھا اور مسعود منور کے پاس دو روپے تھے دونوں ...... دو سپاہیوں کو قائل کرتے رہے کہ ان کے لیے دو ہی روپے کافی ہیں۔ انھیں ڈر تھا کہ پچاس کا نوٹ دیکھ کر وہ سارے کا سارا ہڑپ کر جائیں گے۔ اسی سے نوشی اور پھر بے ہوشی میں انھوں نے جب ضرورت سے زیادہ ہوشیاری شامل کر دی تو اس کے سبب رات حوالات میں بسر کی۔ یہ حوالات پرانی انارکلی کے آئیڈیل تھانے کی تھی۔ بعد میں سنا گیا کہ رات بھر انھوں نے مسعود مفتی کا نام لے لے کر پولیس والوں کو بہت ڈرایا دھمکایا (جو ان دنوں لاہور کے ڈی سی تھے) دونوں بار بار اصرار کرتے رہے کہ ہم نے مسعود مفتی کے ساتھ بیٹھ کر پی ہے۔ اسے بھی بلا کر یہاں بند کرو مسعود مفتی نے جو کہ اس نعمت سے محروم تھا یہ واقعہ سنا تو مسکرا دیا اور حبیب جالب کے کہنے پر اسی مسعود مفتی نے مجسٹریٹ سے نرم سزا کی سفارش بھی کی۔ یہ سفارش بہت کام آئی اور نواب محمد احمد خاں اعزازی مجسٹریٹ نے اپنا تاریخی فیصلہ لکھواتے ہوئے جب یہ لکھوایا کہ "شراب پی کر غل غپاڑا کر رہے تھے" تو ریڈر سے اس جملے کو کٹوا دیا اور پھر اصلاح یوں کی کہ "شراب پی

کروا دیا کر رہے تھے۔" اس نے دونوں کو بتیس بتیس روپے جرمانہ کر کے رہا کر دیا۔ اور یوں یہ قصہ خوش بختی پر تمام ہوا۔

سلیم شاہد میرے نزدیک بہترین غزل گو ہے۔ بہترین الفاظ کو بہترین ترتیب میں سجانے والا یہ عمدہ شاعر جب مشاعرے میں اپنی غزل سناتا ہے تو لگتا ہے کوئی بچہ کرسٹل کے نوادرات کو تہس نہس کر رہا ہے۔ اچھے سخن شناس کو بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ پر لطف پلاؤ کے ساتھ وہ کنکر بھی نگل رہا ہے مگر اسے لہجے کے توازن کی پروا ہے نہ ٹھنک کی' نہ داد کی نہ ہوٹنگ کی بلکہ بعض اوقات تو یہ لگتا ہے کہ وہ خود سامعین کو ہوٹ کر رہا ہے۔ وہ اپنا کلام سناتے ہوئے اس کا ثبوت ضرور دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی بڑے مشاعرے میں وہ بڑی بڑی شخصیات کے جلو میں اس پل صراط سے صحیح سالم گزر جائے۔ مگر یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ اپنی روایت کا نشان نہ چھوڑے۔ یوں اس کا ذہن ایک ہی وقت میں کئی محاذوں پر ڈٹا رہتا ہے۔ بالکل سیاست دانوں کی طرح ...... اس کی جیب میں ایک سے ایک اچھا داؤ پرانے سکوں کی طرح کھنکتا ہے تو وہ چیلنج سامنے ہو نہ ہو داؤ ضرور لگاتا ہے۔ کوئی رکاوٹ بنے تو کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے' کوئی مزاحم نہ ہو تو بے مزہ ہو کر پسپائی اختیار کرتا ہے۔ اس فیلڈ میں وہ اس وقت سے ہے جب اس نے حلقہ ارباب ذوق کے متوازی ایک تنظیم قائم کر لی تھی۔ نام اس کا "اردو مجلس" رکھا گیا اور گرما گرم جلسے ہونے لگے۔ سب نئے پرانے جنہیں حلقے والے قریب نہ آنے دیتے تھے' ان جلسوں کی رونق بنے۔ چند ماہ بعد سلیم شاہد کے اندر کے سیاست دان نے کروٹ بدلی اور اس نے الیکشن اناؤنس کر دیا اور اس گھی کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلی سے نکالنے کی اس طرح ٹھانی کہ سیکرٹری شپ افتخار جالب کو آفر کی مگر الیکشن مجھے لڑوا دیا۔ جب میرا نام پیش ہوا تو افتخار جالب نے جو ہم سب کے لیے قابل احترام اور سینئر تھے اور بہت دور رس انسان ہیں' اپنا نام واپس لے کر مجھے سیکرٹری تو بنوا دیا' تاہم مجھے یہی لگا کہ میں استعمال ہو چکا ہوں کیوں کہ عباس اطہر جو افتخار جالب کو اپنا گرو مانتا تھا مجھ سے بری طرح روٹھ گیا مگر سلیم شاہد کو اس ساری گیم میں بڑا لطف آیا۔ کیوں کہ اس نے "اردو مجلس" کا عہدہ قبول نہ کر کے اپنے آپ کو "حلقہ ارباب ذوق" کا الیکشن لڑنے کا اہل ثابت کر دیا (کسی دوسری انجمن کا عہدہ دار حلقے کے کسی عہدہ کے لیے الیکشن نہیں لڑ سکتا) اور واقعی وہ اس کے بعد "حلقہ ارباب ذوق" کا جوائنٹ سیکرٹری منتخب بھی ہو گیا جب کہ ان دنوں میری کہانی تک حلقے کے پروگرام میں شیڈول نہیں ہوئی تھی۔ اور میں جو کہتا ہوں کہ اس کے اندر ہر دم ایک سیاست داں' ایک شاعر کلبلاتا رہتا ہے تو یہ بہت حد تک درست ہے۔ عجیب اور اصل بات یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں اپنی کیپیسٹی سے زیادہ خرچ کرتا ہے خواہ وہ عقل ہی کیوں نہ ہو۔ گھر میں اس کی بات سنی جاتی ہے اور اسے مدبر سمجھا جاتا ہے' دوست اسے مدبر مانیں یا نہ مانیں...... وہ دوستوں کے لیے اپنے دل میں ایک تنبو تانے رہتا ہے۔ سب کے دکھ سنتا ہے' مشورہ بھی دیتا ہے' البتہ دوستوں کو اس کا مشورہ پسند نہ آئے تو وہ کیا کرے۔ لیکن یہ طے ہے کہ دوسروں کے لیے جب وہ کچھ نہ کچھ کرتا ہے تو خلوص دل سے' اندر باہر سے' ایک ہو کر۔ اس کے لباس پر سیاست کے چھینٹے تو ہیں مگر دل بے داغ ہے اگر کوئی نقش سویدا تھا بھی

........تو اس کی ریٹائرمنٹ نے اسے دھو دیا ہے۔

ساری باتیں اپنی جگہ........ نئے غزل گو کے طور پر اس کی شاعری اعتماد کا ایک ایسا نشان ہے جسے نظر انداز کرنا نئے شعور سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ اس کے لہجے اور وژن کا جمال اسے ایک خوب صورت شاعر کے طور پر پیش کرتا ہے' جس نے کم لکھنے کے باوجود........ سلیقے اور حسن کاری سے داستان رقم کی ہے۔ وہ زبان کا ادا شناس نہ سہی' لفظ کا مزاج دان تو ہے۔ اسی باعث وہ لفظ کو تخلیقی سطح پر پرکھنے اور سجانے کا ہنر جان گیا ہے۔ "صبح سفر" سے "خواب سرا" تک اس ذہین شاعر کے بہت سے ایسے اشعار ملیں گے جو دلوں پر نقش ہیں اور نقش رہیں گے۔ وہ ایک ایسا ونجارا ہے جس کے چھابے میں ہر رنگ کی ہر شے موجود ہے جو اسے تو آسودہ رکھتی ہی ہے قاری کو بھی آسودہ ذہن کرتی ہے۔ خدا اس ونجارے کو سلامت رکھے' صحت مند رکھے اور خوش رکھے۔

ممتاز رفیق

بچہ جگت باز..... عبیداللہ علیم

یہ کائنات کے پہلے آدمی ہیں جنھیں ایک بے غرض درویش کی محبت لے ڈوبی۔ لوگ نفرت کا شکار ہو جاتے ہیں انھیں سلیم احمد کی محبت نے مار دیا۔ وہ بندہ بے بدل تو خیر اپنی سرشت سے مجبور تھا کہ اس کے لیے محبت کے علاوہ کچھ اور ممکن ہی نہ تھا، تعجب تو ان پر ہوتا ہے کہ انھوں نے محبت میں بھی بھٹکنے کی راہ نکال لی۔ سلیم بھائی نے ان کی ابتدائی شاعری میں ایک چمک دیکھ کر امکانات پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں موضوع سخن بنایا تھا، کمال تو ان کا ہے کہ انھوں نے کم لکھے کو بہت جانا اور مسند پر چڑھ بیٹھے۔ بیٹھنے اور بٹھائے جانے میں جو نزاکتیں مضمر ہیں اس سے یہ بے چارے بے خبر ہے اور ابھی مسند نشیں ہوئے چند ساعتیں ہی گزری تھیں کہ تختے نکل گئے اور ان کا تختہ ہو گیا۔

اب یہ ایک ایسے پرندے کی طرح ہیں جو بساط سے اونچی اڑان کے شوق میں اپنی رہی سہی قوت پرواز بھی کھو بیٹھے اور کسی چھوٹی سی پہاڑی پر ڈیرہ جمائے بلند آواز میں معصوم ہم جنسوں پر کام یاب پرواز کا رعب گانٹھنے لگے۔ ان کے ساتھ ساتھ اکثر مجھے اس کمہار کی یاد آتی ہے جس نے مہارت کے زعم میں اپنا چاک اٹھا پھینکا تھا اور پھر اس بھول کی پاداش میں اسے اپنی انگلیاں قلم کرنی پڑی تھیں۔

لمبا چوڑا قد کاٹھ، زردی مائل اجلی رنگت، محبت اور نرمی سے محروم الق بلق چالاک آنکھیں اور داہنے گال کی ہڈی کے قریب ایک موٹا سا مسہ جس کی سیاہی کہیں اندر سرایت کر گئی ہے، اور زخم لگاتی ہوئی بے لگام زبان اور بال بہت لانبے اور منتشر جیسے صافہ ابھی ابھی سر سے گرا ہو اور داڑھی ان کے اعتقاد کی طرح کبھی بہت کم اور کبھی بہت زیادہ اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا مزاج اور شاعری ان کا شوق اور جگت بازی وجہ افتخار ٹھہری۔ جگت بازی کے بہاؤ میں بہہ کر کبھی کبھی یہ وہاں تک جا پہنچتے ہیں جہاں لطیف اور کثیف کا فرق مٹ جاتا ہے۔ جب یہ اپنے جیسے بے تکلف دوستوں میں ہوں تو غیبت کی لونڈی اور لڑکیوں کی لذیذ کہانیاں چٹخارے بھرتی ان کے بیچ اٹھلاتی پھرتی ہیں اور شاعری بھی کہ جس سے ان کا سلوک خاصا سوتیلے پن کا سا ہے، کبھی کبھار ان کی محفل میں اپنی چھب دکھلا کر کہیں جا چھپتی ہے۔

محبت سے محرومی ان کا ایک بڑا المیہ ہے۔ دراصل محبت سے انھوں نے ایک عجب کاروبار کا سا رشتہ استوار کر رکھا ہے کہ جب ذرا گھاٹا ہوا دکان بدل لی۔ جوانی کے دہکتے دنوں میں کہ جب ان میں سچ کی ایک رمق زندہ تھی، انھوں نے صحرا کی ہوا جیسی آزاد اور نیم کی سی کڑوی ایک خاتون سے عشق اختیار کیا

لیکن بدی کا یہ پھول جب ان کے کوٹ کے کالر پر لگا' مرجھانے لگا تو انھوں نے اسے وہاں سے نوچ کر گل دان میں لگا دیا اور پھر کچھ ہی عرصے میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ ایسا کوئی پھول کبھی ان کی زندگی میں کھلا تھا۔ اب سنا ہے کہ یہ ایک ہم وار زندگی گزار رہے ہیں اور انھیں ایک کنبے کا تحفظ حاصل ہے' شاید سیر کو سوا سیر ٹکرا گیا ہے جب ہی موصوف ایک عرصے سے کولھو سے بندھے بیٹھے ہیں۔

جن دنوں نگار خانے میں ان کا طوطی بولتا تھا' جناب کی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کا کمرہ شہر بھر کے بونے شاعروں اور ادیبوں' انا کو گرما دینے والی داد و تحسین' سگریٹ کے دھوئیں' چائے کی پیالیوں اور مخالفین کے خلاف جاری کیے جانے والے فتووں سے بھرا رہتا اور موصوف کہ اس بارات کے دولھا ہوتے اپنی انائے بیمار کے لیے مزید روگ اکٹھا کرتے رہتے اور جب رات گئے یہ منڈلی برخاست ہوتی تو میرے ممدوح کی گردن کا ایک آدھ اسپرنگ اور کم ہو چکا ہوتا۔ آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ ان کے لیے گردن جھکا کر زمین دیکھنا بھی ممکن نہ رہا اور جب آدمی زمین سے اپنا رشتا منقطع کر لے تو اس کا توازن کسی بھی وقت بگڑ سکتا ہے۔ یوں یہ بڑے چوکس رہتے ہیں کہ کہیں ان کی کسی غلطی کے باعث ڈیڑھ ٹانگ پر کھڑی شہرت کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے' لیکن جب معاملہ انا کا ہو تو بیمار انا حواس کھو بیٹھتا ہے اور ہمیں اپنے چاروں طرف بکرے ممیاتے سنائی دیتے ہیں :

پہلا شاعر میر ہوا اور اس کے بعد ہوں میں

میں حیران ہوں کہ انھوں نے کس دل سے میر کو اپنے سے اول گردانا؟ شاید یہ ان کی کسر نفسی تھی یا پھر کوئی ایسا رمز جس کے بھید ان جیسے "پہنچے" ہوئے لوگوں پر ہی کھلتے ہیں۔ مجھے اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ لوگوں نے ان کی اس بات پر اتنا واویلا ہی کیوں مچایا؟ کون نہیں جانتا کہ چھوٹے منھ سے اتنی بڑی بات کوئی غیر متوازن شخص ہی کہہ سکتا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں ایک شک اور بھی ہے کہ شاید یہ سب کہا ہی اس لیے گیا تھا کہ یہ ہنگامہ کھڑا ہو اور ان کی ذات گرامی موضوع بحث بن سکے۔

"تدبیر" کچھ تو بہر "خرافات" چاہیے

یہ ایک ایسے آدمی ہیں جو شاعری' عشق اور صحرا پوری سچائی سے اختیار کر ہی نہیں سکتے کہ یہ تینوں ایک مخصوص دیوانگی کا مظہر ہیں اور یہ ٹھہرے چار کھونٹ چالاک ...... کیوں کہ اگر شاعری میں شہرت نہ ملے' عشق میں کچھ کھو دینے کا خدشہ ہو اور صحرا میں صرف پیاس اور آبلہ پائی ملے تو انھیں اختیار کرنے کا فایدہ؟ ...... یہ ایک "کھرے" آدمی ہیں۔ شعر لکھے تو شہرت کے لیے' عشق کیا تو اس التزام کے ساتھ کہ کہیں کوئی خراش نہ آ جائے اور صحرا...... تو اس میں ان جیسے لوگوں کو سونے کا حوصلہ کہاں؟

ابتدا میں کہ جب ان میں سچ کی کوئی بوند لشکارے مارتی تھی تو انھوں نے چند اچھے شعر لکھے اور لوگوں میں گمان پیدا ہوا کہ شاید ایک زندہ آواز وجود پا چکی ہے لیکن ...... اس وقت تمام توقعات دم توڑ گئیں جب انھوں نے اپنی غزلیں خوش گلو فن کاروں سے گوا کر داد سمیٹنے کا باقاعدہ ایک منصوبہ شروع کر دیا۔ انھوں نے مشاعرے بھی خوب لوٹے اور شہرت بھی اچھی خاصی کمائی' جس میں ان کی ہنرمندی کم

اور سازو آواز کا جادو زیادہ سر چڑھ کر بولا۔ لیکن جیسے ہی میدان مارنے کے لیے منصوبہ بندی اور اہتمام کا آغاز ہوا' ان کے ننھے منے چراغ کی لو تھرتھرانے لگی اور وہ راستا جو خاصا ہموار اور گل زار نظر آتا تھا یکایک اجاڑ اور مخدوش نظر آنے لگا اور پھر یہ تھے اور کچے پکے نوجوانوں کا مختصر گروہ جسے ہمارے دوست نے بے راہ کرنے کا بیڑا اٹھالیا تھا۔ وہ ان میں سے ہر ایک کو "غیر معمولی" ہونے کا یقین دلا رہے تھے۔ لیکن یہ تماشا بھی چند روز کا تھا جوں ہی انھوں نے نگار خانہ ترک کیا یہ بھیڑ بھی چھٹنے لگی اور موصوف چاند چرا ستارا آنکھوں کے ساتھ "مٹی کا دیا" لیے جو کبھی لڑنے میں مشغول ہو گئے۔ اب وہ تھے اور شہر بھر کی چھوٹی بڑی ادبی محفلیں' جنھیں یہ اپنی جگت بازی کے زور پر بڑی آسانی سے اکھاڑے میں بدل دیتے۔ ان کے اس فن کارانہ کمال کا تمام تر انحصار اس ہنرمندی پر ہے جسے انھوں نے چالاکی' مکاری اور اداکاری کے آمیزے سے تیار کیا ہے۔

مجھے انھیں دیکھ کر بے حد دکھ ہوتا ہے کہ کسی ذہین آدمی کو ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھنا اچھا خاصا اذیت ناک تجربہ ہے۔ اپنے گرد ذہانت سے لگائی ہوئی اس جنتم میں جھلس کر میرا یہ دوست اپنی ہیئت کھو چکا ہے اور اب آہستہ آہستہ معدوم ہوتا جارہا ہے اور کون جانے کل کلاں یہ وقت بھی آجائے کہ اسے کھوجنے کے لیے ردی کتابوں کے ڈھیر میں غوطے لگانے پڑیں کہ اب جو کچھ تھوڑا بہت یہ موجود ہیں تو اپنی ان کتابوں میں کہ جنھیں فروخت کرنے میں اب بے درد ردی فروش بھی زیادہ چست اور سرگرم نظر نہیں آتا۔ کسی نے سچ کہا کہ "انسان اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔" یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی زبان تلے دفن کردیے گئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

محیط اسمٰعیل

قینچی بردار خاتونِ کتب خانہ

شی (She) یعنی وہ' ماہ یعنی چاند........ محترمہ اردو ادب کی دنیا کا چاند ہے۔ ہو آنے والوں نے بتایا ہے کہ چاند دو چیزوں پر مشتمل ہے ایک بنجر زمین' دوسرے پتھر...... اس کے پہاڑ اور چٹان نزدیک کی نظر والوں کو بھلے نہیں لگتے تو دور کی نظر والوں کو بُرے نہیں لگتے۔

ایک مدت سے جن صاحبوں کی اس پر نظر ہے' وہ "صاحبِ نظر" کہلاتے ہیں جب کہ عام نظریں اس تاک میں ہوتی ہیں کہ موصوفہ گزر جائے تو سکون کا سانس لیا جاسکے۔

جب یہ کسی گلی سے گزر رہی ہو تو وہاں کی آوارہ بلیاں اس کی چال سے دھوکا کھا کر دور تک پیچھے پیچھے چلتی ہیں اور اپنی بھی بھول جاتی ہیں۔

آغاز بچوں کی کہانیاں مرتب کرنے سے کیا۔ اب بڑے بڑے ادیبوں کو اپنے کارناموں کی ایسی ایسی کہانیاں سنا چکی ہیں کہ وہ اسے دیکھتے ہی بچوں کی طرح مچل مچل اٹھتے ہیں۔

تعلقاتِ عامہ میں اتنی پکی کہ اسے تعلقاتِ اماں کہا جاسکتا ہے اس کے باوصف جہاں دیدہ افسر اسے دیکھتے ہی "باپ رے باپ" کہہ اٹھتے ہیں۔

اکثر ویگن میں سفر کرتے ہوئے ترجیح آگے کی نشست کو دیتی ہے..... کسی ادارے کا ناظم ہو یا ویگن ڈرائیور' موصوفہ برابری کا حق ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ ویگنوں اور اداروں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں میں سواریاں ہوں یا عملہ پیچھے پیچھے ہوتے ہیں۔ دفاتر میں ان کے پیچھے اس لیے ہوتے ہیں کہ موصوفہ ایک بار باہر نکل جائے تو فوراً" دروازہ بھیڑ اور اندر سے کنڈی لگا کر اپنے باقی ماندہ افسر کو بچاسکیں۔ ہمارے معاشرے میں کاغذ چننے والیاں بہت ہیں مگر ان میں کوئی بھی محترمہ کی طرح ادبی کاغذ چننے کا ملکہ نہیں رکھتی۔

محترمہ کو قینچی مار کہ خاتون بنانے میں ناشروں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اسی لیے جب وہ اپنی مہم سے لوٹے تو ناشر اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ پاکستان بالخصوص پنجاب کے وہ کتب خانے جو علم و ادب کی حد میں آئے اس کے ہتھیار کی زد میں آئے۔ اس قینچی بردار خاتون کا "سبز قدم" آہستہ آہستہ واضح ہو رہا ہے۔ بعض لائبریری والوں نے اندر کی آنکھیں کھول لی ہیں اور موصوفہ پر دروازے بند کرنے کی ناکام سعی کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ ادارے اور دانش ور اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں اور موصوفہ کو اپنے

کتب خانے میں پروانہ وار گھسنے کا پروانہ جاری کر دیتے ہیں۔ اگر کسی بھی کتب خانے سے کتاب، مضمون یا ورق نکال لانا علم کی عصمت دری ہے تو یہ عصمت دری ایک خاتون کے ہاتھوں دیکھ کر شریف النفس لائبریرین اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ بالفرض رواں صدی کے آخر تک تمام کتب خانے اہم کتابوں سے محروم ہو جائیں تب بھی محترمہ نچی یا چہار دیواری میں بیٹھنے والی نہیں کیوں کہ شخصی کتب خانے کئی گنا (اور کئی گناہ) اس کی نظر میں ہیں۔

مردوں کے پاس جواں مردی سے بیٹھی ان کے شخصی کتب خانے میں موجود نایاب کتب سے متعلق کرید کرتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اہم دستاویز کی ایسی جاسوس کہ مدِ مقابل کچھ چھپانا چاہ رہا ہو تو بُو پالیتی ہے۔ ادیب مرد اس کے مطلب کا راز آسانی سے اُگل نہ رہا ہو تو اتنا قریب آجاتی ہے کہ قرب کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

کراچی میں مقیم ایک محقّق سے ملاقات نہ ہونے کے باوصف معلوم کر لیا تھا کہ ان کا کتب خانہ پورے برصغیر میں بہت اہم ہے۔ دانا کو دانہ ڈالنے کے لیے ایک کتاب کا انتساب ان صاحب کے نام کر دیا، دوسروں کے نام اب تک کئی کتابوں کا انتساب کرنے کا سبب ان کے عہدے اور منصب ہیں۔

محترمہ کا بیگ تخریب کاروں کے بیگ سے زیادہ تباہ کن ہے۔ تخریب کار حادثے کی جگہ دوبارہ نہیں آتے۔ محترمہ پوری ڈھٹائی سے اپنی شکار گاہوں پر بار بار نمودار ہوتی ہے۔ تخریب کار چند افراد کو صدمہ پہنچا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ محترمہ کی حرکاتِ قینچیات نے سیکڑوں کے پیاسے ذہنوں کو دھچکے پر دھچکا لگایا ہے، جب وہ پڑھتے ہوئے تراشیدہ مقام (جائے حادثہ) پر پہنچتے ہیں، تلملا اٹھتے ہیں۔

محترمہ کا ایک ناشر تو ہے نہیں۔ شرعاً" چار بھی ہوتے تو جائز شکایت کے لیے دروازے کھٹکھٹائے جاسکتے۔ حال ہی میں ایک مقامی ہفت روزہ میں لائبریریوں سے سینکڑوں نایاب کتب کی چوری کا انکشاف ہوا ہے مگر سنگ دل پبلشروں پر اس کا اثر ہوا نہ اس کی صحت پر۔

ڈائریکٹر جنرل پبلک لائبریریز زنانہ پولیس بھیج کر اس کے گھر چھاپہ ڈلوا دے تب بھی ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ کیوں کہ محترمہ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ علم کی روشنی جہاں جہاں موصوفہ پہنچا دیتی ہے، لائبریری والے خود وہاں نہیں پہنچ سکتے۔

محترمہ حوا کی بیٹی نہیں، ہوا کی بیٹی ہے۔ چناں چہ کوئی بھی کام ہوا کا رخ دیکھ کر کرتی ہے۔ بہت سے کتب خانوں میں پردے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ ایسا ماحول "حسنِ کارکردگی" کے لیے اس کو بہت پسند ہے۔ محترمہ اکثر لائبریری میں سہ پہر کے بعد داخل ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ گھریلو خواتین کے اٹھ کر جانے کا وقت ہوتا ہے۔ ایسی کار آمد تنہائی میں علم کی روشنی سمیٹنے کا کام، قینچی سنبھال لیتی ہے۔ ایک روز محترمہ کو جلدی تھی (شاید کسی کو وقت دے رکھا تھا) قینچی سے مطلوبہ تراشے لے کر تھیلے میں ٹھونسے جا رہی تھی کہ ایک خاتون اس منظر سے حیران پریشان پوچھ بیٹھیں۔ "بی بی یہ کیا کرتی ہو!" اس نے جواب دیا "اے بہن آپ کو نہیں معلوم بعض تحریریں نئی نسل کا اخلاق خراب کرتی ہیں۔" خاتون نے کہا۔ "ذرا ملاحظہ تو کراؤ

میں بھی دیکھوں!" موصوفہ کتابوں کا کام تمام کر کے اٹھتی ہوئی بولی۔ "بس یہ پڑھوگی تو کیا تمھارا اخلاق خراب نہ ہوگا!" سن کر خاتون نے اپنا "حسنِ اخلاق" اپنے برقع ہی میں رہنے دیا۔ محترمہ کا اخلاق آج تک اسی لیے خراب نہیں ہوا کہ یہ اپنے تراشے ہوئے مسودے نہیں پڑھتی۔ کسی کتاب کی مرتبہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اسے ایک مرتبہ پڑھے بھی۔

ایک دفعہ وہ بال بال بچی ...... قینچی نئی تھی' آواز سن کر لائبریرین محترمہ کی طرف بڑھا۔ محترمہ نے "مردانہ" آہٹ سنی تو پلک جھپک میں کتاب کو بند کر کے پرے دھکیل دیا۔ مگر قینچی ابھی ہاتھ میں تھی کہ لائبریرین سر پہ آ گیا اور پوچھا۔ "کیوں بی بی کون سی کتاب ذبح کر رہی تھیں؟" ایک ادائے خاص سے بولی۔ "یہ مذبح خانہ تو نہیں کتب خانہ ہے۔ میں تو ناخن تراش رہی تھی۔" یہ کہہ کر بیچاری سچ مچ اپنے خوب صورت ناخن کاٹنے لگی۔ جان بچانے یا جان چھڑانے کے لیے ایسی چھوٹی موٹی قربانیاں تو دینا ہی پڑتی ہیں۔ لائبریرین اپنی جگہ واپس آیا تو بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا۔ جھٹ اپنی پتلون والی جیب پر ہاتھ رکھا اور مطمئن ہوا کہ اس ناخن تراش نے اس کی جیب نہیں تراشی تھی۔

سارا کیا دھرا اس بولتی قینچی کا تھا۔ وہ لائبریری سے سیدھے قینچی والے کے پاس پہنچی اور آج کی ناکامی کا سارا غصہ نکالنے لگی۔ ہجوم میں چہ میگوئیاں ہوئیں کہ نئی نئی سان چڑھی معلوم ہوتی ہے۔ قینچی والے کے پاس ایسی کوئی قینچی نہیں تھی جو محترمہ کی زبان کا مقابلہ کرتی یا زبان کو ہمیشہ کے لیے مہذب کر دیتی' تنگ آ کر دکان دار نے ہاتھ جوڑے' خدا کا واسطہ دیا' دبے لفظوں میں کہا۔ "آہستہ بولو میری بیوی سن لے گی تو آ کر مجھے سان چڑھا دے گی کیوں کہ اس نے پہلے ہی تم سے بچ رہنے کو کہا ہے۔"

محترمہ اور بپھر کر کہنے لگی۔ "تمھیں وہ سان چڑھا دے گی' اور میں چاند چڑھا دوں گی۔ بڑے بڑے ادب کے تیس مار خاں میرے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہیں' تب میرے قد کی برابری کرتے ہیں۔" دکان دار سمجھ دار نکلا' بھاگ کھڑا ہوا۔ محترمہ بٹ صاحب کی طرح کم بولنے والی اور بالشت بھر کی تین چار قینچیاں بیگ میں ڈال کر لوہاری سے باہر آ گئی۔

محترمہ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ سارا شہر صرف پانچ دس روپے میں گھوم پھر آتی ہے۔ حالاں کہ اچھے سے اچھا کھاتی ہے۔ چائے بوتلوں کا شمار نہیں' تحفے تحائف میں عید' شب برات کی شرط نہیں۔ کسی کا ٹیلی فون نمبر اسی کے قلم سے لکھ کر دونوں چیزیں بیگ میں رکھ لیتی ہے تاکہ قلم دیکھ کر رابطہ کرنا یاد آئے۔ ملک بھر میں اب تک ہزاروں ٹیلی فون گھما چکی ہے' کیا مجال ایک روپے کا نوٹ اس کے پرس سے نکلا ہو۔ سرکاری' نیم سرکاری اور نجی اداروں میں ایک سے زیادہ ٹیلی فون سیٹ اس کے تصرف میں رہتے ہیں۔ بعض اوقات چونگا اتنی دیر تک پکڑے رکھتی ہے کہ بے چارہ "ڈیڈ" ہو جاتا ہے پھر اسے فنے منہ کہہ کر اس کے حال پر چھوڑ دوسرا پکڑ لیتی ہے۔ اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ فی ادارہ پچیس کالیں ضروری کرے۔

بعض اداروں کے شریف سربراہ اپنے ٹیلی فون آپریٹر کو محترمہ کے حوالے کر کے ضروری ٹیلی فون

کے لیے پی سی او (باہر) کا رخ کرتے ہیں۔ محترمہ کے نازک ذہن پر روز بہ روز بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔ ناشروں کا "دباؤ" الگ، ہر ہفتے ٹیلی فون ڈائریکٹری ڈائریکٹروں کے دفتروں گھروں کے نمبروں سے بھر جاتی ہے تو بہت سے خفیہ نمبر ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتے ہیں۔ بہت سوں کے بینک اکاؤنٹ نمبر اور بیلنس (اگر کچھ رہ گیا ہو تو) یاد رکھنا پڑتا ہے۔ خاص خاص ملاقاتوں کے لیے فلیٹ نمبر، مکان نمبر، گلی نمبر، ہوٹل نمبر .... اتنے نمبر کہ کر جواب دے جاتی ہے۔ نمبروں کی بھول چوک کے نتیجے میں نئی ملاقات بھی نیک شگون ثابت ہوتی ہے۔ تعلقات اب اتنے وسیع ہیں کہ ٹیلی فون نمبر بھول جانے کی صورت میں کوئی بھی چھ سات عدد ہندسے گھما کر پوچھ لیتی ہے "ہیلو کون صاحب بول رہے ہیں؟" قلمی نام ہو یا فلمی، شروع ہو جاتی ہے۔ رانگ نمبر ایک صورت میں ہوتا ہے جب دوسری طرف آواز نسوانی ہو۔

اس ماہر تراش خراش کو صنفِ نازک کہنا ہی زیادتی ہے، بہت محنتی ہے۔ ترتیب و تالیف کی راہ پر اتنی دور اب تک کوئی نہیں چلا۔ اسی کا دماغ ہے جو چل گیا ہے۔

اردو بازار میں علمی ادبی کتابوں کی ایسی دکانوں پر جہاں بندہ جوان یا نوجوان ہو پہنچ کر "محل نظر بے تکلفی" کے ساتھ خاص خاص کتابیں تحفے میں طلب کر لیتی ہے۔ دکان دار بخیل یا نامراد ہو تو کندھے سے لٹکے تھیلے کا زپ کھلا رکھتی ہے اور ہاتھ کی صفائی دکھا دیتی ہے ...... اکثر گاہکوں تک سے "فری" ہوتے ہوئے ان کی دلچسپیاں اور مصروفیات معلوم کرتی ہے۔ جب کوئی بے عمدہ نکلے تو اسے بے ہودہ کہہ کر اس کا پیچھا چھوڑ دیتی ہے۔

اکثر اداروں میں اسٹیشنری بے ترتیب پڑی محترمہ کو اچھی نہیں لگتی، میزوں کو صاف دیکھنا پسند کرتی ہے۔ کوئی نہ دیکھ رہا ہو تو میز صاف بھی کر دیتی ہے۔ دن دگنی، رات چگنی اس کی شہرت پر کسی کو حیران نہیں ہونا چاہیے کہ ادب میں مرد حضرات وافر اور خواتین نمک برابر ہوتی ہیں اور ہمارے ادیب بالخصوص "دل کے مریض" نمک سے پرہیز نہیں کرتے۔

ایک صاحب نے حد کر دی موصوفہ کے "اندھیرے اجالے" کا ذکر کرتے ہوئے ہزار نو سو روپے کے نئے نئے نوٹوں کی "اڑن طشتری" کا الزام دھر دیا اور یہ بھول گئے کہ انمول کتابوں کے مقابلے میں یہ رقم کچھ بھی نہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس روز کسی کے بیگ یا جیب سے اچھی رقم ہاتھ لگ جائے موصوفہ سیدھے کسی ہوٹل یا اپنے گھر جاتی ہے۔ اس طرح کوئی نایاب کتاب اس روز "چھو منتر" یا بے آبرو ہونے سے بچ جاتی ہے۔

☆ ○ ☆

بلند پایہ نقاد مظفر علی سید کے فکر انگیز مقالات کا مجموعہ

تنقید کی آزادی

قیمت : ۱۸۰ روپے

منفرد پیشکش، نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ

نعت رنگ

مرتب : صبیح رحمانی

غزلیں

ضیا جالندھری

وہ دکھ، وہ بے کلی، وہ خواب، وہ خیال نہیں
جو ہم تھے ہم نہیں، جو حال تھا وہ حال نہیں

نگاہِ تشنہ سے باہر کوئی جمال نہیں
خود اپنا جال ہوں میں، اس کے خدوخال نہیں

عطائے دوست ہے توفیقِ سینہ افروزی
یہ نیم شب کی تجلی ترا کمال نہیں

تمام عمر تلاشِ جواب میں گزری
یہاں تک آئے کہ اب خواہشِ سوال نہیں

سخن ہے سایہ، سخن ان کہی کا پردا ہے
یہاں بھی عجزِ بیاں ہے، بیانِ حال نہیں

وہ سن جو بن کہے دل کی تہوں میں جا اترے
سخن جو آئنۂ خامشی میں بال نہیں

وہی ہے بات پہ مطلب کچھ اور ہے اس کا
وہی ہیں لفظ پہ میرا ہم خیال نہیں

چھپا چھپا کے نہ رکھ آرزو کے زخم ضیا
گریز، دیر کا رستا ہے، اندمال نہیں

شہزاد احمد

ساخت ایسی ہے کہ بے ساختہ پن سے دیکھو
اسے آنکھوں سے نہیں سارے بدن سے دیکھو

وہ تو سورج ہے تمھیں راکھ بھی کر سکتا ہے
اسے جب دیکھنا ہو' اس کے گہن سے دیکھو

جس کی وسعت تمھیں دیوانہ بنا دیتی تھی
اب اسی دشت کو دیوار چمن سے دیکھو

گر تمھیں دیکھنا ہو' عشق کی گہرائی میں
اس کے چہرے سے نہیں اپنی لگن سے دیکھو

میں بچھا جاتا ہوں' پیروں میں زمیں کی صورت
تم مرا چاند بنو' مجھ کو گگن سے دیکھو

کب رواں ہوں گے' خلاؤں میں سفینے میرے
پھول کب کھلتے ہیں' پس طرزِ سخن سے دیکھو

ڈوب جائے گا کہ یہ شہر ابھر آئے گا
دیکھ سکتے ہو تو دریا کے چلن سے دیکھو

دوریاں ختم ہوئیں' فاصلے معدوم ہوئے
یار لوٹ آئے ہیں شہزاد کفن سے دیکھو

شہزاد احمد

کون کہتا ہے کہ دریا میں روانی کم ہے
میں جہاں ڈوب رہا ہوں وہاں پانی کم ہے

تیرگی کاش شگوفے کی طرح کھل اٹھتی
تیرے ہوتے ہوئے یہ رات سہانی کم ہے

بھول کر بھی کوئی سنتا نہیں روداد مری
واقعہ اس میں زیادہ ہے کہانی کم ہے

اے خدا پھر مرے جذبوں کو فراوانی دے
زندگی بھر کے لیے ایک جوانی کم ہے

یہی کہتا ہوں کہ آخر مجھے نیند آ ہی گئی
داستانِ شبِ غم اس کو سنانی کم ہے

میری آنکھوں میں یہ آنسو تو عطا ہیں اس کی
اس سے مل جائے تو کیا ایک نشانی کم ہے

میرے لہجے سے مرے درد کا اندازہ کر
مری باتوں میں اگر تلخ بیانی کم ہے

یہ محبت ہے کہ احساس ہے' محرومی ہے
میری آنکھوں میں بہت کچھ ہے' زبانی کم ہے

مجھے الزام دیے جاتے ہیں کیا کیا شہزاد
میری کیفیت دل آپ نے جانی کم ہے

محسن احسان

کھیل اب کے دکھائے ہمیں تقدیر نے ایسے
حلقے کبھی دیکھے نہیں زنجیر نے ایسے

گرتی تو کسی فرد کی آواز نہ آتی
چھت روک لی ٹوٹے ہوئے شہتیر نے ایسے

ہر آدمی مقروض رہے شہر ہوس میں
ڈھونڈے ہیں ہدف صاحبِ تدبیر نے ایسے

منزل پہ ہیں لیکن ہمیں منزل نہیں ملتی
کب حیلے تراشے نہیں تاخیر نے ایسے

ہم نیند میں بھی جن سے لرز اٹھتے ہیں اکثر
کچھ خواب دکھائے ہمیں تعبیر نے ایسے

ہر حرف ہے خورشید بکف شہرِ غزل کا
تخلیق کیے شعر بہت میرؔ نے ایسے

اب ہم ہیں اور اک وحشتِ آوارگی محسنؔ
در کھول دیے خواہشِ تشہیر نے ایسے

*

محسن احسان

ڈھلے نہ چہرۂ شب احتمال ایسا ہے
امیدوارِ سحر کو ملال ایسا ہے

ہر اک نگاہ ہے افسونِ خدّ و خال میں گم
طلسم خانۂ حسن و جمال ایسا ہے

گرفتِ فکر سے بالا رہا خدا کا وجود
یہ کارِ سہل بھی' کارِ محال ایسا ہے

مٹا سکی نہ اسے قربتوں کی سرشاری
مسافتوں کا یہ دکھ لازوال ایسا ہے

ہم آپ اپنی نگاہوں میں معتبر ٹھہرے
ہمارے شہر میں قحط الرجال ایسا ہے

کسی کو جراتِ گفتار ہو نہیں سکتی
کہ شہریار کا جاہ و جلال ایسا ہے

شکوہِ صاحبِ منصب پہ دل گرفتہ نہ ہو
کہ یہ عروج تو محسن زوال ایسا ہے

رضی اختر شوق

اپنے حصہ میں نہ موتی نہ خزانے آئے
ہم تو دریا میں فقط لہر اٹھانے آئے

پوچھنا ہو جسے تعمیرِ جہاں کا اسلوب
ان سے پوچھے جو یہاں خاک اڑانے آئے

آپ تصویر تھا نیرنگیٔ دنیا کے سبب
جس مصوّر کو یہاں رنگ لگانے آئے

اک وہی شخص نہ آیا کہ جسے آنا تھا
ایک دستک پہ زمانے کے زمانے آئے

زندگی میں نے ترے ناز اٹھائے ہیں بہت
کبھی تو بھی تو مرے ناز اٹھانے آئے

جو گُلو درد سے خالی ہے وہ زحمت نہ کرے
جس پہ واجب ہے وہی قرض چکانے آئے

آج محفل میں دیے بھی ہیں کئی دوست بھی ہیں
دیکھنا ہے کہ کسے کون جلانے آئے

☆

رضی اختر شوق

اے میرے لفظ قید مکاں سے نکل کے آ
اے میرے خلوتی مری جاں سے نکل کے آ

کب سے سنی نہیں ترے رنگوں کی گفتگو
اے میرے حسن میرے بیاں سے نکل کے آ

اے میرے عکس پھر سے دکھا دے مری جھلک
میں جس جگہ نہیں ہوں وہاں سے نکل کے آ

اے میری دید پھر سے کوئی انکشاف کر
اے روشنی سوادِ نہاں سے نکل کے آ

مجھ کو نکال میرے خلا سے مری نمود
میرے لیے زمین و زماں سے نکل کے آ

میرے گداز میری محبت کو جسم دے
میرے گواہ میرے بیاں سے نکل کے آ

آہو کوئی نشانہ کیے مدتیں ہوئیں
اے میرے تیر میری کماں سے نکل کے آ

اے میری موج میری روانی کو لہر دے
دل سے نکل کے آ کہ زباں سے نکل کے آ

پھر اپنے آنسوؤں سے چراغاں کروں تجھے
اے میرے سروِ شام خزاں سے نکل کے آ

تو خوش عقیدہ ہے تو مجھے منحرف نہ کر
کافر ہے تو تو شہرِ بتاں سے نکل کے آ

سب شوق تیرا حسنِ سخن مان جائیں ہم
کچھ داد لے کے کج کلہاں سے نکل کے آ

ظفر اقبال

کچھ اس کا گماں عکس تمہارے سے نکلتا
کوئی جو شرارا سا شرارے سے نکلتا

خود کو کسی خواہش پہ بیاباں میں گنواتے
ارماں کوئی دریا میں اتارے سے نکلتا

کچھ یوں ہی بگاڑی نہیں تھک ہار کے یہ شکل
کوئی تو نتیجہ بھی سنوارے سے نکلتا

بنتی کوئی' بتلایئے کیا بعد میں صورت
کچھ روز تو ہر کام اُدھارے سے نکلتا

ہم جس کو مٹانے میں ہی مصروف ہیں اب تک
وہ نقش نکلتا تو نکھارے سے نکلتا

بس ایک ہی بار آ کے وہ گھر لوٹ گیا کیوں
تھا ڈھونڈنا مجھ کو تو دوبارے سے نکلتا

مل لیتا ہے سب سے ہی' خوش اخلاق بہت ہے
لیکن کبھی میرے بھی پکارے سے نکلتا

بے کار بجاتا ہوں جو یہ بین شب و روز
ڈستا ہی مجھے' کچھ تو پٹارے سے نکلتا

الفاظ کا مجمع سا لگایا بھی ظفر نے
آخر کوئی معنی تو بچارے سے نکلتا

ظفر اقبال

جو پہلے تھی وہی خواہش دوبارہ کرنے والا ہوں
صدا تو دے نہیں سکتا، اشارہ کرنے والا ہوں

وہ جس پر زندگی بھر کا سخن میں نے سجایا تھا
اب اس کاغذ کو خود ہی پارہ پارہ کرنے والا ہوں

اسے بھی سادگی کی خو ہے رہنے اور سہنے میں
اور اس کے ساتھ ہی میں بھی گزارا کرنے والا ہوں

پتا چلتا نہیں کچھ بھی کہ خود وہ تنگ ہے مجھ سے
کہ میں ہی اس کے دریا سے کنارا کرنے والا ہوں

سمندر کو ستارہ کر چکا ہوں میں بہت پہلے
مگر، اس بار ساحل کو ستارہ کرنے والا ہوں

مرا یہ شعبدہ بھی خاص ہوگا، دیکھتے رہنا
جو میں کچھ دن میں شبنم کو شرارا کرنے والا ہوں

ہے جو کچھ آشکارا اس کو پھر مستور کردوں گا
چھپا رکھا ہے جو بھی' آشکارا کرنے والا ہوں

جو اس کا ماحصل ہوگا اسے پھر دیکھ لوں گا میں
ابھی تو اس منافعے کو خسارا کرنے والا ہوں

بہت حد تک' ظفر' مجھ کو پریشاں کرچکے ہو تم
سو' بندوبست اب میں بھی تمہارا کرنے والا ہوں

ظفر اقبال

کچھ فایدہ نہیں ہے کہ فرصت نہیں رہی
اب شاعری کسی کی ضرورت نہیں رہی

کچھ علم ہی نہیں تھا خصائص کا آپ کے
ویسے بھی ہم کو آپ سے صحبت نہیں رہی

ہم تو زبون و خوار تھے پہلے ہی اس قدر
کچھ آپ کی بھی شہر میں عزت نہیں رہی

ملتی ہے اب تو عام ہر اک چیز شہر میں
اب تو کسی طرح کی قباحت نہیں رہی

احوال دشمنوں کے ہیں اس سے بھی کچھ برے
کہتے ہیں دوستوں میں مروت نہیں رہی

یا خود انھوں نے کھینچ لیا ہاتھ ظلم سے
یا پھر انھیں کچھ ایسی فراغت نہیں رہی

ہیں دوسروں کے ساتھ بہت ٹھیک ٹھاک وہ
حاصل ہمیں ہی ان کی حمایت نہیں رہی

کچھ دوسری طرف کہیں ہم بھی نکل گئے
اور، کچھ انھیں بھی ہم سے محبت نہیں رہی

انبار لگ رہے ہیں اسی چیز کے، ظفر
جس کی ہمارے ہاں کوئی قیمت نہیں رہی

حنیف اسعدی

زباں پہ نام دم آہ سرد کس کا تھا
وہ کرب کیسا تھا دل میں وہ درد کس کا تھا

وہ کون تھا جو کسی کی تلاش میں گم تھا
وہ کوچہ کس کا تھا وہ کوچہ گرد کس کا تھا

ستم بھی جس کا سکوں بخش تھا تو کون تھا وہ
جو درد خود ہی دوا تھا وہ درد کس کا تھا

مرے لیے وہ کبھی اتنا بے قرار نہ تھا'
تو اس کے چہرے پہ پھر رنگ زرد کس کا تھا

اسے جدائی کا دکھ ہے نہ غم بچھڑنے کا
تو میرے ہاتھ میں وہ دست سرد کس کا تھا

وہ نقش پا جو مرا راہبر ہوا تھا کبھی
وہ کوہکن کا کہ صحرا نورد کس کا تھا

نہ اس نے ترک تعلق کیا نہ میں نے حنیف
تو پھر یہ دونوں میں [illegible] نبرد کس کا تھا

*

حنیف اسعدی

خود جو بیمار ہیں وہ دل کی دوا کیا دیں گے
اہل دنیا مجھے دنیا کے سوا کیا دیں گے

میری تخریب بھی اب ان کے مقدر میں نہیں
میں تو بجھنے کو ہوں یہ اور ہوا کیا دیں گے

جرم تو سارے غریبی کے ہیں ہم مجرم ہیں
یہ بتائیں کہ غریبی کی سزا کیا دیں گے

ان کے کشکول میں خود مانگے ہوئے ٹکڑے ہیں
مجھ گدا کو یہ تہی دست گدا کیا دیں گے

خشک پتے پہ گرے بوند تو گر پڑتا ہے
اب یہ بادل بھی مجھے نشوونما کیا دیں گے

اہل باطن تو مشیت پہ نظر رکھتے ہیں
قلب مردہ کو یہ جینے کی دعا کیا دیں گے

مقتدی ان کا ہوں جو سارے جہاں کے ہیں امام
یہ لٹیرے مجھے منزل کا پتا کیا دیں گے

پھر بھڑک اٹھے گا بجھتا ہوا احساس حنیف
دل جلانے کے سوا شعلہ نوا کیا دیں گے

توصیف تبسم

مطرب! تری آواز، ترے ساز میں کیا ہے
یہ نغمہ، مری روح میں غم گھول گیا ہے

رہنے دو ابھی تیرہ یونہی دل کے دریچے
شمعیں نہ جلاؤ کہ بہت تیز ہوا ہے

آواز سنو، شہرِ تمنا کے مکینو ......!
نغمہ کوئی دیوار سے سر پھوڑ رہا ہے

کیا خوش ہو کہ بند آنکھ سے آنسو نہیں گرتا
سوچو کہیں تنکوں سے بھی سیلاب رکا ہے

وہ دل جسے پھولوں کی رفاقت کا جنوں تھا،
اب زخم کی صورت مرے سینے سے لگا ہے

جو آگ ہے پہلو میں جلا دے نہ بدن کو
جو قرب کا لمحہ ہے سو جنگل کی ہوا ہے

توصیف تبسم

دل دیوانہ، غم عشق میں رسوا جو ہوا
دیکھنے وہ بھی چلے آئے، تماشا جو ہوا

اتنے تنہا تو نہ تھے روشنیوں میں دن کی
سارا غم دل میں سمٹ آیا، اندھیرا جو ہوا

کیسے شفاف غم جاں سے بھرے تھے ساغر
پی لیا زہر، تری آنکھ کا دھوکا جو ہوا

خاک اڑتی ہے دل و جاں میں تو روئیں کیوں کر
آنکھ دریا نہ ہوئی، غم کبھی صحرا جو ہوا

آؤ، اب ہم ہی ہر اک شیشے پہ ماریں پتھر
ہم ہی دیوانے ہوئے، ہم کو ہی سودا جو ہوا

ہائے کیا چیز ہے، مٹی کی محبت، توصیف
لوگ روئے تھے بہت، شہر اکیلا جو ہوا

افتخار عارف

جبینوں کو بحد تسلیم خم دیکھا گیا ہے
بہت نامطمئن آنکھوں میں نم دیکھا گیا ہے

کہیں جائے نماز شکر پر آنسو کی اک بوند
اسی قطرے میں دجلہ یم بہ یم دیکھا گیا ہے

سب آشفتہ سروں کا ایک ہی نعرہ کہ ہم ہیں
ہم آوازوں کو دل کا ہم قدم دیکھا گیا ہے

بیاض خواب رفتہ کیا عجب ترتیب پا جائے
کتاب جاں کا شیرازہ بہم دیکھا گیا ہے

ادھر اس چاند تارے سے ذرا مشرق کی جانب
نگوں ہوتا ہوا پرچم علم دیکھا گیا ہے

رفوئے زخم دیرینہ کی اک صورت تو نکلی
جدھر دیکھا نہیں تھا کم سے کم دیکھا گیا ہے

افتخار عارف

حجرہ جاں میں باغ کی جانب ایک نیا در باز کیا
ہم نے میر سے روتابی کی بدعت کا آغاز کیا

خوابوں کی پسپائی کے چرچے گلی گلی تھے جب ہم نے
دل کے ہاتھ پہ بیعت کرلی دنیا کو ناراض کیا

جانے وہ کیسا موسم تھا جس نے بھری بہار کے بعد
اس گل کو شادابی بخشی ہم کو دست دراز کیا

زندہ لفظ کے مد مقابل کیا اورنگ و طبل و علم
سارے سحر بکھر جائیں گے جب ہم نے اعجاز کیا

درد کی لے کا مدھم رکھنا عین ہنر تھا اور ہم نے
باغ نوا کے خلوتیوں کو خلق کا ہم آواز کیا

جمال پانی پتی

ڈوبنا جس کا ہو آسان، بچانا مشکل
ایسی کشتی کو کنارے سے لگانا مشکل

گھر میں جو گھر کے چراغوں کو بجھانے سے لگی
گھر کو اس آگ کے شعلوں سے بچانا مشکل

ہاتھ ٹوٹیں تو میں پاؤں سے چنوں راہ کے خار
دل ہی ٹوٹے تو ہے پھر پاؤں بڑھانا مشکل

عشق کی آگ میں جلنا تو نہیں کچھ دشوار
مگر اس آگ کو گل زار بنانا مشکل

مجھ کو آئینۂ فردا میں جو آتا ہے نظر
دیکھنا اس کا ہے آسان، دکھانا مشکل

سیلِ خوں سر سے گزرتا ہے تو گزرے لیکن
اب ہمیں کوچۂ قاتل سے اٹھانا مشکل

یوں ہی چڑھتا رہا گر درد کا دریا تو جمال
کشتیٔ جاں کو کنارے سے لگانا مشکل

☆

سحر انصاری

ہے دل اداس صفِ دوستاں سے جاتے ہوئے
ستارہ ٹوٹ گیا کہکشاں سے جاتے ہوئے

ہر ایک گام پہ نقشِ قدم نے پوچھا ہے
مسافروں کا پتا کارواں سے جاتے ہوئے

غبار چھوڑ گئے دل پہ خوش خیال سے لوگ
مسافتوں میں کہیں درمیاں سے جاتے ہوئے

خبر نہیں کہ کب انساں کو ہوش آتا ہے
یقیں سے جاتے ہوئے یا گماں سے جاتے ہوئے

ہماری فکر و نظر کے تمام پیمانے
زمیں کی سمت ہی تھے آسماں سے جاتے ہوئے

فرار آتشِ سوزاں پہ غور کر دیکھا
سکوں نہیں تپشِ قلب و جاں سے جاتے ہوئے

رہِ حیات میں سوچا نہیں سحرؔ ہم نے
قریب پڑتی ہے منزل کہاں سے جاتے ہوئے

امجد اسلام امجد

گردِ سفر میں بھول کے منزل کی راہ تک
پھر آ گئے ہیں لوگ نئی قتل گاہ تک

اک بے بسی کا جال ہے پھیلا چہار سو
اک بے کسی کی دھند ہے دل سے نگاہ تک

بالائے سطح آب تھے، جتنے تھے بے خبر
ابھرے نہیں ہیں وہ کہ جو پہنچے ہیں تھاہ تک

اک دوسرے پہ جان کا دینا تھا جس میں کھیل
اب رہ گیا ہے صرف وہ رشتہ نباہ تک

پھولوں سے اک بھری ہوئی بستی یہاں پہ تھی
اب دل پہ اس کا ہوتا نہیں اشتباہ تک

آتی ہے جب بہار تو آتی ہے ایک ساتھ
باغوں سے لے کے دشت میں اُگتی گیاہ تک

جانا ہے ہم کو خواب کی کشتی میں بیٹھ کر
کاجل سے اک بھری ہوئی چشم سیاہ تک

جذبات بجھ گئے ہوں تو کیسے جلے یہ دل
میر سپہ کا نام ہے اس کی سپاہ تک

امجد اب اس زمین پہ آنے کو ہے وہ دن
عالم کے ہاتھ پہنچیں گے عالم پناہ تک

امجد اسلام امجد

کلام کرتی نہیں، بولتی بھی جاتی ہے
تری نظر کو یہ کیسی زبان آتی ہے!

عجب تضاد میں پلتی ہے تیرے وصل کی آس
کہ ایک آگ بجھاتی ہے، اک لگاتی ہے

کبھی کبھی مجھے پہچانتی نہیں وہ آنکھ
کبھی چراغ سے چاروں طرف جلاتی ہے

یہ چار سو کا اندھیرا سمٹنے لگتا ہے
کچھ اس طرح تری آواز جگمگاتی ہے

یہ کوئی اور نہیں آگ ہے یہ اندر کی
بدن کی رات میں جو روشنی بچھاتی ہے

میں اس کو دیکھتا رہتا ہوں رات ڈھلنے تک
جو چاندنی تری گلیوں سے ہو کے آتی ہے

وہ دیکھتی ہے مجھے ایسی مست نظروں سے
مرے لہو میں کوئی آگ سرسراتی ہے

یہ وصل بھی امجد ہے کانچ کی چوڑی
کہ پہننے میں کئی بار ٹوٹ جاتی ہے

پیرزادہ قاسم

اداکاری میں بھی سو کرب کے پہلو نکل آئے
کہ فنکارانہ روتے تھے مگر آنسو نکل آئے

ہمیں اپنی ہی جانب اب سفر آغاز کرنا ہے
سو مثلِ نکہتِ گل ہو کے بے قابو نکل آئے

یہی بے نام پیکر حسن بن جائیں گے فردا کا
سخن مہکے، اگر کچھ عشق کی خوشبو نکل آئے

اسی امید پر ہم قتل ہوتے آئے ہیں اب تک
کہ کب قاتل کے پردے سے کوئی دلجو نکل آئے

کبھی وہ صبح بھی آئے کہ ہر شے سے سوا تاباں
بجائے مہر میرا عشق شعلہ رُو نکل آئے

سمجھتے تھے کہ مجبوری کی ظلمت ہی مقدر ہے
مگر پھر اس کی یادوں کے بہت جگنو نکل آئے

دلوں کو جیت لینا اس قدر آسان ہی کب تھا
مگر اب شعبدے ہیں اور بہت جادو نکل آئے

سفر کی انتہا تک ایک تازہ آس باقی ہے
کہ میں یہ موڑ کاٹوں اس طرف سے تو نکل آئے

*

پیرزادہ قاسم

اب حرف تمنا کو سماعت نہ ملے گی
بیچو گے اگر خواب تو قیمت نہ ملے گی

تشہیر کے بازار میں اے تازہ خریدار
زیبائشیں مل جائیں گی قامت نہ ملے گی

لمحوں کے تعاقب میں گزر جائیں گی صدیاں
یوں وقت تو مل جائے گا مہلت نہ ملے گی

سوچا ہی نہ تھا یوں بھی اسے یاد رکھیں گے
جب اس کو بھلانے کی بھی فرصت نہ ملے گی

اب منزل تعبیر میں ہے عشق بلا خیز
یعنی اسے پالینے سے راحت نہ ملے گی

تا عمر وہی کار زیاں ۔ عشق رہا یاد
حالاں کہ یہ معلوم تھا اجرت نہ ملے گی

تعبیر نظر آنے لگی خواب کی صورت
اب خواب ہی دیکھو گے بشارت نہ ملے گی

آئینہ صفت وقت: ترا حسن ہیں ہم لوگ
کل آئنے ترسیں گے تو صورت نہ ملے گی

*

حمیرا رحمان

کٹھ پتلی کا ایک تماشا مجھ میں رہتا ہے
نیند میں بھی اک جاگنے والا مجھ میں رہتا ہے

سورج اپنے لمس کی کتنی بھی شدت برسائے
اک ان دیکھے ابر کا ٹکڑا مجھ میں رہتا ہے

برگ اڑے پھر بکھر گئے اوراق لباسوں کے
اب ان پیڑوں کا سناٹا مجھ میں رہتا ہے

اس سے جو کہنا چاہا تھا میں نے کہا نہیں
پھر اب کیوں اس بات کا کانٹا مجھ میں رہتا ہے

وہ بھی حمیرا اسی حویلی کا اک باسی تھا
وہ بھی سب سے کٹ کے تنہا مجھ میں رہتا ہے

*

حمیرا رحمان

اوپر موٹی برف جمی ہے نیچے پانی ہے
ہر تصویر کے پس منظر میں یہی کہانی ہے

ایک ہجوم ہے اور اس میں اک چہرہ سب سے الگ
گئی پرانی یادوں کی سفاک نشانی ہے

خوش لہجوں میں چھپا ہوا سہما انجانا خوف
اپنے آپ سے ملتے رہنے کی حیرانی ہے

آنکھ ملا کر بات نہ کر پائے آئینہ بھی
لو دیکھی ہے باہر کا منظر طوفانی ہے

ہر آئندہ لمحہ پہلے سے بڑھ کر حیران
ہجرت کرنے والوں کی پہچان پرانی ہے

*

حمیرا رحمان

وہ رنگ رنگ دھوپ تھی کہ رات رات خواب ہے
یہ میں ہوں روشنی میں یا کوئی نیا سراب ہے

مرے قریب زندگی کی آب و تاب ہے وہی
اور آسمان پر وہی طلوع آفتاب ہے

ہرے بھرے وجود ٹہنیوں پہ نام لکھ چکے
بہار کیاریوں پہ اب کھلی ہوئی کتاب ہے

میں ایسے خواب سے پناہ مانگتی رہی سدا
کہ جس کے بعد رت جگوں کا بے کراں عذاب ہے

بجھی ہوئی ہنسی' جلے ہوئے گھروں کا خال و خد
کسی نئے سوال کا کوئی نیا جواب ہے

تمام شہر عکس عکس سربریدہ ہوگیا
یہ آئنوں کا ایک ایک فرد سے حساب ہے

کوئی تو ہنر پل حمیرا اپنے آپ کو ملے
کئی دنوں سے فرصتوں کا ذائقہ خراب ہے

*

ثروت حسین

فسونِ خاک، رنگِ آسماں حیرت میں رکھتا ہے
مجھے تو یہ درو بستِ جہاں حیرت میں رکھتا ہے

فرازِ کوہ پر آبِ زلال و یخ پیا میں نے
سرودِ چشمہ آبِ رواں حیرت میں رکھتا ہے

کبھی بوندوں کی رم جھم روک لیتی ہے قدم میرے
کبھی دروازہ کھلنے کا سماں حیرت میں رکھتا ہے

شگوفے پھوٹتے ہیں، پھول پھل آتے ہیں شاخوں پر
زمیں پر کاروبارِ گلستاں حیرت میں رکھتا ہے

عناصر کے مقابل اور زیرِ آسماں ثروت
کوئی تو ہے جو بہرِ امتحاں حیرت میں رکھتا ہے

صابر ظفر

روز و شب جو بھی ملے ہم کو، نرالے ہی ملے
نہ کٹی رات ستم کی، نہ اجالے ہی ملے

تیرے میخانے کے چرچے تھے بہت، لوگوں میں
ہم جو پہنچے تو ہمیں خالی پیالے ہی ملے

تیری تاریخ نے جن جن کو بھی زندہ لکھا
خود ملے وہ نہ ہمیں ان کے حوالے ہی ملے

ہم تو آواز اٹھاتے رہے ظالم کے خلاف
تیرے ہونٹوں پہ تو خود ساختہ، تالے ہی ملے

یہ وطن ایسا شجر ہے کہ ظفر جس کو یہاں
بیشتر لوگ جڑیں کاٹنے والے ہی ملے

صابر ظفر

جب مجھے اس نے اٹھایا خاک سے
تن بدن باہر ہوا پوشاک سے

ہوگیا مٹی میں مٹی آپ ہی
کیا ملا ہے کوزہ گر کو چاک سے

جو زباں سے بات کہہ سکتا نہیں
کہہ رہا ہوں دیدہ نم ناک سے

اس برہنہ زندگانی کے نقوش
کیا چھپاؤں اس بت بے باک سے

کیا سمیٹو گے کہ نکلے گی فقط
ایک ویرانی مری املاک سے

کیا اتر کے پانیوں میں' ڈوبنا
پوچھ لو' گہرائیاں' تیراک سے

تم عبث کرتے ہو اس کا انتظار
کون اترے گا ظفر افلاک سے

*

اعتبار ساجد

عجب یہ کرب کے دن ہیں گذر نہیں چکتے
کہ ناؤ ریت پہ ہے لوگ اتر نہیں چکتے

نجومیوں کی سلیٹیں چٹختی جاتی ہیں
ہتھیلیوں کے مقدر سنور نہیں چکتے

وہ ہاتھ اٹھ نہیں چکتا جو ڈور کھینچے گا
اذیتوں کے یہ عالم گذر نہیں چکتے

نجانے کس کا ہمیں انتظار ہے اب تک
کہ ریزہ ریزہ ہیں پھر بھی بکھر نہیں چکتے

لہولہان اناؤں کے ساتھ جیتے ہیں
عجیب لوگ ہیں کم بخت مر نہیں چکتے

یہ چارہ گر ہیں کہ قاتل' جواز ڈھونڈتے ہیں
مری شکست کا اعلان کر نہیں چکتے

ہوائے شب ہو کسی رت کی جسم جلتا ہے
یہ کیسے زخم ہیں ساجد کہ بھر نہیں چکتے

*

اعتبار ساجد

ہیں در و بام پر سب مناظر، جیسے اندھوں کی گلکاریوں کے
اب مرے شہر کی اس فضا میں، پھول کھلتے ہیں چنگاریوں کے

جب سے اذنِ تکلم ملا ہے، خیر سے کشتگانِ وفا کو
تذکرے جا بجا ہو رہے ہیں، شہر میں تیری فنکاریوں کے

قصر کے بام و در سے سمٹ کر، دھوپ آنکھوں کے آنگن میں اتری
شق ہوئی چادرِ خوابِ عشرت، فق ہوئے رنگ درباریوں کے

اب مکین و مکاں کا تعلق، صرف کاغذ کی تحریر تک ہے
چار دیواریوں سے نہیں ہیں رابطے چار دیواریوں کے

یوں تو کہنے کو بزمِ رفیقاں، ڈھل چکی گرچہ شامِ غریباں
پھر بھی بستی کے اکثر گھروں میں سلسلے ہیں عزاداریوں کے

پھر نگارِ وطن چاہتی ہے، اپنے بیٹوں سے تجدیدِ الفت
پھر لکھے جا رہے ہیں لہو سے، حلف نامے وفاداریوں کے

رہرو! ختم ہونے کو آئی، جاں کنی کی یہ لمبی مسافت
اب صلے منزلوں سے ہی لینا، اپنی بے لوث جی داریوں کے

*

عرفان صدیقی

یمن ویراں ہوا اب دل کی جولانی سے کیا ہوگا
نقیب و لشکر و تختِ سلیمانی سے کیا ہوگا

قبا سے کیا ہوا ہنگامۂ شوقِ تماشا میں
ہم آنکھیں بند کرلیں گے تو عریانی سے کیا ہوگا

مری دنیائے جاں میں صرف میرا حکم چلتا ہے
بدن کے ملک پر اوروں کی سلطانی سے کیا ہوگا

یہاں کس کو خبر ہوگی غبارِ شہہ سواراں میں
میں خوشبو ہی سہی میری پریشانی سے کیا ہوگا

پھر اک نوبرگ نے روئے بیاباں کردیا روشن
میں ڈرتا تھا کہ حاصل ایسی ویرانی سے کیا ہوگا

عرفان صدیقی

وہ ہلالِ ماہِ وصال ہے دلِ مہرباں اسے دیکھنا
پسِ شامِ تن جو پکارنا سرِ بامِ جاں اسے دیکھنا

مری عاشقی' مری شاعری ہے سمندروں کی شناوری
وہی ہم کنار اسے چاہنا' وہی بے کراں اسے دیکھنا

وہ ستارہ ہے سرِ آسماں ابھی میری شامِ زوال میں
کبھی میرے دستِ کمال میں تہِ آسماں اسے دیکھنا

وہ ملا تھا نخلِ مراد سا ابھی مجھ کو نجدِ خیال میں
تُو ذرا غبارِ شمال میں مرے ساربان اسے دیکھنا

نہ ملے خبر کبھی دوستو' مرے حال میرے ملال کی
تو بچھڑ کے اپنے حبیب سے پسِ کارواں اسے دیکھنا

*

احمد جاوید

ہر آن جو رو برو نہیں ہے
وہ اور کوئی ہے تو نہیں ہے

جو دل میں پڑا نہ پیرہن میں
وہ چاک بھی بے رفو نہیں ہے

میں، جو کچھ بھی ہوں میں نہیں ہوں
وہ تو ہی تو ہے جو تُو نہیں ہے

ہلکان کیے رکھا اسی نے
جس کی مجھے جستجو نہیں ہے

اک حرف ہے خامشی بھی گویا
یہ بادہ بھی بے سبو نہیں ہے

☆

احمد جاوید

معنی آگ اور حرف خاشاک
خاکستر ہے متاعِ ادراک

آنسو کی قبیل سے نہیں ہے
جس بوند سے چشمِ دل ہے نم ناک

ہے قامتِ خامشی پہ ناراست
یہ چار گرہ سخن کی پوشاک

کچھ عقل نے ڈالے کچھ جنوں نے
یکساں نہیں پیرہن کے سب چاک

دو حرف ہیں قدِّ یار و شمشاد
یہ گفتۂ جاں وہ گفتۂ خاک

دل ہاں یہی دل جو سینے میں ہے
سلطانِ زمیں ہے میرِ افلاک

میں شعلہ ہوں شعلگی سے دل سرد
یا ذرّہ ہوں ذرّگی سے غم ناک

احمد جاوید

ہر دانہ سر افشانی ہر قطرہ قدم کوبی
میں خرمنِ مستی ہوں میں دجلۂ مجذوبی

ہم منتظروں سے تنگ آ مل کہ پڑے ہیں گے
بوسیدہ کیے تن پر سو خرقۂ ایوبی

میں کشتۂ ہر موجِ طغیانِ بہاراں ہوں
کس پھول پہ جاں واروں اے گلشنِ محبوبی

وہ آنکھ رہی ساکت دورانِ جگر کاوی
وہ لب نہ ہلے ہرگز ہنگامِ دل آشوبی

دم دم چمنِ گل سے رم رم نفَسِ دل سے
پویاں ہے اسی جانب ہر قافلۂ خوبی

اک رہبرِ کوفی سے اک مرشدِ صوفی سے
جاوید نے سیکھی ہے سر شوئی و دل روبی

احمد جاوید

اس سروِ خراماں کا دراصل ہے گھر دل میں
پھرتا ہے وہ آنکھوں میں رہتا ہے مگر دل میں

ہر گام پہ ہوتی ہے سیاحیِ صد عالم
ہم گوشہ نشینوں کا ہے سیر و سفر دل میں

پھر ساعتِ وصل آئی ہر فرع کی اصل آئی
اس فصل میں نخلِ جاں دیتا ہے ثمر دل میں

تن تن تننا ہا ہو' دم دم ہمہ دم یا ہو
مہمان ہے تُو ہی تُو ہر سینہ و ہر دل میں

اس خرمنِ خوبی سے ہنگامِ چمن گردی
جو دانہ بھی گرتا ہے بنتا ہے شجر دل میں

آگ اور چمن کاری' برق اور سمن باری
وہ ترک پسر آیا بے تیغ و سپر دل میں

ہر لمحہ ازل قامت' ہر آن ابد پیکر
ہم نے بھی گزارے ہیں دو چار پہر دل میں

گلشن سے گلستاں تر، صحرا سے بیاباں تر
اور وقت سے دوراں تر اک شے ہے ادھر دل میں

جس دشتِ بلا میں ہے عمرِ خضر اک ذرہ
اس دشت کو سو سو بار ہم کرتے ہیں سر دل میں

بیٹے نے جو کل پوچھا، رہتا ہے کہاں سیمرغ
بابا نے یہ فرمایا، اے جانِ پدر دل میں

گریے نے مری دولت پانی میں بہائی ہے
جو بوند ہے آنکھوں میں تھی لعل و گہر دل میں

احمد جاوید

بنا گیا ہے جنوں نے وہ دشت رستا خیز
کہ ذرہ ذرہ جہاں کا ہے آفتاب انگیز

لکھا ہوا ہے یہ الواحِ موسوی پہ کہیں
نہ کر نظارۂ دلبر میں چشم کو آمیز

نسیم بادیۂ دل کی ایک جنبش سے
ہماری خاک کا ہر ذرہ ہے بیاباں خیز

مہندسوں کا ہے اجماع اس مساحت پر
کہ طولِ جادۂ دنیا ہے نیم گام گریز

بس ایک عرض ہے میری اگر قبول افتد
کہ امتیاز من و تو سے ہے مجھے پرہیز

سج سج کے چل اے بادِ بامداد وصال
بہار پر ہے وہ شمشاد آتش گلریز

سمن بر انفس عاشق است و روضۂ دل
ز سبزہ سبزہ ببال و ز سرو سرو بہ خیز

☆

رشیدہ عیاں

اسیرِ لمحۂ موجود ہوگئے ہم بھی
خود اپنی ذات کے سائے میں کھوگئے ہم بھی

لگاؤ سنگِ صدا شیشۂ سکوت پہ آج
زمانے والو پکارو کہ سوگئے ہم بھی

لگے تو شاخ پہ اک برگِ زرد کی مانند
گرے تو گردِ حقارت میں کھوگئے ہم بھی

نہ دیکھ پائے حقیقت کے ہول ناک نقوش
ہزار رنگ نقابوں میں کھوگئے ہم بھی

ہمارا ذوقِ سخن گوئی صرف ذوق نہ تھا
کہ ایک عہد کو اس میں سموئے ہم بھی

غموں کی دھار وہی ہے الم کی کاٹ وہی
نہ جانے کیسے عیاں کند ہوگئے ہم بھی

معین الدین احمد

جن کے لیے یہ خوابِ تمنّا دلوں میں ہیں
وہ لوگ کس دیار میں کن بستیوں میں ہیں

ڈوبے ہوئے جو دیدہ و دل حیرتوں میں ہیں
سب زندگی کے رنگ انھیں آئنوں میں ہیں

ٹھہرے ہوئے جو آنکھ کے منظر دلوں میں ہیں
سب جیسے ہم سفر ہیں ابھی صحبتوں میں ہیں

دل ڈوبتا ہے، ان کو ہوائیں بجھا نہ دیں
روشن جو کچھ چراغ ابھی راستوں میں ہیں

اس زندگی کو یوں تو زمانے گذر گئے
اب تک دھنک کے رنگ مرے آنسوؤں میں ہیں

بس اک تلاش، ایک خلش، ایک آرزو
رقصاں خیال و خواب انھیں دائروں میں ہیں

شوکت عابد

خواب تازہ دکھا نہ جائے کہیں
نیند مجھ کو جگا نہ جائے کہیں

شور اتنا ہے کچھ سنائی نہ دے
لب جو کھولوں صدا نہ جائے کہیں

ڈر رہا ہوں اس آتشِ زر سے
دامنِ دل تک آ نہ جائے کہیں

تاک میں ہوں کہ دل میں یہ دنیا
جال اپنا بچھا نہ جائے کہیں

دشت و صحرا کہ صحنِ گلشن ہو
یہ دلِ مبتلا نہ جائے کہیں

شوکت عابد

صحن و دیوار و در میسر ہے
دشت میں ہم کو گھر میسر ہے

یہ جو شہرت ہے ہم فقیروں کی
سب ترے نام پر میسر ہے

ہم تو کیا ہیں مگر ہمیں بس اک
نگہِ معتبر میسر ہے

اک دیا دل میں جھلملانے کو
شام سے پیشتر میسر ہے

ایک مہتاب دل کے آنگنے میں
اور اک بام پر میسر ہے

غم وہی شاعری میں لکھا ہے
جو ہمیں بیشتر میسر ہے

میرے عیبوں پہ ڈالنے کو نظر
اک سے اک دیدہ ور میسر ہے

احمد نوید

اٹھا جو زخم رفو کر کے تیرا دستِ رفو
پھر اس کے بعد نہ میں رہ گیا نہ رہ گیا تو

عجب ہے عشق عجب عشق کی اذیت ہے
نہ رُک رہا ہے وہ خنجر نہ کٹ رہا ہے گلو

شکستگی سے یہ دیوانگی بڑھے تو بڑھے
بہار تو نہیں آئے گی توڑنے سے سُبو

یہی ہُوا کہ ہُوا دامِ بے دلی کا شکار
نہیں تھا دل پہ کسی طور بھی کوئی قابو

ملے ہیں کتنے تناسب سے آب و خاک و ہوا
کہاں سے آئی ہے سبزے میں یہ ادائے نمو

احمد نوید

ساقی نظر اٹھا نگہِ تشنگاں تو دیکھ
اے نشّۂ یقین خمارِ گماں تو دیکھ

پھر دیکھنا یہ حسرتِ تعمیرِ آشیاں
پہلے فنا کے آگے خسِ آشیاں تو دیکھ

تجھ کو عدد کی بے عددی کی نہیں خبر
محوِ شمارِ سود، حسابِ زیاں تو دیکھ

راہ و سفر مسافر و منزل نہ فرض کر
یہ بے نشانیِ خطِ شکِّ نشاں تو دیکھ

گر تشنگی کی حد سے گزرنا محال ہے
ساغر میں ڈوب کر ہی سہی آسماں تو دیکھ

☆

احمد نوید

عہدِ سکوت، شورِ سلاسل کہیں سے لا
مشکل میں پھر ہے عقل کوئی دل کہیں سے لا

ایسا گیا کہ پھر نہیں آئی کوئی خبر
دل سے کہا تھا عشق کا حاصل کہیں سے لا

اے بے دلیِ کارِ سہولت قسم تجھے
آساں جو کردے موت وہ مشکل کہیں سے لا

لذّت ہے میرے واسطے طوفاں کا زیر و بم
ہاں ناخدا کے واسطے ساحل کہیں سے لا

دل سے جو ولولہ کوئی اٹھے تو میں اٹھوں
بے ولولہ ہے دل کوئی منزل کہیں سے لا

محیط اسماعیل

ایسے ہے جیسے خدا کو دھمکیاں
کون دے اپنی انا کو دھمکیاں

کوئی جھونکا آئے مارا جائے گا
حبس دیتا ہے ہوا کو دھمکیاں

جان واقع ہو تبسم میں اگر
اچھی لگتی ہیں قضا کو دھمکیاں

رسم تھی یہ بھی، ادا ہوتی رہی
دہریوں کی انبیا کو دھمکیاں

مانگنا ہر مرتبہ اچھا نہیں
دیجئے دستِ دعا کو دھمکیاں

شادباد اے صاحبانِ حیثیت
خوب ہیں بے آسرا کو دھمکیاں

ایک ہی طوفان تھا کترا گیا
ساحل اب دے ناخدا کو دھمکیاں

رنگ ہلکا خون کی نسبت سے تھا
دی گئیں برگِ حنا کو دھمکیاں

دور ایسا آگیا الٹا محیط
شاہ دیتا ہے گدا کو دھمکیاں

اجمل سراج

نفس کی آمد و شد کا کچھ اعتبار نہ کر
یہ بے ثبات ہے اس زندگی کو بار نہ کر

جواز ڈھونڈ کوئی بے جواز ہونے کا
جز اختیار کوئی جبر اختیار نہ کر

خموش ہو کے گزر جا خبر کی راہوں سے
نہ کر کلام فضاؤں کو سوگوار نہ کر

نکال وہم کی ویران وادیوں سے مجھے
فقط وجود و عدم پر مجھے نثار نہ کر

میں کارِ ہستیٔ ظلمت تمام کر بھی چکا
تو منتظر ہے تو اب اور انتظار نہ کر

*

اجمل سراج

آپ کو بھی تو کوئی لمحہ دیکھ
تو نے دیکھا نہیں دوبارہ دیکھ

آگہی کی کوئی تو راہ نکال
آئنہ دیکھ یا زمانہ دیکھ

دل کہ شاید تجھے نظر آئے
نظر آئے تو یہ نظارہ دیکھ

دیکھ کیا کیا اجڑ گئے ہیں ہم
دیکھ اے خو گرِ تماشا دیکھ

سُن صدائے دلِ شکستہ سُن
آ گزارش گہہِ تمنّا دیکھ

دیکھ رفتارِ عالمِ ایجاد
نیند میں چل رہی ہے دنیا دیکھ

راستے میں کھڑی ہوئی ہے شام
اس حوالے سے خود کو زندہ دیکھ

کھول آنکھ اس فریب خانے میں
دیکھنے کے لیے ہی دنیا دیکھ

آنے والی رتوں کا رستا ڈھونڈ
یا گزر گاہِ عہدِ رفتہ دیکھ

نیند میں جاگتے ہوئے اجملؔ
خواب کو خواب سے زیادہ دیکھ

عزم بہزاد

اسی جلتے بجھتے ملال میں، مری عمر زینہ بدل گئی
مری نیند رات سے بجھ گئی مری رات خواب سے جل گئی

کسی شہسوار کی آنکھ پر کوئی رہ گزار نہ کھل سکی!
کسی پاپیادہ کو دیکھ کر کوئی راہ خود ہی مچل گئی

کسی شاخِ سبز کی چھاؤں میں کوئی خار چبھ گیا پاؤں میں
میں زیادہ دیر جو چپ رہا تو فضا کی چیخ نکل گئی

جسے اپنے بجھنے کی فکر تھی مری خامشی سے چمک اٹھی
جسے شمع ہونے پہ ناز تھا مری گفتگو سے پگھل گئی

اب اک انتظار کی آگ ہے مرے جسم و جاں میں بھری ہوئی
وہ جو اختیار کی لہر تھی مری دسترس سے نکل گئی

مجھے روشنی کی طلب نہ تھی مری تیرگی کوئی کم نہ تھی!
مگر اک خیال کی چاندنی مرے فیصلے کو بدل گئی

*

خالد معین

سر خوشی سے نہ بارِ غم سے ہے
کچھ گلہ ہے تو چشمِ نم سے ہے

جز تمھارے بیاں کریں کس سے
وہ شکایت جو ہم کو ہم سے ہے

مجھ میں یہ انتشارِ خواب و خیال
اس کی باتوں کے پیچ و خم سے ہے

مسندِ دل پہ ایک تازہ خلش!
جلوہ فرما بڑے بھرم سے ہے

صحنِ دل میں غبارِ شب کا طواف
تشنہ سانسوں کے زیر و بم سے ہے

بیٹھ بھٹکے ہوؤں کی صحبت میں
آگہی، گمرہی کے دم سے ہے

محمد خالد

نشاطِ غم میں مجھے یار مہرباں لایا
یہ کیف میرے لیے عمرِ جاوداں لایا

یہاں تو دھول نہیں کہکشاں سی پاؤں میں
مجھے کہاں سے کہاں میرا کارواں لایا

وہی جو دھوپ میں کرتا ہے ابر کا سایہ
مری زمیں کے لیے ایک آسماں لایا

ذرا سی دیر تھی مہتاب کے ابھرنے میں
میں اپنا خواب ستاروں کے درمیاں لایا

کوئی کلاہ و سپر لے کے آگیا ہے نذر
درونِ قلب کوئی آرزوئے جاں لایا

ہمارے واسطے ہر اک سفیرِ ساعتِ نو
پلٹ کے پھر وہی تصویرِ رفتگاں لایا

کسی کسی نے تو کھولا کہیں کہیں درِ خواب
سفر سے لوٹ کے ہر شخص داستاں لایا

☆

محمد خالد

ڈھونڈ لیتی ہیں کوئی مہتاب سا منظر کہیں
جاگتی رہتی ہیں آنکھیں خواب کے اندر کہیں

ڈال لیتے ہیں بھلا زنجیرِ عشرت پاؤں میں!
تان کر چلتے ہیں سر پر درد کی چادر کہیں

اس خیالِ ناز میں ہوتا ہے شب بھر جاگنا
ایک کیفِ ہجر میں ہوگا مرا بستر کہیں

دل کے اندر چپکے چپکے جاگتی ہے بے کلی
شور کرتی ہیں ہوائیں جسم کے باہر کہیں

آنکھ میں بیداریوں کی دھول گرتی جائے گی
آسماں سر پر اٹھائیں گے مہ و اختر کہیں

ہر صدائے نغمہ ہے آوازۂ محشر مجھے
دل لرزتا ہے بدل جائے نہ یہ منظر کہیں

☆

عباس عالم

لذتِ تشنگی سے واقف تھے
جو نہیں تھا اسی سے واقف تھے

در کھلا تھا مگر اُدھر نہ گئے
ہم تو دیوار ہی سے واقف تھے

ایک اک آدمی سے ہنس کے ملے
ایک اک آدمی سے واقف تھے

چوم کے ہر کرن کو چھوڑ دیا
آئنے روشنی سے واقف تھے

دشت میں کیا کمی ہوئی ہم کو
شہر میں کب کسی سے واقف تھے

ایک تم تھے ہمی سے ناواقف
ایک ہم تھے، تمہی سے واقف تھے

ہم نے ایسے لکھا ہے صحرا کو
جیسے دیوانگی سے واقف تھے

خورشید عالم

آئینِ عشق و وحشت ہر سو بدل گیا ہے
اب میں بدل گیا ہوں اب تو بدل گیا ہے

وہ خواب گاہ عشرت آباد ہے مگر اب
سینہ بدل گیا ہے بازو بدل گیا ہے

شام وصال کوئی' آ دیکھ جاتے جاتے
میرے بدن سے اپنی خوشبو بدل گیا ہے

وہ آشنائے غم بھی کیا کیجئے کہ اکثر
پہلو میں آکے میرے پہلو بدل گیا ہے

اک عرصۂ طلب میں پھر میرے خونِ دل سے
اک لمحۂ تغیّر آنسو بدل گیا ہے

قیصر عالم

دل وہ دولت کہ جس کے ہاتھ لگی
بیچ اسے ساری کائنات لگی

شاخِ ہجراں پہ اس کی یاد کا پھول
اجنبی اجنبی سی بات لگی

کیا انوکھی تھی عشق کی بازی
جیت بھی اپنی ہم کو مات لگی

چاند کو چاندنی کے پیکر میں
ڈھلتے ڈھلتے تمام رات لگی

شب ہی تنہا نہ آئی شام ڈھلے
صبحِ فردا بھی آئی ساتھ لگی

کوئی کہتا تھا اپنا قصہ دل
مجھ کو اپنی ہی واردات لگی

ہم نے دیکھا جو غور سے قیصر
ذرے ذرے میں کائنات لگی

*

نقد و نظر

شفقت رضوی

علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی

(ا)
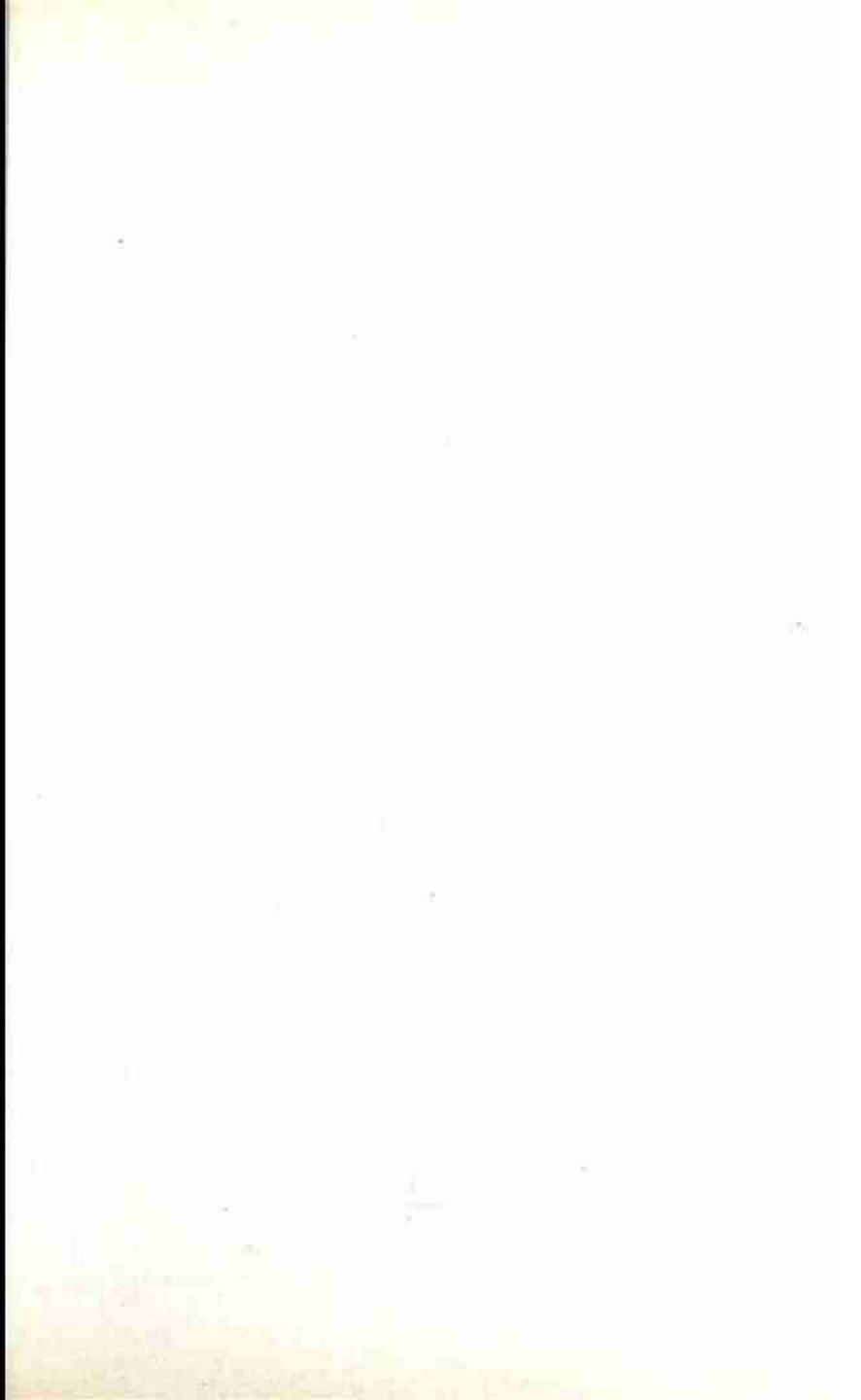
پچھلی صدی کے دوران غالبؔ نے اپنے منفرد اندازِ شاعری سے ناقابلِ تقلید مثال قایم کی تھی اس لیے وہ صدی ان کے نام سے منسوب ہے۔ شعرا نے ان کی پیروی کی کوشش کی' کامیاب کوئی نہ ہوا۔ ناکام رہنے والوں نے غالب شکنی کو شیوہ بنالیا۔ موجودہ صدی اقبال سے منسوب ہے جنھوں نے مشرقی شاعری کی روایات اور خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے منضبط اور منظم نظامِ فکر پیش کرکے شاعری سے غیر روایتی کام لیا اور ایسا اہم اور بلند مقام پایا کہ دنیا کے پیغام گو شعرا میں سب سے ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔

اقبال کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہمارے شعرا میں وہ سب سے زیادہ صاحبِ علم تھے۔ ان کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا' انھوں نے مذہب اسلام' قرآن' حدیث' سنت' افکارِ علمائے اسلام' الٰہیات' روحانیت' مابعد الطبیعیات' تصوف کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ علوم و افکار کے حصول کی خاطر مغرب کے تمام دبستانوں کی سیر بھی کی تھی۔ ان کی حصولِ علم کی تشنگی کبھی آسودہ نہیں ہوئی۔ علوم کے سمندروں میں غواصی کرنے کے بعد انھوں نے وہ جوہر نایاب پائے تھے جن میں آفاقی اور ابدی چمک موجود ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے مغرب و مشرق کا موازنہ ہر پہلو سے کرکے اپنی فکر کی راہیں متعین کی ہیں اس صورتِ حال میں سردار جعفری کا یہ بیان:

> "ماضی پرستی اور مذہبی احیا کے تصورات اقبال کو گزشتہ عہد سے ورثہ میں ملے تھے۔" (ترقی پسند ادب۔ طبع ثانی' لاہور۔ ۱۹۵۶ء۔ صفحہ ۱۲)

ان کی فکر کو محدود کردینے کے مترادف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال نے ایک مذہبی (قدامت پرست) گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کا خاندان مذہب کو تمام دنیاوی امور سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ وہ اسلامی روایات کے امین اور پابند تھے۔ برصغیر میں احیائے اسلام کی خوش گوار ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ خاندانی پس منظر اور ماحول کی یگانگت سے ان کی حساس طبیعت کا متاثر ہونا یقینی امر تھا لیکن بات یہیں تک محدود نہیں رہی۔ وہ روایات کے ورثے میں جکڑے ہوئے نہیں رہے۔ انھوں نے احیائے اسلام کی تحریکوں کو آنکھ بند کرکے تقلید کے انداز میں نہیں اپنایا۔ حقایق کو جلا دینے کے لیے علم اور روایات کافی نہیں ہوتے بلکہ

متضاد حقائق سے موازنہ زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ دن کی شناخت رات کی تاریکی سے ہوتی ہے۔ اقبال نے احیائے اسلام کی شمع نہاں خانۂ دل میں جلائے رکھی لیکن اس کی روشنی ان وسیلوں پر منحصر نہیں کہ انھوں نے مذہب کا مطالعہ کیا تھا۔ اپنے والد اور اپنے استاد شمس العلما میر حسن سے رہنمائی پائی تھی بلکہ ان کے نورِ ایمانی میں اضافہ مغربی فلسفہ اور طرزِ زندگی کے مطالعہ سے ہوا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فکر کو مادیت تک محدود رکھنا اور دنیاوی زندگی کو ہی سب کچھ قرار دینا شرفِ انسانیت سے محرومی کی نشانیاں ہیں۔ زندگی کے مقاصد ان سے اعلیٰ و ارفع ہیں جن تک اہلِ مغرب کی نظر نہیں پہنچ سکی۔ اس مادہ پرستی اور دنیاوی زندگی کی اہمیت نے مغربی تہذیب کو تباہ کردیا ہے۔ انھیں مغرب میں پھیلی تاریکی میں اسلام اور مشرقی فکر کی روشنی زیادہ واضح اور صاف نظر آئی۔ انھیں احساس ہوا کہ مغربی فکر و عمل کے دلکش مناظر میں حقیقی مسرت اور آسودگی کا سامان نہیں، وہ تو سامری کی ساحری ہے۔ وہ سورج کی شعاعوں کو اسیر کرسکتے ہیں مگر زندگی کی شب تاریک کی سحر نہیں کرسکتے۔ ان کے نظریات فسادِ قلب و نظر کا باعث ہیں۔ گویا اقبال کی مذہب سے محبت اور احیائے اسلام کی خواہش، ورثہ میں ملی دولت نہیں ہے بلکہ اس کی سچائی اور عظمت کا ثبوت مغرب نے فراہم کیا ہے۔ اسی لیے انھوں نے کہا۔

تازہ دم پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم

کلامِ اقبال کے خواص و عوام میں مقبولیت حاصل کرنے سے ان کے دور میں اور ان کے بعد کے دور میں منظرِ عام پر آنے والے شاعروں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اقبال کی سرحدوں سے پرے بستیاں بسائیں اور اگر ان کی حدوں میں داخل ہونے کا خیال کریں تو ان سے زیادہ شانِ علمی، بیدار مغزی، قدرتِ تجزیہ، فکری صلاحیت اور ندرتِ اظہار سے مالا مال ہوں۔ اکبر، حسرت اور اصغر جیسے شاعروں نے اپنے الگ جہاں آباد کیے اسی لیے وہ اپنی شاعرانہ حیثیت منوانے میں کامیاب رہے۔ بعد کے دور میں فیض نے بھی اس رمز کو پالیا تھا۔ اب ان سب کے نام معتبر اور مستند سخن وروں میں شامل ہیں۔ اقبال کی سرحد میں جس نے بھی داخل ہونے کی کوشش کی وہ ان کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکا بلکہ اپنی انفرادیت بھی گنوا بیٹھا۔ جوش ملیح آبادی بھی ایسے ہی شاعروں میں شامل ہیں۔ ان کے بارے میں نثار احمد فاروقی کا یہ تجزیہ درست ہے:

> جس طرح غالب بننے کے complex نے یگانہ کو پس منظر میں ڈال دیا ایسے ہی اقبال کی طرح فلسفی اور مفکر شاعر کہلانے کے شوق یا احساسِ کمتری نے جوش سے ایسی متضاد باتیں کہلوائیں جن کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو حیرت ہوتی ہے۔

مفکرانہ شاعری کی بنیادی شرط دامن کا علم کے موتیوں سے بھرا ہونا ہے جب کہ جوش تہی دامن تھے۔ وہ اودھ کے جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے جہاں معمولی سی نوشت و خواند سے آگے علم کی جستجو کو وقت کا زیاں سمجھا جاتا تھا، انھوں نے اس وقت ہوش سنبھالا جب اودھ ہر نوع کے انحطاط کا شکار تھا اور جاگیرداروں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ زمانہ کس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ وقت کے

تقاضوں کو سمجھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے علم ہی مضبوط ہتھیار ہو سکتا ہے۔ والدین اپنی اولادوں کو مولویوں اور منشیوں کے حوالے کر کے گلستان اور بوستان پڑھوا کر سمجھتے تھے کہ انھوں نے تعلیم دلوانے کا حق پورا کر دیا۔ جوش نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے والد کا رویّہ بھی ایسا ہی تھا۔ "یادوں کی برات" میں ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے رشتے کے بھائی صفدر اور والد کے دوست ڈاکٹر عبدالکریم نے خاص طور پر ان کو تعلیم دلوانے کے لیے اصرار کیا تھا۔ اس کا اثر ان کے والد پر برائے نام ہوا۔ انھوں نے جوش کو سیتا پور ہائی اسکول میں داخل کروا دیا لیکن کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں کی کہ وہ پڑھ رہے ہیں یا نہیں۔ اس زمانے میں امیرزادوں کا میلان عیاشیوں کی طرف تھا۔ جوش کے مزاج پر ایسے ہی ہم عمروں کا اثر رہا۔ ان کے پاس عیش و عشرت بلکہ بے راہ روی کے اسباب کی فراوانی تھی۔ نوجوانی حسن و نغمہ کی چھاؤں میں پروان چڑھی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مزاج علم کی جانب کبھی راغب ہی نہ ہوا نہ تو بزرگوں نے ان کے ذہن کی تربیت کی اور نہ اس کے لیے ان کا ماحول سازگار رہا۔ وہ اپنے "ولولۂ تعلیم" کا مبالغہ آمیز ذکر کرتے ہیں اور اپنے چار بنیادی میلانات میں ایک حصولِ علم قرار دیتے ہیں۔ اس کی صداقت نہ ان کی طرزِ زندگی سے ثابت ہوتی ہے اور نہ ان کی شاعری اور نثر سے! اس بارے میں پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> اس کی وجہیں زیادہ تر جوش کے انفرادی رجحانِ طبیعت اور ماحول میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ لکھنؤ کی تباہ حالی نے امرا اور روسا کے ذہنوں پر ایک خاص قسم کا مجہول اثر ڈالا تھا۔ ان کے دماغ میں امارت اور ریاست، شرافتِ خاندانی اور آباؤ اجداد کی عظمت کا احساس اس قدر رچ بس گیا تھا کہ وہ نئے حالات میں اپنی شخصیت کو ترقی دینے یا نمایاں کرنے کے ذرائع زیادہ نہ سوچ سکتے تھے اور بزرگوں کی عظمت سے اپنے تعلق کو کافی سمجھتے تھے۔ (مضمون "جوش ایک تعارفی مطالعہ" رسالہ افکار، کراچی۔ جوش نمبر۔ صفحہ ۱۰۸)

پروفیسر احتشام حسین نے جوش کا دل رکھنے کی خاطر جو باتیں ان کے بارے میں کہنا چاہیے تھیں وہ ماحول کے حوالے سے کہہ دی ہیں۔ بین السطور میں انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ ایسے ماحول میں نوجوانی گزارنے والے جوش اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ "پدرم سلطان بود" کے حصار سے کبھی باہر نہیں نکل سکے۔ ان کے اجداد میں فقیر محمد خاں گویا ان کے آئیڈیل تھے جن کی امارت، شان و شوکت، عیش پسندی، جنسی طاقت کا وہ اکثر ذکر کرتے۔ پٹھان ہونے کے باوجود وہ دین تہذیب میں ایک نو مسلم کی طرح داخل ہوئے تھے۔ ان میں ایک اجنبی زبان اور قطعی نامانوس تہذیب میں ڈھل جانے کی حیرت ناک صلاحیت اخاذیت ایسی نادر صفت تھی جو لاکھوں میں نہیں کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک غیر معمولی شخصیت ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ (بہ حوالہ "یادوں کی بارات" صفحہ ۳۳۰)

فقیر محمد خاں گویا نے ایک نئی تہذیب کو کامیابی سے اپنایا تھا اور جوش تو اس میں رچے بسے تھے۔ گویا کے محل کی جو شان انھوں نے پیش کی ہے اپنے زمانے کی اس سے ملتی جلتی تصویر ویسے ہی شوخ

رنگوں میں تیار کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ادھر شام ہوتے ہی نوابوں اور رئیسوں کے محلوں میں جھاڑ فانوس' شمعیں اور اکے روشن کر دیے جاتے۔ عود سلگتا' عطردان کھلتے' خاص دانوں میں گلوریاں آتیں' چاندی سونے کی پتیلیوں سے اٹھا اٹھا کر پان کھائے جاتے۔ معطر حقے اور سٹکیں گڑگڑاتیں' علمی مباحث' مشاعرے اور مجرے ہوا کرتے تھے۔ ("یادوں کی بارات" صفحات ۱۸۴۔۱۳۵)

یہ سامانِ عیش و عشرت ان کے دیکھے ہوئے نہیں تھے بلکہ ان ہی میں انھوں نے جوانی بتائی تھی۔ بلکہ بزرگوں کے سامانِ تعیشات میں شراب اور شباب کا اضافہ بھی کر دیا تھا۔ چند برسوں میں سارے اسبابِ تعیش ختم ہو گئے۔ تہی دست ہو جانے کے بعد بھی ان کی ذہنیت نہیں بدلی۔ اٹھتی جوانی میں یہ رنگینیاں چھائی ہوں تو تعلیم حاصل کرنے کی کس کو سوجھ سکتی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق چند سالوں کے عرصہ میں:

> سیتا پور اسکول' حسین آباد' جوبلی ہائی اسکول' سینٹ ہائی اسکول اور چرچ ہائی اسکول (لکھنؤ) میں تعلیم پانے کے بعد ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ کے ایم اے او کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۴ء میں آگرہ گئے اور سینٹ پیٹرس کالج میں سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۸ء میں شانتی نکیتن گئے اور تقریباً چھ ماہ رہے۔ (رسالہ "افکار" کراچی۔ جوش نمبر۔ صفحات ۱۸۔۱۹)

جس نے چند برس کے دوران آٹھ درس گاہوں کے چکر لگائے ہوں اس کی **"ثابت قدمی"** کے کیا کہنے!؟ صہبا لکھنوی کو ان تفصیلات سے آگاہ کرنے کے باوجود انھوں نے اس بات کو سینۂ رازی میں رکھا کہ اس "ولولۂ تعلیم" کے نتیجے میں کتنی اسناد اور ڈگریاں حاصل کیں۔

ان کے ذوقِ مطالعہ اور علمی قابلیت کا انحصار ان کے ایسے بیانات پر ہے جو "خود کشائی" کی تعریف میں نہیں بلکہ "خود ستائی" کے ضمن میں آتے ہیں۔ چناں چہ صہبا لکھنوی نے ان کی صداقت تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ۱۹۱۸ء میں شانتی نکیتن سے واپسی کے بعد جوش نے جائیداد کی دیکھ بھال کے علاوہ بیشتر وقت ادب' تاریخ' فلسفہ اور شاعری وغیرہ کے گہرے مطالعہ میں صرف کیا۔
>
> ادبیات میں انھوں نے شیکسپیئر' گوئٹے' دانتے' ملٹن' طالستائی' ورڈز ورتھ' شیلے' کیٹس' بائرن اور برنارڈ شا سے' فلسفہ میں سقراط' افلاطون' ارسطو' کانٹ' ہیگل' مارکس' برگساں' نطشے' شوپنہار اور ہیوم سے' سائنس میں آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت' ڈارون کے نظریۂ ارتقا اور جیمس جینز کی پر اسرار

کائنات سے 'مذہبیات میں قرآن مجید' انجیل 'توریت' زبور 'اوستا' وید' اوپنشد اور گیتا کی حکمت سے 'تاریخ میں تاریخ اسلام' مہابھارت اور رامائن کے پیغام سے 'ہندی شعرا میں کالی داس' سورداس 'بھبھوتی' تلسی داس 'کبیرداس' ملک محمد جائسی اور رحیمن خان خاناں ' فارسی میں سعدی' حافظ' خیام' نظیری' فردوسی' عرفی' فانی' سرور' سرمد' بابا افغانی اور بیدل سے نہ صرف "بھرپور استفادہ "کیا بلکہ فکری طور پر متاثر بھی ہوئے۔ (حوالہ مذکورہ بالا۔ صفحہ ۲۰)

جو بھی اس بیان کو پڑھتا ہے' حیران رہ جاتا ہے کیا ان بحرِ ذخار سے ایک زندگی میں "بھرپور استفادہ" ممکن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی طویل زندگی میں جوش نے جتنے نام سنے تھے وہ سب گنوا دیے۔ اگر اس بات کو سچ مان میں بھی لیا جائے کہ شانتی نکیتن سے واپسی (۱۹۱۸ء) کے بعد وہ غرقِ مطالعہ ہو گئے تو یہ مدت چھ سال سے زیادہ قرار نہیں پاتی۔ ۱۹۲۴ء تک وہ جائیداد کی "دیکھ بھال" سے "فارغ" ہو کر تلاشِ ذریعۂ معاش میں ریاست حیدر آباد چلے گئے تھے۔ ان کی وہاں کی زندگی اور ریاست سے نکالے جانے کے بعد کی زندگی کے اوراق کھلے پڑے ہیں جن کی کسی سطر پر "شوقِ حصولِ علم" نہیں لکھا ہے۔ ان علوم کی متاعِ گراں بہا کو حاصل کر لینا جس قدر حیران کن ہے اس سے زیادہ حیران کن یہ امر ہے کہ ان کے آثار نہ تو ان کی شاعری میں ملتے ہیں نہ نثر میں! اس کے باوجود صہبا لکھنوی کی طرح ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی جوش کی عالمانہ عظمت کے قائل ہیں اور لکھتے ہیں:

ہمارے شاعروں میں (سوائے علامہ اقبال کے) شاید ہی کسی شاعر نے علم و ادب کے مطالعہ میں اتنی محنت کی ہو جتنی کہ جوش صاحب نے کی ہے۔ (رسالہ "افکار" جوش نمبر۔ صفحہ ۱۶۷)

ہمارے خیال میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے علامہ اقبال کا نام اخلاقاً" اور مروتاً" شامل کر لیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جن اہلِ قلم حضرات نے جوش کی قابلیت کی قصیدہ خوانی کی ہے انھوں نے اپنے طول طویل مضامین میں جوش کی تبحرِ علمی کے بارے میں چند نمونے یا مثالیں تک پیش نہیں کی ہیں۔ ہر ایک نے دعوے کیے ہیں دلیل کسی نے فراہم نہیں کی ہے۔

جوش نے اپنی ذات کے بارے میں کہا ہے۔

اکھڑے نہیں آج تک لڑکپن کے خیام
سینے میں وہی دھوم ہے یارانِ کرام
میرے دل میں ہے اک بچہ ایسا
بڑھنے کا جو آج تک نہیں لیتا نام

ان کی ذات میں چھپا بچہ کبھی "بڑھنے" کا نام نہیں لیتا۔ وہ پڑھے گا نہیں تو بڑھے گا کیسے؟

وہ اپنے اور علم کے تعلق کے بارے میں کہتے ہیں۔

جوش تعلیم کجا' عشق جگر دوز کجا
محفل علم کجا' جلوۂ گہر سوز کجا

شعر حقیقت کا ترجمان ہے جس کی زندگی "عشق" اور "جلوہ" سے معمور ہو' ہوش سنبھالنے سے لے کر لحد میں جانے تک ان کے سوا کسی سے آشنا نہ رہی ہو وہ علم اور محفل علم کے لیے بے گانہ ہی رہتا ہے۔ اور جب انھوں نے "بے علمی" کے طعنے سنے تو جواب میں کہا۔

نے فکرِ دقیقہ سنج' نے عقلِ سلیم
بس حرف شناس ہے مدارِ تعلیم
جھانکا جب مدرسے کے تہ خانے میں
دیکھا کہ ہے دبکا ہوا اک جہلِ عظیم

جوش کے واقعاتِ زندگی گواہی دینے کے لیے کافی ہیں کہ انھوں نے کسی "مدرسے کے تہ خانے میں جھانکا" بھی تھا نہیں۔ جویائے علم کے لیے ہزار دروازے کھلے رہتے ہیں اسے کسی "تہ خانے میں جھانکنے" کی ضرورت نہیں ہوتی' علم دانشوری کے دریچے وا کرتا ہے اور شخصیت کو نکھار کر دوسروں کے لیے رہنما بناتا ہے۔ جوش میں یہ اوصاف نظر ہی نہیں آتے۔ اس لیے ان کا یہ شعر خود ان پر صادق آتا ہے۔

جب جہل ہو عینِ ذات و عینِ فطرت
دستارِ فضیلت ہے فقط بارِ گراں

اور ان کا یہ ارشاد بھی درست ہے کہ۔

اس علم قلیل سے جہالت بہتر

جوش کی شاعری' ان کی نثر اور ان کے خطوط میں علم کا مہین سا اشارہ بھی نہیں ملتا البتہ "جوش کے خطوط" (مرتبہ راغب مراد آبادی) میں ان کی اصل شکل و صورت ضرور نظر آتی ہے۔ خطوط کے بارے میں "خامہ بگوش" کا کہنا ہے کہ "لکھنے والے کی ذہنی صحت مشکوک نظر آتی ہے۔" (بہ حوالہ ہفت روزہ "تکبیر" ۱۲ تا ۱۸ مئی ۱۹۹۵ء۔ صفحہ ۴۹)

یہ ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ جوش کو عالم ثابت کرکے اقبال کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا ہے اور سارا زور اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ اقبال مذہب پرست اور قدامت پسند تھے جب کہ جوش عقل پرست اور ترقی پسند ہیں۔ حالاں کہ اقبال کی شاعری عقل پرستی کے سوا کچھ نہیں۔ انھوں نے کوئی بات نہ تو روایت کی بنا پر پیش کی ہے اور نہ اس کی تعلیم دی ہے۔ وہ اپنی فکر کو عقلی جواز کے بغیر پیش ہی نہیں کرتے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے بھی اس تقابلی انداز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اگر روحانی اور قدیم اقدار پر ایمان رکھتے ہیں تو جوش مادی فلسفہ کے ذریعے اپنے افکار کا تانا بانا بنا چاہتے ہیں لیکن ایسا سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔...... یہ بات قابلِ غور ہے کہ جوش نے جس مادی فلسفہ

کو اپنایا ہے اسے جاننے اور سمجھنے کے لیے بھی مطالعہ ریاضت اور جدید علوم پر دسترس اور عبور کی ضرورت ہے۔ کجا اس کو اپنا نظریۂ حیات بنانا اور اس نظریے سے تمام مسائل کو دیکھنا اور اس طرح کہ نظر گہرائیوں میں جاسکے اور کوئی گوشہ گرفت سے باہر نہ رہ جائے۔ جوش کی جدید علوم سے واقفیت تو بڑی بات ہے ان کی اطلاع ان علوم کے بارے میں صفر کے برابر ہے۔" (خلیل الرحمن اعظمی۔ مضمون جوش ملیح آبادی۔ رسالہ "ساقی" کراچی۔ جوش نمبر۔ صفحہ ۱۰۷)

جوش کا مطالعہ محدود بھی تھا اور سرسری بھی' انھوں نے دل لگا کر نہ شاعری کو پڑھا نہ علوم کا مطالعہ کیا۔ کبھی کبھار اچٹتی سی نظر ڈالی' کبھی سمجھا کبھی نہ سمجھا۔ اشعار میں جہاں کہیں "استفادہ" کا گمان ہوتا ہے وہاں یا تو وہ "آدھی سچائی" ظاہر کرپاتے ہیں یا نفسِ مضمون کے برخلاف سمجھنے کا اظہار کرتے ہیں۔

مفکرانہ شاعری کے لیے علم کے بعد بنیادی خصوصیت تفکر کی صلاحیت کا ہونا ہے۔ عموماً یہ فطری میلان ہوتا ہے جو سازگار ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔ غور و فکر کی عادت جوش میں تھی نہیں۔ ماحول ایسا ملا کہ سوائے عیش و عشرت اور خوش طبعی کے کوئی بات کبھی سوجھتی نہ تھی۔ سنجیدہ فکر ان پر کبھی غالب نہ ہو سکی اس کے باوجود ان کے "طرف دار" نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی برآمد کرنے کی کرشمہ سازیوں میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے بیانات "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" کے مصداق ہیں۔

سردار جعفری اپنا سارا زور جوش کو "عقل پرست" ثابت کرنے میں صرف کردیتے ہیں اور بغیر کسی دلیل کے ان کی عقل پرستی کو ایک انقلابی قوت تسلیم کرتے ہیں جو رجعت پرستی کی بنیادوں کو ہلا دیتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> جوش کی عقل پرستی ان کے پیش رو تمام شعرا اور ادیبوں کی عقل پرستی سے مختلف ہے۔ اس میں وہ حالی اور اقبال سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ یہ باغیانہ قسم کی عقل پرستی ہے۔ (کتاب "ترقی پسند ادب" طبع ثانی۔ لاہور۔ صفحہ ۱۹۴)

مجتبیٰ حسین اسی "عقل پرستی" کے حوالے سے ان کی مفکرانہ شاعری کی توصیف کرتے ہیں لیکن فکر کی اساسی سمت اور مقصد کی نشان دہی سے قاصر رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

> بعض ضرورتوں سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ ان کی شاعری کو فکر سے خالی بتاتے ہیں حالاں کہ ایسی شاعری جیسی جوش صاحب نے کی ہے فکر کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ جوش صاحب کی شاعری میں کوئی مخصوص سمت نہیں پائی جاتی۔ یہ بھی سچ ہے کہ کوئی ایسی فکر جس کا ڈانڈا مابعد الطبیعاتی فکر سے مل جائے ان کے ہاں نہیں ہے۔ (مضمون شاعرِ اعظم۔ رسالہ "افکار" کراچی۔

جوش نمبر۔ صفحہ ۵۳۸)

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان کے مزاج کا مطالعہ کر کے نتیجہ اخذ کیا ہے:

> وہ حد درجہ جذباتی ہیں لیکن اس کے باوجود عقلیت پسند ہیں۔ وہ روایت کے پرستار ضرور ہیں لیکن ان کا مزاج ایک انقلابی کا مزاج ہے۔ ایک انقلابی کے مزاج میں جو شدت ہوتی ہے وہ جوش صاحب میں بھی ہے۔ لیکن اس شدت کے باوجود وہ کبھی فکر کا دامن نہیں چھوڑتے۔ غور و فکر ان کے مزاج کے بنیادی جزو ہیں۔ (مضمون "جوش ملیح آبادی' شخصیت کے چند اہم پہلو" ۔ رسالہ "افکار" کراچی۔ جوش نمبر۔ صفحہ ۱۶۸)

جوش جذباتی بھی ہیں۔ انتہا پسند انقلابی بھی ہیں اور ان صفات کے ہوتے ہوئے مفکر بھی ہیں۔ حالاں کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ غور و فکر کے لیے مزاج میں ٹھہراؤ' ذہن کی یکسوئی اور شدتِ جذبہ سے مغلوب نہ ہونا بنیادی اور لازمی شرایط ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جوش جذباتی تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ انتہا پسند تھے اور ایسے شخص کو فکر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اوروں کا کیا ذکر احتشام حسین جیسا صاحبِ علم' بلند پایہ دانش ور' بالغ نظر بھی اسی نوع کی "سخن فہمی" سے اپنے قلم کو آلودہ کیے بغیر نہ رہ سکا' ان کا کہنا ہے:

> گو تفکر انھیں بچپن سے عزیز ہے اور انھوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا ہے لیکن ان کا ذہن طبعاً جذباتی ہے منطقی نہیں۔ (مضمون "جوش ایک تعارفی مطالعہ" رسالہ "افکار" کراچی۔ جوش نمبر۔ صفحہ ۱۶۱)

جو چیز موجود نہ ہو اسے سینے سے لگائے رکھنے کے خیال کو محض "شاعرانہ جدت طرازی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جوش کے ہاں "فکر" نہیں بلکہ "فکر کی قلابازیاں" ہیں۔

جوش کے معاملہ میں نقادوں نے "لفظی بازی گری" سے کام لیا ہے۔ ان کا رویّہ "ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے" کے مصداق ہے۔ جہاں علم کا فقدان ہو' عقل و شعور کی تربیت نہ ہوئی ہو' عیش پسندی جس کا شیوہ رہا ہو جس کی شاعری میں سطحیت کے سوا کچھ نہیں' جس نے زندگی میں کبھی علمی بحث نہ کی ہو' جو ایک ضدی بچے کی طرح اپنی بات پر اڑا رہا ہو' جو صبح کو ایک نظریہ بیان کرے اور شام کو اس کا مخالف نظریہ پیش کرے' جس کو ہر دعویٰ بلا دلیل پیش کرنے کا شوق ہو' جو مخالفانہ دلائل کے رد کرنے کے لیے فقرہ باز اور پھکڑ بازی سے کام لیتا ہو اسے مفکرِ اعظم ثابت کرنے کی سعی ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا' کے مترادف ہے۔ ہاں اسے "گروہی پروپیگنڈہ" ضرور کہہ سکتے ہیں۔ پروپیگنڈے کے لیے مضبوط بنیادوں اور قابلِ قبول استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مجتبیٰ حسین نے محولہ بالا مضمون میں اقبال اور جوش کا طویل موازنہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اقبال کی شاعری کی ایک اساس ہے جب کہ جوش کی شاعری میں کوئی اساس نہیں۔ اقبال کے خیالات منظم

اور مربوط ہیں' جوش کے خیالات غیر منظم اور منتشر ہیں۔ اقبال بر بنائے فکر زندگی کے مسائل کا گہرا مطالعہ کرتے اور ان کا حل تلاش کرتے ہیں اور:

> جوش کی شاعری اتنی (Staggering) مبہوت کر دینے والی چیز ہے کہ آدمی اپنے خیالات کو مجتمع نہیں کر پاتا۔ اور انھیں آسانی کی خاطر خانوں میں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ (حوالہ مذکورہ۔ صفحہ ۵۲۷)

ایک مفکر اور مبہوت کرنے والے Juggler میں جو فرق ہو سکتا ہے وہی اقبال اور جوش میں ہے۔

جوش لمحہ بھر کے شاعر ہیں۔ جس لمحے انھیں جو خیال سوجھتا ہے وہ شعر کے پیرائے میں بیان کر دیتے ہیں' ضروری نہیں کہ وہ خیال ان کا اپنا ہو۔ اسے پیش کرتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے اس کے برخلاف کتنی بار اظہار کیا ہے۔ علم و دانش کی کمی کی وجہ سے وہ کسی نظام فکر کی تشکیل میں کامیاب نہیں ہوئے اس کے باوجود ہمارے نقاد ان کو فکر و فلسفہ کے حوالے سے اقبال سے بلند تر نہیں تو ان کے برابر ثابت کرنے سے باز نہیں آتے۔ ان کا سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ اقبال مذہب پرست اور قدامت پسند تھے۔ جب کہ جوش عقل پرست اور ترقی پسند تھے۔ حالاں کہ اقبال نے جن افکار کو پیش کیا ان کی بنیاد روایت پر نہیں بلکہ عقلیت پر ہے۔ وہ منطقی ذہن رکھتے تھے اور اس سے کام لینے کا سلیقہ انھیں آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات میں کہیں تضاد نہیں ہے۔ البتہ کہیں کہیں فکر کی ارتقائی صورت کی وجہ سے تضاد کا گمان ہوتا ہے ان کے مضامین میں ربط ہے۔ شخصیت کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو ان کے مزاج میں ٹھہراؤ' سنجیدگی' بردباری کی وہ صفات ملتی ہیں جو تفکر کے لوازمے ہیں۔ ان کے ہاں دل سوزی ہے جو دوسروں کے ساتھ بھلائی کے لیے انھیں آمادہ کرتی ہے۔ انھوں نے "ہوس داد طلبی" میں شاعری نہیں کی اپنی فکری متاع سے رہنمائی کی سعی کی ہے۔ عزیز احمد نے اقبال اور جوش کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> جوش جب شاعرانہ وجدان سے الگ ہو کے لکھتے ہیں تو ان کی شاعری پھسی پھسی اور آورد کی شاعری معلوم ہونے لگتی ہے۔ ان کے بلند خیالات کو بلند تو نہیں کہہ سکتے مگر پستش بغایت پست کا اطلاق ان پر یقیناً ہوتا ہے۔
>
> اقبال کی طرح وہ شاعری میں ذہنی اور فلسفیانہ قوت پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن چوں کہ وہ اقبال کے عظیم الشان علمی پس منظر اور ذہنی پیش منظر سے محروم ہیں اسی لیے جوش جب گہرائی میں اترنا چاہتے ہیں تو ان کی سطحیت اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ باوجود ان کے اس تمام جوش و خروش' اس تمام ابال اور شورش کے کبھی کبھی ان کے خلوص اور عقیدے پر بھی شک ہوتا ہے۔ اس کی وجہ پُرجوش الفاظ کی فروانی لیکن جوش کردار کی کمی ہے۔ (کتاب "ترقی پسند ادب" پاکستانی ایڈیشن' مطبوعہ جولائی ۱۹۸۶ء۔ صفحات ۶۷۔۶۸)

عزیز احمد کا فیصلہ دو ٹوک ہے انھوں نے "اگر مگر" کے چیستاں سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کی رائے کا مقابلہ احتشام حسین' سردار جعفری اور مجتبیٰ حسین کی آرا سے کیا جائے تو یہ کہہ کر نظریں نہیں پھیری جا سکتیں کہ یہ اختلافِ رائے ہے۔ درست اور غلط رائے کا تعین کرنے کے لیے جوش کے کلام کو پڑھنا ہوگا۔ ہمارے خیال میں عزیز احمد کی رائے غیر جانب دارانہ اور منصفانہ ہے۔ انھوں نے احتشام حسین کی طرح "معاندت مندانہ طرف داری" نہیں کی ہے اور سردار جعفری اور مجتبیٰ حسین کی طرح "گروہی پروپیگنڈے" سے کام نہیں لیا ہے۔

انصاف سے دیکھا جائے تو اقبال کا دبستان اور ہے جوش کی اقلیم اور۔ اقبال نے اپنی حدود میں رہ کر یکسوئی کے ساتھ اس فرض کو نبھایا جو انھوں نے خود پر عاید کیا تھا۔ اسی لیے ان کے افکار کی ضیا سے ساری دنیا منور ہوئی۔ جوش اپنی قلمرو میں رہتے تو بڑے شاعر نہ سہی اچھے شاعر ضرور کہلاتے۔ وہ جذبہ اور کیف کے شاعر ہیں۔ نشاط انگیزی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ ان کی نشاطیہ شاعری بڑی جان دار ہے۔ وہ کیفیاتِ حسن کو دل نشین انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔ "عشق" کی ظاہری تصویر خوب کھینچتے ہیں۔ منظر نگاری میں انھیں کمال حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں خوش گوار تازگی ہے۔ طربیہ کیف ہے۔ لیکن خیالات میں گہرائی نہیں ہے۔ وہ معاملاتِ عشق میں "تو نہ سہی اور سہی اور نہ سہی اور سہی" کے قائل تھے۔ اس لیے دردِ دل اور سوز و گداز سے نا آشنا ہی رہے۔ ہر شب ان پر اہلِ حسن کی نوازشوں کی بارش ہوتی رہی۔ وہ جذباتی طمانیت اور آسودگی سے سرشار رہے' اس کی جھلک ان کی شاعری میں ہے۔ ان کے احساسات اور جذبات میں سطحیت ہے' ان کا دل خلوص اور سوز سے ہمیشہ خالی رہا۔ "تو اگر واپس نہ آتی بحزِ بیت ناک سے" جیسی واقعاتی نظم میں بھی خلوص کا فقدان ہے۔ جوش کا احسان ان حرماں نصیبوں پر ہے جن کو ان کی شاعری طرب و نشاط کے چند لمحے فراہم کرتی ہے۔ ان کی شگفتہ مزاجی اردو شاعری کے لیے نئی اور جوش آیند ہے۔ لیکن ان کے خیالات ہماری ادبی اور تہذیبی روایات سے میل نہیں کھاتے وہ اپنے پڑھنے والوں کو لمحاتِ انبساط فراہم کرتے ہیں' ان کے ذہنوں کی تربیت نہیں کرتے۔

ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی تباہی میں مشاعروں اور حاشیہ نشینوں کا بڑا ہاتھ رہا۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام "روحِ ادب" اور بڑی حد تک ان کے دوسرے مجموعہ کلام "شعلہ و شبنم" میں ان کی فکری صحت مندی کی علامتیں موجود ہیں لیکن جب وہ پروپیگنڈے کے طلسم کدے میں محصور ہو گئے' انھیں ہر شعر پر داد ملنے لگی' ان کی غلطیوں کو اوصاف ثابت کرنے کے لیے نامور نقادوں کے قلم وقف ہو گئے تو انھوں نے وہ شاعری نہیں کی جو انھیں کرنا چاہیے تھی بلکہ وہ شاعری کی جو دوسرے سننا چاہتے تھے' اسی لیے وہ آورد کا شکار ہو گئے۔

ان سب سے عظیم تر حقیقت جسے عام طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہے یہ ہے کہ اقبال کا تعلق معاشرے کے متوسط بلکہ نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ یہ طبقہ محنت کشوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی محنت سے ترقی کی راہیں استوار کرتا ہے۔ اس میں جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کی غیر محدود

صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ وہ سکون نا آشنا ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے افراد حلال کی روٹی کماتے، عسرت میں قناعت کرتے اور دوسروں کی بھلائی کے لیے سوچتے اور ان کے لیے کام کرتے ہیں۔ آگے بڑھنے کے جذبے کے ساتھ اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو روبہ کار لاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس، فلسفہ، ادب، سیاست میں جن لوگوں نے حیاتِ جاوداں حاصل کی وہ سب اسی طبقے سے ابھرے تھے۔ یہی طبقہ مذہب، تہذیب اور اخلاق کی اقدار کا امین ہوتا ہے۔ اقبال ان تمام خصوصیات کے ساتھ علم اور بیدار مغزی کے اوصاف کے حامل تھے۔ انھوں نے اس طبقے سے اپنا ذہنی رشتہ نہیں توڑا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ علم و فکر کی اقلیم میں جہدِ مسلسل کرتے رہے۔ انھوں نے مذہب، اخلاق اور تہذیب کی خوبیوں کو سینے سے لگائے رکھا۔ عسرت میں بسر کرنے کے باوجود ملک اور ملت اور عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے بارے میں فکر کرتے رہے۔ جوش جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ذہنیت ہمیشہ جاگیردارانہ رہی۔ مالی حیثیت کی تباہی کے باوجود وہ اس طبقہ سے اپنے ذہنی رشتے کو کبھی توڑ نہیں سکے۔ اپنے کو دوسروں سے بالاتر سمجھنا، اپنی غلط بات پر اصرار کرنا اور اسے منوانے کی کوشش کرنا، میں تحکم کا پایا جانا، علم سے چشم پوشی، ظاہر داری کی روایات کی پاس داری، فکر سے نا آشنائی، عیش و عشرت کی خاطر مذہب اور تہذیب سے روگردانی، جھوٹی عزت اور وقتی شہرت کی خاطر منافقت سے کام لینا، جاگیردار طبقے کی یہ تمام خصوصیات ان کی ذات میں اس طرح مجتمع تھیں کہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھیں۔ انھوں نے زندگی کے جس پہلو پر نظر ڈالی وہاں سچائی تک پہنچنے میں ان کی فطرت مانع رہی۔

(۲)

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ کسی کی بلند قامتی اور فکرِ عالی سے متاثر ہونے والا اپنے جذبۂ استحسان کو پوشیدہ رکھتے ہوئے بھی رشک کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے برابر ثابت کرے۔ اس صحت مندانہ رجحان کے برخلاف جاگیردارانہ ذہنیت حسد کو جنم دیتی ہے۔ اس صورت میں وہ کسی بلند قامت کی نقل کرتا ہے تو فکرِ عالی کے مظاہرے کے بجائے انتشارِ ذہنی کے مضحکہ خیز نمونے پیش کرتا ہے اور جب اسے حصولِ منزل کا امکان نظر نہیں آتا تو غیر صحت مند سوچ سے منزل اور منزل پر پہنچنے والوں کی شان میں گستاخیاں کرنے لگتا ہے۔ جوش بھی حسد کا شکار رہے۔ شاعری کی محفل میں وہ اپنے سوا کسی کا چراغ جلتا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس جذبے نے انھیں "فکر" پر آمادہ کیا تو سوائے ذہنی قلابازیوں کے کسی بات کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ انھیں ان کی کم استعدادی نے اقبال دشمنی پر آمادہ کیا۔ اس کا اظہار انھوں نے مختلف طریقوں سے کیا ہے وہ کہیں بلاواسطہ اور کہیں بالواسطہ طور پر اپنے افکار کو بلند ثابت کرتے اور اقبال کے فلسفہ کو رد کر دیتے ہیں۔ اور کبھی اپنے احساسِ کمتری کی بنا پر اظہارِ برتری کرتے ہوئے کسی جاگیردار کی طرح لعن، طعن، تشنیع اور مہمل گوئی پر اتر آتے ہیں۔ ایسے میں ان کے منہ سے جھاگ اڑتی صاف نظر آتی ہے اور ان کا ایک ایک فقرہ گالی کا کام کرتا ہے اور جب کچھ نہیں سوجھتا تو فقرہ بازی اور

پھکڑپن سے کام لیتے ہیں۔ ان میں سے ہر نوع کی مثالیں موجود ہیں۔

سمت پرکاش شوق کو انٹرویو دیتے ہوئے جوش نے جذباتی اور فکری شاعری کے بارے میں کہا تھا:

> آج زمانہ سائنس و فلسفہ کی وجہ سے ایک نئی موڑ پر آگیا ہے۔ اب دنیا جذباتی شاعری کا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ فکریہ شاعری کا مطالبہ کرتی ہے۔ جذباتی شاعری ابھی دفن نہیں ہوئی اور فکری شاعری ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ (بہ حوالہ رسالہ "ساقی" کراچی۔ جوش نمبر۔ صفحہ ۳۶۳)

بہ ظاہر یہ ایک معصوم اور فلسفیانہ بیان ہے لیکن غور کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ بین السطور انھوں نے اپنے حق میں اور اقبال کی نفی کرنے کے لیے ایک بے بنیاد بات کہی ہے۔ اقبال کی فلسفیانہ شاعری مشرق و مغرب سے داد و تحسین وصول کر چکی تھی۔ ہر ا کی جامعات میں ان کے افکار تعلیم کا حصہ بن چکے تھے۔ ایک دنیا ان کی شاعری کی عظمت کے گن گا رہی تھی۔ ایسے میں یہ ارشاد کہ "فکری شاعری ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔" واضح اشارہ ہے کہ وہ اقبال کی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ساتھ ہی جو یہ فرمایا ہے کہ "جذباتی شاعری ابھی دفن نہیں ہوئی۔" اپنی شاعری کی مدافعت کے مترادف ہے۔ علاوہ ازیں اپنی دانست میں انھوں نے بڑی گہری فلسفیانہ بات کہی ہے کہ جذباتی شاعری دفن ہو تو فکری شاعری پیدا ہو۔ حالاں کہ جذباتی اور فکری شاعری دونوں ایک ہی زمانہ میں ہو سکتی ہیں اور ہوتی رہی ہیں۔

ان کا یہ بیان کسی سنجیدہ سوچ پر مبنی نہیں' ان کی عادت کے مطابق "موشگافی" پر مبنی اور اقبال دشمنی کا مظہر ہے۔ اگرچہ ان کا وار چھپا ہوا ہے لیکن ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو غضب کی نظر رکھتے ہیں اور مافی الضمیر کو تاڑ لیتے ہیں۔

اس بیان کی یہ نسبت اخبار "جنگ" میں شایع ہونے والے اپنے کالم "فکر و عمل" میں وہ ذرا کھل کر سامنے آئے ہیں۔

جدوجہدِ آزادی کے دوران اردو شعرا کا رویہ قابلِ اعتراض گردانتے ہوئے موجودہ شاعروں کی حب الوطنی کو مشکوک قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> اس وقت ہم (شعرائے اردو) اپنی غداری کے صلے میں انگریز کی سرکار سے "خان بہادر" اور "سر" کا خطاب وصول فرما رہے تھے۔ جناب والا! آپ ہم کو نہیں جانتے! ذرا ہم سے ہوشیار رہیے۔ خدا پاکستان کو پایندہ سلامت رکھے۔ لیکن اگر کسی وقت دشمن ملک نے خدا نخواستہ پاکستان پر حملہ کر دیا تو ہم شعرائے اردو ہوں گے کہ سب سے پہلے دشمن کے کیمپ میں داخل ہوں گے اور پاکستانی فوجیوں اور پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیں گے۔

"خان بہادر" اور "سر" کے خطاب پانے والے شاعروں پر نظر ڈالیے۔ خیال فوری طور پر حفیظ جالندھری اور اقبال کی طرف منتقل ہوگا۔ گویا انھیں خطابات قوم سے غداری کے صلے میں ملے تھے۔ یہ

الزام تراشی ان کے احساسِ محرومی کا نتیجہ ہے۔ ان بے چارے کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ غداری کا صلہ کس کو کہتے ہیں اور عظمتِ شاعری کے اعتراف کا صلہ کیا ہے۔ ان کی محدود معلومات میں یہ حقیقت شامل ہی نہیں تھی کہ اقبال نے کن وجوہ سے کن حالات میں اور کتنے مرحلوں کے بعد خطاب وصول کیا تھا۔ انھیں اقبال دشمنی کے اظہار سے تسکین پانا تھا اس لیے بے سروپا الزام لگایا۔

رہا غداری کا مسئلہ تو تاریخ کے ہر دور میں اور ہر ملک و قوم میں میر جعفر، میر صادق اور شیخ عبداللہ پیدا ہوتے رہے ہیں اور اس کے لیے حالتِ جنگ کی قید بھی لازمی نہیں۔ حالتِ امن میں بھی اردو کے بعض شعرا دشمن کے کیمپ میں داخل ہو کر پاکستانی فوج اور پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں۔ وفاداروں اور غداروں کی کھیپ میں کبھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ خود جوش اس کی زندہ مثال ہیں۔ آزادی کے بعد بھارت نے ان کو کیا کچھ نہیں دیا۔ ان کی قابلیت سے کہیں بڑے عہدے اور تنخواہ سے نوازا، حد یہ ہے کہ ملک کا اعلیٰ ترین سول اعزاز "پدم بھوشن" دیا جسے جیلوں اور بہانوں سے خاطر میں نہ لاکر وہ اس ملک پر الزامات لگاتے ہوئے فرار ہوگئے۔ دراصل یہی احساسِ جرم ہے جس نے ان سے یہ سطور لکھوائیں۔ انھوں نے اپنے کلنک کے ٹیکے کو چھپانے کے لیے دوسروں کی پیشانی کو آلودہ کیا ہے۔

(۳)

اپنی خودنوشت "یادوں کی بارات" میں بھی جوش نے اقبال کو اعتراضات اور استہزا کا نشانہ بنایا ہے اور اس کے لیے ایک غیر معروف، مجہول الحرکات دوست قاضی خورشید احمد کا سہارا لیا ہے۔ انھوں نے قاضی خورشید احمد کی زبانی اقبال کے اشعار کی مضحکہ خیز تشریح و توضیح کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ان کو (قاضی خورشید احمد کو) جب یہ شعر سنایا گیا۔
>
> کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
> کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
>
> تو انھوں نے منھ جھٹک کر کہا۔ "لاحول! بھلا یہ بھی کوئی شعر ہے۔ شاعر صاحب اللہ تعالیٰ سے فرما رہے ہیں کہ ہر چند میرے ماتھے میں ہزاروں سجدے پھدک رہے ہیں لیکن جب تک تو اطلاق تنزیہ کے دائرے سے نکل کر چھپن چھری یعنی جانکی بائی آف الہ آباد کے لباس میں انگیا کرتی پہن کر نہیں آجائے گا میں تیری بارگاہ میں ایک بھی سجدہ نہیں کروں گا۔ اس سے زیادہ مادہ پرستی اور اہانت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔" ("یادوں کی بارات" صفحہ ۲۱۸)

اقبال کے شعر کا مذاق اڑانے والے جوش نے اس مضمون کو بار بار ادا کیا ہے جیسے۔

> اگر تو ہے در اصل ربِّ غیور
> تو خوش وضع و سنجیدہ ہوگا ضرور

جو یہ ہے تو راہِ متانت سے آ
مرے رو برو بابِ حکمت سے آ

....

جو تو داورِ وہمِ انساں نہیں
تو اے تہمتِ وہم بن جا یقیں

....

یقیں ہے تو کیوں گم ہے گرداب میں
جھلک قعرِ دانش کے گرداب میں

....

یقیں بن کے جب تک نہ آئے گا تو
تو اے وہمِ دیرینہ اہلِ ہو
رہ کفر کی خاک چھانے گا جوش
نہ مانا ہے تجھ کو نہ مانے گا جوش

پہلے شعر میں "خوش وضع" اسی "چھپن چھری" کے مترادف ہے جسے اقبال نے لباسِ مجازی کہا ہے۔ دیگر اشعار میں "یقین" کے لیے جو تقاضے کیے گئے ہیں انھیں کے لیے اقبال نے "لباسِ مجاز" کا استعارہ کیا ہے۔ اگر کسی کو لفظ اور استعارہ کا فرق معلوم نہ ہو تو اس کی سخن فہمی معلوم!؟

اسی طرح اقبال کے ایک اور شعر کو تمسخر کا ہدف بنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں

> اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر نے جس قدر بھی اودے' نیلے' پیلے' سفید اور دھانی گناہ کیے تھے وہ جب "عفو بندہ نواز" کے "تنبوں" کے دروازے پر پناہ مانگنے آئے تو انھیں بھگا دیا گیا لیکن شاعر صاحب کے جب حبشیوں کی طرح کالے کلوٹے گناہوں نے درخواست کی تو انھوں نے فوراً پناہ دے دی۔ کاش کوئی اللہ میاں سے جا کر پوچھتے کہ آپ کو انسان کے حبشی گناہوں پر کیوں پیار آتا ہے۔ اس کے علاوہ مصرع میں "جہاں" کا لفظ انتہائی حشو ہے۔ ("یادوں کی بارات" صفحہ ۲۱۹)۔

جو اردو زبان کے عام روز مرہ اور محاورے سے نابلد ہو وہی "جرم ہائے سیاہ" کی ترکیب پر اس طرح کی مضحکہ خیز حاشیہ آرائی کر سکتا ہے۔ معمولی استعداد کا آدمی بھی "جرم سیاہ" اور "گناہوں کی سیاہی" کے مفہوم سے آشنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے عالم فاضل ہونا ضروری نہیں لیکن جہاں دل ہی سیاہ ہو

وہاں ایسی ہی موشگافی سے کام لیا جاتا ہے۔

یہ اعتراض درست نہیں کہ "جہاں کا لفظ انتہائی حشو ہے۔" شاعر کا کہنا ہے کہ میرے بدترین گناہوں کو اس مادی اور ظاہری دنیا میں کہیں اماں نہیں ملی اگر اماں ملی بھی تو "عفوِ بندہ نواز" کے سایہ میں جس کا اس ظاہری دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ایک اور شعر پر نہایت رکیک اور عامیانہ حملہ کیا گیا ہے۔ لکھا ہے:

کبھی قبلہ رخ جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ عراقی کے شعر کا پرتو ہے۔

بحرم چو سجدہ کردم ز حرم ندا بر آمد
کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

دوسری بات یہ ہے کہ مصرع اول کے جزو اول یعنی "کبھی قبلہ رخ کھڑا ہوا" میں ایسی فحاشی اور بدتمیزی کی گئی ہے جس کو زبان پر نہیں لا سکتا۔ توبہ 'توبہ 'کھڑا ہوا' ایسی فحاشی' معاذ اللہ۔ ("یادوں کی بارات" صفحہ ۴۱۹)

کسی جنس زدہ فحش ذہنیت رکھنے والے کا خیال ہی "کھڑا ہوا" کے اس مبتذل' عامیانہ اور بازاری پہلو کی طرف جا سکتا ہے۔ ماشاء اللہ جوش اور ان کے احباب کا ذہن اس معاملہ میں بڑا شاداب تھا۔ "قبلہ رخ کھڑا ہوا" کے مفہوم سے مسلم گھرانوں کا بچہ بچہ بہ خوبی واقف ہوتا ہے بلکہ برصغیر کے اکثر غیر مسلم گھرانوں میں جہاں مسلمانوں کی معاشرت سے تھوڑی سی بھی واقفیت ہو اس کے معنی آسانی سے سمجھ لیے جاتے ہیں لیکن جنھیں اپنے باطن کے انکشاف کا شوق ہو تو وہ ایسے موقعوں سے یونہی فایدہ اٹھاتے ہیں۔

رہا شعر میں عراقی کے پرتو کا ہونا تو یہ کوئی بڑی قابل اعتراض بات نہیں۔ شاعری میں لو سے لو جلتی ہے۔ شاعر کو جو خیال پسند آ جاتا ہے وہ اس کے ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ رہتا ہے اور کسی بھی وقت دانستہ یا نادانستہ طور پر شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اس طرح بات آگے بڑھتی ہے۔ اگر دانستہ طور پر کسی کے خیال کو اپنایا جائے تو ماخذ اصلی کا حوالہ دینا مناسب ہوتا ہے لیکن اس کا رواج عام نہیں ہے۔ اس نوع کی تکرار سے کسی شاعر کا کلام خالی نہیں ہے۔ اسے بدنیت سرقہ کہیں گے' حقیقت میں یہ استفادہ ہے۔ اردو بولنے والوں میں کتنے فارسی داں رہ گئے ہیں جنھوں نے عراقی کا شعر پڑھا ہے۔ اقبال نے ان تک عراقی کا خیال پہنچا دیا تو کیا برا کیا؟ اگر یہ عیب ہے تو جوش کا کلام بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حافظ : مگر تبسم ساقی نمی کند تقصیر
جوش : مگر تبسم ساقی خطا نہیں کرتا
حافظ : کم کن ز کبر و ناز کہ دید است روزگار
چین قبائے قیصر و طرف کلاہِ کے

جوش : قیصر و اسفندیار و خسرو و بہرام و زار
کتنے تاجوں کی چمک دیکھے ہوئے ہے روزگار

عرفی : بدہ عناں تعلق بہ حسن ذرہ
برآرد ستے و بر دوش آفتاب انداز

جوش: ذرات کو چھوڑ کے حریفوں کے لیے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا میں نے

خیام : از خردی خلق ناگفتہ بماند

جوش : کیا گوہر شاہوار ناسفتہ رہیں جوش

کبیرداس : ہر مرے تو ہم مریں اپنی مرے بلا

جوش : کیا موت کی ہستی ہے کہ دامن چھولے
اللہ مرا تو ہم مریں گے اے جوش

جوش کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے کہ "رقص اعضا کی شاعری ہے۔" ان کے اکثر مقلدین اس "حکیمانہ انکشاف" کو دھرا کر اپنے دانش ور ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ خیال بھی جوش کا اپنا نہیں۔ اقبال نے کہا تھا:

فاش کرتا ہے اک چینی حکیم اسرار فن
شعر گویا روح موسیقی ہے رقص اس کا بدن

جوش کی نظر "چینی حکیم اسرار فن" تک کیا پہنچی ہوگی۔ انھوں نے اقبال ہی سے استفادہ کیا۔ گویا ان کے اس مشہور جملے پر اقبال کے شعر کا واضح پرتو ہے۔ ان کی طویل نظم "حرفِ آخر" کے بہت سے مصرعے اور اشعار قرآن شریف کے فقروں کے لفظی ترجمے ہیں بلکہ نظم کا پورا خیال ہی قرآن سے ماخوذ ہے البتہ حاشیہ آرائی جوش کی ہے جو انھیں اصل مطلب سے دور لے جاتی ہے۔

جوش نے شاعر کی توصیف میں لکھا ہے:

> شاعر کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی ایک موضوع، کسی ایک مقصد، کسی ایک تعلیم، کسی ایک فلسفہ اور حیات کے کسی ایک پہلو کے اندر قید ہو کر نہیں رہ سکتا۔ وہ قرآن کی زبان میں نئی نئی وادیوں کی سیر کرتا ہے۔ وہ تو ہواؤں کی طرح آوارہ، ابر کی طرح بے پروا خرام، تصورات کی طرح بے قید و بند اور ایتھر کی طرح آزاد ہوتا ہے۔

انھوں نے اپنے ذہنی انتشار کو شاعر کی خصوصیت قرار دے کر قرآن شریف سے سند حاصل کرتے ہوئے اسے "نئی نئی وادیوں کی سیر کرنے والا" بتلایا ہے، حالاں کہ واقفِ کار جانتے ہیں کہ سورہ الشعرا (۲۲۴۔

۲۲۵) میں یہ فقرہ توصیف کے طور پر نہیں مذمت کے طور پر آیا ہے۔ جوش نے اسے نقل تو کر دیا لیکن بغیر سمجھے ہوئے۔ ان مثالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اگر اقبال کے ایک شعر پر عراقی کے شعر کا پرتو ہے تو جوش کا کلام بھی "پرتو" سے بھرا پڑا ہے۔ حالاں کہ نقاد اور معترض کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ جس عیب کی نشان دہی کر رہا ہے وہ عیب اس میں تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو اسے عیب جوئی کا حق نہیں پہنچتا۔

اقبال کے اشعار کی توضیح' تشریح کے بارے میں استدلال کیا جا سکتا ہے کہ وہ خیالات قاضی خورشید احمد کے ہیں' اس لیے الزام جوش پر وارد نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ اگر وہ ان نامعقول باتوں سے متفق نہ تھے تو ان کا اعادہ نہ کرتے اور اگر مقصد قاضی خورشید احمد کے ذوقِ استحسان شعری کے نمونے پیش کرنا تھا تو اس کے ساتھ اپنا منفی یا مثبت ردِّ عمل ظاہر کرتے۔ ایسا نہ کر کے وہ شریکِ جرم قرار پاتے ہیں۔ اسی باب میں جب قاضی خورشید احمد نے ان کی دربار داری پر اعتراض کیا تو انھوں نے اس کے لیے تاویل پیش کر دی تھی۔ قاضی خورشید احمد نے طعنہ دیا تھا:

> اب تم نواب فقیر محمد گویا کے پوتے نہیں علمی پیادے بن کر رہ گئے ہو۔ تمھاری رگ و پے میں غلامی سرایت کر گئی ہے۔

تو جوش صاحب نے صفائی میں کہا:

> اگر تہذیب کی نگہ داری غلامی ہے تو میں غلام' میری سات پشتیں غلام۔
> ("یادوں کی بارات" صفحہ ۴۲۹)

جوش کے یہاں اپنے ہر عیب کا جواز موجود ہے۔ وہ دربار داری کو تہذیب کی نگہ داری کہہ کر دامن بچا لیتے ہیں لیکن اقبال کے بارے میں ہرزہ سرائی ٹن کے مدافعت میں ایک لفظ نہیں کہہ پاتے۔

لائقِ غور نکتہ یہ بھی ہے کہ واقعہ مذکورہ کے مدتوں بعد جوش نے تمام جزئیات کے ساتھ اسے تحریر کیا ہے۔ اس لیے مضمون اور الفاظ من و عن قاضی خورشید احمد کے نہیں ہو سکتے۔ جوش نے برسوں پرانی دھندلی یاد کو اپنی فطرتِ لطف اندوزی کی خاطر اپنی ہی شوخیٔ تحریر میں پیش کیا ہے۔ اس میں طرزِ استدلال اور عبارت آرائی دونوں غماز ہیں کہ خورشید احمد کے پردے میں کون بول رہا ہے۔

(۴)

جوش کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ اقبال کے خیالات سے اتفاق نہ کرتے لیکن کم سے کم سنجیدگی اور دلائل کے ساتھ تو بحث کرتے مگر اس کے لیے ان کی علمی کم مائیگی مانع تھی۔ سنجیدہ بحث کرنا ان کے مزاج میں داخل ہی نہ تھا۔ اس بارے میں ماہرالقادری نے اپنی قربتوں اور تجربوں کی بنا پر لکھا ہے:

> حضرتِ جوش سے بارہا مذہبی مسائل پر گفتگو ہوئی مگر جب بھی ان کے سامنے ٹھوس عقلی دلائل پیش کیے گئے انھوں نے بات کو اڑا دیا اور اسی قسم کی پھبتیاں کر دیں۔

یہ پٹی پٹائی باتیں ہیں۔
فلاں مذہبی مفکر اور دانش ور کے منھ سے دودھ کی بو آتی ہے۔
یہ طفلانہ باتیں ہیں...... پھر مسکراہٹ' ہنسی اور قہقہہ۔

(رسالہ "ساقی" کراچی۔ جوش نمبر۔ صفحہ ۱۹۷)

ان کا یہ انداز مذہبی مباحث تک محدود نہ تھا۔ ہر معاملہ میں انھوں نے غیر سنجیدہ رویّہ سے کام لیا۔ وہ مجلسی آدمی تھے۔ فقرے بازی' استہزا' پھکڑپن ان کے مزاج کا حصہ تھے۔ اقبال کے خلاف بھی علمی رویّہ اختیار کرنے کے بجائے انھی حربوں سے کام لیا اور اقبال کو تضحیک آمیز انداز میں مخاطب کیا ہے۔ اپنی نظم "حب وطن اور مسلمان" میں یوں تو تمام مسلمانانِ برصغیر سے مخاطب ہوئے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا روئے سخن اقبال کی طرف ہے۔ اس نظم کے یہ اشعار اس بات کے غماز ہیں۔

تیرے لب پر ہے عراق و شام و مصر و روم و چیں
لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں
کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں
کل جہاں تیرا مگر ہندوستاں تیرا نہیں

جوش نے یہ اشعار اقبال کی نظم "ترانۂ ملی" کے اس شعر کے جواب میں کہے ہیں۔

چین و عرب ہمارا' ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اپنی نظم کے پہلے شعر میں جوش نے اقبال کو "نا آشنائے رحمۃ اللعالمین" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

ظرف اور اس حد کا تنگ اے حامیِ دینِ مبیں
حیف اے نا آشنائے رحمۃ اللعالمین

محولا بالا اشعار سے واضح ہے کہ جوش' اقبال کو ایسا حامیِ دینِ مبیں سمجھتے تھے جس کا ظرف تنگ تھا اور وہ نا آشنائے رحمۃ اللعالمین تھے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ جو شخص خدا کو نہ مانے' رسولوں کی توہین سے باز نہ آئے وہ اقبال جیسے حامیِ دینِ مبیں اور شیدائے رسولِ پاک پر طعن و تشنیع کے وار کرے۔

جوش کی نظم "عقل و عشق" کے تمام اشعار اقبال کی فکر کے خلاف لکھے گئے ہیں۔ اس میں اقبال کو "خودی کے دیوتا" اور "نیا ملا" جیسے خطابات سے نوازا گیا ہے۔

قیامت ہے "خودی کا دیوتا" بھی یہ نہیں کہتا
کہ اے انسان تو ہے بے خدائے دین و آں ساقی
"پہن کر مغربی پہناوں کی سر سے بڑی ٹوپی"
"نیا ملا" سناتا ہے پرانی داستاں ساقی

نظم "تقلید و تحقیق" کے ان اشعار میں بھی اقبال کو مخاطب کیا ہے۔

کیوں کر یقیں دلائیے "اربابِ عشق" کو
مبنی ہے صرف عقل پہ انسان کی نجات
زہ کرچکے ہیں اہلِ بصیرت کمانِ عقل
ہشیار آشیانے سے "مرغِ الٰہیات"

اور پھر اپنے مخصوص لہجے میں اس درجے تک اتر آئے ہیں جسے شرافت برداشت نہیں کرسکتی۔

کیا واقعی بن جاؤں گا تجھ سا مومن
کیا عقل کا ہو جاؤں گا دشمن میں بھی
بھونکتے ہیں مرے افکار پہ وہ خانہ خراب
خود کو "علامہ" و "شاعر" کا جو دیتے ہیں خطاب

ان مثالوں سے یہی ثابت نہیں ہوتا کہ جوشؔ اقبالؔ کے سخت مخالف تھے بلکہ ان کی ذہنی سطح کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ علمی سطح پر رہ کر مخالفت کرنے کے اہل نہیں تھے اس لیے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اپنے مزاج کے مطابق پھکڑپن پر اتر آتے تھے۔ یہی حال اقبالؔ کے اجزائے فکر وفلسفہ پر تنقید کا ہے۔

(۵)

اقبالؔ کے محبوب موضوعات میں عقل و عشق بھی شامل ہیں۔ ان کے حوالے سے ان کے کلام میں بے شمار اشعار موجود ہیں۔ انھوں نے عقل پر بحث کرتے ہوئے اس کے درجات معین کیے ہیں۔ ایک نوعیت کی عقل کو وہ خام، فرومایہ اور خود بیں قرار دیتے ہیں۔ جس نے ظاہر و باطن کے علوم پر عبور حاصل نہ کیا ہو، اس کی عقل اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ مغربی نظام و نصابِ تعلیم اس کی نشو و نما نہیں کرتے بلکہ مادہ پرستی کی حد تک محدود کردیتے ہیں۔ سائنس موجودات کا علم فراہم کرتا ہے، مابعد الطبیعیات تک اس کی بھی رسائی نہیں ہے۔ دوسری نوعیت کی عقل وہ ہے جو مادی مظاہر سے گزر کر روح کی پہنائیوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ظاہر کو باطن کی شہادت اور توثیق کے لیے استعمال کرتی ہے۔ اسے عقلِ کامل کہہ سکتے ہیں۔ اقبالؔ نے اسے "عقلِ نورانی" کا نام دیا ہے یہی قابلِ اعتماد ہوتی ہے۔ دنیا اور دین کے معاملات میں رہنمائی کرکے انسان کو سرخ رو کرتی اور اس کے شرف میں اضافہ کرتی ہے۔ اول الذکر پر بھروسا کرنا نادانی ہے، آخر الذکر انسان کو عشق سے قریب تر کردیتی ہے۔ عزیز احمد نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

> وہ عقل جو محض ذاتی یا وقتی خود غرضی کے لیے تسخیرِ فطرت کرتی ہے دراصل عقلِ خود بیں ہے۔ یہ وہ دانشِ برہانی ہے جس کا انجام حیرت ہے۔ دانشِ نورانی یا عقلِ جہاں بیں اس سے مختلف ہے۔ عقلِ جہاں بیں عشق سے قریب ہے۔ وہ کائنات کی گہرائیوں میں سرایت کرجاتی ہے اور اسے اندر سے منقلب کرتی

ہے۔("اقبال' نئی تشکیل"۔ مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔ صفحہ ۲۸۵۔۲۸۶)

اقبال کے متعدد اشعار اس کی علمی بحث کے لیے وقف رہے ہیں جیسے۔

اک دانشِ نورانی' اک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی' حیرت کی فراوانی
عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آنکو نہ پردہ کشادہ نظرے
ایں سوے پردہ گماں و ظن تخمیں دگر است
اے خوش آں عقل کہ پنہائے دو عالم با اوست
نور را فرشتہ و سوز دل آدم با اوست

اقبال نے اس موضوع پر کثرت سے لکھا ہے۔ اس لیے جہاں کہیں وہ عقل کی مذمت کرتے ہیں تو قاری باور کرلیتا ہے کہ ان کی مراد عقلِ برہانی یا عقلِ فرومایہ سے ہے اور جب وہ عقل کی تعریف کرتے ہیں تو وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ان کا اشارہ عقلِ نورانی یا عقلِ کامل کی طرف ہے۔ درج ذیل اشعار عقلِ نورانی کے بارے میں ہیں۔

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی
باہر نہیں کچھ عقلِ خداداد کی زد سے
خرد سے رہبر و روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہگذر ہے

جب کہ عقلِ فرومایہ یا عقلِ جہاں بیں کی بے وقعتی ان اشعار سے ظاہر ہوتی۔

نگہہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی ہوئی ہے چار سو میں

....

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

....

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

جوش نے اپنے عمومی رویئے کے مطابق کلام اقبال پر اچٹتی نظر ڈالی۔ انھیں عقلِ نورانی اور عقلِ برہانی کا فرق سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ باور کر بیٹھے کہ اقبال "عقل کے دشمن" تھے اور لگے طعن، طنز و تشنیع کے تیر برسانے۔

کیا چاک کروں گا حق کا دامن میں بھی
افکار کا پھونک دوں گا خرمن میں بھی
کیا واقعی بن جاؤں گا تجھ سا مومن
کیا عقل کا ہو جاؤں گا دشمن میں بھی

....

افسوس ہے اے نور و خرد کے دشمن
بدبو سے بھرا ہوا ہے تیرا مسکن
کوزوں میں ترے بجھک رہا ہے اب تک
افسردہ چادر روایات کہن

....

اے شخص نہ کر اہانتِ عقلِ سلیم
کیوں مجلسِ دیں میں ہے ترا ذہن مقیم
کیا تیری نجات کے بنیں گے ضامن
یہ بیوہ عقاید اور یہ افکارِ یتیم

ان اشعار میں نور کے دشمن، خرد کے دشمن اور عقلِ سلیم کی اہانت کرنے والے کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ مخاطبت اقبال کے سوا کسی سے نہیں۔ اس طرح جوش نے اپنی عقل کے فرومایہ ہونے کی دلیل خود فراہم کردی ہے۔ کیوں کہ اقبال نے عقلِ سلیم کی اہانت کبھی نہیں کی۔ اس میں اقبال کا کوئی قصور نہیں اگر قصور ہے تو جوش کی فہم کا۔ اور پھر اپنے آپ کو "عقل پرست" ثابت کرنے کے لیے کہا۔

کسے سمجھائیں، کن لفظوں میں اور کس موقع پر
کہ نورِ عقل سے روشن ہے یہ سارا جہاں ساقی
کہ دانش صرف دانش ہے لباسِ مردمِ کامل
کہ حکمت صرف حکمت ہے کلاہِ مقبلاں ساقی

جوش نے اقبال کی ضد میں عقل پرستی کو شعار بنایا۔ عقل کی شان میں متعدد نظمیں، رباعیات اور قطعات لکھے۔ ان سب کی نوعیت سطحی ہے۔ ان میں فکر کی گہرائی نظر نہیں آتی۔ صرف عقل کی قصیدہ خوانی ہے۔

اقبال نے عقلِ فرومایہ کے خیال اور فکر کو ناقابلِ اعتنا بلکہ زہرِ قاتل قرار دیا ہے۔ موجودہ دور میں

جو برکتیں لعنت میں بدل گئی ہیں ان میں جمہوریت اور آزادیٔ اظہارِ خیال بھی ہیں۔ ان دنوں عقل و دانش کے فرمودات ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے لیکن عقلِ فرومایہ کے خیالات سے کتابیں، رسالے اور اخبارات بھرے پڑے ہیں اور یہ سب آزادیٔ اظہارِ خیال کے نام پر ہو رہا ہے۔۔ اس آزادی کے حامی بھول جاتے ہیں کہ ہر آزادی کے لیے بنیادی شرائط اور متعینہ حدود ہوتے ہیں۔ نام نہاد جمہوریت کے دور میں ان شرائط کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے اور تمام حدود کو پار کر کے اظہارِ خیال کی آزادی سے بہرہ اندوز ہوا جاتا ہے۔ جن کا دامن گوہرِ علم سے خالی ہے وہ دانش وروں کی صف میں شامل ہونے کے لیے ان مسائل پر اس حق کو استعمال کرتے ہیں جن کی ابجد سے بھی وہ واقف نہیں ہیں۔ اسی کی وجہ سے اقوام میں ذہنی انتشار کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اقبال بھی آزادیٔ خیال کو شرائط و حدود کا پابند رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ بے لگام آزادی کے قائل نہیں۔ اسی لیے انھوں نے کہا ہے:

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انساں کو ہے حیوان بنانے کا طریقہ

اقبال نے واضح الفاظ میں "فکرِ خام" کو آزادیٔ افکار کے لیے نا اہل قرار دیا ہے۔ اور یہ حق انھیں کے لیے رکھا ہے جو فکر و تدبر کا سلیقہ رکھتے ہوں۔ وہ اس بات کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ موجودہ تعلیم نوجوانوں کی فکر کی جلا کرتی ہے اس لیے اگر ڈگری یافتہ افراد اپنے آپ کو فکرِ عالی کا حامل سمجھتے ہیں تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ اس لیے اقبال نے مروجہ تعلیم کی بھی مذمت کی ہے۔ ان کا کہنا:

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

بے ربط خیالات رکھنے والوں کو آزادیٔ فکر و اظہار حاصل نہیں ہونا چاہیے گویا۔

اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اقبال نے شرائط اور حدود متعین کر دیے ہیں، ان کے بغیر آزادیٔ افکار ابلیس کا فعل ہے۔ جوش بھی انھیں افراد میں شامل ہیں جو ان شرائط کو پورا نہیں کرتے اور آزادی کی حدود کا خیال نہیں رکھتے۔ اور اس کا اظہار انھوں نے اقبال کی فکر کو نہ سمجھتے ہوئے اپنے ردِ عمل میں کیا ہے۔ اقبال کے خیالات کو رابط کے بغیر انھوں نے آخری مصرع کو پڑھ کر اندازہ لگا لیا کہ اقبال "آزادیٔ افکار کو ابلیس کی ایجاد" سمجھتے ہیں اور ان پر طعن کر دیا۔

افکار کو جانتے ہیں کارِ ابلیس
اچھا اس مرتبہ پہ فائز ہیں حضور

اپنی دانش میں وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اقبال "مذہب پرست" تھے اور کوئی مذہب آزادیٔ فکر کی حمایت نہیں کرتا اس لیے اقبال نے بھی آزادیٔ افکار کو ابلیس کی ایجاد قرار دیا ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

ایمان کبھی کھل کے سانس لے سکتا ہی نہیں
کشتی آب خرد میں کھیتا ہی نہیں
فریاد کہ آزادی افکار کا
مذہب کبھی لائسنس دیتا ہی نہیں

ان کا مذہب پر یہ حملہ بھی ان کی لاعلمی کی بنیاد پر ہے۔ مذہب آزادیٔ افکار کا لائسنس دیتا ہے' اس کا نام اجتہاد ہے۔ اس کے لیے بھی شرائط مقرر ہیں۔ قرآن میں دو باتوں پر خصوصیت سے زور دیا گیا ہے' ایک علم اور دوسرے تفکر۔ عام لوگوں کی طرح یہ تعلیم بھی جوش کی نظر سے پوشیدہ رہی۔ اسی لیے انھوں نے نتیجہ نکالا۔

علم آشوبِ عقاید ہے یہ کہیے کس سے
عقل غارت گرِ ایماں ہے کوئی کیا جانے

حالاں کہ قرآن کے ارشاد کے مطابق عقل ایمان کے لیے غارت گر نہیں بلکہ اس کے استحکام کا سبب ہوتی ہے' اس کے لیے شرط ہے کہ عقل خام نہ ہو۔

اقبال نے عقل کے مقابلے میں عشق کو پیش کیا ہے اس کے بھی کئی درجات ہیں۔ اعلا ترین جذبۂ عشق روحانی اور وجدانی کیفیت کا نام ہے جو پاکی' نیکی' فکرِ صالح' عملِ صالح سے مزیّن ہوتا ہے۔ وہی کارگہِ حیات اور عالمِ روحانیت میں کامیابیوں کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اس کی کامیابیاں عقلِ جہاں بیں کے لیے باعثِ حیرت ہوتی ہیں۔ عشق کا موازنہ عقلِ جہاں بیں سے کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ عقل پر مصلحت حاوی ہوتی ہے۔ اس کی مصلحت کوشی' عزایم اور اعمال میں مزاحم ہوتی ہے۔ عقلِ نورانی عشق سے قریب تر ہوتی ہے' وہ جذبۂ عشق کو مہمیز کرتی ہے۔ وہی راہ سجھاتی ہے اور عشق گامزن ہوتا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم' اقبال کے تصورِ عشق کی توضیح اس طرح کرتے ہیں:

> اقبال نے جس کیفیت یا جس جذبہ کا نام عشق رکھا ہے اس کے مظاہر کی گوناگونی کی کوئی حد نہیں' محبت کے اقسام کو کون شمار کر سکتا ہے۔ ہر رابطے میں محبت کا الگ رنگ ہوتا ہے۔ ماں باپ کی اولاد سے محبت ایک قسم کی ہے زن و شوہر یا مرد و زن کی محبت ایک دوسرے انداز کی۔ کہیں وطن کی محبت ہے کہیں نوعِ انساں کی محبت' کہیں کسی نصب العین سے اور کہیں مقصدِ حیات و کائنات سے۔

......سب محبتیں مجازی اور عکسی ہیں۔ اصل چیز جو سرمدی ہے وہ عشقِ مطلق ہے جس کا رابطہ حسنِ مطلق سے ہے لیکن معرضِ شہود میں عشق کی بوقلمی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ عشق کہیں قوتِ قلب و جگر پیدا کرتا ہے۔ کہیں عقل کی پشت پناہی کرتا ہے۔ کہیں چشمِ نم ناک میں ظہور کرتا ہے۔ کہیں بے خودی کا رنگ اختیار کرتا ہے اور کہیں خودی کو استوار کرتا ہے۔

("فکرِ اقبال"۔ صفحہ ۳۲۰)

اقبال جس جذبۂ عشق کے قائل ہیں' اس کی فضیلت کے بارے میں کہتے ہیں۔

عشق دمِ جبرئیل' عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول' عشق خدا کا کلام
عشق کی مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات' عشق سے نارِ حیات
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات
زندگی را شرع و آئین است عشق
اصلِ تہذیب است' دین است عشق
ظاہر او سوزناک و آتشیں
باطن او نورِ رب العالمین

اس عشق کا وہی قائل ہو سکتا ہے جو روحانیت کا بھی قائل ہو۔ جو عقل جہاں بیں رکھتا ہے' وہ مادیت سے ماورا ہو کر نہ سوچ سکتا ہے اور نہ اس جذبے کو سمجھ سکتا ہے۔ جوش کی ذہنی سطح مادیت سے بلند تر کبھی نہ ہو سکی اس لیے وہ اقبال کے فلسفۂ عشق کو سمجھ ہی نہ سکے اور جب اقبال نے حضرت ابراہیمؑ کی مثال پیش کی جو نارِ نمرود میں بربنائے عشقِ مطلق عواقب کی پروا کیے بغیر کود گئے تھے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تو جوش نے اس بیان کی تردید میں کہا۔

غلط کہ کود پڑے تھے خوشی سے شعلوں میں
بہ جبر آگ میں جھونکے گئے تھے ابراہیمؑ

اگر جوش کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آتشِ نمرود گلزار میں تبدیل کیوں ہوئی تھی۔ اس کی تاویل کرنے سے وہ قاصر رہے اس لیے اس نکتہ کے بارے میں کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا۔ جوش کی فطرت تھی کہ وہ مسلّمات کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے اور کسی مسلّمہ حقیقت کے ایک

حصہ کی تردید کی گنجائش نظر آتی تو اس کے اظہار سے دریغ نہیں کرتے لیکن دیگر پہلو کی تردید ممکن نہ ہوتی تو اس سے نظر بچا جاتے۔ اس لیے انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ آتش نمرود حضرت ابراہیمؑ کے لیے امتحان تھی اور گلزار اس میں کامیابی کا انعام۔

جذبۂ عشق اور اس کی کیفیات کے اظہار سے ہماری شاعری بھری پڑی ہے۔ اقبالؔ کے علاوہ بھی بڑے بڑے شاعروں نے اپنے قلبی تجربات کی روشنی میں اس جذبے کی کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ جوشؔ نے اپنے تجربات کے بیان سے گریز نہیں کیا۔ جس سطح کی ان کی فکر تھی ویسے ہی ان کی آرزوئیں اور تمنائیں تھیں۔ ان کا تصورِ عشق دو جسموں کے ملاپ سے بلند تر کبھی نہ ہو سکا۔ وہ شہوت اور ہوس ناکی کو عشق کا درجہ دیتے رہے۔ "یادوں کی بارات" ان کی عشقیہ کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ اس میں جنس کی بھی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اپنے قبیح اعمال کے جواز کے لیے انھوں نے جو فلسفۂ عشق ایجاد کیا جو نہایت عامیانہ ہے۔ انھوں نے اپنے جذبۂ عشق اور اقبالؔ کے تصورِ عشق کی توضیح بہ یک وقت اپنی نظم "سراب" میں اس طرح کی ہے۔

یہ ہیں فقط شاعری کی باتیں
یہ ہیں فقط صوفیوں کی نشتیں
کہ عشق ہے روحِ بے کرانی
کہ عشق ہے جنسِ آسمانی
مگر یہ اب پول کھل چکا ہے
کہ عشق ہیجان جسم کا ہے
نہ عشق اعلیٰ نہ عشق احسن
فقط اک اعصاب کی ہے اینٹھن

اک جنس کا میلان ہے اور کچھ بھی نہیں
اک جسم کا ہیجان ہے اور کچھ بھی نہیں
اے مردِ خدا روح سے کیا عشق کو کام
یہ خون کا ارمان ہے اور کچھ بھی نہیں

جس معیار کا تصورِ عشق جوشؔ نے پیش کیا ہے اسی معیار کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ "پول کھل جانا" "اعصاب کی اینٹھن" ان کے ذوقِ شاعری کے ترجمان ہیں۔ اس موازنہ سے کیسی بلندی کے مقابلہ میں کیسی پستی نظر آتی ہے۔ اسے ذوقِ سلیم کون سمجھ سکتا ہے۔ آفریں ہے جوشؔ پر وہ اپنے دیگر شاعرانہ خیالات سے عملاً چاہے جتنے بھی دور رہے ہوں اپنے فلسفۂ عشق پر وہ زندگی کے آخری لمحات تک سختی سے عمل پیرا رہے۔

اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ عشق کا ایک درجہ "مجازی" بھی ہے۔ اس کے بھی کئی روپ ہوتے ہیں۔ مرد و زن کے جسمانی تعلق کو ایک فطری ضرورت تو قرار دیا جاسکتا ہے عشق نہیں کہا جاسکتا۔ مجازی عشق میں وصال کی خواہش کے سوا بھی بہت سی خواہشیں ہوتی ہیں جو نگاہ' ذہن' دل اور روح کی تسکین کے لیے کی جاتی ہیں۔ جوش نے ان سب سے انکار کیا ہے اور عشق مجازی کو بھی جنسی ہوس پرستی تک محدود کردیا ہے۔ وہ بڑی شد و مد سے قدما کی شاعری کو رد کرتے ہیں کہ وہ حقیقت پسندانہ نہیں تھی اور دوسروں کی ذہنی تربیت کا فرض ادا نہیں کرسکتی تھی۔ لیکن یہ الزام دوسروں سے زیادہ خود جوش پر عاید ہوتا ہے۔ انھوں نے نوجوانوں کے ذہنوں کی تربیت کرنے کی بجائے جنسی لذت پسندی کی تشہیر کرکے انھیں بھٹکانے کا کام انجام دیا ہے۔ اقبال اور جوش کی شاعری میں بنیادی فرق یہی ہے۔ اقبال نے ذہنوں کی تربیت کے لیے شاعری کی تو جوش نے گم راہ کرنے کے لیے۔ "عورت پرستی" جوش کے علاوہ اکثر شاعروں کا شعار رہا ہے' اسی لیے اقبال نے کہا تھا۔

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ' بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ بات بھی جوش کو ناگوار گزری' چناں چہ انھوں نے کہا۔

سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دیتی ہے
جاگے ہوئے فتنوں کو سلا دیتی ہے
جس قوم کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
وہ عقل سے عشق کو بڑھا دیتی ہے

اقبال نے ایک حقیقت کا اظہار کیا ہے اور جوش نے لفظی موشگافی سے کام لیا ہے۔ اقبال کے شعر کی تشریح عزیز احمد نے درست طور پر کی ہے۔ ان کا کہنا ہے:

> اعتراض ہرگز یہ نہیں ہے کہ عورت ہندوستان کے جدید شاعروں یا مصوروں کا خاص موضوع ہے۔ نہیں بلکہ یہ کہ عورت ان کے ذہن پر اس قدر چھاگئی ہے کہ وہ ان کے اور زندگی کے درمیان ایک حجاب بن گئی ہے۔ شاعر اور مصور اپنی ساری جنسی تمنائیں جو زندگی میں ناکام رہتی ہیں اپنے فن میں پوری کرلیتے ہیں۔ عورت سے عشق کا بھی انھیں اچھی طرح سلیقہ نہیں۔ وہ ان کے ذہن پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ وہ اسے بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے۔ ("اقبال' نئی تشکیل"۔ صفحہ ۲۲۹۔۲۳۰)

عورت اور جنسی ضرورت سے انکار ممکن ہی نہیں۔ یہ انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق وجود

میں آئے ہیں لیکن ان کا ذہنوں پر چھا جانا مرض بن جاتا ہے۔ اقبال نے اسی مرض سے بچاؤ کی ترغیب دی ہے کہ جوش اس میں مبتلا ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔

اقبال نے عقل و عشق کا موازنہ اکثر اشعار میں کیا ہے اور عشق کی عقل پر برتری ثابت کی ہے۔ یہ کہاں ممکن تھا کہ اقبال کوئی بات کہیں اور جوش اس کی تردید نہ کریں۔ چناں چہ اقبال کے خیالات کو مسترد کرنے کے لیے نظم "جنون و مومن" لکھی۔ اس میں بھی مخاطبت اقبال سے ہے۔ پہلے بند کی ابتدا اس شعر سے کی ہے۔

فغاں کہ عشق و جنوں کی چلی وہ صرصر تند
کہ بجھ گیا سر محفل چراغ عقل سلیم

دوسرے بند میں ارشاد فرمایا ہے۔

یہ نکتہ جوش دلوں میں اتاردوں کیوں کر
کہ سیل عشق نہیں جوئے عقل ہے تسنیم
غلط کہ کود پڑے تھے خوشی سے شعلوں میں
بہ جبر آگ میں جھونکے گئے تھے ابراہیم
"مبلغان غلط بین عشق" کو اب تک
خبر نہیں کہ یہ قرآن کا ہے لفظ رجیم
خدا گواہ کہ ام الکتاب کی رو سے
خرد ہے خیر کثیر اور خدا علیم و حکیم
لگے جنوں کو وہ ٹھوکر کہ دم نکل جائے
قدم بڑھائے اگر بے عناں عقل سلیم
جبین عقل پہ ہے تاج دولت دارین
تمھیں خبر بھی ہے اے صاحبان قلب دونیم
ہزار جلوہ انجم اور ایک پر تو مہر
"ہزار ضرب کلیم" اور ایک حرف حکیم

ان کے خیال میں "عشق" کے لیے "دیدار" اور "جلوہ" لازمی ہیں۔ آنکھوں سے دیکھے اور دل سے پسند کیے بغیر انسان "عشق" میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ جو شرایط اور لوازم عشق مجازی کے ہیں "عشق حقیقی" کے لیے بھی وہ انھیں ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک رباعی میں اقبال کے نظریہ عشق پر اعتراض اسی نقطہ نظر سے کیا ہے۔

آتش کے بغیر دود ممکن ہی نہیں
بے شاہد لطف عود ممکن ہی نہیں

عنقا ہو جہاں دولتِ دیدار و شہود
واں "عشق" کا ہو وجود ممکن ہی نہیں

جوش اپنی کوتاہ بینی کو شہود سمجھتے ہیں اس کے آگے کی بھی کچھ منزلیں ہیں جن سے وہ ناآشنا ہیں۔ وہ اس کے راہ نشین رہے نہ راہی۔ مظاہر پرستی سے گزر کر مادی عناصر میں "جلوہ" انھیں کیوں کر نظر آتا۔ اللہ اللہ کیا وقت آگیا کہ جوش اقبال کو درسِ قرآن دے رہے ہیں۔

قرآن نے اس عشق کو "رجیم" قرار دیا ہے جس کے جوش قائل ہیں۔ ایک موقع پر تو اقبال کی تردید میں وہ کہتے ہیں کہ "مذہب افکار کی آزادی کا لائسنس نہیں دیتا۔" اور دوسرے موقع پر اس کی تردید میں قرآن کا حوالہ دیتے ہیں کہ "ام الکتاب نے خرد کو خیرِ کثیر" قرار دیا ہے۔ اس بوالعجبی اور انتشار ذہنی کا نام ہے جوش کی فکر اور شاعری۔

جوش نے اقبال کے تصورات کے برعکس عشق پر عقل کی فضیلت ظاہر کرنے کی سعی کی ہے۔ اس نوع کے اشعار میں مخاطب اقبال ہی ہیں لیکن نئے نئے ناموں کے ساتھ۔

"اے مردِ خدا" عشق کی تلقین نہ کر
"اے صیدِ جنوں" عقل کی توہین نہ کر
کیوں کر یقیں دلایئے "اربابِ عشق" کو
مبنی ہے صرف عقل پر انسان کی نجات
زہ کر چکے ہیں اہلِ بصیرت کمانِ عقل
ہشیار آشیانہ سے مرغِ الٰہیات

اہلِ دانش نے اقبال کو "دانائے راز" اور "گرہ کشائے رموزِ حیات" جیسے خطابات سے نوازا۔ یہ بات جوش کو کہاں گوارا ہو سکتی تھی کہ ایسے خطابات ان کے علاوہ کسی کو دیے جائیں اس لیے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کہا۔

دیوانوں سے ناکوں کو رگڑ رکھا ہے
ایمان کے پنجے میں جکڑ رکھا ہے
تم جس کو "گرہ کشا" کا دیتے ہو خطاب
اس نے ہی تو تم سب کو جکڑ رکھا ہے

(۶)

اقبال کی فکر کے کئی دائرے ہیں۔ ایک دائرے میں رہ کر وہ ملک اور وطن سے محبت کی بات کرتے ہیں۔ دوسرے دائرے میں اسلام کو آفاقی رہنما قوت جان کر اس کے احیا کی سوچتے ہیں۔ اس کی سربلندی کے لیے وہ تمام ممالک کے مسلمانوں کو ملت کے تصور کے ساتھ متحد کرنا چاہتے ہیں۔ تیسرے دائرے میں

وہ عالم گیر انسانی مسائل پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اور بلا لحاظِ مذہب و ملت سب کی خامیوں اور برائیوں کی نشان دہی کر کے ان کی اصلاح اور مادی و روحانی ترقی کے لیے اپنا منظم اور مربوط فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ یہ دائرے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

انھوں نے ملک اور وطن کے بارے میں بھی فکر کی ہے حبِ وطن کے ترانے بھی گائے ہیں۔ ان کی نظمیں "ترانۂ ہندی" "نیا شوالہ" "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اس کی نمایندہ مثالیں ہیں۔ انھوں نے برطانوی تسلط کے دور میں زندگی گزاری۔ ان کے دل میں آزادی کی تڑپ تھی۔ اسی تڑپ نے انھیں عملی سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ ان کی سیاسی بصیرت کا خطبۂ الٰہ آباد شاہد ہے۔ غلامی سے بیزاری کی کیفیت ان کے اکثر اشعار میں ملتی ہے۔ وہ اس کی سخت مذمت کرتے ہیں۔ جس دور میں انھوں نے غلامی کے خلاف آواز اٹھائی ان کا نقطۂ نظر وسیع ہو چکا تھا اس لیے انھوں نے دیگر اردو شاعروں کی طرح صرف برصغیر کی آزادی کے نعرے نہیں لگائے بلکہ برصغیر کے علاوہ دیگر غلام ممالک کی ترجمانی کی خاطر اس استبدادی چلن کی اصولی مخالفت کی۔ وہ ملکوں کے غلام ہونے پر اس لیے رنجیدہ اور افسردہ نہیں ہوتے کہ انھیں سیاسی، معاشی اور انتظامی آزادی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس لیے کہ غلامی میں انسانی نفسیات بدل جاتی ہے، قوم شرفِ انسانیت سے محروم ہو کر حیوانی درجہ تک گر جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ غلامی پر راضی اور قانع ہو جاتی ہے۔ اس طرح غلامی، سیاسی اور معاشی استحصال کے ساتھ انسان کی ذہنی اور روحانی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ استحصال سے آزاد ہونا آسان ہے لیکن ذہنی اور روحانی پستی سے نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ مقامِ آہ و فغاں سیاسی غلامی سے زیادہ "خودی" کی موت ہے۔ یہ نکتۂ نظر بالکل نیا ہے جو اقبال نے پیش کیا ہے اور حبِ وطنی کے جذبے سے بھی اعلیٰ تر احساس ہے۔ حالتِ غلامی میں تمام قوم کی مرضی کے شامل ہونے کا بھی شائبہ ہوتا ہے اگر جابر قوت جس نے کسی قوم کو غلام بنا رکھا ہے وہ یقیناً قابلِ مذمت ہے لیکن غلامی پر قانع رہنے والی قوم بھی کم قابلِ مذمت نہیں۔ یہ اصولی مباحث ہیں جنھیں اقبال نے موضوعِ سخن بنایا اور ظاہر ہے کہ اس کے محرک برصغیر کے حالات تھے۔ انھوں نے اپنے جذبۂ حبِ وطن کو سطحی طور پر ظاہر نہیں کیا بلکہ اسے فکری انداز بھی دیا ہے۔ اسی لیے انھوں نے کہا۔

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو گلا تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

اقبال کی حبِ وطنی میں سیاسی نعرہ بازی نہیں، وہ جوش و ولولہ اور تخریب پسندی نہیں جسے لوگ "انقلاب" کہتے ہیں۔ نعرہ بازوں اور مفکر کی شاعری کا فرق وہیں واضح ہوتا ہے جب جوش اور اقبال کا موازنہ کیا جائے۔ قوموں کے اہم مسائل نعروں اور سنہری خوابوں سے حل نہیں ہوتے۔ دل سوزی کے ساتھ سنجیدہ فکر سے ان کا حل نکالا جاتا ہے، یہی کام اقبال نے انجام دیا ہے۔

اگرچہ انھوں نے "ہندوستاں" کا نام لیے بغیر غلامی کے ادارے کی مذمت کی ہے لیکن اس کا

محرک وہی جذبۂ وطن سے محبت کا ہے جو جوشؔ کو نظر نہیں آیا۔ اقبالؔ حالات اور واقعات کو تجریدی انداز میں دیکھنے کے عادی نہیں تھے وہ اصولوں اور بین الاقوامی حالات کے تناظر میں سیاسی امور کا تجزیہ کرتے تھے۔ کیا ان اشعار سے اقبال کی "ملک دوستی" عیاں نہیں ہوتی ہے۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

وہ ہر قدم پر عوام کو متنبہ کرتے رہے۔ انگریزوں کی سازشوں کی حقیقت بیان کرتے رہے۔ جب انھوں نے اہلِ ہند کو سیاسی مراعات دینے کا اعلان کیا اور تمام سیاسی جماعتوں نے اسے اپنی جدوجہد کی کامیابی سمجھ کر جشن منائے تو اقبال کی دل سوزی نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کیا۔

شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے
خریدتے ہیں فقط ان کے جوہرِ ادراک

ہندوستان میں ایسے مذہبی رہنماؤں کی کمی نہیں تھی جو انگریزوں کی حکومت کو "برکاتِ الٰہیہ" سے تعبیر کرتے تھے جو اپنے خطبوں میں تلقین کرتے تھے کہ "حاکمِ وقت" سے وفاداری کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اقبالؔ نے ان کے خلاف بھی آواز اٹھائی اور کہا۔

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

اور ساتھ ہی اس بات پر افسوس کیا ہے۔

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی میں رضامند

محولہ بالا تمام اشعار وطن دوستی اور غلام قوم سے ہمدردی کے جذبے میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں لفظی گھن گرج نہیں ہے لہجے میں جوش و خروش نہیں ہے۔ آزادی کی خواہش میں نعرہ بازی نہیں ہے پھر بھی یہ وطن کی محبت کے ترجمان ہیں۔ الفاظ کا دروبست، لہجے کا وقار، فکر کی گہرائی بتلا رہی ہے کہ یہ درد کی آواز ہے، پروپیگنڈے کی گونج نہیں ہے۔ انھوں نے اہلِ وطن کو غیرت دلانے کے لیے بڑے دھیمے لہجے میں کہا ہے کہ افسوس مجھے ایسے دیس میں پیدا کیا گیا جہاں کے لوگ غلامی پر رضامند ہیں۔ ان کے برخلاف جوشؔ کے حبِ وطن کی عجیب شان ہے۔ وہ اہلِ وطن سے اس حد تک محبت کرتے ہیں کہ انھیں گالیوں سے نوازنے لگتے ہیں۔

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لیے نگاہ

اے روسیہ، بے حیا، وحشی، کمینے، بدگماں
اے جبینِ ارض کے داغ، اے دلِ ہندوستان
انسان کی زبوں ترین بدبختی ہے
بد اصل دونی قوم میں پیدا ہونا
زندہ مردوں کی ہے بستی کون سنتا ہے یہاں
تا بہ کہ چیخا کروں "ہندوستان، ہندوستان"

....

اک نظر بھی قدردانِ جوہرِ قابل نہیں
ہند کے اجڑے ہوئے سینے کے اندر دل نہیں

....

اپنی تباہیوں پہ کبھی غور کر سکے
اتنی ذلیل ملک کو فرصت کہاں ہے جوش
افسوس کہ قوم کا سیاسی چھکڑا
دھوبی کے گدھے کھینچ رہے ہیں ہمراز

ممکن ہے ان اشعار میں کسی کو اہل وطن کی محبت نظر آئے، ہم نے تو یہ محسوس کیا ہے کہ ایک جلاد قسم کا جاگیردار اپنی بے بس رعایا کو مخاطب کر رہا ہے۔ اس کے پاس کلام کا کوئی مقصد تو نہیں وہ صرف گالیاں دینے کا شوق پورا کر رہا ہے۔ غالباً "حبِ وطن کی سرشاری میں لکھے گئے ان اشعار کو پڑھ کر ہی نیاز فتح پوری نے لکھا تھا کہ "جوش کے یہاں گالی دینے کا جذبہ گھٹ کر شاعری بن گیا ہے۔" نیاز مرحوم نے بڑی رعایت سے کام لیا ہے کہ ان اشعار کو "شاعری" کہا ہے۔ نفسِ بیاں اور طرزِ اظہار کسی میں بھی اعلا درجہ کی شاعری کا گمان بھی ممکن نہیں ہے البتہ اسے "گالیوں کا انسائیکلوپیڈیا" کہہ سکتے ہیں۔

ستم یہ ہے کہ اس اندازِ فکر و اظہار پر وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا انسان دوست قرار دیتے ہیں اور لاالہ الا اللہ کے کلمۂ ایمانی کے مقابلے میں لا الٰہ الا الانسان کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ گالیوں کے ذریعے انسان کی توقیر صرف جوش کو زیب دیتی ہے۔ ایک ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ اس شانِ حب الوطنی کے باوصف وہ اقبال کو محبِ وطن تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کی نظم "حبِ وطن اور مسلمان" ملاحظہ فرمایئے جو اقبال کو مخاطب کر کے لکھی گئی۔

دل پہ تیرے نقش ہے وہ فلسفہ ادیان کا
کاٹتا ہے رشتہ جو انسان سے انسان کا
تیری بستی تنگنائے کفر و ایماں کے لیے
میں بنا ہوں آب و رنگِ نوعِ انساں کے لیے

حصہ ہے سب سے مقدّم زندگی میں "خویش" کا
"خویش" سے بچ جائے تو زر مال ہے درویش کا
سعی کرنا چاہیے پہلے تو گھر کے واسطے
گھر سے فرصت ہو تو پھر نوعِ بشر کے واسطے
تیرے لب پر ہے عراق و شام و مصر و روم و چیں
لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں
کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں
کل جہاں تیرا گر ہندوستاں تیرا نہیں
مردِ حق کو قعرِ باطن سے ابھرنا چاہیے
کعبۂ حبِ وطن میں سجدہ کرنا چاہیے
سب سے پہلے مرد بن ہندوستاں کے واسطے
ہند جاگ اٹھے گا پھر سارے جہاں کے واسطے

اپنے معاصرین اور ہم وطنوں کی گالیوں سے توقیر بڑھانا جوش کے سوا کسی شاعر کا شیوہ نہیں رہا۔ حضرت یاس یگانہ چنگیزی ان کی حدود میں داخل ہونے کے لیے کوشاں رہے لیکن جو ذہنیت جوش نے پائی تھی اس سے وہ عاری تھے' اس لیے ان کے پایہ کو نہ پہنچ سکے۔ جوش نے اس حصہ میں "زبان کو صیقل" کرنے کے لیے ہزل گوئی بھی اختیار کیا تھی۔ ان کے جوہر ہم وطنوں کو گالیاں دینے ہی میں نہیں کھلے بلکہ اس کا رنگ وہاں اور زیادہ چوکھا ہو گیا ہے جہاں انھوں نے "ملا" کو نشانہ بنایا ہے۔ اس طبقے سے اردو اور فارسی کا کوئی شاعر خوش نہیں۔ قدما اور متوسطین کے پاس بھی اس کے خلاف مضمون آفرینی ملتی ہے لیکن وہ "برائے بیت" یا بربنائے شوخیِ گفتار ہے۔ اقبال نے ان کے بارے میں جو شعر کہے ہیں ان میں ایک احساسِ دردمندی ہے۔ اسلام کی جو خدمت ان سے ہونی چاہیے تھی وہ اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ ان کا علم محدود ہوتا ہے۔ وہ مذہب کی روح کو سمجھنے کے اہل نہیں۔ ان کا انحصار علم اور تفکر کے بجائے اقوال پر ہوتا ہے۔ جن باتوں کی وہ نصیحت کرتے ہیں ان پر خود کاربند نہیں رہتے۔ وہ دنیادار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس موضوع پر ان کے سنجیدہ اشعار بھی ہیں اور طنزیہ اشعار بھی۔

سنجیدہ اظہار کی چند مثالیں۔

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

....

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

"جواب شکوہ" میں خدا کی جانب سے ملا پر اعتراضات عاید کیے ہیں کہ۔

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی' شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں' روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا' تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

اور جب اقبال طنزیہ انداز اختیار کرتے ہیں تو نظم "ملا اور بہشت" وجود میں آتی ہے جس میں اس طبقہ کی سرشت آشکار کی گئی ہے۔ وہ جدل' قال' اقوال' بحث' تکرار' تکفیر اور فساد فی سبیل اللہ میں مبتلا ہے اس لیے اقبال کو ملا کی جنت پر بھی اعتراض ہوتا ہے کہ وہاں اس کی زندگی ان پسندیدہ چیزوں کے نہ ہونے سے اجیرن ہو جائے گی۔ شوخیِ بیان کے باوجود اقبال نے احتیاط ملحوظ رکھی ہے اور معیارِ شاعری کو باقی رکھا ہے۔

مذہب کے یہ ٹھیکے دار ملا' زاہد' شیخ' پیر کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ ان کا رشتہ دین سے اتنا مستحکم نہیں ہوتا جتنا دنیا سے ہوتا ہے۔ مذہب بھی ان کے لیے فنِ زرگری بن کر رہ جاتا ہے اس صورتِ حال کا انحصار بھی اقبال نے "بانگِ مرید" کی زبانی کیا ہے۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو کہ دیہاتی مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں' سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن

یہ موضوع جوش کو طبع آزمائی کے لیے دلکش اور دلچسپ معلوم ہوا۔ اس لیے نہیں کہ انھیں مذہب سے کوئی لگاؤ تھا اور ملا کو وہ اس کے فرض اور مقام سے واقف کروانا چاہتے تھے جیسے کہ اقبال نے اشارہ کیا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ اس میں وہ اپنے مذاق کے مطابق مضمون آفرینی کر سکتے ہیں اور گالی

دینے کا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ انھوں نے "خدا کے وہم کا شکار" قرار دے کر ملا کو بھی مطعون کیا ہے اور مذہب اور خدا کو بھی۔ اس پر مستزاد ان کا غیر شاعرانہ انداز بیان۔ ملاحظہ ہو ان کی نظم "شیطانی زہد"

جوش کے غیر سنجیدہ رویے کا اظہار ان کی نظم "مولوی" میں بھی ہوتا ہے اس نظم میں بھی مولوی کی ظاہری حالت کو بیان کیا گیا ہے اور انتہائی مضحکہ خیز تصویر کھینچی گئی ہے اس نظم کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ حسینوں کی سراپا نگاری سے جو مہارت حاصل ہوئی اسے یہاں صرف کر دیا ہے۔

نظم میں کوئی مقصدیت نہیں ہے۔ سراپا کو کراہیت کے ساتھ موضوع بنانا ہجو نگاری تو کہلا سکتا ہے لیکن نظم گوئی کا اعلیٰ نمونہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عیوب جسمانی کو تختۂ مشق بنا کر جوش نے نظم سے وہ کام نہیں لیا جو "مولوی" کے اعمال و افکار میں تضاد کی بنا پر نفریں کا جذبہ پیدا کر سکتا۔ وہ صرف اپنے زور بیان پر تکیہ کر کے شعر کہتے اور مقصدیت سے ہمیشہ نا آشنا رہے۔ "مولوی" کی طرح ان کی نظم "ذاکر سے خطاب" بھی طعن و تشنیع کا مجموعہ ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ امام حسینؓ اور واقعہ کربلا کے حوالے سے ان کی جو نظمیں خاص حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرتی ہیں' ان میں خود جوش نے ذاکر کا کردار ادا کیا ہے۔ ذاکر اور جوش میں فرق یہ ہے کہ وہ معاوضہ کے لیے ذکر حسینؓ کرتا ہے اور ثواب اس کا نکتہ نظر ہوتا ہے تو جوش واہ واہ کے خزانے لوٹنے کے لیے۔ جس اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے مخالف ہیں ان ہی کی وساطت سے ذکر حسینؓ میں زور بیاں پیدا کرتے ہیں۔ خلوص دل کا دونوں کے یہاں فقدان ہے۔

(۷)

اقبال فارسی اور اردو کے ان چند خوش نصیب شاعروں میں شامل ہیں جن کی فکر و شاعری کی قدر ان کی زندگی میں ہوئی اور مشرق و مغرب میں ان کے چرچے عام رہے۔ ان کے افکار کی توضیح و تشریح اور حمایت میں مقالے لکھے گئے یہ سلسلہ ان کی وفات کے بعد تیز تر اور ہمہ گیر ہو گیا۔ جوش نے ہمیشہ اپنے وسیع مطالعہ کے دعوے کیے اردو' فارسی' انگریزی' ہندی کے ہر معروف شاعر کو پڑھنے کا دعوا کرنے کے ساتھ علامہ کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین کو خط کے ذریعے اطلاع دی:

اس کے بعد اقبال آئے مگر چھا نہیں سکے۔

(رسالہ "افکار" کراچی' جوش نمبر: ص ۱۳۱)

اس "نہ چھانے والے" شاعر کی وفات کے بعد وہ جوش کی نظر میں بہت بڑے شاعر قرار پائے اس بارے میں ان کی دو تحریریں محفوظ ہیں ایک وہ جو رسم دنیا نبھانے اور نام آوری کے مواقع ضائع نہ کرنے کے شوق میں تعزیتی مضمون کے طور پر لکھی گئی دوسرے وہ پیغام جو انجمن سادات امروہہ (کراچی) کے مشاعرہ بیاد اقبال (۱۹۷۷ء) کے تعارفی مجلہ "معجزہ فن" کے لیے بھیجا گیا۔ ان دونوں میں علامہ اقبال کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ بھی مردہ پرست ہیں حالاں کہ زندگی بھر وہ مردہ پرستی کی روایت پر لعن طعن کرتے رہے۔

تعزیتی مضمون میں جوش نے اقرار کیا ہے:

> کس کے منھ میں اتنے دانت ہیں کہ ان کی عظمت کا انکار کرے۔ اقبال شاعر تھا عظیم شاعر! اقبال مفکر تھا عظیم مفکر!! (اقبال کی موت پر از جوش مشمولہ "مقالاتِ جوش" مرتبہ سحر انصاری: مطبوعہ کراچی: ۱۹۸۳ء۔ ص ۳۵۲)

اسی کے ساتھ اعتراف بھی کیا کہ:

> میں ہندوستان کے رعب آفریں اور عبرت ناک وسیع براعظم پر اس سرے سے اس سرے تک نگاہ دوڑاتا ہوں مگر کروڑوں کی اتنی زبردست آبادی کے اندر مجھے ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس بلند پایہ مرنے والے کی خانہ پُری کر سکے۔ (حوالہ مذکورہ: ص ۳۵۳)

اسی طرح مذکورہ پیغام میں ارشاد فرمایا ہے:

> حضرتِ اقبال ایک بزرگ شاعر اور، بحر بیکراں قسم کے انسان تھے اور ابلاغ پر بھی ان کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ (حضرتِ اقبال از جوش مشمولہ "جوش ملیح آبادی کی نادر غیر مطبوعہ تحریریں۔" مرتبہ ڈاکٹر ہلال نقوی: مطبوعہ کراچی: ۱۹۸۲ء: ص ۷۹)

"نہ چھانے والے شاعر" کی عظمت کے گیت گا کر جوش نے اپنے انتشارِ ذہنی اور تضاد بیانی کا ثبوت دیا ہے۔ اسی طرح عظمت و بزرگی کے اعتراف کے ساتھ مذمت کے پہلو دریافت کرکے اپنی کمزوری پر صاد کیا ہے۔

آج بھی علمی دنیا علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ کی معترف ہے۔ مسلم اور غیر مسلم، مشرقی اور مغربی اہلِ علم و دانش ان کے وسیع موضوعات کی توضیح و تشریح اور تحسین کر رہے ہیں اور ان کے کلام میں موجود آفاقی قدروں کی نشان دہی کر رہے ہیں لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو انھیں تنگ دائروں میں محبوس و مقید کر دینا چاہتا ہے جو لوگ انھیں شاعرِ مشرق کہتے وہ انھیں مشرق تک محدود کر دیتے ہیں۔ چند ایسے بھی ہیں جو انھیں صرف مذہب پرست اور اسلام کا شیدائی ثابت کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، حالاں کہ علامہ ان قیود سے ماورا ہیں وہ آفاقی قدروں اور عالمِ انسانیت کے شاعر ہیں۔ جوش ان کی عظمت کے گن گانے کے باوجود سطحی تاثر سے بلند تر نہ ہوئے اور انھیں صرف اسلام کا شاعر تسلیم کیا وہ اپنے سوا کسی کو "مکمل شاعر" ماننے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے اس لیے علامہ کو یہ اعزاز کیوں کر دے سکتے ہیں۔ انھوں نے علامہ پر اعتراض کر دیا:

> ابتدا میں ہر عظیم شاعر کی طرح اقبال کی شاعری بھی وسیع اور آفاقی شاعری تھی۔ اس کی نظر دور رس اور اس کا سینہ چوڑا تھا مگر اس کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر اس کی شاعری کا دائرہ تنگ ہونے لگا اور آخر کار یہاں تک تنگ ہو گیا کہ اس کی

تمام تر شاعری مذہب تک محدود ہو کر رہ گئی۔

("مقالاتِ جوش": ص ۳۵۳)

جوش کا بیان کردہ قاعدہ کلیہ ان کے ذہن کی پیداوار ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ ابتدا میں کسی شاعر کا کلام وسیع اور آفاقی ہو اور بعد میں ترقیٔ معکوس کے ذریعہ محدود ہوتا جائے۔ ایسی مثالوں کی کمی نہیں کہ شاعرانہ اور روزمرہ تجربات کے بعد کلام میں وسعت، گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی گئی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلام اقبال پر ایک خود ساختہ الزام عاید کرنے کے لیے ایک اصول خواہ مخواہ متعین فرمایا اور اس کے تحت جواز پیش کیا ہے۔ اسی نوع کا اظہار انھوں نے مذکورہ پیغام میں بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں:

> ان کے دماغ میں ایک مدت تک عقل و عشق کے مابین کشمکش ہوتی رہی لیکن آخر کار اپنے آبائی اور ذاتی میلانات کی بنا پر انھوں نے آفاقیت سے منھ موڑ کر اسلامیت کا دامن پکڑ لیا۔

("جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں" ص ۷۹)

ایسے الزامات وہی عاید کر سکتا ہے جس کا علم محدود اور سنی سنائی باتوں پر ہو اور جس کا ذہن شوقِ مطالعہ اور اخذِ نتائج سے قاصر ہو۔ یہی کیفیت جوش کی بھی ہے۔ وہ علامہ کو برصغیر کا عظیم ترین شاعر بھی مانتے ہیں جس کی جگہ کوئی پُر نہیں کر سکتا اور ان کے افکار کو "اسلامیت" تک "محدود" بھی قرار دیتے ہیں۔ کیا علامہ کے خیالاتِ زمان و مکاں، ان کا پیغامِ عمل، ان کا فلسفۂ خودی و بے خودی، کارل مارکس کے بارے میں ان کا اعلان کہ وہ "پیغمبرِ بے کتاب" تھا، کیا سرمایہ و محنت کی کشمکش، کیا مغربی تہذیب کی مخالفت سب اسلامیات کے ابواب ہیں۔ ان میں سے چند کا تعلق یقیناً روحانیت سے ہے جس کی تصدیق اصولِ اسلام سے بھی ہوتی ہے لیکن جزو کو کل قرار دے دینا دانش مندی کی دلیل نہیں ہے۔ جب جوش لکھتے ہیں:

> آج اقبال ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن جب تک اس دنیا کے گوشے گوشے میں علم و ادب کا نام باقی رہے گا اقبال زندہ و پایندہ رہے گا اور اس کے گیت ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کرتے رہیں گے اور اس کا نام انسانی ذہن کے افق پر آفتاب کی طرح جگمگاتا رہے گا۔ ("مقالاتِ جوش": ص ۳۵۳)

تو وہ اقبال کے آفاقی اور وسیع خیالات و نظریات کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہی عناصر شاعر کو لامحدود بنا دیتے ہیں اور بلا تخصیص ہر ملک میں ان کے مطالعہ اور تجزیے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چناں چہ اقبال کے کلام اور افکار کا دنیا کی جتنی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے وہ اس کی دلیل ہے۔ علامہ کو "اسلامیت" تک محدود کر دینا تنگ نظری ہی نہیں متعصبانہ رویّہ ہے۔

(۸)

اس تجزیاتی مطالعہ کا حاصل مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال علم کے سمندروں سے فیض یاب ہو کر بھی تشنہ لب اور جویائے علم رہے۔ جوش دولتِ علم سے تہی دامن ہی رہے بلکہ علم سے نفور کا ارتکاب بھی کرتے رہے۔

اقبال طبعاً" مفکر تھے وہ آفاقی اور دایمی قدروں کے متلاشی رہے۔ ان کے خیالات سے متفق نہ ہونے والے بھی اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایک فلسفی تھے۔ جوش جذبات سے مغلوب ہو کر لمحاتی انداز میں شاعری کرتے رہے۔ جس لمحہ جو خیال پیدا ہوا شعر میں بیان کردیا۔ یہ بھی غور نہیں کیا کہ اس کی تردید میں وہ کتنی بار شعر کہہ چکے ہیں۔

اقبال کے مزاج میں سلامت روی ہے۔ وہ اعتراض کرتے ہیں اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تب بھی ان کے لب ولہجہ میں وقار ہوتا ہے۔ جوش ذہنی لغزشوں کو ہنر اور پھکڑبازی کو شاعری سمجھتے ہیں۔ اقبال نے ملت اور اقوام عالم کے لیے تلاشِ حق کی راہیں کھولی ہیں۔ جوش نے قاری کو گم راہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کو نہ ستایش کی تمنا تھی نہ صلہ کی پروا۔ جوش کو ہوسِ شہرت نے مارا۔

اقبال نے اسلام اور روحانی قدروں میں فلاح کی راہ ڈھونڈی ہے۔ جوش اسلام' خدا' کتاب اور شعائرِ اسلام کی توہین کو اعزاز سمجھتے ہیں لیکن ضرور تاً" ان کے قائل بھی ہوجاتے ہیں۔

اقبال دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ جوش وقتی سامانِ انبساط فراہم کرتے ہیں۔ اسی لیے اقبال کا نام عالمی فکر وادب میں جس احترام سے لیا جاتا ہے' جوش کا نہ لیا جاتا ہے اور نہ کبھی لیا جاسکتا ہے۔

☆ ○ ☆

ضمیر علی بدایوانی

ژاک دریدا اپنے روایتی ملبوس میں

دریدا موجودہ عہد کا سب سے مشکل لسانی مفکر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ادبی اور فلسفیانہ نظریہ' ردِ تشکیل نئے اور پیچیدہ ادبی مباحث اور مشکل تعبیری تصادم (conflict of interpretation) کو جنم دے رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ متن میں معنی کے قیام پذیر ہونے کا قائل نہیں ہے۔ ابھی وہ طلوعِ معنی کے استقبال سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ معنی اپنا رختِ سفر باندھنے لگتا ہے۔ گویا بہ قولِ شاعر

ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

گویا متن کی حیثیت ایک رہ گذر کی سی ہے جہاں سے معانی کے قافلے گزرتے رہتے ہیں اور قیام پذیر نہیں ہوتے۔ متن کے اس معنی گریز رجحان کو دریدا نے ایک مخصوص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور نئے ادبی' لسانی اور فلسفیانہ تصورات سے آشنا کیا ہے۔ دریدا کے فکری اثرات کا دائرہ مسلسل وسعت پذیر ہے۔ اس کی فکر یورپ اور امریکا تک محدود نہیں اب وہ ایشیا کے ساحلوں کو چھو رہی ہے۔ برصغیر کے علمی ادبی حلقوں میں بڑی گرم جوشی سے اس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ بالخصوص جدید اردو تنقید اس کے لسانی فلسفہ سے اثر پذیر ہو رہی ہے۔ علمی اصطلاحوں سے گراں بار یہ نقطۂ نظر ہمیں متن میں پوشیدہ نئے امکانات سے آشنا کر رہا ہے۔ متن کے دامن میں تازہ پھولوں کی بارش ہمیں آمدِ بہار کی خبر سنا رہی ہے

چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

دریدا نے متن میں پوشیدہ بعض ایسے گوشوں سے روشناس کیا ہے جو خود متن کے وجود کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مصنف کی ارادی معنویت کو تو ساختیات نے پہلے ہی مجروح کر دیا تھا۔ لیکن دریدا نے متن کی معنویت ہی کو ملتوی کر دیا بلکہ اس التوائے معنی کو متن کا بنیادی رجحان قرار دے کر معنی پرستوں کی ساری توقعات پر پانی پھیر دیا اور ان کو ایک نئی بے پروبالی کی کیفیت سے دوچار کر دیا۔

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

دریدا ایک جانب تو سابیر، ہسرل اور ہیڈیگر سے متاثر نظر آتا ہے اور ان کے افکار کو نئی وسعتوں سے آشنا کرتا ہے تو دوسری طرف اپنی روایت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ دریدا فرانس کا ایک

یہودی فلسفی ہے جس کی تحریروں میں دور جدید اور عہد نامہ عتیق دونوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنی تہذیبی اور مذہبی روایت سے مزاحم نہیں بلکہ اس روایت کا امین اور محافظ ہے۔ اس نے اپنے روایتی شعور کو قبول بھی کیا ہے اور اسے آگے بھی بڑھایا ہے۔ یہ روایتی پہلو دریدا کی فکر کے پس منظر کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے اور ان مشکلات کو کافی حد تک کم کردیتا ہے جو رد تشکیل کے نظریہ کی تفہیم میں ہمیں پیش آرہی ہیں۔

ساختیات نے جن مباحث کو جنم دیا تھا انھوں نے پورے یورپ اور امریکا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سا سیر کے نزدیک زبان میں افتراق (differance) کے علاوہ کچھ نہیں وہ مثبت اظہار سے عاری اور عاجز ہے۔ زوجی تضاد (binary opposition) معنی کے پوشیدہ خدوخال کو واضح اور روشن کرتا ہے۔ یہ افتراق و تضاد معنی کی تشکیل کرتا ہے۔ جن کی رد تشکیل (Deconstruction) سے معنی کا پرند غائب ہوجاتا ہے۔ دریدا کا تصور معنی اس کی فکر کا مرکز و محور ہے۔ وہ معنی کے وجود سے یکسر انکار نہیں کرتا بلکہ اس کو نئے بدلتے ہوئے تناظر میں دیکھتا ہے۔ وہ معنی سے زیادہ تعین معنی سے اختلاف رکھتا ہے۔ وہ معنی کو اس حد تک قبول کرنے میں مضائقہ محسوس نہیں کرتا جب تک اسے متعین نہ کیا جائے۔ تعین معنی کو وہ پروبال عطا کرتا ہے جس کی جانب ہمارے خواجہ میر درد نے اشارہ کیا تھا۔

کاش تا شمع نہ ہوتا گزر پروانہ
تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ

دریدا کے نزدیک معنی صرف افتراق سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ افتراق و التوا معنی کو تعین سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اس طرح معنی کی تشکیل کا عمل کبھی مکمل نہیں ہوتا اور نامعلوم جہت میں اس کا سفر جاری و ساری رہتا ہے۔ دریدا کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ وہ معنی سے زیادہ معنویت اور متن سے زیادہ متنیت (textuality) کا قائل ہے۔ اس نے متن کے بدلتے ہوئے احوال کو رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح کبھی غالب نے کی تھی۔

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

دریدا کے نزدیک معنی قایم نہیں ہوتا بلکہ مسلسل بہاؤ اور التوا کی کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ افتراق و التوا کی اس ملی جلی کیفیت کو دریدا (differance) کا نام دیتا ہے۔ اس نئی اصطلاح میں حرف الف یا A کی موجودگی دریدا کو عہد نامۂ قدیم تک لے جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنی روایت کے اولین سرچشمے تک پہنچ جاتا ہے۔ دریدا کے اس سفر روایت کی داستان مشہور مفکر ہیبرماس نے رقم کی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے Robbi Eliezeric کے اس قول کو بھی نقل کیا ہے:

> If all the seas were of ink and all ponds planted with reeds, if the sky and the earth were parchments and if all human beings practised the art of writing - they would not exhaust the Torah I have learned, just as

the Torah itself would not be diminished any more than is the sea by the water removed by a paint brush dipped in it.

دریدا نے اسی تصور توریت کا اطلاق اپنے تصور متن پر کیا ہے۔ علاوہ ازیں عرفائے قبالہ (Cabalists) کے نزدیک احکام عشرہ کا پہلا حرف جو سنا گیا وہ الف ہے۔ یہی "الف" دریدا نے اپنے فلسفیانہ نقطہ نظر کی تشریح کے لیے استعمال کیا ہے یعنی difference میں "الف" کو یعنی A کو شامل کرکے Differance کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ گویا دریدا نے یہودی تصوف اور قبالہ کے code کا ایسا فلسفیانہ استعمال کیا ہے کہ اس میں افتراق و التوا کے مفاہیم سمٹ کر یک جا ہو گئے ہیں۔ یہ اس امر کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے کہ دریدا اپنی تہذیبی اور ثقافتی روایت کو بے حد اہمیت کا حامل قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنی روایت کو پس جدید کلچر (Post-modern culture) سے اس طرح مربوط کردیا ہے کہ بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے تناظر میں ایک نئی فکر اور معنویت کا سرچشمہ بن گیا ہے۔ یہودی تصوف کے مطابق حقیقتِ توریت کبھی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ لباس بدلتی رہتی ہے اور اسی لباس کو روایت کا نام دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں توریت میں کوئی ایک متعینہ صداقت نہیں بلکہ وقت اور ضرورت کے مطابق اس میں صداقت دریافت کی جاسکتی ہے۔

The Cabalist conception was later radicalized again. Now even the written Torah is considered a problematic translation of the divine word into the language of human beings. Everything is oral Torah from the beginning. It keeps changing its clothes permanently and these clothes are the tradition. (Discourse on Modernity : Habermas)

ایک سوال یہ بھی ہے کہ احکام عشرہ (Ten Commadments) اسرائیلیوں پر بعینہٖ منکشف کیے گئے یعنی بغیر کسی تحریف کے۔ قبالہ کے کچھ محققین کہتے ہیں کہ پہلے دو احکام جو توحید کے بارے میں ہیں 'وہ براہِ راست خدا کی طرف سے جاری ہوئے' کچھ اس رائے سے متفق نہیں۔ ربی مینڈل کے خیال میں یہ درست نہیں کہ دو احکام براہِ راست خدا کی جانب سے منکشف ہوئے۔ اسرائیلیوں نے جو کچھ سنا وہ حرف "Aleph" یا الف ہے۔ جس سے پہلے حکم کا آغاز ہوتا ہے۔ شولم لکھتا ہے یہ انتہائی اہم بیان ہے جو ہمارے ذہن کے لیے خاطر خواہ یا کافی مواد فراہم کرتا ہے۔ چناں چہ لکھتا ہے:

For in Hebrew the consonant "Aleph" represents nothing more than the position taken by the larynx when a word begins with a vowel. Thus the aleph may be said to denote the source of all articulate sound ... To hear the aleph is to hear next to nothing, it is a preparation for all audible language, but in itself contains no determinate, specific meaning. Thus with his daring statement ... Rabbi Mendel transformed the revelation on Mount Sinai into a mystical revelation, pregnant with infinite meanings, but without specific meaning. (The philosophical Discourse of Modernity by Habermas page-183.)

سرچشمہ یہی اسرائیلی روایت اور ربی مینڈل کی تعبیر و تفسیر ہے۔ کیوں کہ رد تشکیل کا بانی مفکر ژاک دریدا متن کی معنویت کو کم و بیش اسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے جس انداز سے ربی مینڈل اسرائیلی روایت کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ متن کی معنویت کا ملتوی ہوتے رہنا اور کسی خاص قسم کی معنویت سے خالی ہونا' ساختیاتی اور پس ساختیاتی فکر کی خشت اول ہے جس میں توریت اور قبالہ کی فکر کی بازگشت محسوس ہوتی ہے۔ differance میں الف کی موجودگی رد تشکیل کو یہودی تصوف کے منکشفات کی طرف لوٹا دیتی ہے اور اسرائیلی روایت کو خون تازہ فراہم کرتی ہے۔ دریدا کی کتاب Of Gramatology (نحویات کی اساس) یہی تصوف کی روایت ہے جو دریدا کی تحریروں میں ایک دائمی نقش رکھتی ہے۔ ہیبرماس جدید جرمنی کا ایک مستند اور عظیم فلسفی ہے۔ دریدا کی فکر کے روایتی سرچشمے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ دریدا نے بھی ہسول اور ہیڈیگر کی طرح یہودی سریت میں پناہ ڈھونڈھ لی ہے ع

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

لیکن یہ صرف تصویر کا ایک رخ ہے۔ کیوں کہ دریدا روایت سے متاثر ضرور ہے' روایت پرست نہیں ہے۔ اس کی لسانی فکر لفظ مرکزیت (Logocentricism) کے خلاف ہے۔ لفظ مرکزیت روایت کا ایک حصہ ہے یعنی جب کچھ نہ تھا تو لفظ تھا۔ لیکن دریدا اس فکر سے نبرد آزما رہا ہے خاص طور پر ہسول اور ہیڈیگر کے لسانی تصورات سے وہ برسر پیکار رہا ہے اور موجودگی کی مابعد الطبیعیات (metaphysics of presence) کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ تصور مابعد الطبیعیات ہمیں حقیقت اور زبان کے ادراک سے مزاحمت پر مجبور کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دریدا نے متن کو پہلے سے قایم شدہ مفروضات سے آزاد کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ اس نے اہل قبالہ کی دقیقہ سنجیوں سے رد تشکیل کی تشکیل میں مدد ضرور لی ہے لیکن رد تشکیل کا عمومی رجحان secular نظر آتا ہے۔ ممکن ہے یہ انداز بیاں کا اعجاز ہو اور دریدا کی فکر کے حقیقی خدوخال مذہب اساس ہوں اور اس عالم گیر فروغ یہودیت کا حصہ ہوں جس کے تحت Protocols کی اشاعت ظہور میں آئی لیکن یہ مسئلہ اقدار کے تعین کا ہے اس لیے کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے اس کا بغور جائزہ لینا ہوگا۔

اپنے تہذیبی خزانے سے فیض یاب ہونا کوئی معیوب بات نہیں بشرطیکہ اس کی تہ میں یہودیت کے مذموم عزایم کارفرما نہ ہوں۔ دریدا ایک جگہ لکھتا ہے:

"Deconstruction is not neutral. It intervenes."

اوپری بیان سے دریدا کے معاشرتی اور سیاسی عزایم ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ زوجی تضادات میں کم زور کی طرف داری کا قائل ہے۔ جیسے مرد اور عورت میں فریق ثانی یا سرمایہ اور محنت میں محنت کا ساتھ دینے کا عزم رکھتا ہے جس کے ڈانڈے مارکس کی طبقاتی کشمکش سے جا ملتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مارکس کی طرح دریدا کی فکر کوئی قابل عمل معاشرتی مساوات کا نظریہ یا فلسفہ نہیں ہے۔ اس نے تحریر کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس کی فکر صرف تحریر تک محدود ہو کر رہ گئی۔ حقیقی زندگی کے خدوخال درست کرنے

میں کوئی کردار ادا نہ کر سکی۔

یہودیوں کی نسل پرستی اور اس کے غیر انسانی مقاصد کو دریدا زیر بحث نہیں لاتا لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ وہ ہر قسم کی نسل پرستی کے خلاف ہے۔ ۱۹۸۶ء میں دریدا نے نیلسن منڈیلا کی حمایت میں ایک مجموعہ مضامین مرتب کرنے میں مدد کی۔ اس سلسلے میں دریدا رقم طراز ہے:

> پہلے طبقاتی نظام نہیں تھا۔ نہ امیر تھے نہ غریب اور انسانوں کے ہاتھوں انسان کا استحصال بھی نہیں تھا۔ سارے انسان آزاد اور برابر تھے اور یہی حکومت کی بنیاد تھی۔ اس عام اصول کو تسلیم کیا گیا اور اس کا اظہار کو نسل کے آئین میں کیا گیا۔ ایسے معاشرے میں انقلابی جمہوریت کے بیج ہوتے ہیں جس میں کسی سے بھی غلامانہ سلوک نہیں کیا جاتا اور جس میں غربت' ضرورت اور عدم تحفظ نہیں ہوتا۔

نسل پرستی کے خلاف اپنے ایک ابتدائی مضمون میں دریدا نے نیلسن منڈیلا کی تعریف و توصیف اور اس کی حمایت میں آواز بلند کی۔ نومبر ۱۹۸۳ء میں پیرس میں ایک آرٹ کی نمائش کا اہتمام کیا گیا جس کا موضوع تھا Art Against the Apartheid' اس نمائش کے بارے میں مختلف مضامین کا تعارف دریدا نے تحریر کیا تھا۔ اپنے ابتدائیے میں دریدا نے لکھا تھا کہ یہ نمائش پوری مغربی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن یہ ایک غیر واضح اور مبہم تحریر تھی۔ نیلسن منڈیلا کے بارے میں جب دریدا کا مضمون شائع ہوا تو اس ابتدائی مضمون کا متن بھی واضح ہو گیا۔ دریدا کے نزدیک مغربی تہذیب میں ایک بڑا تضاد تھا' اس کی اپنی اقدار اور سیاست کے درمیان' اس کے فلسفے اور اس کے عمل کے درمیان۔ دوسرے لفظوں میں مغرب نظریہ کی حد تک تو مسلکِ مساوات کا قائل نظر آتا ہے لیکن عملی طور پر حقیقت کی دنیا میں عدم مساوات پر عمل پیرا ہے۔ دریدا کی نظر میں دوسری تہذیبوں میں بھی نسل پرستی پائی جاتی ہے' لیکن یورپین تہذیب وہ واحد تہذیب ہے جس میں نسل پرستی ریاستی سیاست کا ایک حصہ ہے اور اس کو ایک سرکاری نظریہ یا اصول کا درجہ دیا گیا ہے۔

دریدا کے بعض نقادوں نے دریدا کے اس موقف کو جمہوری کلچر سے ناواقفیت کی بنیاد قرار دیا اور کہا کہ دریدا کے پیش نظر جمہوری اقدار کا ارتقا اور تاریخی عمل نہیں ہے۔ لیکن اس بحث کو ہم آگے بڑھانے کے حق میں اس لیے نہیں ہیں کہ ہمارے پیش نظر دریدا کی پس جدیدیت کے محرکات کی تلاش ہے۔ بلاشبہ ایک محرک تو دریدا کی اپنی روایت ہے دوسرے محرکات کی تلاش آیندہ کسی مضمون میں کی جائے گی۔ فی الحال تو اس پر ہی اکتفا کرتا ہے کہ دریدا اپنی روایت سے کافی حد تک متاثر نظر آتا ہے لیکن صرف علمی حدود میں۔ اس نے صیہونی مقاصد کی تکمیل میں کوئی حصہ نہیں لیا اور انسانیت کو نسل پرستی سے نجات دلانے میں موثر کردار ادا کیا۔ اپنے سرمایۂ علمی سے استفادہ یا اس کی تجدید کسی بھی لحاظ سے ممنوع و معیوب نہیں۔ البتہ لاشعوری محرکات کے بارے میں یا اجتماعی لاشعور کے مطالبات کے بارے میں

کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا کیوں کہ رد تشکیل کے نفسیاتی عوامل کی تلاش کا سفر شروع ہوچکا ہے۔ ابھی تو اس نظریہ کو کئی مراحل سے گزرنا ہے اور ادب اور فلسفے میں اس کے مثبت اثرات کا جائزہ لینا ہے۔ رد تشکیل کے روایتی پس منظر کے ادراک کے بغیر اس کے پس جدید کردار کی تفہیم ممکن نہیں۔ ہر نئے نظریہ اور نئے تصور کی جڑیں اس کے ماضی میں پیوست ہوتی ہیں۔ دریدا پس جدید کلچر کا سب سے اہم نمایندہ ہونے کے باوجود اپنی روایت سے بے خبر نہیں اور اسے برتنے کا فن بھی جانتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دریدا کی فکر روایتی نوعیت کی ہے۔ اس نے موجودگی کے تصور کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور موجودگی کی مابعد الطبیعیات کو تسلیم کرنے سے انکار بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ لفظ مرکزیت (Logocentricism) کی روایتی فکر کو قبول نہیں کرتا۔ لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ دریدا جہاں ایک طرف تو ہسرل ہیڈیگر مکتب فکر کے طلسم سے خود کو آزاد کرنے میں کام یاب ہوا' وہاں وہ ربی مینڈل کے تصور روایت کا ایک شارح و مفسر بھی ہے۔ وہ اپنی ثقافتی حدود پھلانگنے میں کام یاب نہیں ہوا۔ موجودہ عہد میں دریدا کو ایک عظیم مفکر اور نقاد کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے ادبی مظاہر کی تعبیر و توضیح میں دریدا کا نظریہ رد تشکیل ایک اہم کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔ ہمارے ادبی تصورات میں دریدا نے ایک انقلاب برپا کردیا ہے اور جدید تنقید کا سارا منظرنامہ بدل چکا ہے۔ آج ادبی متن کی قرات کے قرینے تبدیل ہوچکے ہیں۔ لیکن دریدا کی حکمت عملی کا یہ اعجاز ہے کہ اس کی فکر اگرچہ مستقبل اساس ہے لیکن اس نے واپسی کا راستا کھلا رکھا ہے۔ یہ واپسی کا سفر کب شروع ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا' شاید دریدا بھی نہیں۔ دریدا کی فکر کا کمال یہ ہے کہ وہ بہ یک وقت ماضی اور مستقبل دونوں سے مکالمہ کرتی ہے۔ اس مضمون میں ماضی سے مکالمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور فکر فردا کے لیے آیندہ صفحات خالی چھوڑ دیے گئے ہیں۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

ایلیٹ کا اردو دنیا میں خیر مقدم

۲۰ ویں صدی کے نمایاں تر تخلیقی ذہن ...... ناقد، شاعر اور ڈراما نگار ٹی ایس ایلیٹ کے حسی ادراک کے انقطاع اور معروضی ارتباط کے نظریات نے دنیا بھر کے ادب پر نہ صرف گہرے اثرات مرتب کیے بلکہ زندہ ادبی روایت کا وہ شعور بھی بخشا، جو مختلف تخلیقی ادوار کے بیچ محسوس کیے جانے والے زمانی بعد کو گھٹانے میں مددگار ثابت ہوا۔

خدا معلوم، ۲۱ ویں صدی میں ٹی ایس ایلیٹ کے نام اور کام کو کن نئے فکری مجادلوں، تبدیل ہوتی ہوئی تہذیبی اور مذہبی صورت احوال اور نت نئی نظریہ سازی کا سامنا کرنا پڑے، اور اس کا نتیجہ کیا رہے۔ یہ سوچتے ہوئے، جانے کیوں قدیم یونانی شاعر ہومر سے متعلق ایک روایت یاد آگئی۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ بڈھا ہومر ارکیڈیا کے کنارے ماہی گیروں کی ایک بستی تک پہنچا اور سوال کیا۔

"اے ارکیڈیا کے ماہی گیرو...... !! کیا تمھارے پاس کچھ ہے؟"

اس سوال کے جواب میں انھوں نے ایک پہیلی کہی۔

"جو کچھ ہم نے پکڑا تھا، وہ پیچھے چھوٹ گیا، البتہ جو ہم نے نہیں پکڑا، وہی ہمارے پاس ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ ہومر اس پہیلی کو نہ بوجھ سکا اور اسی غم میں مر گیا۔

سو، یہ کہنا کوئی چارہ کار نہیں کہ ایلیٹ جانے اور آنے والا وقت۔ لیکن تخلیقی ادب کی پہچان پرکھ کے حوالے سے ایلیٹ کی جو بھی عطا رہی ہے، اس میں سے اردو دنیا کو ملنے والا حصہ بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں۔

ہمارے ہاں ایلیٹ سب سے پہلے (۱۹۳۵ء) بہ طور شاعر، پھر بہ طور ناقد (۱۹۴۴ء) اور تیسرے مرحلے پر (۱۹۵۶ء) بہ طور ڈراما نگار کے زیر بحث آیا۔ جب کہ ایلیٹ کی پہلی شناخت تنقید ہے، دوسری شاعری اور تیسری منظوم ڈراما۔

بہ طور نقاد ٹی ایس ایلیٹ کے تہلکہ خیز مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" (تکمیل: ۱۹۱۹ء Tradition and The Individual Talent) کے ضبط تحریر میں آنے سے قبل رومانوی تنقید کا بنیادی سوال یہ تھا کہ "شعر کا تاثر کیا چیز ہے؟" اور اس سوال کے ساتھ تنقید کرنے کو نقاد کا اہم فریضہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ شعر کہنے والے شاعر کے ذہنی در بے نوٹ کیے جائیں، نیز یہ کہ تخلیقی لمحے میں

شاعر پر ماحول کس طرح اثر انداز ہوا۔ یوں ایلیٹ سے قبل رومانوی تنقید میں فن پارے کی بجائے شاعر کی ذات مرکزِ توجہ رہی تھی جب کہ ایلیٹ نے ان نظریات کو رد کر دیا۔

"وہ (شاعری) شخصیت کا اظہار نہیں' بلکہ اس سے گریز ہے۔" (ایلیٹ)

اس بات کی وضاحت اس نے یوں کی تھی۔

شاعر کے ہاں شخصیت کی طرز کی کوئی شے نہیں ہوتی' جس کا وہ اظہار کرے۔
اس کے پاس تو محض اظہار کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اس وسیلہ اظہار میں تاثرات اور
تجربات عجیب و غریب اور غیر متوقع صورتوں میں یکجا ہو جاتے ہیں۔

یوں ایلیٹ کے مطابق تنقید کا بنیادی وظیفہ فن پارے کی تشریح و توضیح ہے اور ناقدانہ تجزیے کے ذریعے فن پارے کی قدر کا تعین بنیادی چیز ہے۔ اس طرح تقابل اور تجزیہ' نقاد کے اہم اوزار ہوئے۔

تخلیقی عمل سے متعلق یہ نظریہ آئی اے رچرڈز کے تنقیدی افکار کی عین ضد کہا جا سکتا ہے۔ جب کہ ایلیٹ کے قریبی دوست اور اہم معاصر ناقد ہربرٹ ریڈ نے بھی ایلیٹ کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے۔ خود ہمارے ہاں ممتاز حسین (۱۹۵۷ء) نے شاعری میں شاعر کی شخصیت کے اظہار یا اخفا پر بات کرتے ہوئے ایلیٹ کو رد کیا اور چند اختلافی پہلوؤں کے باوجود ہربرٹ ریڈ کی حمایت کی۔ اس باب میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے خیالات (۱۹۶۱ء) بھی قابل مطالعہ ہیں۔

ایلیٹ' ادب اور زندگی دونوں میں معیارات کے نفوذ اور غیر ذاتی میلانات و رجحانات کا قائل تھا۔ اس لیے اس نے احساسِ ماضی اور احساسِ روایت کو ضروری خیال کیا۔ اس ضمن میں اس کے وہ مضامین جو "On Tradition" نامی کتاب میں یکجا ہوئے' خاص طور پر زیر بحث آئے۔ اس نے کہا تھا۔

ادب میں روایت پرستی کا رجحان' ذہنِ انسانی کی ترقی اور تہذیب' نیز ادب کے
صحت مند ارتقا کے لیے ضروری ہے۔

اس کا جواب' ایلیٹ کے معترضین نے یہ پھبتی کس کر دیا کہ "ایلیٹ ایک ایسا جدید شاعر ہے جو روایت پرست بھی ہے۔"

ایلیٹ' بلاشبہ ۲۰ ویں صدی عیسوی کا ایک بڑا باغی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایلیٹ نے ۲۰ ویں صدی عیسوی میں مادی سطح پر جن تہذیبی اور فکری تضادات کا تماشا کیا تھا' ان پر سنجیدگی سے غور کیے بغیر اس کی ناقدانہ نظریہ سازی اور تخلیقی عمل کو سمجھنا محال ہے۔ پھر یہ کہ ادب کا اتنا بڑا اور اہم ناقد رفتہ رفتہ ادبی تنقید سے سوشل تنقید کی طرف نکل گیا اور اس نے "Idea of a Christian Society" اور "Notes Towards a Definition" جیسے مقالات لکھنے کے ساتھ ساتھ "رباعیات چہار آہنگ" (Four Quartets) قلم بند کیں' جن میں مذاہب عالم کو موضوع بنایا گیا تھا۔

ہمارے ہاں ایلیٹ کے تصور روایت کو سب سے پہلے محمد حسن عسکری (اپریل ۱۹۴۴ء) ہی زیر بحث لائے تھے۔ اس کے بعد یہ بحث چل نکلی اور یوں ڈاکٹر آفتاب احمد (اپریل ۱۹۴۵ء) ڈاکٹر عبادت بریلوی (۱۹۴۹ء) احتشام حسین (۱۹۵۳ء) اور آل احمد سرور نے اس ضمن میں اظہار خیال کیا۔ بہ قول صوفی غلام مصطفیٰ تبسم 'اس دور میں پطرس بخاری نے بھی ادبی محافل میں ایلیٹ کو تادیر زیر بحث رکھا۔ ("نقوش" لاہور۔ پطرس نمبر۔ ۱۹۵۹ء)

ایلیٹ کے تصور روایت سے اثر پذیری کی اولین صورتیں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاں دکھائی دیں۔ انھوں نے ۱۹۵۳ء میں دو مضامین لکھے۔ "اردو شاعری میں حب وطن کی روایت" اور "اردو تنقید میں روایت اور تجربہ"۔ ۱۹۵۳ء کے اواخر میں محمد طفیل مدیر "نقوش" نے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا جس کا موضوع تھا "اردو افسانے میں روایت اور تجربہ" (مطبوعہ "نقوش" لاہور۔ شمارہ ۳۷۔۳۸ بابت جنوری ۱۹۵۴ء)۔ اس مذاکرے کے شرکا تھے' سید وقار عظیم' ڈاکٹر عبادت بریلوی' سعادت حسن منٹو' احمد ندیم قاسمی' شوکت تھانوی' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' حمید اختر اور انتظار حسین۔

اسی طرح ایلیٹ کے تصور روایت کے حوالے سے ایک بڑی ہلچل اس وقت پیدا ہوئی' جب مجلہ "سویرا" لاہور شمارہ ۱۷۔۱۸ بابت ۱۹۵۵ء کو مرتب کرتے وقت حنیف رامے نے ایلیٹ کے لازوال تنقیدی مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" کے حوالے سے ایلیٹ کے تصور روایت اور شخصی استعداد کے موضوع پر ایک تحریری سمپوزیم کا اہتمام کیا۔ محرک بحث تھے مختار صدیقی' جنھوں نے نہ صرف یہ کہ ایلیٹ کے اس اہم مضمون کا اردو میں پہلا ترجمہ کیا بلکہ اس مضمون کو زیر بحث بھی لائے اور اپنے دور کی ادبی صورت احوال سے متعلق اہم سوالات اٹھائے۔ اس بحث کے شرکا میں سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبادت بریلوی' ممتاز مفتی' ڈاکٹر محمد حسن' ظہیر کاشمیری' شاد عارفی' عارف عبدالمتین اور مظفر علی سید کے نام ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ "سویرا" کے مذکورہ شمارے میں "خوشبو کی ہجرت" کے زیر عنوان شیخ صلاح الدین' حنیف رامے' ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے بیچ ہونے والا ایک مکالمہ بھی شامل کر دیا گیا۔

یوں اس موضوع پر بحث کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور ایلیٹ بہ طور ناقد' بار بار زیر بحث آیا۔ ایلیٹ کے تنقیدی افکار سے متعلق اس فضا بندی میں ایک طرف تو محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کا حصہ ہے' جنھوں نے انتہائی مرعوب کن انداز میں ایلیٹ کا ذکر بار بار کیا' تو دوسری طرف کلیم الدین احمد کی کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" (۱۹۵۶ء) کا پیدا کردہ ہنگام۔ کلیم الدین احمد نے خاص طور پر آل احمد سرور کے تنقیدی نظریات کو رد کرتے ہوئے ایلیٹ کے حوالے سے بات کی اور یوں بات سے بات چلی۔

اس کے بعد ایلیٹ کے تنقیدی افکار کو ڈاکٹر وحید قریشی (۱۹۵۶ء)' ڈاکٹر صدیق کلیم (۱۹۵۶ء) عابد علی عابد اور ممتاز حسین (۱۹۵۷ء)' ڈاکٹر سجاد باقر رضوی (۱۹۶۱ء) محمد حسن عسکری (۱۹۶۲ء) احتشام

حسین اور علی عباس جلال پوری (۱۹۶۳ء) زیرِ بحث لائے۔ اس سارے کے نتیجے میں ہمارے ہاں ایلیٹ کے ناقدانہ افکار نے کئی مباحث کو جنم دیا اور ایلیٹ کی وضع کردہ تنقیدی اصطلاحات مثلاً "شخصی استعداد' شخصیت سے فرار' معروضی تلازمہ' نیا شعری مذاق' روایت کا شعور اور شاعری کی تیسری آواز وغیرہ ہماری تنقید میں رواج پاگئیں۔

لیکن یہی وہ زمانہ ہے' جب اردو کے اہم ترین ناقد محمد حسن عسکری نے اپنے مضمون "روایت کیا ہے؟" ("حاذق" لاہور جنوری فروری ۱۹۶۲ء) میں ایلیٹ کے رومن کیتھولک ہونے پر اچنبھے اور غصے کا اظہار کیا اور ایلیٹ کی روایت سے متعلق نظریہ سازی اور اس میں مذہبی کارگزاری کے پرخچے اڑانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ اس مضمون کی اگلی کڑی بہ عنوان "اردو کی ادبی روایت کیا ہے؟" جب "شب خون" الہ آباد' شمارہ ۲۹' بابت اکتوبر ۱۹۶۸ء میں شایع ہوئی تو اس پر ڈاکٹر وحید اختر نے "ادب' مذہب اور حسن عسکری" ("شب خون" الہ آباد' بابت اپریل ۱۹۶۹ء) کے عنوان سے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔ یوں یہ بحث چل نکلی اور محمد حسن عسکری نے "اردو ادب کی روایت.... چند تصریحات" ("شب خون" الہ آباد بابت اپریل ۱۹۶۹ء) لکھ کر خالصتاً" اسلامی تصوف اور مذہبی حوالوں سے اپنے خیالات کا دفاع کیا۔

اس زمانے میں یقیناً محمد حسن عسکری کی فکر میں تبدیلی کا باعث دیگر عوامل بھی رہے ہوں گے لیکن ٹی ایس ایلیٹ کا رومن کیتھولک ہونا اور ادبی روایت کے حوالے سے اس پر عسکری کا یہ اعتراض' خود عسکری کو کیا سے کیا بنا گیا۔

محمد حسن عسکری نے رومن کیتھولک ٹی ایس ایلیٹ کے مذہبی تصور اور تصورِ روایت کے رد میں اسلامی تصورات کو بے چگوں قرار دیتے ہوئے اسلامی تصوف کی وکالت میں تہذیبی سفر کی نفی کی۔ اس لیے کہ عسکری کے خیال میں روایت کا انحصار آسمانی صحائف پر ہونا چاہیے۔ یوں عسکری نے عقل کی تشکیل میں انسانی تجربے اور مسلسل انسانی عمل اور روایات کی نفی کرتے ہوئے عمرانیات' حیاتیات اور نفسیات جیسے علوم کو بے جواز قرار دیا اور آخرکار یہ نتیجہ نکالا کہ مغرب کی غلط نظریہ سازی اور گم راہیوں نے ہمارے نظریہ ساز ادبا و شعرا کو ادبی روایت کے صحیح مفہوم سے نا آشنا رکھا۔ ("بے تکلف گفتگو" مطبوعہ "شب خون" الہ آباد۔ شمارہ ۲۸)۔

دراصل یہی وہ زمانہ ہے' جب محمد حسن عسکری ادب سے باقاعدہ متنفر دکھائی دیے اور مولانا اشرف علی تھانوی کے دینی مدرسہ کے لیے نصاب سازی کرتے ہوئے' "جدیدیت یا مغربی گم راہیوں کی تاریخ کا خاکہ" جیسی کتاب لکھنے میں مگن ہو گئے۔ اب انھوں نے مجدد الف ثانی کی تحریروں کے حوالے سے اصلاحِ تصوف و اصلاحِ ایمان اور مولانا اشرف علی تھانوی کی "شرحِ حافظ" اور "شرحِ مثنوی مولانا روم" کے زیرِ اثر رہ کر ادبی منظرنامے کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی۔ البتہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ کہ عسکری صاحب کے بہترین تنقیدی کام "ستارہ یا بادبان" کے ناقدانہ طریقہ کار میں ٹی ایس ایلیٹ کا کچھ نہ

کچھ حصہ ضرور رہا ہے اور "جدیدیت" یعنی مغربی گم راہیوں کا خاکہ میں ایلیٹ کا مضمون "آفٹر سٹرینج گاڈز۔ جدید کفر کا قاعدہ" (۱۹۳۴ء) اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

ایلیٹ کی وفات ۴ر جنوری ۱۹۶۵ء کے بعد 'اس کی یاد تازہ کرنے کو ہمارے ادبی جرائد میں بہت کچھ دیکھنے کو ملا۔ خاص طور پر مجلّہ "افکار" کراچی بابت فروری ۱۹۶۵ء کا خصوصی گوشہ اور شمس الرحمان فاروقی کا طویل مضمون "ٹی ایس ایلیٹ 'شاعر اور مصلح" (۱۹۶۵ء)۔ "نیا دور" کراچی بابت ستمبر ۱۹۶۶ء کے خصوصی گوشے میں ایلیٹ کے اوائل عمری میں مرتب کردہ جریدے "آتش دان کے قریب" (Fire Side) کے چند صفحات کا عکس اور ایلیٹ کی نایاب تصاویر کے علاوہ دو مضامین بہ عنوان "ٹی ایس ایلیٹ" از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور "مفکر نقاد" از ڈاکٹر جمیل جالبی 'ایلیٹ کے پانچ مضامین بہ عنوان "تنقید کا منصب" "شاعری اور پروپیگنڈا" "بودلیئر" "ادب اور عصر جدید" اور "صحافت اور ادب" کے تراجم از ڈاکٹر جمیل جالبی کے علاوہ ایلیٹ کے منظوم ڈراما "کاک ٹیل پارٹی" کا ترجمہ از سراج الحق شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب "ایلیٹ کے مضامین" کا پہلا ایڈیشن بھی ۱۹۶۰ء ہی میں سامنے آیا۔ جس میں ایلیٹ کے نو تنقیدی مضامین کے تراجم نیز "ٹی ایس ایلیٹ ایک مطالعہ" کے عنوان سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون شامل تھا۔

اب ٹی ایس ایلیٹ بہ طور ناقد 'مختلف النوع حوالوں کے ساتھ زیرِ بحث رہا۔ ناصر کاظمی (۱۹۶۶-۶۷ء) نظیر صدیقی (۱۹۶۷ء) 'عتیق اللہ (۱۹۶۸ء) 'محمد ہادی حسین۔ محمد حسن عسکری (۱۹۶۸ء) ' ڈاکٹر شمیم حنفی (۱۹۷۰ء) ڈاکٹر محمد علی صدیقی (۱۹۷۲ء) 'ممتاز حسین (۱۹۸۲ء) 'ڈاکٹر عصمت جاوید (۱۹۸۳ء) 'ڈاکٹر جمیل جالبی (۱۹۹۱ء) اور ایس حسن (۱۹۹۳ء) تک ایلیٹ کے ناقدانہ افکار کا شاید ہی کوئی پہلو رہ گیا ہو 'جس پر بات نہ ہوئی ہو۔ اسی طرح ایلیٹ کی تفہیم کو آسان بنانے میں ہمارے مترجمین کا حصہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر۔

(۱) "روایت اور انفرادی صلاحیت" از ٹی ایس ایلیٹ / مختار صدیقی 'مطبوعہ "سویرا" لاہور۔ شمارہ ۱۷۔۱۸ 'بابت ۱۹۵۵ء۔

اس مضمون کے دیگر چار تراجم کی تفصیل یوں ہے۔

"روایت اور انفرادی صلاحیت" ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی 'مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی 'کراچی۔ طبع اول ۱۹۶۰ء۔

"ادبی روایت اور شخصی استعداد" ترجمہ افضال حسین مطبوعہ "نقوش" لاہور۔ شمارہ ۱۰۱ 'بابت مئی ۱۹۶۵ء۔

"روایت اور نئی تخلیق" ترجمہ ڈاکٹر صدیق کلیم 'مشمولہ "نئی تنقید" مرتبہ صدیقی کلیم / ظہور الحق شیخ مطبوعہ سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی 'گورنمنٹ کالج 'لاہور طبع اول ۱۹۶۹ء۔

"روایت اور انفرادی ذہانت" ترجمہ کشور ناہید مشمولہ "باقی ماندہ خواب" مرتبہ کشور ناہید، مطبوعہ سنگ میل لاہور۔ طبع اول ۱۹۸۲ء۔

(۲) "منظوم ڈرامے کا نصب العین" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ "نیا دور" کراچی شمارہ ۲۹۔ بابت ۱۹۵۵ء۔

(۳) "شاعری اور ڈراما" از ٹی ایس ایلیٹ / رحمان مذنب مطبوعہ "ساقی" کراچی۔ سالنامہ ۱۹۵۶ء۔

(۴) "کلاسیک کیا ہے؟" از ٹی ایس ایلیٹ / سید قاسم محمود، مطبوعہ "نئی تحریریں" شمارہ۔ ۳، لاہور۔ ۵۷۔۱۹۵۶ء۔ اسی مضمون کا ایک ترجمہ از ڈاکٹر جمیل جالبی "ایلیٹ کے مضامین" ۱۹۶۰ء میں شامل ہے۔

(۵) "شاعری کا سماجی منصب" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" طبع اول ۱۹۶۰ء۔ اسی مضمون کا ایک ترجمہ بہ عنوان "شاعری کے معاشرتی فرائض" از ناظر حسین، مشمولہ "ادب اور ادیب" ۱۹۸۸ء ہے۔

(۶) "شاعری کی تین آوازیں" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" (۱۹۶۰ء)۔

(۷) "شاعری کی موسیقی" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" (۱۹۶۰ء)۔

(۸) "مذہب اور ادب" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" (۱۹۶۰ء)۔

(۹) "تجزیہ اور تنقید" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" (۱۹۶۰ء)۔

(۱۰) "تنقید کی حدود" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" (۱۹۶۰ء)۔

(۱۱) "شعر کی موسیقیت" از ٹی ایس ایلیٹ / رحم علی الہاشمی، مطبوعہ "سیپ" کراچی۔ شمارہ ۱۸۔

(۱۲) "کلچر کا مفہوم" از ٹی ایس ایلیٹ / قمر سلطانہ، مطبوعہ "نیا دور" کراچی۔ شمارہ ۱۸۔۱۵۔

(۱۳) "شاعری اور پروپیگنڈا" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" نظر ثانی شدہ ایڈیشن مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، طبع اول ۱۹۷۸ء۔

(۱۴) "بودلیئر" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" نظر ثانی شدہ ایڈیشن۔ طبع اول ۱۹۷۸ء۔

(۱۵) "ادب اور عصر جدید" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" (۱۹۷۸ء)۔

(۱۶) "صحافت اور ادب" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین"

(۱۷) "تنقید کا منصب" از ٹی ایس ایلیٹ / ڈاکٹر جمیل جالبی' مشمولہ "ایلیٹ کے مضامین" (۱۹۷۸ء)۔

اسی طرح مغربی تنقید سے متعلق ہمارے ہاں جو تھوڑا بہت کام ہوا' اس میں ٹی ایس ایلیٹ بہ طور ایک نظریہ ساز ناقد کے شامل ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ "تنقیدی نظریے" از ڈاکٹر ملک حسن اختر' مطبوعہ جدید بک ڈپو' لاہور۔ طبع اول نومبر ۱۹۶۶ء۔ طبع دوم مکتبہ میری لائبریری' لاہور۔ ۱۹۸۱ء۔

۲۔ "مغرب کے تنقیدی اصول" از ڈاکٹر سجاد باقر رضوی' طبع اول دسمبر ۱۹۶۶ء۔

۳۔ "اشارات تنقید" از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ' مطبوعہ مکتبہ خیابان' لاہور۔ طبع اول ۱۹۶۶ء۔ طبع دوم ۱۹۷۴ء۔

۴۔ "مغربی شعریات" از محمد ہادی حسین' مطبوعہ مجلس ترقی ادب' لاہور۔ طبع اول مارچ ۱۹۶۸ء۔

۵۔ "ارسطو سے ایلیٹ تک" از ڈاکٹر جمیل جالبی' مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان' کراچی۔ طبع اول ۱۹۷۶ء۔ طبع دوم ۱۹۷۷ء۔ طبع سوم ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس' دہلی۔ ۱۹۸۱ء۔

۶۔ "مغربی تنقید کا مطالعہ ..... افلاطون سے ایلیٹ تک" از عابد صدیق' مطبوعہ ثاقب پبلشرز' ملتان' طبع اول ۱۹۸۴ء۔

۷۔ "تاریخ ادب انگریزی" از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی' مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد۔ پاکستان۔ طبع اول ۱۹۸۶ء۔

(۲)

ٹی ایس ایلیٹ' ۲۰ ویں صدی عیسوی کے انگریزی ادب کی سب سے بڑی شعری بغاوت کا اہم ترین نظریہ ساز شاعر ہے اور اس کی طویل نظمیں خصوصاً "جے الفرڈ پروفراک کا نغمہ محبت" (۱۹۱۷ء) اور "خراب آباد" (۱۹۲۲ء) انھی رجحانات کی حامل نمائندہ ترین نظمیں ہیں۔ ان نظموں کا زمانہ تخلیق ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۲ء ایسا ہے جب جنگ عظیم اول کے بعد یورپ کا سرمایہ دارانہ نظام ابتلا کے سخت ترین مراحل میں سے گزر رہا تھا۔ دوسری طرف ایلیٹ کو بہ طور شاعر کے دیکھیں تو کہا جاتا ہے کہ "ویسٹ لینڈ" (۱۹۲۲ء) مکمل کر لینے کے بعد اس نے اپنے مزاج میں جوش اور امید پرستی کے فقدان کے باعث یا نامعلوم وجوہات کے سبب رومن کیتھولک عقائد میں پناہ لی۔ "خراب آباد" (The Waste Land)' بہ قول اس کے سخت ترین ناقدین' اس اعتراف شکست یا کم ہمتی کے احساس سے پہلے کی نظم ہے۔ اس نظم میں رواں امثالیت کا دارومدار مس ویسٹن (Miss Weston) کی کتاب "From Ritual to Romance" اور سر جیمز فریزر (Sir James Frazer) کی

کتاب "شاخ زریں" (Golden Bough) پر ہے۔

یہ آخری بات تو ایک کھلی حقیقت ہے اور اس کا اعتراف خود ایلیٹ نے بھی کیا' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایلیٹ کے شعری لحن میں حزنیہ لے اور طنز کی کاٹ کے داخلی اسباب کیا رہے؟ کیا یہ محض خارجی حالات کا نتیجہ تھا' یقیناً یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں۔ اور نہ کبھی اس کے ہاں جوش اور امید کا فقدان دیکھنے کو ملا۔ تیسری بات یہ کہ ایلیٹ کے شعری لحن کو اس دور کی انگریزی شاعری کے سیاق و سباق' ردو قبول کی منزل اور انگریزی کی نزول شعری روایت سے باہر رکھ کر نہ تو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی تحسین ممکن ہے۔

یوں سب سے پہلے تو ہمیں انگریزی کی نزول شعری روایت پر بھرپور نگاہ ڈالنا ہوگی' اور اس کے بعد ایلیٹ کے چند معاصرین (تقدیم و تاخیر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے) کے کام کا جائزہ لینا ہوگا۔ خصوصاً" ڈکنز' تھیکرے' گالزوردی' ایچ جی ویلز' برنارڈ شا اور آر اے سکاٹ جیمز کے سماجی حوالہ جات' سگمنڈ فرائیڈ' ڈاکٹر یونگ' ڈاکٹر ہسٹیکل اور برگساں کے تحت الشعور' لاشعور اور اجتماعی لاشعور کے نظریات' ڈی ایچ لارنس کے انسانی روابط سے متعلق افکار' رڈیارڈ کپلنگ' ایذرا پاؤنڈ' ای ایم فورسٹر اور ڈبلیو بی ییٹس کا مشرق کی جانب جھکاؤ' آرتھر کوئسلر اور کارل مارکس کی نئی نظریہ سازی' جارج سینٹس بری' اے سی بریڈلے' اولیور ایمن' ڈبلیو پی کر' ڈوور ولسن اور پولارڈ وغیرہم کی تحقیق سے ہم رشتہ تنقید اور سب سے بڑھ کر ڈیوڈ ڈائشز اور کرسٹوفر کاڈویل سے لے کر ایلن ٹیٹ' رچرڈ بلیکمر' کلینتھ بروکس' آئی اے رچرڈز اور ولیم ایمپسن تک کے تنقیدی نظریات ٹی ایس ایلیٹ کی تفہیم میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

اگلا مرحلہ ایلیٹ کے تنقیدی افکار اور اس کے شعری تصورات کو ذہن میں تازہ کرنے سے متعلق ہے۔ جنھیں جانے اور سمجھے بغیر نہ تو ۲۰ ر سویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی کی شعری بغاوت کے معنی سمجھ میں آئیں گے اور نہ ہی ایلیٹ کی پیچیدہ نظمیں اور اس کی مذہبی شاعری' خصوصاً" چہار شنبہ مبارک" (Ash Wednesday) اور چار آہنگ کی رباعیات یعنی "Four Quartets"۔ یوں ہم بھی گراہم ہف کی مانند ایلیٹ کے بار بار گرفت سے نکلنے کی شکایت ہی کرتے رہ جائیں گے۔ لہٰذا یاد رہے کہ ایلیٹ کے عہد میں تہذیبی یکسانیت کا فقدان پایا جاتا ہے اور مذہبی تصورات میں دراڑیں نیز اس دور میں علمی اور ادبی سطحوں پر نت نئی نظریہ سازی عام رہی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی نہایت ضروری ہے کہ انگریزی کی شعری روایت کو ہمارے ہاں کی گھسی پٹی ادبی اصطلاح کی طرح کی چیز تصور نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ انگریزی کی شعری روایت کی تشکیل و تہذیب کئی زمانوں کے پیدا کردہ مختلف النوع شعری دھاروں نے کی ہے۔ اور ایک سرسری نظر ڈالنے پر ہی وہ تمام نزول شعری دھارے الگ الگ اپنی پہچان کروانے کے ساتھ ساتھ جزو میں کل کا جلوہ بھی دکھاتے ہیں۔

اس کا سب سے بڑا سبب ادبی رویوں کی چھان پھٹک، نزول تخلیقی اظہار کی پہچان، اور ناقدین کی درست سمت نمائی ہے۔ یوں انگریزی شاعری کی نزول شعری روایت ہر زمانے میں لحظہ بھر کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے پائی۔

کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی کی شعری روایت نے صدیوں کے سفر کے بعد اپنے اندر ایک خاص نوع کی لچک پیدا کر لی ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ انگریزی کی شعری روایت اس درجہ جاذب ہو چکی ہے کہ محض چونکا دینے کی خواہش کے کوئی معنی نہیں۔ ایسا نہیں کہ کوئی مسخرہ اٹھے اور محض چند روزہ اہمیت ہی حاصل کر جائے، جیسا کہ ماضی قریب میں ہمارے ہاں اکثر ہوتا آیا ہے۔ یا یہ کہ مرزا غالب کی تحسین کے لیے شیخ ابراہیم ذوق کا دنیا سے اٹھ جانا ضروری معلوم ہو، یا محض مشاعرے میں تیسرے درجے کے سامعین کی واہ واہ کے سبب یاس یگانہ چنگیزی کی موجودگی میں جگر مراد آبادی کو ایک نمبر شاعر قرار دے دیا جائے، یا فراق، فیض، عزیز حامد مدنی یا ناصر کاظمی کی موجودگی میں محض گروہ بندی، کالم نگاری یا اخبارات کے ادبی صفحات کے زور پر تیسرے درجے کا پھٹیچر شاعر عزت پا جائے۔

شیکسپیئر، ڈن، پوپ، بلیک، براؤننگ، پاؤنڈ اور ایلیٹ انگریزی کی نزول شعری روایت کی باہم پیوست کڑیاں ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سب کو (شعری روایت میں توسیع کی خاطر ہی سہی) انگریزی کے کل شعری سرمایہ کو یک قلم مسترد کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جب کہ اس نوع کی مثالیں ہمارے ہاں ایک ڈھونڈو، ہزار ملتی ہیں۔ یہ فرق ہے روایت کے شعور کا۔

غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایلیٹ نے جب جارجین، وکٹورین اور خالص رومانی شعرا کی بہت بڑی تعداد کو رد کرتے ہوئے نزول شعری روایت سے نکال باہر کیا تو وہ اس وقت تو کلاسیکی، مابعد الطبیعیاتی اور الزبیتھین دور کے بیشتر شعرا کو قبول بھی کر رہا تھا۔ اور جب لوگوں کو وہ قبول کر رہا تھا، انھی میں سے کسی ایک شاعر کی شعری سطح پر تحسین، آگے چل کر خود ایلیٹ کی شاعری کے لیے بڑا چیلنج بھی بن سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا کیا، اور کمال احتیاط کے ساتھ اپنی بہترین شاعری میں جنگ عظیم اول کے بعد کی دنیا کے فکری اور تہذیبی انتشار کو سمیٹ لینے میں کامیاب ہو گیا۔

ایلیٹ کی شاہکار طویل نظمیں خصوصاً "The Love Song of J. Alfred Profrock" (جے الفرڈ پروفروک کا نغمۂ محبت) اور The Waste Land (خراب آباد) اس نوجوان نسل کا نوحہ ہیں جس کا شباب جنگ عظیم اول میں جھونک دیا گیا۔ یوں جنگ کے نتیجہ میں بکھری ہوئی نفسی کیفیتیں اور وحشت خیزی کا چناؤ، ایلیٹ کی ان نظموں کا موضوع خاص ہے۔

ان بکھرے، انوکھے اور ٹیڑھے احساسات اور نفسی کیفیتوں کی پیش کش میں ایلیٹ نے بہ طور رومانی حقیقت نگار کے ویسا ہی پیرایہ اظہار چنا جو ان سے لگا کھاتا تھا مثلاً "The Waste Land" (خراب آباد) میں گوتم بدھ کے افکار، انجیل مقدس، کلاسیکی فکشن اور ڈراما کی پیوند کاری کرتے ہوئے دانتے اور واگنر (جرمنی)، شیکسپیئر، میڈلٹن، ویبسٹر، گولڈ سمتھ اور کڈ (برطانیہ) سے انتخاب کرتے

ہوئے ایلیٹ نے ایک ایسا مناسب حال طنزیہ پیرایۂ اظہار اور پُر پیچ علامتی نظام (Cryptogram) وضع کیا' جو ایلیٹ سے پہلے کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے مضمون "ویسٹ لینڈ" از ڈاکٹر صدیق کلیم' مطبوعہ "ادب لطیف" لاہور' ۱۹۵۶ء۔

یہاں اس بات کی صراحت بھی ضروری ہے کہ The Waste Land کی اشاعت (۱۹۲۲ء) سے قبل ایلیٹ نے یہ نظم ایذرا پاؤنڈ کو دکھائی تو پاؤنڈ نے اپنی بہترین ناقدانہ صلاحیتوں کے ساتھ اسے نہ صرف پڑھا اور قیمتی مشوروں سے نوازا' بلکہ اس نظم میں شامل بحری جہاز کی غرقابی سے متعلق طویل مناظر' دانتے کے جہنم سے متعلق طویل اقتباس اور Rape of Lock سے اثر پذیری کو کم کرنے کی خاطر ابتدائی مسودے میں سے بہت سے حصے قلم زد کرتے ہوئے اس نظم کو مزید پر اثر بنا دیا۔

"خراب آباد" (The Waste Land) کے آغاز میں لتھوینیا کی ایک لڑکی کی یادوں کا ایک سلسلہ ملتا ہے' جب وہ اپنے چچا زاد کے ساتھ سیر کو نکلی تھی۔ اسے یاد آ رہا ہے لڑکپن کا وہ زمانہ' جب وہ دونوں آرچ ڈیوک کے کم سن مہمان تھے۔ درختوں کے جھنڈ' بارش کی باڑھ اور گاڑی پر اپنے چچا زاد کو مضبوطی سے تھامے ہوئے' بری طرح دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ترائی میں اترنا اور اس کے بعد وقت کے منہ زور دھارے کا سامنا کرتے اور پچھاڑیں کھاتے ہوئے شعور کی رو کی تکنیک ماضی قریب اور ماضی بعید کے مختلف کرداروں کا سامنا' اور داخلی ٹوٹ پھوٹ' دکھ اور پچھتاوا۔

اسی طرح نظم "جے الفرڈ پروفروک کا نغمہ محبت" کا مرکزی کردار' صنعتی یورپ کا اینٹی ہیرو ہے جو ہیملٹ کی طرح بے روح اور بے عملی کا شکار دکھا گیا۔ اس کے بطون سے اٹھنے والے طوفان ساحلوں پر آکر دم توڑ دیتے ہیں۔ ایلیٹ کی ایک اور اہم نظم "ایک خاتون کا پورٹریٹ" (Portrait of a Lady) کے نسوانی مرکزی کردار کی نفسی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں۔ لہٰذا ایلیٹ نے ان نظموں میں تجرید اور شعور کی رو کا استعمال کیا۔

یوں بہ غور دیکھیں تو ایلیٹ کے شعری اظہار میں تسلسل خیال نہیں بلکہ ایک ایسی ٹوٹ پھوٹ اور کچھ ایسے مخفی اشارے ہیں جو زوال پرست فرانسیسی علامت نگاروں کی بازگشت کے ساتھ گھل مل کر ایلیٹ کے شعری کرداروں کو گوشت پوست کی کرداری سطح سے اوپر اٹھائے جاتے ہیں۔

ٹی ایس ایلیٹ' جسے جرمن شاعر دانتے مرغوب ہے اور رومانی شعرا سے نفرت' وہ پوپ اور جان ڈرائیڈن کی تعریف لکھتا ہے اور جون کی بلینک ورس کا قائل۔ جان ڈن اور دیگر مابعد الطبیعاتی شعرا کا پیروکار رہتے ہوئے بودلیئر اور جیمز جوائس کا مداح ہے۔ جب کہ تھامس ہارڈی' ڈی ایچ لارنس اور جارج ایلیٹ پر اس نے کڑی تنقید کی۔ ڈبلیو ایچ آڈن نے یہ سب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "اس نے پیاس اور خوف رقم کرنے کے لیے' صحیح لحن ڈھونڈ نکالا۔" اس کے علاوہ بہت اہم چیز ایلیٹ کا تصور زماں ہے۔ ایلیٹ کے ہاں وقت کا دھارا مستقیمی ہے جو ہر شے کو نیست و نابود کرتا ہوا' آگے اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس انہدام میں اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف یادوں کا ذخیرہ ہے۔

ایلیٹ کے خیال میں وقت کا دھارا انسان کے اندر رواں ہے یعنی ایلیٹ زمانِ روحانی کا قائل ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان وقت کے دھارے کے اندر نہیں' بلکہ وقت انسان کی ذات میں جاری و ساری ہے۔ یوں ایلیٹ کا تصورِ زماں ہیگل' کارل مارکس' نطشے اور اسپنگلر کے نظریات کا رد اور اس تصورِ زماں سے قریب تر ہے جو فخرالدین عراقی اور کانٹ نے پیش کیا۔

ایلیٹ کے ہاں پانی کا استعارہ در حقیقت وقت سے متعلق ہے اور رنگوں کی دھنک مختلف زمانوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ اسی طرح سرما کا شدید موسم ان جکڑ بندیوں کو ظاہر کرتا ہے' جن کے خلاف ایلیٹ نے فکری سطح پر بغاوت کی یا کرنا چاہی۔

ایلیٹ کے قنوطی ذہن کے باوجود اس کی شاعری میں حسن' خیر اور محبت کی جستجو دکھائی دیتی ہے اور وقت کے بہتے دھارے میں سے لفظ اور سر کا گیان' اس کی منشا اور منتہا۔ اس طرح ایلیٹ خارجی بے زاریت کے لاینحل دائرے کا اسیر رہتے ہوئے بھی مابعد الطبیعیاتی حقیقت کا جویا دکھائی دیتا ہے۔

ایلیٹ کے ہاں جنگی جنون سے بے زار انسان' نیز تہہ و بالا تہذیب کی شکست و ریخت کی آواز ایک نوحہ بن جاتی ہے اور ایلیٹ کے شعری کرداروں کے باطن میں دور تک پھیلی ہوئی ویرانی' مذہب کے روایتی استعارے کی ٹوٹ پھوٹ اور ایقان و اعتقاد سے انکار کا باعث بنتی ہے۔

دوسری طرف ایلیٹ کی مختصر نظمیں ہیں' خصوصاً "منظرنامے" (Landscapes)' "سوینی ..... بلبلوں کے درمیان" (Sweeny, among The Nightingales) اور "بوسٹن کی شام کا خبرنامہ" (Boston Evening Transcript) وغیرہ' تو ان میں اکتاہٹ' جھلاہٹ' بے زاری اور طنز کی کاٹ دیکھنے کو ملتی ہے' جو اس تہذیبی ٹوٹ پھوٹ کا شاخسانہ ہے' جس کا سامنا ایلیٹ کو رہا۔

نظم "منظرنامے" کی بنیاد مناظرِ فطرت اور بچپن کی معصومیت ہے۔ اس نظم میں بدھ مت اور تصوف کے حوالے سے معنوی ابعاد پیدا کیے گئے ہیں۔ نظم "سوینی ..... بلبلوں کے درمیان" کی بنیاد ستارہ شناسی کا علم ہے اور تکنیکی سطح پر تجرید کا در تارا دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب کہ "بوسٹن کی شام کا خبرنامہ" اس دور کی اکتاہٹ سے بھری بے زار کن شاموں کی عکاس ہے۔

ان نظموں میں سوائے بدھ مت کے مطالعے (نظم "منظرنامے") اور مجوسیوں کے علمی دائرے (نظم "سوینی .... بلبلوں کے درمیان") سے متعلق مذہبی حوالوں کے (جو ایلیٹ کے وسعتِ مطالعہ کی پہچان رہی ہے) کوئی ایک مخصوص رنگ نہیں اور نہ ہی ایلیٹ نے اس کے لیے کوئی خاص تگ و دو کی ہے۔ اس کے باوجود امریکی ایمیجسٹ تحریک سے متاثر ہونے والا ایلیٹ کا یہ روپ نظم کو شعرا کے لیے تمثال کاری' تاثریت' پیکر تراشی' ذخیرہ الفاظ اور زبان کے تخلیقی در تارے کے باب میں راہنما اصول سامنے لاتا ہے۔

ایلیٹ کی مذہبی شاعری ایک طرح سے تاریخی حصار کو توڑتے ہوئے' تاریخی شعور کے مقابلے میں روحانی vision کی فتح یابی کا جتن ہے۔ جس کی نمایاں مثالوں میں درجِ ذیل نظمیں یادگار ہیں۔

۱۔ "چہار شنبہ مبارک"(Ash Wednesday)(۱۹۳۰ء)۔
۲۔ "میگی کا سفر"(Journey of The Magi)
۳۔ "اینی میلا"(Animila)
۴۔ "میرینا"(Marina)
۵۔ "چٹان سے دو سپاسِ سرمدی"(Two Choruses From "The Rock")
۶۔ "کوریولین"(Coriolan)
۷۔ "منظرنامے"(Landscapes)
۸۔ "طوفانی رات پر ایک غنائیہ"(The Preludes)
۹۔ "برگِ خزاں"(Gerontion)
۱۰۔ "چہار آہنگ"(Four Quartets)(۳۲-۱۹۳۶ء)

"چہار شنبہ مبارک" ایک دعائیہ نظم ہے۔ اسی نظم سے ایلیٹ کے رومن کیتھولک افکار کی جانب نظریں اٹھیں۔ "میگی کا سفر" کا منظرنامہ عرب کی سرزمین بالخصوص فلسطین سے چنا گیا ہے۔ شاعر اس نظم میں حضرت عیسیٰؑ کے زمانے تک پیچھے ہٹتا چلا گیا ہے۔ اور یوں اپنے زمانے تک آتے آتے مذہبی افکار میں پڑنے والی دراڑوں کی بات کرتا ہے۔ نظم میں تجریدی طریقۂ کار کے تحت گزرا ہوا وقت موجود لمحے سے گلے مل رہا ہے۔ نظم "اینی میلا" میں بھی یہی تکنیک برتی گئی ہے۔ نظم "میرینا" کی بنیاد ہندومت کا فلسفہ اور ہندی کی مثلیں رہی ہیں۔ یہ نظم حد سے بڑھتی ہوئی تحریص پر ایک طنز ہے۔ "مایا جال" کے حوالے سے تلسی داس کی ایک مثل یاد آتی ہے۔

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہات
تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

اس طرح نظم میں مایا کے تین روپ دکھائی دیتے ہیں پرسو، پرسا، پرس رام۔ یعنی جوں جوں دولت جمع ہوتی جاتی ہے انسان کی عزت اور توقیر میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس نظم میں ایلیٹ کا وقت کا تصور، خواب و خیال اور یادیں قابلِ غور ہیں نیز رنگوں کے حوالے سے مختلف موڈ اور کیفیتیں قابلِ توجہ۔

نظم "چٹان سے سپاسِ سرمدی" (Two Choruses from "The Rock") کا عنوان ہی بتاتا ہے کہ یہ منظوم ڈراما "The Rock" کے مختلف کورس یا دعائیے ہیں۔

نظم "منظرنامے" (Landscapes) واضح طور پر بدھ مت اور تصوف کے اثرات کے تحت لکھی گئی۔ جس میں بچپن کی معصومیت کے ساتھ مناظرِ فطرت ہم رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ نظم "طوفانی رات" (Preludes) میں ہندومت کے حوالے سے آواگون کا تصور، نیز یادوں کے سلسلے اور وقت کا طوفانی دھارا خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ جب کہ "برگِ خزاں" (Gerontion) ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۵ء کی درمیانی مدت میں سامنے آئی۔ عام طور پر ہمارے ناقدین اور محققین اس نظم کو ایلیٹ کی مذہبی شاعری

میں شمار نہیں کرتے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس نظم میں نہ ہی حوالے حد درجہ واضح ہیں۔ خاص طور پر یسوع مسیح کے مصلوب ہو جانے کے بعد کی نشانیوں اور ظہور کے حوالے سے۔ اس نظم میں بھی توفیقِ خداوندی کے حصول کی خواہش کی گئی ہے۔ ایلیٹ کے مخصوص وقت کا تصور اس نظم میں بھی موجود ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نظم میں شاعر' دہشت کے اثر سے باہر نکلتا دکھائی دیتا ہے۔

اور سب سے آخر میں ذکر اس طویل نظم کا جسے ایلیٹ کی مذہبی شاعری کے حوالے سے خصوصی توجہ حاصل رہی' یعنی ''چہار آہنگ''(Four Quartets)۔

یہ نظم چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ا۔ Burnt Norton (۱۹۳۶ء)' ۲۔ East Coker (۱۹۴۰ء)' ۳۔ (The Dry Salvages)(۱۹۴۱ء) اور ۴۔ Little Gidding (۱۹۴۲ء)۔ واضح رہے کہ ایلیٹ کی "چہار آہنگ" سے پہلے کی مذہبی شاعری کی نمایاں خصوصیت کرسچین امیجری اور کرسچین روایت تھی جب کہ "چہار آہنگ" ان خصوصیات سے خالی ہے۔ اس کے باوجود یہ مذہبی شاعری بلکہ ایلیٹ کی مذہبی شاعری کا بام عروج ہے۔

"چہار آہنگ" میں ایلیٹ نے توفیقِ خداوندی کی خواہش تو کی ہے لیکن قدرے مختلف انداز میں۔ ایک ایسے انداز میں' جو نظم "برگِ خزاں" "پیاس سردی" اور "چہار شنبہ مبارک" میں دکھائی نہیں دیتا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ نظم ماضی اور حال سے نہیں' مستقبل سے جڑی ہوئی ہے۔ ایلیٹ نے اس نظم میں کرشن مہاراج کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ "مستقبل ایک مدھم گیت کے مانند ہے' ان لوگوں کے لیے' جو پُرامید رہتے ہیں۔"

اس نظم کی دوسری نمایاں بات یہ ہے کہ یہاں ایلیٹ کے مخصوص وقت کا تصور (تصورِ زماں) وہ نہیں جو اس کی تمام دیگر نظموں میں پایا جاتا ہے یعنی وقت کا مستقبلی تصور اس نظم میں دکھائی نہیں دیتا۔ اور یہ بات کچھ کم اہم نہیں۔

"چہار آہنگ" کو بہ غور دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ دو یگوں کے بیچ وقت کا دھارا باہم مربوط نہیں۔ لہٰذا ایک یگ (زمانہ) کے خاتمے پر دوسرے یگ (زمانہ) تک رسائی ممکن ہی نہیں۔ بس اگر کچھ ممکن ہے تو وقت کی مار سہنا اور سفر کی صعوبتیں ہی ماحصل ہیں۔ یوں ایلیٹ کا یہ تصورِ زماں' جاپان کے شنتو مت کے عقاید سے قریب دکھائی دیتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت از حد ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ایلیٹ کی مشہور طویل نظم "چہار آہنگ" کا ابتدائیہ بہ عنوان Burnt Norton (۱۹۳۶ء) نظم "The Hollow Men" اور دعائیہ نظم "Ash Wednesday" (۱۹۳۰ء) چند ایسی نظمیں ہیں' جن کی تشکیل ایلیٹ کے منظوم ڈراموں اور طویل نظموں سے بچے بچائے ٹکڑوں سے ہوئی۔ مثلاً ''Burnt Norton'' کی ابتدائی لائنیں منظوم ڈراما "Murder in Cathedral" کی تراش خراش کے دوران بچ رہی تھیں۔

تخلیقی سطح پر اتنے بڑے جوکھم سے نبرد آزما رہنے کے باوجود ٹی ایس ایلیٹ کو ہمارے ہاں اردو نظم میں بہ طور ایک ماڈل کے وہ اہمیت نہیں ملی، جو اسے نظری تنقید میں حاصل رہی۔ ایلیٹ کے عروج کے دور میں بھی، اردو میں آزاد نظم کے بانی تصدق حسین خالد یورپ سے محض آزاد نظم کی تکنیک کو ہی چن پائے۔ خود تصدق حسین خالد کے مطابق انھوں نے سفر انگلستان (۱۹۳۲ء) سے قبل چند آزاد نظمیں لکھیں۔ اس وقت تک وہ شیلے اور سون برن سے متاثر تھے جب کہ انگلستان میں رہ کر انھوں نے ولیم موریس اور پا کمپنز سے ذہنی قربت محسوس کی۔ ایذرا پاؤنڈ یا ایلیٹ کا ذکر انھوں نے "سرودِ نو" (طبع اول ۱۹۴۸ء) کے دیباچے میں نہیں کیا۔

۱۹۴۸ء میں ایلیٹ ادب کا نوبل انعام وصول کر کے دنیا کے مقتدر شعرا میں کھڑا ہو گیا تھا اور یقیناً میرؔاجی کے مطالعے میں بھی رہا ہو گا لیکن میرؔاجی اپنی مخصوص افتادِ طبع اور موضوعات کے چناؤ میں ایلیٹ سے خاصے دور کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ن م راشدؔ نے عجمی شعری روایت کی بازیافت کے معاملے میں ایلیٹ کا نام لیے بغیر استفادہ کیا۔ دیکھیے ان کا تنقیدی مضمون "ادب میں اجتہاد" مطبوعہ "شاہکار" لاہور۔ بابت جولائی ۱۹۳۵ء۔

شاعر ٹی ایس ایلیٹ کا اردو دنیا سے اولین تعارف جنوری ۱۹۳۷ء میں عزیز احمد (پ: ۱۱ر نومبر ۱۹۱۳ء۔ م: ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۸ء) کی معرفت ممکن ہوا۔ عزیز احمد، جو اردو کے معروف ناول نگار، فسانہ طراز، نقاد، شاعر اور محقق تھے۔

عزیز احمد نے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، دکن سے ۱۹۳۴ء میں بی اے (آنرز) کیا اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کوششوں سے انھیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر انگلستان جانے کا موقع ملا۔ ۱۹۳۵ء کے آغاز میں وہ لندن گئے۔ یوں عزیز احمد کو جامعہ عثمانیہ کے مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، مولوی وحید الدین سلیم اور مولانا احسن گیلانی کی علمی صحبتوں کے بعد انگلستان کی علمی و ادبی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔

اس وقت تک عزیز احمد کا ادبی دنیا میں جتنا بھی تعارف تھا، اسے کسی بھی تخلیق کار کے آغاز کے اعتبار سے شان دار ہی کہا جا سکتا ہے۔ تفصیل درجِ ذیل ہے۔

۱۔ مجلّہ "مکتبہ" حیدر آباد دکن (مدیر: عبدالقادر سروری) کے شریک مدیر۔

۲۔ "دنیا کے شاہکار افسانے" مرتبہ عبدالقادر سروری، طبع اول ۱۹۲۳ء کے شریک مرتب۔

۳۔ مترجم، افسانہ "بچپن" از رڈیارڈ کپلنگ، مطبوعہ "نیرنگِ خیال" لاہور۔ شمارہ ستمبر ۱۹۲۸ء۔

۴۔ مترجم، افسانہ "شریر لڑکا" از رابندر ناتھ ٹیگور، مطبوعہ "نیرنگ خیال" لاہور۔ شمارہ دسمبر ۱۹۲۸ء۔

۵۔ طبع زاد افسانہ "کشاکشِ جذبات" از عزیز احمد، مطبوعہ "مکتبہ" حیدر آباد، دکن۔ مکتبہ ابراہیمیہ بابت نومبر ۱۹۲۹ء۔

۶۔ طبع زاد مثنوی "عمر خیام" تکمیل ۱۹۳۲ء۔

۷۔ مضمون "جدید روسی تھیٹر" مطبوعہ "اردو" اورنگ آباد' دکن۔ بابت اکتوبر ۱۹۳۴ء۔

۸۔ مضمون "ترقی پسند ادب کیا ہے؟" مطبوعہ "الاؤ" اورنگ آباد' دکن۔ بابت اپریل ۱۹۳۵ء۔

۹۔ تبصرہ "لیلیٰ کے خطوط" از قاضی عبد الغفار' مطبوعہ "اردو" اورنگ آباد' دکن' بابت اپریل ۱۹۳۵ء۔

۱۵ر جون ۱۹۳۵ء کی شام ٹی ایس ایلیٹ کے منظوم ڈراما "Murder in The Cathedral" (کلیسا میں قتل) کی پہلی ریہرسل کنٹربری کیتھڈرل میں ہوئی تو اگلے روز روزنامہ "The New Yarker" کے ڈراما ناقد نے اس ڈرامے کی تعریف لکھی۔ گمان غالب ہے کہ عزیز احمد نے ایلیٹ کا نام اسی زمانے میں پہلی بار سنا ہو گا۔ نتیجے کے طور پر ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو جب عزیز احمد' مولوی عبد الحق کے ۱۹۱۳ء کے پرانے دوست ای ایم فورسٹر سے ملے تو دوران گفتگو ٹی ایس ایلیٹ کا ذکر بھی رہا۔ لیکن بہ قول عزیز احمد۔

> وہ (فورسٹر) ٹی ایس ایلیٹ کے مداح ضرور تھے' مگر میں نے ان کی تعریف میں کوئی خاص جوش نہیں دیکھا۔

("متاعِ عزیز" (خطوط) مرتبہ: ڈاکٹر صدیق جاوید' طبع اول: ۱۹۹۱ء ص ۳۶۹)

عزیز احمد نے اپنے قیامِ جنیوا کے دوران ۱۲ر اگست ۱۹۳۶ء میں ایلیٹ کا اولین تعارف قلم بند کیا۔ وہ اس وقت تک نہ صرف یہ کہ ایلیٹ کی باقاعدہ اجازت کے ساتھ "The Waste Land" کا اردو ترجمہ "خراب آباد" کے عنوان سے مکمل کر چکے تھے بلکہ ایلیٹ کی شاعری کے تلمیحاتی نظام کو مارٹن بلوم فیلڈ اور جے ڈبلیو پار کے ساتھ مل کر سمجھنے کے بھی اولین دعوے دار تھے۔

عزیز احمد کا کیا ہوا یہ ترجمہ مع تعارف ماہنامہ "اردو" آکسفورڈ بابت جنوری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ جب کہ اسی نظم کو بعد میں کلیم احسن کلیم اور رفیق خاور نے بھی اپنے اپنے انداز میں ترجمہ کیا۔

بہ طور شاعر ٹی ایس ایلیٹ کو زیرِ بحث لانے والا دوسرا نام پروفیسر آلِ احمد سرور کا ہے۔ جنھوں نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے ایک ریڈیائی نشریہ (۱۹۳۹ء) میں ایلیٹ کی دوسری اہم نظم "جے الفرڈ پروفروک کا نغمۂ محبت" کا حوالہ دیتے ہوئے ایلیٹ اور اس دور کے دیگر جدید شعرا مثلاً "سٹیفن سپینڈر' ڈبلیو ایچ آڈن اور لیوس کے تشبیہاتی اور استعاراتی نظام پر بات کی۔ دیکھیے مضمون "انگریزی شاعری" (تشکیل ۱۹۳۹ء) مشمولہ "تنقیدی اشارے" از آلِ احمد سرور طبع اول ۱۹۴۲ء' طبع چہارم ۱۹۶۳ء ص ۸۳۔۸۴۔

۱۹۴۱ء میں پروفیسر احمد علی نے "Mr Eliot's Penny World of Dreams" کے عنوان سے ایک کتاب مکمل کی' جو لکھنؤ یونی ورسٹی پریس' لکھنؤ سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں محمد حسن عسکری' ڈاکٹر عبادت بریلوی' آلِ احمد سرور اور کلیم الدین احمد کے تنقیدی مضامین کے سبب ایلیٹ (بہ طور شاعر) کا ذکر عام ہو گیا۔

اردو ادب میں شعری سطح پر ن م راشد (نظم حسن کوزہ گر۔ ایران میں اجنبی 'لا = انسان)' مجید امجد (مرے خدا' مرے دل۔ نہ کوئی سلطنتِ غم نہ اقلیمِ طرب)' ضیا جالندھری (خزاں۔ سرِ شام۔ زمستاں کی شام)' صفدر میر (راکھ کا ڈھیر)' مختار صدیقی (موہن جوداڑو)' رضی ترمذی (رستہ خیز درخشاں)' شمس الرحمان فاروقی (بودلیئر اور ایلیٹ کے لیے حقیر تحفہ)' آفتاب اقبال شمیم (بے انت کا سپنا۔ میں ابد ہوں۔ نہیں اور ہاں سے آگے۔ دھوپ اور دھند)' شہریار ("اسم اعظم" کی متعدد نظمیں)' اختر حسین جعفری (آئینہ خانہ)' وحید اختر (مٹی کی صدا)' افتخار جالب (قدیم بنجر)' مخمور سعیدی (ہوا کو نہ روکو)' ساجدہ زیدی (سمندر کے سینے کے خاموش اسرار)' زبیر رضوی (بشارت پانی کی)' پریم وار برٹنی (کتبے) اور راج نرائن راز (آبروئے شیوہ اہل نظر) نے تخلیقی تجربے میں ایلیٹ کے ساتھ اشتراک محسوس کیا' اور یہ سلسلہ شعورِ روایت کے حوالے سے ستر کی دہائی کے غزل گو شعرا محمد خالد' ثروت حسین' محمد اظہار الحق' غلام حسین ساجد' شاہدہ حسن' جمال احسانی' سلیم کوثر' غلام محمد قاصر' خالد اقبال یاسر اور عرفان صدیقی تک چلا آیا ہے۔

○

ٹی ایس ایلیٹ کی منظومات کے معلومہ اردو تراجم کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ "خراب آباد" (The Waste Land) ترجمہ: عزیز احمد' مطبوعہ: ماہنامہ "اردو" آکسفورڈ' بابت جنوری ۱۹۴۳ء۔

اس نظم کے دیگر دو تراجم بھی دیکھنے کو ملے۔ ایک ترجمہ مکین احسن کلیم کا جو لگ بھگ ساٹھ کی دہائی میں کیا گیا اور دوسرا رفیق خاور کا' جو "تخلیقی ادب" کراچی' مرتبہ: مشفق خواجہ' شمارہ ۲ میں شائع ہوا۔

۲۔ "چہار آہنگ" (Four Quartets) ترجمہ: قرۃ العین حیدر' مطبوعہ: ماہنامہ "افکار" کراچی' شمارہ ۱۹۳' ۱۱ر' بابت ۱۹۵۶ء۔

ترجمہ نامکمل' محض ایک حصے کا ہے۔ اسی نظم کے پہلے حصے "Burnt Norton" کا ترجمہ شان الحق حقی نے کیا۔ مشمولہ "درپن درپن" (۱۹۸۵ء)۔

۳۔ "چہار شنبہ مبارک" (Ash Wednesday) ترجمہ: سید فیضی' مطبوعہ: "نقوش" لاہور' شمارہ ۱۰۲۔ بابت ۱۹۶۵ء (نامکمل صرف ابتدائیہ)

دوسرا مکمل ترجمہ رفیق خاور نے "بازگشت" کے عنوان سے کیا جو "تخلیقی ادب" کراچی' مرتبہ: مشفق خواجہ۔ شمارہ ۵' بابت اکتوبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔

۴۔ "بوسٹن کی شام کا خبرنامہ" (Boston Evening Transcript) ترجمہ: ناصر کاظمی' مطبوعہ: ماہنامہ "نصرت" لاہور۔

۵۔ "برگِ خزاں" (Gerontion) ترجمہ: رفیق خاور' مطبوعہ: "تخلیقی ادب" کراچی' شمارہ ۱' بابت

۱۹۸۰ء۔

۶۔ "شہر بہ شہر" (Landscapes) ترجمہ: رفیق خاور' مطبوعہ: "تخلیقی ادب" کراچی' شمارہ۔۱' بابت ۱۹۸۰ء۔

اس نظم کا دوسرا ترجمہ بہ عنوان "تناظر" ادیب سہیل نے کیا جو "قومی زبان" کراچی' بابت ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔

۷۔ "طوفانی رات" (Preludes) ترجمہ: رفیق خاور' مطبوعہ: "تخلیقی ادب" کراچی۔ شمارہ۔۱' بابت ۱۹۸۰ء۔

۸۔ "سوینی... بلبلوں کے درمیان" (Sweeny Among the Nightingales)' ترجمہ: رفیق خاور' مطبوعہ: "تخلیقی ادب" کراچی' شمارہ۔۱' بابت ۱۹۸۰ء۔

۹۔ "میرینا" (Marina) ترجمہ: رفیق خاور' مطبوعہ: "تخلیقی ادب" کراچی۔ شمارہ۔۱' بابت ۱۹۸۰ء۔

۱۰۔ "مغاں کا سفر" (Journey of the Magi) ترجمہ: رفیق خاور' مطبوعہ: "تخلیقی ادب" کراچی۔ شمارہ۔۱' بابت ۱۹۸۰ء۔

۱۱۔ "جے ایلفرڈ پروفروک کا محبت کا گیت" (The Love Song of J.Alfred Prufrock) ترجمہ: احسان اکبر' مطبوعہ: "نیا دور" کراچی۔ شمارہ ۸۳۔ ۸۴۔

اسی نظم کا دوسرا ترجمہ بہ عنوان "سازِ بے سوز" از رفیق خاور مطبوعہ "تخلیقی ادب" کراچی۔ شمارہ۔۵۔ بابت اکتوبر ۱۹۸۵ء اور تیسرا ترجمہ' بہ عنوان "جے الفرڈ پروفروک کا نغمۂ محبت" انیس ناگی "دانش ور" لاہور۔ شمارہ۔۱۔

۱۲۔ "سپاسِ سرمدی" (Two Choruses from "The Rock") ترجمہ: رفیق خاور' مطبوعہ: "تخلیقی ادب" کراچی' شمارہ۔۵۔ بابت اکتوبر ۱۹۸۵ء۔ تمثیلو ڈراما "The Rock" کے دو سرے کورس کا ایک ترجمہ بہ عنوان "نورِ غیب" شان الحق حقی نے بھی کیا ہے' جو ان کی کتاب "درپن درپن" طبع اول ۱۹۸۵ء میں شامل ہے۔

(۳)

شاعری اور تنقید کے بعد ایلیٹ کی تیسری جہت ڈراما نگاری ہے اور ڈراما نگاری میں بھی منظوم ڈرامے سے متعلق۔ ایلیٹ نے آخری دور میں اپنی پوری توجہ منظوم ڈراما کی طرف مبذول کر لی تھی اور اس کا سبب بتاتے ہوئے ایلیٹ نے کہا تھا کہ یہ ادب کی بہترین صنفِ اظہار ہے۔

لیکن خدا لگتی کہیں تو تخلیقی سطح پر ایلیٹ کے ڈرامے اس پھیلاؤ کے حامل کبھی نہیں رہے' جو موضوعی اور تکنیکی سطح پر ایلیٹ سے مخصوص رہا۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً ان ڈراموں کا مذہبی رنگ

ہے۔ ایلیٹ نے کل چھ ڈرامے لکھے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ "چٹان" (The Rock A Pageant Play) ۱۹۳۴ء ایک طویل نیم مذہبی' طلوساتی ٹیبلو ہے' جسے مکمل کرنے میں ایلیٹ کو ای ایم براؤن کا تعاون حاصل رہا۔ "چٹان" میں شامل کورس (سیاسِ سرمدی) الگ سے بھی شائع ہوئے۔

۲۔ "کلیسا میں قتل" (Murder in The Cathedral) ۱۹۳۵ء۔ یہ ازمنہ وسطیٰ میں تھامس بیکٹ کی موت سے متعلق ڈراما ہے جسے اس دور میں توجہ کی نظر سے دیکھا گیا اور اس کا ذکر اذکار تادیر رہا۔ یہ منظوم ڈراما پہلی بار ۱۵/ جون ۱۹۳۵ء میں کنٹربری کیتھڈرل میں اسٹیج کیا گیا اور یکم نومبر ۱۹۳۵ء کو لندن کے مرکزی تھیٹر کی زینت بنا۔ یہی ڈراما ایلیٹ کے مذہب کی جانب جھکاؤ کا اولین مظہر ہے۔

ایلیٹ کے دیگر ڈرامے:

۳۔ "کنبے کا ملاپ" (The Family Reunion) ۱۹۳۹ء۔ جس کی "Eumenides" سے حد درجہ قربت' خاص طور پر قابلِ غور ہے۔

۴۔ "کاک ٹیل پارٹی" (The Cocktail Party) ۱۹۵۰ء۔

۵۔ "خفیہ ریکارڈ کا سپردار" (The Confidential Clerk) ۱۹۵۳ء۔

۶۔ "بزرگ مدبّر" (The Elder Stateman) ۱۹۵۹ء۔ جس کے پس منظر میں "Oedipus at Colonus" کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ آخر الذکر چار منظوم ڈرامے ایسے ہیں' جو ایلیٹ کے عہد میں بالائی مراعات یافتہ طبقہ کے ڈرائنگ روم کی حسِ مزاح اور میلوڈرامائی عناصر کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان میں بھی بین السطور مذہبی لہر چل رہی ہے۔

اردو میں ایلیٹ کے منظوم ڈراموں سے اثر پذیری کی اولین صورت ناصر کاظمی کا منظوم ڈراما (کتھا) "سر کی چھایا" ہے جو پہلی بار مجلّہ "سویرا" لاہور' شمارہ ۱۷۔۱۸' بابت ۱۹۵۵ء میں سامنے آیا جسے کتابی صورت میں مکتبہ خیال' لاہور نے ستمبر ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ اس میں درج ذیل منظوم ڈرامے بھی قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ "کیوپڈ اور سائیکی" از جعفر طاہر' مطبوعہ: مجلّہ "صحیفہ" لاہور' شمارہ۔ ۳' بابت دسمبر ۱۹۵۷ء۔

۲۔ "جنگل" از صفدر میر۔

۳۔ "دستِ حنا بستہ" از توصیف تبسم' مطبوعہ: "اوراق" لاہور' شمارہ۔ ۲' بابت ۱۹۶۷ء۔

۴۔ "دائرہ اور تکون" از انور معظم' مطبوعہ: "شعر و حکمت" حیدر آباد' دکن' شمارہ۔۱' بابت جنوری تا مارچ ۱۹۷۰ء۔

۵۔ "بلیدان" از عارف عبدالمتین' مطبوعہ: "اوراق" لاہور' (دورِ ثانی) شمارہ ۲۔ بابت اکتوبر تا نومبر ۱۹۷۲ء۔

○

اب تک ایلیٹ کے دو مکمل منظوم ڈرامے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

۱۔ "کلیسا میں قتل" ترجمہ: قرۃ العین حیدر، مطبوعہ: "نیا دور" کراچی۔ شمارہ ۲۱۔ ۲۲۔

۲۔ "کاک ٹیل پارٹی" ترجمہ: سراج الحق، مطبوعہ: "نیا دور" کراچی۔ بابت ستمبر ۱۹۶۶ء۔

○

ڈاکٹر عتیق اللہ کا ایک مضمون بہ عنوان "۲۰ ویں صدی میں منظوم ڈرامے کا فن اور ایلیٹ" اس نابغۂ روزگار کی منظوم ڈراما نگاری کا تجزیہ اور تعارف ہے جب کہ موسسہ فرینکلن، لاہور نے لیونارڈ ونگر کے ایلیٹ سے متعلق تعارفی کتابچے کا ترجمہ قیوم نظر سے کروا کر شایع کیا۔

○

۴ جنوری ۱۹۶۵ء کو جب ٹی ایس ایلیٹ نے لندن میں وفات پائی تو ژاں پال سارتر نے اپنا ایک اہم تعزیتی بیان ریکارڈ کروایا تھا۔ مجلّہ "افکار" کراچی کے شمارہ بابت فروری ۱۹۶۵ء کی معرفت سارتر کا یہ تعزیتی بیان اردو دنیا تک پہنچا۔ "افکار" کراچی کے شمارہ بابت مارچ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اردو دنیا کی نمایندگی کرتے ہوئے ایلیٹ کو خراجِ تحسین پیش کیا اور جنوری ۱۹۶۶ء میں جب مجلّہ "اوراق" لاہور کا اولین شمارہ منظرِ عام پر آیا تو اس میں ڈاکٹر عرش صدیقی کا مقالہ شامل تھا "ٹی ایس ایلیٹ، میرا پسندیدہ فنکار"۔

ایلیٹ کے عالمی ادبی منظرنامے سے رخصت پر اردو دنیا کو اتنا ہی ملال تھا، جتنا کہ ایلیٹ کی جنم بھومی سینٹ لوئس، مسوری (امریکا) یا اس کے آبائی وطن ایسٹ کاکر، سمرسٹ (انگلستان) کے باسیوں کو رہا ہو گا۔

☆ ○ ☆

علی حیدر ملک

ایک شہر........دو ناول

جوگندر پال (پیدائش: سیالکوٹ ۱۹۲۵ء) نے راقم الحروف کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میں نے ہجرتیں بہت کی ہیں جس کی وجہ سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں قتل ہوتا رہا ہوں۔ رام کو چودہ سال بن باس ملا تو بلڑ بچ گیا۔ اب تو ہر آدمی رام بنا ہوا ہے۔ میرا آیندہ ناول شاید اسی موضوع پر ہوگا لیکن اس کی شکل کیا ہوگی ابھی نہیں کہا جا سکتا۔" (روزنامہ "جسارت" کراچی' ۱۸ر اپریل ۱۹۸۶ء)

جوگندر پال نے ہجرت کے موضوع پر جو ناول لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا وہ کئی سال بعد "خواب رو" کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ ناول کراچی میں آباد ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں سے متعلق ہے جن کی شناخت ہی ہجرت ہے اور جو چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی اب تک مہاجر ہی کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

برصغیر جنوبی ایشیا ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کی سیاسی غلامی سے آزاد ہوتے ہی مختلف قسم کے آزار میں مبتلا ہو گیا۔ آزادی کے ساتھ ملک کی تقسیم یا ملک کی تقسیم کے ساتھ آزادی نے ہر طرف فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکا دی۔ لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے اور کروڑوں اپنا گھربار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اس لیے آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں ادب کا پہلا اور سب سے اہم موضوع یہی فسادات بنے۔ اس کے بعد سیاسی اکھاڑ پچھاڑ' ناانصافیوں' بدعنوانیوں' اقلیتوں اور کم زور طبقوں پر مظالم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شاعروں اور ادیبوں خصوصاً" فکشن لکھنے والوں نے ان موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی۔ اسی اثنا میں پاکستان دولخت ہو گیا اور بنگلہ دیش کے نام سے ایک نئی مملکت وجود میں آگئی۔ پاکستان کی اس شکست و ریخت نے پاکستانی ادیبوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ پھر یہ ہوا کہ راہی کی بھولی ہوئی منزل کے مصداق پاکستانی علاقوں سے ہندوستان جانے والے اور ہندوستانی علاقوں سے پاکستان آنے والے اہلِ قلم کو اپنے سابق وطن کی یاد ستانے لگی۔ اس حوالے سے جو ادب تخلیق ہوا اسے نوسٹلجیائی ادب کا نام دیا گیا۔ بعض ناقدین نے نوسٹلجیا کو ایک فطری عمل قرار دیا جب کہ بعضوں نے اسے منفی معنی پہنانے کی کوشش کی۔ ناقدوں نے اپنے فہم یا اپنی مصلحت کی بنا پر اس ادب کو جو بھی رنگ دینے کی کوشش کی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس حوالے سے سرحد کی دونوں جانب بہت توانا اور موثر ادب وجود میں آیا ہے۔ "خواب رو" کا شمار بھی اسی زمرے میں کیا جائے گا۔

جوگندر پال کے اس ناول کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

یہ لکھنؤ ہے۔ ملک کی تقسیم پر جب لکھنؤ کے مہاجرین کراچی چلے آئے تو ذرا سنبھلتے ہی انھوں نے یہاں بھی وہی امین آباد کا چوک کھڑا کرلیا۔ ویسے ہی یہاں بھی چھ سات راستے ٹوپیاں ٹیڑھی کیے ادھر ادھر سے بہ یک وقت آ داخل ہوتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا ادھر ہی چلی آرہی ہے۔ امین آباد میں آخر تل دھرنے کو جگہ نہ رہی اور مہاجرین امین آباد کے گردو پیش پاؤں جمانے لگے اور اس طرح ہوتے ہوتے پورا لکھنؤ آباد ہوگیا۔ صرف پرانا شہر ہی نہیں پرانے شہر کے بطن سے پیدا ہوکر نیا نویلا شہر بھی نواح میں اپنی کھلواڑ کا سماں باندھنے لگا۔ کہتے ہیں کہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں مگر مقامات ہمیشہ وہیں مقام کیے رہتے ہیں مگر یہاں تو مہاجرین دل ہی دل میں شہر کا شہر اٹھالائے۔ کوئی اپنے گھر کی اینٹیں، کوئی جوں کا توں پورا گھر، کوئی ساری گلی، کوئی گلی سے باہر تیز تیز چلتی ہوئی سڑک، جو بھی جس کے دل میں سمایا اور جب کراچی پہنچ کر ان کی سانس میں سانس آئی تو انھوں نے دلوں سے اینٹ اینٹ سارا شہر برآمد کرلیا۔ خدا جانے جہاں یہ شہر واقع تھا وہاں اب کیا رہ گیا ہوگا۔ یہاں تو اس کی چھبن کا یہ عالم ہے کہ کوئی کراچی کی سیر کو آئے تو اس سے بار بار پوچھا جاتا ہے۔ کراچی میں لکھنؤ دیکھا۔

ناول کے مرکزی کردار نواب مرزا کمال الدین ہیں جو دیوانے مولوی صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ دیوانے مولوی صاحب کا بڑا بیٹا نواب مرزا جوتوں کے ایک بڑے کارخانے کا مالک ہے مگر کارخانے کے مزدوروں اور اہل کاروں کے مابین مقامی اور غیر مقامی کی چپقلش سے پریشان ہے۔ ان کا دوسرا بیٹا اسحاق مرزا وکیل ہے اور اس نے ایک سندھی لڑکی سے شادی کرنے کے بعد سندھیوں کی ایک پرانی بستی میں بودوباش اختیار کرلی ہے۔ وہ مقامی آبادی میں شیرو شکر ہونے کی کوشش کررہا ہے۔

مصنف نے مہاجروں کے علاوہ دوسرے طبقوں اور آبادیوں کے مسائل کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اسحاق مرزا، سعودی عرب میں مقیم اپنے ماموں زاد بھائی ہاشم علی کو ایک خط میں لکھتا ہے:

غیر مقامی جب مقامی ہوجاتے ہیں تو مقامیوں کے غیر مقامی ہونے کی باری آجاتی ہے۔ چند ہی روز پہلے کا ذکر ہے کہ ہمارے لا کلب کے سالانہ ڈنر میں بہت سے وکلا جمع تھے اور خوب ہنس کھیل رہے تھے اور ہمارے اتنے بڑے ہنستے کھیلتے مجمع میں ایک واحد شخص تھا جو منہ دبائے بیٹھا تھا اور شاید کوئی منجھا ہوا وکیل ہونے کے باوجود صرف ہاں میں ہاں ملانے کے لیے اپنا سر ہلا دیتا تھا۔ میں سبھوں کو چھوڑ کر اس کی طرف سرک آیا اور اپنا تعارف پیش کیا۔ جواباً اس نے بھی اپنا نام بتایا۔ چندانی نام کا کوئی ہندو جج تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد اس کے سارے

رشتے دار ہندوستان چلے گئے تھے مگر اس کا اصرار تھا کہ سندھو دیش ہی اس کا اصل مقام ہے۔ کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں میرے بھائی کہ اس وقت ساری محفل میں ایک وہی شخص غیر مقامی معلوم ہو رہا تھا۔

ہندوستان اور پاکستان میں مہاجروں اور ان کے پیچھے رہ جانے والے لواحقین کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے اس کی جھلک بھی ناول میں موجود ہے۔ اسحاق مرزا اپنے ماموں زاد ہاشم کو ایک اور خط میں آگاہ کرتا ہے:

ایک نوجوان ہندوستانی سندھی وکیل اپنے باپ کا پرانا گھر اور شہر دیکھنے آیا ہوا تھا۔ وہ کسی کامن فرینڈ کا انٹروڈکشن لایا تھا تاکہ میں اس کی ہر ممکن مدد کروں جو میں کرنا بھی چاہتا تھا لیکن ابھی وہ ایک ہی بار کھانے پر میرے یہاں آیا تھا کہ دوسرے دن انٹیلی جنس کا ایک افسر میرے سر پر آسوار ہوا۔ آخر آپ کا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے؟ وہ بار بار پوچھتا رہا اور آخر جب میں نے اسے بتایا 'میں نے کلاسیکی فارسی شعرا کو بڑی معصوم عمر میں پڑھا ہے تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ پانے کے باوجود بگڑ گیا کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں اور آپ کیا جواب دے رہے ہیں۔ اس کے بعد اس کے آدمی کئی روز تک سائے کی طرح میرے پیچھے لگے رہے۔ سچ پوچھو تو ڈنر کے بعد اس کے ہم جنسوں کے خوف سے میں نے اس نہایت بھلے لڑکے سے ٹیلی فون پر بھی رابطہ نہ کیا۔ سوچتا ہوگا ہم لوگ کتنے بدتمیز ہیں......
اور سنتے جاؤ میرا کلرک ابھی دنوں ہندوستان کے اعظم گڑھ سے لوٹا ہے۔ کہہ رہا تھا کوئی بیس برس بعد ماں، بہن اور بھائی سے ملنے گیا تھا۔ وہاں کی سی آئی ڈی کو جب اس کی آمد کی خبر ملی تو وہ لوگ اس کی ماں سے یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس کا بیٹا اس سے کیوں ملنے آیا ہے یعنی بیس سال کی جدائی کے بعد بیٹے کی ماں سے ملنے کی معصوم سی بے تابی کسی بہت بڑی غیر ملکی سازش کا پیش خیمہ تو نہیں؟"

دیوانے مولوی صاحب کے گھر کے کئی افراد ایک بم دھماکے میں جو کہ لسانی منافرت کا شاخسانہ ہے' ہلاک ہو جاتے ہیں۔ مولوی صاحب اس جانکاہ حادثے کے بعد لکھنؤ واپس جانے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ ان کے پوتے سلیم کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس لکھنؤ کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ........ "لکھنؤ یہیں تو ہے بڑے ابا" ناول اسی فقرے پر ختم ہو جاتا ہے۔

آزادی کے بعد نقل مکانی کر کے سرحد کی دونوں طرف آباد ہو جانے والے لوگوں کے لیے یہ فقرہ ایک تلقین کی حیثیت رکھتا ہے جو بہ ظاہر غلط بھی نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ زندگی گزارنے کے لیے حقائق کو تسلیم کرنا اور ان سے مطابقت پیدا کرنا بہرحال ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ناول کی تخلیق کے بعد بھی کراچی میں بموں کے بہت سے دھماکے ہو چکے ہیں اور بہت سارا انسانی خون یہاں کی سڑکوں پر

بسہ چکا ہے۔ آبادیوں کے محاصرے، شہریوں کی بے تحاشا گرفتاریوں اور ماورائے عدالت قتل نے شہر کو ایک ذہنی کرب اور نفسیاتی اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ان حالات کے تناظر میں انتظار حسین (پیدائش۔ ڈبائی ضلع بلند شہر ۱۹۲۵ء) نے اپنا ناول "آگے سمندر ہے" (اشاعت ۱۹۹۵ء) پیش کیا ہے۔ ہجرت انتظار حسین کے ہاں کوئی نیا موضوع نہیں۔ یہ ان کے ہاں سب سے زیادہ حاوی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت سے افسانوں کے علاوہ ان کے پہلے تینوں ناول...... "چاند گہن" "بستی" اور "تذکرہ" بھی ہجرت ہی کے موضوع پر تصنیف کیے گئے ہیں مگر "آگے سمندر ہے" اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں پہلی بار کراچی کے پس منظر میں مہاجروں کے مسائل سے بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "آگے سمندر ہے" کے آغاز سے پہلے مصنف نے احمد مشتاق کا یہ شعر درج کیا ہے۔

وہی گلشن ہے لیکن وقت کی رفتار تو دیکھو
کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

ناول کا بیشتر حصہ خود کلامی اور مکالمے پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں دو مرکزی کرداروں جواد اور مجو بھائی کی گفتگو ہے جس میں وہ قیام پاکستان کے بعد کراچی شہر کے ابتدائی دنوں کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔

جواد کہتا ہے..... "تو آپ آدمی کی جڑیں شہر میں تلاش کرتے ہیں مگر شہر کی اپنی بھی تو جڑیں ہونی چاہییں۔"

مجو بھائی جواب دیتے ہیں...... "اماں باؤلے ہوئے ہو۔ سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی کہیں جڑیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ تو پانی پر تیرتا ہے۔"

کراچی شہر کے خراب حالات پر جواد کی پریشانی دیکھ کر مجو بھائی اسے مشورہ دیتے ہیں....... "سوچنا چھوڑ دو یا پھر اس شہر کو چھوڑ دو۔"

"آگے حضور کو کیا نظر آتا ہے؟" کے جواب میں مجو بھائی کہتے ہیں...... "سمندر۔"

ناول کا نام "آگے سمندر ہے" یہیں سے اخذ کیا گیا ہے اور یہ وہ الفاظ ہیں جو پاکستان کے ایک سابق سربراہ نے لسانی فسادات کے دوران کراچی کے مہاجروں سے دھمکی کے طور پر کہے تھے۔

جواد کی پھوپھی ہندوستان سے ایک خط میں اپنے بھتیجے کو لکھتی ہیں...... "پاکستان والوں نے ہمارے بھرے گھر کو اجاڑ کے رکھ دیا۔"

پیارے میاں پاکستان سے ہندوستان جا کر بڑی بھابھی سے جب یہ کہتے ہیں کہ...... "آپ نے ایسی بد دعا دی کہ میں ابھی تک بے ٹھکانا ہوں۔" تو بڑی بھابھی اس کے جواب میں کہتی ہیں...... "بد دعا میں نے نہیں دی۔ تمھاری زمین نے تمھیں بد دعا دی ہے۔ آباد زمین کو اجاڑنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ پیارے میاں زمین بھی کوستی ہے۔ ارے پاکستان میں آباد ہونے کے شوق میں ہمیں تو نہ اجاڑتے اور خاندان کا کھیل بکھروا تو نہ کرتے۔"

انتظار حسین اس ناول میں بھی اپنے خاص رجحانِ طبع کے مطابق تاریخ اور اساطیر میں سفر کرتے ہیں اور یہ تاریخی و اساطیری واقعات ناول کے مرکزی خیال پر کسی نہ کسی پہلو سے روشنی ڈالتے ہیں۔ صفحہ نمبر ۲۷۱ سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے.........

نریندر رکا اور جھجکتے جھجکتے بولا...... "گنیش ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھ۔"

"سری کرشن مہاراج تو بہت بدھی مان ہیں' بہت گیانی ہیں۔ انھوں نے کیا سوچ کر متھرا چھوڑا تھا؟"

"نریندر تونے میرے دل کا چور پکڑ لیا۔ یہ پرشن تو مجھے بھی بیکل رکھتا ہے۔"

"شاید!" .... نریندر رکتے رکتے بولا ...... "شاید انھوں نے اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر .... شاید ...."

"صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ اچھا نہیں کیا۔"

شہر میں گڑبڑ ہے۔ جواد گولی لگنے کے بعد زخمی حالت میں مجو بھائی کی تلاش میں گھر سے نکلا تو اس کے اپنے الفاظ میں .... "دہلیز سے قدم نکالتے نکالتے میں ٹھٹکا۔ یہ کون سا شہر ہے۔ وہی شہر۔ تو پھر میں وہی نہیں ہوں۔ اس جانے بوجھے شہر میں اچانک میں اجنبی بن گیا تھا۔"

اور اسی عالم میں وہ حال سے ماضی کی طرف مراجعت کر جاتا ہے .... "دونوں وقت مل رہے تھے۔ مل کر جدا ہو رہے تھے۔ پھر چراغ کیوں روشن نہیں ہوئے .... آگ بجھ چکی تھی۔ خلقت کہ یہاں امنڈی ہوئی تھی' تتر بتر ہو چکی تھی۔ باب الرملہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ راکھ بہت اڑ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں کوئی ادھ جلا ورق کسی دیوان کا' کسی صحیفہ کا' کسی فیلسوف کے مخطوطے کا' کسی صوفی کے ملفوظات کا۔ باقی سکوت تھا۔ صرف ایک بلی بیچ راہ میں بیٹھی اپنی کنجی ایسی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔"

اور انھی سطروں کے ساتھ ناول اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

ہندوستانی مسلم جو ہند اسلامی کلچر کے پروردہ اور داعی تھے۔ ڈیڑھ سو سال سے مسلسل قربانیاں دیتے چلے آ رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء ...... ۱۹۴۷ء .... ۱۹۷۱ء .... ۱۹۹۵ء ان لا متناہی قربانیوں کے بڑے سنگ ہائے میل ہیں۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی بے مثال قربانیاں ہی نہیں دیں بلکہ بہت سے آدرشوں کو ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوتے ہوئے بھی دیکھا اور ان کے بہت سے خوابوں کی تعبیریں الٹی بھی نکلیں۔ آیندہ کیا ہوگا؟ کیا قربانیوں کا یہ لامتناہی سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا یا یہ کبھی بار آور بھی ہوں گی؟ اس سلسلے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ بہت سے مقدمے وقت کی عدالت میں زیرِ سماعت ہیں اور بہت سے فیصلے مستقبل کی کوکھ میں محفوظ ہیں۔ اگر کوئی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے تو بس یہ کہ ان سارے حالات و واقعات کو بہرحال ایک منطقی انجام تک پہنچنا ہے۔ تیز رفتار بیسویں صدی اپنے اختتام پر ہے اور ایمان و آگہی' تاریخ و جغرافیہ' تہذیب و ثقافت' نظام و اقدار سب کچھ اس کی بے رحم تغیر پسندی کی زد میں ہیں۔ آج جو چیزیں ہمارے وہم و گماں میں بھی نہیں ہیں عین ممکن ہے کل وہ

حقیقتوں کی صورت میں ہمارے سامنے آ کھڑی ہوں اور آج جو اٹل حقیقتیں نظر آتی ہیں کل خواب و خیال بن جائیں۔ اس وقت کراچی کے بارے میں جو ناول لکھا جائے گا وہ جوگندر پال کے "خواب رو" اور انتظار حسین کے "آگے سمندر ہے" سے یقیناً مختلف ہوگا۔ جوگندر پال (حال مقیم دہلی) اور انتظار حسین (حال مقیم لاہور) نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کراچی کو پیش کیا ہے۔ جوگندر پال کے یہاں موجودہ حالات سے مفاہمت کا رویہ پایا جاتا ہے جب کہ انتظار حسین نے حال کو تاریخ اور اساطیر کا آئینہ دکھا کر نتیجہ اخذ کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ دونوں ناول یقیناً اچھے اور اہم ناول ہیں لیکن انھیں بڑے ناول ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا کیوں کہ ان کے ذریعے کراچی کی مکمل اور بھرپور تصویر سامنے نہیں آتی۔ دنیا میں مہاجروں کے سب سے بڑے شہر کراچی کے تہ در تہ مسائل' اس کے ساتھ روا رکھی جانے والی زیادتیاں اور ناانصافیاں اور یہاں کے باشندوں کی خاص نفسیات دونوں ناول نگاروں کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ دونوں ناول نگاروں کا تعلق مستقل طور پر کراچی سے نہیں ہے۔

کراچی اپنی ہیئتِ ترکیبی اور ہمہ جہت اہمیت کی بنا پر اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے حوالے سے ایک بھرپور اور بڑا ناول لکھا جائے جو اس شہر کو پورے پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ وسیع تناظر میں پیش کرسکے۔ یہ ناول کون لکھے گا اور کب لکھے گا؟...... یہ کہنا قبل از وقت ہے۔

☆ ○ ☆

مبین مرزا

دروغ بر گردنِ راوی

دروغ بر گردنِ راوی...... لیکن سننے میں یہی آیا ہے کہ ایک بار ن م راشد نے افتخار جالب کی کسی تحریر کو پڑھ کر کہا تھا کہ افتخار جالب کی یہ حرکت ایسی ہے جیسے کوئی اپنا نام اخبار میں چھپوانے کے لیے کسی پر قاتلانہ حملہ کردے۔ کوششِ بسیار کے باوجود ہمیں یہ تو آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ افتخار جالب کی وہ کون سی تحریر تھی جسے پڑھ کر راشد صاحب کو اپنے اوپر قاتلانہ حملے کا گمان گزرا' البتہ سہ ماہی "بادبان" کراچی کی حالیہ اشاعت (شمارہ ۴) میں شائع شدہ بعض تحریروں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ افتخار جالب کی تحریر کے بارے میں راشد صاحب کا خیال درست ہو یا نہ ہو مگر ان تحریروں کا تعلق کسی نہ کسی عنوان ادب میں قاتلانہ حملے سے ضرور ہے۔

قاتلانہ حملے کے اس ذکر پر آپ کو چونکنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے ادب کی تاریخ میں اس کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ ہمارے ادب میں قاتلانہ حملوں کی بھی ایک بہت مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔ اس روایت میں قاتلانہ حملوں کی نوعیت' طریقۂ واردات' غرض و غایت اور قاتل و مقتول کے بدلتے ہوئے کرداروں کی بدولت جو تنوع پایا جاتا ہے' اس کا اندازہ درج ذیل چند مثالوں سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔

قاتلانہ حملوں کی ایک قسم تو وہ ہے جس کا ثبوت ہمیں اپنی غزلیہ شاعری میں اس قسم کے اشعار سے ملتا ہے۔

خنجر نے ترے دیا نہ پانی
ترسا ترسا کے مار ڈالا

....

خنجر پہ کوئی چھینٹ نہ دامن پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

....

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اور دوسری قسم وہ ہے جس میں واردات کے بعد حملہ آور فاتحانہ انداز میں کچھ اس قسم کے نعرے لگاتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔

اختر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

اور تیسری قسم وہ ہے جس کی متعدد مثالیں ہمارے آج کے تنقیدی ادب میں شمیم احمد مرحوم جیسے نقادوں کی تحریروں سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس باب میں مرحوم کا یہ امتیازی وصف بہ طورِ خاص مشہور ہے کہ وہ ادب میں اپنے ناپسندیدہ عناصر کو ٹھکانے لگانے کے لیے قلم کی بجائے نوکِ شمشیر استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کا وار اس قدر کاری ہوتا تھا کہ جس کسی پر بھی پڑا بچتا نظر نہ آیا۔

شمیم احمد کے بعد اندیشہ تھا کہ ہمارے ادب میں قاتلانہ حملوں کی یہ روایت جمود کا شکار ہو کر رہ جائے گی لیکن ان کے بعد پہلے تو ساقی فاروقی نے اس روایت کو اپنے مخصوص طریقۂ واردات کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا جیسے کشتگانِ جفا کے حوالے سے جاری رکھا اور اب سہ ماہی "بادبان" کراچی میں اس انداز کی کم از کم دو تحریریں ایک ساتھ دیکھنے سے کچھ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اب اس نے اس روایت کو ایک نئے انداز اور نئے طریقۂ واردات کے ساتھ آگے بڑھانے کی ٹھانی ہے۔

"بادبان" کے حالیہ شمارے میں شائع ہونے والی مذکورہ بالا دو تحریروں میں سے ایک کا عنوان ہے "بابائے اردو کا مقدمہ"۔ یہ اس پرچے کا اداریہ ہے جس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی زندگی کے آخری ایام کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ وہ جولیس سیزر کی طرح اپنے دوست نما دشمنوں کے ہاتھوں ہلاک ہوگئے، لیکن ان میں اور جولیس سیزر میں فرق یہ ہے کہ جولیس سیزر کے برعکس وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے اردگرد جمع ہونے والے سازشی عناصر میں وہ کون لوگ ہیں جو ان پر شب خون مارنے کی تیاریاں کررہے ہیں۔ "بادبان" کے اداریہ نویس کے بہ قول ان گندم نما جو فروشوں نے برادرانِ یوسف کا کردار ادا کرتے ہوئے مولوی صاحب کو طرح طرح سے ہراساں کرکے بالآخر "انجمن ترقیٔ اردو" اور "ترقیٔ اردو بورڈ" (موجودہ ڈکشنری بورڈ) سے مستعفی ہونے پر مجبور کردیا۔ مولوی صاحب نے "ترقیٔ اردو بورڈ" کی لغت کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے جو استعفیٰ دیا تھا اس کے بارے میں شان الحق حقی صاحب کی جانب سے مختلف اوقات میں جاری ہونے والے مختلف بیانات کے حوالے سے انھیں مولوی صاحب کا ناطقہ بند کرکے ان کی ایذا رسانی کا مرتکب قرار دیتے ہوئے اداریہ میں کہا گیا ہے کہ حقی صاحب ادب میں اپنی ساکھ اور اپنا اعتبار اس حد تک کھو چکے ہیں کہ اب "اگر وہ قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر بھی کچھ کہیں گے تو کوئی لکھنے والا ان کی بات کا یقین نہیں کرے گا۔" اور یہ کہ :

> اگر حقی صاحب میں ادبی غیرت نام کی کوئی شے ہوتی تو وہ اردو زبان بولنے والوں کے سامنے اپنے ان سیاہ کارناموں کے لیے معافیاں مانگتے جن کی وجہ سے ایک بوڑھا آدمی مرتے وقت بھی ناقابل برداشت اذیت کا ہدف بنا رہا۔

اب قطع نظر اس بات سے کہ حقی صاحب جیسے بزرگ ادیب کے بارے میں مدیر "بادبان" اپنے غیظ و غضب کا یہ انداز اختیار کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں' ان کے غم و غصہ اور اشتعال سے لبریز اس رویے کو دیکھتے ہوئے کم از کم ہمارے لیے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اس قسم کی باتوں سے ان کا مقصد بابائے اردو کے مقدمہ کی پیروی کرنا ہے یا حقی صاحب پر گرج برس کر اپنے دل کا بخار نکالنا اور خود کو pesify کرنا۔ بہر حال واقعہ جو بھی ہو' لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس قسم کی تحریریں نہ تو اردو زبان و ادب کو کوئی فایدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ ہی خود "بادبان" جیسے جریدے کے حق میں کسی طرح سودمند ثابت ہو سکتی ہیں۔

رہا "بادبان" کے مدیر محترم کا مشفق خواجہ صاحب سے یہ مطالبہ کہ وہ ان سازشی عناصر کو بے نقاب کریں جو بابائے اردو کے خلاف ہونے والی سازشوں کے اصل کردار کی حیثیت سے ان کی ہلاکت کے ذمہ دار قرار دیے جا سکتے ہیں تو ہمیں نہیں معلوم کہ مشفق خواجہ صاحب ان معاملات سے کس حد تک واقف ہیں جن کی طرف "بادبان" کے اداریے میں اشارہ کیا گیا ہے' اور وہ اپنے سارے ادبی اور تحقیقی کام چھوڑ کر مدیر "بادبان" کی تسکین خاطر کے لیے اس ضمن میں اپنی جانب سے کوئی وضاحت پیش کرنا بھی چاہیں گے یا نہیں؟ تاہم بابائے اردو کا جو مقدمہ ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم کے نام مولوی صاحب کے کوئی چالیس پینتالیس سال پرانے چند خطوط کی بنیاد پر بنایا گیا ہے وہ آج سے کوئی پچیس ۲۵ سال پہلے "نیا دور" کراچی کے ایک شمارے میں چھپ کر بڑے پیمانے پر موضوع گفتگو بھی بن چکے ہیں۔ سو ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک اس قدر پرانے قضیے کو آج از سر نو چھیڑنے سے مدیر محترم کا مقصد کیا ہے' اور اس سے اردو زبان و ادب کا کیا بھلا ہو سکتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب مرحوم کے ساتھ زیادتیاں اور ناانصافیاں بھی ہوئی ہیں لیکن اول تو ان کے ذمہ دار عناصر کی مذمت ہر دیانت دار اور سچے ادیب کی طرف سے پہلے بھی کی گئی ہے اور ہر genuine ادیب آج بھی اس کی مذمت ہی کرے گا۔ (ویسے مذمت کے سوا بے چارے ادیب اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟) دوسرے مولوی صاحب کے ساتھ جو بھی اچھا برا سلوک ہوا' وہ اب اردو زبان و ادب کی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ لہٰذا اب اس قضیے کو اتنی مدت گزرنے کے بعد از سر نو چھیڑ کر گڑے مردے اکھیڑنے سے مولوی صاحب کی روح کو کون سی خوشی حاصل ہوگی؟ یہ بات ہمارے لیے بعید از فہم ہے۔ یوں بھی اگر ادیبوں اور شاعروں سے تعلق رکھنے والے تیس تیس اور چالیس چالیس سال پرانے قضیے اور مناقشے آج ایک بار پھر تازہ کیے جانے لگے تو ہمارے نزدیک اس سے دنیائے ادب کی فضا کو جو پہلے ہی کچھ ایسی خوش گوار نہیں مزید مکدر اور پراگندہ کرنے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو سکے گا۔

"بادبان" میں شایع ہونے والی دوسری تحریر سے جمیل الدین عالی کے شاعرانہ مرتبہ و مقام' ان کی

ادبی شہرت، علمی ساکھ اور ذاتی کردار پر قاتلانہ حملے سے تعبیر کرنا غلط نہ ہوگا، اس پرچے میں "سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس عنوان کے تحت "تراجم علمائے حدیث ہند" نامی تذکرے کے ایک ایسے صفحے کا عکس شائع کیا گیا ہے جس میں تذکرے کے مولف مولانا ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی نے نواب ضمیر الدین احمد (رئیس لوہارو) مرحوم کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ ایک پرانی وضع اور قدیم حال دقال کے بزرگ عالم دین تھے جو اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور عالی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے چند کتابیں بھی لکھیں مگر دوسروں کے نام سے شائع کرادیں۔ بہترین غزلیں اور مرصع قصائد لکھے مگر وہ بھی شاہانہ فیاضیوں کی بدولت اوروں کو بخش دیے۔ نواب صاحب کے حالات یہاں تک بیان کرنے کے بعد تذکرہ نویس کا قلم اچانک غیر متوقع طور پر ایک ناقابل یقین سمت میں مڑجاتا ہے اور وہ نواب صاحب کی شاعری کے کھاتے میں کچھ دوہوں اور گیتوں کا اضافہ کرنے کے بعد ان کے ایک رشتے کے پوتے جمیل الدین کا ذکر کرنے لگتے ہیں جو ان کے بہ قول اپنے دادا کی شاعری کے سارے اثاثے پر ہاتھ صاف کرکے پاکستان سدھار گئے اور وہاں جاکر عالی تخلص اختیار کرلیا۔

مولف تذکرہ کے اس غیر متوقع اور حیرت انگیز بیان کی تائید و تصدیق ایک غیر معروف ہفت روزہ "پنج لوک" میں شائع شدہ تین مختلف راویوں کے ان بیانات سے بھی ہوتی ہے جنھیں "بادبان" کے حالیہ شمارے میں "تراجم علمائے حدیث ہند" کے متعلقہ صفحہ کے عکس کے ساتھ یک جا کرکے شائع کیا گیا ہے۔ یہ تینوں راوی ادبی چوری کے اس واقعے کی روایت میں ایک دوسرے سے متفق ہیں کہ جمیل الدین عالی اپنے رشتے کے دادا نواب ضمیر الدین احمد عالی کے انتقال پر ان کے سارے کلام پر قابض ہوئے اور ملکیت کو پختہ کرنے کے لیے خود بھی عالی تخلص اختیار کرلیا۔ "تراجم علمائے حدیث ہند" کی روایت کی بنیاد پر ادبی چوری کے اس واقعہ کی تصدیق و تائید میں ایک چھوڑ تین راویوں کو متفقہ طور پر ایک دوسرے کا ہم نوا اور ہم زبان پاکر ہمیں بھی واقعہ کی صحت میں شک کرنے کا کوئی جواز نظر نہ آیا۔ نتیجہ یہ کہ عالی صاحب کے شاعرانہ مرتبہ و مقام کا جو نقش ہمارے ذہن میں قایم تھا اس کا رنگ پھیکا پڑگیا اور ساتھ ہی ان کی شاعرانہ حیثیت بھی ہماری نظر میں مشکوک ہوکر رہ گئی۔ چناں چہ جس کلام کو ہم اب تک ان کا کلام سمجھتے آئے تھے اس پر نواب ضمیر الدین احمد عالی کا کلام ہونے کا گمان گزرنے لگا۔ اتفاق سے جمیل الدین عالی کا پہلا شعری مجموعہ "غزلیں، دوہے، گیت" تو ہمارے پاس موجود ہی تھا سو ہم نے اسے پوتے کی بجائے دادا کا کلام سمجھ کر اٹھایا اور اس کلام کے آئینے میں دادا کی شخصیت کا اندازہ کرنے کے لیے اسے ابتدا سے پڑھنا شروع کیا۔ مجموعے کی پہلی ہی غزل (جسے ہم پہلے بھی کئی بار پڑھ چکے تھے) تمام کی تمام اس رنگ کے اشعار پر مشتمل تھی۔

یوں تو نہ رہ سکوں گا میں اے تگ غلط خرام
یا کوئی منزل سکوں یا کوئی راہ بے مقام
خواہش زندگی کے ساتھ کاہش زندگی بھی تھی
اب نہ وہ میری آرزو اب نہ وہ میرے انتظام
کچھ تو یہ نشتر وجود جس کی خلش سے جاں فگار
کچھ تری رہ کی مشکلیں جن سے ہے روح بے قیام
تم جو فقیر دوست ہو تم جو ہو صاحب نگاہ
ہم بھی ہیں آل میر درد ہم بھی ہیں صاحب مقام

ہم نے اس غزل کو نواب ضمیرالدین عالی کی غزل مان کر اس کے اشعار پر غور کیا تو ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ جمیل الدین عالی کے دادا اور یہ رنگ کلام؟ ان کے دادا کم و بیش داغ کے زمانے کے بزرگ تو ضرور ہی رہے ہوں گے۔ لہٰذا ہمارا خیال تھا کہ ان کا کلام بھی کم و بیش داغ ہی کے رنگ کا ہوگا۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ ان کے بعد والی اگلی نسل یعنی جمیل الدین عالی کے چچا نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی اور بیخود دہلوی کے زمانے کی دلی پر بھی داغ کے رنگ کے اثر کی گواہی کم از کم اس قسم کے اشعار سے ضرور مل جاتی ہے۔

یہ مسجد ہے یہ مے خانہ تعجب اس پہ آتا ہے
جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

....

تمہیں رنگیں سے شیخ مرغوب کیا ہے گلابی ہو یا زعفرانی کہو تو
پلائے کوئی ساقی حور پیکر مصفا' کشیدہ' پرانی' کہو تو

اور

شمع میرے ہی جلانے کو تو ٹھنڈی کردی

سو جب جمیل الدین عالی کے چچا اور ان کے معاصرین کے کلام کا یہ رنگ تھا تو دادا کے کلام پر تو داغ یا داغ کے معاصرین کا اثر اور بھی زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن "غزلیں' دوہے' گیت" کی اس پہلی غزل کے اشعار کا تو کوئی تعلق نہ داغ سے ہے نہ امیر مینائی اور ریاض خیر آبادی یا ان کے دیگر معاصرین سے' یہ تو آواز ہی کوئی اور ہے۔ علاوہ ازیں اس غزل کے ایک شعر سے پتا چلتا ہے کہ شاعر کا تعلق آل میر درد سے ہے۔ سو اتنی بات تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ جمیل الدین عالی اپنی ننھیال کی طرف سے آل میر درد سے تعلق رکھتے ہیں (*)۔ جب کہ نواب ضمیرالدین احمد (رئیس لوہارو) مرحوم کے بارے میں ہمیں یہ بات تحقیق سے معلوم ہوئی کہ ان کا کوئی نسبی تعلق آل میر درد سے نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ کم از کم یہ غزل

تراں کی نہیں ہو سکتی۔

سو بسم اللہ ہی غلط ہوتے دیکھ کر ہم نے غزلوں کی بجائے دوہوں کا جائزہ لینے کی ٹھانی۔ لیکن دوہوں پر تو جمیل الدین عالی کی شخصیت کی چھاپ ان کی غزلوں سے بھی کہیں زیادہ گہری نظر آئی۔ مزید برآں ایک اہل حدیث کا مسلک رکھنے والے عالمِ دین سے اس قسم کے دوہوں کو منسوب کرنا ہمیں یوں بھی کچھ اچھا نہ لگا کہ۔

دیکھا تو آخر چولی سے کیا چیز یہ ابھری آئے
گوری ہم تو چنگی بابو ہم سے کیوں شرمائے

....

عالی اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تہوار
ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیا کہہ گئی نار

....

دو اندھیاروں میں کل عالی بن گئی اپنی بات
ایک طرف تھی دکنی ابلا ایک طرف تھی رات

....

صبح جو اٹھ کر چلی وہ پاتر آیا دل میں دھیان
وہی عورت لے پانچ روپے اور وہی عورت لے جان

پھر جمیل الدین عالی کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ اپنی سیر و سیاحت کے طویل دورانیوں میں دیس بدیس کی جن الھڑ ناریوں اور مختلف شہروں اور خطوں کی جن سندر گوریوں سے ملے' ان کی بڑی دلکش اور اچھوتی تصویریں انھوں نے اپنے دوہوں میں کھینچی ہیں۔ ان میں کوئی پورب کی ابلا ہے کوئی دکن کی ابلا' کوئی نرم بدن کی گھائن ہے تو کوئی سخت بدن کی دیہاتن' کوئی سانوری بنگلہ ناری ہے تو کوئی پنجاب کی نار' کوئی کچے محل کی رانی ہے اور کوئی سو خصمی ناگن۔ پھر انھی میں واہ کی کنواری بھی ہے اور شاعر کو آوارہ اور افسر کو مزدور کہنے والی لاہور کی تیکھی بانکی مغرور حسینہ بھی۔ بیر بہوٹی رنگ والی انگریز ناری بھی ہے اور الگ تھلگ چپ چاپ رہنے والی فرانسیسی ابلا بھی۔ ٹھوس جوانی والی جرمن لونڈیا بھی ہے اور رمبا سمبا ناچنے والی بدیسی نار بھی۔ برقع پوش پٹھانی بھی ہے اور گدرائے بدن والی مراٹھن بھی۔ غرض کے چین سے لے کر لندن تک ایک ہی نانکہ بھید کا سراغ دینے والے یہ تمام دوہے جمیل الدین عالی کی زندگی کے جس رخ اور ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات کے جس پہلو کو expose کرتے ہیں اس کا بھی کوئی تعلق ہمیں ایک پرانی وضع کے اہل حدیث بزرگ اور عالم دین کی زندگی اور شخصیت سے نظر نہ آیا بلکہ ایسے دوہوں کو ان سے منسوب کرنا ہمیں ان کے وقارِ دینی اور شعارِ مذہبی کے بھی صریحاً خلاف معلوم ہوا۔ اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ نواب ضمیر الدین احمد عالی اگر آج زندہ ہوتے تو وہ خود بھی اس قسم کے دوہوں کو اپنے نام

سے منسوب ہوتا دیکھ کر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے کہ۔

یہ من جس پر سو سو کنواری کنوار پتا دے تول
اک سوکھی ناگن اس کو مارگئی بے مول

....

پورب کی ابلا' دکن کی ابلا' اور پنجاب کی نار
عالی اپنے دل پر سب کے گہرے گہرے وار

....

کچے محل کی رانی آئی رات ہمارے پاس
ہونٹ پہ لاکھا' گال پہ لالی آنکھیں بہت اداس

....

تیس روپے میں بیس ہیں اس کے' دس لیوے دلال
اتنا مہنگا شہر اور اس میں اتنا سستا مال

اس احساس کے ساتھ ہی جمیل الدین عالی پر اپنے دادا کے کلام کی چوری کا جو یقین ہمارے دل میں "تراجم علمائے حدیث ہند" کی روایت اور ایک نہیں تین تین راویوں کی تصدیق و تائید کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا' اس کی جڑیں ہلنے لگیں۔ لیکن شک کا ایک ہلکا سا کانٹا ابھی دل میں کھٹک رہا تھا۔ چناں چہ ہم نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ اس تلاش میں آگے چل کر ہماری نظر جمیل الدین عالی کے ان دوہوں پر پڑی جو ان کی زندگی کے اس ابتدائی دور کا حال بیان کرتے ہیں جسے خود انھوں نے "بابو گیری" والے دور کا نام دیا ہے۔

بابو گیری کرتے ہوگئے عالی کو دو سال
مرجھایا وہ پھول سا چہرہ بھورے پڑگئے بال

....

دھیرے دھیرے کمر کی سختی کرسی نے لی چاٹ
چپکے چپکے من کی شکتی افسر نے دی کاٹ

....

کیا جانے یہ پیٹ کی آگ بھی کیا کیا اور جلائے
عالی جیسے مہاکوی بھی "بابو جی" کہلائے

اور آگے بڑھے تو عالی صاحب کے مسلسل دوہوں میں "پاکستان کتھا" اور "پنڈی دیس" والے دوہوں کے علاوہ مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلہ دیش) کی بنگلہ ناری والے ان خوب صورت دوہوں پر نظر پڑی جن میں انھوں نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کا نچوڑ یوں پیش کیا ہے۔

باتیں بہت سنی عالی کی اب سن لو یہ بانی
جس نے بنگلہ نار نہ دیکھی وہ نہیں پاکستانی
پیچھے ناچیں ڈاب کے پیڑ اور آگے پان سپاری
ان ناچوں کی تھاپ سے ابھرے سندر بنگلہ ناری
سندر بنگلہ ناری جس کی آنکھیں پریم کٹورے
آنکھیں پریم کٹورے جن میں دکھوں کے کتنے ڈورے
دکھوں کے ڈورے مٹ جائیں گے گر کوئی پیار سے چوے
لیکن پیار سے چومنے والا دریا دریا گھومے

غرض جوں جوں آگے بڑھتے ہمیں پورا یقین ہوتا چلا گیا کہ ان دوہوں کو پوتے کی بجائے دادا کے دوہے قرار دینا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہ قول کوئی چند ہار تک جس آدمی نے دوہے کی صنف کو اردو میں ایسا رچا بسا دیا کہ وہ نہ صرف اردو کی صنف ہو گئی بلکہ وہ اس سے اور وہ دوہے سے منسوب ہو کر رہ گیا' اس کے دوہوں کو ایک ایسے شخص کے دوہے قرار دینا جو دنیائے ادب میں بہ حیثیت دوہا نگار کے متعارف ہی ہو اور نہ ہی جس کا کوئی دوہا آج تک کسی ادبی پلیٹ فارم' مشاعرے' جریدے یا کتاب کے حوالے سے منظرعام پر آیا ہو' یقیناً انتہائی نا سمجھی اور سخن ناشناسی کے مترادف ہے۔ اور پھر یہ کہ جمیل الدین عالی کے دوہوں پر ان کی شخصیت کی چھاپ اتنی گہری اور dominant ہے کہ انہیں کسی دوسرے کے نام سے منسوب کرنے کا خیال بھولے سے بھی کسی کے دل میں نہیں آسکتا۔

تاہم ہماری اس بات سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہو گا کہ عالی صاحب کے دوہوں کو تو کسی اور کے دوہے قرار دینا ممکن نہیں' البتہ ان کی غزل پر مال مسروقہ ہونے کا گمان ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کی غزل کو تو مولف تذکرہ مولانا ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی پہلے ہی غیر مبہم الفاظ میں یہ کہہ کر اس الزام سے بری قرار دے چکے ہیں کہ نواب ضمیرالدین احمد نے جو بہترین غزلیں (اور مرصع قصائد) لکھے وہ اپنی شاہانہ فیاضیوں کی بدولت اوروں کو بخش دیے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اوروں کو بخش دینے کے بعد تو غزلوں میں جمیل الدین عالی کے قبضہ اور تصرف کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچ سکتا۔ اور یہ تو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ عالی صاحب کی غزل پر بھی ان کی شخصیت کی چھاپ اس قدر واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ اسے کسی اور کے نام سے منسوب کرنا کسی بھی طور ممکن نہیں۔ غرض کہ عالی صاحب کی غزلیں ہوں یا دوہے اور گیت' ان کے کلام کی داخلی شہادت بجائے خود اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہے کہ یہ کلام جمیل الدین عالی کے سوا کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ ان کے کلام میں ان کی شخصیت جس طرح اپنی تمام تر diversity اور افتادِ طبع کے ساتھ موجود ہے اس کا کوئی بھی تعلق کسی ایسے عالم دین کی شخصیت سے نہیں ہو سکتا جسے مولف تذکرہ پرانی وضع اور قدیم حال و قال کا بزرگ قرار دیتے ہیں۔ ہاں اگر جمیل الدین عالی پر اپنے دادا کے کلام کی چوری کا الزام عاید کرنے والے ثبوت کے طور پر کچھ

نشاندہی مال مسروقہ کی بھی کر دیتے تو بات اور تھی لیکن مال مسروقہ کی نشان دہی کے بغیر ان پر خواہ مخواہ چوری کا الزام کم از کم ہمیں تو بہتان بازی اور تہمت تراشی کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہوتا۔

بہرحال عالی صاحب پر اپنے دادا کے تخلص اور کلام کو لے اڑنے کا الزام لگانے میں تین تین راویان روایت کا ایک دوسرے سے متفق ہونا ہمارے لیے حیرت کا باعث ضرور بنا۔ اور چوں کہ ان تینوں راویوں کے بیان کی بنیاد "تراجم علمائے حدیث ہند" نامی تذکرے کی جس روایت پر ہے اس کے راوی یعنی تذکرے کے مولف مولانا ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی کے بارے میں ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں کہ وہ خواہ مخواہ کسی پر بے بنیاد الزام بھی لگا سکتے ہیں' لہٰذا یہ معاملہ باعث حیرت ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے قدرے ناقابل فہم بھی ٹھہرا۔

صورت احوال پر غور کرتے ہوئے معاً" یہ خیال آیا کہ اس معاملے کی وضاحت کے لیے کیوں نہ براہ راست عالی صاحب ہی سے رجوع کیا جائے۔ ہمیں ان سے رابطہ تو یوں بھی قائم کرنا ہی تھا کہ اس بار "مکالمہ" میں ہم ایک گوشہ ان کے لیے مخصوص کر چکے تھے۔ اس گوشہ کے لیے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضامین پہلے ہی موصول ہو کر کمپوز ہو چکے تھے۔ اب صرف عالی صاحب سے ان کا کلام حاصل کرنا باقی تھا جس کے لیے ہم ان کی اسلام آباد سے واپسی کے منتظر تھے۔ سو ان کے کراچی آنے پر ہم وقت لے کر ان کے پاس پہنچے اور ان سے "بادبان" میں شایع ہونے والے مواد کے حوالے سے ان کے دادا نواب ضمیرالدین احمد خاں عالی کے تخلص اور کلام کے بارے میں استفسار کیا۔ جواب میں انھوں نے بتایا کہ نواب ضمیرالدین احمد عالی میرے دادا نہیں سگے چچا تھے اور ساتھ ہی ان کے بارے میں چند باتیں مختصر بیان کرتے ہوئے مولف تذکرہ کے بارے میں فرمایا کہ جب میرے چچا کے بارے میں ان کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ وہ انھیں میرے چچا کی بجائے رشتے کے دادا بتاتے ہیں تو اس سلسلے میں موصوف کی دیگر معلومات کس حد تک قابل اعتبار ہو سکتی ہیں' اس کا اندازہ آپ خود ہی لگا لیجیے۔

ہم نے عرض کیا کہ خیر' دادا نہ سہی چچا ہی سہی مگر تخلص تو آپ کا بھی وہی ہے جو آپ کے چچا کا تھا۔ عالی صاحب نے فرمایا کہ بے شک مگر میں نے کبھی اس بات کو چھپایا نہیں۔ یہ بات میرے انٹرویوز اور مضامین وغیرہ میں پہلے ہی سے ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ تخلص میرا اپنا نہیں بلکہ مجھے اپنے چچا نواب ضمیرالدین احمد عالی سے ملا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں اپنے ایک پرانے مضمون "میں اور میرا فن" کا حوالہ دیا جو اولاً" حیدر آباد (سندھ) سے نکلنے والے "شعور" نامی ادبی جریدے کے شمارہ نمبر ۲۔ ۳ میں آج سے کوئی پینتیس سال پہلے شایع ہوا اور جسے راول پنڈی کے ماہنامہ "چہار سو" نے اپنے نومبر' دسمبر ۱۹۹۵ء کے شمارہ نمبر ۳۹۔ ۳۸ میں مکرر شایع کیا ہے۔ اس مضمون میں عالی صاحب لکھتے ہیں :

> تخلص میرا اپنا نہیں۔ میرے چچا نواب ضمیرالدین خاں' عالی تخلص کرتے تھے لیکن وہ اہل حدیث کے پیشوا تھے اور بڑے متقی پرہیزگار بزرگ۔ جب میں نے ان سے "جنگ نامہ" اور "انوار سہیلی" پڑھ لیے تو شاید میری بدشوقی کی بنا پر

انھوں نے اندازہ لگایا کہ مجھ سے فارسی صرف و نحو نہیں چلے گی نہ کوئی اور ڈھنگ کا کام ہو گا۔ چناں چہ انھوں نے کہا کہ بھئی ایک تخلص اچھا تھا لیکن میں تو اپنی خشک مزاجی' ادق گوئی اور فارسی گوئی کے سبب اس میدان میں نام پیدا نہیں کر سکا۔ تم اردو سے شوق رکھتے ہو' یہ زمانہ بھی اردو کا ہے سو یہ تخلص تم لے لو۔ یہ بات یہ بات ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کی ہے۔

علاوہ ازیں عالی صاحب نے اپنے تخلص کے سلسلے میں ایک دلچسپ انکشاف یہ بھی کیا کہ اصلاً "تو یہ تخلص ان چند تخلصوں میں سے ایک ہے جو غالب نے میرے دادا نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کے لیے تجویز کیے تھے (یعنی علائی' عالی اور نسیمی وغیرہ) مگر انھوں نے ان میں سے اردو کے لیے علائی اور فارسی کے لیے نسیمی چن لیے اور عالی سمیت بقیہ تخلص چھوڑ دیے۔ لہٰذا آپ اسے میرے دادا علاؤالدین علائی کا چھوڑا ہوا تخلص بھی کہہ سکتے ہیں جو میرے چچا نواب ضمیرالدین احمد عالی سے ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا ہے۔

اب تو ہمیں بھی خیال آیا کہ تخلص کا اشتراک تو دنیائے ادب میں اس قدر عام ہے کہ اس کی بے شمار مثالیں ماضی و حال کے اکثر شعرا کے ہاں مل جاتی ہیں۔ ورنہ یوں کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حفیظ جونپوری کا تخلص حفیظ ہوشیار پوری اور حفیظ جالندھری دونوں لے اڑے۔ حسرت موہانی کے تخلص پر چراغ حسن حسرت قابض ہو بیٹھے۔ بہادر شاہ ظفر کا تخلص یوسف ظفر نے ہتھیا لیا۔ محشر لکھنوی کا محشر بدایونی نے اور ناصر کاظمی کا تخلص ناصر زیدی نے اڑا لیا۔ حتیٰ کہ خود اس تخلص عالی کا یہ حال ہے کہ اس کا سلسلہ نواب ضمیرالدین احمد عالی سے ہوتا ہوا محض جمیل الدین عالی ہی پر آکر ختم نہیں ہو گیا بلکہ یہی تخلص ہمیں اس سے آگے جلیل عالی کے ہاں بھی سرگرم سفر نظر آتا ہے۔ اب اگر تخلص کا یہ اشتراک ماضی و حال کے شعرا میں آج تک کسی کے ہاں قابل اعتراض نہیں سمجھا گیا تو صرف ایک جمیل الدین عالی ہی کے سلسلے میں اس پر اعتراض کیوں ہو۔ اور پھر اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی تو قابل غور ہے کہ اگر اس تخلص سے چچا دنیائے ادب میں کوئی نام پیدا نہ کر سکے اور بھتیجے نے کر دکھایا تو اس میں آخر اعتراض کی کون سی بات ہے؟

بہرحال عالی صاحب نے چوں کہ اپنے مذکورہ بالا مضمون "میں اور میرا فن" میں اپنے تخلص کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ انھیں یہ تخلص ان کے چچا نے ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں دیا' اس لیے ہم نے اگلا سوال ان سے یہ کیا کہ ۱۹۳۹ء۔ ۱۹۳۸ء میں آپ کی عمر کیا رہی ہو گی؟ کہنے لگے۔ یہی کوئی بارہ تیرہ سال۔ ہم نے پوچھا۔ آپ کی شعر گوئی کا آغاز کب ہوا؟ کہا۔ یہ تو ٹھیک سے یاد نہیں کہ پہلا شعر کب کہا لیکن پہلی غزل میں نے ۱۹۳۹ء میں سوہاوہ کے ڈاک بنگلے میں جہاں میں اپنے بڑے بھائی مرزا اعتزازالدین احمد مرحوم سپرنٹنڈنٹ پولیس جہلم کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا' ان کے دیے ہوئے مصرع طرح پر کہی۔ اس کا حوالہ بھی آپ کو میرے بعض انٹرویوز میں مل جائے گا(۲*)۔

اب دیکھیے' عالی صاحب نے اپنی پہلی غزل ۱۹۳۹ء میں کہی اور عالی تخلص بھی ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں اختیار کیا۔ جب کہ "تراجم علمائے حدیث ہند" مطبوعہ ۱۳۵۶ھ (مطابق ۱۹۳۷ء) کے سرورق کی عکسی تحریر کی روایت کے مطابق عالی صاحب ایک ایسے وقت اپنے دادا نواب ضمیرالدین احمد کی شاعری کے سارے اثاثے پر ہاتھ صاف کرکے پاکستان سدھار گئے جب کہ ان کے صاحب تخلص بنے اور پہلی غزل کہنے میں ابھی کم و بیش ایک سال کا اور پاکستان بننے میں کوئی دس سال کا عرصہ باقی تھا۔ ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے۔

مولف تذکرہ کو یوں الٹی گنگا بہاتے دیکھ کر اب ہمیں ان کے بارے میں عالی صاحب کی یہ بات یاد آئی کہ جب وہ میرے سگے چچا کو میرے رشتے کے دادا بتاتے ہیں تو اس بات سے قیاس کرلیجیے کہ ان کی معلومات میری اور میرے چچا کی شاعری کے بارے میں کس حد تک قابل اعتبار ہوسکتی ہیں؟ بلکہ معلومات کے قابل اعتبار ہونے نہ ہونے کا سوال تو پھر بھی کہیں بعد میں جاکر پیدا ہوتا ہے' یہاں تو عالم یہ ہے کہ واقعات ابھی ظہور ہی میں نہیں آئے مگر بیان اس طرح کیے جارہے ہیں جیسے کہ وہ ظہور میں آنے کے بعد گئے گزرے زمانے کی چیز بھی بن چکے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں عالی صاحب سے دریافت کرنے پر یہ بھی معلوم ہوا کہ "تراجم علمائے حدیث ہند" کی طبع اول کے وقت یعنی ۱۳۵۶ھ (مطابق ۱۹۳۷ء) میں ان کے چچا نواب ضمیرالدین احمد عالی زندہ تھے (*۳) جب کہ تذکرہ کے صفحہ ۱۷۹ کی عکسی تحریر (مطبوعہ "بادبان") کے عنوان میں ان کے نام کے آگے "مرحوم" کا لفظ بھی درج ہے۔

اب تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آخر ایسا ہو کیسے سکتا ہے؟ ہم نے کبھی ایک واقعہ پڑھا تھا کہ ایک ترقی پسند نقاد کسی محفل میں مجروح سلطان پوری کے بعض اشعار کو فیض کے اشعار قرار دے رہے تھے۔ وہاں ایک سخن فہم ادیب و شاعر بھی موجود تھے۔ انھوں نے کہا۔ جناب یہ اشعار فیض کے نہیں' مجروح سلطان پوری کے ہیں مگر ترقی پسند نقاد ماننے کو تیار نہ ہوئے۔ اتفاق سے سخن فہم ادیب و شاعر کے پاس اس وقت مجروح سلطان پوری کے دیوان کا پاکستانی ایڈیشن موجود تھا۔ انھوں نے اس کے وہ صفحات کھول کر بھی دکھائے جہاں وہ اشعار موجود تھے۔ لیکن جناب نقاد نے اس ایڈیشن ہی کو جعلی قرار دے دیا۔ سخن فہم ادیب نے کہا کہ یہ ایڈیشن جعلی نہیں' اسے مجروح صاحب کی اجازت سے ان کے ایک عزیز نے کراچی سے چھپوایا ہے اور اس پر مشہور نقاد محمد علی صدیقی نے دیباچہ لکھا ہے جب کہ وہ کسی جعلی ایڈیشن پر دیباچہ نہیں لکھ سکتے۔ مگر نقاد موصوف نے محمد علی صدیقی کے دیباچے کو بھی جعلی قرار دے دیا۔ سخن فہم ادیب نے کہا کہ دیباچہ ہرگز جعلی نہیں۔ آپ چاہیں تو محمد علی صدیقی کو فون کرکے ابھی معلوم کرسکتے ہیں۔ بولے۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ فون پر محمد علی صدیقی ہی بولیں گے' بولنے والا جعلی محمد علی صدیقی بھی تو ہوسکتا ہے۔

خیر یہ واقعہ جو ہم نے کبھی خامہ بگوش کے کسی کالم میں پڑھا تھا' محض ایک لطیفہ بھی ہوسکتا ہے مگر یہاں تو حقیقتاً سارا معاملہ ہی جعلی دکھائی دینے لگا۔ اس کے بعد عالی صاحب سے یوں تو کچھ اور پوچھنے کی

ضرورت ہی باقی نہ رہی تھی لیکن پھر بھی ہم نے ذرا ہمت کر کے پوچھا خیر' تخلص کے بارے میں تو مانا کہ آپ کے دادا کا چھوڑا ہوا تھا جو آپ کے چچا سے ہوتا ہوا آپ تک پہنچا لیکن ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کلام کے بارے میں بھی ارشاد فرمائیے کہ کیا یہ بھی آپ تک کسی ایسے ہی طریقے سے تو نہیں پہنچا ہے؟ اب پوچھنے کو تو سوال ہم نے پوچھ لیا مگر ساتھ ہی اپنے سوال کی نامعقولیت کو محسوس کر کے دل ہی دل میں خائف ہوئے کہ خدا جانے اس پر عالی صاحب کا ردِ عمل کیا ہو؟ لیکن انھوں نے خلافِ توقع ذرہ برابر بُرا مانے بغیر بڑے اطمینان اور سکون کے لہجے میں جواب دیا۔ مرزا صاحب! اگر کوئی اسے میرے چچا یا دادا کا کلام بتا کر خوش ہو سکتا ہے تو ہونے دیں۔ میں تو یوں بھی اب ایسی باتوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ مجھے تو پہلے بھی میری شعر گوئی کے تعلق سے ایک خاص دور میں بعض لوگوں نے non-poet ڈکلیئر کر دیا تھا مگر میں نے نہ صرف یہ کہ بُرا نہیں مانا بلکہ کسی ردِ عمل کا اظہار تک نہیں کیا۔ پھر کچھ لوگوں نے میرے دوہوں کو ہندی بحر میں نہ ہونے کی وجہ سے دوہا ماننے سے انکار کر دیا بلکہ میرے دوہوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خائف ہو کر میری دوہا نویسی اور اندازِ دوہا خوانی کے بارے میں بھی طرح طرح کے شگوفے چھوڑے۔ میں نے پھر بھی بُرا نہیں مانا بلکہ اپنے ایک دوہے میں یہاں تک کہا کہ:

اس دیوانی دوڑ میں بچ بچ جاتا تھا ہر بار
اک دوہا سو اسے بھی لے جا تو ہی خوش رہ یار

سو اگر اب بھی کچھ لوگ میرے کلام کو میرے چچا یا دادا کا کلام قرار دے کر خوش ہونا چاہتے ہیں تو ہو لیں۔ میں ان کی خوشی ان سے کیوں چھینوں۔ یوں بھی یہ تو اب ہمارا قومی مزاج بن کر رہ گیا ہے کہ جہاں کسی کو کسی میدان میں ابھرتا ہوا دیکھا' آگے بڑھ کر اس کی ٹانگ کھینچ لی۔

عالی صاحب کے ہاں سے واپسی پر ہمارے ذہن میں "تراجم علمائے حدیث ہند" اور اس کے مولف مولانا ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی سوال یہ تھا کہ علمائے حدیث کے بارے میں ایک ایسا تذکرہ جسے اس کے سرورق پر درج شدہ عبارت کی رو سے خاندان ولی اللہی دہلی و علمائے دہلی و صوبہ یوپی کے حالات کے لیے مخصوص اور انھی پر مشتمل ہونا چاہیے تھا' اس میں مبینہ طور پر جمیل الدین عالی سے منسوب ادبی سرقہ کے ایک انتہائی مضحکہ خیز اور بے سروپا واقعے کو بہ طور خاص اہمیت دے کر شامل کرنے کا آخر کیا جواز ہو سکتا ہے؟ دوسری قابلِ غور بات اس سلسلے میں یہ تھی کہ "بادبان" میں شایع شدہ سرورق کی عکسی تحریر میں مولف تذکرہ کے نام کے آگے "رحمۃ اللہ علیہ" لکھا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مولف تذکرہ اس تذکرے کی مبینہ طبع دوم یعنی ۱۳۹۱ھ (مطابق ۱۹۷۱ء) سے پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے۔ خود ہماری اپنی معلومات کے مطابق ان کا انتقال ۱۲ جنوری ۱۹۶۶ء کو ہوا (**) یعنی تذکرے کی طبع دوم سے کوئی پانچ چھ سال پہلے۔ اس سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ دراصل ان کی تحریر کردہ طبع اول کی اصل عبارت ہی کو کسی قسم کے اضافے یا ردوبدل کے بغیر طبع دوم کے وقت دوبارہ شایع کیا گیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ "بادبان"

میں شائع ہونے والی طبع دوم کی عکسی تحریر از اول تا آخر دراصل مولف ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی طبع اول (۱۹۳۷ء) کی اصل تحریر کا reproduction ہے۔ اب اگر یہ بات درست ہے تو ۱۹۳۷ء میں شائع ہونے والے تذکرے میں ایک ایسے شاعر (جمیل الدین عالی) کا ذکر کسی بھی عنوان کیسے ممکن ہے جو نہ تو ابھی صاحب تخلص بنا ہے اور نہ ہی اس نے ابھی اپنی پہلی غزل ہی کہی ہے (یہ دونوں باتیں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کم و بیش سال دو سال بعد کی ہیں) پھر سب سے زیادہ حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات یہ ہے کہ خود پاکستان کے بننے میں بھی ابھی پورے دس سال کا عرصہ باقی ہے۔ اس کے باوجود تذکرے میں جمیل الدین عالی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دادا عالی کی شاعری کے سارے اثاثے پر ہاتھ صاف کر کے پاکستان سدھار گئے۔ اب ہم حیران ہیں کہ جمیل الدین عالی یا کوئی بھی شخص پاکستان بننے سے دس سال پہلے پاکستان کیسے سدھار سکتا ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی

علاوہ ازیں یہاں ایک سوال یہ بھی ہے کہ تذکرے کی طبع اول کے وقت یعنی ۱۹۳۷ء میں تو نواب ضمیر الدین احمد زندہ تھے پھر تذکرے میں انھیں مرحوم کیسے لکھا جا سکتا ہے۔ اور آخری قابل غور بات وہی ہے کہ بہ قول جمیل الدین عالی جب مولف تذکرہ کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ وہ ان کے سگے چچا کو ان کے رشتے کے دادا بتاتے ہیں تو پھر ان کی دیگر معلومات کو کس بنا پر قابل اعتبار سمجھا جا سکتا ہے؟

حضرت مولانا ابویحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی ایک عالم دین تھے۔ اور یقیناً وہ بہت ثقہ، متقی اور پرہیزگار بھی رہے ہوں گے مگر ہمیں سخت حیرت ہے کہ آخر ایک ثقہ، متقی اور پرہیزگار عالم دین بے وجہ اور بے سبب کسی پر ایک ایسا بے بنیاد اور بے سروپا الزام کیسے لگا سکتا ہے جس سے خود اس کے تذکرے کی credibility اور استناد پر بھی حرف آتا ہو؟ ۱۹۳۷ء میں جمیل الدین عالی دس گیارہ سال سے زیادہ کے نہ ہوں گے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ مولانائے موصوف کو ۱۹۳۷ء میں نواب صاحب کے ایک دس گیارہ سالہ نو عمر بھتیجے کو بلاوجہ بدنام کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی؟ لاکھ سوچنے پر بھی اپنے سوالوں کا کوئی معقول جواب ہمیں نہ سوجھ سکا مگر اب ہمارے دل میں اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی خواہش شدت اختیار کر چکی تھی۔ چناں چہ ہم نے مولانا ابویحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی اور ان کے تذکرے کے بارے میں چھان بین شروع کر دی۔ آخر کار ہمیں ایک جگہ "تراجم علمائے حدیث ہند" مطبوعہ ۱۳۵۶ھ (مطابق ۱۹۳۷ء) کا سراغ مل ہی گیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور کام کی کتاب "خاندانِ لوہارو کے شعرا" مصنفہ حمیدہ سلطان احمد دہلی (۵*) بھی ہمارے ہاتھ لگی۔ ۱۹۸۱ء میں شائع ہونے والی حمیدہ سلطان احمد کی اس کتاب میں نواب مرزا الٰہی بخش خاں معروف اور نواب مرزا علاؤالدین علائی سے لے کر مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی اور مرزا جمیل الدین احمد خاں عالی تک پورے اکیس شعرا کے حالات (مع نمونہ کلام) درج ہیں۔ ان شعرا میں خاندان لوہارو کے تمام چھوٹے بڑے قابل ذکر شاعروں کے علاوہ ایسے شعرا بھی شامل ہیں جو محض تفریحاً شعر کہتے تھے۔ اس کے باوجود یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ نواب

ضمیرالدین احمد عالی کا کوئی ذکر ڈھونڈے سے بھی اس کتاب میں نہیں ملتا۔ اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ مصنف کے نزدیک ان کی شاعرانہ حیثیت تفریحاً "شعر کہنے والے شعرا کے برابر بھی نہیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے انھیں خاندان لوہارو کے شعرا میں شمار ہونے کے لائق نہیں سمجھا یا ممکن ہے کہ انھوں نے انھیں صرف فارسی میں شعر کہنے اور اردو میں نہ کہنے کے سبب کتاب میں شامل نہ کیا ہو۔ بہرحال وجہ جو بھی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ نواب ضمیرالدین عالی کا کوئی ذکر اس کتاب میں نہیں ملتا جب کہ جمیل الدین عالی کا ذکر (مع نمونہ کلام) پورے آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور مصنف نے ان کا شمار خاندان لوہارو کے ان شعرا میں کیا ہے جنھوں نے اپنی خاندانی وجاہت کو اپنے فن سے اور بھی بلند کر دکھایا۔

اب یوں تو علمائے کرام کے تذکرے میں نواب ضمیرالدین احمد کا ذکر بہ حیثیت شاعر کے ہونا اور شاعروں کے تذکرے میں نہ ہونا ہی کچھ کم دلچسپ نہیں مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جمیل الدین عالی جیسے مسلّم الثبوت غزل گو اور trend setter دوہا نگار پر جس کا نام آج مشرق سے لے کر مغرب تک اردو کی پوری دنیائے ادب میں بچے بچے کی زبان پر ہے' ایک ایسے شخص کے اثاثۂ شاعری پر ہاتھ صاف کرنے کا الزام عاید کیا جائے جس کی شاعرانہ حیثیت اتنی بھی مسلّم نہ ہو کہ وہ خود اپنے ہی خاندان کے ایسے شعرا کی صف میں شامل ہونے کے قابل سمجھا جا سکے جو محض تفریح طبع کے طور پر اردو میں شعر کہنے کا شوق رکھتے ہوں۔

لیکن "تراجم علمائے حدیث ہند" نے تو سارا مسئلہ ہی حل کر کے رکھ دیا۔ اس لیے کہ اس تذکرے میں ادبی چوری کے کسی واقعے کا تو کیا ذکر' خود جمیل الدین عالی کا نام تک کہیں نظر نہ آیا۔ تذکرے کے سرورق اور متعلقہ صفحے کی عبارت کا عکس قارئین کی ضیافت طبع کے لیے ہم اگلے صفحے پر شایع کر رہے ہیں تاکہ جعل سازی کے اس مجرمانہ فعل کی حقیقت ان پر بھی اچھی طرح واضح ہو جائے۔

نواب ضمیرالدین احمد (رئیس لوہارو) کے بارے میں عکسِ تحریر کی عبارت کو غور سے دیکھنے اور اس کا تقابلی موازنہ "بادبان" میں شایع شدہ تذکرہ (طبع دوم) کی عبارت سے کرنے پر دونوں میں جو فرق نظر آتا ہے اس کے حوالے سے مندرجہ ذیل باتیں نوٹ کرنے کے قابل ہیں :

○..... طبع اول کی تمام کی تمام عبارت نواب ضمیرالدین احمد کے حالات اور شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں نہ تو جمیل الدین عالی ہی کا کوئی ذکر موجود ہے اور نہ ہی اس بات کا کہ وہ یا کوئی اور شخص ان کے اثاثۂ شاعری پر ہاتھ صاف کر کے پاکستان سدھار گیا۔

○..... اور چوں کہ مولف تذکرہ مولانا ابویحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی اس تذکرے کی اشاعت دوم (۱۹۷۱ء) سے کوئی پانچ چھ سال پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے۔ لہٰذا اس مضحکہ خیز اور بے بنیاد واقعے کا تذکرے کی اشاعت دوم کے وقت ان کے قلم سے نکلنا یکسر خارج از بحث ہے۔

○..... علاوہ ازیں تذکرے کی اشاعت اول میں اس بات کا بھی سرے سے کوئی ذکر نہیں کہ نواب

جعلنٰہا تذکرۃ ومتاعا للمقوین
ہم نے اسے تذکرہ اور ضرورت کا سرمایہ بنا دیا

تراجم علمائے حدیث ہند

سنہ ۱۳۵۶ھ

جلد اوّل

مؤلف: ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی

ماہ ذی قعدہ ۱۳۵۶ھ
ماہ جنوری ۱۹۳۸ء

جید برقی پریس دہلی میں چھپی

تعداد اشاعت بار اول ۱۰۰۰

۱۹۲ جلد اول

گر گیا ناصح نے ہم کو تیرہ اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

طب کا مشغلہ بھی شروع کر دیا اور اب تک یہ فیض جاری ہے۔ صاحب اولاد ہیں۔

نواب ضمیر الدین احمد رئیس لوہارو

(عدد مسلسل ۱۳۵) (عدد ۲۵)

نواب علاء الدین علائی مرحوم کے خلف الصدق اور خاندان مغلیہ کی یادگار ہیں۔ سن ولادت ۱۱ دسمبر ۱۸۶۲ء (۱۹ شعبان ۱۲۸۳ھ) ہے۔ ابتداءً والد مرحوم سے پڑھا۔ تکمیل منقول و معقول مولوی سید ولی دمشقی (دیجیری) سے کی۔ حدیث بھی انہی بزرگوار سے پڑھی۔ تدریس کا مشغلہ ہمیشہ رہا آیا مگر اس طرح کہ جو طالب علم دولتکدہ پر کتاب لے کر حاضر ہوا پڑھا گیا۔ چند کتابیں لکھیں مگر دوسروں کے نام سے شائع کرا دیں۔ اسی طرح شاعری کا حال ہے۔ اردو اور فارسی میں بہترین غزلیں اور مرصع قصائد لکھے مگر وہ بھی شاہانہ فیاضیوں کی وجہ سے اوروں کو بخش دیئے۔ راقم الحروف کو بھی ایک قصیدہ بخشے جانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ علائی تخلص فرماتے ہیں۔ پرانی وضع اور قدیم خیال و قال کے بزرگ ہیں۔ اولاد نہیں ہوئی۔

ضمیرالدین احمد خاں دوہے اور گیت بھی کہتے تھے۔ اور یہ ذکر اس لیے موجود نہیں کہ مولف تذکرہ ان سے ذاتی طور پر واقف ہونے کی بنا پر یہ بات بہ خوبی جانتے تھے کہ انھوں نے کبھی کوئی دوہا یا گیت لکھا ہی نہیں۔ لکھا ہوتا تو اس بات کا ذکر وہ پہلی ہی اشاعت میں کر دیتے۔ لہٰذا "بادبان" میں شایع ہونے والی طبع دوم کی عکسی تحریر میں یہ انوکھا انکشاف دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ "نواب صاحب نے دوہے اور گیت بھی خاصے کہے"۔ اب اگر اس بات کو نظر میں رکھا جائے کہ یہ انوکھا انکشاف تذکرے کی اشاعت اول کے مدتوں بعد ایک ایسے وقت کیا گیا جب کہ خود نواب صاحب اور مولف تذکرہ دونوں ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے تو اس انکشاف کے بے اصل، بے بنیاد اور جعلی ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔ اب قطع نظر اس بات سے کہ تذکرے کی اصل عبارت میں اس جعلی اور الحاقی عبارت کے اضافے کا ذمہ دار کون ہے؟ طبع دوم کی عکسی تحریر میں اس اضافے کی کوئی اور وجہ سوائے اس کے سمجھ میں نہیں آتی کہ جمیل الدین عالی کے حوالے سے ادبی چوری کے ایک مفروضہ اور من گھڑت افسانے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے ضروری تھا کہ نواب صاحب کی شاعری کے کھاتے میں کچھ دوہے اور گیت بھی ڈال دیے جائیں۔ ورنہ بہ قول مولف تذکرہ جو آدمی اپنی غزلیں اور قصیدے اپنی شاہانہ فیاضیوں کی بدولت اوروں کو بخش کر اپنی جھولی پہلے ہی خالی کر چکا ہو اس کے پاس کسی کے چرانے کے لیے باقی ہی کیا رہ جاتا ہے کہ جمیل الدین عالی یا کوئی اور شخص اس پر قابض ہو سکے؟

اس تقابلی موازنے سے یہ بات یقینی طور پر واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ "بادبان" میں شایع شدہ تذکرے کی عکسی تحریر میں نظر آنے والی آخری چند سطروں پر مشتمل مندرجہ ذیل عبارت تمام کی تمام جعلی ہے جسے کسی صورت میں بھی مولف تذکرہ مولانا ابویحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی کے قلم کی تحریر نہیں سمجھا جا سکتا۔

> دوہے اور گیت بھی خاصے کہے۔ ان کے ایک رشتے کے پوتے جمیل الدین تھے۔ ان کا وہاں بہت آنا جانا تھا۔ جمیل الدین سارے شاعری کے اثاثے پر ہاتھ صاف کر کے پاکستان سدھارے اور وہاں عالی تخلص اختیار کیا۔

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ جعلی عبارت بڑھاتے وقت عنوان میں نواب ضمیرالدین احمد رئیس لوہارو کے نام کے آگے (مرحوم) کے لفظ کا اضافہ تو کر دیا تھا مگر عنوان کے تحت درج عبارت میں حال کے صیغوں کو ماضی کے صیغوں میں بدلنے کا یا تو خیال ہی نہ آیا یا یہ تبدیلی خلاف مصلحت سمجھ کر نظرانداز کر دی گئی۔ شاید اس لیے کہ اس سے پوری عبارت کے جعلی ہونے کا راز بہ آسانی فاش ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ نواب صاحب عنوان میں مرحوم اور عنوان کے تحت درج عبارت کے ایسے جملوں میں زندہ نظر آتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ۔

> خاندان مغلیہ کی یادگار ہیں .... عالی تخلص فرماتے ہیں .... پرانی وضع اور قدیم حال و قال کے بزرگ ہیں۔

بہرحال اب ہم یہ اعتراف بھی کرتے چلیں تو اچھا ہے کہ مولف تذکرہ مولانا ابویحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی کے بارے میں جو بدگمانی ہمارے دل میں پیدا ہوئی تھی وہ اس صورت حال کی وضاحت کے بعد نہ صرف یہ کہ دور ہو جاتی ہے بلکہ ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم تحقیق کیے بغیر ان کے طرف سے خواہ مخواہ بدگمانی کا شکار ہوئے۔ بہرحال اب یہ بات قطعی طور پر واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ "بادبان" میں شایع شدہ عکسی تحریر میں ادبی چوری کے جس من گھڑت اور بے بنیاد واقعے کو جمیل الدین عالی سے منسوب کیا گیا ہے وہ نہ تو "تراجم علمائے حدیث ہند" کی اشاعت اول کے وقت (یہ ۱۹۳۸ء میں) مولانائے موصوف کے قلم سے نکل سکتا تھا اور نہ ہی وہ اپنے انتقال کے پانچ چھ سال بعد ۱۹۷۱ء میں تذکرے کی طبع دوم کے وقت اس کی اصل عبارت میں اس واقعے کا اضافہ کرنے کے لیے عالم بالا سے واپس تشریف لا سکتے تھے۔ لہٰذا یہ بات بالکل یقینی ہے کہ تذکرے کی اصل عبارت میں یہ اضافہ کسی ایسے شخص کی طرف سے کیا گیا ہے جو عالی صاحب پر اپنے دادا کے کلام کی چوری کا مضحکہ خیز اور بے بنیاد الزام لگا کر ان کی ادبی شہرت اور شاعرانہ مرتبہ و مقام کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔

اب اگر کوئی پوچھے کہ جعل سازی کی اس گھناؤنی حرکت کا ذمہ دار آخر ہے کون؟ تو اگرچہ ہمیں اس معاملے کی چھان بین سے چنداں دلچسپی نہیں لیکن "بادبان" جیسے ادبی پرچے میں اس قسم کے گھٹیا لچر اور سنسنی خیز مواد کی اشاعت ہمارے لیے باعث حیرت ضرور ہے۔ اس لیے کہ مدیر "بادبان" جناب ناصر بغدادی سے ذاتی طور پر متعارف نہ ہونے کے باوجود ہمیں اس بات پر بہ مشکل ہی یقین آ سکتا ہے کہ "بادبان" جیسے اچھے اور صاف ستھرے پرچے کا مدیر اپنے پرچے کو جعل سازی کے اس انتہائی مذموم اور قابل نفرت کاروبار میں جان بوجھ کر ملوث کرنا پسند کرے گا اور نتیجے کے طور پر دنیائے ادب میں اس کی بنی ہوئی ساکھ کو خود ہی مٹی میں ملا کر رکھ دے گا۔ گو کہ "بادبان" کے حالیہ شمارے پر جو تبصرے ماہنامہ "شب خون" جیسے موقر ہندوستانی پرچوں میں ہماری نظر سے گزرے ہیں، ان میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ "بادبان" کے پچھلے شماروں سے اس کا جو image بنا تھا وہ اب مجروح ہوتا نظر آ رہا ہے۔ کیوں کہ اب ہندوپاک کی ملکی گندی سیاست کی طرح اس پرچے میں بھی ادبی سیاست کا زور کچھ زیادہ ہی دکھائی پڑ رہا ہے۔ اور ساتھ ہی مدیر "بادبان" کو اپنے پرچے میں اس قسم کا سنسنی خیز مواد چھاپنے پر براہ راست ذمہ دار قرار دیتے ہوئے انھیں اس طرح کی ادبی سیاسی بازی گری سے دور رہنے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔ لیکن ہم پھر بھی ان کے بارے میں نیک گمان رکھتے ہوئے یہی کہیں گے کہ اس اسکینڈل کے حوالے سے "بادبان" میں جو کچھ چھپا ہے، چوں کہ اس کے لکھنے والے تمام کے تمام دوسرے لوگ ہیں اس لیے اس بات کا امکان باقی رہتا ہے کہ مدیر "بادبان" نے اس سنسنی خیز مواد کے پیچھے چھپی ہوئی جعل سازی سے لاعلم رہتے ہوئے ان لوگوں کا فراہم کردہ مواد مناسب تحقیق و تفتیش کے بغیر ہی نادانستگی میں چھاپ دیا ہو۔ اگرچہ اس صورت میں بھی ان پر کم از کم اس سوال کے جواب کی ذمہ داری ضرور عاید ہوتی ہے کہ انھوں نے مناسب تفتیش کے بغیر اپنے پرچے میں ایسا مواد کیوں کر شایع ہونے دیا جس کے لکھنے اور فراہم کرنے

والوں کا نام "بادبان" جیسے ادبی پرچے میں شائع ہونا بجائے خود "بادبان" کے اپنے معیار اور وقار کے سراسر منافی ہے۔ بہرحال' دانستہ ہو یا نادانستہ ہم اتنی بات ضرور کہیں گے کہ "بادبان" کا جعل سازی کے اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہونا ہمارے نزدیک افسوس ناک بھی ہے اور شرم ناک بھی۔

رہے "بادبان" کو اس اسکینڈل کا مواد فراہم کرنے والے فرید شمسی (علیگ) محمد شاہد ملک اور "خیراندیش" جیسے مجہول الاسم لوگ' تو ہمیں نہیں معلوم کہ یہ لوگ ہیں کون؟ لیکن چوں کہ ادبی چوری کے اس لغو اور بے سروپا واقعے کی اولین روایت کی تمام تر بنیاد فرید شمسی (علیگ) کے بہ قول دہلی کے ایک اہلِ حدیث بزرگ شاعر کے بیان پر ہے جو انھیں "تراجم علمائے حدیث ہند" نامی تذکرہ فراہم کرنے کے ذمہ دار بھی ہیں۔ لہٰذا فرید شمسی کی جانب سے ان کے نام کو unnecessorily پردہ اخفا میں رکھنے کی مصلحت قطعی طور پر ناقابلِ فہم ہے۔ اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ اخفا جعل سازی کے اس گھناؤنے فعل کو چھپانے کے لیے ضروری تھا جس کا تانا بانا خود انھوں نے دہلی کے اہلِ حدیث بزرگ شاعر کے حقیقی یا فرضی کردار کی مدد سے بنا ہے۔ ہمارے اس شبہ کو تقویت اس بات سے بھی پہنچتی ہے کہ "شب خون" میں چوہدری ابن النصیر نے "بادبان" پر اپنے تبصرے میں نہ صرف یہ کہ جمیل الدین عالی کے بارے میں اس پوری کہانی کو بے وقعت قرار دیا ہے جو دہلی کے بزرگ شاعر کے حوالے سے شائع ہوئی ہے بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وہ دہلی کے کسی ایسے بزرگ شاعر سے واقف نہیں جو اہلِ حدیث سے تعلق رکھتا ہو۔ اس طرح کچھ اور بھی ایسی باتیں ہیں جو ہمارے اس شبہ کو تقویت پہنچا کر یقین کے درجے تک لے آتی ہیں مثلاً"

۱۔ فرید شمسی (علیگ) کا نہ صرف یہ کہ دہلی کے اہلِ حدیث بزرگ شاعر کے نام ہی کو پردۂ اخفا میں رکھنا بلکہ ان کے بارے میں یہ بتانے سے بھی گریز کرنا کہ وہ کراچی میں اپنے کس عزیز کے ہاں ٹھہرے تھے۔ یہی نہیں بلکہ شاعر موصوف نے کراچی سے واپسی کے چند ماہ بعد بھارت سے آنے والے جن صاحب کے ہاتھ انھیں "تراجم علمائے حدیث ہند" نامی تذکرے کا تحفہ بھیجا' ان کے نام کو بھی چھپائے رکھنا۔ گویا ہر وہ شخص جو اس معاملے کی اصل حقیقت پر کچھ بھی روشنی ڈال سکتا ہو' اس تک پہنچنے کے تمام راستے پوری احتیاط کے ساتھ بند کر دینا۔

۲۔ فرید شمسی (علیگ) کے علاوہ ادبی چوری کے اس من گھڑت واقعے کے دوسرے گواہ محمد شاہد ملک ہیں جو اس واقعے کی روایت میں فرید شمسی اور دہلی کے اہلِ حدیث بزرگ شاعر' دونوں سے متفق اور دونوں کے ہم نوا ہیں مگر وہ بھی عالی صاحب کے بارے میں دیرینہ معلومات رکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود نہ صرف یہ کہ اپنی معلومات کے ذرائع کا انکشاف کرنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ ہفت روزہ "پنج لوک" کے جس شمارے میں ان کا بیان شائع ہوا ہے' اس کا شمارہ نمبر بتانے سے بھی گریز کرتے ہیں۔

۳۔ چوں کہ "تراجم علمائے حدیث ہند" کی جعلی عبارت میں نواب ضمیرالدین احمد کو عالی صاحب کے چچا کی بجائے رشتے کے دادا قرار دیا گیا تھا لہٰذا دہلی کے بزرگ شاعر' فرید شمسی (علیگ) اور محمد شاہد ملک' ان

تینوں حضرات کے لیے بھی انھیں عالی صاحب کا "دادا" بنانا لازم آیا۔ چچا کو دادا بنانے میں ان تینوں حضرات کا متفقہ طور پر ایک دوسرے کا ہم نوا ہونا اس بات کی چغلی کھارہا ہے کہ یہ حضرات محض جمیل الدین عالی کو بدنام کرنے کے لیے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت متفقہ طور پر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک کا کردار اس سلسلے میں بنیادی ہو اور بقیہ دونوں اس کے آلۂ کار یا فرضی کردار کی حیثیت رکھتے ہوں۔ بہر حال ان کے کردار حقیقی ہوں یا فرضی، مگر یہ لوگ اپنی تمام تر منصوبہ بندی کے باوجود غالباً اس بات سے بے خبر ہے کہ چچا بھتیجے کے رشتے کو دادا پوتے کے رشتے میں بدلنے پر ان کے باہمی اتفاق کی حقیقت کھلتے ہی یہ راز بھی طشت ازبام ہو کر رہ جائے گا کہ عالی صاحب کو مبینہ طور پر اپنے دادا کے تخلص اور کلام کی چوری کا مرتکب قرار دینے میں ایک دوسرے سے اتفاق کرکے وہ ایک صاف اور صریح جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہم عالی صاحب کے طرف دار نہیں، اور چوں کہ طرف دار نہیں اس لیے ان پر سخت سے سخت اصولی تنقید کو جائز سمجھتے ہیں بشرطیکہ وہ شخصی اور ذاتی مخالفت اور مخاصمت کے جذبے سے بالاتر ہو کر ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے کی جائے۔ اس لیے کہ تنقید نہ تو بہتان بازی اور کردار کشی کا نام ہے اور نہ ہی بدگوئی اور ہرزہ سرائی کا۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ عالی صاحب میں ہزار کھوٹ سہی مگر ہم اور آپ ہی ایسے کون سے دودھ کے دھلے ہیں کہ ان پر اعتراض کرنے سے پہلے خود اپنے گریبان میں جھانک کر نہ دیکھیں۔ رہے فرید شمسی (علیگ) محمد شاہد ملک اور "خیر اندیش" جیسے مجہول الاسم لوگ، تو یہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں، ہم نہیں جانتے اور نہ ہی جاننا چاہتے ہیں۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ ادب میں ان کا کوئی نام نہیں، کوئی شناخت نہیں۔ یہ بے شناخت لوگ ہیں۔ ایسے لوگ جن کا نام بھی جمیل الدین عالی کے نام کے ساتھ لینا ہمارے نزدیک بدمذاقی سے کم نہیں۔ عالی صاحب پر انھوں نے جو الزام لگایا وہ اس قدر مضحکہ خیز اور بے سروپا تھا کہ ہمیں تو اس کی تردید کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس مضمون میں ہم نے جو کچھ کہا اس سے بھی ہمارا مقصد عالی صاحب پر ان لوگوں کی طرف سے عاید کردہ الزام کی تردید کرنا نہیں، بلکہ ان کی جعل سازی کے گھناؤنے کردار کو بے نقاب کرنا تھا۔ چناں چہ اسی مقصد کے تحت ہم نے ان کے عاید کردہ الزام کا جائزہ لیا اور ان کی جعل سازی کو تمام تر ممکنہ دلائل و براہین سے ثابت کر دکھایا۔

عالی صاحب کی شاعری کے بارے میں بے پر کی اڑانے کے علاوہ جس قسم کی گھٹیا اور پست ذہنیت کی باتیں ان لوگوں نے ان کے بارے میں کی ہیں اور ان کی عزت پر جو رکیک حملے کیے ہیں، شاید یہ لوگ ایسی باتیں کرکے اپنی جگہ خوش ہو رہے ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح ایک بار کسی ایسے ہی بے شناخت آدمی نے سید ذوالفقار علی بخاری سے کچھ بدتمیزی کرکے اپنی دانست میں ان پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر جواب میں جو کچھ بخاری صاحب نے کہا وہ بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ بخاری صاحب نے کہا کہ میاں میری ایک عزت ہے، تم میری عزت پر حملہ کرسکتے ہو، میری ایک شہرت ہے، تم میری شہرت پر حملہ کرسکتے ہو، میرا ایک نسب ہے، تم میرے نسب پر حملہ کرسکتے ہو۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تمھارے پاس کیا ہے، میں

تمھاری کس چیز پر حملہ کروں؟ سو اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا بخاری صاحب کی طرح عالی صاحب بھی ان لوگوں سے یہی پوچھنا چاہیں گے یا نہیں کہ میاں تمھارے پاس کیا ہے؟ میں تمھاری کس چیز پر حملہ کروں؟

حواشی

*۱۔ عبدالعزیز ساحر کی کتاب "جمیل الدین عالی کی نثر نگاری" (صفحہ ۱۳)

*۲۔ عبدالعزیز ساحر کی کتاب "جمیل الدین عالی کی نثر نگاری" (ص ۱۵) سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ عالی صاحب نے اپنی پہلی غزل اپنے بھائی کے دیے ہوئے مصرع طرح پر ۱۹۳۹ء میں کی۔

*۳۔ عالی صاحب کے بہ قول ان کا انتقال مارچ ۱۹۴۳ء میں ہوا۔

*۴۔ "وفیات مشاہیر پاکستان" (ص ۳۵) مرتبہ پروفیسر محمد اسلم۔ مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد۔

*۵۔ خواہر فخرالدین علی احمد مرحوم، صدر جمہوریہ ہند۔

سوال یہ ہے

"مکالمہ۔۱" میں ہم نے ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک مطبوعہ مضمون "عسکری کا تصورِ روایت" ان کے ایما پر شائع کیا تھا' اس لیے کہ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے محمد حسن عسکری مرحوم کے تصورِ روایت کے حوالے سے ایک اہم سوال اٹھایا تھا۔ عسکری صاحب کا خیال ہے کہ روایتی ادب روایتی معاشرے ہی میں پیدا ہو سکتا ہے اور روایتی معاشرہ وہ ہے جو مابعد الطبیعیات کی بنیاد پر قائم ہو۔ عسکری صاحب کی متعین کردہ تعریف اور معیار کے پیشِ نظر ڈاکٹر جمیل جالبی کا سوال یہ ہے کہ وہ ادب جو گزشتہ سو سال سے ان معاشروں میں تخلیق ہو رہا ہے' جو اپنی مابعد الطبیعیات سے ہٹ چکے ہیں' اس پر یہ روایتی معیار کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ آج کے بدلے ہوئے معاشرتی اور ادبی تناظر میں عسکری صاحب کا نقطۂ نظر ہمیں ایک گنبدِ بے در میں لا کر چھوڑ دیتا ہے اور ہم بہت سے لاینحل سوالوں کے جال میں پھنس کے محض بے دست و پا ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون شائع کرتے ہوئے ہم نے اربابِ نقد و نظر کی توجہ ان کے سوال کی جانب مبذول کرائی تھی اور انھیں اس ضمن میں اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی۔ اس سلسلے میں ہمیں جمال پانی پتی اور شہزاد منظر کے مضامین موصول ہوئے جو قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ بنیادی سوال یا ان مضامین کے حوالے سے اگر اہلِ فکر و دانش آیندہ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیں تو ہم انھیں خوش آمدید کہیں گے۔ (ادارہ)

جمال پانی پتی

حسن عسکری کا تصورِ روایت...... ایک سوال

"حسن عسکری کا تصورِ روایت" کے عنوان سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک مضمون نئے کتابی سلسلہ "مکالمہ" کی اولین اشاعت میں شایع ہوا ہے۔ اس مضمون کے حوالے سے اظہار خیال کی جو دعوت دی گئی ہے' میں اس سلسلے میں اپنی معروضات پیش کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون دراصل ایک نسبتاً طویل مضمون کا حصہ ہے جس میں انھوں نے اردو تنقید کے مختلف مکاتب فکر کا جائزہ لے کر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ مکاتب فکر چوں کہ اپنے اپنے مخصوص نقطہ نظر کے تنگ دائرے میں رہ کر ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اس لیے اس مطالعہ کا نتیجہ ایک محدود اور یک رخی تنقید کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ لہٰذا اس وقت تنقید کو ایک ایسے "فطری امتزاج" کی ضرورت ہے جو تنقید میں بہ یک وقت کئی سطحوں کو جذب کر کے اسے ایک وسیع تر متوازن صورت عطا کر دے۔ اس لیے کہ ایسے ہی امتزاج سے ادب کی وہ پوری اکائی اور فکری وحدت سامنے آتی ہے جس سے ادب کی حقیقی روح کا پتا چل سکے (*۱)۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں سماجی تنقید' مارکسی تنقید' تاثراتی تنقید' نفسیاتی تنقید اور جمالیاتی تنقید جیسے مختلف تنقیدی مکاتب فکر کے ساتھ ساتھ محمد حسن عسکری کے تصورِ روایت کے حوالے سے تنقید کے اس رجحان کا جائزہ بھی لیا ہے جسے بالعموم "روایت کی بازیافت" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس جائزہ کی ابتدا ہی میں ڈاکٹر صاحب نے روایت کے حوالے سے عسکری اور ایلیٹ کا ذکر کرتے ہوئے یہ تو ضرور فرمایا کہ عسکری صاحب ایلیٹ سے متاثر بھی ہیں اور اسے شدت سے رد بھی کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ان دونوں کے تصورِ روایت کا ذکر کچھ ایسے انداز میں کیا ہے جیسے کہ دونوں کے درمیان کوئی خاص فرق نہ ہو بلکہ یہاں تک فرمایا ہے کہ اردو تنقید میں عسکری صاحب نے بھی وہی کام کیا ہے جو انگریزی میں ایلیٹ نے کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :

> عسکری صاحب ایلیٹ سے اختلاف کے باوجود چلتے اسی راستے پر ہیں جس پر ایلیٹ چلا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایلیٹ کیتھولک عیسائی ہے اور عسکری صاحب سنی مسلمان۔ ایلیٹ نے ایک کتاب لکھی۔ "آفٹر اسٹرینج گوڈز" (After Strange Gods)۔ جس کا ذیلی عنوان تھا "جدید بدعتوں کا ابتدائی قاعدہ" (A Primer of Modern Heresy)۔ محمد حسن

عسکری نے ایک کتاب لکھی "جدیدیت" جس کا ذیلی عنوان تھا "مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ"۔ ایلیٹ اور عسکری میں فرق منزل کا نہیں راستے کا ہے۔ اور وہ فرق بھی کیتھولک عیسائی اور سنی مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے۔"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ عسکری کے تصور روایت اور ایلیٹ کے تصورِ روایت کے درمیان جو بنیادی فرق ہے' اسے ڈاکٹر صاحب نے زیادہ درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ حالاں کہ عسکری صاحب نے آخری دور میں جو مضامین اپنے تصورِ روایت کی وضاحت میں لکھے ان میں انھوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ ان کے تصورِ روایت کا ایلیٹ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ انھوں نے تو ایلیٹ کے تصورِ روایت پر کئی ایک بنیادی اعتراضات بھی کیے تھے۔ اس لیے کہ عسکری صاحب کا تصورِ روایت ایلیٹ کا تصورِ روایت نہیں' رینے گینوں کا تصورِ روایت ہے اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن لگتا ایسا ہے جیسے کہ ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اس فرق کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔

بہرحال' ڈاکٹر صاحب نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ ایلیٹ سے اختلاف کے باوجود عسکری صاحب بھی اسی راستے پر چلے ہیں جس پر ایلیٹ چلا ہے لیکن وہ اگر اپنے الفاظ کو غور سے دیکھتے تو انھیں معلوم ہوجاتا کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں اس میں بجائے خود ایک تضاد موجود ہے۔ اگر ایلیٹ سے اختلاف کے باوجود عسکری صاحب بھی اسی راستے پر چلے ہیں جس پر ایلیٹ چلا ہے تو ان کے بارے میں یہ کہنا کہ "ایلیٹ اور عسکری میں فرق منزل کا نہیں راستے کا ہے۔" اپنی تردید آپ کرنے کے مترادف ہے۔ بہرحال اس خود تردیدی بیان سے قطع نظر' ڈاکٹر صاحب اگر اس طرح کی سطحی مشابہتوں کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ ایلیٹ کی تنقید نے جو کام انگریزی ادب میں کیا وہی کام اردو تنقید میں عسکری صاحب نے بھی انجام دیا' تو یہ بات دونوں کے کام کے بنیادی فرق کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔ ورنہ یوں کہنے کو تو کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے :

> جمیل جالبی صاحب حسن عسکری سے اختلاف کے باوجود چلتے اسی راستے پر ہیں جس پر عسکری چلے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ جالبی صاحب کلچرل اسلام کے ماننے والے ہیں اور عسکری روایتی اسلام کے۔ عسکری نے ایک زمانے میں ماہنامہ "ساقی" میں ایک مستقل کالم "باتیں" کے عنوان سے لکھا جس میں ادب اور ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی (۲۸)۔ جالبی صاحب نے بھی ایک زمانے میں ماہنامہ "ساقی" میں ایک مستقل کالم "باتیں" کے عنوان سے لکھا جس میں ادب اور ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ جالبی صاحب اور عسکری میں فرق راستے کا نہیں' منزل کا ہے۔ جالبی صاحب جس راستے پر چل کر ایلیٹ تک پہنچے' عسکری اسی راستے سے رینے گینوں تک پہنچ گئے اور دونوں کے درمیان یہ فرق بھی کلچرل مسلمان اور روایتی مسلمان ہونے کی بنا پر ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ جس طرح ہمارے ان فقروں سے ڈاکٹر صاحب اور عسکری' ان دونوں کے کام کا ایک ہونا کسی بھی طرح ثابت نہیں ہوتا' اسی طرح ڈاکٹر صاحب کے فقروں سے بھی نہ تو عسکری اور ایلیٹ کے کام کا ایک ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی ان سے ان دونوں کے تصور روایت ہی پر کوئی روشنی پڑتی ہے۔ اور دونوں کے تصور روایت کے درمیان جو بنیادی فرق ہے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہونے کا تو خیر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ٹھیک ہے کہ محمد حسن عسکری نے روایت کو دین کا نام دیا اور ایلیٹ نے بھی اپنے تصور روایت میں مذہب کو شامل کیا لیکن اول تو ایلیٹ کے ہاں ادب اور مذہب کا باہمی رشتہ ہی واضح نہیں۔ دوسرے دونوں کے درمیان روایتی ادب کی بنیاد کا مسئلہ بھی متفق علیہ نہیں۔ اس لیے کہ ایلیٹ تاریخی شعور کو روایتی ادب کی بنیاد قرار دیتا ہے' جب کہ عسکری صاحب کے نزدیک روایتی ادب کی بنیاد مابعد الطبیعیاتی تصور حقیقت پر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب اگر اس تصور کی بنیاد پر قایم ہے تو وہ روایتی ہے' ورنہ نہیں' چاہے الفاظ اور اسالیب وہی استعمال ہو رہے ہوں۔ ایلیٹ صاحب کہتے ہیں کہ شاعر کو زمانیت اور لازمانیت دونوں کا احساس الگ الگ بھی ہو اور بہ یک وقت بھی۔ ان کے نزدیک ایسے ہی تاریخی شعور کے ذریعے ادب روایتی بنتا ہے۔ اب یہاں ایک بات تو دیکھنے کی یہی ہے کہ تاریخ سرتاسر زمانی چیز ہے اس لیے کہ اس کا تعلق اصول حرکت سے ہے جس کا عمل زمانے کے اندر واقع ہوتا ہے۔ لہٰذا تاریخی شعور سے زمانیت کے احساس کو منسوب کرنا تو ٹھیک ہے مگر لازمانیت کا تاریخی شعور سے کیا تعلق ہے' یہ بات ناقابل فہم ہے۔ اس لیے کہ لازمانیت کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو وقت اور تاریخ سے ماورا ہو۔ دوسرے ایلیٹ کے ہاں زمانیت اور لازمانیت کے درمیان کیا رشتہ ہے' یہ بات بھی واضح نہیں۔ علاوہ ازیں اس کے ہاں روایت ایک طرح کی معاشرتی عادت کے مترادف ہو کر رہ جاتی ہے یعنی ایک ایسا کام جو کوئی قوم یا گروہ سو دو سو سال سے کرتا چلا آرہا ہو۔ مگر جیسا کہ عسکری صاحب نے کہا ہے۔ "عادت فطرت ثانیہ تو ضرور بن جاتی ہے لیکن جو چیز ثانوی ہو' وہ لازمی نہیں ہوتی۔ اس کی بجائے کوئی اور چیز بھی لائی جاسکتی ہے۔ ہمیں ایک قسم کے ادب کی عادت تو ضرور پڑچکی ہے لیکن اگر ہم ایک دن اٹھ کے زبردستی دوسری قسم کا ادب لکھنا شروع کردیں تو تھوڑے دن بعد ہمیں نئی عادت پڑجائے گی اور ہم اسے روایت کہنے لگیں گے" (۳*)۔ چناں چہ ایلیٹ کے ہاں روایت کوئی قایم و دایم اور مستقل چیز نہیں' بلکہ ایک ایسی چیز ہے جو زمانے کے اعتبار سے بدلتی بھی رہتی ہے اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے' جب کہ عسکری صاحب کا تصور روایت اس سے بالکل مختلف ہے۔ آپ اس سے اختلاف تو کرسکتے ہیں لیکن اسے اور ایلیٹ کے تصور روایت کو ایک ہی سطح پر نہیں رکھ سکتے۔

اب جہاں تک عسکری صاحب کے تصور روایت کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک روایت کوئی ایسی چیز نہیں جسے کسی معاشرے یا تہذیب نے کچھ عرصہ سے عارضی یا مستقل طور پر اختیار کرلیا ہو بلکہ یہ وہ چیز ہے جو کسی تہذیب کی بنیاد ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ روایت کا تعلق ایک ایسے مابعد الطبیعیاتی نظام سے

ہے جس سے کسی تہذیب کی ساری شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ مذہب' اخلاق' معاشرت اور علوم و فنون کے سارے اصول اسی مابعد الطبیعیاتی نظام سے اخذ کیے جاتے ہیں اور اسی کے تابع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں عسکری صاحب کا کہنا ہے کہ مرکزی روایت ہمیشہ ایک ہوتی ہے اور معاشرے کی تمام دوسری روایتیں اسی مرکزی روایت سے نکلتی ہیں۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتیں بلکہ ایک دوسرے سے مربوط اور ایک کل کا حصہ ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ روایت نہ عادت کو کہتے ہیں اور نہ ہی رسم و رواج کو بلکہ یہ ان سب سے زیادہ بنیادی چیز ہے۔ ایک ایسی چیز جو نہ تو کبھی زمانے کے ساتھ تبدیل ہوتی ہے نہ ترقی کرتی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔

عسکری صاحب کے بہ قول روایت کا یہ تصور ایلیٹ تو ایلیٹ پورے جدید مغرب میں ناپید ہے۔ لہٰذا ان کا کہنا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب کسی طرح روایتی تہذیب کے دائرے میں نہیں آتی۔ کیوں کہ اس میں روایت کا وجود ہی نہیں۔ روایت کیا ہے۔ مشرق کی کون کون سی تہذیبیں مکمل طور پر روایتی تہذیبیں ہیں' اور کون کون سی روایتی ہونے کے باوجود نامکمل ہیں۔ یہ سب باتیں عسکری صاحب نے اپنے مضامین میں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔ روایتی تہذیبوں کے مقابلہ پر مغرب کی موجودہ تہذیب کو عسکری صاحب غیر روایتی تہذیب کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کا تعلق حقیقت کے روایتی تصور سے نہیں ہے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ ایلیٹ کے ہاں روایت بدلتی بھی ہے اور اس میں ترقی یا اضافہ بھی ہوتا ہے۔ جب کہ عسکری صاحب کے نزدیک روایت نہ تو بدلتی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی ترقی یا اضافہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی عسکری اور ایلیٹ کے تصور روایت میں اس فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عسکری صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے:

> ایلیٹ کے نزدیک روایت بدل سکتی ہے لیکن ابن عربی کے تصورات کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ ان میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں۔

یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن اس سے ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا ہوتی ہے کہ عسکری صاحب کے ہاں روایت کا مفہوم جمود یا بے حرکتی کے مترادف ہے یعنی پرانی چیزوں کو اسی طرح دہرائے چلے جانا جیسی کہ وہ ہیں' روایت ہے۔ اس کے برعکس پرانی چیزوں کو چھوڑ کر نئی چیزوں کو اختیار کرنا جدیدیت ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی غلط فہمی ہے جس نے ادب' تہذیب اور تہذیبی سفر کے سارے تصورات کو چوپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہر آن بدلتی ہوئی زندگی میں روایت کو قایم رکھنا ہمارے لیے اول تو ممکن ہی نہیں اور اگر بالفرض ممکن ہو بھی تو پسندیدہ نہیں۔ کیوں کہ پرانی چیز بہرحال پرانی چیز ہے۔ اسی لیے ہم پرانی چیز کو چھوڑ کر نئی چیز کی طرف بھاگتے ہیں۔ روایتی نقطۂ نظر سے یہ تصور نہ صرف غلط ہے بلکہ انتہائی گمراہ کن اور مضر بھی ہے۔ عسکری صاحب کے ہاں روایت کے معنی اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ کائنات کی ہر چیز آفاقی' دائمی اور ناقابلِ تغیر اصولوں کی تابع ہے۔ اس لیے اصول کو ہمیشہ اپنی جگہ قایم

رکھتے ہوئے ہر زمانے کی بدلتی ہوئی صورت حال پر اس کا اطلاق کرنا روایت ہے۔ اصول غیر متغیر ہیں مگر حالات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ تغیر پذیر حالات پر غیر متغیر اصول کو منطبق کرنا روایت کا ایک لازمی عمل ہے۔ لہٰذا روایت کو جمود اور بے حرکتی کے مترادف سمجھنا درست نہیں۔ لیکن یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ روایت زمانے کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ اس لیے کہ روایت تو کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو زمانے کی تبدیلیوں میں اپنے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ بالفاظ دیگر روایت اعادہ یا تکرار نہیں کرتی' بلکہ نو بہ نو شکلوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ روایت کی باز آفرینی ہے' اعادہ یا تکرار نہیں۔ حافظ سے میر تقی میر تک اور میر تقی میر سے داغ تک اردو اور فارسی غزل کے موضوعات' رموز و علایم' تشبیہات و استعارات ایک ہیں۔ لیکن میر کی غزل نہ تو حافظ کی غزل کی تکرار ہے اور نہ ہی داغ کی غزل میر کی غزل کا اعادہ ہے۔ یہ نہ تکرار ہے نہ اعادہ۔ یہ روایت کا ظہور نو ہے جو ہر زمانے میں نو بہ نو شکلیں اختیار کرتا ہوا زمانے کی تبدیلیوں میں اپنے تسلسل کو برقرار رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روایت کبھی نئی یا پرانی نہیں ہوتی۔ یہ بہ یک وقت نئی بھی ہوتی ہے اور پرانی بھی۔ یہ ایک نہایت اہم اور بنیادی بات ہے جو ہمیں عسکری صاحب کے تصور روایت کے حوالے سے یاد رکھنی چاہیے۔

عسکری صاحب نے کہا تھا کہ "روایتی ادب اور روایتی فنون صرف روایتی معاشرے ہی میں پیدا ہو سکتے ہیں اور روایتی معاشرہ وہ ہے جو مابعد الطبیعیات کی بنیاد پر قایم ہو۔" لہٰذا سوال پیدا ہوا کہ یہ مابعد الطبیعیات ہے کیا؟ سو عسکری صاحب نے شاہ وہاج الدین کی تصنیف "الکہف والرقیم" کے دیباچہ سے مابعد الطبیعیات کے اس تصور کا حوالہ بھی پیش کر دیا جو بہ قول ان کے روایت کی جڑ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ادب اگر اس تصور کی بنیاد پر قایم ہے تو وہ روایتی ہے' ورنہ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی عسکری صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مابعد الطبیعیات کے اس تصور سے ادب کو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت کو جانچنے کے چند اصول بھی نکلتے ہیں جو شاہ وہاج الدین نے بیان کر دیے ہیں۔ چناں چہ کسی ادب پارے کو روایتی نقطہ نظر سے جانچنے کا جو معیار شاہ وہاج الدین نے پیش کیا' عسکری صاحب نے اس کا اطلاق حالی' نظیر اکبر آبادی' رتن ناتھ سرشار اور فیض احمد فیض پر کر کے بھی دکھایا۔ اب ہمارے محترم ڈاکٹر جمیل جالبی یہ تو مانتے ہیں کہ عسکری صاحب نے روایت کے تصور کو بہت وسعت دی اور اس کی اہمیت کو بھی طرح طرح سے واضح کیا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ آج کے دور میں جب مشرق کے دوسرے روایتی معاشروں کی طرح ہمارا معاشرہ بھی جو کبھی مابعد الطبیعیات کی بنیاد پر قایم تھا' اپنی مابعد الطبیعیات سے ہٹ چکا ہے' ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آخر ہم تیزی سے ٹوٹ پھوٹ کر بدلتے ہوئے اس معاشرتی ماحول میں روایتی معیار کیسے نافذ کر سکتے ہیں اب گو کہ ڈاکٹر صاحب کے اس سوال سے یہ بات تو واضح نہیں ہوتی کہ یہ سوال معاشرے کے حوالے سے کیا گیا ہے یا ادب کے' لیکن چوں کہ ایک تو عسکری صاحب غیر روایتی معاشرے میں روایتی معیارات نافذ کرنے کی بات نہیں کرتے' دوسرے خود ڈاکٹر صاحب کے

مضمون کا تعلق بھی معاشرے سے نہیں' ادب سے ہے' اس لیے ان کا سوال بھی دراصل ادب ہی سے متعلق معلوم ہوتا ہے اور ادب کے حوالے سے اس سوال کے دو رخ ہو سکتے ہیں۔ ایک تخلیق کی طرف دوسرا تنقید کی طرف۔ تخلیق کے بارے میں چوں کہ عسکری صاحب کا کہنا یہ ہے کہ روایتی ادب اور روایتی فنون روایتی معاشرے ہی میں پیدا ہو سکتے ہیں اور روایتی معاشرہ وہ ہے جو مابعد الطبیعیات کی بنیاد پر قایم ہو' اس لیے ڈاکٹر صاحب بھی ان کے اس موقف کو زیرِ بحث لا کر یہ سوال اٹھانا نہیں چاہتے کہ روایتی ادب غیر روایتی معاشرے میں کیوں پیدا نہیں ہو سکتا۔ یوں بھی چوں کہ ڈاکٹر صاحب کا پورا مضمون تنقید ہی کے بارے میں ہے اس لیے ان کا سوال بھی تنقید ہی سے متعلق معلوم ہوتا ہے' تخلیق سے نہیں' چناں چہ آگے چل کر وہ اپنے سوال کو خود ہی وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ کیا عسکری صاحب کا معیار' روایت نئی ادبی تنقید کا معیار بن سکتا ہے؟ ان کا کہنا ہے کہ وہ ادب جو گزشتہ سو سال سے ہمارے معاشرے میں پیدا ہو رہا ہے' وہ بھی اب بجائے اپنی روایت کی طرف دیکھنے کے مغرب کی طرف دیکھ رہا ہے اور اسی سے روشنی حاصل کر رہا ہے۔ اس لیے روایتی معاشرے کے اصول و اقدار کا اطلاق ہم اس ادب پر کیسے کر سکتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ حالی سے پہلے کے ادب کا مطالعہ تو ہم ان اقدار کی رو سے ضرور کر سکتے ہیں لیکن حالی کے وقت سے لے کر آج تک پیروی مغربی کی راہ پر چلنے والے جدید ادب کا مطالعہ روایتی اصول و اقدار کی رو سے نہیں کر سکتے۔ جہاں تک سماجی تنقید' تاثراتی تنقید' نفسیاتی تنقید اور جمالیاتی تنقید وغیرہ کا تعلق ہے تو ڈاکٹر صاحب ان تنقیدی مکاتب فکر کے بارے میں یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ چوں کہ یہ مکاتب فکر اپنے اپنے محدود نقطہ نظر سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اس لیے ان کے تنقیدی نقطہ نظر کا نتیجہ ادھوری اور یک رخی تنقید کی صورت میں سامنے آتا ہے لیکن یہ نہیں کہتے کہ ان کے تنقیدی اصول و معیارات کا اطلاق جدید ادب پر نہیں ہو سکتا۔ جب کہ "روایت کی بازیافت" والے رجحان کے بارے میں ان کا اصل سوال ہی یہ ہے کہ کیا اس کے اصول و معیارات کا اطلاق جدید ادب پر ہو سکتا ہے۔ اور اس سوال کا جواب بھی ان کے نزدیک نفی میں ہے۔

اچھا' اس سے پہلے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کے اس سوال پر غور کریں' آیئے ذرا اس سوال کو پلٹ کر دوسرے رخ سے بھی دیکھ لیں۔ دوسرا رخ اس سوال کا یہ ہے کہ مغربی معاشرہ جو کبھی مابعد الطبیعیات کی بنیاد پر قایم تھا' قرونِ وسطیٰ کے بعد اپنی مابعد الطبیعیات سے ہٹ کر ایک قطعی غیر روایتی معاشرے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور اس غیر روایتی (یا جدید) معاشرے میں پیدا ہونے والا تخلیقی اور تنقیدی ادب بھی اب روایت کی بجائے غیر روایتی اصولوں کی بنیاد پر تخلیق ہو رہا ہے۔ اس لیے اس ادب کے غیر روایتی اصول و اقدار اور معیارات کا اطلاق ہم حالی سے پہلے کے روایتی شعر و ادب پر کیسے کر سکتے ہیں؟ اب اگر کوئی اس سوال کا جواب نفی میں دے تو آپ یقیناً اس کی بے خبری پر خندہ زن ہوں گے اور اسے بتانا ضروری سمجھیں گے کہ بھائی ہم تو حالی کے وقت سے لے کر آج تک اپنے روایتی یا کلاسیکی ادب کو بھی مغرب ہی کے معیارات سے پرکھ کر قبول یا رد کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یوں بھی آج اردو ادب کا ایسا کون

طالب علم ہو گا جو حالی کے بارے میں یہ نہ جانتا ہو کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ ہمیں پیرویِ مغربی کی تعلیم دی بلکہ خود بھی پیرویِ مغربی کے تقاضوں کے عین مطابق مغرب کے ادبی معیاروں کا اطلاق اردو شاعری پر کرکے اس میں ہزار کیڑے ڈالے۔ اس کے بعد حالی سے لے کر آج تک اردو کے نقادوں کا ایک پورا سلسلہ ہے جو حالی سے پہلے کے اردو شعر و ادب کو مغرب ہی کے ادبی معیاروں سے دیکھتا چلا آرہا ہے۔ اس سلسلے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے تو خیر ایک پورے دفتر کا دفتر درکار ہے۔ لیکن یہاں صرف چند ایک مختصر سی لیکن دلچسپ مثالیں دیکھتے چلیے۔

مغرب میں جب یہ خیال عام ہوا کہ سائنس کے چمکتے ہوئے سورج کے آگے شاعری کا چراغ جلنا مشکل ہے تو او پیکاک نے شاعر کو مہذب دنیا میں "نیم وحشی" قرار دیا۔ سنتیانا نے "نیم وحشی" کی یہ پھبتی براؤننگ کے ڈرامائی مونولاگز پر کسی۔ وہاں سے کلیم الدین احمد لے اڑے اور (سنتیانا یا پیکاک کا حوالہ دیے بغیر) اسے اردو غزل پر چپکا دیا۔ یوں بھی کلیم الدین احمد صاحب اردو میں کلاسیکی مغربی تنقید کے نمایندے سمجھے جاتے ہیں۔ اور کلاسیکی مغربی تنقید کے اصولوں کی رو سے ایک فن پارے کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ ایک وحدت یا کل ہو۔ اس کے اجزا باہم مربوط ہوں اور ان میں توازن، تناسب اور ہم آہنگی پائی جائے۔ چناں چہ کلیم الدین احمد صاحب کلاسیکی مغربی تنقید کے ان اصولوں کا اطلاق اردو غزل پر کرتے ہیں تو انھیں غزل ربط و تسلسل سے عاری ایک ایسی صنف سخن نظر آتی ہے جس پر "نیم وحشی" کی یہ پھبتی ہر اعتبار سے درست نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح عسکری صاحب نے مغرب کے ناولوں سے ایک معیار اخذ کرکے اسے سچی اور بڑی شاعری کا معیار قرار دیا۔ چناں چہ ان کے نزدیک سچا اور بڑا شاعر وہ ہے جو اپنی شاعری میں اعلیٰ ترین زندگی کو عام ترین زندگی سے ہم آہنگ کرسکے۔ اب سچے اور بڑے شاعر کی یہ تعریف چاہے صحیح ہو یا غلط، مگر یہ حقیقت ہے کہ عسکری صاحب نے سچی اور بڑی شاعری کا یہ معیار پروست (Proust) اور جوائس (Joice) کے ناولوں سے اخذ کیا اور اسے میرؔ کی غزل پر منطبق کرکے جدیدیت کی تازہ ترین منزل سے تعبیر کردیا۔ اور اس معیار کے حوالے سے میرؔ کے ہاں جدید ترین جدیدیت کے عناصر بھی غالبؔ سے کہیں زیادہ دریافت کرلیے۔ اب مزے کی بات یہ ہے کہ یہی وصف ہمارے محترم ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی میرؔ کے ہاں ڈھونڈ نکالا اور حسن عسکری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ۔

> ان کا ہر تجربہ اعلیٰ اور عام کو ایک بنا کر پیش کرتا ہے۔ ایسا عام جو اعلیٰ ہے اور ایسا اعلیٰ جو عام ہے۔ یہی وہ تخلیقی عمل ہے جو میرؔ کو میرؔ بناتا ہے۔ حسن عسکری نے لکھا کہ میرؔ کی کشمکش کا ماحصل یہ ہے کہ اعلیٰ ترین زندگی کو عام ترین زندگی سے ہم آہنگ بنایا جائے۔ اس اعلیٰ ترین زندگی کا نام ان کے ہاں عشق ہے۔
>
> (محمد تقی میرؔ از ڈاکٹر جمیل جالبی صفحہ ۱۱۷)

غرض یہ کہ ہم تو حالی سے لے کر کلیم الدین احمد تک اور کلیم الدین احمد سے لے کر محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر جمیل جالبی تک، حالی سے پہلے کے اردو ادب پر مغرب ہی کے غیر روایتی اصولوں اور

معیاروں کا اطلاق کر کے اسے قبول یا رد کرتے چلے آرہے ہیں۔ چناں چہ حالی اور کلیم الدین احمد جہاں انھی معیاروں کا اطلاق کر کے اردو غزل میں کیڑے ڈالتے ہیں وہاں حسن عسکری اور جمیل جالبی انھی معیاروں کی مدد سے میر کو بڑا شاعر ثابت کرتے ہیں۔ حالی کے وقت سے لے کر ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور تک اگر ہمارے ہاں بالعموم اپنے روایتی یا کلاسیکی ادب کو مغرب کی آنکھ سے دیکھ کر رد کرنے کا رجحان غالب تھا تو اس کے بعد انھی معیارات کی کسوٹی پر کس کے اسے قبول کرنے، بلکہ اس میں عظمت کے عناصر تلاش کرنے کا رجحان پروان چڑھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے سوال کو اس طرح پلٹ کر دوسرے رخ سے دیکھنے کے بعد ہم ان کے سوال کا جواب آسانی سے دے سکتے ہیں۔ لیکن ان کے سوال کا جواب دینے سے پہلے اب اگر ایک سوال خود ڈاکٹر صاحب سے بھی پوچھ لیا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ سو ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر ہم حالی سے پہلے کے روایتی اردو ادب پر مغرب کے غیر روایتی ادبی معیارات کا اطلاق کر سکتے ہیں تو حالی کے بعد پیروی مغربی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے غیر روایتی (یا جدید) ادب پر روایتی معاشرے کے اصول و اقدار کا اطلاق کیوں نہیں کر سکتے؟ ڈاکٹر صاحب جواب میں کوئی وجہ بتائے بغیر کہتے ہیں کہ "میرے خیال میں اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔" لیکن اس کے ساتھ ہی وہ شاہ وہاج الدین اور عسکری صاحب کے ہاں سے جدید ادب پر روایتی معیار تنقید کے اطلاق کی چند مثالیں بھی اپنے مضمون میں پیش کر کے اپنی تردید آپ کر بیٹھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر صاحب ہمیں بتاتے ہیں کہ عسکری صاحب کے نزدیک روایتی ادبی تنقید کا ایک معیار شاہ وہاج الدین کی تصنیف "الکہف والرقیم" کے درج ذیل اقتباس میں پیش کیا گیا ہے :

> انسان کے پیش نظر معرفت کے صرف دو ہی تعینات ہیں۔ انفس اور آفاق .... تکمیل اس میں ہے کہ دونوں کی شناخت ایک ساتھ ہو، اور انفس کی شناخت کو آفاق کی شناخت پر غلبہ ہو۔ کیوں کہ آفاق جسم ہے اور انفس اس کی روح ہے۔ کیوں کہ آفاق میں کسی چیز کا وجود بلا انفس کے ادراک کے نہیں پایا جاتا۔ پس رونگٹا رونگٹا انفس کا آفاق کے لیے عالم عالم ہے۔ اسی لیے پچھلی صدیوں سے شاعری ہر زبان کی بہ شمول آفاق کے انفس کو غلبہ دے کر مکمل سمجھی گئی ہے۔

اور شاہ وہاج الدین نے اس معیار کا اطلاق اردو کی نیچرل شاعری پر کر کے جو تنقید فرمائی وہ بھی انھوں نے اسی اقتباس کے تسلسل میں آگے درج کر دی۔ ملاحظہ ہو :

> اس زمانے کی نیچرل شاعری جو بہت پسندیدہ کہی جاتی ہے وہ ناتمام ہے کیوں کہ اس میں صرف آفاق ہی کو لیا ہے اور انفس کو جو آفاق کی جان ہے چھوڑ دیا ہے۔ لہذا یہ شاعری مثل ایک جسم بے جان کے ہے۔

شاہ وہاج الدین کی طرف سے نیچرل شاعری پر انفس و آفاق والے روایتی معیار کے اطلاق کے بعد

اب یہ بھی دیکھیے کہ نظیر اکبر آبادی کے شاعرانہ مرتبہ و مقام کے بارے میں جو قضیہ عہد جدید میں کھڑا ہوا عسکری صاحب اسے شاہ وہاج الدین والے اسی معیار کی رو سے کس طرح نمٹاتے ہیں۔ میں یہاں ڈاکٹر صاحب کے پیش کردہ ادھورے اقتباس کی بجائے عسکری صاحب کے مضمون سے پورا اقتباس نقل کر رہا ہوں۔ عسکری صاحب کہتے ہیں :

> ہمارے یہاں بھی اردو ادب کی روایت کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کا چرچا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہم ایلیٹ کی اس بات کو بھی سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ہر نسل ادب کو نئے طریقے سے پڑھتی ہے۔ نئے طریقے سے پڑھنے کے ضمن میں ایک خاص مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو ادب کی روایت میں نظیر اکبر آبادی کا کیا مقام ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی عوامی مقبولیت کے باوجود سو سال پہلے تک انھیں ادب میں کوئی اونچا مقام نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے بعض نے کہا کہ پہلے زمانے میں لوگوں کا ذوق پست تھا۔ دوسروں نے اسے چند معاملات میں ذوق کی کوتاہی کا نتیجہ سمجھا۔ اور بعض نے کہا کہ جاگیرداروں کے زمانے میں عوام کے نمایندوں کو حقیر سمجھا ہی جانا چاہیے تھا۔ لیکن آپ دیکھیں تو ان میں سے ہر بات کچی ہے۔ شاہ وہاج الدین والا معیار آزما کے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ قصہ کیا ہے۔ روایتی معاشرے میں نظیر اکبر آبادی جیسے شاعروں کا بھی ایک خاص فریضہ ہے اور اس لحاظ سے ان کی قدر بھی کی گئی۔ لیکن نظیر کی شاعری کے بیشتر حصے میں آفاق کا عنصر غالب ہے' اور انفس کا عنصر کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں بڑے شاعروں کی صف میں نہیں رکھا گیا اور ان کی تعریف سب سے پہلے کی تو ایک انگریز فیلن نے (۳۳)۔

اب یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ عسکری صاحب نے ایک طرف تو نظیر اکبر آبادی کو جو مقام اردو ادب کی روایت میں سو سال پہلے تک دیا گیا تھا' اس کا جواز شاہ وہاج الدین والے معیار کی رو سے پیش کر کے دکھا دیا۔ اور دوسری طرف نظیر اکبر آبادی والے قضیہ کے حوالے سے جدید دور کے بعض تنقیدی رویوں کی خامی بھی اسی معیار کی رو سے ظاہر کردی۔ اسی طرح عسکری صاحب نے اپنے معیار روایت کی رو سے حالی کے بارے میں یہ کہا کہ :

> بہ ظاہر تو حالی روایت کے شاعر نظر آتے ہیں مگر ان کی نعت تک دیکھ لیجے الفاظ تو روایتی استعمال کر رہے ہیں مگر مابعد الطبیعیات کو چھوڑ کر اخلاقیات ڈال رہے ہیں۔ حالی نے اردو ادب کو بہت فایدہ پہنچایا۔ لیکن روایت کے نقطۂ نظر سے ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری سے مابعد الطبیعیات کو خارج کیا۔

تو یہ بھی حالی پر روایتی معیار کا اطلاق کر کے ہی کہا ہے۔ گویا ایک طرف تو عسکری صاحب نے یہ دکھا دیا کہ

شاہ وہاج الدین اپنے معیار روایت کا اطلاق اردو کی نیچرل شاعری پر کرکے اس کی کمزوری کس طور پر ظاہر کرتے ہیں اور دوسری طرف خود انھوں نے نظیر اکبر آبادی والا قضیہ بھی اسی معیار کی رو سے نمٹادیا۔ اب خواہ ہمیں روایتی معیار تنقید کے اطلاق سے برآمد ہونے والے ان نتائج سے اتفاق ہو یا اختلاف لیکن ہم اس بات سے انکار نہیں کرسکتے کہ عسکری صاحب اپنے معیار روایت کا اطلاق حالی پر بھی کرتے ہیں اور حالی کے علاوہ سرشار کی نثر اور فیض صاحب کی شاعری پر بھی۔ سرشار اور فیض کا حوالہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں نہیں دیا۔ البتہ غالب کے بارے میں عسکری صاحب کا یہ فقرہ ضرور نقل کیا ہے :

> "ان کا کلام ہمارے لیے ایک پردہ بن گیا ہے جو اصل روایت کو دیکھنے نہیں دیتا۔"

سو غالب کے کلام پر ایک مختصر سے جملے میں اتنا عمدہ، اتنا بھرپور اور اتنا جامع تبصرہ جس میں روایت کا پورا نقطۂ نظر سمٹ کر آگیا ہو، عسکری صاحب کے سوا شاید ہی کوئی اور کرسکتا تھا۔ اب اگر کوئی پوچھے کہ غالب کا کلام روایت کا پردہ کیسے بن گیا تو اس بات کی وضاحت کے لیے ہم ذیل میں ڈاکٹر صاحب ہی کے ایک مضمون کا اقتباس درج کرتے ہیں جو گویا ایک طرح سے عسکری صاحب کے اس جملے ہی کی تشریح ہے۔

> غالب کے دور تک شاعری کی یہ روایت اور تہذیب کا وہ نظام جس نے اس روایت کو اپنی کوکھ سے جنم دیا، زندہ و سالم تھا۔ اسی لیے اس روایت میں شاعری کرنے والا شاعر ذوق، جس کا طرزِ احساس اور فکری ادراک اسی روایت کی لکیر پر چل رہا تھا، اس دور کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اور غالب کی شاعری کا چراغ اس کے آگے نہیں جلتا تھا۔ غالب کی شاعری اس روایت کے دائرے کو توڑ کر ایک نیا دائرہ بناتی ہے جو اس طرزِ احساس کا دائرہ ہے جس میں نئی دنیا کا رنگ و آہنگ، فکر و احساس اور شعور و ادراک کروٹیں لے رہا ہے۔ اسی لیے جب تک روایتی طرزِ احساس کا نظام زندہ رہا، ذوق بڑے شاعر رہے اور جیسے ہی جدید فکر کی روشنی نے معاشرے کو متاثر کرکے بدلنا شروع کیا، غالب کی شاعری کا سورج نصف النہار پر آکر چمکنے لگا۔ .... ذوق اور غالب دو مختلف دائروں اور دو مختلف طرزِ احساس کے شاعر ہیں .... غالب کی شاعری میں قدیم روایت ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوجاتی ہے اور یہ فرزندِ آذر اپنی روایت کا ایک الگ دائرہ بناتا نظر آتا ہے جس میں ہمارا جدید شعور و ادراک "ہم" آپ سب کھڑے ہیں (۵*)۔

ڈاکٹر صاحب کی اس تشریح کے بعد اب ہمیں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی ڈاکٹر صاحب اپنے زیر بحث مضمون میں اس بات کو خود ہی مزید کھول کر بیان کرچکے ہیں۔ ان کے اس مضمون کا اقتباس بھی ایک بار پھر دیکھ لیجیے۔

> حسن عسکری صاحب جب ان معیاروں کا اطلاق ادب پر کرتے ہیں تو انھیں ذوق کی شاعری غالب کی شاعری سے بہتر نظر آتی ہے۔ لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ جب ہم ذوق اور غالب دونوں کو ایک ساتھ پڑھتے ہیں تو ہمیں غالب کی شاعری اچھی لگتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا سارا معاشرہ اور اس کے ساتھ ہمارا مذاق سخن سب کچھ بدل گیا ہے اور اس بدلے ہوئے منظر میں ہمیں غالب کے سامنے ذوق کی شاعری پسند نہیں آسکتی۔

اب غور کیجیے کہ مندرجہ بالا اقتباسات میں ایک طرف تو ڈاکٹر صاحب خود ہی یہ بات بہ خوبی واضح کردیتے ہیں کہ غالب کا کلام روایت کا پردہ کیسے بن گیا اور دوسری طرف یہ بات بھی تسلیم کرلیتے ہیں کہ وہ چاہے ذوق جیسا روایتی طرزِ احساس کا شاعر ہو یا غالب جیسا جدید شعور و ادراک کا شاعر' دونوں کی شاعری کے بارے میں عسکری صاحب کا فیصلہ دراصل ان دونوں پر روایتی معاشرے کے ادبی معیاروں کے اطلاق ہی کا نتیجہ ہے۔ گویا اس اطلاق سے تو خود ڈاکٹر صاحب کو بھی کوئی انکار نہیں خواہ وہ اس کے نتائج کو پسند کریں یا نہ کریں۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب کا اس اطلاق کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کے بارے میں یہ سوال کہ یہ اطلاق کیسے ممکن ہے۔ کم از کم ہم جیسے نافہموں کے لیے تو۔

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

اور خواہ ہم اس معمہ کو حل کرسکیں یا نہ کرسکیں 'مگر ڈاکٹر صاحب کا سوال بہرصورت وہی ہے جسے انھوں نے ہر مرتبہ ایک مختلف پیرائے میں پیش کیا ہے فرماتے ہیں :

> ہمارا معاشرہ اپنی مابعدالطبیعیات سے چوں کہ ہٹ گیا ہے۔ اس لیے روایتی معاشرے کے ادبی اصول و اقدار کا اطلاق ہم اپنے جدید ادب پر کیسے کرسکتے ہیں۔ حالی سے پہلے کے ادب کا مطالعہ تو ہم ان اقدار سے ضرور کرسکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ....

خیر' حالی سے پہلے کی شاعری کو روایتی یا کلاسیکی قرار دے کر حالی سے جدید شاعری کا آغاز کرنے والا کلیہ ویسے تو ٹھیک ہے۔ لیکن حالی سے پہلے غالب' جو خود ڈاکٹر صاحب ہی کے بہ قول جدید طرزِ احساس اور جدید شعور و ادراک کا شاعر ہے' اس کلیہ کو توڑ دیتا ہے۔ یوں بھی جیسا کہ سلیم احمد کہتے ہیں "جدید شاعری کرنے اور جدید شاعری کی بنیاد ڈالنے والے حالی کی شاعری غالب کے مقابلہ پر کچھ یوں ہی سی جدید ہے۔ جب کہ غالب اردو شاعری میں جدیدیت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس کے بعد کوئی اور ایسا شاعر پیدا نہیں ہوا جس کی ذات میں جدیدیت کی اتنی خصوصیات جمع ہوں" (۲*)۔ اب اگر روایتی معیاروں کے اطلاق کے نتیجے میں عسکری صاحب کو ذوق کی شاعری غالب کی شاعری سے بہتر نظر آتی ہے تو خواہ ہم اس اطلاق کے نتائج کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب جیسے جدید شاعر کو روایتی معیاروں سے دیکھے بغیر ذوق سے کم تر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چناں چہ اب یہ بات تو خود ڈاکٹر صاحب ہی کے

پیش کردہ حوالوں کی رو سے ظاہر ہو گئی کہ عسکری صاحب کے معیار روایت کا اطلاق جدید ادب پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا روایتی معیار تنقید کے اطلاق کی ان مثالوں کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کچھ ایسا درست نہیں کہ عسکری صاحب کے معیار روایت کا اطلاق جدید ادب پر نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ تو عین ممکن ہے کہ عسکری صاحب نے شعر و ادب کی قدر و قیمت کے جو معیارات روایت کے نقطہ نظر سے بیان کیے ہیں 'عملی تنقید کرتے ہوئے ان کے اطلاق میں ان سے کہیں کوئی چوک ہو جائے اور نتیجہ کے طور پر وہ جو فیصلہ کریں وہ ہمارے لیے قابل قبول نہ ہو۔ چناں چہ ہمیں ان کے اطلاق کے نتائج سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن ہم بجائے خود اس اطلاق سے انکار نہیں کر سکتے۔ یوں بھی عسکری صاحب نے شعر و ادب کی تنقید کے سلسلے میں کوئی ایک شاہ وہاج الدین والے معیار ہی کو حرف آخر قرار نہیں دیا بلکہ مولانا اشرف علی تھانوی جیسے لوگوں کے حوالے سے روایت کے تنقیدی اصول و معیارات کا ذکر کرنے کے علاوہ روایتی تصور حقیقت کے حوالے سے خود بھی ان اصولوں اور معیاروں کی توضیح کی ہے جو روایت کے نقطہ نظر سے شعر و ادب کی قدر و قیمت کے تعین کے سلسلے میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن یہاں ہم یہ بات بھی واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اصول و معیارات چاہے مشرق کے ہوں یا مغرب کے 'روایتی ہوں یا غیر روایتی' تنقیدی شعور اور بصیرت کے بغیر ان کا بے لچک استعمال ہمارے نزدیک چند در چند خطرات سے خالی نہیں۔ اور تنقیدی اصولوں کو قطعیت کے ساتھ ایک ایسی کسوٹی کی طرح سمجھنا بھی پوری طرح درست نہیں جو اگر ایک بار ہاتھ آجائے تو پھر اس کی مدد سے کسی بھی ادب پارے یا فن پارے کو پرکھ کر اس کی قدر و قیمت بہ آسانی معلوم کی جاسکتی ہو۔ دراصل تربیت یافتہ تنقیدی شعور رکھنے والا نقاد کسی ادب پارے پر اصول و معیارات کا اطلاق میکانکی طور پر کرنے کی بجائے مطالعہ ادب کی واردات کو دل میں اتارتے ہوئے اصول و معیارات کے اطلاق میں ایک ایسی نظر سے کام لیتا ہے جو کسی ادب پارے کی گہرائی میں اتر کر اس کے کھوٹے کھرے کو پرکھ سکے۔ بالفاظ دیگر ادبی تنقید میں اصول و معیارات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ درکار ہوتا ہے۔ لیکن چوں کہ جمیل جالبی صاحب نے اپنے سوال میں اس "اور بہت کچھ" سے کوئی غرض نہیں رکھی۔ اس لیے ہم بھی اپنے جواب میں اسے نظرانداز کرتے ہوئے صرف و محض اصول و معیارات ہی کے حوالے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہماری گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ ہم ادبی تنقید کے سلسلے میں صرف و محض اصول و معیارات ہی کو تنقید کی واحد کسوٹی سمجھتے ہیں اور اس "اور بہت کچھ" کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

اچھا' یہ جو ہم نے ابھی کچھ دیر پہلے شعر و ادب کی قدر و قیمت کے تعین کے سلسلے میں بنیادی اہمیت رکھنے والے ان اصول و معیارات کا ذکر کیا جن کا تعین عسکری صاحب کے بہ قول روایتی تصور حقیقت کے حوالے سے ہوتا ہے' آیئے ذرا آگے بڑھنے سے پہلے ایک نظر ان پر بھی ڈالتے چلیں تو بہتر ہے۔ اپنے مضمون "مشرق و مغرب کی آویزش (اردو ادب میں)" میں عسکری صاحب مشرق اور مغرب کے فرق کو متعین کرنے کے سلسلے میں مختلف نظریات کا جائزہ لینے کے بعد دونوں کے فرق کو مابعد الطبیعاتی تصور

حقیقت کی بنیاد پر متعین کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مشرق کی تمام روایتی تہذیبوں میں حقیقت کا ایک واحد تصور ملتا ہے۔ یہ حقیقت عظمیٰ ظہور کے دائرے سے بالاتر ہے۔ لیکن ظہور بھی اختیار کرتی ہے۔ اس لیے حقیقت کے کئی درجے ہو جاتے ہیں جنھیں اسلامی طریقت کی اصطلاحوں میں لاہوت، جبروت، ملکوت اور ناسوت جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سارے درجے چوں کہ ایک ہی بنیادی حقیقت کے اندر سے نکلے ہیں اور اسی کی بدولت وجود رکھتے ہیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت صرف وہی ایک ہے۔ باقی اس کے ظہور کی مختلف شکلیں ہیں۔ حقیقت کا یہی وہ مابعد الطبیعیاتی تصور ہے جو روایتی معاشرے کی بنیاد ہے۔ اور چوں کہ روایتی معاشرے میں تخلیق ہونے والے ادب و شعر کا فریضہ بھی یہی ہے کہ وہ اس حقیقت کی معرفت حاصل کرنے میں بساط بھر انسان کی مدد کرے۔ اس لیے اس معاشرے میں شعر و ادب کی تنقید کے معیار بھی اسی تصور حقیقت کے حوالے سے متعین ہوتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت عسکری صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں :

> چوں کہ مشرق کے نظام اقدار میں انسان کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کو پہچانے۔ اس لیے جو انسانی سرگرمی ہمیں حقیقت کے جتنے قریب لائے گی وہ اتنی ہی قابل قدر ہوگی اور جتنی دور لے جائے گی قدر و قیمت میں اتنی ہی کم ہوتی جائے گی۔ مشرق میں چوں کہ ساری انسانی سرگرمیاں اسی پیمانے سے ناپی گئی ہیں اس لیے ایک انسانی سرگرمی کی حیثیت سے شعر و ادب پر بھی یہی معیار عاید ہوتا ہے(*۷)۔

اس معیار کے حوالے سے عسکری صاحب ہمیں بتاتے ہیں :

> حقیقت کے سارے درجے چوں کہ اسی ایک بنیادی حقیقت کے اندر سے نکلے ہیں اور چوں کہ عالم کثیف کا پست ترین درجہ بھی بالآخر حقیقت عظمیٰ سے منسلک ہے اس لیے کسی طرح کی حقیقت کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک شعر حقیقت کے کسی بھی درجہ سے متعلق ہو سکتا ہے۔ اور اس درجہ کی نوعیت کے اعتبار سے اس کی قدر و قیمت کا فیصلہ ہوگا۔ لیکن شعر چاہے عالم کثیف کے پست ترین درجے سے ہی متعلق کیوں نہ ہو، آپ اسے شاعری کے دائرے سے باہر نہیں نکال سکتے بشرطیکہ وہ ادبی معیار پر بھی پورا اترتا ہو(*۸)۔

اب اس رویّے کو عسکری صاحب نے نظریے کی شکل میں جس طور پر بیان کیا ہے وہ یہ ہے :

> اگر کوئی شعر ادبی معیاروں پر پورا اترتا ہے تو وہ شاعری کے دائرے میں داخل ہے۔ اگر اس کے ساتھ وہ عرفان حقیقت میں بھی معاون ہے تو عظیم شعر ہے ...... لیکن اگر یہ شعر عالم ناسوت کے اندر ہی رہ گیا تو اس کی قدر و قیمت کم ہوئی، مگر عالم انسانی کے دائرے میں پھر بھی اہمیت کا حامل رہا۔ اگر یہ شعر عالم

ناسوت کے پست ترین مظاہر یعنی انسان کے کم ترین افعال اور خواہشات کی نمایندگی کرتا ہے تو یہ شعر تو پھر بھی رہا لیکن قدر و قیمت کے اعتبار سے بہت ہی گھٹیا ہو گیا(*۹)۔

اب اگر روایتی معاشرے کے اس ہمہ گیر اور جامع معیار نقد و نظر کی رو سے دیکھا جائے جو حقیقت کے تمام بلند و پست درجات پر محیط ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا جدید ادب چوں کہ (بعض مستثنیات کو چھوڑ کر) زیادہ تر عالم ناسوت ہی کے پست درجہ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے بہ حیثیت مجموعی پست درجہ کا حامل ہے۔ عسکری صاحب کے مضمون سے روایتی معیار تنقید کے جو نمونے گزشتہ صفحات میں پہلے ہی گزر چکے ہیں' ان سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جہاں تک مشرق کے روایتی یا کلاسیکی ادب پر مغرب کے ادبی معیارات کے اطلاق کا تعلق ہے' تو اس بارے میں عسکری صاحب کا کہنا یہ ہے :

اور ذوق شعری کو مستقل چیز سمجھ کے یہ کہنا بھی زیادہ صحیح نہیں کہ مشرقی ادب پر مغربی ادب کے معیارات عاید نہیں ہوتے۔ مغرب میں عقل' جذبہ' حسیات اور لاشعور وغیرہ کو سامنے رکھ کر الگ الگ ادبی نظریے بنا دیے گئے ہیں۔ چوں کہ یہ سب عناصر حقیقت ہی کے چند درجات کی نمایندگی کرتے ہیں' اس لیے مغرب کا ہر ادبی نظریہ ایک محدود اور مخصوص دائرے میں مشرقی ادب پر بھی عاید ہو سکتا ہے۔ بس فرق صرف اتنا پڑے گا کہ مشرق کا بہت سا ادب ہر مرتبہ اس دائرے کے باہر رہ جائے گا۔ اور مختلف ادبی عناصر کی وہ قدر و قیمت باقی نہ رہے گی جو پرانے مشرق میں تھی (*۱۰)۔

چناں چہ جس طرح یہ کہنا صحیح نہیں کہ مشرقی ادب (یا روایتی ادب) پر مغربی ادب کے معیارات عاید نہیں ہوتے' اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ مغربی ادب یا ہمارے جدید ادب پر (جو بہ قول ڈاکٹر صاحب مغرب ہی سے روشنی حاصل کر رہا ہے) مشرقی ادب کے روایتی معیار عاید نہیں ہو سکتے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ عاید تو ضرور ہو سکتے ہیں لیکن پہلی صورت میں چوں کہ مغرب کے ادبی نظریات ایک محدود اور مخصوص دائرے ہی میں مشرق کے روایتی ادب پر عاید ہو سکیں گے۔ اس لیے اتنا فرق ضرور پڑے گا کہ مشرق کا بہت سا ادب ہر مرتبہ اس دائرے کے باہر رہ جائے گا۔ اس کے برعکس دوسری صورت میں روایتی معیاروں کی ہمہ گیری اور جامعیت کے مقابلہ میں (بعض مستثنیات سے قطع نظر) ہمارے جدید ادب کا بیشتر حصہ حقیقت کے پست درجات سے متعلق ہونے کی وجہ سے پست درجہ کا نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ وہاج الدین نے اپنے روایتی معیار کا اطلاق اردو کی نیچرل شاعری پر کیا تو آفاق رہ گیا' انفس نکل گیا۔ عسکری صاحب نے اس معیار کا اطلاق حالی اور سرشار پر کیا تو اخلاقیات رہ گئی' مابعد الطبیعیات نکل گئی' فیض صاحب پر کیا تو صرف الفاظ ہی روایتی رہ گئے' معنی غائب ہو گئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بہرحال نہیں

کہ ہمارا قدیم روایتی یا کلاسیکی ادب سارے کا سارا بلند درجے کا ادب ہے بلکہ اس ادب کا تعلق بھی جس حد تک عالم ناسوت یا عالم نفس کے ارذل حصہ سے ہے اس حد تک یہ بھی پست درجہ کا ادب ہی کہلائے گا۔ لیکن اس کا جو حصہ عالم ناسوت کے درجہ سے اوپر اٹھ کر حقیقت کے جتنے زیادہ درجات سے متعلق ہوگا' وہ اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے اتنا ہی بلند تصور کیا جائے گا۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ روایتی معاشرے میں پیدا ہونے والا پست درجہ کا ادب بھی حقیقت کے پست ترین درجات سے متعلق ہونے کے باوجود روایتی ہی کہلائے گا اس لیے کہ یہ ادب اپنے اصول تخلیق کے اعتبار سے حقیقت کے درجہ وار تصور سے وابستہ ہے۔ جب کہ غیر روایتی معاشرے میں پیدا ہونے والا ادب گاہے گاہے حقیقت کے پست ترین درجات سے کسی قدر اوپر اٹھنے کے باوجود غیر روایتی ہی کہلائے گا اس لیے کہ اس کا تعلق حقیقت کے اس درجہ وار تصور سے نہیں جس پر روایتی معاشرے اور روایتی ادب کی بنیاد ہے۔

مگر روایت کی بازیافت کے حوالے سے ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اس رجحان کے علم برداروں میں عسکری صاحب کے علاوہ ایک بہت اہم نام سلیم احمد کا بھی ہے بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ سلیم احمد نے روایت کے تناظر میں شعر و ادب کو جانچنے اور پرکھنے کا کام عسکری صاحب کی نسبت کہیں زیادہ جم کر اور پورے شرح و بسط کے ساتھ انجام دیا۔ عسکری صاحب کا کام اس اعتبار سے تو یقیناً اوّلیت اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے مشرق اور مغرب کے ادب کے فرق کو کسی سطحی بنیاد پر نہیں بلکہ دونوں کے تصورِ حقیقت کی بنیاد پر زیادہ گہرائی میں جا کر واضح کیا۔ اور اردو کی کلاسیکی شاعری کا رشتہ پھر سے اس تصورِ حقیقت سے جوڑ کر دکھا دیا جس کے تحت وہ پیدا ہوئی تھی۔ اسی طرح انھوں نے زندگی کی اس ٹوٹی ہوئی اکائی کو بھی پھر سے جوڑنے کی صورت پیدا کی جو ہمارے ہاں آج سے سوا سو سال پہلے ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن یہ کام انھوں نے جس بڑے علمی' فکری اور عالمی تناظر میں انجام دیا اس میں ان کی توجہ زیادہ تر بنیادی اہمیت کے سوالوں پر مرکوز رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روایت کے حوالے سے بعض تنقیدی معیارات کی نشان دہی کرنے کے باوجود عملی تنقید کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے۔ جب کہ سلیم احمد نے روایت کے تناظر میں شعر و ادب کو پرکھنے کا کام جس شرح و بسط کے ساتھ اور جتنے بڑے پیانہ پر انجام دیا وہ اردو تنقید کی تاریخ میں روایت کے نقطۂ نظر سے اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی تنقید میں روایتی معاشرے کے دوسرے معیارات کے علاوہ بنیادی اہمیت اس بات کی ہے کہ انھوں نے روایتی تہذیب کے "پورے آدمی" کو تنقیدی معیار بنا کر اس کا اطلاق کم و بیش پچھلے سوا سو سال کی پوری شاعری پر کرتے ہوئے "پورے آدمی" کے تقابل میں کسری آدمی کی مختلف صورتوں کی نشان دہی کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے جب پہلی بار اس معیار کا اطلاق "نئی نظم اور پورا آدمی" میں اس دور کی شاعری پر کیا جس کا موضوع رومان تھا تو انھیں اس کی امکانی جہات کا پورا پورا اندازہ کم ہی تھا۔ چناں چہ انھیں "نئی نظم اور پورا آدمی" کے حوالے سے بعض اعتراضات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ حالاں کہ ان کے اس مضمون میں بعض بہت واضح شہادتیں ایسی بھی موجود ہیں جن کی بنیاد پر پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "پورے

آدمی" کا تنقیدی معیار ان کے نزدیک شروع ہی سے ایک مابعد الطبیعیاتی پیمانہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن بعد میں جب اس کی تفصیلات ان کے ذہن میں واضح ہوتی چلی گئیں تو انھوں نے اسے ایک خاص حد تک develop کر کے اس کے روایتی تناظر میں واضح طور پر پیش بھی کیا۔

سلیم احمد کا کہنا تھا کہ ہماری روایتی تہذیب دراصل پورے آدمی کی تہذیب تھی اور پورا آدمی اپنے اجزائے وجود میں داخلی طور پر اپنے اندر بھی ہم آہنگ تھا اور اپنے باہر بھی خارجی حقیقت سے ہم آہنگی کے رشتے میں مربوط تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد روایتی تہذیب کی شکست و ریخت کے ساتھ ساتھ پورا آدمی بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا۔ اور نتیجہ کے طور پر اپنی شخصیت کے اصول وحدت سے محروم ہو کر اپنا تعین اپنے ہی اجزائے وجود میں سے کسی ایک جزو کے ساتھ کرنے لگا۔ یہی وہ کسری آدمی ہے جس کی مختلف شکلیں سلیم احمد نے ہمیں پچھلے سو سوا سو سال کے شعر و ادب میں "پورے آدمی" کے تقابل میں رکھ کر دکھائی ہیں۔ اس کی ایک بہت اچھی مثال ان کا مضمون "حالی سے لامساوی انسان تک" ہے جس میں یہ کسری آدمی ہمیں 'عقلی آدمی' افادی آدمی' جذباتی آدمی' اخلاقی آدمی' روحانی آدمی' سیاسی آدمی' معاشی آدمی' جبلی آدمی' جنسی آدمی اور تجریدی آدمی سے لے کر تخریبی آدمی تک جن جن صورتوں میں نظر آتا ہے' وہ سب پچھلے سو سوا سو سال کی شاعری پر "پورے آدمی" کے اسی معیار کے اطلاق کا نتیجہ ہیں۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی بات بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ اس لیے کہ اپنی روایت کی طرف دیکھنے کی بجائے مغرب کی طرف دیکھنے اور مغرب ہی سے روشنی حاصل کرنے والے ادب کے تنقیدی اصول و معیارات بھی مشرق سے نہیں' مغرب ہی سے آنے چاہییں۔ یہ ایک اصولی بات ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا' ہمارے جدید ادب کو مغربی معاشرے کے اصول و اقدار اور معیارات تنقید کی بجائے روایتی معاشرے کے اصول و اقدار اور معیارات کی رو سے بھی پرکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ اور گو کہ اس ادب پر روایتی معیاروں کی رو سے کی جانے والی تنقید' اس تنقید سے بڑی حد تک مختلف ضرور ہوگی جو تنقید کے مغربی دبستانوں کے زیر اثر وجود میں آتی ہے' پھر بھی اس تنقید سے ہمیں اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ اپنی روایت اور اپنے ماضی سے کٹنے کے بعد ہمارے ادب کی تاریخ کا سفر انحراف کن کن منزلوں سے گزرا ہے۔ اور اپنی اصل سے گریز کے اس سفر میں اس نے کیا کھویا یا کیا پایا ہے۔ یا یہ کہ وہ اپنی قدر و قیمت اور قد و قامت وغیرہ کے اعتبار سے کس حد تک گھٹا یا بڑھا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی مرکزی حقیقت سے غیر متعلق ہونے کے بعد یہ ادب ہمیں اعلیٰ تر حقایق کی طرف لے جانے سے تو بے شک قاصر ہے مگر ان حقایق کے ادراک کے زوال سے جو کیفیات مرتب ہوتی ہیں کم از کم ان کی سرگزشت یہ ادب ہمیں ضرور سناتا ہے۔ اس سرگزشت میں انسانی شخصیت کی شکست و ریخت سے لے کر معاشرے کے اجتماعی تہذیبی بحران تک زندگی کے سفر کی بے جہتی اور بے راہروی سے لے کر زندگی کی بے مقصدیت اور بے معنویت کے احساس تک اور غیر روایتی معاشرے میں معاشرے کے اختلال و انتشار

سے لے کر انسانی باطن کے جہنم بنتے چلے جانے کی داستان تک سبھی کچھ شامل ہے۔ اور یہ ایک ایسی قیمتی شہادت ہے جسے ہم کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔

رہے مغربی معیارات تنقید' تو چوں کہ حالی کے مقدمہ شعرو شاعری کے بعد سے ہماری شاعری ہی کا نہیں' تنقید کا رخ بھی مغرب ہی کی طرف ہو گیا ہے اور ہم اب مشرق کے روایتی تنقیدی معیارات کی بجائے مغرب ہی کے تنقیدی اصولوں اور معیاروں کو اپنا رہے ہیں' لہٰذا ہمارے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ آج کل مغربی تنقید شعرو ادب کی قدر و قیمت کا تعیّن کن معیارات کی بنا پر کرتی ہے۔ اور یہ بھی کہ کیا وہ بہ یک وقت کئی سطحوں کو جذب کر کے اس فکری وحدت کو جنم دے سکتی ہے جو ادب کی پوری اکائی کو ہمارے سامنے لا سکے۔ اس لیے کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کے نزدیک نئی تنقید کا حقیقی منصب دراصل یہی ہے۔

اب اگر پہلے سوال کے جواب میں ہمیں عسکری صاحب کی بات ماننے میں کوئی تامّل نہ ہو تو ان کا کہنا اس سلسلے میں یہ ہے کہ :

> انگریزی ادب کی دنیا میں آج کل کسی کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی کوئی ایسے معیار باقی رہے ہیں جن کے ذریعے اچھے اور برے ادب میں تمیز کی جا سکے۔ ہر لکھنے والا اپنے آپ کو سب سے اچھا لکھنے والا سمجھتا ہے اور کسی معیار کا حوالہ بھی نہیں دیتا۔ اس لیے آج کل ادیب وہ ہے جس کے دعوے کو کچھ لوگ قبول کر لیں۔
>
> (وقت کی راگنی۔ صفحہ ۵۶)

لیجیے معیارات کا قصہ تو یوں پاک ہوا۔ مگر خیال رہے کہ عسکری صاحب نے یہ بات ۱۹۶۰ء میں کہی تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک مغربی ادب میں معیار کا بحران مزید آگے بڑھ کر جس مقام تک پہنچ چکا ہے وہاں تو اب ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔ بہرحال' اب رہا دوسرا سوال' تو اس سلسلے میں ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم بالعموم مغرب کے کسی ایک یا چند نقادوں کے خیالات کی مدد سے شعرو ادب کو سمجھتے یا ان تصوّرات کے مطابق شعرو ادب تخلیق کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اور چوں کہ مغربی تنقید کے بارے میں ہماری معلومات بڑی حد تک محدود ہیں اس لیے ہم اس کے جس حصہ کا انتخاب اپنے مقصد کے لیے کرتے ہیں اس کو مغربی تنقید کے کل کے مترادف سمجھ کر اس پر اپنی تنقید یا تخلیق کی بنیاد رکھ دیتے ہیں جب کہ مغربی تنقید کو اس کی کلیت میں دیکھنے یا اس کو اس کے اہم مکاتبِ فکر کے ساتھ بہ حیثیت مجموعی بہ یک وقت پیشِ نظر نہ رکھ سکنے کی وجہ سے ہمیں بالعموم یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ خود مغرب میں ان تصوّرات و خیالات کے ردّ و قبول کی نوعیت کیا ہے۔ لیکن اس سے ہماری مراد یہ بہرحال نہیں کہ ہمارے ہاں مغربی تنقید کو اس کی کلّیت میں دیکھنے کی ضرورت کا احساس یکسر ناپید ہے۔ اس لیے کہ مغربی تنقید کے شاہکار مضامین کا جو ترجمہ خود ہمارے محترم ڈاکٹر جمیل جالبی نے "ارسطو سے ایلیٹ تک" کے نام سے کیا

ہے وہ دراصل ہماری اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ چناں چہ اگر ہم مغربی ادب کے تنقیدی نظریات کو ایک نظر میں دیکھنے کے لیے' اصل سے نہ سہی' اس ترجمے سے (یا ایسے کسی اور ترجمے سے) رجوع کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مغرب کا ہر نقاد اپنا ایک الگ نظریہ رکھتا ہے جو دوسروں سے نہ صرف یہ کہ مختلف ہے بلکہ اکثر و بیشتر ان کی تردید بھی کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ مغربی تنقید کے باہم متضاد اور متخالف نظریات کے درمیان کسی بھی قسم کی تطبیق ناممکن ہے۔ پھر باہم متضاد اور متخالف نظریات کا جو پریشان کن سلسلہ ہمیں مغربی تنقید میں نظر آتا ہے وہ صرف تنقیدی نظریات ہی تک محدود نہیں مغرب کے فکر و فن اور علم و ادب کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جو اس صورت حال سے مبّرا ہو۔ چناں چہ بھانت بھانت کی بولیوں کے درمیان یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم کس آواز پر کان دھریں اور کس پر نہ دھریں۔ عسکری صاحب نے مغربی تہذیب کی صورت حال کا یہ رنگ دیکھ کر کہا تھا کہ مغربی تہذیب چوں کہ مشترک عقاید اور مشترک اصولوں سے خالی ہے' اس لیے اس کا نتیجہ فکری انتشار کے سوا کسی اور صورت میں برآمد نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ "ارسطو سے ایلیٹ تک" کے مضامین کو توجہ سے پڑھ کر دیکھا جائے تو ہمیں بھی عسکری صاحب کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے بلکہ اتنی بات تو خود جالبی صاحب بھی اپنے مقدمہ کے آخر میں مغرب کے تنقیدی نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے مان لیتے ہیں کہ "ان سب طریقوں میں سے کوئی بھی طریقہ ایسا نہیں جو پورے طور پر قابل قبول ہو۔ یہ سب یک طرفہ ہیں اور ادب جیسے سنجیدہ تخلیقی عمل کے صرف ایک ہی پہلو کو سامنے لاتے ہیں۔ تنقید ایک ایسے نقاد کی منتظر ہے جو ان دائروں کو ملا کر ایک بڑے دائرے اور کسی فکری وحدت کو جنم دے سکے۔" لیکن ہماری گزارش ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ ہے کہ فکری وحدت کے پیدا ہونے کی تو صرف ایک ہی صورت ہے۔ یہ کہ فکر کسی آفاقی' مابعدالطبیعاتی اور ناقابل تغیّر روایت سے وابستہ ہو۔ لیکن مغرب میں چوں کہ فی زمانہ ایسی کسی روایت کا نشان تک نہیں ملتا' اس لیے اس کے فکر و فلسفہ یا علم و ادب سے فکری وحدت کی توقع رکھنا ایک خواب بے تعبیر سے زیادہ نہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب نے فکری وحدت کے سلسلے میں اپنی امیدیں مستقبل کے جس نقاد سے وابستہ کر رکھی ہیں وہ تو صرف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب مغرب 'مغرب' نہ رہے بلکہ ماضی کے مشرق کی طرح کسی آفاقی' مابعدالطبیعاتی اور غیر متغیّر روایت سے وابستہ ہو جائے۔

اچھا' یہ جو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آج ہمارا ادب اپنی روایت کی طرف دیکھنے کی بجائے مغرب کی طرف دیکھ رہا ہے اور اسی سے روشنی حاصل کر رہا ہے۔ اس بات کا مطلب اگر یہ ہے کہ ہمارا ادب آج تصور حقیقت کی سطح پر اپنی روایت اور اپنی مابعدالطبیعیات کے دائرے سے نکل کر مغربی تصور حقیقت کی روشنی میں آگیا ہے تو ہمارے نزدیک یہ بھی ایک اچھی بات ہے۔ اس لیے کہ گزشتہ سو سال کے دوران مشرق و مغرب کی کشمکش میں ابن رشیق اور لارڈ میکالے کے درمیان معلق رہتے ہوئے تو وہ گھر کا رہا تھا نہ گھاٹ کا۔ چناں چہ اب اگر وہ اس کشمکش سے رہائی پا کر یک سو ہو گیا ہے تو کم از کم عسکری صاحب کو تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ وہ تو اس صورت حال کو بہ خوشی قبول کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں

کہ :

اگر ہم حقیقت کا مغربی تصور قبول کرلیں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر تو مغرب کے ادبی نظریے ہمارے لیے بھی اتنے ہی تسلی بخش ثابت ہوں گے جتنے مغرب کے لیے ہیں۔

(مشرق و مغرب کی آویزش۔ اردو ادب میں۔ وقت کی راگنی۔ صفحہ ۱۹)

اب اگر ایسا ہو چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرق و مغرب کا جھگڑا بھی بالآخر ختم ہوا۔ لہٰذا نہ تو اب مشرقی ادب کو مغربی معیارات سے دیکھنے کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی مغربی ادب پر مشرق کے روایتی معیارات عاید کرنے کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ہمارے ادب کی صورتِ حال آج ویسی ہی ہے جیسی کہ ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا فقرے میں بیان ہوئی ہے۔ جواب کے لیے ہم ایک بار پھر ڈاکٹر صاحب ہی سے رجوع کرتے ہیں تو ان کی طرف سے کہا جاتا ہے :

ہمارے زیادہ تر ادیب خیالات' نظریات اور تحریکیں' ٹی وی' وی سی آر اور مشینوں کی طرح مغرب سے درآمد کر رہے ہیں۔ اور انھی کو اپنی تحریروں میں اگل رہے ہیں۔ اسی لیے ادب اجنبی بن کر رہ گیا ہے .... ہمارا ادب اس وقت بیرونی اور اجنبی اقدار و خیالات اور نظریات کا غازہ ایک بیسوا کی طرح اپنے چہرے پر پوت رہا ہے .... یہی وجہ ہے کہ ادب کی آواز مردہ اور بے جان ہو کر رہ گئی ہے۔

(اداریہ "نیا دور" از جمیل جالبی۔ شمارہ نمبر ۸۶-۸۵)

یہ جواب سن کر ہم ڈاکٹر صاحب کو یاد دلاتے ہیں کہ ہمارا سوال تو اس روشنی کے بارے میں تھا جو ہمارا ادب مغرب سے حاصل کر رہا ہے۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب بڑے تاسّف کے ساتھ دکھ بھرے لہجہ میں فرماتے ہیں :

آنکھیں بند کر کے مغرب کی پیروی کرنے سے ہمارے ادب کا تعلق اپنے معاشرے کی روح سے منقطع ہو گیا ہے۔ اور اسی لیے عام طور پر ادب ایک بے اثر اور بے جان چیز بن گیا ہے .... تقریباً" سو سال پہلے "مقدمہ شعر و شاعری" سے شروع ہو کر ہم نے اپنے ادب کو مغربی تنقید کے طریقوں اور پیمانوں سے ناپنا شروع کیا تھا اور یہ عمل آج تک جاری ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ .... ہمارا ادب جس میں تخلیق اور تنقید دونوں شامل ہیں' بے دیکھے' بے سمجھے' بے سوچے' پیروی مغربی کی راہ پر چل رہا ہے۔ اردو تنقید نے بھی انھی معیارات و رجحانات کو قبول کیا ہے جو مغرب میں پروان چڑھے ہیں۔ اب ہمارا احساس اور ہماری فکر مغرب کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس

میں بھی کوئی برائی نہیں تھی۔ اگر ہم شعور کے ساتھ اس عمل کو قبول کرتے اور ہر رجحان یا فکر کو قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھتے کہ کیا قبول کر رہے ہیں' اور یہ قبولیت ہمیں کہاں لے جائے گی؟ اس وقت ہمارا معاصر ادب کم و بیش مغربی ادب کا چربہ بن کر رہ گیا ہے۔

(نئی تنقید از ڈاکٹر جمیل جالبی۔ صفحات ۱۶۔۱۸)

غرض یہ ہے وہ روشنی جو آج ہمارا ادب مغرب سے حاصل کر رہا ہے۔ اصولی طور پر تو ڈاکٹر صاحب کے سوال کا جو جواب ہو سکتا تھا' وہ ہم دے چکے۔ لیکن عملی صورت حال جب یہ ہو تو اس ادب پر روایتی یا غیر روایتی کسی بھی طرح کے معیارات کے اطلاق کا سوال اٹھانے سے پہلے ہمیں یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ اس نام نہاد اور بے جان ادب کو صحیح معنوں میں ادب کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

اچھا' ڈاکٹر صاحب نے اپنے سوال کے حوالے سے ایک عجیب بات عسکری صاحب کے بارے میں یہ بھی فرمائی ہے کہ جب یہ سوال انھیں پریشان کرتا ہے تو وہ ہمیں مغربی ادب کی اس روایت کو جذب کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جو فلوبیئر اور بودلیئر سے شروع ہو کر جوائس' پاؤنڈ اور لارنس تک پہنچتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جیسے سلجھے ہوئے ذہن رکھنے والے معتبر اور ممتاز نقاد کا عسکری صاحب کے بارے میں یہ کہنا ہمارے لیے باعث حیرت ہے۔ اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے عسکری صاحب کے بارے میں کچھ ایسا گمان گزرتا ہے جیسے کہ وہ تنقیدی بصیرت اور فہم و فراست سے کلیتاً عاری ایک ایسے شخص کی صورت میں تبدیل ہو کر رہ گئے ہوں جس پر بلا تکلف "سوال از آسماں جواب از ریسماں" کی پھبتی کسنا ضروری ہو۔ اب ہم عسکری صاحب کے بارے میں یہ تو نہیں کہتے کہ وہ چوں کہ ہر قسم کی غلطی سے مبّرا تھے اس لیے ان کی ہر بات اور ان کے ہر جواب کو لازماً "درست ہی سمجھا جائے۔ لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کے بارے میں یہ باور کرنا کہ وہ کسی تنقیدی نوعیت کے سوال سے گھبرا کر اس کے جواب میں تخلیق کا نسخہ تجویز کریں گے' دراصل ان سے اور ان کی روایتی فکر کے خطوط سے اپنی مکمل ناواقفیت کا ثبوت دینے کے مترادف ہے۔ یوں بھی یہ تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے کہ عسکری صاحب اپنے روایتی معیار تنقید کا اطلاق غالب اور حالی سے لے کر رتن ناتھ سرشار اور فیض احمد فیض تک کس عمدگی کے ساتھ کرتے ہیں بلکہ ادیبوں اور شاعروں کی بات تو رہی الگ' وہ تو بعض اوقات معمولی سے معمولی لفظوں تک کو اپنے روایتی معیار کی کسوٹی پر کس کر یہ بھی بتا دیتے تھے:

> یہی حال لفظوں کا بھی ہے۔ مشرق میں ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ اور ان کے معنوں کا تعین بھی حقیقت کے انھی درجوں کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ مثلاً "ذات" ہی کا لفظ لیجیے۔ دراصل ہمارے ہاں یہ لفظ صرف خدا کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن جب یہ لفظ ظہور کے درجات کی سیڑھیوں پر نیچے اترنے لگتا ہے تو آخر میں آپ یہ فقرہ بھی سنتے ہیں "کتے کی ذات" یعنی لفظ

"ذات" تو شروع سے آخر تک وہی رہا۔ لیکن اس کے معنی کا تعین حقیقت کے
اس دائرے کی رو سے ہوا جس کے ضمن میں یہ استعمال ہوا۔
(مشرق و مغرب کی آویزش اردو ادب میں۔ وقت کی راگنی۔ صفحہ ۱۳)

یہی نہیں بلکہ اپنے مضمون "ادب میں صفات کا استعمال" میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ اردو ادب کے موٹے موٹے رجحانات کے حوالے سے صفات کا جائزہ اپنے روایتی نقطہ نظر سے لے کر انتہائی سہولت کے ساتھ یہ بھی دکھا دیا کہ پچھلے سو سال کے دوران پیرویِ مغرب کے نتیجے میں ہمارے ہاں صفات پر کیا گزری بلکہ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ پچھلے تین سو سال سے مغرب صفات کے ذریعے چیزوں کو گرفت میں لانے اور قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن چاند قریب آتا جا رہا ہے اور زمین کی چیزیں دور سے دور تر ہوتی جا رہی ہیں۔ ویسے کہنے کو تو یہ مضمون "ادب میں صفات کے استعمال" پر ہے لیکن اس میں زبان و ادب اور گرامر وغیرہ کے ساتھ ساتھ مشرق اور مغرب' ان دونوں کے طرزِ احساس' تصورِ حقیقت' علامتی نظام اور تہذیبی بنیادوں کے فرق و امتیاز کو عسکری صاحب نے جس گہرائی میں جا کر دیکھا اور جو بصیرت افروز باتیں ان کے بارے میں کی ہیں وہ اگر ان چیزوں پر روایتی نقطۂ نظر کے اطلاق کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہیں۔ چناں چہ بات محض ادب ہی کی نہیں بلکہ عسکری صاحب تو اپنی کتاب "وقت کی راگنی" کے بیشتر مضامین میں پورے مشرق اور مغرب کو روایت ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے نظر آتے ہیں۔ اور مشرق و مغرب کے تہذیبی تصادم سے پیدا ہونے والی صورت حال کا تجزیہ اور تنقید بھی روایت ہی کے آفاقی اصولوں کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح عہد حاضر میں دبستانِ روایت کے عظیم شارح شیخ عبدالواحد یحییٰ (رینے گینوں) اپنی کتابوں میں قرونِ وسطیٰ کے بعد روایت اور اپنی مابعد الطبیعیات سے ہٹ کر ایک قطعی غیر روایتی معاشرے اور تہذیب میں ڈھل جانے والے جدید مغرب کی تنقید روایت کے آفاقی اصولوں کی بنیاد پر کرتے ہیں' تو جو لوگ اپنی روایت سے منحرف ہونے والی پوری کی پوری تہذیب کا مطالعہ' تجزیہ اور تنقید وغیرہ سبھی کچھ روایتی اصولوں اور معیاروں کی بنیاد پر کرتے ہوں ان کے لیے گزشتہ سو سال کے ادب کو روایت کے نقطۂ نظر سے دیکھنا کیا مشکل ہے۔ لیکن جب صورتِ حال یہ ہو کہ خود ڈاکٹر صاحب کے بہ قول "ہمارا ادب مہمل بے مقصدیت کا شکار ہو اور اس کی روح میں کوئی ایسی معنویت باقی نہ رہی ہو جس سے فرد اور معاشرے کے کسی بھی سوال کا جواب دیا جا سکے (۱۱۷)۔" تو ایک جینوئن ادیب یا نقاد کا فرض اس کے علاوہ کچھ اور نہیں رہ جاتا کہ وہ سب سے پہلے ادیبوں کو نہ صرف یہ کہ بامعنی ادب تخلیق کرنے کا مشورہ دے بلکہ یہ بھی بتائے کہ بامعنی ادب کی تخلیق کا امکان کس راستے پر چلنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔

چناں چہ ہم سمجھتے ہیں کہ عسکری صاحب اگر ہمیں مغربی ادب کی اس روایت کو جذب کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جو فلوبیئر اور بودلیئر سے شروع ہو کر جوائس' پاؤنڈ اور لارنس تک آتی ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے اٹھائے ہوئے کسی مفروضہ سوال سے پریشان ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ہمارے ادب

کو مہملیت اور بے معنویت کے گرداب سے نکال کر بامعنی ادب کی تخلیق کا راستا دکھا سکیں۔ چناں چہ انھوں نے مشورہ دیتے ہوئے یہی بات صاف الفاظ میں کہی بھی ہے کہ "جب تک ہمارے ادیب مغربی ادب کی مذکورہ روایت کو اپنے اندر جذب نہیں کریں گے بامعنی ادب تخلیق نہیں کر سکیں گے۔" اور پھر انھوں نے یہ مشورہ جس سیاق و سباق میں دیا ہے اس کو نظر میں رکھنے سے بھی یہ بات بہ خوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس مشورہ کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس سیاق و سباق سے وہ لوگ تو خیر بہ خوبی واقف ہی ہوں گے جنھوں نے ان کے کم از کم دو مضامین غور سے پڑھے ہیں۔ ایک وہ جس کے آخر میں یہ مشورہ دیا گیا ہے۔ یعنی "مغربی ادب کی آخری منزل" اور دوسرا "مشرق و مغرب کی آویزش' اردو ادب میں"۔ پھر بھی اگر ہم آگے بڑھنے سے پہلے اس سیاق و سباق کو یہاں مختصراً بیان کرتے چلیں تو اچھا ہے۔

۱۹۶۰ء میں عسکری صاحب نے اپنا مضمون "مغربی ادب کی آخری منزل" لکھتے ہوئے دور حاضر کے مغربی ادب کی مایوس کن حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے' اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس مضمون کا ایک مختصر سا اقتباس دیکھیے :

> اگر ادب کا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں میں کوئی گہرا باطنی رشتہ ہو' ادب میں چند واضح معیار موجود ہوں' چند لکھنے والوں یا کتابوں کو سند کا درجہ حاصل ہو' ادب میں چند غالب رجحانات نظر آسکیں جن کی پیروی اچھے لکھنے والوں کی ایک چھوٹی موٹی جماعت کر رہی ہو' اور چند لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہو کہ اچھے ادب اور برے ادب میں کیا فرق ہے تو ان معنوں میں مغربی ادب ختم ہو چکا ہے۔
>
> (مغربی ادب کی آخری منزل۔ وقت کی راگنی۔ صفحہ ۵۵)

چناں چہ ۱۹۶۰ء ہی میں وہ ہمیں اس بات سے بھی خبردار کر چکے تھے کہ مغربی ادب کے موجودہ اور غالب رجحانات کی پیروی میں ہمارے لیے کیا خطرات موجود ہیں۔ ان کا کہنا تھا :

> خیر' میں تو ان لوگوں میں ہوں جو کہتے ہیں کہ اگر مشرقی طریقہ ہمارے لیے ممکن نہیں رہا تو بہرحال اور بہر قیمت ہمیں ادب میں مغربی طریقہ آزما کے دیکھنا چاہیے۔ کیوں کہ جوائس' پاؤنڈ اور لارنس بھی تو آخر مغرب ہی میں ہیں۔ لیکن مغربی طریقہ اختیار کرتے ہوئے ہمیں اس بات سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے کہ اگر ہم نے مغربی ادب کے موجودہ اور غالب رجحانات کی پیروی کی تو ہم زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکیں گے کہ مغرب جیسا ادب پیدا کر چکا ہے اس کی ایک نقل ہم بھی تیار کر دیں۔ اور جب مغربی ادب اپنی فطری موت مرے تو اس کے تھوڑے دن بعد ہمارا ادب بھی مرجائے۔ (مشرق و مغرب کی آویزش' اردو ادب میں۔ وقت کی راگنی۔ صفحات ۱۹۔ ۲۰)

اس پورے دور میں عسکری صاحب کو اگر کہیں روشنی کی کوئی کرن نظر آئی ہے تو صرف مغربی ادب کی اس روایت میں جسے جذب کرنے کا مشورہ وہ اردو کے ادیبوں کو دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق :

> ادب کو نئی زندگی اور توانائی دینے کی جدوجہد کا آغاز بیسویں صدی میں ایلیٹ' پاؤنڈ' جوائس' لارنس وغیرہ نے کیا۔ فرانس میں یہ سلسلہ انیسویں صدی میں فلوبیئر اور بودلیئر کے ساتھ شروع ہوا۔ اس تحریک نے انسانی زندگی کے خارج اور باطن' اور فن کی ماہیت کی تفتیش اس ہمہ گیری کے ساتھ اختیار کی کہ مغربی ادب میں سترہویں صدی کے بعد سے اس کی مثال نہیں ملتی بلکہ یہ لوگ تو انسانی زندگی سے بھی آگے بڑھے اور پرانی مابعد الطبیعیات کو سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ خالص ادبی اعتبار سے ان کی جدوجہد یہ رہی کہ چند ایسے ادبی معیار قایم ہوں جن کے ذریعے دنیا بھر کے ادب کو نہ سہی تو یونانیوں سے لے کر آج تک کے مغربی ادب کو سمجھا جا سکے اور جن کی رہنمائی میں آگے ادب تخلیق کیا جا سکے۔ یہ عظیم تحریک ۱۹۳۰ء میں ختم ہو گئی۔

(مغربی ادب کی آخری منزل۔ وقت کی راگنی۔ صفحہ ۵۴)

اب اس سیاق و سباق کو نظر میں رکھتے ہوئے عسکری صاحب کا مشورہ ایک بار پھر انھی کے الفاظ میں سن لیجئے :

> چوں کہ ہمارا بھی مغرب سے براہ راست تعلق ہے۔ اس لیے ہمارا ادب بھی ان اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا بلکہ دراصل ہمارے موجودہ ادب کا پس منظر ایک حد تک یہی مغربی ادب ہے۔ ان حالات کو نظر میں رکھے بغیر ہم اردو ادب میں کوئی معقول اضافہ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اگر ہم بے خبری کے عالم میں اثر پذیر ہوتے رہے تو ہم انھیں رجحانات کے اسیر ہو جائیں گے۔ پھر یہ بات بھی ہمیں واضح طور سے سمجھ لینی چاہیے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم روایتی قسم کا مشرقی ادب پیدا نہیں کر سکتے۔ ایسا ادب صرف اس معاشرے میں پیدا ہو سکتا ہے جس کی بنیاد مابعد الطبیعیاتی روایت پر ہو۔ اس لیے ہمارے بیشتر ادیبوں کے لیے مغربی اثرات قبول کرنا ایک ناگزیر چیز بن گیا ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ تو دیکھ لینا چاہیے کہ ہم کون سا اثر قبول کر رہے ہیں اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ میری نہایت ہی ذاتی رائے یہ ہے کہ مشرقی ادیب جب تک فلوبیئر اور بودلیئر سے شروع ہونے والے ادبی سلسلے اور جوائس' پاؤنڈ اور لارنس کو اپنے اندر جذب نہیں کریں گے بامعنی ادب تخلیق نہیں کر سکیں گے .... اب یہ مشرقی

ادیبوں کا کام ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے مغربی تہذیب کے دھارے میں بہتے ہیں یا آنکھیں کھول کر قدم جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(مغربی ادب کی آخری منزل۔ وقت کی راگنی صفحات ۵۶۔۵۷)

عسکری صاحب کے مشورہ کو اس کے پورے سیاق و سباق کے ساتھ نظر میں رکھا جائے تو اس بات میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ عسکری صاحب کا یہ مشورہ ہمیں یا ہمارے موجودہ ادب کو کسی گنبد بے در میں لے جا کر چھوڑنے کے لیے نہیں بلکہ اسے مہملیت اور بے معنویت کے اس گرداب سے نکال کر بامعنی ادب کی تخلیق کی راہ بھانے کے لیے دیا گیا تھا جس میں پھنس کر وہ ڈاکٹر صاحب کے بہ قول ایک بے اثر اور بے جان سی چیز بن کے رہ گیا تھا۔ اور ہاں اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عسکری صاحب نے یہ مشورہ روایتی ادب کی تخلیق کے سلسلے میں نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کے بہ قول اسی ادب کے حوالے سے دیا تھا جو اب اپنی روایت کی طرف دیکھنے کی بجائے مغرب کی طرف دیکھ رہا ہے۔

اور چوں کہ عسکری صاحب یہ بات بھی پوری طرح واضح کر چکے ہیں کہ مشرق و مغرب کی آویزش میں ابن رشیق اور لارڈ میکالے کے درمیان معلق رہتے ہوئے ہم روایتی قسم کا مشرقی ادب پیدا نہیں کر سکتے کیوں کہ ایسا ادب تو صرف اس معاشرے میں پیدا ہو سکتا ہے جس کی بنیاد مابعد الطبیعیاتی روایت پر ہو' اس لیے اس معاملے میں ابن عربی' شاہ وہاج الدین یا مولانا اشرف علی تھانوی سے رجوع کرنے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم مغربی ادب کی روایت کے مذکورہ سلسلے کو جذب کرنے کے بارے میں جو نہایت ذاتی قسم کی رائے عسکری صاحب نے جھجکتے ہوئے پیش کی ہے' اگر وہ ہمارے لیے کسی سبب سے قابل قبول نہ سمجھی جائے تو اس سے بہتر کوئی اور معقول تجویز بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم انھی کا مشورہ قبول کرنے کے پابند ہوں۔ خوش قسمتی سے دوسری معقول تجویز خود ڈاکٹر صاحب ہی نے عسکری صاحب کے مشورے کو رد کرنے کے بعد ان الفاظ کی صورت میں پیش کی ہے :

> اس مشکل کا کوئی حل عسکری صاحب کے پاس نہیں۔ وہ تو بس یہی کہتے ہیں کہ "روایتی ادب' روایتی معاشرے ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔" اور ہم گزشتہ سو سال سے اس روایت سے ہٹ کر اتنی دور آگئے ہیں کہ بہ ظاہر سفر واپسی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم مابعد الطبیعیاتی معاشرے کے دوبارہ قیام کے لیے جدوجہد کریں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ مغرب کے اثرات کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے کی بجائے شعور کے ساتھ انتخاب کے ذریعے قبول کریں۔ اور مغرب کی روایت کے اس حصے کو قبول کریں جو ہماری روایت سے قریب تر ہو۔

اب ڈاکٹر صاحب کی اس تجویز کو عسکری صاحب کے مشورے سے ملا کر دیکھیے اور بتائیے کہ ان دونوں میں سوائے اس کے اور کیا فرق ہے کہ عسکری صاحب مغربی ادب کی روایت کے جس سلسلے کو

جذب کرنے کا مشورہ دیتے ہیں' اس کے انتخاب کی وجہ بھی بتا دیتے ہیں' جب کہ ڈاکٹر صاحب مغربی ادب کے کسی خاص حصے کی واضح طور پر نشان دہی کرنے کی بجائے صرف اتنی بات کہہ کر انتخاب کی ذمہ داری خود ہمیں پر ڈال دیتے ہیں کہ ہم مغربی ادب کے اس حصے کو قبول کریں جو ہماری روایت سے قریب تر ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بات کا فیصلہ کیسے ہو اور کون کرے کہ مغربی ادب کی روایت کا کون سا حصہ ہماری روایت سے قریب تر ہے؟ عسکری صاحب والی تجویز میں کم از کم یہ بات تو واضح تھی کہ انھوں نے مغربی ادب کی روایت کے جس سلسلے کو جذب کرنے کا مشورہ دیا تھا' اس میں انھیں بہ قول ڈاکٹر صاحب مشرقی مابعد الطبیعیات کی مغربی صورت نظر آئی تھی۔ لہٰذا اس اعتبار سے اسے ہماری روایت سے قریب تر بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں ہمیں اس ذریعہ سے بامعنی ادب کی تخلیق کی بشارت بھی دی گئی تھی۔ جب کہ ڈاکٹر صاحب کی تجویز میں ایسی کسی بشارت کا تو کوئی ذکر نہیں البتہ یہ ڈراوا ضرور موجود ہے کہ :

> لیکن اس صورت میں بھی مغرب کا سیلاب ہمیں یقیناً بہا لے جائے گا.........
> مغرب کا سیلاب مشرق کے باطن کی دہلیز تک پہنچ گیا ہے۔ اور اب ہم اسے روک نہیں سکتے۔

اب ہم سوائے اس کے اور کیا عرض کریں کہ۔

بھلا نہ دل نہ تیرگیٔ شام غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

حواشی

*۱۔ یہ مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب "نئی تنقید" میں "نئی تنقید کا منصب" کے عنوان سے شامل ہے۔

*۲۔ اس عنوان کو تبدیل کر کے بعد میں "جھلکیاں" کا نام دیا گیا۔

*۳۔ عسکری صاحب کی کتاب "وقت کی راگنی۔ مشرق و مغرب کی آویزش (اردو ادب میں)" صفحہ ۹۔

*۴۔ رہی یہ بات کہ تذکرہ طبقات الشعرائے ہند از ایف فیلن و منشی کریم الدین میں شاعروں کے بارے میں جو رائے دی گئی ہے' وہ نہ فیلن کی ہے نہ منشی کریم الدین کی بلکہ گارساں دتاسی کی ہے' لہٰذا عسکری صاحب اگر فیلن کی بجائے گارساں دتاسی کا نام لکھتے تو صحیح ہوتا۔ تو خیر چلیے یوں ہی سہی۔ اور یہ بھی تسلیم کہ گارساں دتاسی کی اس رائے میں تعریف کا بھی کوئی خاص پہلو نہیں۔ اس کے باوجود عہد جدید میں نظیر اکبر آبادی کے شاعرانہ مرتبہ و مقام کے بارے میں پیدا ہونے والا قضیہ عسکری صاحب نے شاہ و تاج الدین والے معیار کی رو سے جس طرح نمٹایا ہے' اس میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

*۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون "راز داں اپنا" جو ان کی کتاب "نئی تنقید" میں شامل ہے۔ صفحہ ۲۹۔۲۳۸

*۶۔ "ادھوری جدیدیت از سلیم احمد" صفحہ ۱۳۔۱۴۔

*۷۔ "وقت کی راگنی از محمد حسن عسکری" صفحہ ۱۲۔

*۸۔ "وقت کی راگنی از محمد حسن عسکری" صفحہ ۱۳۔

*۹۔ "وقت کی راگنی از محمد حسن عسکری" صفحہ ۱۳۔

*۱۰۔ "وقت کی راگنی از محمد حسن عسکری" صفحہ ۱۹۔

*۱۱۔ "ادب کی صورت حال" از ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ "نیا دور" (شمارہ نمبر ۸۱۔۸۲)۔

☆ ○ ☆

شہزاد منظر

عسکری کا تصورِ روایت اور ادب

اس سے قبل کہ عسکری صاحب کے تصورِ روایت و ادب اور اس کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے مضمون سے بحث کروں، میں عسکری مرحوم کے "پرانے" تصورِ روایت کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ عسکری صاحب کے آخری دور کی تحریروں میں "روایت" کی اصطلاح کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے افکار کی بنیاد اسی تصور پر رکھی تھی اور اسے مرکز بنا کر بحث و مباحث کیا تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مرحوم عسکری کا تصورِ روایت ہر دور میں یکساں نہ تھا۔ وہ جب مذہب سے دور اور خالص سیکولر تصورات کے حامل تھے، ان کا تصورِ روایت قطعی "سیکولر" تھا اور وہ جب رینے گینوں کے زیرِ اثر تصوف سے متاثر ہوئے تو ان کا تصورِ روایت بدل گیا۔ اس کا اندازہ عسکری صاحب کی ۴۰ء کے عشرے کی ایک تحریر سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> روایت کا مفہوم اتنا تنگ نہیں کہ باہر سے کوئی چیز اس میں سما نہ سکے۔ ادب کی تاریخ اس کی تردید کرتی ہے۔ روایت تو ایک بڑھنے اور پھیلنے والی چیز ہے۔ جو عجیب سے عجیب تجربے کو بھی اپنا لیتی ہے۔ اگر اپنی روایت کو وسیع کرنے کا احساس ان لوگوں میں نہ ہوتا تو ہمیں نہ چوسر نظر آتا، نہ شیکسپیئر، نہ ملٹن، نہ پروست، نہ جوائس..... (۱)

روایت کوئی جامد و ساکت شے نہیں، جو ہمیشہ ایک مقام پر جمی رہے۔ وہ ہمیشہ بدلتی، نشو و نما پاتی اور وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی اور مختلف تجربوں کو اپنانے کے نتیجے میں اس کے بطن سے نئی روایت جنم لیتی ہے، جو پرانی روایت سے مشابہت رکھتے ہوئے بھی اپنے تئیں مختلف ہوتی ہے۔ عسکری صاحب نے ۴۰ء کے عشرے میں روایت کا جو تصور پیش کیا تھا، اس میں تغیر و تبدل کی کافی گنجائش موجود تھی۔ ان کے اس دور کے تصورِ روایت کا مفہوم تنگ نہ تھا۔ اس میں بیرونی عنصر بھی شامل ہو سکتا تھا۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ روایت ایک بڑھنے اور پھیلنے والی شے ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے ۶۰ء کے عشرے میں روایت کا جو تصور پیش کیا۔ اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ روایت کی سب سے بڑی خوبی یہ بیان کرنے لگے کہ وہ کبھی نہیں بدلتی، ہمیشہ ساکت رہتی ہے۔ تصورِ روایت کے جامد یا متحرک ہونے کی بحث کا تعلق دراصل فلسفے کے دو مخالف اسکولوں سے ہے۔ عینیت پسند اور مادیت پسند فلاسفہ کے درمیان بنیادی اختلاف مادے کے بدلتے اور ترقی کرتے رہنے کے بارے میں ہی ہے۔ آج تک جتنے بھی عینیت پسند

فلسفی گزرے ہیں ان کا بنیادی موقف یہ ہے کہ مادہ جامد رہتا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی' جب کہ مادیت پسند فلاسفہ کا خیال ہے کہ مادہ کبھی ایک حالت میں نہیں رہتا۔ اس میں ہمیشہ نہ صرف تبدیلی ہوتی ہے بلکہ اس کا ارتقا بھی ہوتا ہے' چناں چہ اگر رینے گینوں جیسے عینیت پسند مفکر کی نظر میں مابعد الطبیعیات پر مبنی روایت ساکت رہتی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

عسکری صاحب نے روایت کا تصور رینے گینوں سے مستعار لیا تھا' جن کا خیال تھا کہ روایت وہ ہے جو زبانی ہو' سلسلہ بہ سلسلہ اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہے اور جس میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ رینے گینوں نے روایت کے بارے میں آج تک مروج تصور اور اس کی تعریف کو بدل کر رکھ دیا' یعنی وہ روایت کی جو تعریف بیان کرتے ہیں وہ ان تمام تعریفوں اور تشریحوں سے مختلف ہے' جو آج تک مختلف زبانوں کی لغات اور قاموس میں درج ہیں۔ عسکری صاحب نے بھی رینے گینوں کے اسی تصور کو اپناتے ہوئے اپنے افکار کا محل تعمیر کیا تھا۔

جمیل جالبی صاحب ایک مذہب پرست اور لبرل ادیب و نقاد ہیں۔ وہ عسکری صاحب کے بڑے معتقد ہیں اور ان کا بڑا احترام کرتے ہیں' لیکن وہ بھی خود کو عسکری صاحب کے تصورِ ادب سے متفق نہیں پاتے اور ان کے تصورِ روایت کو "گنبدِ بے در" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جالبی صاحب نے درست سوال کیا ہے کہ:

> ہمارے دور میں روایتی معاشرے ختم ہو چکے ہیں اور جو رہ گئے ہیں' وہ بھی مٹ رہے ہیں..... آج کے بدلتے ہوئے معاشرتی اور ادبی منظر میں ہم اپنے ہاں وہ روایتی معیار کیسے نافذ کر سکتے ہیں' جو عسکری صاحب نے پیش کیا ہے۔(۴*)

جالبی صاحب نے عسکری مرحوم کے تصورِ روایت کے بارے میں جس نوع کا سوال کیا ہے۔ مرحوم کو اس قسم کے سوال کا پہلے ہی احساس تھا' چناں چہ انھوں نے اس بارے میں لکھا کہ "اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم روایتی قسم کا مشرقی ادب پیدا نہیں کر سکتے۔ ایسا ادب صرف اس معاشرے میں پیدا ہو سکتا ہے جس کی بنیاد مابعد الطبیعیاتی روایت پر ہو۔" عسکری صاحب اس مسئلے کا حل یہ تجویز کرتے ہیں کہ "میری نہایت ذاتی رائے ہے کہ مشرقی ادیب جب تک فلوبیئر اور بودلیئر سے شروع ہونے والے ادبی سلسلے اور جوائس' پاؤنڈ اور لارنس کو اپنے اندر جذب نہیں کریں گے' بامعنی ادب تخلیق نہیں کر سکتے' لیکن مغرب اندرونی طور پر ان سے دور رہا ہے اور ان کے انکشافات سے گھبراتا ہے۔ اب یہ مشرقی ادیبوں کا کام ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے مغربی تہذیب کے دھارے میں بہتے ہیں یا آنکھیں کھول کر قدم جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

عسکری صاحب کا تضاد ملاحظہ ہو کہ وہ ایک جانب مغرب کو گم راہ قرار دے کر اسے مکمل طور پر مسترد کرتے تھے اور دوسری جانب "روایتی قسم کا مشرقی ادب" پیدا کرنے کے لیے فلوبیئر اور بودلیئر سے

شروع کر کے جوائس' پاؤنڈ اور لارنس کو اپنے اندر جذب کر کے بامعنی ادب تخلیق کرنے کا نسخہ تجویز کرتے تھے۔ اس جگہ پہنچ کر جالبی صاحب نہایت بے چارگی کے ساتھ کہتے ہیں۔ "یہ وہ مقام ہے جہاں عسکری صاحب کا نقطۂ نظر ہمیں "گنبدِ بے در" میں لے جا کر چھوڑ تا دیتا ہے اور ہم بہت سے لاینحل سوالوں کے جال میں پھنس کر عملاً بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔"

جالبی صاحب کو عسکری مرحوم سے شکایت ہے کہ وہ اس سوال کے حل کے لیے مغربی ادب کی اس روایت کو جذب کرنے کا تو مشورہ دیتے ہیں جو فلوبیئر اور بودلیئر سے شروع ہو کر جوائس' پاؤنڈ اور لارنس تک پہنچتی ہے' لیکن ابنِ عربی' شیخ وہاج الدین یا مولانا اشرف علی تھانوی سے رجوع کرنے کے لیے نہیں کہتے۔ میرا خیال ہے کہ جناب جالبی کو مغالطہ ہوا ہے۔ عسکری صاحب نے اپنی کتاب "وقت کی راگنی" میں شامل اپنے مضامین میں یہ مشورہ بھی دیا ہے اور یہاں تک کہا ہے کہ اگر شاہ وہاج الدین کے نسخے پر عمل کیا گیا تو دنیا کا عظیم ترین ادب تخلیق ہو سکتا ہے۔

عسکری صاحب اس سے قبل ادب کی تفہیم اور تعیّنِ قدر کے لیے لیوس' رچرڈ سن' ایلیٹ' پاؤنڈ اور لارنس وغیرہ کے حوالے دیتے رہے تھے' لیکن وہ مغرب کو مسترد کرنے کے بعد رینے گینوں کے تصورِ روایت کی روشنی میں اردو شعر و ادب کو پرکھنے کے لیے شاہ وہاج الدین کا "معیارِ ادب" ڈھونڈ لائے تھے' جو بنیادی طور پر نہ ادیب تھے اور نہ نقاد اور جنھوں نے (بہ قول عسکری صاحب) "ادب کے بارے میں چند سطریں لکھی ہیں۔" لیکن انھوں نے ادب کے بارے میں ان کی چند سطری تنقید کو دنیا کے بڑے سے بڑے نقاد کی آرا کے مقابل پیش کر دیا تھا اور دعویٰ کیا تھا کہ "ایسی ادبی تنقید آپ کو اردو میں مشکل سے ملے گی۔ انھوں نے ایسا معیار پیش کر دیا ہے جو دنیا بھر کے ادب پر حاوی ہے۔" یہ ہے عسکری صاحب کا "دنیا بھر کے ادب" کو پرکھنے کے لیے معیارِ تنقید۔ شاہ وہاج الدین نے شعر و ادب کے بارے میں جو "چند سطریں" لکھی ہیں۔ وہ آپ بھی پڑھئے اور سر دھنیے۔ عسکری صاحب شاہ وہاج الدین کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> انسان کے پیشِ نظر معرفت کے لیے صرف دو ہی تعینات ہیں۔ انفس و آفاق۔ تکمیل اس میں ہے کہ دونوں کی شناخت ایک ساتھ ہو اور انفس کی شناخت کو آفاق کی شناخت پر غلبہ ہو' کیوں کہ آفاق جسم ہے اور انفس اس کی روح ہے' کیوں کہ آفاق میں کسی چیز کا وجود بلا انفس کے ادراک کے پایا نہیں جاتا ہے۔ پس رونگٹا رونگٹا انفس کا آفاق کے لیے عالم عالم ہے۔ اسی لیے پچھلی صدیوں سے شاعری ہر زبان کی بہ شمول آفاق کے انفس کو غلبہ دے کر مکمل سمجھی گئی ہے اور بہ اعتبارِ مشرب ہر ملت و قوم کے معشوق انفس ہی کو قرار دیا گیا ہے' اس زمانے کی نیچیل شاعری جو بہت پسندیدہ کہی جاتی ہے' وہ تمام ہے' کیوں کہ اس میں صرف آفاق ہی کو لیا ہے اور انفس کو جو آفاق کی جان ہے' چھوڑ

دیا' لہٰذا یہ شاعری مثل ایک جسمِ بے جان کے ہے اور پرانی شاعری پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ بھرا ہوا ہے' یہ اعتراض نا سمجھی سے ہے کیوں کہ جان کی بابت کوئی بات مبالغہ نہیں ہے (۳۰)۔

عسکری صاحب کا خیال تھا کہ شاہ وہاج الدین کی مذکورہ بالا چند سطری تنقیدی آرا سے "نہ صرف روایت کا ایک یقینی مفہوم متعین ہو جاتا ہے' بلکہ روایتی نقطۂ نظر سے کسی ادب پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کا بھی معیار مل جاتا ہے۔ "چناں چہ "وہ ادب کے روایتی نقطۂ نظر کا سب سے پہلے نظیر اکبر آبادی پر اطلاق کرتے ہیں اور نظیر کو اس لیے بڑے شاعروں کی صف سے خارج کردیتے ہیں کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ آفاق (یعنی دنیا اور عالم) کے بارے میں ہے۔ انفس (یعنی روحوں یا روحانیت) کے بارے میں نہیں ہے۔ اردو کے کون کون بڑے شاعر ہیں جن کی شاعری میں صرف انفس ہی انفس کا غلبہ ہے۔ آفاق کا نہیں؟ کیا یہ شاعر غالب ہیں؟ ان بڑے شاعروں میں میر تو یقیناً شامل ہوں گے؟ اس لیے کہ میر' عسکری صاحب کے پسندیدہ شاعر اور متصوف ہیں۔ کیا ان بڑے شاعروں میں اقبال شامل ہیں؟ عسکری صاحب کے آخری دور کی تحریروں میں ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔

عسکری صاحب نے اس مضمون میں حالی کے بارے میں بھی غلط بیانی سے کام لیا ہے اور ان پر غلط الزامات عاید کیے ہیں۔ حالی کبھی بھی مذہبی شاعر نہ تھے۔ وہ بنیادی طور پر اصلاح پسند تھے۔ اس لیے وہ شاعری میں اخلاقیات کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ شاعری میں مابعد الطبیعیات کو چھوڑ کر اخلاقیات ڈال رہے ہیں' قطعی غلط اعتراض ہے۔ عسکری صاحب اس بات کے تو قائل ہیں کہ انھوں نے اردو ادب کو بہت فایدہ پہنچایا ہے لیکن انھیں ان سے شکایت ہے کہ روایت کے نقطۂ نظر سے انھوں نے اردو شاعری سے مابعد الطبیعیات کو خارج کردیا ہے۔ دراصل جب سے عسکری صاحب کو مابعد الطبیعیات کا سودا سمایا تھا وہ اس کے بغیر لقمہ توڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے اور ایسے شاعر و ادیب کے ہاں مابعد الطبیعیات تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے' جن کے ہاں یہ شے سرے سے ناپید ہوتی تھی' چناں چہ انھوں نے حالی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ عسکری صاحب جب کسی کے بارے میں لکھتے تھے تو وہ یہ بھی نہیں دیکھتے تھے کہ شاعر کس مزاج کا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ اس نے کس نوع کی شاعری کی ہے۔ بس الزامات پر الزامات عاید کرتے چلے جاتے تھے اور یہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ اس بے چارے شاعر سے صریح ناانصافی ہو رہی ہے۔ یہ ہے عسکری صاحب کی تنقید کا کمال!

جیسا کہ میں متذکرہ بالا سطور میں کہہ چکا ہوں۔ وہ جب سے رینے گینوں کے زیرِ اثر مابعد الطبیعیات کے قائل ہوئے تھے' کبھی مولانا اشرف تھانوی کی تحریروں سے تخلیقِ ادب کے اصول دریافت کرتے تھے' کبھی شاہ وہاج الدین کی تحریروں سے اور کبھی حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے۔ انھوں نے یہ کام فرانسیسی مصنف ژاک ماری تیں سے سیکھا تھا جنھوں نے سینٹ ٹامس ایکوناس کی الٰہیات سے ادب کے اصول اخذ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب ایک فرانسیسی مصنف ایسا کر سکتا تھا تو

عسکری صاحب ایسا کیوں نہیں کر سکتے تھے' لہٰذا انھوں بھی ایسا ہی کیا۔ چناں چہ انھوں نے "اردو کی ادبی روایت کیا ہے؟" میں سب سے پہلے اس اصول کے تحت ارسطو کے نظریۂ نقل (Mimesis) کو یک قلم مسترد کر دیا۔ اس لیے کہ ارسطو کے نزدیک مابعد الطبیعیات کا مطلب علم وجودیات (Ontology) تھا یعنی بہ قول عسکری صاحب "ارسطو' یونانی فلسفیوں اور از منہ وسطیٰ کے عیسوی مفکروں کے نزدیک حقیقتِ عظمیٰ وجود ہے۔" اس کے بعد انھوں نے حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے "حقیقتِ عظمیٰ کا اسلامی تصور" بر آمد کیا اور ثابت کیا کہ حقیقتِ عظمیٰ چوں کہ خدا کی مجرد ذات ہے اس لیے نہ اس کی نقل کی جا سکتی ہے اور نہ تصویر کشی اور عکاسی' زیادہ سے زیادہ اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ارسطو' عسکری صاحب کی طرح مسلمان نہیں تھا اور نہ اس دور میں یونانی فلاسفہ روح اور خدا کے تصور سے واقف ہوئے تھے۔ یہ تصورات ارسطو کے عہد کے برسوں بعد فلاطینوس کے عہد سے عام ہوئے۔ اس لیے بے چارے ارسطو کے نزدیک مابعد الطبیعیات سے مراد علمِ وجودیات اور حقیقتِ عظمیٰ سے مراد حقیقتِ وجود ہی ہو سکتی تھی۔ عسکری صاحب کسی پر نکتہ چینی کرتے وقت ہمیشہ اس کے دور اور تاریخی پس منظر کو فراموش کر دیتے تھے۔ خدا کا مجرد تصور انسان نے بہت بعد کے دور میں اور وہ بھی معاشرتی ارتقا کے ایک خاص عہد میں تسلیم کیا ہے' ورنہ قدیم انسان کا ذہن یہ قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ خدا ایسا بھی ہو سکتا ہے' جس کا کوئی خالق یا جس کی کوئی ہیئت نہ ہو یعنی نرآکار ہو۔ قدیم انسان فطرت میں ہی خدا کا وجود دیکھتا تھا اور اپنی ذہنی سطح کے مطابق فطرت سے خدا تراش لیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام قدیم اصنام پرست مذاہب میں خدا کسی نہ کسی تجسیمی صورت میں موجود رہتا ہے۔ ارسطو کے عہد میں حقیقتِ عظمیٰ کا وہ تصور پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا' جو یہودیت' عیسائیت اور اسلام کے عہد میں پیدا ہوا۔ لطف کی بات یہ ہے محمد حسن عسکری اس کے بعد "شاعری کا فریضہ" متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں :"جب اسلام کا تصورِ حقیقت یہ ہے اور اسلامی شاعری کا فریضہ یہ ہے کہ اس حقیقت کی معرفت حاصل کرنے میں اپنی بساط بھر انسان کی مدد کرے تو پھر ارسطو کے ادبی نظریات ہماری شاعری کو سمجھنے میں کیسے مفید ہو سکتے ہیں؟ اسلامی روایات کے دائرے میں جو شاعری ہوگی' اس کا آخری مقصد تو حقیقتِ عظمیٰ کی طرف اشارہ کرنا ہی ہوگا۔" یہ وہی عسکری صاحب ہیں' جو اس سے قبل ادب کی مقصدیت کے شدید مخالف تھے اور آرٹ برائے آرٹ کے زبردست چیمپئن سمجھے جاتے تھے۔ وہی عسکری صاحب اسلامی شاعری کا فریضہ' حقیقت کی معرفت حاصل کرنے میں انسان کی مدد کرنا قرار دے رہے تھے۔

عسکری صاحب جب اپنے مذکورہ اسلامی نظریۂ ادب کا اردو شاعری پر اطلاق کرتے تھے تو بڑے مضحکہ خیز نتائج اخذ کرتے تھے' مثلاً "وہ داغ کے مشہور شعر۔

صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

کا حوالہ دیتے ہوئے دریافت کرتے ہیں "کیا اس شعر کا ظہور و اخفا کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں؟" صرف اتنا ہی نہیں عسکری صاحب امیر مینائی کے اس قبیل کے شعر،

وصل ہو جائے ابھی حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے

کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھتے ہیں۔ "کیا یہ شعر رویتِ باری تعالیٰ کے مسئلے سے نہیں نکلا؟" یہ ہے مسلکِ تصوف اختیار کرنے کے بعد عسکری صاحب کی سخن فہمی کا عالم! جس کا ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے چہار دانگِ عالم میں ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے اور جنھوں نے میر اور فراق کی شاعری پر معرکہ آرا تنقیدیں لکھی ہیں۔ ان کی مضحکہ خیز سخن فہمی کی انتہا یہ ہے کہ وہ امرا کی شان میں کہے ہوئے قصائد سے بھی توحید کے مضامین نکالنے سے نہیں چوکتے۔

عسکری صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں اردو والوں کو یہ مژدہ بھی سنایا تھا کہ اردو شاعری فرانسیسی شاعری کے مقابل پہنچ چکی ہے، بلکہ اس سے بھی دو چار ہاتھ آگے نکل چکی ہے۔ اس لیے اب اردو والوں کو مغربی شاعری کے مقابلے میں احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ محمد حسن عسکری نے اس انکشاف پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا، بلکہ یہ بھی دریافت کیا تھا کہ "رابرٹ گریوز نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کرنے کے بعد کہا کہ ہم لوگ تو جانتے بھی نہیں کہ اصل شاعری ہوتی کیا ہے؟ فارسی شاعری تو بڑی چیز ہے۔ جن دو چار فرانسیسیوں نے اردو شاعری پڑھی ہے۔ ان کے منھ سے بے ساختہ یہی نکلا کہ ہمیں تو اب پتا چلا کہ شاعری کسے کہتے ہیں۔" بے چارے عسکری مرحوم خواہ مخواہ عمر بھر بودلیئر، ملارمے اور راں بو کی شاعری کی تعریف میں مضامین لکھ کر کاغذ سیاہ کرتے رہے۔ انھوں نے تصوف اختیار کرنے کے بعد ان شعرا کا مطالعہ کیا ہوتا تو ان پر لکھنے کی زحمت نہ کی ہوتی۔

جیسا کہ میں متذکرہ بالا سطور میں ایک جگہ لکھ چکا ہوں۔ عسکری صاحب کسی پر اعتراض کرتے وقت تاریخی تناظر کا قطعی خیال نہیں رکھتے تھے، چناں چہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں شبلی اور حالی پر بلا سوچے سمجھے سنگین الزام عاید کیا کہ انھوں نے "شاعری کا سب سے بڑا مقصد اخلاقی اصولوں کی ترویج ٹھہرا کر نہ صرف ہمارے ادب کو نقصان پہنچایا، آنے والی نسلوں کے ادبی فہم اور ادبی ذوق کو غارت کیا، بلکہ مسلمانوں کو دینی نقصان بھی پہنچایا (ملاحظہ ہو "وقت کی راگنی")۔ ان مشاہیرِ ادب کو محدود تصورات میں مقید کرکے آنے والی نسلوں کے ادبی فہم اور ادبی ذوق کو غارت کرنے کا بہتان عاید کرنا صریح ظلم ہے جس کا عسکری صاحب نے ارتکاب کیا اس لیے کہ اس دور میں اس سے زیادہ کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ عسکری صاحب ۱۹۴۸ء میں بیٹھ کر شبلی اور حالی پر اعتراض کر رہے تھے۔ اگر وہ خود اس عہد میں ہوتے تو ان میں بھی وہ تاریخی شعور نہ ہوتا جس کا وہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہر ادیب کو اس کے عہد کے تناظر میں دیکھنا چاہیے ورنہ اس کے ساتھ انصاف ممکن نہیں ہے۔ شبلی اور حالی نے اگر شاعری کا سب سے بڑا مقصد اخلاقی اصولوں کی ترویج قرار دیا تو کوئی جرم نہیں کیا اس لیے کہ یہی کام اس عہد میں

انگریزی کے ناقدین انجام دے رہے تھے۔ اگر بہ قول عسکری صاحب یہ انگریزی ناقدین پروٹسٹنٹ ہونے کے باعث مذہبی عقاید کو فراموش کر چکے تھے تھے یا مذہب کی بہ نسبت اخلاقیات کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے تو اس کے لیے شبلی اور حالی کیسے ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟

عسکری صاحب نے اپنے مضمون "اردو کی ادبی روایت کیا ہے؟" میں کہا تھا کہ مولانا تھانوی کی کتابوں سے اردو اور فارسی ادب کے بارے میں ہدایت مل سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون "اردو ادب کی روایت..... چند تصریحات" میں اس سے بھی آگے بڑھ کر دعویٰ کیا کہ "مغربی ادب کو سمجھنا ہو تو بھی ان کتابوں کی ضرورت پڑے گی۔" یعنی مولانا اشرف علی تھانوی کی تحریروں سے مرتبہ ادبی اصولوں کی! مزے کی بات یہ ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی ملفوظات سے تنقیدی اصول اخذ کرنے کے باوجود عسکری صاحب مارے عقیدت کے انھیں "ادبی نقاد" کہنا بدتمیزی اور ان کی شان میں گستاخی تصور کرتے تھے۔ جیسے ادبی ناقد ہونا مولانا اشرف علی تھانوی کے لیے کسرِ شان ہو یا ادبی نقاد مولانا تھانوی کی بہ نسبت کم تر حیثیت کا مالک۔

عسکری صاحب نے مولانا اشرف علی تھانوی کے تنقیدی اصولوں کے بارے میں نہ صرف بلند بانگ دعوے کیے بلکہ یہاں تک کہا کہ مغربی ادب کو سمجھنے کے لیے ان کی تصنیف کا مطالعہ کرنا ضروری ہے لیکن انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں مولانا موصوف کی تحریروں سے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ جس کی بنیاد پر عسکری صاحب دعویٰ کرتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے تنقیدی اصول یا ہدایت کیا ہیں؟ یہ تو صرف عسکری مرحوم ہی جانتے ہوں گے لیکن انھوں نے اس سے قبل اپنے مضمون "اردو ادب کی ادبی روایت کیا ہے؟" میں شاہ وہاج الدین کی تصنیف اور مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے جو "ادبی اصول" دریافت کیے تھے وہ بہت ہی مضحکہ خیز ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا "نظریۂ تنقید" یا "ادبی اصول" "شعر و ادب کی تفہیم اور تخلیق کے لیے کس حد تک کار آمد ثابت ہو سکتا ہے' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مولانا اشرف تھانوی نے اپنی معرکہ آرا تصنیف "بہشتی زیور" میں عورتوں پر ناول پڑھنے کی پابندی عاید کردی ہے۔ اس لیے کہ اس سے عورتوں کے گم راہ ہو جانے اور بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔ اس فتوے کے بعد صرف عسکری صاحب جیسے شخص ہی ان کے ادبی اور تنقیدی اصولوں پر ادب کو پرکھنے کی جرات کر سکتے تھے۔ یہ کسی سنجیدہ اور نارمل انسان کے بس کی بات نہ تھی۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شاعر شاہ وہاج الدین اور مولانا اشرف علی تھانوی کی شعروادب سے متعلق آرا کی روشنی میں شعر کہے تو کیا اسے مستند شاعر تسلیم کر لیا جائے گا؟ کیا اشعار میں صرف تصوف کے مضامین کو باندھ لینے سے اچھے اشعار وجود میں آجائیں گے؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے جس کے جواب کے بغیر شعروادب کی بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔ خدا کا شکر یہ ہے کہ عسکری صاحب نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا اور اعتراف کیا کہ "اگر کوئی دعویٰ کرے کہ میں اپنے اشعار میں تصوف کے مضامین باندھتا ہوں تو ادبی ذوق کی تسکین ڈھونڈنے سے پہلے یہ دیکھنا لازمی ہوگا کہ مضمون بھی ٹھیک طور سے ادا ہوا ہے یا نہیں'

خصوصاً" جب بحث اردو ادب کی بنیادی روایت سے ہو رہی ہو تو سب سے پہلا کام یہ دیکھنا ہے کہ شعروں کا مطلب کیا ہے' کون سا شاعر کس درجے کا ہے۔ یہ بات تو بعد کی ہے پہلے اصول سے بحث ہونی چاہیے۔ پھر فروع سے (۴۴)۔"

عسکری صاحب نے اپنے اس مضمون میں غالب کے بارے میں بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ عسکری صاحب چوں کہ روایت کے معنی مابعد الطبیعیاتی روایت تصور کرتے تھے اور ان کے بیان کے مطابق ادبی روایت بھی ایک مرکزی روایت (مابعد الطبیعیاتی روایت) سے نکلتی ہے اور اسلام میں اس سے مراد دین ہے۔ اس لیے یہ قول ان کے "روایت کے سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے غالب کو بھول جانا چاہیے۔" اس لیے کہ "ان کا (غالب کا) کلام ہمارے لیے ایک پردہ بن گیا ہے' جو اصلی روایت کو دیکھنے نہیں دیتا۔" وہ اسی کے ساتھ شبلی اور حالی کی تنقید کو بھی بھول جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے خیال سے یہ لوگ روایت کے پاس دار نہیں۔ اچھا ہوا کہ عسکری مرحوم نے غالب کو روایت کا پاس دار قرار نہیں دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب روایت کے پاس دار نہیں' جدیدیت کے پاس دار تھے' اسی طرح شبلی اور حالی دورِ جدید سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کو روایت کے سوال پر سنجیدگی سے بحث کرتے ہوئے ضرور خارج کر دینا چاہیے تھا' لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ عسکری صاحب نے روایت کے چکر میں غالب کی شاعری میں تصوف کے عناصر کو نظرانداز کر دیا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عسکری صاحب پہلے ہی میر اور مومن کے طرف دار تھے۔ اس لیے ان کا غالب سے انصاف کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے انھوں نگی لپٹی رکھے بغیر غالب کو تصورِ روایت سے خارج کر دیا۔

عسکری صاحب کی طرح ٹی ایس ایلیٹ بھی روایت کا بہت بڑا علم بردار گزرا ہے اور وہ بھی مذہب اور ادب کو ایک تصور کرتا تھا لیکن عسکری صاحب اور ایلیٹ میں فرق یہ ہے کہ کٹر مذہبی اور کیتھولک ہوتے ہوئے بھی وہ کسی حد تک عقلیت پرست تھا اور بعض حقائق کو تسلیم کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذہب کے ساتھ ڈارون کو پسند کرنے پر مجبور تھا' ورنہ مذہب کا ڈارون سے کیا تعلق؟

اب آیئے' ڈاکٹر جمیل جالبی کے اصل سوال کی جانب کہ "آج کے بدلتے ہوئے معاشرتی اور ادبی منظر میں ہم اپنے ہاں وہ روایتی معیار کیسے نافذ کر سکتے ہیں جو مابعد الطبیعیات پر مبنی نہیں ہے؟" وہ یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ آیا "عسکری صاحب کا معیارِ روایت نئی تنقید کا معیار بن سکتا ہے؟ پہلے سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم عسکری صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مغرب کو مکمل طور پر مسترد کر دیں اور اس کی پھیلائی ہوئی گم راہیوں اور آلائشوں کو ترک کر کے قرونِ وسطیٰ کے دور میں واپس چلے جائیں اور "خالص مذہب" کا احیا کر کے مابعد الطبیعیاتی نظام میں زندگی بسر کریں۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ عسکری صاحب کا معیارِ روایت نئی تنقید کا معیار بن سکے یا نہ بن سکے ان کا کام تنقیدی نظریہ پیش کرنا تھا' لہٰذا انھوں نے اسے پیش کر دیا۔ یہ تنقیدی نظریہ قابلِ عمل ہے یا نہیں؟ یہ عسکری صاحب کا مسئلہ نہ تھا۔ انھوں نے یہ نظریہ بالکل اسی طرح پیش کیا جس طرح انھوں نے ۵۰ء کے عشرے میں اسلامی اور پاکستانی

ادب کا نظریہ پیش کیا تھا، لیکن مشکل یہ ہے کہ نظریے سے ادب تخلیق نہیں ہوتا (یہ دوسری بات ہے کہ ادب سے نظریہ وضع ہو جائے)۔ حیرت کی بات ہے کہ عسکری صاحب تخلیقی عمل سے اچھی طرح واقف تھے اور انھوں نے "ستارہ یا بادبان" میں شامل اپنے مضامین میں اس سے بالتفصیل بحث بھی کی ہے، لیکن زندگی کے آخری ایام میں وہ جب رینے گینوں سے متاثر ہوئے تو تخلیقی عمل کے اپنے طریقِ کار کو فراموش کر بیٹھے اور فرض کر لیا کہ وجدان کے بغیر محض ذہن پر زور دے کر ادب (اور وہ بھی اعلیٰ درجے کا تخلیقی ادب) پیدا کیا جا سکتا ہے۔ (۵*)

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن عسکری: "جدید شاعری" مشمولہ: "جھلکیاں" (حصہ اول) مطبوعہ: ماہنامہ "ساقی" دہلی، جنوری ۱۹۴۳ء

۲۔ جمیل جالبی: "عسکری کا تصورِ روایت" مطبوعہ "مکالمہ" کراچی۔ کتابی سلسلہ نمبر ۱۔ ۱۹۹۶ء

۳۔ محمد حسن عسکری: "روایت کیا ہے؟" مشمولہ "وقت کی راگنی"

۴۔ محمد حسن عسکری: "اردو کی ادبی روایت کیا ہے؟" مشمولہ: "وقت کی راگنی"

۵۔ میں نے عسکری صاحب کے تصورِ روایت کی بحث کو اس مقالے میں بہت مختصر کر دیا ہے۔ اس لیے کہ مقالہ بہت طویل ہو چکا تھا۔ میں نے اس موضوع سے اپنی زیرِ طبع کتاب "محمد حسن عسکری ایک مطالعہ" میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

☆ ○ ☆

تجزیاتی مطالعہ

ساقی فاروقی

حاجی بھائی پانی والا

(وہ ایک فیل فا تھا۔ یہ ترکیب میری اختراع ہے اور انگریزی / لاطینی ہائڈروسل (*۱) کا ترجمہ۔ جس طرح فیل پا وہ مریض ہوتے ہیں جن کے پیروں میں پانی اُتر آتا ہے 'فیل فا' وہ کہلائیں گے جن کے فوطوں میں پانی اُتر آئے۔)

دونوں مشکیزے لبالب
ایک چُمبک کی طرح
اپنی جانب کھینچتے رہتے اسے
فیل بندی قہر تھی........

مرد گاہک مسخری کرتے ہوئے ڈرتے
ذرا محتاط رہتے
جُھرجُھری کا سوانگ بھرتے........
عورتیں مغموم آنکھوں میں
ترس کاڑھے ہوئے
اپنے بچوں پر برس پڑتیں
اگر وہ بدلحاظ
بھولپن سے پوچھ لیتے :
"کیوں نہیں'

اُس کے فلانوں کی طرح
اِن کے فلانے کیوں نہیں"......

وہ خدائی فرش پر اکڑوں،
کبھی گوتم کے آسن میں، کبھی
تھڑے باہر پاؤں پھیلا کے،
اکڑ کر بیٹھتا......

باربار اس واسطے پہلو بدلتا......
......جگلری (٭۴) کرتا کہ پیروں میں
ہمیشہ جُھنجُھنی کے جُھنجُھنے بجتے
عجب اک مستقل سی بے کلی رہتی......

وہ غبارے پھٹنے پڑتے تھے
جن پر تانت سی نیلی رگیں پھولی ہوئی
ننھے منّے کیچوؤں کی طرح
کنڈلی مار کے بیٹھی ہوئی تھیں......

جس طرح گھینگا چھپانے کے لیے
اپنے سرسید کی داڑھی......
ہو، بہو،
پلپلے تربوز پر
اس کی لُنگی میز پوش ایسی پڑی رہتی......

اس مرض کا فایدہ اتنا ہوا

اپنی چوکی سے فراغت پا گیا
یہ کہ رڈی پھاڑ کر
اپنے تھیلے اپنی گودی میں سمیٹے
وہ انھی پر
ساری پڑیائیں بناتا
لونگ، دھنیا، دار چینی، جائے پھل اور تیج پات
سب مسالے اس کی رانوں کے مزے
چکھے ہوئے تھے......

رغیبتی جُل ککڑے ایسے تھے کہ بس
صاف کہتے اس نے کعبے کی زیارت ہی
نہیں کی ہے
فقط اجمیر جا کر لوٹ آیا
بلکہ یہ بھی مشتبہ

اِس پہاڑی سے اُترنا
دوسری کا قصد کرنا
حاجیوں کی دھینگا مُشتی، لپّا ڈُگی، ریل پیل
پھر گناہوں کے پٹارے کی طرح لٹکی ہوئی
فالتو گٹھری الگ
اس کی حالت غیر تھی
حج تو ممکن ہی نہیں......

جتنے حاسد اتنی باتیں
ایک روز

وہ اُلنوں سے نڈھال
موت کی بانسوں میں بانہیں ڈال کے
اپنے آقا کی طرف
اپنے راز اپنے "مفاعیلن" اٹھائے چل پڑا.......

کسی ملک میں ایک تھا بادشا(٭۳).......
.......ہمارا تمہارا خدا بادشا(٭۳)

٭۱۔ Hydrocele

٭۲۔ Jugglery

٭۳۔ چوں کہ "بادشاہ" حرمزدگی کرتے رہتے ہیں اس لیے میں نے ان کے ہجّے بدل دیے ہیں۔ ساقی

☆ ☆ ☆

عباس رضوی

ساقی فاروقی کی نظم "حاجی بھائی پانی والا"

نظم "حاجی بھائی پانی والا" جس کا تجزیہ حسبِ فرمائش زیرِ نظر سطور میں مقصود ہے، اردو کے منفرد ترین شاعر ساقی فاروقی (یہ انفرادیت جو بہ یک وقت منفی بھی ہے اور مثبت بھی، قلی قطب شاہ سے دورِ حاضر کے شعرا تک بہ وجوہ مسلم ہے) کی چند متنازعہ ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ ساقی شعر و ادب کی شو بزنس کے آدمی ہیں۔ ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں گلیمر جزوِ اعظم ہے۔ وہ مختلف النوع تنازعات کو جنم دینے یا پھر بنے بنائے تنازعات میں پھاند کر محفل لوٹ لینے میں مہارتِ تام رکھتے ہیں۔

نظم "حاجی بھائی پانی والا" نظموں کی اس قبیل سے تعلق رکھتی ہے جو اپنے موضوع اور برتاؤ دونوں کے اعتبار سے taboos کے زمرے میں آتی ہیں اور اردو میں ایسی نظمیں میراجی کی "لبِ جوئبار" کے علاوہ محض چند ہی اور ہوں گی جو ان انسانی مسائل پر لکھی گئیں جن پر خامہ فرسائی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے مگر ساقی جو قریب قریب گذشتہ پونے چار دہائیوں سے لندن میں مقیم ہیں کسی بھی موضوع، کسی بھی استعارے اور کسی بھی پیرایۂ اظہار کو اپنے لیے ممنوع نہیں سمجھتے۔ ان کے شدید جارحانہ رویّے کا مظاہرہ ہم ان کی لندن روانگی سے قبل کراچی میں دیکھ چکے ہیں جب ان کی ایک تکلیف دہ نظم "آج وہ...... کہاں ہے" منظرِ عام پر آئی تھی اور صاحبانِ نظر جان گئے تھے کہ افقِ شاعری پر ایک دم دار ستارہ ظہور کر چکا ہے۔

نظم "حاجی بھائی پانی والا" کا موضوع اک ایسا عمر رسیدہ پر چونیا ہے جو Hydrocele (خصیوں میں پانی اتر آنے کا عارضہ) کا مریض ہے اور شدید کرب اور بے چینی کے عالم میں اپنے چھوٹے سے کاروبار کو چلاتے ہوئے اپنی دکھ بھری زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ ایک خاص کاروباری برادری کے لوگوں کے عام ناموں کی طرح اس کا نام حاجی بھائی ہے جس میں ہمارے صاحبِ طرز و ایجاد شاعر نے پانی والا کا معنی خیز لاحقہ لگا کر عنوان کو خاصا دلچسپ بنا دیا ہے اور یوں نظم کا عنوان ہی قاری کو گھیر لیتا ہے۔ ساقی کی بعض دیگر انتہائی مشہور نظموں "شیر امداد علی کا میڈک" "خالی بورے میں زخمی بلا" "شاہ صاحب اینڈ سنز" "مستانہ ہیجڑا" "بریسٹ کینسر" اور "محاصرہ" کی طرح "حاجی بھائی پانی والا" میں بھی اولین قرات کی حد تک بلا کی تحیّر خیزی ہے اور نظم اپنے موضوع کا مکمل پورٹریٹ محسوس ہوتی ہے جس میں تمام تر جزئیات شاعرانہ تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں مگر ساتھ ہی یہ نظم عجزبیاں اور غرابتِ زباں کا بھی شکار

ہے اور شاعر نے کئی مقامات پر زبان و بیان کے معاملے میں ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔ آیئے شاعر کی انگلی تھام کر اس نظم کی سیر کو چلتے ہیں۔

نظم کا آغاز اس کراہت انگیز لائن سے ہوتا ہے جس میں حاجی بھائی پانی والا کے testis کو لبالب بھرے ہوئے مشکیزے سے تشبیہ دے کر قاری کو پہلا ذہنی جھٹکا دیا گیا ہے پھر ان کی ہیئت' وزن اور کھنچاؤ کے بیان کے بعد صرف ایک بلیغ لائن میں پوری صورت حال کو متشکّل کر دیا گیا ہے یعنی "فیل بندی قہر تھی" اس جامع ترکیب میں شاعر نے کمال چابک دستی سے پورے احوال کو سمو دیا ہے جو اس کریہہ وزن کو کمر کے ساتھ کس کر باندھے رکھنے کا منظر دکھاتی ہے۔ اور تب شاعر مردوں' عورتوں اور بچوں کے مخصوص ردِ عمل کو تصویر کرتا ہوا حاجی بھائی پانی والا سے متعلق دیگر مکروہ تفصیلات بیان کرتا ہے مگر اپنے مخصوص انداز میں :

مرد گاہک مسخری کرتے ہوئے ڈرتے
ذرا محتاط رہتے
جھر جھری کا سوانگ بھرتے
عورتیں مغموم آنکھوں میں
ترس کاڑھے ہوئے
اپنے بچوں پر برس پڑتیں
اگر وہ بد لحاظ
بھولپن سے پوچھ لیتے :
"کیوں نہیں
اس کے فلانوں کی طرح
ان کے فلانے کیوں نہیں"

نظم کا یہ حصہ حقیقت سے خاصا بعید محسوس ہوتا ہے کیوں کہ "مسخری کرتے ہوئے ڈرتے / ذرا محتاط رہتے" ایک ایسا بیان ہے جو جسمانی چھیڑ چھاڑ کی جانب اشارہ کرتا ہے اور قاری حیران ہے کہ اک ایسے مریض سے جو ایسے تکلیف دہ مرض کی شدت سے نیم جاں ہے اور حرکت کرنے سے بھی قریب قریب معذور ہے کون شقی ایسی مسخری کرتا ہوگا جس سے حاجی بھائی کو ضرر پہنچنے کا امکان ہو۔ جھر جھری کا سوانگ بھرنا بھی غیر فطری محسوس ہوتا ہے کیوں کہ ایسے مریض کو دیکھ کر فی الواقع جھر جھری سی آجاتی ہے۔ بچوں کے حوالے سے لکھی گئی لائنیں یعنی "کیوں نہیں / اس کے فلانوں کے طرح / ان کے فلانے کیوں نہیں" بھی غیر مدلّل اور غیر حقیقی ہیں کیوں کہ بچوں کا یہ اعتراض یا بہ قول شاعر بھولپن سے کیا ہوا سوال قاری کو الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ دراصل یہ ماہرانہ تقابلی موازنہ بچوں کے بس کی بات نہیں ہے خواہ وہ یورپ و انگلستان کے بچے ہوں یا گورکھ پور کے۔ اور پھر یہ بات بھی پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس سلسلے

میں بچوں کا علم ہمارے شاعر کے علم اور وسیع مطالعہ کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔

نظم کا سفر آگے بڑھتا ہے تو شاعر اپنے کریہہ اور عبرت ناک subject کو پوری باریک بینی سے دیکھتا اور دکھاتا ہے اور قاری کے سامنے منظر کی کچھ اور تفصیلات آتی ہیں :

وہ خدائی فرش پر اکڑوں
کبھی گوتم کے آسن میں، کبھی
تہمد سے باہر پاؤں پھیلا کے
اکڑ کر بیٹھتا

بار بار اس واسطے پہلو بدلتا
جگلری کرتا کہ پیروں میں
ہمیشہ جھنجھنی کے جھنجھنے بجتے
عجب اک مستقل سی بے کلی رہتی

نظم کے اس حصے میں تصویر کشی کا عمل زیادہ طاقت ور ہوتا ہے بالخصوص دو بہت طاقت ور لائنوں نے جو شاعر کی خلاقانہ قوت کی مظہر ہیں، اس کرب کی بڑی بھرپور عکاسی کی ہے جس سے حاجی بھائی گزر رہا ہے :

ہمیشہ جھنجھنی کے جھنجھنے بجتے
عجب اک مستقل سی بے کلی رہتی

مگر اس کیفیت میں لفظ جگلری کسی طرح بھی برمحل نظر نہیں آتا کیوں کہ مستقل بے چینی کے عالم میں بار بار پہلو بدلنا، مختلف انداز سے بیٹھنا جہاں حاجی بھائی پانی والا کی تصویر میں حقیقت کا رنگ بھرتا ہے وہاں جگلری کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ لفظ تہہ بند کو بھی تہمد لکھ کر بے تکلفی سے برتا گیا ہے مگر تہمد غلط العام ہے لہٰذا زیادہ گراں نہیں گزرتا۔

اور اب نظم اس مقام پر آن پہنچی جہاں شاعر نے منظر کی ناقابلِ بیاں تفصیلات کو پوری طرح بے نقاب کر دیا :

وہ غبارے پھٹنے پڑتے تھے
جن پر تانت سی نیلی رگیں پھولی ہوئی تھیں
ننھے منے کیچوؤں کی طرح
کنڈلی مار کے بیٹھی ہوئی تھیں

نظم کے اس حصے میں شاعر نے حاجی بھائی پانی والا کے ان اعضائے بدن کو عریاں کر کے دکھایا ہے جنھیں مرض کی شدت نے انسانی قوت برداشت کی آخری حدود تک enlarge یا inflate کر دیا ہے اور وہ ایسے غباروں کی طرح نظر آتے ہیں جو بس پھٹنا ہی چاہتے ہوں اور ساتھ ہی ان پر پھیلی ہوئی نیلی رگوں کے لیے کیچوؤں کی نادر تشبیہہ کا انتخاب کیا مگر ساقی اظہار کو اس کی انتہائی شدت تک لے جانے کے قائل

ہیں سو انھوں نے ایک ایسی لائن بھی لکھی جس نے اس عمدہ تشبیہہ کے جادو کو بے اثر بنادیا یعنی "کنڈلی مار کے بیٹھی ہوئی تھیں" شاید تخلیقی ہیجان کی شدت اور منھ زوری اور پھر اپنی زمین سے برسہا برس کی دوری کی وجہ سے شاعر یہ بات بھول گیا کہ بے چارے کیچوے کنڈلی مار کے بیٹھنے کی آن بان سے محروم ہوتے ہیں۔

نظم کے اگلے موڑ پر قاری کی ملاقات ساقیؔ فاروقی سے ہوتی ہے 'revile' کرنا ان کا فن ہے اور اگر بات محض پھبتی تک رہ جائے تو ان کا قاری ان کا ممنون ہوتا ہے۔ شاعر نے لکھا :

جس طرح گھینگا چھپانے کے لیے
اپنے سر سید کی داڑھی......
ہو بہو
پلپلے تربوز پر
اس کی لنگی میز پوش ایسی پڑی رہتی

شاعر کی خوئے مردم آزاری اپنی جگہ اور اس کا مخصوص طرزِ ادا اپنی جگہ لیکن انھوں نے ایک نیک نام ریفارمر کو ناحق لپیٹا اور ان پر گھینگا چھپانے کی پھبتی اچھال دی۔ نظم میں سر سید کی داڑھی کا تضحیک آمیز اور غیر ضروری حوالہ نہ صرف ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے بلکہ قاری کو بدمزہ بھی کرتا ہے۔ اگر اس نظم میں یہ لائن نہ ہوتی یا شاعر کسی دوسری تشبیہہ سے کام نکال لیتا تو شاید یہ بات نظم کے حق میں کچھ بہتر ہوتی۔ یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ پلپلا تربوز صرف ایک نہیں تھا بلکہ دو تھے۔

نظم کا اگلا حصہ اس نظم کا کم زور ترین حصہ ہے جس میں خیال اور زبان دونوں ہی کم زور نظر آتے ہیں :

اس مرض کا فایدہ اتنا ہوا
اپنی چوکی سے فراغت پا گیا
یہ کہ ردی پھاڑ کر
اپنے تھیلے اپنی گودی میں سمیٹے
وہ انھی پر
ساری پڑیا میں بناتا
لونگ' دھنیا' دار چینی' جائے پھل اور تیج پات
سب مسالے اس کی رانوں کے مزے چکھے ہوئے تھے۔

تخلیق کے جوش میں شاعر نے ایک عجیب و غریب منظر بنا ہے کہ حاجی بھائی کو اب اپنی چوکی کی حاجت نہیں رہی بلکہ وہ انھی اعضائے بدن پر رکھ کر جنھیں شاعر پلپلے تربوز یا غبارے قرار دے چکا ہے مختلف مسالوں کی پڑیاں بناتا ہے۔ قاری حیران ہوتا ہے جب ساقی جیسا شاعر عجزِ بیاں کا شکار ہو کر "پڑیاں" کو "پڑیا میں"

لکھتا ہے اور پھر تھوڑا سا شرماتے ہوئے قاری کو بتاتا ہے کہ "سب مسالے اس کی رانوں کے مزے چکھے ہوئے تھے"۔ جب کہ قاری خوب جانتا ہے کہ سب مسالے کون سا مزا چکھے ہوئے تھے؟ طرفہ تماشا یہ کہ اس کی دکان سے مرد، عورتیں اور بچے باقاعدہ خریداری بھی کرتے تھے۔ شاید زیادہ مزے دار مصالحوں کی وجہ سے۔

نظم آگے چل کر ان حاسدوں کا بیان کرتی ہے جو حاجی بھائی پانی والا کے غیاب میں اس کے حاجی ہونے پر شک و شبہہ کا اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے اس نے کعبۃ اللہ کی زیارت ہی نہیں کی ہے بلکہ فقط اجمیر تک جا کے لوٹ آیا ہے یعنی اس نے سرے سے حج ہی نہیں کیا ہے کیوں کہ بیماری کی وجہ سے جو قباحت اس کے ساتھ تھی اور جسے شاعر نے یوں نظم کیا ہے :

غیبتی جل ککڑے ایسے تھے کہ بس
صاف کہتے اس نے کعبے کی زیارت ہی
نہیں کی ہے
فقط اجمیر جا کر لوٹ آیا
بلکہ یہ بھی مشتبہ

اس پہاڑی سے اترنا
دوسری کا قصد کرنا
حاجیوں کی دھینگا مشتی لپاڈگی ریل پیل
پھر گناہوں کے پٹارے کی طرح لٹکی ہوئی
فالتو گٹھری الگ
اس کی حالت غیر تھی
حج تو ممکن ہی نہیں......

اولاً" تو یہ بات قاری کے حلق سے نہیں اترتی کہ ایک ایسے عمر رسیدہ اور گرفتارِ بلا شخص سے کوئی حسد بھی کرتا ہوگا جو محض اور محض ہمدردی اور رحم کا مستحق ہے، جو پرچون کی ایک چھوٹی سی دکان جیسے ناقابلِ رشک کاروبار سے اپنے لیے روزی پیدا کرتا ہے اور ایسے بھیانک مرض کا شکار ہے، اس کے لیے چلنا پھرنا تو در کنار ہلنا جلنا بھی کارِ محال ہے۔ حاجیوں کے حوالے سے دھینگا مشتی لپاڈگی جیسے ناروا الفاظ کا استعمال شاعر کے باغیانہ self کی عکاسی کرتا ہے کیوں کہ حج کے دوران جو ان عبادات میں سے ہے جن کی آرزو کی جاتی ہے دھینگا مشتی اور لپاڈگی قطعاً" بے معنی ہیں اور پھر ریل پیل چہ معنی دارد؟ ساقی لفظوں کو ان کے مزاج کے مطابق برتنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں مگر یہاں قاری کو ان سے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ اجمیر کا حوالہ نظم کے locale کا اشارہ بھی ہو سکتا ہے اور عقیدے کا بھی۔ دونوں صورتوں میں حاجی بھائی پانی والا پر اجمیر تک جا کر لوٹ آنے اور خود کو حاجی مشہور کر دینے کا الزام ہے کیوں کہ اس کیفیت میں حج خارج از

امکان نظر آتا ہے۔ نظم کے اس حصے کی پہلی دو لائنیں نظم کے بنیادی خیال کی کلید ہیں جسے ساقی نظم کے climax کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے جو نظم کی موجودہ تبدیل شدہ صورت میں موجود نہیں ہے۔ نظم اپنے اختتام پر ہمیں بتاتی ہے :

جتنے حاسد اتنی باتیں
ایک روز
وہ الٹوں سے نڈھال
موت کی بانسوں میں بانہیں ڈال کے
اپنے آقا کی طرف
اپنے راز اپنے "مفاعیلن" اٹھائے چل پڑا

حاسدوں کا دوبارہ اور غیر ضروری تذکرہ نظم کو بوجھل بنا دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا ساری بستی حاجی بھائی پانی والا کے حاسدوں سے بھری پڑی تھی مگر اس عجیب و غریب حسد کا سبب قاری پر نہیں کھلتا۔ بہرحال اس حصے کی آخری چار لائنیں طاقت ور اظہار کی مثال ہیں۔ ان لائنوں میں شاعر نے حاجی بھائی پانی والا کی موت کو بڑی کامیابی سے پینٹ کیا ہے اور یہ لائنیں ان کے مخصوص طرزِ ادا سے مالا مال ہیں۔ ان لائنوں کی رمزیت قابلِ دید ہے۔ وہ راز جو کبھی راز نہ تھے اور جنھیں شاعر نے فالتو گٹھری بھی قرار دیا تھا' "اٹھائے چل پڑا" کے ساتھ اک کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

اور یوں ساقی فاروقی کی اختراعانہ قوتوں کی مظہر ایک اور نظم اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی مگر شاعر وفورِ تخلیق میں دو ایسی لائنوں کا اضافہ کیے بغیر نہ رہ سکا جن کا اس نظم کی کیمسٹری سے قطعاً" کوئی تعلق محسوس نہیں ہوتا۔ "کسی ملک میں ایک تھا بادشا / ہمارا تمھارا خدا بادشا"۔ ان دو اضافی لائنوں سے نہ تو نظم کی حسن کاری میں کچھ اضافہ ہوا ہے نہ ہی خیال کو کوئی بڑھاوا ملتا ہے۔ یہ دراصل ایسی ہی یا کچھ کم اضافی لائنیں ہیں جن پر ساقی خود بڑے بڑے شعرا کو ٹوک دیا کرتے تھے کہ "بس نظم یہاں ختم ہو گئی آگے مت سنائیے۔" البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر وہ نظم کے آغاز سے ہی قصہ گوئی کا انداز اختیار کرتے تو نظم کے اختتام پر یہ سطور اضافی محسوس نہ ہوتیں۔

نظم حاجی بھائی پانی والا ہرچند کہ پہلی قرات میں اپنے موضوع کی ندرت اور طرزِ بیاں کے انوکھے پن کے علاوہ اپنے برتاؤ اور اپنی مخصوص جمالیات میں بڑی بھرپور محسوس ہوتی ہے مگر یہ نظم ساقی فاروقی کی کم زور نظموں میں شمار ہو گی کیوں جلد ہی قاری پر اس کے عیب کھلنے لگتے ہیں اور اس کی totality مجروح ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات بہ طور خاص قابلِ ذکر ہے کہ اپنے تازہ مجموعے میں ساقی نے اس نظم کی آخری لائنوں میں دو ایسے لفظ تبدیل کر دیے ہیں جو مقدس اسلامی مقامات کی توہین کے زمرے میں آتے اور جو بھارت کے ایک ادبی جریدے میں شائع ہو چکے ہیں مگر بعد میں انھیں "مفاعیلن" سے بدل دیا گیا۔ مذہبی معاملات میں احتیاط پسندیدہ ہے مگر اردو نظم کے قاری نے پہلی مرتبہ ایک خوف زدہ ساقی فاروقی کو دیکھا ہے جو کائناتی شہرت کا طلب گار تو ہے مگر سلامتی جاں کی حدود سے متجاوز بھی ہونا نہیں چاہتا۔

زکریا شاذ

ساقی کا "حاجی بھائی پانی والا" ...... ایک تجزیہ

زیرِ نظر نظم معاشرے کے کٹھور پن کی اندوہ ناک کہانی ہے اس کی عددی قیمت ساٹھ مصرعے ہے۔ اور فنی قیمت ادب کے پارکھی ہی جانتے ہیں۔ مصرعوں کی تراش خراش، لفظوں کی ایجاد و اختراع، ان کا ہارمونک (harmonic) انتخاب اور استعمال، ترتیب و تنظیم اور نظم کی بناوٹ میں مہارت و نفاست کا جو فنی شعور ساقی صاحب کے ہاں ملتا ہے کوئی اور شاعر ان کی اس خلاقی کے پاسنگ بھی نہیں۔ جمالیاتی توازن و اعتدال ان کی شاعرانہ اپج کا خاصہ ہے جو اس نظم میں بھی نئے ذائقوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ شاعر نے ایسی فن کارانہ دردمندی سے اپنے مشاہدے کو بیان کیا ہے کہ جو شاعر پر گزری وہی قاری نے محسوس کرلی اور اس طرح کہ پڑھنے یا سننے والے کے ہاں "اپنی آنکھوں دیکھا حال" کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

حاجی بھائی پانی والا، مشکیزے، گاہک، ٹانت، غبارے، بچکوے، سرسید، میز پوش، جھنجھنے، صفا اور مروہ کی منفرد امیجری نے نظم کو نگار خانہ بنادیا ہے، جس میں ہر تصویر مکمل اور دوسری سے جدا ہے مگر ان کے فن کارانہ ربط نے مجموعی تاثر کی وہ تشکیل کی ہے کہ نظم کا وقار بلند ہو گیا ہے۔

جسمانی امراض پر آپ کی نظر جمتی ہے اور خوب جمتی ہے۔ جسمانی عیوب کو آپ لفظوں میں اس طرح صیقل کرتے ہیں کہ وہ عیوب آپ کا ہنر بن جاتے ہیں۔ یہ نظم موضوع کے اعتبار سے ساقی صاحب کی نظموں "شاہ صاحب اینڈ سنز" اور "مستانہ ہیجڑا" کے قبیل کی نظم ہے۔ مگر موضوع سے کوئی بھی نظم بڑی یا چھوٹی نہیں ہوجاتی۔ تخلیق کی فنی قدر و قیمت کا اندازہ زبان و اظہار کی ہنرمندانہ باریکیوں سے لگایا جاتا ہے۔ میں نے جب بھی ساقی کی کوئی نئی نظم پڑھی میری ملاقات ایک نئے ساقی سے ہوئی۔ وہ اپنی ہر نئی تخلیق میں پہلے سے زیادہ توانا اور تازہ دم نظر آتے ہیں۔ ساقی متنوع اسلوبِ بیاں کے شاعر ہیں اور یہ مقام اسی شاعر کو نصیب ہوتا ہے، جس کا جذبہ genuine اور متحرک ہو۔ ساقی جذبے کی رنگارنگی کے ایسے شاعر ہیں کہ جہاں بڑے بڑے شاعروں کے "رنگ" فق ہوجاتے ہیں۔ آپ اردو زبان اور ادب کی صحیح معنوں میں خدمت کر رہے ہیں تو پھر مجھے بے چون و چرا کہہ دینا چاہیے کہ ساقی فاروقی جدید اردو نظم کے وفادار خادم ہیں۔ میں دوستوں میں آپ کا تذکرہ ساقی صاحب "بشیر امداد علی کا میڈک والے"، ساقی صاحب "برسٹ کینسر" والے یا ساقی صاحب "مستانہ ہیجڑا" والے کے ناموں سے کیا کرتا تھا۔ اب ان کی پہچان میں یہ اضافہ

ہو گیا ہے کہ میں دوستوں سے آپ کا ذکر یوں کرتا ہوں...... ساقی صاحب! حاجی بھائی پانی والے۔

نظم کا عنوان پڑھتے ہی ذہن میں بچپن کے زمانے کی تصویریں گھومنے لگتی ہیں..... مجھے یاد ہے ہمارے محلے میں جب پینے کا پانی آسانی سے دستیاب نہیں تھا تو ایک آدمی گھر گھر جا کر "بھیستا" پانی دیا کرتا تھا۔ سب اس کو "بھائی پانی والا" کہتے تھے..... جب کبھی دروازے پر دستک ہوتی اماں کہتیں "جاؤ دروازہ کھولو۔ بھائی پانی والا ہو گا۔" میں دروازہ کھولتا وہ کھڑا ہوتا..... لکڑی کا موٹا لمبا ڈنڈا اپنی گدی پر "انقا" رکھے ہوئے جس کے دونوں سروں پر پانی سے بھرے ٹین کے کنستر لٹک رہے ہوتے۔ اس عالم میں، میں اکثر اسے آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ بوجھ کے باعث کبھی وہ دائیں تو کبھی بائیں جانب کو جھک جاتا۔ یہ کردار اب بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ماشکی بھی بعض جگہوں پر اپنا کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب لوگ ہماری ثقافت کا اہم حصہ ہیں۔

نظم کا آغاز چونکا دینے والے مگر انتہائی رازدارانہ انداز سے ہوتا ہے کہ دھیان نظم کے کردار اور اس کے پس منظر سے ہٹتا ہی نہیں، کوئی اور بات سوجھتی نہیں۔

دونوں مشکیزے لبالب

ایک چہبک کی طرح

چہبک کے لفظ میں وہ ساحرانہ کشش ہے کہ آگے بڑھنے کو جی ہی نہیں چاہتا..... اس کے گرد تھوڑی دیر کا رقص وارفتگی کا تقاضا ہے۔ لفظ چہبک میں وہ مقناطیسی کھچاؤ ہے جو شاید خود مقناطیس میں بھی نہیں ہو گا۔ اس لفظ سے کئی اور لفظوں کی شبیہیں آنکھوں میں اتر آتی ہیں جن کی خوشبو ذہن میں بس جاتی ہے۔ مثلاً "..... چومنا، چٹنا، چپکنا اور چابک بھی۔ ان سب میں چہبک کی لفظی و معنوی خاصیتیں موجود ہیں۔ شاید اسی لیے یہ الفاظ چہبک کی طرف کھنچتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور چہبک معنی آفرینی کا مرقع بن جاتا ہے۔ پھر مشکیزے کی تمثیل اتنی ملایم ہے کہ اس کے ساتھ چہبک ہی کا استعمال موزوں تھا جس نے کردار کی اصل کیفیت کی ہو بہو تصویر کشی کی ہے..... یہاں تک ذہن میں کردار کی ثقافتی تصویر پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے..... مگر.....

فیل بندی قہر تھی

کا اعلان ذہن میں بسے ہوئے پورے منظر کو تبدیل کر دیتا ہے۔ یہاں سے نظم کے حسن اور انفرادیت کی بنیاد پڑتی ہے جو مصرع مصرع بڑھتی جاتی ہے۔ دراصل "وہ" کسی مردانہ مرض میں مبتلا ہے جس کو "مشکیزوں" کا "پانی دار" بوجھ کسی طرح ڈھنگ سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اس لیے تکلیف کے باعث فیل بندی اس کے لیے عذاب بنی ہوئی ہے۔

"حاجی بھائی پانی والا" کی تمثال سازی نے نظم کو پہلوداری کے وصف سے ملا دیا ہے جو نظم اپنے عنوان ہی سے ادھر ادھر کی سیر کرانے لگے اس کی رنگا رنگی مسلم ہے۔ اگر نظم کا عنوان "فیل فا" یا کچھ اور ہوتا تو اکہرے پن کا بوجھ نظم کو کھینچ کر نیچے لے آتا۔

"اس" کا اصل دکھ "گاہک" کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ یہ نظم کا تیسرا موڑ ہے جہاں سے نظم کی پوری فضا بنتی ہے۔ "اس" نے باوجود اذیت ناک بیماری کے خوردہ فروشی کی دکان ڈال رکھی ہے۔ "وہ" باور کرانا چاہتا ہے کہ "وہ" دوسروں سے کسی طرح بھی کم نہیں اور جینے کا پورا حوصلہ رکھتا ہے۔ مگر لوگ "اس" کا مذاق اڑاتے ہیں کہ "اس" کا اس حالت میں معاشرے میں کوئی مقام نہیں۔ شاید وہ اس کے پاس خریداری کے لیے کم اور اس کی دل آزاری کے لیے زیادہ آتے ہیں۔

مرد گاہک مسخری کرتے ہوئے ڈرتے

ذرا محتاط رہتے

کبھی کبھی اس کو لوگ منہ سے کچھ نہیں کہتے مگر کسی نہ کسی بہانے اس کا دل دکھا ہی جاتے ہیں۔

جھرجھری کا.........

اب نظم میں ایک وقفہ سا آگیا ہے۔ ہول ناک خاموشی ہر طرف منڈلا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی رو رہا ہے۔ شاید "وہی" درد کا مارا رو رہا ہو..... مگر نہیں! وہ رونے والا تو نہیں!..... تو پھر......

عورتیں مغموم......

ترس کاڑھے ہوئے

یہ عورت ہی ہے جس سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ شاعر نے ضمناً عورت کے اس فطری پہلو کی طرف اشارہ بھی کردیا ہے کہ بہرحال عورت مرد کی بہ نسبت نرم دل ہوتی ہے جو کسی کو مصیبت میں مبتلا دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے۔ اسی باعث وہ عورتیں اپنے بچوں کو "اس" کے بارے میں الٹے سیدھے سوالوں پر ڈانٹتی ہیں۔ پھر "ترس کاڑھے ہوئے" کے ٹکڑے میں بہت سی کیفیتیں بند کردی گئی ہیں..... جیسے یہ روز مرہ کا معمول ہے کہ لوگ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور عورتیں اس کی حالتِ زار پر کڑھتی ہیں۔ گویا اس مصرعے سے وقت گزرنے کے احساس کی غمازی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔

اس کی بیماری اور دل آزاری روز بہ روز بڑھتی ہی جارہی ہے۔ اسے کسی طرح بھی چین نصیب نہیں۔

وہ خدائی فرش.........

کبھی گوتم.........

....

اکڑ کر بیٹھا ہے

اس کا دکھ دہرا ہے۔ ایک درد کی شدت اور دوسرے لوگوں کے حوصلہ شکن طعنے۔ وہ اپنے اس راز کو چھپانے کے لیے اگر پہلو بدل بدل کر بیٹھتا بھی ہے تو یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ دراصل اس کے پاؤں سوجاتے ہیں۔ اس کی اس بے چارگی کو شاعر نے بڑی فن کاری سے لفظوں میں ڈھالا ہے۔

بار بار اس واسطے پہلو بدلتا

جگلری کرتا کہ پیروں میں

جھنجھنی کے جھنجھنے بجتے

اس ٹکڑے کے پہلے مصرعے میں حرفِ علت یعنی "اس واسطے" کا استعمال اضافی سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس "واسطے" کو مصرعے سے حذف کر کے اگلے دو مصرعوں کو پڑھا جائے تو شاید خیال کا تسلسل پھر بھی برقرار رہتا ہے۔ کیوں کہ "جگلری" کے رواں لفظ میں "اس واسطے" بڑے فطری انداز میں خود بہ خود چھپا ہوا ہے۔ اور پھر حرفِ بیان یعنی جگلری والے مصرعے میں "کہ" کا استعمال بھی پہلو بدلنے کی توجیہہ واضح کر رہا ہے یوں کرنے سے مصرع بے وزن ہوجائے گا کہ اس واسطے کا الف واصل ہے۔ پھر نظم کی روانی بھی تباہ ہوگی۔

جھنجھنی کے.......

یہ مصرع شاعر کی سیاتی گہرائی اور لفظوں میں بند موسیقی تک شاعر کی رسائی کا نادر نمونہ ہے۔ پاؤں سوجانے کی کیفیت کو جھنجھنے کی تمثیل نے گویا زبان دے دی ہے۔ "ج" اور "ن" کی ردیفنگ تکرار سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے واقعی جھنجھنا بج رہا ہے۔ اس حرکی و سمعی امیج نے مصرعے میں رقص کی کیفیت کو اس طرح ابھارا ہے کہ سارا مصرع جھنجھنا اٹھا ہے۔

اس کی حالت دگرگوں ہے اور دکھ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ بیماری اب اذیت ناک شکل اختیار کرچکی ہے۔ غبارے، تانت اور کیچوے کی انوکھی تشبیہوں نے مصرعوں میں جان ڈال دی ہے۔ اس کے کرب اور مرض کی پوری تصویر کو بڑی مہارت سے ابھارا گیا ہے۔ اب یہ اندازہ بہ خوبی ہوجاتا ہے کہ وہ تکلیف کے کس درجے تک پہنچ چکا ہے۔ اب تو اس کی کراہ بھی صاف سنائی دے رہی ہے۔

وہ غبارے..........

....

.... بیٹھی ہوئی تھیں

نظم میں پھر وقفہ سا آگیا ہے۔ جیسے سکون ہو۔ اس نے چوکی پر بڑھیا کیں بنانے کی بجائے اپنی گود میں اب دکان کھول لی ہے۔ لوگ آجارہے ہیں جیسے اب اسے کوئی پریشانی نہیں ہے۔

اس مرض..........

....

سب مسالے اس کی رانوں کے سڑے
چکھے ہوئے تھے

مگر لوگ چپ رہنے والے کہاں ہیں۔ انھوں نے اس کا دل دکھانے کی اور راہ نکال لی ہے۔ اب وہ اس کی کردار کشی پر اتر آئے ہیں۔ انھوں نے اس کے تمام اچھے اعمال کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کردیا ہے۔

"ضیتی جل گکڑے" کی ترکیب شاعر کی اختراعی حس کا کھلم کھلا اعلان ہے جس میں شاعر نے اس

سے اپنے والہانہ لگاؤ اور لوگوں سے غم و غصے کا بھرپور اظہار کردیا ہے۔ یہ ترکیب ہمارے معاشرے کی ذہنی پستی کی صحیح معنوں میں تصویر کشی کر رہی ہے۔

اسے سب کچھ قبول تھا۔ مگر اس کے سارے حوصلے بے رحم معاشرے کے آگے ہار گئے ہیں۔ کیوں کہ اب لوگ بہتان تراشی پر اتر آئے ہیں۔ یہاں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں اس نے انھیں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

ایک روز

اس ایک روز پر نظم آکر آخری بار تذبذب میں مبتلا کردیتی ہے۔ پتا نہیں ایک روز وہ اس شہر سے چلا گیا ..... یا ایک روز اسے اپنے جسمانی دکھ سے نجات مل گئی۔

وہ الستوں........

....

اپنے راز اپنے صفا مروہ اٹھائے چل پڑا

یہاں آکر نظم کا تجسس پوری شدت سے اپنی تکمیل کو پہنچ کر اس طرح پاش پاش ہوجاتا ہے کہ سوائے آنسوؤں کے باقی کچھ نہیں بچتا۔ وہ دنیا سے جاچکا ہے۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ کہیں اس کا نام و نشان تک نہیں۔ زندگی اپنے معمول پر رواں دواں ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ تھیبتی جل لکڑے آ جا رہے ہیں بلکہ کسی دوسرے "حاجی بھائی" کی تلاش میں ہیں۔

دل ڈوب رہا ہے۔ اچانک سینے کو چیرتی ہوئی آواز ابھرتی ہے۔

کسی ملک میں ایک تھا بادشا
ہمارا تمہارا خدا بادشا

☆ ○ ☆

نظمیں

وزیر آغا

ہم ٹوٹے ہوئے تارے نہیں تھے

کبھی ایسے بھی ہوتا، ہم
دھنک کو خود سے لپٹائے
معطر روشنی کے طشت میں آتے
تو جیسے رقص کی لہروں پہ بہتے
مگر یہ ایک پل
بس ایک پل کا مرحلہ ہوتا
معاً چکنے چمکتے فرش کو ہم پار کرتے
پلٹ آنے کا رستا بھول جاتے!

مگر ایسے بھی ہوتا
ہم اتر جاتے خود اپنی تیرگی میں
نکل آتے وہاں
جنگل کے گنجل میں جہاں
اک روشنی کا دائرہ ہوتا
چھدرے ہونٹوں پہ وحشی سر مچلتے
ہراساں ڈھول کی پاگل دھمک
یلغار کرتی
عجب لذت بھری
اندھی خوشی کے ناچ میں بے وزن ہو جاتے

بھنور میں گھومتے
گرتے
ابھرتے
ڈوبتے...... لیکن
کبھی ہم دائرے کو توڑ کر
باہر نکلنے کی
کوئی کوشش نہ کرتے
کہ ہم ٹوٹے ہوئے تارے نہیں تھے!!

وزیر آغا

عجب اک مسکراہٹ

مہکتا گھاس کا قالین
اجلا دھوپ کا گنبد
چمکتا ریت کا پھیلاؤ
جس میں نصب اونچا برف کا پربت
اترتے برف کے گالے
گھروں کو جاتے رستوں پر
گلابی پتّیوں کے
ڈھیر میں کچھ ڈھونڈتی چڑیاں
ہوا...... خوشبوؤں بھرا اک خط لیے
بازار میں گرداں
جھکی پلکوں کے پیچھے
چھپ کے بیٹھی بوند پانی کی
زمیں کو اپنی مٹھی میں لیے
اک بے کراں آواز کی لہریں
لکیریں، زاویے، قوسیں
یہ سب کچھ
ان کہا بھی اور کہا بھی
سنا بھی ان سنا بھی
فقط اک مسکراہٹ
عجب تاروں بھری
اک مسکراہٹ...... اس کی آنکھوں کی!!

☆

شہزاد احمد

آسمان

بہت دن سے رلایا کیوں نہیں ہے آسماں نے؟
مرے اس کے تعلق میں
کہاں سے آ گئی یہ بے حسی کی لہر سی
.......گھڑی ہے قہر سی

مجھے معلوم ہے، میں آسماں کے عشق میں
آوارہ پھرتا ہوں
.......بہت بے چین رہتا ہوں
مجھے معلوم ہے جتنے ستارے بھی فلک پر ہیں
وہ مجھ سے دشمنی رکھتے ہیں
مجھ پر رشک کرتے ہیں

مگر یہ بھی مجھے معلوم ہے
مرے اور آسماں کے درمیاں کوئی نہیں ہے
(جو بھی کچھ مجھ کو نظر آتا ہے میرا وہم ہے)
مرے اور آسماں کے درمیاں شاید خلا ہے
اور خلا تو کچھ نہ ہونے کی علامت ہے

مگر یہ فاصلہ کیا ہے؟
جو کم ہونے میں آتا ہی نہیں
مجھے اس فاصلے نے مار ڈالا ہے
مرے اور آسماں کے درمیاں یہ فاصلہ

کب تک رہے گا؟
اسے میں کب ملوں گا؟
جس کی قربت ہر گھڑی محسوس کرتا ہوں

کبھی مل پاؤں گا اس کو
مگر یہ بھی تو ممکن ہے
جدائی جاودانی ہو
میں اس کے سانس لینے کی صدا سنتا ہوں
اس کی وسعتوں کو دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے

مگر پھر سوچتا ہوں
یہ تعلق کچھ تو ہو گا
آخر اتنے فاصلے میں قربتیں کیوں ہیں
وہ میرا دکھ سمجھتا ہے
میں اس کا دکھ سمجھتا ہوں!

☆

شہزاد احمد

ظاہر باطن

کیا باہر کچھ ہے ہی نہیں
جو کچھ مجھے دکھائی دیتا ہے، مرا باطن ہے
کیا چیزیں موجود نہیں؟
اور اگر ہیں تو، میری آنکھوں کے اندر ہیں

یہ آئینہ جو مجھے اپنے چہرے کی پہچان بتاتا ہے
باہر کی دنیا میں نہیں!
دل کی پہنائی میں کہیں آویزاں ہے
اور گزرتا وقت.....
جو ہم سے گریزاں ہے
سینے کے اندر چلتا ہے
جیسے ہر سو خون کی نہریں دوڑتی پھرتی ہیں
کیا میں ایک جہان ہوں
اور بہت ویران ہوں
یا اس پھیلی ہوئی وسعت کا حصہ ہوں
جس کا سمٹ جانا بھی ایک قیامت بن سکتا ہے

جس کا ہونا اور نہ ہونا ہی سب کچھ ہے
جس کی باتیں میرے باطن کو بھڑکاتی ہیں

مجھ کو اور الجھاتی ہیں
کیا باطن اور ظاہر
ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں
اور کسی نے اس سکے کو
عین بیچ سے کاٹ دیا ہے

☆

رضی اختر شوق

برمودا ٹرائی اینگل

رن وے پہ یہ اتنی کہر کیوں ہے
ہم کون سے ایرپورٹ پر ہیں
امید کے پاس کے یقیں کے؟
یا صرف ہوا کا ہاتھ تھامے
نادیدہ سفر پہ جا رہے ہیں
حیرت کا گراف بڑھ رہا ہے
روشن ہیں کئی سوال کے بلب
یہ کون سا سنہ ہے عیسوی کا
کیا اگلا شیڈول کہہ رہا ہے
تر جسم میں نیند جل رہی ہے
اخبار کی آخری سطر تک
اک بے خبری لکھی ہوئی ہے
یا ایسے کسی جہاز میں ہیں
آگے کی تمام منزلوں کا
عملے نے سراغ کھو دیا ہے
راڈار جواب دے چکے ہیں
رن وے نے دیے بجھا دیے ہیں
پرواز شناخت کھو چکی ہے

☆

رضی اختر شوق

اعزاز

مدتیں بیت گئیں گو مجھے چلتے چلتے
کسی اعزاز کی دستک مرے خیمے پہ نہیں

میں نواگر کسی منصب کسی رُتبے پہ نہیں
کوئی بھی حرفِ ستائش مرے نغمے پہ نہیں

پھر بھی یہ کم تو نہیں ہے کہ مسافت کا غبار
میرے قدموں میں رہا ہے مرے چہرے پہ نہیں

سحر انصاری

سمندر کے قریب

رات کے وقت مرا شہر
سمندر کے قریب
ہے سجائے ہوئے ہر رنگ کی جگ مگ کرنیں
جس طرح طشت میں رکھے ہوئے ہیروں کی چمک
اور جواہر کی دمک
میں جب آنکھوں میں بسا لیتا ہوں اس منظر کو
جگمگا اٹھتی ہیں خود میرے بدن کی گلیاں
کھلنے لگتی ہیں رگ و پے میں مہکتی کلیاں
اور اس وقت وہ چہرے، متبسم چہرے
جو مجھے لائے تھے اس گوشہ فرصت کی طرف
مجھ کو لگتے ہیں چمکتے ہوئے بے داغ صدف
جن میں اخلاص کے تابندہ گہر
شہر کی ر شنیوں ہی کا نسب رکھتے ہیں
ہر مداوائے غم ہمت شب رہے ہیں

ادیب سہیل

راگ مالکوس کی ایک راگنی توڑی

(س ر گ م پا دھا نی)

روپ مالکوس:

یہ شاہزادہ ہے کس نگر کا؟
لباس ہے سرخ، کام زر کا
گلے میں چمپا کلی مرصع
انگوٹھی یاقوت کی ہے
بازو پہ نورتن
اور کچے سونے کی طرح پیکر کا رنگ
تخت ہوا پہ بیٹھا ہوا ہے میزان عدل پکڑے
مصاحب دل نواز حلقہ کیے ہوئے ہیں

....

راگنی توڑی:

اور اس کی اک راگنی ہے توڑی
حسین،
چنچل سی،
روح پرور سی،
دلربا سی،
سہیلیاں اس کی گن کلی، گوری، کوکبی اور کھنبوتی ہیں
جمال سب میں ہے مشترک اور

شمار سب کا ہے خوش قدوں میں
نظر میں شوخی ہے اور آنکھوں میں رم ہرن کا

کمال سے اپنے اس کو بخشو نے حسن بخشا' اثر نوازا
جمال سے اپنے اسی نے بیجو کے دل کو موہا
اور اس پہ ایسا فدا ہوا تان سین
اس نے
میاں کی توڑی کے نام سے ایک اور توڑی ۔ زندہ جاوید دے دی
فراخ پیشانی
مرگ نینی'
بلند بینی
بھرا بدن
رنگ سبزہ مائل سفید
قشقہ ہے زعفرانی

....

میاں کی توڑی پہ ایسے ریجھے بلاس خاں
تان سین زادے
کہ اس پہ دھرپد کے بول لکھے:
کون بھرم بھولے ہو من گیانی' پوچھت راگ انچھر بدھ بانی
ان جانی کچھ جانی' نجات بدیا بہت سیانی' جو کوئی سادھیں'
سو ہی گن جانیں'
پارس کی مت یوہی تھانی' بلاس خاں کے پر بھو جو بھلا جانیں
تان سین گور گیانی۔
الاپ:

ہرے بھرے بن میں جان و تن کو سرور ملتا ہے

آدمی اپنے ہر غم و کرب کو بھلا کر
ورود کرتا ہے ماورا میں کچھ اس طرح سے
کہ منظروں میں قیام کر کے بھی منظروں میں نہیں ہے گویا

....

ہرے بھرے بن سے دھیان کا رشتہ ہے پرانا
رشی منی نے اسی جگہ آ کے گیان پایا
یہاں پہ دل دنیوی علائق سے دور ہوتا ہے
اور انساں کے فکر کو ارتکاز ملتا ہے
پھول کھلتے ہیں
شاخ ہلتی ہے
پنچھی گاتے ہیں
رنگ اڑتے ہیں چار جانب
عجیب راحت سی دل کو ملتی ہے
بن کے آنگن میں
دیکھ کر یہ ملاپ خوشبو کا **نغمگی** سے
اڑان رنگوں کی تتلیوں کی طرح سے ہے شاخ در شاخ!

....

ہیں بن کے کان آشنا ہزاروں برس سے
نغموں کی دل نوازی سے
اور اس نے **شکنتلا** کی نگاہ دیکھی ہے
جس کی ہرنوں سے دوستی تھی
نثار جس پر تھیں اپسرائیں!
قلم سے جس کو مہاکوی نے امر کیا ہے!

....

ہرن کا بن سے اور اس کے نغموں سے واسطہ کچھ عجب رہا ہے

ہرن کا سدھ بدھ ہمیشہ نغموں میں گم ہوا ہے
وگرنہ گج پر سوار نورجہاں طپنچہ کو داغنے کے بجائے
کیوں قمرغہ میں نغمہ گروں کے لشکر کو ساتھ لاتی
ہرن کے ڈاروں کو بس میں کرنے کا شوق کرتی

....

اثر کی تصدیق لحن داؤد سے بھی ہوتی ہے
اور سائنس بھی صدا کی اثر پذیری کا معترف ہے
گنی یہ کہتے ہیں سنگ پارہ بھی موم ہوتا ہے نغمگی سے
ہے خوش نوائی علاج دل کی فسردگی کا
بہار لاتی ہے دل کے آنگن میں خوش صدائی

....

توڑی کی موجودگی:

ہرے بھرے بن کے سبز قالین پر کھڑی ہے حسین توڑی
لگا ہے کندھے سے بین
انگلی کے مس سے جو لحن پھوٹتا ہے
وہ مست کرتا ہے' ہر کہ و مہ کو' نقش و گل کو!
عجب ہے توڑی کی گائیکی کی اثر پذیری
کہ جب بھی چھیڑا کسی نے بن میں یا بن کے اطراف
کوئی ہرنی بھلا کے جست و زقند اپنی
کھڑی ہوئی پاس آکے جیسے ہو ایک مورت!
صدا یہ توڑی کی سن کے اک دل زدہ بھی گھر سے نکل گئی ہے
وہ گا رہی ہے
چھیڑت ہے کوئی توڑی بن میں' دیا چین پڑت نہیں من میں
اس کی اور میں کھنچتی جاؤں
جادو بولے اس کے فن میں

چھیڑت ہے..........
سر مستی میں ڈالی ڈالی
جھوم رہی ہے من آنگن میں
چھیڑت ہے..............
ہرنی سدھ بسرائے کھڑی ہے
کیا جادو ہے سُر سادھن میں
چھیڑت ہے...........
پیار کا ساگر جیسے امنڈے
تاروں کے جھن جھن جھن جھن میں
چھیڑت ہے.........
قوس قزح آفاق پہ پھیلی
ساتوں رنگ کھلے ہیں من میں
چھیڑت ہے..........
حسن ہی حسن ہے بکھرا ہر سو
پیار ہی پیار ہے مرگ نین میں
چھیڑت ہے کوئی توڑی بن میں' دیا چین پڑت نہیں من میں

....

ادھر وہ توڑی مگن
ملہپت کی حد سے اب مدھ میں جاچکی ہے
ز فرش تا عرش چادر سحر تن گئی ہے
سماعتوں پر ہے رس کی بارش
نظر میں پل پل دھنک کا ہر رنگ کھل رہا ہے
تمام صحرا میں اس کی جھنکار گونجتی ہے
(پروں کو پھیلا کے مور مستی میں ناچتے ہیں)

....

کسی بھی لمحے یہ راگ رانی
درت میں اپنے قدم رکھے گی
ابھی سے اس کے قریب ہرنوں کی ڈار آ کر کھڑی ہوئی ہے
ہوا ہو اس پر طلسم.......... جیسے!
درت کے ہر ایک مرحلے کا طواف کر کے
خموش جب بین کی صدائیں ہوئیں
تو توڑی کی نغمگی کا حصار ٹوٹا
وہ دیکھتی ہے کہ ایک ہرنی بڑی محبت سے تھوتھنی اس کی انگلیوں سے رگڑ رہی ہے
اور اس کی گردن میں ایک "سونے کا ہار" اپنی دمک میں کچھ اس سے کہہ رہا ہے
وہ ہنس پڑی ہے
وہ خوش ہے' اس میں کسی گنی کا ہے پیار شامل
گلے سے ہرنی کے ہار لے کر پہن لیا ہے
سرور میں ہے کہ اس کا سادھن سپھل ہوا ہے!

انور سدید

میری تنہائی ہے میری انجمن

اب مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ میں نے
زندگی تنہا گزاری ہی نہیں
میرے گرد و پیش میں رکھی ہوئی چیزیں
مری ہمراز تھیں
میں نے جس اونچے شجر سے بات کی تھی
وہ مرا دم ساز تھا
میرے دائیں اور بائیں جو کتابیں تھیں
وہ میری دوست تھیں
میں نے دکھ کو اپنے دل کے ایک کونے میں بٹھایا
تو وہ آنسو بن گیا
رونے لگا
دکھ بھی میرا دوست تھا
یہ مجھے تنہائی کا احساس ہونے ہی نہ دیتا
اور میں محسوس کرتا
میں نے اپنی زندگی تنہا گزاری ہی نہیں
میری تنہائی تو میری انجمن ہے
میری تنہائی ہے میری انجمن

☆ ☆ ☆

امجد اسلام امجد

کالا جادو

میرا تمام فن، مری کاوش، مرا ریاض
اک ناتمام گیت کے مصرعے ہیں جن کے بیچ

معنی کا ربط ہے نہ کسی قافیے کا میل
انجام جس کا طے نہ ہوا ہو اک ایسا کھیل

میری متاع، بس یہی جادو ہے عشق کا
سیکھا ہے جسکو میں نے بڑی مشکلوں کے ساتھ
لیکن یہ سحرِ عشق کا تحفہ عجیب ہے

کھلتا نہیں ہے کچھ کہ حقیقت میں کیا ہے یہ!
تقدیر کی عطا ہے یا کوئی سزا ہے یہ!

کس سے کہیں اے جاں کہ یہ قصہ عجیب ہے

کہنے کو یوں تو عشق کا جادو ہے میرے پاس
پر میرے دل کے واسطے اتنا ہے اس کا بوجھ

سینے سے اک پہاڑ سا ہٹتا نہیں ہے یہ!
لیکن اثر کے باب میں ہلکا ہے اس قدر
تجھ پر اگر چلاؤں تو چلتا نہیں ہے یہ!

☆☆☆

پیرزادہ قاسم

مقتل میں مکالمہ

قتل گاہ کی رونق
حسب حال رکھنی ہے
غم بحال رکھنا ہے
جاں سنبھال رکھنی ہے
زور بازوئے قاتل
انتہا کا رکھنا ہے
دشنہ تیز رکھنا ہے
اور بلا کا رکھنا ہے
اور کیا مرے قاتل
انتظام باقی ہے
کوئی بات ہونی ہے
کوئی کام باقی ہے
وقت پر نظر رکھنا
وقت ایک جادہ ہے
ہاں بتا مرے قاتل
تیرا کیا ارادہ ہے
وقت کم رہا باقی
یا ابھی زیادہ ہے
میں تو قتل ہونے تک
مسکرائے جاؤں گا

پیرزادہ قاسم

مہک

عرصہ تمنا میں
اہل درد کی خوشبو
افتخار رکھتی ہے
اعتبار رکھتی ہے
یہ گروہ غم آثار
غم بہ غم بہم ہو کر
خود سے دور ہونے تک
غم سے مہکے جاتا ہے
خالی شیشیاں جیسے
عطر کی مہکتی ہیں
چور چور ہونے تک

صبا اکرام

روشنی کا روپ، بہروپ

مرے گھر کے آنگن میں
چھتنار برگد
گھنا ہو چکا ہے اب اتنا
کوئی چندرما
چاہے چمکے گگن پر
ستاروں کے دیپک
کی لو جھلملائے
کوئی تھرتھراتی کرن
روشنی کی
نہ رستا مرے گھر کا
اب پائے گی
جب بڑھے گی
بھٹک جائے گی
اس کو دے گا
اندھیرا خد و خال اپنا
کہ وہ بھولی بھٹکی
کبھی راستے میں ملے بھی
تو بدلے ہوئے روپ میں ہو
اندھیروں کے بہروپ میں ہو

حمیرا رحمان

لمحہ

عمرِ رواں کے الجھے ہوئے پھیلاؤ میں
فرصت کا اک لمحہ کس کو ملتا ہے
ریگِ بلا اور تپتی دھوپ کے جھلسے ہوئے احساس
کی زد میں
کبھی کبھی اگ آنے والا سایہ کس کو ملتا ہے
اور اگر یہ مل جائے تو
کتنے بے انصاف' غلط اور چبھنے والے
زرد حقائق
دُھل جاتے ہیں
سارے منظر تھوڑی دیر کی بارش پا کر کھل جاتے ہیں
یہ اک پل
جو ہم دونوں کے بیچ میں آ کر رک سا گیا ہے
زیست کا حاصل
یہ اک پل' یہ ساعت
یہ اک عرصہ
کس کو ملتا ہے؟

حمیرا رحمان

بے دھیان مسافتوں کے ہم سفر کے لیے ایک نظم

تاریکی تو ہر موسم میں تاریکی ہے
اور خصوصاً
دکھ میں کوئی دلدار نہ ہو تو
دھوپ کہیں دروازے باہر
آنکھیں موندے، چپ سادھے ٹھہری رہتی ہے
کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے
میری آنکھ میں تیرنے والا
آنسو پہلے
اس کی آنکھ سے ٹپک گیا ہے
جو کچھ میں نے اس سے کہنا چاہا ہے
گویائی سے پہلے
اس کی سماعت تک پہنچا ہے
یہ دنیا اظہار کی دنیا ہے
جس میں ہر کوئی اپنے
جذبوں اور لفظوں کو ظاہر کردے تو پہچانا جائے
گو ہم دونوں نے لفظوں کے کاندھے پر
کم سر رکھا ہے
لیکن بے دھیانی میں چلتے چلتے
دونوں کتنا آگے نکل گئے ہیں

☆

ثروت حسین

نیند سے باہر

جاگ اٹھتا ہوں کسی آواز پر
تکیے کے نیچے
پھول کچھ رکھے ہوئے ہیں
نیند سے باہر نکل کر
دھوپ نے دروازہ کھولا
جل پری کی آنکھ سے
آنسو نہیں، موتی گرے تھے
دھوپ کے پیراک نے غوطہ لگایا
اور آنسو کھینچ لایا
اینٹ گارے سے بنی پیلی عمارت
کھڑکیوں سے گر رہے ہیں کاغذی رومال جیسے
یا فرشتے سرمئی مٹی پہ اپنے پاؤں دھرتے
سانس روکے دیکھتے ہیں
آدمی کو رقص کرتے

☆

چراغ۔ ایک حمد

چراغ ایک حمد ہے، چراغ ایک گیت ہے
چراغ کا یہ گیت ہی ازل کا انتظار ہے
ازل کے انتظار سے ابد کی ڈور کا سرا
بندھا ہوا ہے دیر سے، خدا کے حکم خاص پر
خدا کے حکمِ خاص پر، چراغ ایک حمد ہے

خوب رو چلتے اگر

خوب رو چلتے اگر تم
دور تک پھیلی زمیں پر
سرخوشی کے بیج بوتے
دور تک پھولوں میں سوتے
خوب رو چلتے اگر تم
شہر کی بنیاد رکھتے
لوگ ہم کو یاد رکھتے
خوب رو چلتے اگر تم

☆

بندرگاہ میں صبح

جہازوں کے عرشے پہ لاکھوں فرشتے
ہلاتے ہوں رنگین رومال جیسے
مجھے مل گئے ہیں پر و بال جیسے

☆

شاعری کا پرندہ

باغ کے اک گوشۂ تنہائی میں میری طرح
آب و خاک و باد کی یک جائی میں میری طرح
منہمک ہے قافیہ پیمائی میں میری طرح

عباس رضوی

چند یگانۂ روزگار ہم عصروں کے نام

(ایک رائے طلب عزیز کی تحریک پر)

یہ دنیا
جس میں ہم رہتے ہیں
جس کی خاک میں آخر ہمیں آسودہ ہونا ہے
ابد کی نیند سونا ہے
وہ ان لفظوں کی خوشبو سے منوّر ہے
جنھیں ہم لکھ رہے ہیں
یہاں دیوار و در اس اجنبی تحریر سے آراستہ ہیں
جسے لفظوں کے جادوگر
کسی انجانی دنیا سے
ہنر کا پیرہن پہنا کے لاتے ہیں
تو خوابوں کی سنہری سرزمیں پر
رقص کرتے ہیں نئے منظر
دمکتے نو تراشیدہ نئے پیکر
نئے سورج نئے بادل
نئی شامیں نئی صبحیں
نئی خوشبو سے بوجھل تازہ دم جھونکے ہوا کے
نئے برگ و ثمر سے وصل کی سرگوشیاں کرتے ہوئے
پیغام بر لمحے

یہ دنیا
لفظ کی ان دیکھی ان جانی نئی دنیا
اسی کو نشۂ تخلیق سے آسودہ کرتی ہے

جو سچّے لفظ لکھتا ہے
اسی کو خلعتِ نام آوری کا مستحق گردانتی ہے
جو ایسے خواب لکھتا ہے
جنھیں پانے کو اور تصویر کرلینے کو
خود تعبیر سرگرداں زمانے بھر میں رہتی ہے
سوائے احساس کے صورت گرو
کیوں خلعت و منصب کی خواہش کا ہدف خود کو بناتے ہو
خود اپنی ہی ثنا کرتے ہو
اپنی حمد لکھتے ہو
خود اپنا ہی بھجن گاتے ہو
اپنا بت بنا کر پوجتے ہو
مرض آخر یہ کیا ہے
جس نے تم کو آن گھیرا ہے
تم اپنی ذات کے محبس میں ہو
اور قیدِ تنہائی تمہارا ماجرا ہے
اور اس محبس کے اندر ہی نہیں
باہر بھی چاروں سمت گہرا گھور اندھیرا ہے
یہ روگ ایسا ہے
جس سے کوئی بھی جاں بر نہیں ہوتا
کہ یوں بھی اپنے کاٹے کا کوئی منتر نہیں ہوتا
یہ وہ موذی مرض ہے
جو فقط جاں لے کے ٹلتا ہے
کہ اس میں دھیرے دھیرے ذہن اندر سے پگھلتا ہے
سو دانش مند اس موذی مرض کو
ذہن کی خود لذّتی کا نام دیتے ہیں
کچھ اہلِ دل اسے
خود ذلّتی کا استعارہ جانتے ہیں
اسے خالص خسارہ جانتے ہیں

نئے احساس کے صورت گرو دیکھو
خود اپنے عشق میں جاں سے گذرنا
خود اپنے آئنے میں اپنے خدّ و خال پر مرنا
خود اپنے ہی قصیدے لکھ کے
اپنی نذر کرنا
کسی گھونگے کی صورت خول میں رہنا
بڑی بے چارگی اور کم نصیبی کی علامت ہے

یہ خوابوں کی زمیں ساری تمھاری ہے
کبھی اس خول کی اندھی گھٹن سے خود کو باہر لا کے
اس دنیا کو دیکھو
جو روشن ہے
جہاں سرو سمن حرف و معانی سے فروزاں
زیست کی خوشبو میں غلطاں ہیں
کبھی ایسا کرو
لفظوں کے باطن میں اتر کر
اک جہانِ آرزو امکان بھر دریافت کر دیکھو
جہاں شاداب چہرے ہیں
درخشاں خواب ہیں
اور آنے والے موسموں کے رنگ
ہر کوچے میں رقصاں ہیں

ذرا خود سے تو نکلو
اور اولی الابصار سے پوچھو
تو تم پر یہ حقیقت منکشف ہوگی
کہ یہ دنیا
اگر اثبات کرتی ہے تو بس اس کا

جو خود اپنی نفی کرنے پہ قادر ہو
بھلا ایسی بھی آخر بے قراری کیا
نمود و نام کی
شہرت کی خاطر آہ و زاری کیا
یہ عجلت کیوں
کہ تم بس ایک شب میں میؔر بن جاؤ
خود اپنے خواب کی تعبیر بن جاؤ
سو میرا مشورہ یہ ہے
کہ اپنی روح کو پاکیزہ رکھّو
اور بدن کو دور ہی رکھّو ہوس کی زہرناکی سے
کہ اربابِ نشاط ایسے بھی ہیں
اس شہرِ فن میں
جو اربابِ ادب کے روپ میں
قرطاس پر چھلکے چلاتے ہیں
کہ ان کو مصرعِ تر سے زیادہ
لقمۂ تر کی ضرورت ہے

نئے احساس کے صورت گرو تم بھی
کبھی اس خواہشِ مال و منال و جاہ و منصب سے نکل کر
صرف سچے لفظ لکھو
اور پھر دیکھو
خدا
لفظ و معانی کا خدا
کیسے خزانوں تک رسائی دینے والا ہے
وہ بندوں کو بھی
تھوڑی سی خدائی دینے والا ہے
تمہارے واسطے میں بھی دعاگو ہوں
تمھیں اللہ حسبِ آرزو

شہرت کی دولت دے
تمہارے ظرف کو گہرائی
اور لفظوں میں برکت دے
تم اس دنیا سے جب جاؤ
تمہاری سب خطائیں بخش کر
تم کو جوارِ میرؔ و غالبؔ میں جگہ دے

علی محمد فرشی

بات اتنی سی تھی

(۱)

بات اتنی سی تھی
رات مہکی نہیں
پھول سویا نہیں
خواب جاگا نہیں
چاند رویا نہیں
اس کے دریاؤں میں
دل ڈبویا نہیں
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

(۲)

بات اتنی سی تھی
دھوپ کے ہاتھ پر
آب پارہ نہ تھا
آسماں پر کوئی
میرا تارا نہ تھا
پار جاتا کہاں
دل کنارا نہ تھا
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

(۳)

بات اتنی سی تھی
رات خوابوں کی تھی
دن عذابوں کا تھا
خالی بستے میں اک
دکھ کتابوں کا تھا
آنکھ بارش کی تھی
دل سرابوں کا تھا
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

(۴)

بات اتنی سی تھی
قاف کا شہر تھا
نیند میں لوگ تھے
دل میں جاگے ہوئے
کچھ الگ روگ تھے
جسم کے اس طرف
سوگ ہی سوگ تھے
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

(۵)

بات اتنی سی تھی
جل پری کون تھی
میرے دریاؤں کی
کیسی تنہائی تھی
میرے صحراؤں کی
نظم تو چاپ تھی
پھول سے پاؤں کی
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

(۶)

بات اتنی سی تھی
جس طرف میں نہیں
اس طرف خواب تھا
جلتی عمروں کے بیچ
ایک صحراب تھا
بہتے دریاؤں کے
میں پس آب تھا
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

(۷)

بات اتنی سی تھی
میرے جلتے ہوئے
ایک برفاب کو
میرے دیکھے ہوئے
بے جہت خواب کو
دوسری سمت سے
تم نے دیکھا نہیں
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

☆

افسانے

اشفاق احمد

ہے گھوڑا

ایک دفعہ کا ذکر ہے ہمارے قصبے مکسر میں گھڑ سوار پولیس کا ایک دستہ سوڈی کرپال سنگھ کی حویلی میں آکر متمکن ہوا۔ ہم اسکول کے بڑے لڑکے گھوڑوں کو دیکھنے کے لیے حویلی کے بڑے دروازے پر جمع ہوگئے۔ بارہ خوب صورت' صحت مند اور چمک دار گھوڑے اپنے اپنے تھان پر بندھے تھے اور ان کے منہ پر خوراک کے بھاری توبڑے چڑھے تھے۔ جب وہ اپنے سر جھٹک کر اور تھوتھنیاں توبڑے کی دیواروں سے مار کر اپنے راتب کو اندر ہی اندر منہ میں پکڑتے تو ان کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ جاتی۔

گھوڑا اور ہاتھی دو ایسی شاہی سواریاں ہیں کہ انسان اگر ان کو گھنٹوں دیکھتا رہے تو اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ سال کے سال جب ہمارے یہاں ماگھی کے میلے پر بڑا سرکس ہوتا تو ہم اسکول جانے کے بجائے بڑے تنبو کے پیچھے ان چھولداریوں میں پہنچ جاتے جہاں گھوڑے بندھے ہوتے اور ان کے بالکل ساتھ 'ایک پردے کی اوٹ شیروں' باگھوں اور بگھیروں کے بدبودار پنجرے ہوتے۔

ہاتھی باہر کھلے میں کھڑے' سوکھی چری کماد کے آک اور درختوں کے جھاڑ اپنے اپنے زانوؤں پر جھٹک کر جھٹک کر ڈھکے چھپے سونڈ میں ڈال رہے ہوتے۔ ان کے اگلے پیروں میں لوہے کے بڑے بڑے کڑے موٹے موٹے سنگلوں سے ویلڈ کیے ہوتے اور یہ سنگل زمین میں گہری گڑی بلیوں اور لوہے کے کھونٹوں سے بندھے ہوتے۔ ہر شخص جو ان ہاتھیوں کا نظارہ کرنے لحہ بھر کو بھی وہاں رکتا وہ قریب کھڑے آدمی سے یہ ضرور کہتا کہ "ہاتھی بھائی یہ جو ہر لقمہ جھاڑ جھٹک کر منہ میں ڈالتے ہیں تو چیونٹی سے خوف زدہ ہیں۔ اتنے بڑے جانور کو ایک ذرا سی چیونٹی آن واحد میں ڈھیر کر سکتی ہے۔ وہ سونڈ کے راستے ہاتھی کے دماغ میں پہنچ کر ایک ایسے مقام پر کاٹتی ہے جو ہاتھی کا نازک ترین مقام ہے اور جہاں ہیرامن طوطے کی طرح اس کی جان ہوتی ہے۔ چیونٹی کی پہلی دندی کاٹنے سے ہی ہاتھی ایک چیخ مارتا ہے اور دھاڑ کر زمین پر گر جاتا ہے۔ دوسرا سانس نہیں لیتا اور اس کی لاش زہر سے پھولنے لگتی ہے۔ ہاتھی کے اتنے بڑے دماغ میں اس کے نازک ترین حصے کا صرف چیونٹی کو علم ہے۔ اور چیونٹی کو دیکھ لیجیے نظر ہی نہیں آتی۔ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔"

ہم اسکول کے لڑکے سارا سارا دن ہاتھیوں کے قریب اس آس میں کھڑے رہتے کہ شاید ہاتھی

اگلا لقمہ زانو پر مار کر جھاڑتا اور جھٹکنا بھول جائے۔ اس کے اندر چیونٹی ہو اور چیونٹی سونڈ کے اندر چلتی چلتی اس کے دماغ میں پہنچ جائے اور اس مقامِ مخصوص پر کاٹے جہاں ذرا سی دندی کٹنے سے ہاتھی دھاڑ کر گر تا ہے...... لیکن ایسا کبھی ہو نہ سکا۔ میں نے اور میرے اسکول کے دوستوں نے کوئی دس سال تک' ہر میلے پر' اس واردات کا انتظار کیا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ ہاتھی آتے رہے اور جاتے رہے۔ کئی مرتبہ چیونٹیوں کے بھون کے پاس بھی بندھتے رہے لیکن ہماری حسرت کسی صورت بھی پوری نہ ہو سکی۔ کوئی چیونٹی ہاتھی کے دماغ میں مقامِ مخصوص تک نہ پہنچ سکی۔ اس کی کھردری جلد میں اتر کر دانے دنکے اور ریشے کترے ضرور نکال لاتی رہیں اور اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتی رہیں' لیکن انھیں موت کی نیند نہ سلا سکیں۔

ہاتھی عجیب الخلقت' قوی الجثہ اور عظیم الہیئت ضرور تھے لیکن انھوں نے کبھی مجھے اپنی طرف زیادہ متوجہ نہیں کیا تھا۔ ان کے مقابلے میں مجھے گھوڑے زیادہ پسند تھے۔ ان کے جسموں اور ان کے دانے کی خوشبو' قطار میں بندھے ہوؤں کا ایک مجموعی ڈسپلن' پھر ہر ایک کا اپنا اپنا ٹھاٹھ اور اپنی اپنی شخصیت' ہر ایک کا اپنا انداز اور اپنا نخرہ۔ مختلف قد' مختلف لون' مختلف چہرے' خوب صورت بدن' معتبر وجود' شہزادیوں کا حسن اور ماڈل گرلز کی دعوتِ نظارہ' چڑھے ہوئے پٹھے' جھولتی ہوئی ایال اور پھرتی ہوئی کنوتیاں' ساغری سم' لمبی گاچی' ستا ہوا چہرا' ہر وقت مستعد' ہر گھڑی تیار اور ہر لحہ باملاحظہ ہوشیار!

گھوڑے اور انسان کا تعلق بڑا پرانا ہے۔ میرا اور گھوڑے کا رشتا بھی بڑا پرانا ہے۔ ہم نے کئی جنگیں جیتی ہیں۔ کئی معرکے سر کیے ہیں' کئی میدان مارے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھی اور ایک دوسرے کے غم خوار ہیں۔ ہم دو مختلف انواع ہیں لیکن ہماری سائیکی ایک ہے۔ تاریخ کے لمبے دور میں ہم نے جسمانی' روحانی اور اخلاقی طور پر ایک دوسرے کا بڑا ساتھ دیا ہے۔ انسانوں نے گھوڑے کی خاطر سفید فام محبوباؤں اور سیاہ چشم باندیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وسیع سلطنتوں اور شاداب علاقوں کو منظورِ نظر گھوڑوں پر قربان کر دیا۔ گھوڑوں نے اپنے بستے رستے جنگلوں' پہاڑوں اور ہری بھری گھاٹیوں میں اپنی دل و جاں سے پیاری گابھن ماداؤں کا ساتھ چھوڑ کر شہہ سواروں کی سنگت اختیار کرلی۔ جنگوں میں اپنے یاروں سے یاری نبھائی۔ اتہاسی پنڈت کہتے ہیں کہ سنسار میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں سورماؤں کے مقابلے میں گھوڑے زیادہ مارے گئے۔ تیری جے ہو تیرے انوراگیوں کی جے ہو!

پنجاب میں جب کوئی علاقہ جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ بن جاتا تھا اور اس کے گرد نواح میں جرائم تیزی سے پھیلنے لگتے تھے تو انگریزی سرکار وہاں گھڑسوار پولیس کا ایک خصوصی دستہ متعین کر دیتی تھی جو متاثرہ علاقوں میں روند کر کے یا تو جرائم پیشہ لوگوں کو وہاں سے بھگا دیتا تھا یا ان کو اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ گھڑسواروں کے اس دستے کو "درلی جتھا" کہہ کر پکارتے تھے اور اس کے سارے جوان میانوالی کے پٹھان یا اعوان ہوتے تھے۔ خوب صورت سیاہ داڑھیوں اور تیل لگے پٹوں والے سپاہی۔ ہیڈ کانسٹیبل اور حوالدار۔ گھڑسواری کی وجہ سے یہ لوگ خاکی برجس پہنتے تھے۔ پنڈلیوں پر سیاہ چمڑے کے

مضبوط ولایتی گارڈر۔ بدن پر تول سے موٹی اور زین سے قدرے پتلی پوری آستینوں کی خاکی قمیص۔ کمر پر کالی سیاہ لس لس کرتی پیٹی' پیٹی کے آنکڑے میں پھنسی ہوئی ولایتی وسل۔ سر پر طرے دار پگڑی اور پاؤں میں موٹے چمڑے کے سیاہ بوٹ۔ کندھے سے گزرتی چمڑے کی موٹی ایک براؤن پیٹی تھری ناٹ تھری گولیوں سے بھری ہوئی۔ اسی پیٹی کے آخر میں خاکی رنگ کی ڈوری' انگریزی کے ہندسے آٹھ جیسی سلیقے کے ساتھ لپٹی ہوئی مضبوط اور کافی لمبی۔

زین کے پیچھے سفر میں کام آنے والی ضرورت کی مختصر سی چیزوں کا بچھو اور زین کے بائیں جانب پتھر جیسے مضبوط چمڑے کی ایک کھلی سی میان۔ اس میں نال کے بل کھڑی تھری ناٹ تھری کی رائفل۔ دستہ باہر باقی ساری رائفل مستور۔ کاٹھی کی دائیں طرف سوار کی پیٹھ کے پیچھے ایک مضبوط سے ہک میں فٹ نیلگوں سیاہ کی ہتھکڑی!

گھوڑے کے منھ میں سیدھی راڈ کا دہانہ' ٹھوڑی پیچھے سفید دھات کی موٹی زنجیر' دہانے میں ریشم جیسے چمڑے کی ڈبل راس' چاندی جیسی رکابیں اور سوار کے فل بوٹ پر روپہلی سیدھی مہمیز' کسی ستارے پھرکی یا کنارے کے بغیر۔

کیل کانٹے سے لیس' سجے سجائے بارہ بھاری بھرکم تھارو بریڈ گھوڑے دلکی چال کی ٹاپ دیتے جرائم نگر کا رخ کرتے تو سارے علاقے میں اونچی آواز میں خبر پھیل جاتی "دری جتھا آیا! دری جتھا آیا" بھاگنے والے بھاگ جاتے۔ چھپنے والے چھپ جاتے۔ سفید پوش نمبردار استقبال کے لیے باہر نکل کر گاؤں کے دہانے پر کھڑے ہو جاتے۔ عورتیں دری جتھا کے جمال کا نظارہ کرنے چھتوں پر چڑھ جاتیں۔ لڑکے بالے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ بھاگنے کے لیے دو رویہ کھڑے ہو جاتے۔

دری جتھا گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ایک ایک راؤنڈ رائفل کا چلاتا اور پھر کسے بنے' بولے چالے بغیر گاؤں کے اندر گھوم کر ان آماجگاہوں کی طرف نکل جاتا جہاں اس کے خیال میں ڈکیت اور بد معاش' رہزن اور جتیہ چاری چھپے ہوتے۔ لیکن ان کے آنے سے پہلے ایسی ساری آماجگاہیں سنسان اور ویران پڑی ہوتیں۔

دری جتھا کے لوگ جس جگہ قیام کرتے تھے وہاں کسی سے ملتے نہیں تھے۔ روسائے شہر' والیانِ جاگیر' صاحبانِ جائیداد' علاقے پرگنے کے دوسرے لوگ ان کے ساتھ بات چیت کرنے میل جول بڑھانے اور ربطِ باہمی پیدا کرنے کے بڑے خواہش مند ہوتے مگر یہ ان کو سلام سلام کہہ کر ہاتھ ہلاتے' مسکراتے گزر جاتے' گھوڑا روک کر بات نہ کرتے۔ تھانے کی نفری اور دری جتھا کے جوانوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دونوں ایک ہی محکمے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ہی ایس پی کے ماتحت تھے۔ ایک ہی جگہ سے ان کی تنخواہیں آتی تھیں۔ ایک ہی ڈیوٹی تھی مگر دری جتھا کا حوالدار نہ تو تھانے جاتا تھا اور نہ کبھی تھانے دار سے ملتا تھا۔ بس ایک پہلی تاریخ کی مجبوری تھی کہ ان کی تنخواہ کی تھیلی خزانے کا فوطے دار سر بہ مہر کر کے تھانے بھجواتا اور حوالدار صاحب کو وہ تھیلی اس تھانے آ کر لینا پڑتی تھی جس علاقے میں ان کا

جتھا قیام پذیر ہوتا تھا۔ چوں کہ دربلی جتھا کا واحد مقصد علاقے میں امن قایم کرنا ہوتا' ایف آئی آر کاٹنا اور ضمنیاں بھرنا نہیں تھا اس لیے ان پر ہر قسم کی رشوت کے دروازے آپ سے آپ بند تھے۔ اس لیے جتھے کے سارے جوان شام کو گھڑے بینجو پر میاں والی موسیقی کی دھنیں بجایا کرتے تھے جو پشتو' سرائیکی اور پنجابی کے امتزاجی حسن سے مالا مال ہوتی تھیں۔

جس دربلی جتھے نے میری روح اور میرے دل کے سویدا پر اپنا بھرپور وار کیا۔ اس کا حوالدار سیاہ پٹوں اور چھوٹی سی کالی داڑھی والا ایک دراز قد نوجوان سمند خان نیازی تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے سات آٹھ سال بڑا ہو گا تقریباً" میرے جتنا ہی پڑھا ہو گا اور کچھ میرے جیسے حالات و واقعات ہی سے گزرا ہو گا لیکن ایک نہایت ہی ذمہ دار پوسٹ پر ہونے اور بارہ منھ زور جوانوں کو کمانڈ کرنے کی وجہ سے اس میں مقدونیہ کے سکندر جیسا حسن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جابر نہیں تھا مگر تھوڑی ضرورت سے زیادہ اوپر اٹھا کر چلتا تھا۔ متکبر نہیں تھا لیکن کم آمیز اور کم گو تھا۔ نامرد نہیں تھا لیکن عورتوں کی طرف گردن گھما کر نہیں دیکھتا تھا۔ مجھے تو اس نے بالکل ہی مار دیا۔

مجھے کیا ہمارے شہر کے سارے بزرگوں پر سمند خان نے ایسا وار کیا کہ کوئی بھی جانبر نہ ہو سکا۔ بڑے بڑے کلغیوں والے سوڈھی سردار تھے۔ روپ والی "مان" گھرانہ تھا۔ پھر لمبی چوڑی جاگیر اور پرگنوں والے بیدی سردار تھے۔ اس علاقے کے جدی پشتی مالک' لیکن سب سمند خان نیازی سے ہاتھ ملانے' سلام کرنے اور فتح بلانے میں پہل کرتے تھے۔ وہ بھی دونوں ہاتھوں سے ہاتھ ملا کر اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑا ہو جاتا۔ غور سے بات سنتا لیکن جواب دینے میں ہمیشہ کسرِ نفسی سے کام لیتا۔ "ہاں جی" "ناجی" کہہ کر بات ختم کر دیتا۔ ڈاچیوں پر چڑھتی اور بہلیوں سے نکلتی سردار زادیوں نے کبھی کسی سے ذکر تو نہیں کیا لیکن اپنی نوکرانیوں کی زبانی سمند خان اور اس کے دربلی جتھے کے بہت سے قصے سن کر انھیں گھول کر پی رکھا تھا۔ میرا خیال ہے اتنی باتیں شہرزاد کے زمانے میں الف لیلیٰ کی بھی نہ ہوتی ہوں گی جتنے قصے ہمارے شہر مکسر میں دربلی جتھے کے ہوتے تھے۔

میں آٹھویں پاس کر کے نویں جماعت میں داخل ہو گیا تھا اور میں نے اپنے طور پر ایک مرتبہ "سرمایۂ اردو" ساری ختم کر لی تھی۔ حصہ نظم کی بہت سی چیزیں مجھے زبانی یاد ہو گئی تھیں اور میں اردو اور فارسی کے آخری پیریڈ چھوڑ کر پال سنگھ کی حویلی میں گھوڑے دیکھنے آ جاتا تھا۔ حوالدار سمند خان نیازی کے دو سپاہی اسحاق خان اور سربلند خان میرے واقف بن گئے تھے۔ یہ دونوں بنوں خیل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے' بڑے عالی حوصلہ اور دلیر سپاہی تھے۔ تیجا سنگھ ڈاکو کے ڈیرے کی چھت پر انھی دو نوجوانوں نے اپنے آپ کو موت کے منھ میں ڈال کر تیجے کو اپنے ساتھیوں سمیت ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا تھا۔ ڈاکوؤں نے چھت کے نیچے سے گولیاں چلا کر ان دونوں کو زخمی بھی کیا لیکن یہ اپنے ارادے سے باز نہ آئے اور پھونس کے گٹھے اور سوکھی جوار کے پولے آگ لگا لگا کر روشن دان کے اندر پھینکتے رہے۔

سمند خان نے اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت ڈیرے کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور وہ اپنے ہر

نعرے کے ساتھ گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔ گھیرے کی تنگی اور دھوئیں کی شدت سے تنگ آ کر تیجے ڈاکو نے اپنے چاروں ساتھیوں کی معیت میں ہتھیار ڈال دیے۔

جب درلی جتھے کے سوار ان پانچوں ڈاکوؤں کو الٹی ہتھکڑی لگا کر گاؤں کے باہر باہر اپنی حویلی پر لے جا رہے تھے تو تیجے ڈاکو نے منہ اوپر اٹھا کر اونچی آواز میں حوالدار سمند خان سے کہا "اوئے پٹھاناں! کسی کارن ہم کو معافی مل سکتی ہے؟"

حوالدار نے گھوڑا روک کر کہا۔ "ماں کے جنے اور سورے مرد کے صرف اس وعدے پر کہ آئندہ مخلوقِ خدا کو تنگ نہیں کرے گا اور واہگورو اکال پرکھ کے نام پر سنتوں کی زندگی بسر کرے گا۔"

تیجا سنگھ ڈکیت نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں اور یہ ایک مرد کا دوسرے مرد سے وعدہ ہے۔ ایک دھرتی سوار منکھ کا گھڑسوار منکھ کے ساتھ۔"

مقدونیہ کے شہزادے نے پورا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ "سلطان خان تیجا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی ہتھکڑیاں کھول دو اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرو جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے کرنا چاہیے۔"

ڈاکوؤں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ حوالدار سمند خان گھوڑے سے نیچے اترا۔ ہر ایک سے بغل گیر ہو کر ان کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا۔ "میں بات اس لیے دہرا کر پکی نہیں کروں گا کہ یہ مردوں کا مردوں سے اور دلیروں کا دلیروں سے وعدہ ہے۔ وقت ملے تو ہمارے ڈیرے ضرور آنا۔"

درلی جتھا چلا گیا تو پانچوں ڈاکو بڑی شان سے گاؤں میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے دھڑا دھڑ اپنے دروازے بند کر لیے اور کواڑوں کی جھریوں سے سنسان گلیوں کو دیکھنے لگے۔ ڈاکوؤں نے اپنی پگڑیاں اتار کر گلے میں ڈال لیں اور ہاتھ باندھ کر اونچے چوباروں کے سامنے سر جھکا کر بولے۔ "ہم توبہ کرنے اور پنت میل کے لیے آپ کے دروازے پر آئے ہیں جو کوئی دروازہ کھول کر ہم تریساؤں کو پانی پلائے گا واہگورو اس کا بھلا کرے گا۔"

کرپو نے گاگر اٹھا کر اپنے ایجننا بار کو لہے پر رکھی اور بھڑاک سے دروازہ کھول کر نکل گئی۔ اس کا باپ کھلے دروازے میں کھڑا سر پیٹتا رہ گیا کہ "ہائے میرے کرپو گئی۔ میری کرپو اٹھ گئی۔ کرپو چلی گئی۔"

ڈاکوؤں نے نیم دائرے کی شکل میں زمین پر گھٹنے ٹیک دیے اور پیاسے لبوں سے اوک لگا کر انتظار کرنے لگے۔ کرپو باری باری پانی کی دھار ہر اوک میں اتارتی گئی اور ان کے نفی میں سر ہلانے پر گاگر کا منہ اٹھا لیتی رہی۔

ڈاکوؤں نے کہا۔ "بی بی! واہگورو تیرا ست جگوں میں بھلا کرے۔ مان وڈیائیاں ارپن کرے۔ تیرے نام کی کلا جگے۔"

جب کرپو خالی گاگر لے کر واپس اپنے گھر میں داخل ہوئی تو اس کے باپو کے دروازہ بند کرتے ہی سارے گاؤں کے باسیوں نے اپنے دروازے کھول دیے۔

یہ جو مقدونیہ کا شہزادہ ہمارے شہر میں آیا تھا تو اس پر صرف عورتیں ہی غش نہ تھیں بلکہ بڑے

بڑے بزرگ مرد بھی اس کو بڑا مان دیتے تھے اور اس کے قریب ہو کر بیٹھنے کی خواہش کرتے تھے مگر ان شہہ سواروں کو مقامی لوگوں سے زیادہ اپنے گھوڑے پسند تھے۔ بیٹھ کر باتیں کرنے کے بجائے دوش پسند تھی اور گھومنے پھرنے کے بجائے ورد وظیفہ پسند تھا۔ درلی جتھا بھی عجیب تھا اور درلی جتھے کے جوان بھی عجیب تھے۔ جس طرح درلی جتھا ایک صبح کسی لامعلوم سے برآمد ہو گیا تھا اسی طرح ایک روز اپنا مشن پورا کر کے اسے واپس بھی چلے جانا تھا کسی ناشناختہ اور ناشناس مقام کی طرف...... میرے خیال میں درلی جتھا ایک حقیقت نہیں تھا' مائیتھالوجی تھا۔

بارہ کے بارہ گھوڑوں کے الگ الگ نام تھے۔ کسی کا دلبر' کسی کا بجلی' کسی کا جوگی' کسی کا ہیرا۔ مگر سمند خان کے کالے سیاہ شبرنگ گھوڑے کا نام دوسروں سے مختلف تھا۔ کاغذوں میں اس کا نام "ہچ فورڈ" (Hitchford) تھا اور وہ تھارو بریڈ کی اس فیملی سے تعلق رکھتا تھا جس کے آباؤاجداد آسٹریلیا کیت کے تھے لیکن پھر نقلِ مکانی کر کے آئرلینڈ آ گئے تھے۔ سمند خان نے اسے کبھی بھی اس کے اصل نام سے نہیں پکارا تھا' ہمیشہ "ہے گھوڑا" کہہ کر آواز دیتا اور ہمیشہ اسی نام پر ہچ فورڈ ہنہنا کر اسے جواب دیتا۔

دو رویہ تھانوں پر بندھے منہ زور اور مستعد گھوڑے۔ ابلق' ابرش' چینے' سرنگ' کمیت اور شرنغے باداہی گھوڑے نہیں تھے' حسن کے مجسمے تھے۔ ہر جوان اپنے گھوڑے کے کھریرے' مالش صفائی اور سنگار کا ذمہ دار تھا لیکن اپنے والے کے ساتھ ساتھ اس کی نظر دوسرے گھوڑوں پر بھی ہوتی۔ درلی جتھے کے گھوڑے تھان پر ننگے بدن نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ ہر ایک کے جسم پر نیلے رنگ کا بال پوش یا خاکی کپڑے کا جھول ہوتا۔ کہتے ہیں آنکھ کتنی بھی پاک کیوں نہ ہو گھوڑے کو سب سے پہلے نظر لگتی ہے' اس کے بعد بچے کو' پھر دلہن اور اس کے بعد پہلوان کو۔ سب کو اپنا آپ ڈھانپ کر اور بچا کر رکھنا چاہیے۔

جب حوالدار سمند خان نیازی گھڑ معائنے کے لیے ہر گھوڑے کے پاس جا کر اس کے پٹھے پر گونج دار تھپکی دیتا اور پھر اس کی گردن کو ہاتھ کی تھپک سے سہلاتا تو گھاس سے منہ اٹھا کر گھوڑا کنڈا کر کے گردن کو قوس نما بنا لیتا۔ ہر گھوڑے کو پتا تھا حوالدار صاحب اس کے سوار کے باس ہیں اور یہ سارا میلہ انھی کے دم قدم سے ہے۔

شام کو سارے گھوڑوں کی آنکھ سے اوجھل' حویلی کی ڈیوڑھی میں جب حوالدار صاحب مغرب کی نماز پڑھتے تو دعا مانگنے کے بعد چوکی سے اٹھ کر اونچی اور گونج دار آواز میں لہرا کر کہتے:

والعدیت ضبحا فالموریت قدحا ○

قسم ہے ان فراٹے بھرتے سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی

قسم ہے ان کی (جو سموں سے ٹاپ مار کر) چنگاریاں چھوڑتے ہیں

اور صبح ہوتے ہی دشمن پر یلغار کر دیتے ہیں

اور اس سے ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار کر دیتے ہیں

اور یکایک دشمن کے دل بادل میں جا گھستے ہیں ○

یہاں رُک کر حوالدار صاحب فرش پر زور کا پاؤں مارتے اور ہاتھوں سے لپکتی تالی بجا کر اونچی آواز میں کہتے "بے گھوڑا" تو بارہ کے بارہ گھوڑے اپنے دائیں سموں سے زمین کھدیڑ کر اس زور سے ہنہناتے کہ پورے شہر کے گھر لوٹے ہوئے پرندے ایک مرتبہ پھڑپھڑا کر پھر گھونسلوں سے نکل جاتے۔ حوالدار صاحب تال بجا کر کہے جاتے "بے گھوڑا" "پاک باز گھوڑا" "معصوم گھوڑا" "سرشار گھوڑا" ...... پھر وہ اچانک خاموش ہو کر کھلے چپلوں سے پاؤں نکال کر دوبارہ چوکی پر بیٹھ جاتے۔ ساری فضا خاموش ہو جاتی اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر جلال کے چینل سلسلے سے جمال کی وادی میں داخل ہو کر ایک اور ہی لحن میں پکار کر کہتے:

انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے
اور بے شک وہ خود بھی اپنی اس بات کو خوب جانتا ہے
اور بلاشبہ وہ مال سے سخت محبت کرنے والا ہے
کیا نہیں جانتے اس وقت کو جب قبروں سے مردے اٹھائے جائیں گے
اور سینوں کے سب راز ظاہر کر دیے جائیں گے
بے شک ان کا رب اس دن ان کے حال سے خوب واقف ہو گا

آخری آیت پر نوجوان سمند خان نیازی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے بہنے لگتے، حالاں کہ نہ وہ مال سے محبت کرتا تھا، نہ اس کے پاس مال تھا اور نہ ہی اس کے سینے میں کوئی مخفی راز تھا۔ وہ بس اپنے خدا کی بات سے اور اپنے اللہ کے خوف سے روتا تھا اور اپنی چھوٹی سیاہ داڑھی کو آنسوؤں سے بھگوتا تھا۔

جس طرح دنیا بھر کے ٹورسٹ بکنگھم پیلس پر گارڈز کی تبدیلی کا سماں دیکھنے آتے ہیں اسی طرح میرے قصبے کے ڈھیر سارے لوگ مغرب کے وقت حویلی کرپال سنگھ کے دروازے پر جمع ہو جاتے ہیں اور اس پُر ترکم ادھیائے کا انتظار کرتے جس کی گونج بڑی سہانی تھی۔

سمند خان نیازی دراصل گھوڑے کو انسان ہی کا ایک روپ سمجھتا تھا۔ ایک باوفا اور جاں نثار انسان کا روپ۔ ایسا انسان جو سواری نہ ہونے کے باوجود غزوات میں شریک ہوا اور یکایک دشمن کے دل بادل میں گھس گیا۔ حوالدار سمند خان کہتا تھا جس طرح ایک شہہ سوار گھوڑے کے بغیر شہہ سوار نہیں کہلا سکتا، اسی طرح ایک گھوڑا بھی سوار کے بغیر گھوڑا نہیں ہوتا، ایک جانور ہوتا ہے۔ جنگلی جانور، چرا گاہوں کا چرنیا، ایک بے قابو عفریت جس کے پاس اپنی بے راہ روی کے خلاف کھچی ہوئی راس یا پٹی چھوڑ لگام نہ ہو۔ وہ بندہ ہی کیا جو اپنی جبلت کے منہ میں کانٹے دار دہانہ دے کر گردن توڑ راس نہ کھینچ سکے، اور وہ گھوڑا ہی کیا جو "بے گھوڑا" کا کاشن سن کر انھی قدموں پر رک نہ جائے!

ایک روز صبح کے وقت حوالدار صاحب اپنے بچ فورڈ کی بیری کر کے ہتی چڑھائے اس کی مالش کر رہے تھے کہ میں اسکول جاتا ہوا رک کر ان کے گھوڑے کو دیکھنے لگا۔ حوالدار صاحب نے اپنے محبوب کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے والے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا تو میں نے ان کا قرب اور خوشنودی حاصل کرنے کو انھی کی طرح تال بجا کر ویسی ہی اونچی آواز میں کہا۔

پیکاں میں یا کنوتیاں ہنگام دار گیر
حلقے سے یوں نکلتا ہے جیسے کماں سے تیر
چالاکیاں بھی غیض بھی' غیرت بھی جنگ بھی
بالا دری براق کی دلدل کا ڈھنگ بھی ....!

حوالدار صاحب نے داد دینے کے انداز میں ذرا جھک کر "ہے گھوڑا" کہا تو چچ فورڈ والیوم کم جان کر اور مالک کو قریب پا کر ہلکے سے ہنہنایا' اور گردن گھما کر اپنا بوتھ مالک کے مونڈھے پر رکھ دیا۔ حوالدار صاحب نے میری طرف دیکھ کر جواب میں کہا۔

دونوں کنوتیاں ہیں کہ پیکان تیر ہیں
چاروں سم اس کے غیرتِ بدرِ منیر ہیں
آنکھوں پہ کیجئے جو نظر بے نظیر ہیں
بال ایسے جس کے پیچ میں پریاں اسیر ہیں
سرعت میں اس سے طیر کو نسبت نہ تیر کو
نرمی یہ جلد میں کہ خجالت حریر کو

یہ کہہ کر انھوں نے چچ فورڈ کے کلے پر بوسہ دیا اور اس کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سارے کا سارا بوسکی کا تھان ہے۔"

اب ادھر تو ورلی جتھا کا حسین و جمیل لیڈر اپنے ساتھیوں سمیت ہوا کے گھوڑے پہ اپنے گھوڑے چڑھا کر چاروں کھونٹ دوش مار تا تھا اور ادھر قدرت نے اس کے لیے ایک پھندا تیار کر دیا تھا جس سے بچ کر نکل جانا اس کے اختیار میں نہ تھا۔

گلالی نامی ایک باوریانی تھی جس نے اپنی پسند سے میتو باوریے سے شادی کی اور ایک ہفتے بعد اسے چھوڑ دیا۔ میتو لمبے قد اور مضبوط بدن کا باوریا تھا۔ بہت لم ننگا اور تیز رفتار جیسے افریقہ کے شکاری درندے ہوتے ہیں۔ جب بلا پکڑنے اور خرگوش کا شکار کرنے کے لیے میتو اپنے دونوں حجازی کتے ایک ساتھ چھوڑ کے اور خود بھی ان کے پیچھے بھاگتا تو دونوں' تینوں تقریباً" برابر کی دوڑ میں بڑھتے تھے۔ باوریے قبیلے کے مرد کہتے ہیں کہ میتو نے ہر روز ایک جنگلی بلا پکڑ کر لانے اور اپنے ہاتھ سے اس کے تکے بنا کر گلالی کو کھلانے کا وعدہ کیا تھا اور اس لیے گلالی نے شادی کی ہامی بھری تھی۔ لیکن کماد کٹ گئے تھے اور جنگلی بلے نیائیوں میں چلے گئے تھے۔ نیائیوں میں انگل انگل پانی کھڑا تھا۔ شکاری کتے وہاں چھوت کرنے سے گھبراتے تھے اس لیے بلے پکڑے نہیں جاتے تھے۔ میتو اپنے وعدے سے مجبوراً" پھر گیا تھا اور گلالی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

مگر اس قبیلے کی عورتیں کچھ اور کہانی سناتی تھیں۔ یہ کہانی انھوں نے اڑتی اڑتی گلالی کی ایک سہیلی مایا سے سنی تھی کہ جس طرح کیتنھپ والا سردار گلالی سے ناکام ہو کر کیکر کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا تھا

اور گلالی اس کو بھگا کر اپنی بستی میں لے آئی تھی اسی طرح مینو بھی گلالی سے ہار گیا تھا اور دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

گلالی کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ اپنے اندھے تائے کے ساتھ اس کی جھگی میں رہتی تھی۔ دن کو شہر کے لڑکے بالوں کے ساتھ ٹھٹھا ٹھٹھول اور مسخری مخول کر کے شام کو لوٹتے ہوئے سردار باگھ سنگھ کی کمر اور رانیں دبا کر اس سے دو روپے لے آتی۔ دونوں کا بڑا اچھا گزارا ہو جاتا۔ تائے اور گلالی کا بھی۔ گلالی اور باگھ سنگھ کا۔ وہ بڑا سردار تھا اور بڑی عمر کا تھا' پیٹ بڑا ہونے کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتا تھا۔ ڈیوڑھی میں آرام کرسی پر بیٹھ کر اندر باہر کا نظارہ کرتا۔ گلالی اس کے قدموں میں بیٹھ کر ہی اسے دب گھٹ آتی تھی زیادہ دیر نہیں بس دو منٹ ہی کافی ہوتے۔

اس کی قوم کے دوسرے مرد عورتیں تو سانولی' کالی' خاکی اور سفیدی مائل تھیں لیکن گلالی کا رنگ سرخ تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چہرا کندھے سبھی سرخ تھے۔ خونی دباؤ کی وجہ سے نہیں' جلد کی رنگت ہی ایسی تھی۔ اگر ہمارے قصبے میں کوئی انتھروپولوجی کا ماہر ہوتا تو وہ گلالی کا رشتا ریڈ انڈین سے جوڑ کر اسے انڈونیشیا کے کسی جزیرے سے برآمد کر کے لونڈی غلاموں کی قریبی منڈی میں ضرور پہنچا دیتا۔ وہ پیدا تو باوریوں کے گھرانے میں ہوئی تھی لیکن اس کے کسی پرکھ کے جینز ریڈ انڈین قبیلے سے چلے آتے تھے۔ بال بھی ویسے ستواں' لمبے اور لینکی اور آنکھیں بھی کالی سیاہ' اتری ہوئی باولی جیسی!

گلالی کے قبیلے کی عورتیں اپنے بالوں کی تین تین سو میڈھیاں کر کے چوٹی میں سینکڑوں کوڑیاں اور منکے گوندھا کرتی تھیں۔ بازوؤں میں ہاتھی دانت کا چوڑا' سر پر چونک' ناک میں بلاق' کانوں میں بالیاں' ماتھے پر ٹیکا اور ننگے پاؤں میں چاندی کی آرسیاں پہن کر بازار آیا کرتی تھیں۔ ان کے مقابلے میں گلالی کانوں میں نیلے ناپس' آنکھوں میں سرمہ' ٹھوڑی پہ بندیا' کھڑے کالر کی مردانہ قمیص' کبھی نیلی ٹول کی' کبھی خاکی ٹول کی' گریبان کا اوپر کا بٹن بند' نیچے کے کھلے' ذرا سا سر جھکا کر بیٹھتی تو گریبان چھنے کی طرح کھل جاتا' بازار کے لوگ کھڑے ہو کر دیکھتے۔ کھڑے ہوؤں کو دیکھ کر دوسرے بھی آ جاتے۔ ایک جمگھٹا سا لگ جاتا۔ ہر ایک کو نظروں سے بھر دیتی مگر شریر کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ اس کے پریوار کی ساری عورتیں گھاگھرے پہنتی تھیں اور گھونگھٹ نکال کر چلتی تھیں۔ گلالی بال کھلے چھوڑ کر بغیر اوڑھنی کے چلتی تھی لیکن ٹانگیں ڈھانپ کے رکھتی تھی۔ پتلون نما ایک پائجامہ سا پہنتی تھی جس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی جیبیں ہوتیں۔

بڑے مردوں نے اسے ڈور پر لگانے کی کوشش کی مگر وہ سب کو غچہ دے گئی۔ ایک مرتبہ جانوں کے لڑکے اسے اٹھا کر بھی لے گئے مگر وہ ان کے انڈکوش دبا کر اور ان کی چیخیں نکلوا کر ہنستی ہنستی لمبی مسافت پیدل طے کر کے واپس آ گئی۔ سیٹھوں کے بیٹوں نے پیسوں کا لالچ دے کر اسے ساتھ لپٹانا چاہا مگر وہ دھکا دے کر اگلی گلی نکل گئی۔ چھوٹے تھانے دار نے اس کے خلاف پرچہ کاٹ کر حوالات میں بند کر دیا تو علاقے کے لونڈوں نے تھانے کے سامنے دھرنا دے دیا۔ انگریز ایس پی کو تار بھجوا دیا تو چھوٹے تھانے دار

نے یہ ضمنی بھر کر اسے چھوڑ دیا کہ غلطی سے گرفتار کر لی۔ اس کا آشنا بھاگ گیا جو مطلوب تھا اور جس کے پاس آدھ سیر کچی افیون تھی۔ گورا ایس پی فرتھ نیون تفتیش کو آیا تو اس نے گلالی کی کلف لگی ٹول کی قمیص کے چنٹے میں جھانک کر کہا۔ "میرے ساتھ ضلع چلوگی تمھیں تعلیم دلوائیں گے۔" تو گلالی نے کہا۔ "میرا تایا بوڑھا ہے اور اندھا ہے میرے بنا وہ مرجائے گا۔" ایس پی فرتھ نے کہا "اس کو بھی ہم ساتھ لے چلیں گے۔ لائن میں رہے گا۔ سپاہی لوگ اس کی خدمت کریں گے۔"

گلالی نے کہا۔ "سیدھی بات یہ ہے صاحب بہادر کہ تمھیں میرے سے کوئی فایدہ نہیں ہوگا۔ میرے اندر سانپ کا کھلا زہر ہے۔ میں وش کنیا ہوں۔"

صاحب بہادر نے اس کا مطلب پچھوایا تو پتا چلا کہ اگر وش کنیا خود اپنا دیہ اور بھنگ کھول کر بلائے تو اس کا زہر اثر نہیں کرتا' شریر پھلواری بن جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی زور زبردستی کرے تو اندر کا ناگ ڈس لیتا ہے۔

شام کو جب مغرب کے وقت لوگ سمند خان کی قرات سننے حویلی پھاٹک پر جمع ہوتے تھے تو ان میں اب ایک نئے تماشائی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مردوں والے کپڑے پہننے والی گلالی کا!

دوسرے ہی روز ایک عجیب حادثہ ہوا کہ سمند خان کے سورہ العادیات شروع کرتے ہی مجال خان سوار بھاگا آیا کہ میرا گھوڑا اگاڑی توڑ کر بیٹھ گاہ میں طوفان اٹھائے پھرتا ہے اور اندیشہ ہے کہ دوسروں گھوڑوں کو ضرر کوب کرے گا اور اپنا نقصان بھی کرے گا۔ مجھ سے تو قابو میں نہیں آیا اسحاق اور شبیر خان بھی اسے توبڑا دکھا کر پکڑنے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن وہ توجہ ہی نہیں کرتا آپ ذرا اسے آکر دیکھیں کہ کیا کریں۔

حوالدار سمند خان اپنی چوکی سے چیتے کی طرح اچھلا اور شیر کی طرح دھاڑا "ہے گھوڑا" اور اندرو لگن کی طرف لپکا۔ اس کے پیچھے ہڑبونگ دیکھنے کو باہر کے تماشائی بھی اندر آگئے۔ ان میں گلالی بھی تھی۔

مجال خان کا گل دار سبزہ سوا ٹن وزنی اگلی دونوں ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھا کر دونوں سم زمین پر مارتا تھا۔ پاگل پن سے ہنہناتا تھا اور قریبی گھوڑوں کی گردن پر خون آلود دانتوں سے گہرے زخم لگاتا تھا۔ حوالدار سمند خان نے خوف ناک آواز کی تالی بجا کر غضب ناک آواز میں نعرہ مارا:

"ہے گھوڑا۔"

"سؤر کا بچہ'

بد لگام'

بد اندیش.....یہودی!

اس جھڑکی کے سنتے ہی تھان کا لاڑا' شور پشت اور طوفان مجسم' سبزہ گھوڑا انھی قدموں پر رک گیا۔ دائیں سم سے زمین کھدیڑ کر ہنہنایا اور گردن کنڈا کر کے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ حوالدار نے آگے بڑھ کر اس کے

کلے پر تین تھپڑ مارے اور غصے سے تھرا کر کہا۔ "اوئے بد بختیا۔ بد لگامایاروں کے ساتھ رہ کر بے یاری کرتے ہو۔ لعنت ہو تم پر یسودی!"

ڈیبل گرے گھوڑا اپنے کرتوتوں پر شرمندہ سا کھڑا تھا اور اس کے سانس تک کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ سمند خان نے کہا۔ "مجال خان۔ سبزے کے اگاڑی کے ساتھ ساتھ آج پچھاڑی بھی ڈال دو اس کی یہی سزا ہے۔"

گلالی نے بلڑ باز چشم دھاڑ گھوڑے کو سر جھکائے دیکھا تو دل میں کہا۔ "بس سارے سنسار میں ایک ہی آدمی ہے جو مجھے نتھ ڈال سکتا ہے......" اس کے بعد وہ درلی جھتا کی حویلی پر پھر نہیں آئی۔ ادھر ادھر سے پوچھ لیتی تھی لیکن وہاں جاتی نہیں تھی۔

اس رات جب حوالدار سمند خان اپنے سیاہ پٹوں میں کنگھی کر کے سونے لگا تو گھوڑے کی شورش کے بجائے اپنے دل کی ہلچل سے گھبرا گیا۔ لیٹا' پھر اٹھ کر بیٹھا۔ گھڑے سے پانی پیا۔ دگن میں جا کر گھوڑوں پر نگہ ڈالی واپس آکر پھر لیٹ گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے مردانہ نیلی قمیص میں ملبوس ایک قدیم بو ی لڑکی کھڑی تھی جس کی اصل زادبوم یہی علاقہ تھا اور وہی اصل میں اس سرزمین کی مالک تھی۔ سمند خان نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیر کر سورۃ ناس پڑھی لیکن وہ اسی طرح کھڑی مسکراتی رہی۔ پہلے تو اس نے گلالی کی موجودگی کو بڑے غیر سنجیدہ انداز میں لیا لیکن جب وہ پسر کر سرِ راہ گزر بیٹھ گئی تو سمند خان نے بالوں سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ تین چار زور کے دھپے اس کی کمر میں مارے اور زچ ہو کر کہا۔ "دفع ہو جا کافر چشم یسودی! تیری راہ اور میری راہ اور تیرا میرا کیا واسطہ۔" پھر جو اس نے لڑکی کی گردن کے پیچھے ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دیا تو وہ گھٹنوں کے بل گری اور دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر گردن گھما کے اسے دیکھنے لگی۔ سمند خان اپنے سینے پر نیت کے سے ہاتھ باندھے اسی طرح سرو قد کھڑا رہا تو گلالی زمین سے اٹھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آگے کو چلی گئی۔ پھر اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

اسے اس طرح سے چلتا کر کے اور اپنا پنڈ چھڑا کے سمند خان تکیہ پر سر رکھ کر اطمینان کی نیند سو گیا۔ رات بھر وہ اپنے تج نورڈ پر سوار ایسے ایسے گلستانوں اور کوہستانوں کی سیر کرتا کراتا رہا جہاں فلموں والے جا کر ڈوئٹ ریکارڈ کیا کرتے ہیں۔

صبح عادت کے مطابق عین فجر کے وقت اس کی آنکھ تو کھل گئی مگر وہ نماز کے لیے اٹھا نہیں۔ یہی سوچ کر پھر سو گیا کہ اب ظہر کے وقت نہا دھو کر قضا ہی پڑھ لوں گا۔

انسان کی فطرت اور سرشت میں بے شمار کمزوریاں اس کے خیال اور نیت کے دامن میں کنڈے کانٹے سول اور شوک کی طرح اتری ہوتی ہیں۔ کسی اجاڑ کھیت یا خود رو جھنکاڑ سے گزرتے ہوئے پویلی' بھکنھرے' بنھگنڈے گر گرو آپ سے آپ جسم اور جامے سے چمٹ جاتے ہیں اسی طرح بے آباد فلسفے اور بے بنیاد فکری اندیشے پروانوں اور بھنبیریوں کی طرح دانش و دانائی کی شمع سے لپٹ جاتے ہیں۔ کانٹوں اور سوتوں سے تو بدن چھڑائے بھی جا سکتے ہیں لیکن خوف و ہیبت کی جکڑ بندیوں سے ذہن آزاد نہیں کرائے

جا سکتے۔ اب چوں کہ سارے اعضا و جوارح پر انھی اذہان کا قبضہ ہوتا ہے اس لیے پاگل منوا پورے کے پورے "میں" کو بھی پاگل کر دیتا ہے۔ پھر بدن منفی رخ ہی مانگتا ہے' شر کی طرف ہی رجوع کرتا ہے۔ خیر کو چھوڑ کر غیر ہی کو اپناتا ہے۔ کوئی اختیار نہیں رہتا!

جس روز سفید رنگت والا سمند خان اپنے شب رنگ پیچ فورڈ پر سوار ایک موقع ملاحظہ کر کے آ رہا تھا تو سرکنڈوں کے انبوہ میں ایک سیلانی حرکت ہوئی۔ سمند خان نے کرچ کے دستے پر ہاتھ رکھ کر سرکنڈوں کی طرف دیکھا۔ ایک حملہ آور بجلی کی سی تیزی سے ابھرا اور سمند خان کے گھوڑے تک ابھر آیا۔ باگ پر تو اس کا ہاتھ نہ پڑ سکا البتہ اس نے کالے گھوڑے کی رکاب کو مضبوطی سے تھام لیا۔ یہ گلابی تھی جس کے کالر کا اوپر کا بٹن بھی آج بند نہیں تھا۔

"کیا چاہتی ہو؟" سمند خان نے کڑک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں نے کیا چاہنا ہے..... ہم لوگ چاہنے کے لیے نہیں ہوتے حوالدار صاحب' بیٹھ رہنے کے لیے ہوتے ہیں۔"

"کہاں بیٹھ رہنے کے لیے ہوتے ہیں۔" سمند خان کچھ گڑبڑا سا گیا تو گھوڑے نے ہلکی سی پشتک مار کر اگلے سم سے راستا کھدیڑا کہ چلو اب چلیں۔ حویلی کافی دور ہے.....

گلابی نے کہا۔ "ہم انتظاری لوگ ہیں حوالدار صاحب اور انتظار کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ براتوں کے باہر جھوٹا کھانا سمیٹنے کو۔ سرداریوں کی اترن لینے کو۔ جاگیردار کے فارغ ہونے کو۔ جیلوں کے باہر اپنے قیدیوں سے ملاقات کرنے کو..... ہم پیچ اور وشٹ لوگ ہیں حوالدار جی اس لیے ہم کو بڑا انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

حوالدار نے نہ تو پہلے کبھی ایسی بات سنی تھی اور نہ ہی کسی عورت کے اس قدر قریب ہو کر گفتگو کی تھی' وہ بوکھلا سا گیا۔ پیچ فورڈ کسمسایا۔ اپنی مرضی سے ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ سمند خان نے راس ہلکے سے کھینچ کر اسے روکا کہ ٹھہرو ابھی بات ختم ہونے دو۔

لیکن بات بھی کبھی ختم ہوئی ہے۔ وہ بات جو اماں حوا اور بابا آدم نے شروع کی تھی وہ ہوتی ہوتی اور چلتی چلاتی وہاں سے یہاں تک ضرور پہنچ گئی ہے لیکن ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یہ وہی بات تھی جو ایک گھڑسوار پہلی مرتبہ ایک دہقان باسی سے کر رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ یہ بات آج سے اتنا عرصہ پہلے کہاں چھپی رہی اور کیوں چھپی رہی۔

گلابی نے کہا۔ "ہمارا کوئی سمایک نہیں مالک کوئی میت بیلی کوئی مددگار نہیں۔ ہم بے بس اور اپ مانت لوگ ہیں اور ہزاروں سال سے انتظار کر رہے ہیں۔"

حوالدار نے کہا۔ "میری رکاب تو چھوڑو۔ دفع ہوئی۔"

گلابی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دوسرا ہاتھ بھی اس پر رکھ لیا اور کہنے لگی۔ "بڑی مشکل سے اس آنکڑے کو پکڑا ہے۔ اب نہیں چھوڑوں گی۔ چھوڑوں گی تو وچن لے کر چھوڑوں گی کہ ایک بار مجھ سے ملو

گے۔ الگ میں' ایکانت میں۔ لمبی بیٹھک۔ لمبی بات!"

"کہاں؟" سمند خان کا سارا بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ گھوڑا اور بے چین ہو گیا۔

"کھنڈر خرابے میں۔" گلالی نے خوش ہو کر کہا۔ "تیری ڈیوڑھی کے پیچھے۔"

"کب؟" سمند خان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"شام ڈھلے۔ سورج چھپنے سے ذرا پہلے۔" گلالی نے چہرا اور اوپر اٹھا کر کہا۔ "جب تمھارے گھوڑوں کو راتب دیتے ہیں۔"

"اچھا۔" لیکن یہ اچھا ٹھیک سے گلالی نے سنا نہیں کہ سمند خان کا مشکی بہت گھبرا گیا تھا اور راس کچی ہونے کی وجہ سے پچھلی دونوں ٹانگوں پر گھوم کر زمین پر قوسیں سی لگا رہا تھا۔ سمند خان نے اس کی گردن تھپتھپا کر اونچی آواز مگر محبت بھرے لہجے میں "ہے گھوڑا" کہا مگر چج فورڈ نے ہنہنا کر اس کا جواب نہیں دیا۔ گھوڑے کی نظر کافی کم زور ہوتی ہے اور وہ زیادہ دور تک دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن وہ آہٹ سے اور خوشبو سے اور سب سے بڑھ کر اپنے کشف سے دور' بہت دور بلکہ بہت ہی دور تک دیکھ لیتا ہے۔ جو بات اس کو پسند نہ آئے اس سے بڑی جلدی گھبرا جاتا ہے اور اپنی ناخوشی کا اظہار نتھنوں میں ہوا بھر کے اور پورے زور سے "پھرر" کر کے کرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد کوئی ہڑتال نہیں کرتا' گرفتاری نہیں دیتا' مرن برت نہیں رکھتا' دھرنا نہیں دیتا۔ گھوڑا غازی مرد ہوتا ہے' سیاسی ہتھکنڈے نہیں جانتا۔ الف ہو جاتا ہے!

حوالدار سمند خان کا شب رنگ مشکی بھی زور سے پھنکارا اور اس معاہدے کے خلاف احتجاج کر کے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس پھنکار میں سمند خان کی "اچھا" ڈوب گئی۔ لیکن گلالی نے محبوب کے چہرے کی خوش رنگی سے پہچان لیا کہ مان گیا ہے۔

گھوڑے کو سب سے زیادہ ہتکی اس وقت محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کی نظر میں سب سے بڑھ کر ذلیل اس وقت ہوتا ہے جب اس کا سوار کوئی سفلی حرکت کرے یا کسی مقام پر گھٹنی لڑ کر اپنے فرومایہ اور شکست خوردہ ہونے کا ثبوت دے۔ گھوڑا خود شکست کھا جائے تو اس کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جس قدر خفت اس کو اپنے سوار کی ہزیمت اور پسپائی سے ہوتی ہے۔ اسی لیے پرانے زمانے کی جنگوں میں جب بادشاہوں کے درمیان فتح اور شکست کے معاہدے طے پاتے تو جنگی گھوڑوں سے پرے الگ مقامات پر طے ہوتے تھے کہ شکست خوردہ فوج کے گھوڑوں کو شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے کہ ہمارا بادشاہ یا ہمارا سپہ سالار گلے میں پٹکا ڈال کے دست بستہ دوسرے خسرو گیتی پناہ کے سامنے کیوں حاضر ہو گیا ہے۔

جنگ میں دونوں طرف کے گھوڑے ایک سی طاقت' ایک سی جرات' ایک سی توانائی سے لڑتے ہیں۔ ان کے یہاں آگہی نہ ہونے کی وجہ سے فتح و شکست کا کوئی تصور نہیں ہوتا بس نبرد آزمائی اور حرب و پیکار کا ڈھنگ ہوتا ہے۔ اس لیے جنگ کے خاتمہ پر اگر کوئی ان کے سواروں سے بے لحاظی یا بے مروتی کرے تو ان سے برداشت نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اپنے سوار کو کبھی بھی شکست آشنا نہیں سمجھتے۔

کہتے ہیں جب سکندر نے پورس کو میدان جنگ میں شکست فاش دی تھی تو اس نے اپنے گھوڑے

سے اتر کر سوار پورس کے سامنے جاکر اور چڑا اوپر اٹھا کر پوچھا تھا۔ آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ یونانی جنگ باز دونوں طرفوں کے گھوڑوں کا بڑا احترام کرتے۔ وہ میدان جنگ میں ان کو پتا نہیں چلنے دیتے تھے کہ کون ہارا اور کون جیتا اور کون کس کے آگے سرنگوں ہوا۔

بیچ فورڈ کو حوالدار سمند خان کا راستے میں رکنا' ایک غیر عورت سے باتیں کرنا' اس سے مرعوب ہونا' پھر دو مرتبہ بے خیالی میں بغیر کسی ضرورت کے لگام کو جھٹک کر ڈھیلی چھوڑنا' واپسی پر زین سے ڈھلک کر بیٹھنا' جیسے شہہ سوار نہ ہو کوئی بیمار ہو۔ گھوڑے نے گالی کی بو کو پسند نہیں کیا تھا اس لیے کھلے قدم پھینکتا ہوا جلد حویلی پہنچ گیا۔

خوش انداز اور خوش اطوار راکب کے پاس ابھی بڑا وقت تھا۔ کل شام کے آنے تک ابھی اس کے پاس پوری رات اور پورا دن پڑا تھا۔ وہ اس وقفے میں چلنت ہی تیل مالش کر کے ہلکی سی ایکسر سائز کر سکتا تھا۔ گرم پانی سے نہا سکتا تھا۔ دو مرتبہ لباس تبدیل کر سکتا تھا۔ صبح عطر گلاب استعمال کر کے شام کو عطر شمامتہ العنبر کی پھریری اپنے پٹوں میں اڑس سکتا تھا۔ خط بنوا سکتا تھا۔ نئے سرے سے ناخن تراش کر ان پر کیوڑے کا پھاہا پھیر سکتا تھا۔ پاؤں کی نھینوں پر ویزلین مل کر پنجے ملائم کر سکتا تھا۔

گو اس میں کوئی واضح اور بین تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس کے ماتحت ساتھی محسوس کر رہے تھے کہ حوالدار آئینہ کی مورت سا ہو کر الٹ گیا ہے۔ محسوس تو خیر نہیں کر رہے تھے انھیں اپنی نگاہوں پر اور اپنے آپ پر شک سا گزرنے لگا تھا۔ گھوڑوں کے ساتھ رہ کر اور گھڑ سواری کر کر کے شہہ سواروں میں بھی کشف کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پورا کشف نہیں ہوتا کشف کا دیباچہ ہوتا ہے' اس لیے ساری عمر مشکوک سا رہتا ہے۔

سمند خان نے دوپہر کے وقت مجیب خان کے سرنگ پر زین ڈال اور تھوڑی دیر کو باہر نکل گیا۔ شہر کی حد سے کوئی میل بھر پرے ایک کافی پرانا کھنڈر تھا جس کے ایک حصے پر چماروں کے بھوتوں کا قبضہ تھا اور دوسرے حصے پر شودروں کے بھوت براجمان تھے۔ ایک عرصے سے کسی شخص کو اس کے اندر جھانک کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ راہ گیر شام کے وقت یہاں سے کنی کترا کر نکلتے تھے' جو بھی گزرتا تھا ٹولی بنا کر گزرتا تھا اکیلا دوکیلا نہیں۔

کہتے ہیں یہ اصل میں شیر شاہ سوری کی ایک سرائے تھی جو مغلوں کے عہد میں تاراج ہو گئی۔ پانچ چھ صدیوں کی بارشوں اور تیز دھوپوں نے ہزارہا قسم کے خود رو پودے اور بے شمار جڑی بوٹیاں پیدا کیں۔ یہاں سانپوں کی ان گنت بامبیاں بنیں۔ سینکڑوں قسم کے سانپوں نے یہاں جنم لیے اور پھر وہ اس کھنڈر کو ویران چھوڑ کر چلے گئے۔ سکھوں کے زمانے میں جب چوتھی مسل کا اس علاقے پر تصرف ہوا تو انھوں نے اس کھنڈر کی مرمت کرا کے اسے آباد کیا۔ شام کے وقت یہ مسل کے سرداروں کے لیے کلب کا کام دیتا تھا اور یہاں صبح گئے تک شراب کی محفلیں چلتی تھیں۔ مجرے کے لیے وقت کی تخصیص نہیں تھی دن پر رات برابر چلتا تھا۔ ناچنے والیوں کے جوتے بدلتے رہتے تھے لیکن گھنگھرو کی جھنکار کبھی ختم نہ ہوتی تھی۔

سمند خان نے سرنگ کو آگے بڑھا کر کھنڈر کا پیشگی جائزہ لینے کو اس کی دراڑ میں سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے جھاڑ جھنکاڑ میں پتھر کے دو چوکور ستون پڑے تھے۔ تخت پوش جتنے لمبے مگر چوڑائی میں ان سے آدھے۔ ساری چھتیں اڑ چکی تھیں مگر طاقچوں میں تیل کے نشان ابھی باقی تھے۔ بہت سی دیواریں اپنی پوری مضبوطی کے ساتھ گھیرا ڈال کے کھڑی تھیں باقیوں میں کریک آگئے تھے۔ زمین پر زہریلی ناگ پھنیاں اگی ہوئی تھیں اور دیواروں کے شگافوں میں سرسبز پیپل کے پیڑ تھے جو کافی بڑے ہو گئے تھے۔

اس نے گھوڑے سے اتر کر اس کو آخری سرے سے پکڑے پکڑے اندر قدم رکھ کر دیکھا تو اسے جنگلی نیولے کا ایک مختصر سا کنبہ دکھائی دیا۔ ان کے قریب ہی بڑے سے اپلے جیسا ایک کچھوا سر منہ بند کیے پڑا تھا۔ یہاں کا باسی نہیں تھا کسی طرف سے گھومتا پھرتا غلطی سے ادھر آگیا تھا۔ ایک کونے میں آک کے بڑے بڑے پودے تھے۔ انہی کے ساتھ بیری کا ایک عمر رسیدہ درخت تھا۔

سمند خان نے کارِ خاص کے ایک سپاہی کی طرح اس مقام کا جائزہ لیا اور تیسری ڈیوڑھی کو غور سے دیکھا۔ اس کی ابھی ایک چوتھائی چھت باقی تھی اور اس چھت کے نیچے کا فرش روئیدگی سے بھی پاک تھا۔ وہ موقع معائنہ کر کے کھنڈر کی ہیئت اور گلالی کی ذہانت سے بہت مرعوب ہوا۔ وارداتِ جسمانی کے لیے اس سے اچھا اور کوئی مقام نہ تھا۔

جس طرح سمندر سے لہریں آ آ کر ساحلی ریت پر پھیل جاتی ہیں' کچھ واپس چلی جاتی ہیں' کچھ ریت میں جذب ہو جاتی ہیں' عین اسی طرح سمند خان کے ذہن میں مختلف خیالات کی لہریں آتی رہیں اور اس کو پریشان کرتی رہیں۔ کچھ تو پھر سے آنے کے لیے واپس لوٹ جاتی تھیں اور کچھ اس کے ذہن میں وہیں جذب ہو جاتی تھیں۔ وہ انسان کی اسی ازلی دبدھا میں پھنسا ہوا تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ مانوں یا نہ مانوں۔ کروں یا نہ کروں...... لیکن کوئی آخری فیصلہ نہیں ہو رہا تھا اور لہریں آ جا رہی تھیں۔ جذب ہو رہی تھیں۔ چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ساحل پر پہنچے بغیر واپس جا رہی تھیں۔

شام سے پہلے اس نے نہا دھو کر اپنا نسواری رنگ کا ریشمی کرتا نکالا۔ لٹھے کی کھڑ کھڑ کرتی شلوار پہنی۔ ٹائی والے سیاہ بمبوں کو پالش کر کے چمکایا۔ پٹوں میں کنگھی کی۔ چھوٹی سی سیاہ داڑھی کو عطر حنا سے چپڑا۔ ڈولتے وجود کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ میں جوکیوں والا چھوٹا ہنٹر پکڑا۔ ہنٹر کے گول بھاری سرے کو نیچے لٹکایا اور پتلے سرے کو ہاتھ میں پکڑ کر آہنی گیند کو رانوں اور پنڈلیوں پر مارتا اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

باوجود اس کے سمند خان ورلی جتھے میں تھا اور اس نے کئی خوف ناک چور پکڑے تھے مگر آج پہلی مرتبہ اس کے اپنے اندر چور کا حلول ہو چکا تھا۔ وہ جو چوروں چاروں کو گرفتار کرنے پر مامور تھا اس وقت خود ایک صاحبِ حال بزرگ چور کی طرح مقامِ واردات کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جب وہ ڈوگروں کی پتی میں سے گزرا اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے رک کر سوچا کہ مغرب کی جماعت تو اذان کے ساتھ ہی کھڑی ہو جاتی ہے کیوں نہ تین فرض پڑھ کر اپنے مشن پر روانہ ہو جاؤں لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وضو کرنے' منہ سر پونچھنے اور جماعت کھڑی ہونے

تک انتظار کرنے میں ادھر کا وقت نہ رہ جائے۔ کسی کے ساتھ وعدہ کر کے اسے انتظار کروانا بھی تو کوئی اچھی بات نہیں۔ اس پر بھی بڑی سخت وعید آئی ہے کیوں نہ پہلے وہ فرض نپٹالوں...... باوجود اس کے کہ یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے اس کی رفتار سست پڑی' اس میں کمی آئی لیکن جب مسجد کے محاذ میں آیا تو اس کے قریب سے ناک کی سیدھ سیدھا نکل گیا۔

کھنڈر سے کوئی آدھ فرلانگ کی دوری پر اسے خیال آیا کہ شاید وہ وقت سے پہلے پہنچ گیا ہے۔ اس نے اپنی رفتار سست کر دی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے سامنے کی ٹوٹی دیوار سے دیکھا۔ جھاڑ جھنکاڑ میں لپٹے ہوئے چوکور ستون پر گلالی کھڑی تھی اور لمبے لمبے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی موجودگی کا کاشن دے رہی تھی۔

مقدونیہ کے خوب صورت شہزادے' میانوالی کے بیٹے اور دربی جتھا کے حوالدار نے کہا۔ "یہ میرا حق ہے خدایا۔ میری جبلت' میری سرشت' میری فطرت کا حق ہے۔ جب آلن پر آئی ہوئی گھوڑی پر گھوڑا لپکتا ہے' کبوتری کے گرد کبوتر ناچتا ہے' ہرنی کی طرف ہرن اور شیرنی کی طرف شیر جست بھرتا ہے تو انسان پر کیوں پابندی ہے۔ انسان کو کیوں مناہی ہے۔ انسان کو کیوں روکا ہے۔..... اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ "یہ میرا نفس ہے خدایا۔ میرا وجود ہے۔ میرا سراپا ہے۔ میں اس کا دین دار ہوں' قرض دار ہوں' یہ میرا تقاضا ہے' میرا اصرار ہے' میری پکار ہے۔ میں اس کو کیسے چھوڑ دوں' کیوں چھوڑ دوں' کس کے سہارے چھوڑ دوں کہ میں اس کا ناظر اور نگہبان ہوں' اس کا قرار دل ہوں' اس کا باز رس ہوں۔"

گلالی کھنڈر کی بڑی دراڑ میں کھڑی تھی اور اس کے بدن پر اس کی محبوب مردانہ قمیص نہیں تھی۔ اب ریڈ انڈین قبیلوں کی تو قسم نہیں دی جا سکتی لیکن ہمارے علاقے میں' پنجاب کے صوبے اور وادی سندھ کے دیس میں کسی نے بھی ایسا ریڈش براؤن بدن نہیں دیکھا تھا۔ سمند خان تیزی سے اس کی طرف جھپٹا اور نیزہ بازی کی اس چھپٹ میں جب کھونٹا عین اس کی شست میں تھا اس نے زور کا نعرہ مارا

"ہے گھوڑا

سور کا بچہ

نمک حرام......

بد بخت......

ناشکرا......یوودی۔"

پھر سوار نے پوری راسیں کھینچ کر اپنے وجود کے گھوڑے کا سر کندھوں سے ملا دیا۔ کانٹے دار قزئی نے اس کی باچھیں چیر دیں۔ اور جب اس کی راسیں اور کھنچیں اور زبان کٹی تو اس نے بے بس ہو کر ایک نعرہ اور مارا "ہے گھوڑا" اور ہنٹر کے موٹے گولے کی دو طرفہ مار سے اس کا سارا بدن ڈھیلا ہو گیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور شہوت' رغبت' طلب' ضرورت' بدمستی اور اچھیا آشا کے رن میں فرانے بھرتے سرپٹ گھوڑے کی طرح حملہ آور ہو گیا۔ وہ اپنے قدموں سے چنگاریاں چھوڑ رہا تھا۔

ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار تھا

وہ گھمسان کے رن میں اور اس کے دل بادل میں گھس گیا تھا

اور اپنے دشمن کی چاق و چوبند صفوں پر یلغار کر رہا تھا...... علم کا جھنڈا اٹھائے دائیں بائیں تیغ زنی کر رہا تھا۔

گالی انگار کی چنگھاڑ، چنگھاڑتے گھوڑے کے سموں سے چنگاریاں اڑتے دیکھ کر خوف سے کانپنے لگی۔

تھکا ہارا، زخموں سے چور اور اپنے آپ سے شرمندہ جب مقدونیہ کا شہزادہ اور میانوالی کا بیٹا، کچا سا ہو کر دبے پاؤں حویلی کے پھاٹک میں داخل ہوا تو اس کا شب رنگ، جج فورڈ اپنے فتح مند مالک کی آہٹ پہچان کر زور سے ہنہنایا کہ مالک ثابت و سالم لوٹا ہے۔

دلدل کے جانشین کو یہ فرمان بہ خوبی یاد تھا کہ "جو میرے بندے ہیں ان پر تجھ کو کچھ قدرت نہیں کہ ان کو گناہ میں ڈال سکے۔"

سیاہ رات جیسے مشکی گھوڑے نے شکرانے کے طور پر اپنی تھوتھنی پوری اوپر اٹھا دی اور بدن سونت کر رات کے اندھیرے میں بت بن کر کھڑا ہو گیا۔

(زیر ترتیب تاریخچے کا ایک باب)

سید محمد اشرف

اندھا اونٹ

(محمد عمر میمن کے نام)

سامان رکھ کر میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس سے ملنا ضروری ہے۔ میں خاموشی کے ساتھ گھر سے باہر آ گیا۔ باہر پوس کی رات تھی اور کہرا اور قصبوں والی خاموشی۔

وہ کل صبح واپس چلا جائے گا' ابھی نہیں ملا تو مدتوں انتظار کرنا پڑے گا۔ آج میں اس سے ۲۴ر برس بعد ملوں گا۔ آج وہ کیوں آیا ہے؟ وہ تو آٹھواں پاس کرتے ہی اپنی ماں' بڑے بھائی اور بہن کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ قصبہ چھوڑ کر احمد آباد چلا گیا تھا جہاں کشتی رانی سکھانے کے ایک ادارے میں اسے تار کھولنے اور باندھنے کی معمولی ملازمت مل گئی تھی۔

جوک پارک کر پھاٹک کی کھڑکی سے نکل کر میں نے محسوس کیا کہ قصبے کی گلیوں میں اس وقت سناٹا اور اندھیرا اور خوف تینوں ہوں گے۔ تیز ہوا میرے رخساروں کو چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے مفلر دوہرا کر کے چہرا باندھ لیا۔

وہ مجھے اکثر خط لکھتا رہا۔ میں اپنی مصروفیات میں مشغول۔ خط آ ہی جاتا تھا۔ ایک آدھ بار میں نے جواب بھی دیا۔ میں خط کا پابندی سے جواب نہیں دیتا تھا مگر اس کا خط نہ آئے تو دل میں ایک بے چینی سی رہتی تھی کہ کیا وہ میری ساری باتیں بھول گیا۔

"انور' تمھاری رائٹنگ بہت اچھی ہے۔" وہ ڈیسک پر جھک کر میری کاپی پڑھ کر کہتا تھا۔

"انور تم والی بال بہت اچھا کھیلتے ہو۔" وہ گراونڈ پر لگے والی بال کے پوسٹ کو پکڑ کر گھنٹوں میرا کھیل دیکھتا تھا۔ جب میں رائفل سے کوئی پرندہ مار گراتا تو مجھ سے زیادہ خوشی اسے ہوتی تھی۔ وہ میری ہر بات کو غور سے دیکھتا تھا۔ ہر بات پر پسندیدگی کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا وہ مجھے بے وقوف بنا رہا ہے کیوں کہ میں اسے روزانہ ہاف ٹائم میں آدھی ٹافیاں دے دیا کرتا تھا۔ ایک دن کسی بات پر تکرار ہو گئی تو میں نے یہ بات جتا دی۔ وہ بہت مغموم ہوا۔ اس کا سانولا چہرا سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی آواز رندھ گئی۔ وہ مجھ سے بات کیے بنا سکول سے بستہ اٹھا کر اپنے گھر چلا گیا۔ شام تک جب کسی نے کسی بات پر میری تعریف نہیں کی تو مجھے بے کلی سی ہونے لگی۔ میں بھی اپنا بستہ اٹھا کر سکول سے باہر نکل

آیا۔ پھر ان جانے میں ہی میں اس کے چھوٹے سے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کی امی دروازے پر آئیں، مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔ "آج نواب سے لڑائی ہوئی ہے۔ دوپہر سے منھ پھلائے لیٹا ہے۔"
میں ان سے کچھ نہیں بولا اندر جاکر اشارے سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ انھوں نے اندر والی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی سردیوں کا زمانہ تھا۔ وہ ایک موٹا سا پھٹا ہوا لحاف اوڑھے منھ ڈھانپے لیٹا تھا۔ لحاف میں جہاں اس کا چہرا تھا وہاں کچھ لرزش تھی۔ اسے میری موجودگی کا احساس ہے، یہ سوچ کر میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ کلبلایا۔ میں نے اندر ہاتھ ڈال کر اس کے چہرے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے ہاتھ کے نیچے اس کی گرم گرم بھیگی ہوئی آنکھیں پھڑک رہی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ہم دونوں تھوڑی دیر تک ایسے ہی بیٹھے رہے۔ اس نے کوئی شکایت نہیں کی، میں نے بھی تفصیل نہیں پوچھی پھر جب شام کو ہم دونوں والی بال گراؤنڈ میں ملے تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

ہم دونوں پڑھائی میں اچھے تھے، وہ مجھ سے زیادہ اچھا تھا۔ آٹھویں میں اس کی فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن آئی۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں ننھیال چلا جاتا تھا۔ وہاں جا کر میں اپنا گھر، اسکول سب کچھ بھول جاتا تھا۔ وہاں حکیم جی خالو کے گھر میں چرا چرا کر میٹھی یونانی دوائیں کھاتا تھا۔ بڑی خالہ کے گھر میں امرود پر دوپہر سے شام تک لٹکا رہتا تھا۔ شام کو اپنے ہم عمر خالہ زادوں کے ساتھ سراین ندی پر بنے ریلوے پل پر جانے کے لیے ریل کی پٹری پٹری پیدل مارچ کرتا تھا اس شرط کے ساتھ کہ اسٹیشن سے ندی پل تک پٹری پر چل کر دکھاؤں گا۔ کبھی کبھی اس کوشش میں ریلوے لائن کے کنکروں پر گر کے خونا خون بھی ہو جاتا تھا۔ رات کو ایک پڑوسی کے گھر جاکر اس کی بیٹی کے پاس بیٹھا رہتا تھا اور دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی شربتی آنکھیں قدرتی طور پر ایسی ہیں یا وہ کچھ لگاتی ہے۔ پھر رات کو کسی بھی خالہ کے گھر سو جاتا تھا۔ وہاں میں زیادہ تر بھائیوں سے چھوٹا تھا۔ سب میری کچی پونی سمجھتے تھے اور خود کو سب سے بڑا عقل مند جانتے تھے۔ میں کوئی بھی کام کیوں نہ کروں کوئی تعریف ہی نہیں کرتا تھا۔ سب وہ کام مجھ سے بہتر کر لیتے تھے۔ ایک دن میں بغیا کی چار گز اونچی دیوار سے دھم سے کودا، گھٹنے کی ہڈی کھٹ سے بولی مگر ٹوٹی نہیں۔ میں سمجھا باقی بھائی حیرت سے منھ کھولے میری طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ جب دھول چھٹی تو دیکھا سب ہنس رہے ہیں۔ احتشام بھائی بولے۔
"ذرا سی اونچائی سے کودے اور ابھی تک اٹھ بھی نہیں پائے۔ ہم تو ایک دن ریلوے پل سے سراین ندی میں کود پڑے تھے جھم سے......"چوٹ کی شدت اور مایوسی نے میرے دماغ کے اندر گیلا پانی چھوڑ دیا تھا جو آنکھوں تک آیا مگر باہر نہیں نکلا۔ کاش اس وقت نواب ہوتا۔ جب چھٹیاں گزار کر گھر آیا تو معلوم ہوا کہ نواب کا بڑا بھائی اپنا گھر بیچ کر سب کو لے کر اپنے کسی خالو کے پاس احمد آباد چلا گیا ہے۔
"وہ لوگ اب کبھی نہیں آئیں گے۔"
اس دن میں نے رات گئے تک اس کے گھر کے کئی چکر لگائے۔ وہ مکان کسی کبڑیے کو بیچ گئے تھے۔ میں نے مکان اندر سے دیکھنا چاہا تو انھوں نے دکھا دیا۔ مکان کا نقشہ بدل گیا تھا۔ جس کوٹھری میں اس کی بھڑکتی ہوئی

آنکھوں پر میں نے ہاتھ رکھا تھا اس میں بھینس کا بھوسا بھرا ہوا تھا۔ میں اس کے گھر سے نکل کر برابر کے کھنڈر میں آکر بیٹھ گیا۔ یہاں ہم لوگ بیٹھ کر اگلی زندگی کے منصوبے بناتے تھے۔ میں کمشنر بننا چاہتا تھا۔ میں نے کمشنر دیکھا نہیں تھا لیکن امی نے دیکھا تھا اور وہ یہی دعا کرتی تھیں۔ نواب ایسے موقع پر کچھ کہتے کہتے رک جاتا تھا۔ وہ عہدہ تو نہیں بتاتا تھا مگر اس کی الجھی الجھی باتوں سے اتنا اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے ہو کر اس کے پاس ایک بڑا گھر ہو اور ایک موٹر سائیکل۔ گھر اتنا بڑا ہو کہ اس میں تین کمرے ہوں ایک میں امی ایک میں بڑے بھائی اور ایک میں وہ خود۔ اس رات اس کھنڈر میں بیٹھ کر میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں نواب کو بہت چاہتا ہوں۔ اس رات میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ سناٹے اور اندھیرے کے باوجود کوئی خوف نہیں ہے۔ گھر میں میری تلاش شروع ہو چکی تھی۔ میر صاحب اور انعام اللہ ماما لالٹین اور لٹھیا لیے ہوئے قصبے کا چکر لگاتے ہوئے میرے سامنے سے نکل گئے تھے۔ وہ پریشان لہجے میں میرے کھونے کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ میاں ناراض بھی ہیں اور پریشان بھی۔ جب وہ تیسری مرتبہ میرے سامنے سے نکلے تو میں نے انھیں آواز دی۔

"ارے انور میاں آپ یہاں کھنڈر میں کیا کر رہے ہیں اور کون ہے؟"

"میں اکیلا ہوں۔"

"گھر چلئے میاں ناراض ہیں۔"

"کیا ڈنڈا لیے بیٹھے ہیں؟"

"نہیں اس کی فکر مت کیجئے ہم کہہ دیں گے آپ درگاہ شریف کے پاس کھڑے تھے۔ مگر آپ یہاں رات کو کیا کر رہے ہیں؟"

"میں اپنے دوست نواب کو یاد کر رہا تھا جو قصبہ چھوڑ کر احمد آباد چلا گیا ہے۔"

"چلئے ہم ان کو اگلے مہینے کچھ دن کو بلالیں گے۔ ان کی یہاں گزر بسر نہیں ہوتی تھی۔ بڑے بھائی کو ایک ملازمت مل گئی اس لیے وہ لوگ چلے گئے۔ اب آپ گھر چلیں۔"

پہلے میر صاحب نے گھر کے اندر والے دروازے پر جا کر میاں سے بات کی۔ انعام اللہ اس درمیان مجھے سمجھاتے رہے۔ گھر میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوا تو لالٹین کی روشنی میں صاف نظر آیا کہ میاں تیز تیز غصیلی نظروں سے گھور رہے ہیں۔ امی نے جلدی سے اپنے پاس بلا کر کھانا کھلایا۔ میاں اونہہ کہہ کر کروٹ بدل کر آیت الکرسی کی دستک دے کر سو گئے۔ میں امی کے پلنگ کے پاس والے پلنگ پر لیٹا رات بھر جاگتا رہا۔

دوسرے دن اسکول میں کوئی میری ڈیسک پر نہیں جھکا' شام کو والی بال کے پوسٹ سے لگ کر کسی نے میرا کھیل نہیں دیکھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کہیں کچھ کم ہو گیا ہے۔ نواب کے علاوہ بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا چیز کھوئی ہے' پھر لڑکپن ختم ہوا جوانی آئی تعلیم کے لیے دوسرے شہروں میں جانا پڑا۔ ملازمت ملی' عمر بڑھتی رہی۔ کمشنر تو نہیں ہیڈ کلرک تک پہنچنے میں کتنے ہی برس لگ گئے۔ بدن کی

اشرفیاں گر گر کے کھوتی رہیں۔

ایک دن بیماری کی تعطیل ختم کرکے آفس پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری جگہ کسی اور کا تبادلہ کردیا ہے اور مجھے شماریات والے ناقص شعبے میں بھیج دیا گیا ہے۔ طبیعت کی خرابی کا خمار بھی ذہن میں تھا اور پھر یہ اچانک افتاد، میں سیدھا کمشنر کے پاس پہنچ گیا۔ "ایک تو آپ نے اس مصروفیت کے زمانے میں چھٹی منائی دوسرے آپ کی رائٹنگ بہت خراب ہے۔ ڈرافٹ سمجھ میں نہیں آتے۔" مجھے چکر سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کرسی کا سہارا لے کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی۔

"جناب میری رائٹنگ کی تو اسکول کے زمانے سے تعریف ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہوگی۔" وہ نرمی سے مسکرائے۔ "مگر اب بہت خراب ہے۔"

مجھے یقین نہیں آیا۔ پچھلے ہفتے تک اسی رائٹنگ کے ڈرافٹ پڑھ پڑھ کر تو وہ احکامات پر دستخط کرتے تھے۔ "آپ ایک بار پھر سوچ لیں سر۔" میں نے کہا۔

وہ ناراض ہوئے لیکن انھوں نے ضبط کیا اور کہا۔ "اب آپ جاسکتے ہیں۔"

مجھے ذلت کا شدید احساس ہوا۔ مجھے پھر چکر آنے لگا۔

"آپ کا خیال ہے کہ میں والی بال بھی اچھی نہیں کھیل سکتا۔" وہ کچھ سمجھ نہیں پائے۔ میں بھی کچھ سمجھ نہیں پایا۔ میں لمبی چھٹی کی درخواست ان کے آفس میں داخل کرکے اسی رات ٹرین میں بیٹھ کر دوسرے دن شام تک گھر آ گیا۔

میاں نے بتایا تمھارا بچپن کا دوست نواب آیا ہوا ہے، تمھیں پوچھنے آیا تھا، صبح چلا جائے گا۔

تبھی میں نے ارادہ کیا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی اس سے مل لوں گا۔ اب اس کی گلی کا موڑ آ گیا تھا۔ ماہوٹ کے بادل ہٹے تو چاند نے چہرا دکھایا۔ شکر ہے کچھ روشنی تو ہوئی۔ اس کے پرانے گھر سے ہی اس کی رہائش کا سراغ لگے گا۔ اس کے گھر کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ برابر والے کھنڈر میں کوئی شخص میری طرف پیٹھ کیے بیٹھا زمین کھود رہا ہے۔ چاندنی میں صاف نظر آیا کہ وہ کئی جگہ زمین کھود چکا ہے۔ برابر میں تازہ تازہ مٹی کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔

"یہ کون ہے؟ کیا رات کو اس کھنڈر میں گڑھے کھود کر امرود کے پیڑ لگا رہا ہے۔ کھنڈر کے پار سنسان کھیتوں میں کوئی گیدڑ چلایا۔ میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے لگا جیسے وہ کوئی بھوت ہے جو اس سنسان رات میں اس کھنڈر میں گڑھے کھود کر لوگوں کے کاٹے ہوئے سر دفن کر رہا ہے۔ میں نے آیت الکرسی پڑھنا چاہی تو معلوم ہوا کہ میں بھول گیا ہوں۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اس نے اپنا چہرا موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھرپا تھا جس سے وہ زمین کھود رہا تھا۔ چاندنی اس کے چہرے پر جھلملائی۔ اس کا سانولا چہرا اور سنولا گیا تھا اور اس شدید سردی میں بھی اس کے چہرے پر پسینہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک ایسے ہی کھڑا رہا اور پھر تیزی سے اٹھا اور مجھے لپٹا لیا۔ کیوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لڑکپن اور جوانی سے واقف تھے اس لیے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا بدن پہلے ہی جیسا اپنا اپنا سا لگا۔ ہم دونوں چاندنی کے نیچے

کھنڈر میں دو پتھروں پر بیٹھ گئے۔
"یہ کیا کر رہے تھے؟" وہ چپ رہا۔ پھر دیر کے بعد بولا۔
"اپنی آٹھویں کی مارک شیٹ تلاش کر رہا تھا۔"
"کیوں؟ اب اس کی کیا ضرورت آن پڑی؟"
وہ دیر تک چپ رہا۔
"ایک دن بوٹنگ سیکھنے کے لیے ایک لڑکی آئی۔ وہ بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ وہ اپنی ساتھی سے انگریزی میں کہہ رہی تھی کہ اسے بھگا دو ہم دونوں اکیلے بوٹ لے کر جھیل میں چلیں گے۔"
"میں نے ہندوستانی میں اس کو سمجھایا کہ یہ قاعدے کے خلاف ہوگا۔" وہ دونوں ناراض ہو گئے۔ ان کی ناراضگی کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان کو جھیل میں اکیلے جانے کے لیے روک رہا تھا بلکہ یہ تھا کہ میں نے ان کی انگریزی کیوں سمجھ لی۔ انھوں نے غصے میں مجھے جاہل کہا تو میں نے انھیں نرمی سے سمجھایا کہ میں نے آٹھواں کلاس فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا تھا' اس پر وہ لوگ کھلکھلا کر ہنسے۔ انھیں اس بات کا یقین نہیں ہوا۔ وہ کہتے رہے کہ اگر آٹھویں میں اتنے اچھے نمبر تھے تو گریجویٹ ہونے سے کون روک سکتا تھا۔ گریجویٹ ہو جاتے تو بڑا آدمی ہونے سے کون روک سکتا تھا۔ انھوں نے چلتے چلتے یہ بھی جتایا کہ ناؤ چلانا سکھاتے ہو' بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہوگی اس لیے انگریزی کے دو چار لفظ سمجھ کر خود کو قابل سمجھتے ہو۔ انھوں نے جاتے جاتے مجھے جاہل بھی کہا۔ میں گھر آکر نڈھال ہو کر بستر میں لیٹ گیا تو تمھاری بھابی نے پورا احوال سننے کے بعد کہا کہ ایسے دل پر کوئی بات مت لیا کیجیے۔ میں انھیں کیا بتاتا کہ یہ مرض بچپن سے ہے۔ یہ کہتے کہتے وہ مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ کے پیچھے ہم دونوں کا مشترکہ ماضی تھا اس لیے میں نے دل میں خواہش کی کہ کاش یہ دیر تک مسکراتا رہے مگر وہ ایک دم مغموم ہو گیا۔ میں نے اس سے آنکھیں نہیں ملائیں۔ میں نے کھنڈر پر ایک نگاہ ڈالی۔ پہلے سے بھی زیادہ شکستہ ہو گیا تھا۔ یہ کھنڈر کسی بڑے شہر میں ہوتا تو لوگ پلاٹ کر کے محل کھڑے کر لیتے۔ اس قصبے میں تو گاؤں والے بھی آکر نہیں بستے کہ گاؤں میں کم از کم اپنی زمینیں تو ہیں۔ یہ اور ایسے جانے کتنے تقدیر کے بھاری قدموں کے نیچے آکر پامال ہو چکے ہیں۔ پامال ہو رہے ہیں۔
وہ بولا۔ "تمھاری بھابھی نے کہا تم اپنی مارک شیٹ ان دونوں کو لے جا کر دکھا دو تو تمھارے دل کا غبار نکل جائے گا۔ تب مجھے یاد آیا کہ قصبے سے رخصت ہوتے وقت مارک شیٹ کو ایک ٹین کے ڈبے میں بند کر کے میں نے اس کھنڈر میں گاڑ دیا تھا۔ میں اس دلاسے پر گیا تھا کہ ایک آدھ برس بعد واپس آکر پھر پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا مگر وہاں جا کر صابر بھائی نے نہ تو آگے پڑھایا' کہاں سے پڑھاتے خود ان کی ملازمت بہت معمولی تھی اور ہے' نہ مجھے کبھی یہاں آنے کا موقع ملا سینکڑوں روپے کا کرایہ ہے لوٹا پھیری مگر اس بار تمھاری بھابی کی بات میرے دل کو لگ گئی۔ میں نے سوچا تم نہیں ملو گے تو کم از کم تمھارے گھر جا کر سب سے مل کر آؤں گا۔ میں میاں سے مل کر آیا۔ میاں کیسے ہو گئے ہیں' کمزور' سفید۔ جب میں گیا

تھا تو وہ سیاہ شیروانی پہنتے تھے اور قہقہہ لگاتے تو شیروانی کے بٹن ٹوٹ کر گر پڑتے تھے۔ ہم دونوں بین بین کر اٹھاتے تھے۔ کیا انھوں نے میرے آنے کے بارے میں بتایا تمھیں؟"

"ہاں۔ تبھی تو میں سیدھا چلا آرہا ہوں۔ تم وہاں کیا کرتے رہے اتنے دنوں؟"

"میں نے وہاں ادھر ادھر کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ کبھی کبھی میرا دل جب بہت اوب جاتا تھا تو میں فلسفہ بھی پڑھتا تھا۔ تمھاری بھابی مجھے فلسفی کہتی ہیں۔ ارسطو' افلاطون اور مسلم فلاسفہ میں ابن رشد اور غزالی کو پڑھا۔"

"ابن رشد کو مسلم کہتے ہو اس کے خیالات تو مشرکانہ تھے۔ امام غزالی کی کتابوں پر لکھتا رہتا تھا۔"

"دونوں کی سمجھ اپنے اپنے انداز سے کام کرتی تھی۔ وہ خدا کے تصور اور قدرت خداوندی کے بارے میں امام غزالی کے خیالات سے متفق نہیں تھا۔ صرف اتنی سی بات پر اسے مشرک کہنا زیادتی ہوگی۔"

اس رات کھنڈر میں بیٹھے مجھے یہ فلسفیانہ باتیں غیر ضروری لگیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نواب سے ایک سوال کیا۔ "نواب تم کو میرا خط یاد ہے؟"

"تم بہت کم جواب دیتے تھے۔ کون سا والا خط۔"

"وہ خط جس میں۔ میرا مطلب رائٹنگ سے ہے؟"

"ہاں ہاں یاد ہے۔ کیوں؟"

میں ایک دم سے مایوس ہوگیا۔ کاش وہ اس وقت فوراً" ہی کہہ دیتا کہ تمھاری رائٹنگ مجھے خوب یاد ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں تم سے اچھی رائٹنگ کسی کی تھی ہی نہیں۔

ہم دونوں دیر تک چپ چاپ رہے۔ جیسے میں کسی شخص کو جانتا کہ وہ شخص مجھے اس انداز سے چاہتا ہے اور وہ شخص نہیں جانتا کہ وہ مجھے اس انداز سے چاہتا ہے۔ یہ احساس پہلی بار ہوا اور اس احساس میں بڑی تکلیف تھی۔ وہ پھر کھرپا لے کر زمین کھودنے لگا پھر اچانک رک کر بولا۔

"ابن رشد سے متعلق ایک کہانی پڑھ کر اکثر مجھے لگتا ہے کہ ایک اونٹ ہے وہ اندھا ہے اور وہ مجھے روندتا ہوا چلا جا رہا ہے۔"

رات کیوں کہ رات ہوتی ہے اور رات میں خوف بھی ہوتا ہے تو مجھے خوف محسوس ہوا۔ مجھے اونٹ کا پیکر خیال کرکے اور بھی ڈر محسوس ہوا۔ مجھے اس کے اندھے پن کے خیال سے جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ میں کھسک کر اس کے پاس ہوگیا۔ میں نے اس کا چہرا دیکھا۔ اس کا سانولا چہرا بچپن کے اس واقعے کی طرح سرخ ہوگیا تھا اور چاندنی میں اس پر پسینے کی بوندیں جھلملا رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک زنگ خوردہ ٹین کا ڈبہ تھا۔ زنگ اتنا جم گیا تھا کہ ڈبہ کھلنا دشوار تھا۔ اس نے کھرپے سے کاٹ کاٹ کر ڈبے سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ پھر اس کاغذ کو کھول کر اس کے اندر سے مارک شیٹ نکالی۔ چاندنی میں ہم دونوں نے واضح پڑھا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن۔ وہ کچھ اور بھی خوش ہوتا کہ اس وقت میرے دل میں ایک کمینہ خیال آیا اور میں نے اس کا اظہار کرنے میں دیر نہیں کی۔

"یہ مارک شیٹ مل گئی تو کیا ہوا؟ اسے اس لڑکی اور اس کے ساتھی کو دکھا دو تو کیا ہوگا۔ کیا وہ تمہارا ماضی واپس کر دیں گے کہ نواب اس مارک شیٹ کے سہارے گریجویٹ بن جاؤ۔" یہ کہہ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

نواب نے کچھ دیر تک مارک شیٹ کو ہاتھوں میں ویسے ہی سنبھالے رکھا پھر شدید مایوسی کے انداز میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ میرا جملہ سن کر اس کا چڑا اتر گیا تھا۔ اب مجھے اپنا بچپن والا نواب یاد آیا۔ مجھے اس سے اچانک ہمدردی محسوس ہوئی۔ میں نے تلافی کرنے والے انداز میں کہا۔

"گریجویٹ ہونے سے بھی کیا ہوتا ہے نواب۔ دیکھو میں تمہارے سامنے ایک گریجویٹ بیٹھا ہوں۔ کل ہی میرا تبادلہ صرف اس بات پر کر دیا گیا کہ میری رائٹنگ خراب ہے۔" رائٹنگ والی بات پر اب بھی اسے کچھ نہیں یاد آیا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ "وہ اندھا اونٹ تمہیں بھی پامال کر گیا۔"

کھنڈر کے پار کھیتوں میں پھر کوئی گیدڑ رویا۔ ہم دونوں نے ادھر دیکھا۔ اور دیکھا کہ کھیتوں' باغوں' قصبوں' شہروں اور ملکوں اور انسانوں کو روندتا ہوا ایک اندھا اونٹ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب ہو گئے اور سر جھکائے دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔

☆ ○ ☆

خالدہ حسین

تیسرا پہر

اس سے پہلے کیا تھا' اسے کچھ یاد نہ تھا۔

اس مضبوط ہاتھ کی گرمی اور اس کے اپنے بے وزن پاؤں' گویا ہوا میں اڑتے ہوئے۔ چاروں سمت رنگوں کی چلمن ...... اٹھتی گرتی ...... اٹھتی گرتی۔ وہ اسی طرح شہر کی گنجان گلیوں اور دیہات کے شاداب کھیتوں اور پہاڑوں کی سنگلاخ چوٹیوں کو عبور کرتے ہوئے چلے جاتے۔ بھاگتے بھاگتے یا شاید اڑتے اڑتے اس کے ہاتھوں میں پسینہ آجاتا۔ کبھی لگتا وہ اس مضبوط ہاتھ کی گرفت سے نکل جائے گی مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔ کہانی جو ایک بار شروع ہوئی' لمبی سے لمبی ہوتی چلی جاتی۔ قصے میں سے قصہ نکلتا' وہ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

"یہ کیسی کہانی ہے؟" وہ بہ مشکل ہنسی روکتی۔ "بھلا شہزادیاں بھی بیڈمنٹن کھیلتی ہیں۔ ان کی شٹل کاک بھی دوسروں کی منڈیر پر جا گرتی ہے۔ اور بھلا ایران کی ملکہ روٹیاں کیوں پکانے لگی؟"

وہ بھی ہنس دیتا ہے۔ اس کے نمکین چہرے پر باریک ہونٹ مسکراہٹ میں پھیل جاتے اور ان کے اندر موتیوں ایسے ہموار دانت جھلمل جھلمل کرتے۔

"کہانیوں میں سب کچھ ہوتا ہے۔" وہ تمام جھگڑا چکا دیتا۔ "چلو اپنی گاڑی میں سیر کریں۔"

اور وہ گاڑی کیا تھی۔ لکڑی کی چوکی کے نیچے عجیب سا اسپرنگ اور اس کے ساتھ ایک ہینڈل جس کو سب گاڑی کی چابی کہتے تھے' پھر وہ دونوں اکڑوں اس چوکی پر بیٹھ جاتے۔ چابی کو بل دے کر کسا جاتا اور وہ چوکی برآمدے کے ہم وار فرش پر چلنے لگتی۔

بیچ میں وہ دن دن بھر جدا رہتے۔ وہ اپنے کالج یہ اپنے اسکول۔ مگر سہ پہروں اور ڈھلتے سورج اور سیاہ راتوں میں وہ پھر اس طلسماتی دنیا میں جا نکلتے۔ کھلی چھت پر کھری چارپائی پر لیٹے لیٹے وہ پھر کہانیاں شروع کر دیتا۔ ایسے میں چاروں سمت عجب روشنی سی پھیل جاتی۔ نیچے گلی میں مدھم بتیاں اور ان میں چلتے پھرتے لوگ' سب ان جانے دیس سے آئے لگتے۔ کوئی سندباد جہازی اور کوئی یمنی شہزادہ۔ کوئی خواجہ سگ پرست۔ ایک جادو' گلی کے ایک سرے سے دوسرے تک پھیل جاتا۔ کبھی کبھی رات کی تاریکی میں کوئی بھولا بھٹکا سفید پرندہ بری طرح پھڑپھڑاتا سر کے اوپر سے گذر جاتا۔ تنہا' اپنی ڈار سے بچھڑا اس کا دل رک جاتا۔

"راج ہنس تھا۔" وہ بتاتا۔

"راج ہنس؟"

"نہیں۔ دراصل یہ شہزادہ تھا۔ جادو نگری میں بھولے سے قدم رکھ دیا تھا۔ تب سے راج ہنس بن گیا۔"

"ہمیشہ..... ہمیشہ کے لیے!" گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں میں ابلتے۔

"نہیں۔ اس کی بہن ہے وہ سات سال تک چپ رہے گی ساتویں سال کے آخری دن..... راج ہنس پھر شہزادہ بن جائے گا۔"

"اچھا....." وہ سکھ کا سانس لیتی۔

سات سال..... سات سال خاموش رہنا۔ وہ سوچتی۔ زبان اس کے دانتوں میں دھڑکتی اور گلے میں لفظ گدگداتے۔ ہاں سب ہو سکتا ہے۔ سات سال چپ بھی رہا جا سکتا ہے کہ زبان ایک فالتو بے جان شے منہ میں پڑی رہے۔ اسے اپنی زبان اوپری شے کی طرح' گلے میں اٹکی محسوس ہوتی۔

وہ دن بھی عجب سا تھا..... بتایا نا تب دن' رات' سب کچھ' وقت کا ہر پہر عجب سا ہوتا تھا۔ کچھ ہوتے نہ ہونے کا پتا ہی نہ چلتا تھا۔ چیزیں ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہوتے ہوئے بھی زمین سے آسمان تک بھری رہتی۔ وہ دن بھی عجب تھا۔ اسکول' کالج سردیوں کی چھٹی کے لیے بند تھے۔ وہ دن بھر گھومتے رہتے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر پھرتا رہا۔ دور آسمان میں گم ہوتے پہاڑوں کی لمبی قطار نیلے نیلے دھوئیں میں چھپی تھی اور اس نیلے دھوئیں کے کنارے کنارے نارنجی روشنی سب کچھ جادو بھرا نظر آ رہا تھا۔

"وہ دیکھو روشنی کی لکیر....." اس نے ایک روشن قوس کی طرف اشارہ کیا۔

معلوم نہیں کس شے کا عکس تھا۔

"چلو ادھر....." وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے چلنے لگا۔

"نہیں۔" وہ ایک دم ڈر گئی۔ "نہیں۔ اس کے پار نہیں جانا۔"

"مگر مجھے تو جانا ہے۔ دیکھنا ہے نا اس طرف کیا ہے۔ دیکھو کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے قدم زمین کے ساتھ نہیں لگ رہے۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی مگر وہ قوس پار کر چکا تھا اور دوسرے ہی لمحے ایک راج ہنس آسمان کی طرف اڑتا نظر آیا اور دور سرمئی پہاڑوں میں گم ہو گیا۔

وہ وہیں ایک سبز ٹیلے پر ڈھیر ہو گئی۔ آسمان خالی ہو چکا تھا۔ اور چاروں سمت ایک گہری چپ تنی تھی۔ اس نے زور سے پکارنا چاہا مگر یک لخت آواز اس کے گلے میں دب گئی۔ جیسے منوں ملبہ اوپر آن گرا ہو۔ تب اچانک اسے وہ شہزادہ یاد آیا جو راج ہنس بن گیا تھا۔ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں خشک کیں۔ اور ان میں گرنے والے [illegible] اور کیتلیوں سے اپنا ٹملتا بینر جیتا اٹھا کر ماتھے سے گزور [illegible] تھا۔ لفظ اس کے

لیے مرچکے تھے۔

راج ہنس بن جانے والے کے بارے میں لوگوں نے یہی جانا کہ وہ پھر کوہ پیمائی پر نکل گیا ہے۔ وہ پہلے بھی اسی طرح چلا جایا کرتا تھا۔ کیوں کہ اسے نیلے بادلوں اور سرسبز چوٹیوں اور بہتے جھرنوں سے بہت پیار تھا مگر اصل حقیقت تو صرف وہی جانتی تھی۔

ہر تیسرے پہر وہ سفید براق' لمبی خوب صورت گردن والا راج ہنس نہ جانے کن وادیوں سے اس کے پاس جھیل کنارے آتا۔ وہ اس کے ساتھ لپٹ جاتی' اس کے گلے میں بانہیں ڈالتی۔ دونوں خاموش رہتے مگر راج ہنس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہتے جو زمین پر گرتے ہی موتی بن جاتے۔ وہ ان موتیوں کو چن چن کر جھولی بھرتی اور ان کی لڑیاں پرو کے چھپا چھپا کے رکھتی۔ اس چھوٹی سی پٹاری میں جس میں آج تک اس نے اپنی ہر قیمتی شے رکھی تھی۔ راج ہنس ہجر و فراق کی گھڑی میں ان تیسرے پہر کی زرد روشنی میں آتا۔ روزانہ' وہ اس کے ساتھ جنگلوں وادیوں میں کلکاریاں مارتی پھرتی اور جاتے ہوئے راج ہنس جھیل کنارے آنسوؤں کے موتی بکھیر جاتا۔

آخر وہ دن آگیا۔ وہ صبح سویرے ہی اپنا پسندیدہ گیت گانے لگی۔ پھولوں میں ہم آتے ہیں..... آتے ہیں..... ٹھنڈے موسم میں۔ وہ وادیوں پہاڑوں میں اچھلتی گاتی پھرتی۔ لوگ اس کی آواز پر حیران رہ گئے۔ اس گنگ شہزادی کو بولنا کس نے سکھادیا' اور بولی بھی تو کیسا بولی کہ سب بولنے والے اس کے سامنے خاموش ہو گئے کہ جس کی میٹھی بات وادی وادی' پہاڑ پہاڑ' صحرا صحرا گونجتی پھرتی ہے۔ کیسی جس کی راہ میں آڑ نہیں۔ لوگ کیا جانیں آج ساتواں برس تمام ہوتا ہے' آج اس کا راج ہنس اپنی اصل صورت میں لوٹ آئے گا۔ وہ اس کی نرم مسکراہٹ دیکھے گی۔ اس کا ہاتھ تھامے' گلی گلی گھومے گی۔

اس شام اس نے اپنا خوب صورت ترین لباس پہنا۔ جس کا ریشم ہواؤں میں لہراتا تھا' اور اس کے بال جو ایک ہالے کی صورت اس کے چہرے کے گرد پھیلے تھے۔ اس وقت وہ دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی تھی۔ ہاں اس کا راج ہنس اسے اسی طرح دیکھتا تھا۔ اس نے جھیل کنارے پکار لگائی۔

"پھولوں میں ہم آتے ہیں..... آتے ہیں..... ٹھنڈے موسم میں۔"

پھر آسمانوں کو کاٹتی۔ پہاڑوں کو پاٹتی۔ درختوں پر سرسراتی' ہواؤں میں لہراتی' ایک میٹھی' جادو بھری گونج اٹھی اور سارے میں پھیل گئی۔ آسمان کے ایک کنارے سے دوسرے تک۔

تم کس کو لینے آتے ہو..... آتے ہو...... ٹھنڈے موسم میں۔

یہ آواز ٹھنڈک کی لہر بن کر اس کے اندر اتری اور روشنی بن کر رگوں میں پھیل گئی۔ اس کا راج ہنس نامعلوم وادیوں سے اتر کر اس کے پاس آن رکا۔ مگر آج تو تمہیں اپنی اصلی صورت میں لوٹنا تھا اس نے اس کی گردن میں بانہیں ڈالیں۔

"ہاں۔ آج میں اپنی اصل صورت میں مراجعت کروں گا مگر ابھی کچھ لمحے باقی ہیں۔ تو آؤ میرے ساتھ چلو۔ آج میں تمہیں اس وادی میں لے کر جاؤں گا جہاں سے میں آتا ہوں۔ اور وہ درخت بھی دکھاؤں گا جو میرا

بسیرا ہے۔"

راج ہنس نے کہا میرے پروں پر بیٹھ جاؤ۔ اپنی اصل صورت میں مراجعت سے پہلے آج گلی گلی کوچے کوچے' شہر شہر' وادی وادی گھومیں گے۔ جیسے پہلے گھومتے تھے۔ وہ اس کے پروں پر بیٹھ گئی۔ کتنی اونچی اڑان تھی اس کی۔ بادلوں سے بھی اوپر۔ وہ اپنے شہر کے گلی کوچے اور پھر اونچے پہاڑ' سرسبز وادیاں' طوفانی دریا' سب کھلونے نظر آرہے تھے۔ وہ اس کی گردن سے لپٹ گئی اور قہقہے اس کے بھیتر سے پھوٹنے لگے۔ راج ہنس نے کہا۔ وہ دیکھو میرا بسیرا قریب آرہا ہے۔ میری گویائی تو آج سات سال پورے ہوتے ہی لوٹ آئی تھی۔ وہ سامنے ہے میری وادی۔ اس نے غور سے دیکھا مگر سامنے تو ایک ان ہونا بادل تھا۔ بس ایک مسلسل مسلسل تیسرا پہر۔ ڈھلتا دن۔

"کہاں ہے۔ کدھر ہے۔ کون سی وادی؟"

"ابھی ذرا آنکھیں ملو تمھیں ٹھیک سے نظر آئے گا۔"

"مگر میری آنکھیں...... تم تو جانتے ہو شروع ہی سے میں دور کی شے صاف نہیں دیکھ سکتی۔"

"ہاں مگر اب دیکھ سکو گی۔"

وہ ایک جھیل کے کنارے اتر گئے۔

تب اس نے دیکھا وہ اپنی اصل من موہنی صورت میں لوٹ آیا تھا۔ دراز قد' سانولا رنگ' جادو بھری مسکراہٹ' مگر بال' صرف بال تھے کہ راج ہنس ہی کے رہ گئے تھے' اسٹیل گرے۔ چمکتی چاندی۔ چکاچوند پھیلاتی۔ کشادہ ماتھے سے اٹھتی شعاعیں۔ اس نے اسے غور سے دیکھا۔ آج اس کی تپسیا سپھل ہوئی تھی۔ آج ہی تو پہلی بار اس نے ایک کھری بازی جیت لی تھی۔ جس میں کوئی شک و شبہ نہ تھا جو جیت ہی جیت تھی۔

"وہ سامنے دیکھو۔" اس نے بڑھتے پھیلتے نارنجی شعاعوں کے تیسرے پہر میں ان ہونے بادلوں کی طرف اشارہ کیا اور آگے بڑھنے لگا۔

"مگر اب تو تمھیں وہاں نہیں جانا۔ اب تو تم وہاں نہیں جاؤ گے۔ آج تو تمھاری مراجعت کی ساعت ہے۔ تم اپنے اصل وجود میں واپس آئے ہو۔ وجود جو میرا تمھارا ایک ہے۔"

"ہاں آج ہی تو میری مراجعت کی گھڑی ہے۔ اصل وجود میں لوٹنے کی۔" اس کے راج ہنس بال ادھر ادھر لہرانے لگے۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس تیسرے پہر کی وادی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا مگر اس کی اپنی ہی گرفت اس ہاتھ پر ڈھیلی پڑنے لگی۔ وہ اس کی تیز رفتاری پر دھک رہ گئی۔

تیسرا پہر پھیلتے پھیلتے آنکھوں سے آن ٹکرایا۔

"تم کس کو لینے آتے ہو...... آتے ہو...... ٹھنڈے موسم میں۔" دور ایک گونج اٹھی۔

وہ زمین پر اوندھی گر گئی۔ کیا تم نہیں جانتے۔ کیا تم نہیں جانتے۔ ہم تم کو لینے آتے ہیں.... آتے ہیں

...... ٹھنڈے موسم میں۔
اس کی آواز جنگلوں' پہاڑوں سے ٹکرائی۔ سمندروں' دریاؤں میں بہہ گئی۔
اس نے اپنی پٹاری میں پڑی لڑیوں کو گنا۔
وہ ایک دن کا دھوکا کھا گئی تھی۔

سب داستانوں کی طرح آج آزمائش کی گھڑی ختم نہ ہوئی تھی۔ اس کا آخری دن تھا۔ اس نے ایک دن پہلے اپنا چلہ توڑ دیا تھا۔ وہ ایک دن جو ازلی ابدی تیسرا پہر۔ ہے جس کی نیلی سرخی سے یہ دنیا اُگی ہے۔

☆ ○ ☆

امراؤ طارق

آخری موت

اس کی قبر جہاں کھودی جارہی تھی وہ جگہ بہت زیادہ نشیب میں تھی اور ہفتے بھر سے تیز بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ جہاں گور کن قبر کھودنے میں مصروف تھے وہ جگہ قبرستان کی کچی چہار دیواری کے قریب آخیر میں تھی اور کھودی جانے والی قبر کے آس پاس تین طرف بارش کا پانی جمع تھا اور چوتھی طرف کیکر کی جھاڑیوں کے بعد چند قدم کے فاصلے پر قبرستان کی پختہ چہار دیواری تھی اور اوپر سے دوسری قبر تک جانے کے لیے کوئی باقاعدہ راستا نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے بار بار قبروں پر پاؤں رکھ کر آنے جانے سے عارضی راستا بن گیا تھا اور بعض قبروں پر پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے قبریں ایک دوسری پر چڑھی ہوئی ہیں۔ کئی نئی قبریں پرانی گنجان قبروں کے بیچ پرانی قبروں کے اوپر کھودی گئی تھیں اور ان میں تدفین کے بعد کی تازہ مٹی کے اوپر نئے کتبے لگادیے گئے تھے۔ شاید پرانی قبروں کے کتبے گر گئے ہوں گے یا ان قبروں پر کبھی کوئی نہ آیا ہوگا اور گورکن کو اس کا علم ہوگا اور وہ جگہ زیادہ پیسوں کے عوض فروخت ہوگئی ہوگی۔ گورکن کے پانی کے اندر سے بار بار گذرنے کی وجہ سے کھودی جانے والی قبر کے تین طرف جمع پانی اب کیچڑ میں بدل گیا تھا جس میں پانی کی مقدار اب بھی زیادہ تھی اور گورکنوں کے پاؤں کیچڑ میں اس طرح سنے ہوئے تھے جیسے انھوں نے کیچڑ کے موزے پہن رکھے ہوں۔ قبر کی کھدائی سے نکلنے والی مٹی اب تک گیلی نکلے جارہی تھی اور قبر کے اندر سے خشک مٹی نکلنے کی امید آہستہ آہستہ اب دم توڑنے لگی تھی۔

"یا اللہ میت کیا گیلی قبر میں اتاری جائے گی۔" اس کے سارے نام، سارے رشتے اور سارے ناطے اب باقی نہ رہے تھے۔ وہ اب صرف میت رہ گئی تھی۔ اس کے اندر کہیں بہت گہرائی میں درد کی ٹیس سی محسوس ہوئی اور اس نے وہیں قبروں کے بیچ اس کی ساری زندگی کا جائزہ لیا تو اس کے سارے دکھ اس کے سامنے قرض خواہوں کی طرح آکر کھڑے ہوگئے۔

اب کے بار وہ آخری بار مری تھی۔ وہ پہلی بار اس وقت مری تھی جب اسے آٹھویں کلاس میں اسکول سے اٹھالیا گیا تھا اور اسے ماں کے ساتھ شہر سے لاکر گاؤں میں ایک طویل و عریض صحن، لمبی لمبی دالانوں اور پختہ اینٹوں کی دیواروں والے مکان میں ڈال دیا گیا تھا اور اس کی سمجھ میں کئی دنوں تک یہ بھی نہ آسکا تھا کہ ایسا اچانک کیوں ہوا ہے اور یہ تبدیلی عارضی تھی یا مستقل۔ لیکن اسے جب معلوم ہوا کہ

اب اس کا مستقل گھر یہی ہے تو شہر سے اس کے ساتھ آئے ہوئے سارے معصوم اور خوب صورت خواب بکھر گئے۔ گاؤں میں صرف لڑکوں کا ایک پرائمری اسکول تھا جس میں سفید پوشوں کے بچے ٹاٹ کی پلیلیوں پر بیٹھ کر پڑھتے تھے اور گاؤں کے دوسرے بچے جو ماں باپ کے کاموں میں کھیتوں اور کھلیانوں پر ان کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے' اسکول جانے والے بچوں کو دور سے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے آنکھوں پر چھتری بنا کر اس طرح دیکھا کرتے تھے جیسے شودر برہمنوں کو مندر کے اندر جاتے دیکھا کرتے ہیں۔

قبر کے اندر ابھی تک گیلی مٹی نکل رہی تھی۔

گاؤں آتے ہی تو آزن اس کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ ماں اسے بات بات پر ٹوکتی تھی۔

"لڑکی سر پر دوپٹہ لے۔"

"کیا لڑکوں کے ساتھ بیٹھی ٹھٹھے لگاتی رہتی ہے جا کے گھر کا کام دیکھ۔" اور وہ پاؤں پٹختی چل دیتی اور اس کے چچا زاد اور ماموں زاد جو اس کے پاس بیٹھے ہوتے خجل ہو کر سوچنے لگتے۔

وہ بھی انھی خجل ہو کر سوچنے والوں میں سے ایک تھا۔

ان دنوں وہ ننگے پاؤں' گھٹنوں سے اوپر ڈھیلے پائنچوں والی نیکر اور بار بار کے جھگڑوں سے گلے کے تمام بٹن ٹوٹے اور گریباں چاک قمیص پہنے گلے میں تسبیح کی طرح غلیل ڈالے اور نیکر کی دونوں جیبوں میں غلے بھرے ساری دوپہر جنگلوں میں' کھیتوں کے بیچ بنی پگڈنڈیوں پر اور آم کے باغوں میں بھاگا بھاگا پھرا کرتا تھا اور گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ درختوں پر چڑھ کر طرح طرح کے کھیل کھیلا کرتا تھا اور صرف کھانا کھانے یا سونے کے لیے گھر آتا تھا اور گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی شہر لوٹ جایا کرتا تھا۔ اسی آوارہ گردی کی عمر میں وہ اسے اچھی لگنے لگی۔ گاؤں کی تمام لڑکیوں سے مختلف' صاف شفاف' دھلی دھلائی جیسے اس کے آر پار نظر آتا ہو۔ وہ تھی بھی ایسی ہی سادہ' معصوم' شفاف اور آر پار نظر آنے والی بے ریا۔ سب کچھ اسی طرح کہہ دینے والی جس طرح اسے محسوس ہوتا ہو یا دکھائی دیتا ہو۔ شہر اور اسکول دونوں میں مشترک تھا وہ شہر اور اسکول سے محروم ہو چکی تھی اور وہ شہر اور اسکول میں اب بھی تھا اس لیے وہ دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ وہ ہنستی تو دانت قمقموں کی طرح جلتے بجھتے محسوس ہوتے اور نچلے ہونٹ کا تل بھیگ کر لودینے لگتا۔ وہ کہا کرتی۔

"مجھے اندھیرے سے خوف آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پاس ہی کہیں کچھ چھپا ہوا ہے اور میری تاک میں ہے مجھے اچانک پکڑ لے گا۔ میں کبھی مرنا نہیں چاہتی۔ مرنے کے بعد لوگ قبر میں ڈال کر اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور پھر لوٹ کر دیکھتے بھی نہیں۔ قبر میں کیچڑ ہوتی ہے اور سانپ آجاتے ہیں۔ اور رات کو اندھیرا ہو اور نیچے کیچڑ ہو اور سانپ رینگ رہے ہوں تو...... تم مجھے دفن نہ ہونے دینا۔"

وہ ایسی ناہموار باتوں سے بے مزہ ہوتی رہتی۔

وہ دوسری بار اس وقت مری تھی جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس سے کسی نے پوچھا بھی نہ تھا۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں نے اسے گھیر کر ابٹن لگا دیا اور ڈھولک لے کر گیت گانے لگیں۔

اس نے اپنے آپ سے کہا۔

""اس میں خوشی کی کیا بات ہے' یہ ساری لڑکیاں' ساری عورتیں کیوں خوش ہو رہی ہیں۔ چھلیں کر رہی ہیں' ٹھٹھے لگا رہی ہیں۔ اس شادی میں ان کی کیا خوشی چھپی ہوئی ہے۔ اس کی شادی ہو رہی ہے اور اسی سے کوئی پوچھتا نہیں کہتا بھی نہیں ہے۔ اس کے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے اس میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ کیا وہ زندہ گوشت پوست کی بنی ہوئی نہیں ہے' کوئی لاش ہے' میت ہے یا پتھر کی مورتی ہے' یا موم کی گڑیا ہے؟""

وہ سوچتی رہی اور اس کی شادی ہو گئی۔

اور تیسری بار وہ جب مری تھی جب پاکستانی پرچم میں لپٹی ہوئی اس کے بیٹے کی لاش آ گئی تھی اور اس نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کیپٹن تھا او پی کے فرائض انجام دے رہا تھا اور آرٹلری کو گائیڈ کر رہا تھا اور گولے دشمن کے ٹھکانوں پر ٹھیک ٹھیک لگ رہے تھے۔ تب دشمن نے او پی کے بارے میں سوچا اور تمام امکانات پر گولہ باری کی اور ایک برسٹ اسے لیرلیر کر گیا۔

قبر کھودی جا چکی تھی اور وہ جگہ جہاں اسے کفن سمیت اتارا جانا تھا صاف کر دی گئی تھی۔ قبر کے اوپر چادر تان دی گئی۔

"محرم قبر میں اتر کر میت کو قبر میں اتارنے میں مدد کریں۔" کسی نے آواز دی پھر انتظار ہوا لیکن کوئی محرم آگے نہ بڑھا۔ محرم کے لیے دوبارہ آواز دی گئی۔

کسی نے حیرت سے کہا۔ "یہ کس کی میت ہے۔ کوئی محرم کیوں نہیں ہے۔؟"

""نہیں بھائی کوئی نہیں ہے۔ کوئی محرم وہرم نہیں ہے۔ محرم کہاں سے ہوتا' کیسے آتا۔ مرحومہ کا سارا محلّہ تو سیل بند ہے۔ نہ کوئی محلّے کے اندر آ سکتا ہے نہ محلّے سے باہر جا سکتا ہے۔ آج تیسرا دن ہے گھروں کی تلاشی ہو رہی ہے۔ اسلحہ ڈھونڈا جا رہا ہے۔ گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ قیص اتار کر انھیں کی قیصوں سے آنکھوں پر پٹیاں باندھی جا رہی ہیں کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ حشر کا سماں ہے۔ ایسا تو کبھی کسی کے ساتھ نہ ہوا تھا۔ مرحومہ ہسپتال میں تھی۔ تین دن سے نہ کوئی ملنے جا سکا نہ پھل اور دوا دارو پہنچ سکی۔ مرحومہ ہسپتال میں مری سو اسے دفن کرنے یہاں لے آئے۔""

"دیکھنا قبر کے اندر ابھی گیلی مٹی نظر آ رہی ہے۔" کسی نے کہا تو اس نے آگے بڑھ کر قبر کے اندر دیکھا۔ وہاں کیچڑ تھی جس میں پانی کی مقدار کم تھی۔ چادروں کی مدد سے میت کو قبر میں اتار دیا گیا۔

"عرق گلاب۔"

کئی بوتلیں ہاتھوں میں لے کر بڑھا دی گئیں۔ میت کے اوپر عرق گلاب ڈالا گیا۔

"ملکہ شیبا نے کہا تھا کہ جب فوجیں شہر میں داخل ہوتی ہیں تو شہر کا سہاگ اجڑ جاتا ہے۔ عصمت لٹ جاتی ہے۔ تقدس پامال ہو جاتا ہے۔"

کسی نے اپنے قریب کھڑے لوگوں کو مخاطب کر کے اپنی معلومات کا رعب ڈالا۔

"اپنی فوجیں بھی اگر اپنے شہروں میں داخل ہوں......"
کسی نے سوال کیا مگر قابلیت جتانے والے نے اس کی سنی ان سنی کر دی۔
پتھر کی چوکور سلیں ایک دوسرے سے ملا کر رکھ دی گئیں اور درزوں کو گیلی مٹی سے بند کر دیا گیا۔ گورکن الگ کھڑا ہو گیا اور لوگوں نے قبر پر مٹی ڈال دی۔ گورکنوں نے ادھر ادھر سے مٹی سمیٹ کر قبر کو مکمل کیا۔ کسی نے اگربتی جلا کر قبر کے سرہانے پورا مٹھا گاڑ دیا۔ کسی نے پھولوں کی چادر نکال کر قبر پر پھیلا دی۔ کسی نے قبر کی گیلی مٹی میں کلمے کی انگلی پرو کر دعا پڑھی۔ جب دعا پڑھی جانے لگی تو سب باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے اس نے یہ دعا جانے کتنی بار اسی طرح سنی تھی۔ وہ وہاں سے بھاری قدموں سے اس طرح چلنے لگا جیسے اس نے اس سے وعدہ خلافی کی ہو۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔
"وہ کیچڑ سے خوف زدہ تھی مگر اس وقت کیچڑ کے بستر پر لٹا دی گئی تھی۔"
"وہ اندھیرے سے ڈرتی تھی اور اب اندھیرا آہستہ آہستہ قبرستان پر اتر رہا تھا۔"
"وہ سانپ سے ڈرتی تھی۔"
"مگر سانپ یہاں نہیں ہے۔" اس نے کمال اطمینان سے سوچا اور ایک طویل گہری سانس لی۔
"سانپ یہاں نہیں ہیں......" اس نے اپنے آپ سے کہا۔
"اپنی آستینوں میں دیکھو...... آستینوں میں دیکھو اس سے پہلے کہ آخری موت سر پر آ جائے۔" ایک خبط الحواس نیم برہنہ شخص اس کے پیچھے سے یہ کہتے ہوئے نمودار ہوا اور آگے بڑھ کر درختوں کی اوٹ میں چلا گیا۔

☆ ○ ☆

زاہدہ حنا

رقصِ مقابر

انقلابِ زمانہ کا سفاک ہاتھ ماہ و سال کے رتھ پر چابک برساتا ہے اور یکساں رفتار سے چلتا ہوا رتھ تیزی سے دوڑنے لگتا ہے۔ نسلوں' قوموں اور بستیوں کو اس کے پہیے روندتے چلے جاتے ہیں' ہر شے کو تہہ و بالا کرتے ہوئے' ہر شہر کو وقفِ بلا کرتے ہوئے۔

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پتھر کے پیالے میں وقت کا رتھ دوڑ رہا ہے۔ تیز' تیز تر۔ ہوسِ اقتدار کے چقماق سے چنگاریاں گر رہی ہیں اور آگ بھڑک رہی ہے۔ نسلیں جل رہی ہیں' چہرے پگھل رہے ہیں۔ پشتون' ازبک' تاجیک' ہزارہ' دھقان اور بنجارے اس آگ کا ایندھن۔

ایک ترک نوجوان سبزہ خط آغاز' ایرانی مینا طوروں میں نظر آنے والے لباس میں ملبوس' سر پر پگڑی' بغل میں کتاب' کمر میں تلوار' اس پتھریلے پیالے کی کگر پر کھڑا ہے جو ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہے۔ وہ گردن گھماتا ہے اور اس طرف دیکھتا ہے جہاں آریانا ایئرلائنز کا طیارہ فضا کو چیرتا اور گرجتا ہوا اس پتھریلے پیالے کی سنگلاخ کگر سے چند سو گز اوپر گزر کر اس کے اندر اترنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ پہیے کھل رہے ہیں اور طیارے کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے اعصاب کھنچ رہے ہیں۔ طیارہ اس ترک نوجوان سے چند سو گز کے فاصلے سے گزرتا ہے۔ ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں۔ وہ مسکراتا ہے اور میں اخلاقاً مسکرانے کی کوشش کرتی ہوں۔ جہاں زندگی اور موت میں بال برابر کا فاصلہ ہو وہاں کیسی ہنسی اور کہاں کا اخلاق۔ میری گھبراہٹ دیکھ کر وہ مسکراتا ہے۔ بغل میں دبی ہوئی کتاب نکالتا ہے اور اسے میری نگاہوں کے سامنے لہراتا ہے۔

"یہ میرے لکھے ہوئے اوراقِ پریشاں ہیں۔ دن بھر دشمن کے تعاقب میں رہنے کے بعد جب میں پڑاؤ پر پہنچتا تو الاؤ اور کبھی مشعلوں کی روشنی میں انھیں لکھتا رہا۔" وہ اس کی ورق گردانی کرنے لگتا ہے' پھر وہ اسے بند کر دیتا ہے۔

"تم اب آئی ہو' میں نے صدیوں پہلے اسی جگہ پر کھڑے ہو کر منھ اندھیرے طلوعِ ستارۂ سہیل دیکھا تھا' ایک عمدہ شگون اور پھر سورج طلوع ہوا تھا' ایک پُرجلال و پُرشکوہ وادی ہونے کے رنگ میں رنگی گئی تھی۔"

"صدیوں پہلے۔" مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ ایک سے ایک بڑبولا پڑا ہے اس دنیا میں۔

طیارہ پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی کے اندر آگیا ہے پتھریلی تکر سے بہت نیچے۔ اور تب یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو جاتے ہیں کہ وہ کہانیوں کے ہندو سادھوؤں کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا آتا ہے اور طیارے کے اس پنکھ پر بیٹھ جاتا ہے جو میری نشست سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ مجھے رے بریڈبری کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ اس میں بھی ایک کردار طیارے کے پنکھ پر آ بیٹھا تھا۔ شاید زندگی کا خوف حواسوں کے ساتھ اسی طرح کھلواڑ کرتا ہے۔ میں اپنی نشست کو مضبوطی سے تھام لیتی ہوں۔

"میں نے پہلی مرتبہ اس شہر کو دیکھا تو یہ وہ زمانہ تھا جب میں قندز' بدخشاں' ہرات اور دریائے آمو کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ میں نے پہاڑوں کے اس عظیم دائرے میں تپتی ہوئی سنگلاخ چٹانوں کے درمیان اس دریا کو بہتے دیکھا تھا۔" وہ انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرف دیکھتی ہوں۔

"اس روز اس دریا کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے بہتی ہوئی چاندی کی ایک زنجیر ہے جو ان ہیبت ناک پہاڑوں کے پیروں میں پازیب بن گئی ہے اور چاندی کی اس زنجیر کے دونوں طرف سرسبز و شاداب مرغزاروں کے زمردیں ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ آدم کے قاتل بیٹے قابیل کی سرزمین ہے اور اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ کسی کی حکومت تادیر برداشت نہیں کرتی۔"

میرے سامنے کی قطار میں بیٹھی ہوئی ایک تیم شحیم عورت جو اپنی وضع قطع سے سرابسر پنجاب کی لگ رہی ہے' کھڑکی کی طرف جھک کر نیچے دیکھتی ہے اور پھر "ہائے ربا" کہہ کر زور سے سینے پر دوہتڑ مارتی ہے۔ اس کے برابر بیٹھا ہوا کیسری پگڑی والا سکھ نوجوان آہستہ سے اسے تسلی دیتا ہے۔

میں طیارے کے پنکھ پر بیٹھے ہوئے ترک نوجوان کو نظرانداز کرتے ہوئے نیچے کی طرف نظر کرتی ہوں۔ ہمارے طیارے سے چند سو فٹ نیچے شعلوں کی ایک چھتری سی تنی ہوئی ہے۔ میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ جاتی ہیں۔

ترک نوجوان ہاتھ لہرا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ میں جھنجلا جاتی ہوں۔ یہاں جان پر بنی ہوئی ہے اور یہ ایران توران کی ہانک رہا ہے۔ میں جو دلی سے آرہی ہوں' میں نے منہ اندھیرے کسی طلوعِ ستارۂ سہیل کا نظارہ نہیں کیا کہ اسے نیک شگون جانوں۔ جہادِ ملتِ اسلامیہ کے لیے دولتِ ریاست ہائے متحدہ امریکا کا نادرِ روزگار تحفہ' اسٹنگر میزائل اور اسے "ڈی بریک" کرنے والے اینٹی اسٹنگر فلیئر۔ ان کی لپک دیکھ کر سب ہی کے اوسان خطا ہیں۔ ہوسِ اقتدار کے چقماق سے گرنے والی کوئی چنگاری کسی بھی لمحے آریانا ایئرلائنز کے اس طیارے کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہے۔ طیارے کی فضا میں لتا منگیشکر کی مدھر آواز ہماری حالت کا مذاق اڑا رہی ہے۔ گنگا میّا میں جب تک کہ پانی رہے' مورے سجنا تری زندگانی رہے۔ یہاں کیا سجنی اور کیا سجنا' سب کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ ہماری یہ گائیکہ اس وقت بمبئی میں شاید ریاض کر رہی ہو یا کسی گانے کی ریکارڈنگ میں مصروف ہو' اسے بھلا کیا خبر کہ اگر سربلندیٔ ملتِ اسلامیہ کی خاطر گلبدین حکمت یار کے کسی "مجاہد" کا داغا ہوا کوئی اسٹنگر طیارے کو آن لگے تو اس کی تو آواز سے بھرا ہوا صرف ایک کیسٹ جل جائے گا لیکن ہم سب چشمِ زدن میں خاکستر...... یوں جیسے

شمشان گھاٹ میں چتا پھونک دی گئی ہو۔ مانا کہ اس طیارے میں دلّی سے سوار ہونے والے افغان 'ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت ہے لیکن الحمدللہ کہ دس پانچ مسلمان بھی تو ہیں۔ اجی ہٹاؤ بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ بعد از مرگ دفن ہوئے یا جلائے گئے۔ ابھی تو اندیشۂ مرگ سے ہی دم لبوں پر ہے۔ سب کی سانسیں رکی ہوئی' وقت کی گردش تھمی ہوئی۔ طیارے کے پہیے کابل ایئرپورٹ کی زمین کو چھو لیتے ہیں اور سب جیسے کسی طلسم سے آزاد ہو کر جی اٹھتے ہیں۔

میں طیارے کے پنکھ کی طرف نظر کرتی ہوں۔ وہاں نہ کوئی ترک ہے نہ تاجیک۔ وہی رے بریڈ بری کی کہانی والا قصہ...... موت کا خوف کیسے کیسے سوانگ رچاتا ہے۔

○ ○ ○

ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کابل' باغ بالا کی چوٹی پر سر اٹھائے کھڑا ہے۔ کمرہ نمبر ۱۱۹۔ میں بے قراری سے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی ہوں اور پھر اٹھ کر شیشے کی اس دیوار تک جاتی ہوں جس سے کئی میل پرے نشیب میں کابل ایئرپورٹ کی ایئرسٹرپ نظر آرہی ہے۔ صبح کا ملگجا اجالا پھیل رہا ہے اور ان میں صنوبر اور بلوط کے اونچے اونچے پیڑ سبزے کی بکل مارے ساکت و صامت کھڑے ہیں۔ ہوا شاید ان کے شانوں پر سر رکھ کر سو گئی ہے۔ شیشے کی دیوار کے دائیں جانب چھدرا سا جنگل ہے۔

دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔ ہم نے خطوں میں کتنی بہت سی آرزوئیں کی تھیں۔ کتنی بار مجھے کابل بلایا گیا تھا' کتنی ہی بار یہ پیام آیا تھا کہ ہمارے شہر آؤ تو ملِ کے سیرِ چمن کو چلیں گے۔ اس کے جنگلوں میں گھومنے کی' اس کی سڑکوں پر چلنے کی آرزو تھی۔ پوہنتون کابل کی روشوں پر ٹہلیں گے' خزاں جب پیڑوں کا لباس اتارے گی تو ان مناظر کو دیکھیں گے لیکن وقت اپنی چال چل گیا تھا' اس شہر کا وہ گھر جس میں کئی جوڑا آنکھیں میری منتظر تھیں' وہ گھر کہیں کھو گیا تھا۔ مکینوں نے مکان بدل لیا تھا۔ انتظاری آنکھیں دنیا کے میلے میں کھو گئی تھیں۔ اپنا نام و نشاں بھیجے بغیر۔ جرمنی' امریکا' انگلستان۔ ان محبوب ہاتھوں کی تحریریں صدیوں سے نہیں دیکھیں۔ لیکن آقائے عبدالحئی حبیبی تو کہیں نہیں گئے ہوں گے اور مادام حبیبی جنھیں ان کے بچوں کی طرح میں بھی "بوجان" کہتی تھی' وہ بھلا کہاں گئی ہوں گی۔ میں انھی سے مل لوں' ان کی قدم بوسی کرلوں۔

کابل ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد سے رات ہونے تک میں آقائے حبیبی کے بارے میں ایک ایک سے پوچھتی رہی ہوں لیکن سب ہی نے اتنے اصرار سے نفی میں سر ہلایا ہے کہ مجھے یقین آگیا ہے کہ یہ لوگ آقائے حبیبی کے پتے سے واقف ہیں اور نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی الٰہ آباد میں پنڈت رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری کا پتا پوچھے اور اس سے کہا جائے کہ ہم انھیں نہیں جانتے۔ میں نے اپنے کمرے میں ٹیلی فون کی ڈائریکٹری تلاش کی لیکن افغانستان میں اس نام کی کوئی چیز پائی نہیں جاتی۔ آپریٹر نے رئیسِ مجلس (اسپیکر) محمود حبیبی کے گھر کا نمبر ملا دیا۔ محمود حبیبی اس

خاندان کے بے حد قریبی رشتے دار لیکن نام پہچاننے سے بھی انکاری۔ وہ مرغلرہ کو نہیں جانتے' انھوں نے حبیب اور میرویس کا نام نہیں سنا۔ جب میں انھیں آقائے عبدالحیٔ حبیبی سے ان کی رشتے داری یاد دلاتی ہوں تو وہ غصے سے فون بند کردیتے ہیں۔ کچھ تو ہے کہ جس کی پردہ داری ہے۔

ملک اور شہر جب دو مخالف اور متحارب کیمپوں میں بٹ جائیں' جب چچا بھتیجے کے اور ماموں بھانجے کے خلاف ہتھیار اٹھا رہا ہو' جب بھائی بھائی کی مخبری کر رہا ہو تو رئیسِ مجلس سنا کو ایک پاکستانی ادیب اور اخبار نویس کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیے۔ مانا کہ میں صدرِ افغانستان کی مہمان ہوں لیکن پناہ بہ خدا آئی ایس آئی کی ایجنٹ بھی ہوسکتی ہوں یا ایم آئی کی۔ اور جب بہ راستادلّی واپس کراچی پہنچوں گی تو یہودو ہنود کی ایجنٹ قرار پاؤں گی۔ ہیون سانگ اور فاہیان اور ابنِ بطوطہ ہمارے زمانے میں ہوتے تو دیکھتے کہ کیسے بچتے ہیں سی آئی اے یا کے جی بی کی ایجنسی کے الزام سے۔ ان دونوں سے بچ نکلتے تو انھیں "را" کا ایجنٹ ثابت کرنا تو بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا کہ بائیں بازو کی سیاست کرنے والوں کو ہمیشہ ننگِ دیں' ننگِ وطن ثابت کیا جاتا رہا۔

اور تب کوئی ہولے سے کھنکارتا ہے۔ میں دہشت زدہ ہو کر پلٹتی ہوں۔ مقفل کمرے میں کوئی اندر کیسے آیا؟ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ والی کرسی کھینچ کر وہ بیٹھ گیا ہے اور مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہی ترک نوجوان...... لیکن وہ تو واہمہ تھا' نظر کا فریب...... تو پھر یہ کون ہے اور پتھریلی دیواروں سے گزر کر مجھ تک کیسے آ پہنچا ہے؟ خیالوں کی یورش' اندیشوں کی دوادوش۔

"دیواریں......" وہ ہنستا ہے...... "میرا راستا تو فصیلیں اور دریا اور گہری کھائیاں نہیں روک سکی تھیں' تو پھر اس دیوار کی کیا حقیقت ہے۔" وہ اپنی انگلیوں کو دیوار پر بجاتا ہے' بغل میں دبی ہوئی کتاب رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیتا ہے اور اب کمر سے بندھی ہوئی تلوار کھول رہا ہے۔ شاید میری گردن اڑانے والا ہے۔ میری خطا؟ میرا قصور؟

"میں تمھیں بتاؤں' جنگ کے دامن سے جدائی بندھی چلی آتی ہے۔ وہ جدائیاں جن سے تم دل گرفتہ ہو' میں نے بہت جھیلی ہیں اور میری وجہ سے ہزاروں' لاکھوں نے جھیلیں۔" اس کی آواز ملول ہوگئی ہے۔

میں غور سے اسے دیکھتی ہوں۔ "تم عالم الغیب ہو؟"

وہ نفی میں سر ہلاتا ہے۔

"تو پھر کے از رجال الغیب؟"

وہ مسکراتا ہے۔ "میرے بارے میں جو جی چاہے فرض کرو لیکن بس یہ ہے کہ میں تھا' میں ہوں اور میں رہوں گا۔"

"یہ تو کچھ خدائی کی سی دعویداری کا معاملہ ہے۔" میں ابرو اٹھا کر اسے دیکھتی ہوں۔

"میں روحِ زمانہ ہوں جو کبھی ایک اور کبھی دوسرے نام میں قیام کرتی ہے۔"

"تو اے روحِ زمانہ ان دنوں تم کس نام میں قایم ہو؟" مجھے اب اس کی باتوں میں لطف آ رہا ہے۔
"تو تم کیا واقعی ابھی تک مجھے نہیں پہچانیں۔" اس کی آواز میں حیرت ہے۔ "کل میں روزانہ کے دھواں دھواں منظروں سے بے زار ہو کر ذرا ادھر ادھر کی سیر کو نکلا تھا کہ تمھارے ہوا پیا پر نظر پڑی۔ اس ہجوم میں بس تم ہی تھیں جو مجھے واقف جانتی تھیں' اسی لیے تم سے کلام کیا۔"
میں اسے غور سے دیکھتی ہوں۔ کھنچی ہوئی ملاوئی آنکھیں' نکیلی ٹھوڑی۔ "ہاں شاید تمھیں کہیں دیکھا تو ہے۔" میں جھینپ جاتی ہوں۔
وہ ایک گہرا سانس لیتا ہے اور پھر میز پر رکھی ہوئی کتاب اٹھاتا ہے اور میرے سامنے لہراتا ہے۔ "تم نے تو اسے کئی بار پڑھا ہے۔"
لیجئے صاحب' اسے کہتے ہیں ہاں نہ ماں میں تیرا مہمان' ابھی جناب کا دعویٰ روحِ زمانہ ہونے کا تھا' اب شکایت اس کی ہے کہ میں انھیں پہچان کیوں نہیں رہی اور اس پر بھی اصرار ہے کہ میں نے ان کی کتاب کئی بار پڑھی ہے۔ یہ تو اپنی پوشاک' پگڑی اور پاپوش سمیت آنکھوں میں گھسے آتے ہیں۔ مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ جھوٹے کو گھر تک چھوڑ کر آنا چاہیے۔ میں ہاتھ آگے بڑھا کر وہ کتاب اٹھا لیتی ہوں جس پر مراکشی چمڑے کی جلد ہے۔ میں اسے کھولتی ہوں' اس فارسی مخطوطے کا ہر صفحہ مطلاّ اور ہر صفحہ مذہب ہے۔ پہلی سطر پر میری نظر پڑتی ہے۔
"در سنہ ہشت صد و نود و نہ۔ در ولایت فرغانہ بہ سن دوازدہ سالگی دشاہ شدم۔"
میری انگلیاں لرزنے لگتی ہیں۔ ناممکن۔ میں نگاہیں اٹھاتی ہوں۔ میرے سامنے اس وقت کا محمد ظہیرالدین بابر مسکرا رہا ہے' جب اس نے "بادشاہ" کا لقب اختیار نہیں کیا تھا اور میرے ہاتھوں میں "بابر نامہ" ہے۔
"توزک میں نے ترکی میں لکھی تھی' یہ اس کے ترجمے کی نقل ہے جسے عبدالرحیم خانِ خانان نے برائے خوشنودیٔ پادشاہ محمد جلال الدین اکبر کیا۔" وہ میری حیرت سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور اسی لمحے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ روحِ زمانہ پل چھن میں آنکھوں سے اوجھل۔ نہ شمشیر' نہ کتاب' میں غرق درحیرتِ آب۔
دستک دوبارہ ہوتی ہے۔ اب کہیں محمد جلال الدین اکبر یا محمد نورالدین جہانگیر نہ چلے آتے ہوں۔ میں جھجکتے ہوئے دروازہ کھولتی ہوں۔
سامنے کسی روحِ زمانہ یا رجال الغیب کی بجائے گوشت پوست کا بیل بوائے کھڑا ہے۔ "خانم۔ جاکت و دامن ولباس نو۔" ہینگر پر میرے استری شدہ کپڑے۔
ایک ڈالر کے نوٹ کی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک منتقلی۔
"متشکرم۔ متشکرم۔"

○ ○ ○

ارگ...... پریذیڈنشل پیلس۔ ایک پُر شکوہ پتھریلی عمارت۔ راہ داریوں سے گزر کر کمرۂ ملاقات

شوروی جا چکے۔ جنیوا معاہدہ ہو چکا۔ اس معاہدے کی قیمت جونیجو نے معزولی کی شکل میں ادا کی اور جنرل ضیا نے جان کی صورت میں۔ میں جنرل نجیب کی گہری اور پُر سکون آنکھوں میں جھانکتی ہوں۔ اس شخص سے کیسی کیسی کہانیاں وابستہ ہیں۔ "خاد" کا سربراہ۔ زندان پل چرخی کا عقوبت خانہ۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟ لیکن جس بات کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا وہ یہ کہ اس شخص نے امریکیوں اور روسیوں' پاکستانیوں اور ہندوستانیوں سبھی کے اندازے الٹ کر رکھ دیے۔ دنیا میں روزانہ اس کی حکومت کے خاتمے کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور یہ ہے کہ اپنی کرسی پر جما بیٹھا ہے۔

میرے کانوں میں روح زمانہ کی آواز گونجتی ہے۔ "یہ سرزمین قابیل ہے' آدم کے قاتل بیٹے کی بسائی ہوئی۔ شاید اسی لیے اس کی خاصیت ہو چکی ہے کہ تادیر کسی کی حکومت برداشت نہیں کرتی۔" جنرل نجیب کو یہ زمین نہ جانے کب تک برداشت کرے۔

نجیب ترجمان کے ذریعے باتیں کرتے کرتے اچانک اردو بولنے لگتے ہیں۔ ان کی جوانی پشاور کے گلی کوچوں میں گزری ہے' وہ اپنے کالج کے ساتھیوں کو یاد کر رہے ہیں۔ سیاسی دوستوں کو' پشاور کے بازار اور کراچی کی گلیاں نجیب کی آنکھوں میں جاگنے لگتی ہیں۔ فیض کے اشعار۔ میں اس شخص کو دیکھتی ہوں' یہی ہے جو اس گھر کا نام و نشاں بتا سکتا ہے' جس کا راستا مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ شاید میرا سوال پروٹوکول کے اعتبار سے مناسب نہ ہو۔ شاید اس گھر نے تره کی' امین' ببرک' کارمل اور نجیب کی سیاست سے اختلاف کیا ہو۔ شاید اس گھر کے کسی بیٹے کی چیخیں بھی زندان پل چرخی میں گونجی ہوں۔ خوف کا ایک لمحہ' ہچکچاہٹ کی ایک ساعت۔ دل کے رشتے کسی زندان' کسی بندی خانے کو نہیں جانتے۔

میں اپنی فنجان پر ایک نظر ڈالتی ہوں جو خالی ہو چکی ہے اور جس کی تہ میں چائے کی چند پتیاں رہ گئی ہیں۔ کسی پیالی کی تہ میں رہ جانے والی پتیوں سے کیا واقعی تقدیر پڑھی جا سکتی ہے؟

اور میں اس شخص کے خاندان کے بارے میں سوال کر دیتی ہوں جو پشتو دانش و ادب کی آبرو تھا' جس کے نام کے بغیر پشتو ادب اور افغان دانش کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا' جس نے اپنی زندگی کے سنہرے سال جلاوطنی میں گزارے۔ دانش گاہ پنجاب کی مرتب کردہ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں جس کی تحریریں شامل ہیں۔ جس کے گھر کا عشق آج بھی دل میں پہلے دن کی طرح راسخ ہے' ایک ایسا گھر جس کے کسی بھی فرد کو میں نے ۲۸ برس سے نہیں دیکھا۔

نجیب کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی ہوئی ہیں "یہ سوال شاید آپ نے کسی اور سے بھی کیا تھا۔"

میری پیشانی پر ہلکی سی نمی پھیل جاتی ہے۔ جنرل نجیب کو اپنے مہمان کے سوالات کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے۔ خاد...... افغان سیکرٹ سروس...... زندانِ پل چرخی...... وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ امریکی جاسوسی ظلموں کے مناظر آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں۔

اب جو ہو سو ہو۔ "جی ہاں میں افسرِ مہمان داری عباس کرگر سے اور کئی دوسروں سے بھی یہی سوال کر چکی ہوں۔"

ہم دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کو تول رہی ہیں۔

ایک گہرا سانس اور پھر جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ جنرل نجیب اپنے سامنے رکھی ہوئی پنسل سے کھیلنے لگتے ہیں "آقائے عبدالحیٔ حبیبی کے خاندان میں سے اب کوئی بھی کابل میں نہیں۔"

مجھے صدر افغانستان کی بات پر اعتبار نہیں آتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بوجان نے وہ شہر چھوڑ دیا ہو جس پر وہ ہزار جان سے عاشق تھیں' جس کا نام لیتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

اور یہ بات پانچ برس بعد کراچی میریٹ میں بیٹھے ہوئے ان کے سب سے چھوٹے بیٹے خوش حال حبیبی نے بتائی کہ میرا یقین درست تھا۔ جب میں کابل میں ان کے گھر کا راستا ڈھونڈ رہی تھی' اس وقت وہ کابل میں ہی موجود تھیں' آقائے عبدالحیٔ حبیبی ختم ہو چکے تھے۔ چاروں بچے افغانستان سے باہر تھے' پُرامن زمینوں میں۔ لیکن وہ کابل میں تھیں' تنہا...... اکیلی۔ اور جب ان کے بیٹوں نے انھیں بہ جبر اپنے پاس بلانا چاہا اور وہ کسی نہ کسی طور سرحد عبور کرکے پشاور میں اپنے ایک رشتے دار کے پاس پہنچائی گئیں تو اسی رات ختم ہو گئیں اور اب پشاور کے کسی قبرستان میں سوتی ہیں۔ ان کے آخری لمحوں میں ان کی کوئی اولاد ان کے پاس نہ تھی اور انھوں نے دس برس سے کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ خوش حال حبیبی IUCN کی کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی آیا تھا اور کسی نہ کسی طرح میرا فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بوجان تم جو ستر پچھتر برس کی ایک فراق زدہ عورت تھیں' جس کی جوانی اپنی ماں' اپنے بھائیوں اور بہنوں سے اور کابل سے جدائی کے غم میں آنسو بہاتے بسر ہوئی' جس کا بڑھاپا اپنے بچوں کے فراق میں تڑپتے اور خون روتے گزرا ہوگا' تم سے اگر میں گھنٹہ گھڑی کے لیے مل لیتی تو کون سی قیامت آجاتی۔ لیکن بوجان' رموزِ مملکت خسرواں دانند اور خسرو اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتے اور شاید دنیا کی بیشتر عورتوں کے دلوں کا اپنے پیاروں اور اپنے شہروں کی جدائی سے دولخت رہنا ہی ان کا مقدر ہے۔

افغانستان کی لتامنگیشکر' نغمہ منگل کی دل دوز آواز کابل انٹرکانٹی نینٹل میں "پامیر کلب" کے در و دیوار کے بوسے لے رہی ہے۔

"کابل تو تباہ نہیں ہوا

کابل میں تیرے فراق میں بے قرار

کابل تیری گلیوں کے سامنے ساری گلیاں ہیچ

میں کہیں بھی رہوں کابل' لوٹ کر تیری گلیوں میں آؤں گی۔"

نغمہ منگل کی آواز گلوگیر ہے اور سننے والے دل گرفتہ۔ فراق رشتوں سے' جدائی شہروں سے' وہ جنھیں جنگ اور سیاست اپنے گھروں سے نوچ کر اجنبی بستیوں کی طرف اچھال دے' وہ بھلا کب لوٹ کر سمرام اور دلی اور کابل کی گلیوں میں واپس آئے ہیں۔ آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں' اک مشتِ خاک لے کے صبا نے اڑا دیا۔

○ ○ ○

ٹیلی ویژن اسکرین پر کابل کے ایک چوک میں کھمبے سے جھولتے ہوئے جنرل نجیب کا خون آلودہ چہرے اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ بکھرے بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں' شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں' پھر نکل آئے ہوس ناکوں کے رقصاں طائفے' درد مند عشق پر ٹھٹھے لگانے کے لیے...... وہ جس کے زمانے میں کابل خون میں نہیں نہایا تھا' اسی نے کابل میں اپنے لہو سے وضو کیا۔ وہ جس نے امریکیوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے' اسی کے منھ میں ڈالر ٹھونسے جا رہے ہیں۔ وحشی چہروں والے اس کے بے جان بدن کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں۔ "آدم کے قاتل بیٹے قابیل کی بسائی ہوئی بستی کسی کی حکومت تادیر برداشت نہیں کرتی۔" روحِ زمانہ کی آواز کسی پُر شور موج کی طرح آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔

میری نگاہوں میں کابل کے پریذیڈنشل پیلس کا وہ کمرہ گھوم جاتا ہے جس میں ہم نے باتیں کی تھیں' ہماری تصویریں کھنچی تھیں۔ تصویریں رہ جاتی ہیں۔ تصویروں والے دار پر کھینچ دیے جاتے ہیں۔ خاک میں ملا دیے جاتے ہیں۔

تو اب یہ سرزمین نئے آنے والوں کو کتنے دنوں برداشت کرے گی' بے گناہوں کا لہو ابھی اس سرزمین کو اور سیراب کرے گا۔ کابل میں ہر طرف طالبان کے "امن" پرچم لہرا رہے ہیں۔ وہ سفید جھنڈے جن پر خون کے دھبوں کے درمیان اب کہیں کہیں سفیدی رہ گئی ہے۔

لوگ سولیوں پر لٹکائے جا رہے ہیں۔ عورتیں اور مرد سنگسار ہو رہے ہیں۔ بوڑھوں کو ان کی داڑھیوں سے پکڑ کر لاٹھیوں اور چابکوں سے مسجدوں کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

"۱۹۲۴ء میں جہنمی امیر امان اللہ خان نے عورتوں کو گھر سے نکالا تھا۔ ہم نے اس ملعون کی اور اس کے بعد آنے والے تمام ملاحدہ کی شریعت منسوخ - عورتیں حجروں میں پیدا ہوں گی اور ان ہی میں زندگی گزار کر اپنے گھروں کے آنگنوں میں دفن کر دی جائیں گی۔ علم انھیں گم راہ کرتا ہے' بے باک و گستاخ کرتا ہے اور مردوں کے لیے بھی یہ ہم طے کریں گے کہ وہ کیا پڑھیں گے اور کیا نہیں پڑھیں گے۔ ہم خود علم کا خزینہ' علم کا دفینہ ہیں۔ یہ فرنگی اور شوروی ہمیں علم کیا سکھائیں گے؟"

جلا دو' جلا دو کتابوں کو جلا دو۔ گرا دو' گرا دو تہذیب افرنگ کی ہر نشانی گرا دو۔ کھرچ دو' کھرچ دو' ہر تصویر کو' ہر تحریر کو کھرچ دو۔ کچل دو' کچل دو ہر ساز کو' ہر آواز کو کچل دو۔ موسیقی حرام ہے اور مصوری شرک' ٹیلی ویژن شیطان کا چرخہ۔ گھر گھر بت کدے ہیں۔ اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں' مجھے ہے حکم اذاں لاالٰہ الااللہ

"یا امیر المومنین ملا عمر۔ اسلحہ امریکی ہے' گولہ بارود بھی افرنگی ہے؟"

"ان گستاخوں کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ انھیں پل چرخی کے زندان میں بند کیا جائے۔ ہم کفار کو تہس نہس کرنے آئے ہیں اور ہمیں اسلحہ چاہیے خواہ وہ افرنگی ہو یا امریکی۔"

"یا امیر المومنین لیکن مولوی ربانی اور احمد شاہ بھی کلمہ گو ہیں۔"

"وہ دشمنانِ دین، دشمنانِ اسلام ہیں۔ ہم اسی کی جاں بخشی کریں گے جو ہماری سربراہی تسلیم کرے۔"

اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟ ایک اور موجِ خوں کابل کے سر سے گزر رہی ہے۔

دنیا بھر میں سوالوں کا ایک ہجوم ہے "یہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کون ہے ان کے پیچھے؟"

"یہ میرے بچے ہیں..... my disciples۔ ہمارے مدرسوں کے پالے ہوئے، ہماری تربیت گاہوں کے نکالے ہوئے۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے۔ نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر۔ ہم نے طالبان کی شکل میں اللہ کی فوج بنائی ہے۔ اللہ کی فوج۔"

"لیکن جرنل صاحب خادمین حرمین شریفین نے تو خلیج کی جنگ میں امریکی اور افرنگی فوج بلائی تھی۔"

"کون ہے یہ غدار؟ یہود و ہنود کا ایجنٹ؟"

"حضور ہمارے یہاں حب وطن کا غیظ، کب تک صرف حاضر اور سابق جرنیل بھرتے رہیں گے؟"

سفاک چہرے والا ایک قابوچی چھڑی بغل میں دبائے ہوئے ٹہل رہا ہے۔ خاکی لباس، شانوں پر ستارے جھلملا رہے ہیں۔ آواز کہیں دور سے آتی ہے...... ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں۔ ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں۔ سفاک چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ۔ "شاعر ہمیں خراج دیتے ہیں۔ لفظوں کا خراج اور یہ ملعون، یہ بدبخت۔ کندی تالے لگے یہ کیڑے۔ یہ اخبار نویس ہم سے سوال کرتے ہیں۔ ہم سے......؟" پادشاہ ہندوستان محمد ظہیر الدین بابر کا ہم نام اپنے دانت پیستا ہے۔

"بابر...... بابر...... !" کراچی کے کسی عقوبت خانے میں اذیتیں سہتا ہوا کوئی نوجوان چیختا ہے۔

اور اچانک وہ نمودار ہو جاتا ہے، وہ جو آریانا افغان کے طیارے کے پنکھ پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور پھر کابل انٹرکانٹی نینٹل میں آن پہنچا تھا۔ کمر میں تلوار ہے اور ہاتھ میں تزک۔ قبا کا دامن ہوا سے لہرا رہا ہے۔

"کسی نے مجھے پکارا؟" ترچھی ترک آنکھیں مجھے غور سے دیکھتی ہیں۔

"نہیں...... تمھیں نہیں، تمھارے کیری کیچر کو......" میں خاکی وردی والے کی طرف اشارہ کرتی ہوں جو ٹیلی ویژن اسکرین پر کف در دہن ہے۔ "طالبان، مسلم امہ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مسلم امہ کی جنگ۔"

"یہ......؟ اشت...... میرے زمانے میں ہوتا تو اسے سپاہی بھی بھرتی نہ کرتا۔ تاریخ میں منادی کر دی جائے...... ہاں تاریخ میں منادی کر دی جائے کہ من کہ محمد ظہیر الدین بابر میں نے کبھی اپنے لوگوں پر ستم نہیں توڑے۔ میں نے کبھی اپنے شہر نہیں اجاڑے، اپنے ہی لوگوں کے قاتلوں اور اپنے ہی شہروں کو اجاڑنے والے بابروں سے میرے خاندان کا کوئی علاقہ نہیں۔ ہمارے یہاں ممتاز محل تھی جس نے ایک بیٹا غلط جنا تھا اور اس کی قیمت ہمارے خاندان نے رائیگاں ہو کر اور بے نام و نشاں ہو کر ادا کی۔"

ٹیلی ویژن اسکرین پر اب مس ورلڈ ایشوریا رائے اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔ ایسان دولت بیگم کا نواسہ اور نگار خانم مغل صدر بیگم کا بیٹا بابر، بیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست گنگناتا ہوا اس طرف متوجہ

ہے۔

کہ عالم دوبارہ نیست...... کہ عالم دوبارہ نیست...... مس ورلڈ اپنی جھلک دکھا کر غروب ہو جاتی ہیں۔ پان پراگ کا اشتہار۔

بابر کی آنکھوں میں گزرے ہوئے دنوں کی دھند...... "بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را...... اسے دیکھ کر مجھے اپنی عم زاد معصومہ سلطان کی یاد آئی۔ در شہوار' دُر آبدار تھی۔ میری منکوحہ' میری محبوبہ' ہرات میں دیکھا تھا اسے اور دل ہار بیٹھا تھا۔ زندگی نے اس سے وفا نہ کی۔" وہ ایک آہ بھرتا ہے۔

اشتہاروں کے بعد ٹیلی ویژن پر "زی نیوز" کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا ہے۔ اسکرین دراز داڑھیوں اور سفاک چہروں سے بھرا ہوا ہے۔ تسبیح کے دانے شمار کرنے والی انگلیاں گولے اور میزائل داغ رہی ہیں۔ توپوں کی نالیں شعلے اگل رہی ہیں۔ الجہاد...... الجہاد...... الامان...... الامان...... الامان...... لوگ بھاگ رہے ہیں۔ گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے' گردنوں میں دربدری کے طوق لٹکے ہوئے' آنکھوں میں ویرانیوں اور وحشتوں کے الاؤ جلتے ہوئے' شہر اور دیہات' کھیت اور باغات' بارودی سرنگوں سے اٹے ہوئے' پٹے ہوئے۔ ہماری عظیم طاقتوں کی ایجاد جس کی کہیں داد ہے نہ فریاد۔ بچے باپوں سے محروم' ماؤں سے بچھڑے ہوئے۔ کسی کا ہاتھ ندارد۔ کسی کی ٹانگیں اڑی ہوئی۔ میری نگاہوں میں اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ' کابل کے وہ وارڈ گھوم جاتے ہیں جہاں میں نے سینکڑوں معذور بچوں کو دیکھا تھا' جو لینڈ مائنز اور بلاسٹڈ راکٹوں کا شکار ہوئے۔ سوراخ دار ہڈیاں' کھوپڑیاں پھٹی ہوئی' کسی کے دونوں ہاتھ' کسی کے دونوں پیر کٹے ہوئے۔ یہ جوئے خوں ہے۔ یہ جوئے خوں ہے۔ چار برس سے ادھر اور ادھر دونوں طرف دعویٰ نفاذِ اسلام کا۔ دونوں اپنے مقتولین کو شہید کہنے پر مصر۔ دونوں ایک دوسرے کے مقتولین کو جہنم واصل کرنے کی لذت سے سرشار۔ قاتل بھی کلمہ گو مقتول بھی۔ دونوں کے صنم خاکی' دونوں کے صنم فانی...... اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

ہم سے کہا گیا تھا کہ "سبق پھر پڑھ صداقت کا' عدالت کا' شجاعت کا۔ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا۔ ...... تو اب ہم ہی امام...... ہم ہی امیرالمومنین۔ تم جب تک ہمیں تسلیم نہیں کرتے' ہماری تعظیم نہیں کرتے۔ جنگ جاری ہے۔ جنگ جاری رہے گی۔ کشتوں کے پشتے لگتے رہیں گے' شہر جلتے رہیں گے' انسان کٹتے رہیں گے۔ الجہاد...... الجہاد۔"

"کیسا جہاد؟ کہاں کا جہاد؟ محض فریب نفس' خواہش اقتدار۔" روح زمانہ' محمد ظہیرالدین بابر کے وجود میں بل کھاتی ہے۔ "سعدی شیرازی نے کہا تھا۔ "دہ درویش در گلیمے بہ خسپند و دو پادشاہ در اقلیمے نہ گنجند۔" سعدی کے کہنے کے مطابق دس درویش تو ایک کمبل پر سو سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک مملکت میں سانس نہیں لے سکتے۔ تو یہ کیسے درویش ہیں جنھیں اپنے سوا کوئی دوسرا گوارا نہیں۔"

روح زمانہ کف در دہن ہے اور کھلی ہوئی کھڑکیوں سے آتی ہوئی تیز سمندری ہوا میں تزک بابری کے ورق پھڑپھڑا رہے ہیں۔

اسکرین پر سے تصویریں جو پل بھر کے لیے غائب ہو گئیں تھیں' پھر ابھر آئیں۔

منادی ہو رہی ہے۔ گلی گلی گھر گھر۔ "عورتیں گھروں میں رہیں گی۔ سڑک پر ان کا سایہ نظر نہ آئے۔ قدم باہر نکالنے والیوں کو شرعی سزائیں دی جائیں گی۔ عورتوں پر شیطان کا سایہ ہے سو انھیں گھروں میں رکھو۔ کسی اخبار میں ان کی تصویر نہ چھپے۔ کسی سکول یا مدرسے کی طرف ان کے قدم نہ اٹھیں۔ ٹانگیں توڑ دی جائیں گی' پیر کاٹ دیے جائیں گے۔ بیواؤں کے گھروں میں فاقے ہوا کریں۔ بے باپ کے بچے لاچار ماؤں کی گودوں میں بھوکوں مریں۔ نفاذ شریعہ فاقے اور بھوک اور موت پر مقدم ہے۔"

محمد ظہیرالدین بابر جو ایک دیوان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے' آہِ سرد بھرتا ہے۔ "ان سے اچھے تو ہم تھے جو سربلندی اسلام کے لیے نہیں اپنی امارت و بادشاہت کے لیے لڑتے تھے۔ میں نے جو ابراہیم لودھی سے ہندوستان کی سلطنت چھینی تو کون سی خدمتِ اسلام کی؟ ہاں جب کفار کے ممالک فتح کرتے تو کچھ فایدہ دینِ مبین کا بھی ہو جاتا۔ ہم نمازیں ادا کرتے' مسجدیں بناتے' شراب پیتے اور اپنے اردو میں اکثر اپنی ماؤں اور بیویوں کو ساتھ رکھتے تھے۔ میری شیر دل نانی ایسان دولت بیگم' میرے تن آسان باپ کے محل اور ملک کا سارا انتظام' میری منتظم ماں نگار خانم المعروف بہ مغل صدر بیگم اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی' لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور شعرا کے کلام سے لطف اندوز ہوتی۔ میری بہن خانزادہ بیگم' میری سوتیلی نانی شاہ بیگم' میری سوتیلی خالہ مہر نگار چغتائی' میری افغان بی بی مبارکہ بیگم' ماہم خانم .... سبحان اللہ کیا عورتیں تھیں۔ میدان میں ہوتیں تو گھوڑوں پر سواری کرتیں' قیامت کی تیر انداز' تلوار چلاتیں' جانوروں کو اور وقت پڑے تو دشمنوں کو شکار کرتیں۔ خیموں میں ہماری ناز برداری کرتیں' شعر خوانی میں حصہ لیتیں' داستاں سرائی کرتیں' کتابیں لکھتیں' میری بیٹی گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" لکھا جس کی دھوم سارے جہاں میں ہے' میری پوت بہو نور جہاں بانو بیگم نے سارے ہندوستان پر فرمانروائی کی۔ ٹکسال میں اس کے نام کا سکہ ضرب ہوا' میری سگڑ پوتی زیب النسا مخفی' صاحبِ دیوان ہوئی۔ یہ عورتیں جن کا خمیر سمرقند و بخارا سے' بلخ و بامیان سے اور کابل و قندھار سے اٹھا تھا اور جو صدیوں پہلے گزر گئیں کیسے کیسے کام کر گئیں اور یہ بدبخت جنھوں نے کابل پر یلغار کی' اس کی عورتوں کو زندہ در گور کیے دیتے ہیں۔"

ٹک ٹک سے درست کسی وومن ایکٹوسٹ کی تقریر۔

"میں جا رہا ہوں۔" وہ یکایک کھڑا ہو جاتا ہے۔

"اب کہاں کا سفر درپیش ہے؟"

"میں ہندوستان کا بادشاہ! آگرے میں امانتاً" دفن ہوا اور جب میرا فرزند اپنے دشمن شیر خاں سور کے ہاتھوں دربدر تھا تب میری بیگم بی بی مبارکہ نے آگرہ آکر شیر خان سے مطالبہ کیا کہ وہ میری باقیات بہ حفاظت بہ راستا درہ خیبر کابل لے جانے کے انتظامات کرے۔ شیر خان نے اپنے دشمن کے باپ کی باقیات کو تکریم و احترام کے ساتھ ہندوستان روانہ کیا اور میں نے بالا حصار کی بلندیوں پر کابل کی خاک میں آرام

گیا۔ میرے گھر کو "رحلت گاہ بابر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میں وہیں رہتا ہوں اور وہیں جا رہا ہوں۔ وہ کابل جو شوروی افواج کی موجودگی میں محفوظ رہا تھا' نجیب کی عمل داری میں جس کی سڑکیں اور بازار آباد تھے' زندہ تھے۔ وہی کابل ان کے ہاتھوں لوٹا گیا اور لٹ گیا جو ہاتھوں پر قرآن اٹھائے ہوئے اس میں داخل ہوئے تھے۔ میری ہڈیاں اس کی خاک میں آسودہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ میری رحلت گاہ کے مرمریں ستون گولیوں سے چھلنی ہوئے اور لوحِ مزار چھل گئی لیکن وہ ہے تو میری آرام گاہ...... میں وہاں نہیں تو اور کہاں جاؤں گا۔ وہ ایک آہ بھرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پہاڑوں کے پیالے میں ہوسِ اقتدار کے چقماق سے چنگاریاں گر رہی ہیں اور کابل جل رہا ہے۔ پشتون' ازبک اور تاجیک' ہزارہ دھگان اور بنجارے' عورتیں' بچے اور مرد اس آگ کا ایندھن۔

بامیان میں نصب بدھ کا بلند ترین بت لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اتر آیا ہے۔ ساٹھ گز اونچا یہ بت زمین پر جھکا ہوا اپنی آنکھیں ڈھونڈتا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی کے جوشیلے مجاہدین اسلام اپنے خنجروں سے اس کی آنکھیں نکال چکے' ان کے پیش قبض اس کا چہرہ کھرچ چکے۔

بامیان کا بدھ اپنے محبوب ترین چیلوں ساری پت اور موگلان کو آوازیں دے رہا ہے۔

"موگلان! یہ کیسا ہون ہے جس میں انسان جل رہے ہیں۔"

جواب نہیں آتا۔

"ساری پت! میں نے تو جانوروں کی بگیہ نہیں ہونے دی تھی۔ یہ کون ہیں جو اپنے بھائی بھتیجوں اور بیٹوں' اپنی ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کی بگیہ کرتے ہیں۔"

اس بار بھی جواب نہیں آتا۔

ساری پت اور موگلان شاید پیدائش کے دائرے میں پھنسے ہوئے ہیں اور نروان نہیں پا سکے ہیں۔ تب ہی کوئی جواب نہیں آتا اور بدھ کی آواز پر اس مسجد کے مؤذن کی آواز غالب آجاتی ہے جس کے مینار امتِ مسلمہ کی سربلندی کے نام پر ہونے والی جنگ میں مسمار ہو چکے اور جس کی دیواروں کو مسلم اُمّہ کے اتحاد کی خاطر بلا تنذ راکٹوں کی چاند ماری سے چھلنی کیا گیا۔ لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں' کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی۔

بدھ کی ڈوبتی ہوئی اور مؤذن کی ابھرتی ہوئی آواز کو ایک اسٹنگر میزائل کا دھماکا ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ تمجید کرو' تمجید کرو اس ربِ ذوالجلال کی جس نے توفیق دی ہمیں اپنوں سے لڑنے کی۔ تسبیح کرو ...... تسبیح کرو اس خداوند کی جس نے دلوں کو موم کیا صلیب کے فرزندوں کے اور ہمارے جہاد کے لیے ان کے اسلحہ اور ڈالروں کی فراوانی کی۔

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پہاڑوں کے پیالے میں انسان جل رہے ہیں' بستیاں پگھل رہی ہیں۔ نغمہ منگل کی آواز نوحہ کر رہی ہے۔ کابل تو تباہ نہیں ہوا۔ میں کہیں بھی رہوں کابل' لوٹ کر تیرے

گلیوں میں آؤں گی۔

ہو جان تم پشاور کے کسی قبرستان کی گم نام قبر ہی میں دفن رہو گی۔ تمھارے لیے کوئی بی بی مبارکہ نہیں آئے گی جو تمھاری ہڈیاں کابل لے جائے اور اسے وہاں کی زمین میں دفن کرے۔ خاموش ہو جاؤ نغمہ منگل۔ تمھیں بھی معلوم ہے اور ہمیں بھی کہ کابل تباہ ہو گیا ہے اور اس کے لاکھوں عشاق اب کبھی لوٹ کر اس کی گلیوں کو نہ جا سکیں گے۔

○ ○ ○

شور سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ گلی میں شاید بہت سے بچے آوازیں لگا رہے ہیں۔ ان کی آوازیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں سر کو جھٹکتی ہوں اور اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوں۔ بچوں کا ایک ہجوم ہے جو گلی سے گزر رہا ہے' آوازیں لگاتا ہوا۔

"ہڈیاں لے لو اور نان دو........ نان دے دو اور ہڈیاں لے لو۔"

ان کے شانے بڑی بڑی بوریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے ہیں۔

میں حیران و پریشان انھیں دیکھتی رہتی ہوں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں' کس سے کہہ رہے ہیں' نان کے عوض کیا بیچ رہے ہیں۔ اور پھر میری نگاہ اس پر پڑتی ہے۔ پہلی نظر میں وہ مجھ سے پہچانا نہیں جاتا۔ پگڑی کے پیچ کھلے ہوئے اور وہ گردن میں جھولتی ہوئی' چہرہ خاک سے اٹا ہوا...... کمر سے بندھی ہوئی تلوار کا نام و نشاں نہیں' بغل میں دبی ادبی کتاب بھی غائب...... اس کے کندھے پر ایک بوری دھری ہے۔

میری آواز سن کر وہ رک جاتا ہے۔ کندھے سے بوری اتار کر زمین پر دھرتا ہے اور مجھے دیکھتا ہے۔

"میں تھک گیا........ ہندوستان کی بادشاہی اتنی مشکل نہ تھی۔" اس کی آواز میں صدیوں کی تھکن ہے۔ ایک ٹوٹے ہوئے شخص کی آواز۔

"یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو اور یہ بچے کہاں سے ساتھ لے آئے ہو؟" میں ان بچوں کی طرف اشارہ کرتی ہوں' وہ بھی اس کے رکتے ہی ٹھہر گئے ہیں۔ حلقۂ چشم میں دھنسی ہوئی آنکھیں' پھٹے ہوئے لباس سے جھانکتے ہوئے لاغر بدن' چہروں پر بھوک کی اور بیماری کی تحریر۔

"یہ میرے بچے ہیں۔ کابل کے بچے۔ ان کے لیے میں نے بادشاہی ترک کی اور یاوندہ ہوا۔"

"معموں میں کیوں بات کرتے ہو؟"

"انھیں تم معمہ کہتی ہو؟ یہ تمھیں چیستاں نظر آتے ہیں؟" غصے سے اس کی آواز کانپ رہی ہے۔ "ذرا اپنے دائیں جانب تو نظر کرو۔"

میں گردن گھما کر دیکھتی ہوں۔ دور دور تک کھلی ہوئی قبریں۔ ان میں اترتے ہوئے بچے۔ ہڈیاں چنتے ہوئے' یہ بازو کی ہڈی ہے اور یہ پنڈلی کی۔ "اور پسلی کی ہڈی کہاں گئی۔" ایک دوسرے سے پوچھتا ہے۔ بچے قطار در قطار' سینکڑوں ہزاروں کھلی ہوئی قبریں۔

"یہ سب کیا ہے؟ کیا ہے یہ سب؟" میری آواز لرز رہی ہے اور وجود کانپ رہا ہے۔ macabre۔ موت

کا رقص۔ الفریڈ ہچ کاک کی کسی فلم کا منظر۔

"یہ ...... یہ رقصِ مقابر .... لاطینی میں danse macabre .... عربی میں فتح اول و کسرِ چہارم بہ معنی قبروں کا رقص اور عبرانی میں بہ کسرِ اول و کسرِ چہارم پڑھا جائے تو قبر کھودنے والے کا رقص۔"

وہ قہقہہ لگاتا ہے۔ دیوانگی سے چھلکتا ہوا قہقہہ۔

"میرے شہر میں اناج عنقا' دوائیں ناپید' شہر بے دانہ' گھر بے دانہ۔ باپ اور بھائی جہاد کا لقمہ' مائیں اور بہنیں گھروں میں جبراً" و حکماً" قید۔ یہ بچے کہاں جائیں؟ بھوک کیسے مٹائیں؟ پہلے جانوروں کی ہڈیاں بیچتے تھے۔ جانور کھا لیے گئے' ان کی ہڈیاں بک چکیں۔ نئی ہڈیاں کہاں سے آئیں؟ بھوک نے انھیں قبرستان کا راستا دکھایا جہاں ہڈیوں کے انبار ہیں۔ ہڈیاں جو سرحد پار خریدلی جاتی ہیں' تیل' صابن اور مرغیوں کا کھاجا بنانے میں کام آتی ہیں۔ قبرستانوں سے ہڈیاں چراؤ اور تاجرانِ استخواں کے پاس لے آؤ۔ پنجریک مردِ افغان' بنجاہ (۵۰) سینت۔ ۱۷ پاکستانی روپے۔ ۷۰۰۰ افغانی' ۶ کلو آٹے کا تھیلا ۳۲۰۰ افغانی کا آتا ہے۔ سو ایک پنجر برابر ہوا ۱۳ کلو آٹے کے۔ تمھارے یہاں سے طالبان' سرزمینِ افغانستان کو برآمد کیے جاتے ہیں اور وہاں سے پنجرِ افغانان در آمد۔ نازی نسل پرست تھے' یہودیوں کی چربی سے صابن بناتے تھے' اپنی غلاظتیں صاف کرنے کے لیے۔ تم مسلم اُمّہ کے سرپرست و سرخیل' افغانیوں کے ملّی بھائی' ان کی ہڈیاں باریک پیستے ہو اپنی مرغیوں کو کھلانے کے لیے۔ تمھارا اسد اللہ خاں غالب اپنے اشعار میں انسانی ہڈیاں ہما کو کھلاتا تھا .... اللہ اللہ .... تم نے ہما کی خوراک اپنی مرغیوں کو کھلائی۔" اس کی آواز کانپ رہی ہے' غم و غصے سے' درد و اندوہ سے۔

"افغان جہاد کی کھیتی تمھارے کئی جرنیلوں نے کاٹی اور اب وہ جنیوا میں ان کے بینک اکاؤنٹوں میں محفوظ ہے جب کہ ان کابلی بچوں کے حصے میں یہ قبریں آئیں .... میں دنوں اور راتوں کو ان بچوں کے ساتھ مارا مارا پھرتا ہوں۔ قبرستان زیارتِ عاشقان و عارفان میں' گورستان شہدائے صالحین میں' ان کے ساتھ قبریں کریدتا ہوا۔ ان کا حوصلہ بڑھاتا ہوا۔ یہ بھی نازوں سے پالے گئے تھے' ان کی ماؤں نے بھی انھیں رات کو کبھی گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہیں دھرنے دیا تھا۔ قبر سے کوئی بجو نکل کر بھاگے تو یہ ڈر جاتے ہیں۔ سسکنے لگتے ہیں۔ اندھیروں میں ہڈیاں چمکیں تو خوف سے گھگھیانے لگتے ہیں .... لیکن پیٹ .... لیکن بھوک .... چناں قحط شد اندر دمشق .... کہ یاراں فراموش کردند عشق۔"

اپنی بوری سے وہ ایک کاسہ نکالتا ہے اور میری طرف اچھال دیتا ہے۔ "پہچانو اسے۔ کس کا ہے یہ؟ عباس کرگر کہ عبد اللہ شادان کا' باز محمد خان کہ میجر جنرل گل دوست کا' سلطان علی اور وزگانی کہ آقائے عبدالحی حبیبی کا۔"

میں لرزہ براندام۔ آنسو کاسۂ سر پر لگی ہوئی خاک کو دھو رہے ہیں۔ میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا۔ خشک تار و خشک چوب و خشک پوست' از کجای آید ایں آوازِ دوست۔ از کجای آید .... کابل میں دیکھے ہوئے کتنے ہی چہرے آنکھوں میں گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ کون رہا اور کون رخصت ہوا؟

"خاموش ہو جاؤ ...... ازبرائے خدا! خاموش ہو جاؤ۔" میں اپنے دونوں کان اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیتی ہوں۔

روحِ زمانہ کی نگاہیں مجھے حقارت سے دیکھتی ہیں' پھر اس کے ہاتھ بوری اٹھا کر شانے پر دھر لیتے ہیں۔ اس کے قدم آگے کی طرف اٹھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی سارے بچے چل پڑتے ہیں۔

"ہڈیاں لے لو۔ ہڈیاں لے لو۔ ازبک اور پشتون ہڈیاں' تاجیک اور ترکمان ہڈیاں' ہزارہ اور بنجارہ ہڈیاں۔ کے بنجر افغان' بنجاہ سینت' بنجاہ سینت۔"

رقصِ مقابر...... قبر کھودنے والوں کا رقص........

☆ ☆ ☆

نذرالحسن صدیقی

آفتابِ تازہ

چھتناور درختوں کے جھنڈ میں چھپی اور خود رو جنگلی بیلوں سے ڈھکی اس شکستہ محراب کے قریب جب ہم پہنچے تو وہ قدرے ٹھٹکا سا اور مجھ سے تعجب سے پوچھا۔

"تو کیا تم اس کو بنانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"مگر آخر اب کیوں؟ عمارت تو تعمیر ہوئے میرے خیال میں عرصہ گزر گیا۔"

"ہاں ایک مدت گزر گئی' بہت سال بیت گئے۔" میں نے اپنی پشت پر ایکڑوں پر پھیلی جدید تعمیر کی شاہکار جگمگاتی عمارت پر پیچھے مڑ کر ایک نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر اتنی مدت بعد تمھیں یہ خیال کیوں آیا ہے؟" اور پھر عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس عمارت کی تعمیر کے وقت کیا تمھارا دھیان محراب کی طرف نہیں گیا تھا۔"

"ہاں بس یہ ہی سمجھ لو' اس وقت تھا بھی تو سب کچھ کھنڈر ہی کھنڈر' لمبے چوڑے جیسے پورے ایک قلعے کے کھنڈرات یاں سے واں تک پھیلے ہوئے۔"

"مگر یہ تو اب بھی کھنڈر ہی ہے' شکستہ بوسیدہ جیسے اب گری تب گری!!"

"ہاں ٹھیک ہی کہتے ہو تم!"

"دیکھو نا' میرے خیال میں تو دو چار اینٹیں روزانہ ہی کھس کر گر جاتی ہیں۔" اس نے محراب کے نیچے پڑی ٹوٹی پھوٹی لکھوری اینٹوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' پھر ایک لحظہ توقف کیا اور بولا۔

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس وقت اس کی تعمیر کی کون سی تک ہے' یہ تو اب ویسے بھی عمارت کا حصہ نہیں معلوم دیتی!"

میں نے شکستہ محراب اور عمارت کو ایک نظر دیکھا اور سوچا کہ صحیح تو کہہ رہا ہے۔

"مگر پہلے تو ایسا نہیں تھا' اس وقت تو یہ لمبے چوڑے کھنڈرات کا ہی ایک حصہ تھی' نہ معلوم میرا دھیان پھر کیوں اس طرف نہیں گیا' بتا نہیں سکتا' سمجھ میں نہیں آتا...... اوں' آں۔"

تب اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"تو پھر اب کیوں؟"

اور پیشتر اس کے کہ میں اس کیوں کا جواب دوں پہلے تو میری اور پھر اس کی بھی دونوں کی توجہ ایک تیز سنسناہٹ کی طرف گئی' جیسے کالی آندھی کا ایک تیز جھونکا ہمارے سامنے سے گزر گیا' یہ ابابیلیں تھیں جو فضا میں پرواز کرتی ہوئی آتیں غوطہ لگاتیں اور پھر محراب کی ڈاٹ کے نیچے سے دوسری طرف نکل جاتیں اور پھر اسی عمل کی تکرار ہوتی۔ دوسرے چڑیوں کی چہچہاہٹ اور پرندوں کے شور نے بھی جو درختوں کے اس جھنڈ پر بسیرے کے لیے جمع ہو رہے تھے ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ ان آوازوں سے ابابیلوں کی پرواز سے گفتگو میں منہمک ہم دونوں کو وقت کے بدلنے کا احساس ہوا۔ آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی شام کا سرمئی سرمئی دھندلکا اطراف میں پھیلنے لگا تھا۔ مگر چند ہی ثانیے میں آسمان سے زمین تک گلال افشاں سی پھیل گئی۔ مغربی افق میں شفق پھوٹی اور اس شد ومد سے پھوٹی کہ کچھ دیر کے لیے تمام کی تمام فضا ہی لال لال ہوگئی' جیسے اجالے نے دم آخر بھڑک کر اندھیرے پر غالب آنے کی کوشش کی اور چند منٹ کی اس پھیلتی سرخی میں سرمئی دھندلکے میں گم ہوتی ہر چیز واضح ہوگئی۔ محراب کی ایک ایک شکستہ نیم شکستہ' ٹوٹی بوسیدہ اینٹ اس سرخی سے دمک اٹھی۔ ماحول اور فضا کچھ اس سرعت سے بدلے کہ ہم دونوں کے ذہن شاید اس کی بے پناہ گرفت میں آگئے۔ مگر چند ہی لمحوں میں بھڑکتی ہوئی شفق کو اندھیرا ہڑپ کر گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کے دھندلے دھندلے وجود کو دیکھا' ایک ساتھ مڑے اور آہستہ خرامی کے ساتھ روشنیوں میں نہائی عمارت کی طرف خاموشی سے چلنے لگے۔ چند قدم چل کر نہ معلوم کیوں ہم دونوں نے گردن نے موڑ کر محراب کی طرف دیکھا جو اب تقریباً" اندھیرے میں گم ہو چکی تھی۔ محراب اور عمارت کے درمیانی فاصلے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا' وہ چلتے چلتے یکایک رکا اور بڑبڑایا۔

"عجیب بات ہے!"

"کیا؟" اس کی بڑبڑاہٹ سن کر میں نے سوال کیا۔

"یہی کہ تمہاری اس کوٹھی کی روشنیاں اس حصے کو کیوں روشن نہیں کر رہیں' کوٹھی سے لے کر محراب تک ذرا غور تو کرو.....!"

اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرے روشنیوں سے جگمگاتی کوٹھی سے لے کر اپنے اور اس کے قدموں تک اور پھر آگے محراب تک نظر کی کمندیں پھینکیں تو محسوس ہوا کہ وہ واقعی صحیح کہہ رہا ہے' میری نگاہوں کا سفر اندھیرے ہی میں طے ہوا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہی کہتے ہو۔" میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں' کیا یہ عجیب سی اور حیرت کی بات نہیں!"

"کیا بتا سکتا ہوں' یہ تو کوئی ماہر انجینئر بتا سکتا ہے' شاید روشنیوں کا زاویہ کچھ ایسا ہو' یا نہ معلوم کیوں؟ میں نے خود پہلے کبھی محسوس بھی نہیں کیا!"

اور پھر ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے' شاید ہم دونوں کے ذہنوں میں اسی سوال نے تسلط جمالیا تھا!..... پھر کوٹھی کے اندر اندر کا بقیہ سفر خاموشی ہی سے طے ہوا تھا۔ نشست گاہ میں پہنچ کر جب ہم اطمینان سے بیٹھ

گئے تو ایک بار پھر اس ہی نے مہر خاموشی کو توڑا۔
"تم نے اسے خریدا کس سے تھا' کیا انھوں نے بھی کبھی اس محراب کی طرف تمھاری توجہ نہیں دلائی تھی......؟"
"نہیں......... مگر اصلی مالک سے تو میرا کبھی ملنا ہی نہیں ہوا......."
"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں......."
"ارے بھئی وہ اصلی مالک تو ملک سے باہر تھے........"
"تو پھر کھنڈرات تم نے کس سے خریدے تھے اور کس طرح....؟"
"ان کے اٹارنی شیخ فریدالدین سے معاملہ ہوا تھا جو ان کے عزیز بھی تھے' جاگیر اور جائیداد وغیرہ کی دیکھ بھال سب کچھ ان ہی کے سپرد تھی' ایک مدت سے سب کچھ وہی کر رہے تھے۔"
"تو مالک کون صاحب تھے اور کب سے یہاں نہیں.......؟"
"معلوم نہیں میں تو کبھی ان سے ملا ہی نہیں' ان کے متعلق اور ان کے خاندانی حالات سب کچھ ان کے اٹارنی ہی سے پتا چلے تھے' صدیوں سے ان کا خاندان یہاں آباد چلا آرہا تھا۔"
"اچھا کب سے......؟"
"جب سے' جب پہلی مرتبہ صدائے اللہ اکبر اس صحرا میں گونجی......."
"اچھا!"
"ہاں ان کا سلسلہ نسب "مولانا اسلامی" سے ملتا تھا!"
"کس سے؟"
"مولانا اسلامی سے۔"
"میں سمجھا نہیں'...... ایں...... ان کا نام کیا تھا' کون تھے یہ.....؟"
"نام'........ بس یہ ہی نام سمجھ لو....."
"ارے بھئی بڑے نامی گرامی تاریخی شخصیت تھے مولانا اسلامی' اسی نام سے پکارے جاتے تھے۔"
"تاریخی سے کیا مراد ہے؟"
"وہ فاتح سندھ محمد بن قاسم کے ساتھیوں میں تھے......."
"عرب تھے؟"
"نہیں' یہیں کے سندھ کے باشندے نو مسلم۔ ان معدودے چند خوش نصیبوں میں سے جنھیں خداوند رحمان نے اس سرزمین پر اولیں مسلمان ہونے کی سعادت عطا کی اور وہ جرأت ایمانی بخشی کہ اللہ اللہ' رزم ہو یا بزم دونوں میں یکساں جوش ایمانی کا مظاہرہ۔ رزم حق و باطل ہو تو دست و بازو سے لے کر پورے وجود پر ایک سچے مومن کے شایان شان پر جبروت قہاری طاری اور بزم میں دم گفتار گو نرم' تاہم ریشم کی طرح سرسراتے باتوں کے لچھوں میں دو دھاری شمشیر کی کاٹ اور تیور ستی ہوئی تلوار والے' شاید مولانا

کی انھیں مومنانہ شان و صفات سے متاثر ہو کر سالار اعظم محمد بن قاسم نے انھیں راجا داہر کے پاس اپنے سفارتی وفد میں شامل کر کے بھیجا تھا......"

"اچھا......!"

"ہاں اور جب مولانا راجا کے دربار میں پہنچے تھے تو آپ کے اور راجہ کے درمیان وہ مشہور مکالمہ ہوا تھا جس کی گونج اب تک تاریخ کے صفحات میں سنائی پڑتی ہے۔"

"بھئی میری تاریخی معلومات بہت سطحی ہیں۔"

"پہلے میرا بھی یہی حال تھا' مگر جب سے یہ کھنڈرات خریدے نہ معلوم کیوں خود بہ خود دلچسپی پیدا ہو گئی' سو طبیعت اپنی تاریخ کے مطالعے کی طرف بھی مائل ہوئی۔"

"ہاں تم مکالمے کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے......"

"ہاں ہاں' راجا داہر تو مولانا اسلامی کو خوب جانتا تھا' وہ ایمان لانے سے پہلے دیبل کے ایک معزز ہندو خاندان کے فرد ہی جو تھے۔ جب سفارت پہنچی تو مسلمان ہونے کے ناطے مروجہ رسم و رواج کے برخلاف ان لوگوں نے دربار میں پہنچ کر سجدہ کیا اور نہ سر ہی جھکایا۔ سفارتی وفد کے دیگر اراکین سے کچھ کہنے کی تو شاید راجا نے خود میں ہمت نہ پائی کہ وہ تمام کے تمام عرب تھے' بس چلا تو مولانا پر شاید اس زعم باطل میں کہ مولانا کل تک اس کی رعایا تھے' چناں چہ ان کو مخاطب کر کے کہا۔

"تم آداب شاہی کیوں نہ بجا لائے' کیا اس کی تم کو ممانعت کر دی گئی ہے؟"

مولانا کے اندر کا تو مسلم بولا۔

"جب تک میں ہندو تھا اور آپ کی رعایا تھا شاہی آداب بجالانا میرا فرض تھا لیکن اب کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور خلیفہ کی رعایا میں سے ہوں' سمجھتا ہوں بلکہ میرا ایمان اور عقیدہ ہے کہ کسی انسان کے سامنے سر جھکانا جائز نہیں....."

راجا کہ ایسی بات سننے کا عادی نہ تھا اور کبھی کسی نے کاہے کو اس انداز میں اس سے بات کی ہوگی۔ انتہائی مایوسی میں جیسے اپنی شکست سی چھپاتے ہوئے بولا۔

"افسوس کہ تم سفیر بن کر آئے ہو' ورنہ قتل کے سوا کوئی دوسری سزا تمھاری نہ تھی۔"

اور اب ایک تو مسلم نہیں' جری اور بہادر مومن بولا۔

"میرے جیسے ایک معمولی آدمی کے قتل سے عربوں کا کوئی نقصان نہیں' مگر یاد رکھو میرے جیسے معمولی مسلمان کے خون کا معاوضہ بھی مسلمان اس طرح لیں گے کہ آپ کو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا' یہ تو تمھیں بھی معلوم ہے کہ بعد میں راجا داہر کو شکست اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی تھی' میرے کہنے کا مطلب بس یہ تھا کہ ان کھنڈرات کے مالک کا سلسلہ نسب انھیں مولانا اسلامی سے ملتا تھا ......پشت ہا پشت سے وہ یہاں آباد چلے آرہے تھے......."

"مگر یہ قلعہ' گڑھی یا حویلی جو کچھ بھی رہا ہو کھنڈر کیسے بن گیا؟"

"ارے بھئی کیسی باتیں کرتے ہو' عجیب سا سوال ہے تمہارا! میرے بھائی یہ گڑھی یا قلعہ جو کچھ بھی رہا ہو کیا چیز ہے ہر تاریخی چیز ہی کھنڈر بن گئی ہے۔ تاریخ کا پہیہ ایسے ہی گردش کرتا ہے۔ حوادث زمانہ کے ہاتھوں بڑے بڑے شہر ایسے نیست و نابود ہوتے ہیں کہ زمین میں دفن ان کے کھنڈرات بھی صدیوں بعد دریافت ہوتے ہیں اور پھر آثار قدیمہ کے محققین اور طالب علموں کا موضوع بن کر تہذیب و تمدن اور ارتقا کے مطالعے کے نہ معلوم کتنے نئے باب کھولتے ہیں۔"

"ارے یار تم تو ادق سی فلسفیانہ باتیں کرنے لگے.........!!"

"نہیں بھئی بھلا اس میں فلسفہ کہاں سے آگیا اور کون ایسی ادق بات ہے' سیدھی سی بات! تم بھی تو ایسے کتنے ہی قدیم شہر خود دیکھ چکے ہو یہ کھنڈرات بھی کسی بستی شہر کی عمارت ہی کے ہوں گے۔ شہر اور بستیاں بستی اور مٹتی رہتی ہیں اور پھر نئی بستیاں اور شہر بستے ہیں۔ تاریخ کا یہ پہیہ اسی طرح گردش کرتا ہے۔ تاریخ کا یہ عمل قوموں کے عروج و زوال کے ساتھ چلا آرہا ہے......"

ہاں صحیح کہتے ہو۔" اس نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر ہم دونوں ہی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے' وہ نہ معلوم کیا سوچ رہا تھا' مگر میرے ذہن میں ایک مرتبہ پھر نیم شکستہ محراب در آئی تھی۔ میں غیر شعوری طور پر اٹھا اور کمرے کی اس کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا جہاں سے محراب نظر آتی تھی۔ روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی' مگر محراب اندھیرے ہی میں گم تھی' واقعی عجیب سی ہی بات تھی! جیسے اندھیرے نے یکایک اس پھیلتے بڑھتے سیلاب کو ہڑپ کرلیا تھا۔ مگر میری آنکھ کی پتلی میں کمتی روشنی پھیلی اور ایسی پھیلی اور اتنی بڑھی کہ عمارت کے باہر جگمگ جگمگ کرتی تیز روشنیاں ماند پڑیں اور پھر اس کے بعد عمارت اور محراب کے درمیانی حصے میں پھیلے اندھیرے کو روشن اور منور کرتی محراب کی ایک ایک۔ شکستہ نیم شکستہ اینٹ' اس کی ہر ہر درز کو جگمگا گئی۔ پھر پوری محراب جیسے دو روشن نقطے بن کر میری آنکھوں کی پتلیوں میں سما گئی۔ میں نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں اور کئی بار ایسا کیا مگر محراب کے روشن نقطے میری پتلیوں ہی میں سمائے رہے۔ میں کھڑکی سے ایک قدم پیچھے ہٹا اور دیکھا کہ وہ میرے پیچھے ہی کھڑا تھا' مگر مجھے اس کا احساس بھی نہ تھا.....

"کیوں؟" اس نے جیسے غیر ارادی طور پر سوال کر ڈالا۔

"محراب دیکھ رہا تھا۔" میرے منہ سے بھی جیسے یکایک ہی نکلا۔

"ایں' اچھا!" وہ میرے پیچھے ہٹتے ہی کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا اور پھر بولا۔

"مگر محراب کہاں ہے؟ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا' تمہاری کوٹھی کی روشنیاں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں مگر محراب تک کا درمیانی راستا اندھیروں میں گم ہے' پھر محراب تم کہاں سے دیکھ رہے تھے؟ یار تمہارے دماغ میں تو نہ معلوم کیوں یہ محراب سما گئی ہے......"

"محراب ہی نہیں میرے دماغ میں تو اب ہمہ وقت پرانے کھنڈرات چکراتے رہتے ہیں' ایک ایک بات یاد

آتی رہتی ہے...... جیسے واقعات کا ایک ایک سین یکے بعد دیگرے دماغ کے پردے پر منعکس ہوتا رہتا ہے......"

"کیسے واقعات۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا......

"کھنڈرات کی کھدائی سے لے کر نئی عمارت کی تعمیر تک کے......"

"کیا کوئی خاص بات ہوئی تھی......؟"

"ہاں آں' کئی......

"مثلاً"......"

"کئی ایک باتیں ایسی ہوئی تھیں' کچھ عجیب سی' سمجھ میں نہ آنے والی۔"...... میں نے دیکھا اس کی تیز روشن آنکھوں میں تجسس سا ابھر آیا تھا اور یہ تجسس سے پر چمکیلی آنکھیں میرے چہرے پر سوالیہ انداز میں مرکوز تھیں چناں چہ میں نے اپنی بات جاری رکھی......

"جب کھنڈرات کی کھدائی جاری تھی' تو کام کرنے والے مزدوروں اور رات کو سونے والے چوکیداروں' کام کی نگہداشت کرنے والے نوکروں سبھی نے اس کا تذکرہ مجھ سے کیا......"

"کس بات کا تذکرہ......؟"

"آوازوں کا' عجیب سی ناقابلِ فہم......!"

"اماں یار چھوڑو بھی' کیسی باتیں کرتے ہو تم بھی۔ ویرانوں' کھنڈروں اور پرانی عمارتوں میں لوگ ایسی آوازیں سنتے اور عجیب عجیب شکلیں بھی دیکھتے ہیں' میرے یار یہ سب خوف ہوتا ہے' خوف اور ڈر بس اور کچھ نہیں! کبھی آوازیں سنواتا ہے اور کبھی شکلیں دکھلاتا ہے......"

"نہیں بھئی پہلے میں بھی یہ ہی سمجھا تھا' مگر بعد میں اپنا خیال بدلنا پڑا۔"

"کیوں؟"

"بس ایک دن وہ سب کچھ مجھ پر بھی بیتی۔"

"تم پر بھلا وہ کیسے......؟"

"جب مجھ سے ان لوگوں نے اس کا تذکرہ کیا تو میں نے سوچا کہ کچھ وقت خود بھی کھنڈرات میں گذار کر دیکھوں۔ سو ایک دن صبح سویرے ہی وہاں جا پہنچا تھا' یہ کھنڈرات تم کو شاید پہلے بھی بتلایا تھا ایک اونچے سے ٹیلے پر تھے' کافی بلندی پر' اتنی ہی بلندی پر جس پر اب یہ عمارت کھڑی ہے۔ اس کی اتنی اونچی کرسی دراصل اسی ٹیلے کی اونچائی کے باعث ہے' ہاں تو میں جب ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر پر کھڑا ہوا اور نیچے اطراف میں نظر ڈالی تو ماضی کی آوازیں' سینکڑوں آوازیں میرے ذہن اور دماغ میں بھی گونجنے لگیں' ہزاروں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں' تلواروں کی جھنکاریں......"

"ہاں آں' بعض اوقات ماحول اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے' ایسا ہی کچھ محسوس ہوتا ہے......!"

"شاید ایسا ہی ہوا ہو' تمہارا خیال ہی درست ہو' مگر اس رات ان کھنڈرات میں وہ آواز واقعی مجھے سنائی

دی جس کا ذکر مزدوروں اور کام کی نگرانی کرنے والے نوکروں نے کیا تھا' اس رات اس ویرانے میں' میں نے شب بسری کی تھی...... 'بڑا ہی انوکھا تجربہ تھا وہ بھی!......... وہ رات آج بھی میرے ذہن و دماغ میں زندہ ہے' جیسے کل کی ہی بات!........ سناٹا اور ویرانی مل کر کیسے عجیب ماحول کو جنم دیتے ہیں اور جوں جوں رات بڑھتی ہے' رات کا ہر حصہ کیسے اپنا مخصوص تاثر چھوڑتا ہے؟ یہ سب اسی شب مجھے معلوم ہوا تھا۔ وہ تیرہویں کی شب تھی' شروع رات ہی میں چاندنی نے پسارے لیا تھا' آسمان سے زمین تک تمام فضا جگمگا رہی تھی۔ سناٹا' ویرانی' چاندنی اور لامتناہی سکوت بڑا ہی پر معنی! چاند کے روشن طباق کو میں تادیر دیکھا کیا تھا' پورا آسمان روشن ستاروں سے بھرا ہوا تھا' سب کچھ انتہائی مسحور کن تھا اور میں کافی دیر تک ماحول کی فسوں کاری میں گم رہا تھا' مگر پھر............."

"پھر کیا......؟"

"پھر' پھر آہستہ آہستہ میرا ذہن اور دماغ اس سحری گرفت سے آزاد ہو کر سوچنے لگے تھے......."

"کیا سوچ رہے تھے تم......؟"

"بس کوئی ایک بات نہیں' مختلف خیالات' مگر ذہن زیادہ تر ماضی میں بھٹک رہا تھا۔ پرانی تاریخ صدیوں پرانی جیسے نہ معلوم کون دہرا رہا تھا۔ شاید وہ سکوت سناٹا ہی اتنا پر گو تھا یا پھر کھنڈرات جیسے ماضی مجھ سے ہم کلام تھا۔ ویسے تمہارا خیال بھی صحیح ہو سکتا ہے شاید یہ سب کچھ ماحول کا اثر ہو جو ذہن پر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ خود کو بھی احساس نہیں ہوتا۔ رات گئے تک بس ایک کے بعد ایک کہانی اور اسی عالم میں غنودگی سی طاری ہوتی گئی اور پھر نیم بیدار نیم خواب کیفیت اور پھر جیسے ایک آواز نے اس نیم بیداری نیم خواب والی کیفیت کو بھی ختم کر دیا۔ آواز ہی اتنی صاف اور واضح تھی' ذہن و دماغ پوری طرح بیدار ہو گیا اور تمام تر حسیات بروئے کار.........!"

"کیسی آواز.............!"

"وہی آواز جس کا تذکرہ مزدوروں' چوکیداروں نے کئی مرتبہ کیا تھا........"

"کیسی تھی وہ آواز..........!"

"پہلے تو میں بھی سمجھنے سے قاصر رہا تھا' مگر وقفے وقفے اور تھوڑی تھوڑی دیر سے وہ آواز آتی رہی اور اتنی بار کی سماعت کے بعد اتنی واضح ہو گئی کہ الفاظ ذہن میں بیٹھ گئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی نوجوان بھاری پاٹ دار آواز والا کرب ناک انداز میں الفاظ ادا کر رہا ہے' ایک ہی الفاظ کی تکرار وقفے وقفے سے........!"

"الفاظ کیا تھے؟ تمہیں تو یاد ہوں گے........"

"ہاں آں یاد کیا بس جیسے ذہن پر نقش سے ہو کر رہ گئے' نہ معلوم کیوں؟"

"کیا الفاظ تھے بھلا.........؟"

"اضاعونی وای فتی اضاعوا لیوم کریھتہ وسد ثغر"

"ایں' یہ تو عربی الفاظ ہیں اور عربی میں جانتا سمجھتا نہیں' قرآن پاک بھی پڑھ لیتا ہوں بس........!"
"میرا بھی یہ ہی حال تھا' میں بھی صرف قرآن شریف پڑھ لیتا تھا' مگر کھنڈرات میں بار بار گونجتی آواز نے یہ الفاظ ذہن میں یوں بٹھا دیے تھے کہ وہ آواز میرے دماغ میں مسلسل گونجتی رہتی' سو تجسس ہوا اور ایک عربی سمجھنے اور جاننے والے سے رجوع کیا........"
"پھر کیا معنے بتلائے انھوں نے؟"
"انھوں نے بتایا تھا ان الفاظ کے معنے ہیں'''لوگوں نے مجھے ضایع کردیا اور کس جوان کو ضایع کیا' وہ جوان جو مصیبت کے دن کام آئے' اور سرحدوں کی مضبوطی کے لیے مناسب ہو"......."
"معنے تو سمجھ میں آگئے مگر مطلب نہیں......."
"وہ بھی سمجھ جاؤ گے......."
"کیسے؟"
"بات تاریخ جاننے سمجھنے کی ہے........"
"میں سمجھا نہیں........!!"
"اپنی تاریخ کا مطالعہ سب کچھ سمجھا دیتا ہے۔"

میری بات سن کر وہ چپ ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے بشرے پر سنجیدہ غور و فکر کی نشانیاں ابھر آئیں' تیز روشن چمکیلی آنکھیں بھی جیسے سوچ میں گم ہو گئیں' ہمہ وقت متحرک رہنے والی پتلیاں ٹھہر گئیں۔ اسے سوچ میں گم دیکھ کر میں نے ایک بار پھر کھڑکی سے جھانک کر باہر کی فضا کا جائزہ لیا۔ کوٹھی کے اطراف پھیلی روشنیوں میں تیرتی ہوئی نگاہ دور تاریکی میں ڈوبی فضا میں بھٹکنے لگی۔ رات تاریک تھی' زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز سیاہیوں میں گم تھی' دور کہیں ایک آدھ تارا اس سیاہ اور تاریک فضا میں سیاہ دھند میں لپٹے آسمان پر ٹمٹما رہا تھا۔ آسمان کے رنگ اور باہر کی فضا اور ماحول سے مجھے اندازہ ہوا کہ رات کافی بیت چکی ہے۔ گھڑی پر نظر ڈالی رات کے دوسرے پہر کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے شاید اس نے مجھے دیکھ لیا تھا' وہ اپنی سوچ سے کچھ چونکا سا مگر جیسے کچھ سوچتے ہی سوچتے پوچھا۔

"ایک بات اور سمجھ میں نہیں آئی........"
"کیا........؟"
"یہ ہی کہ کھنڈرات تم نے آخر خریدے کیوں تھے..........؟"
"ویرانے میں بہار آگئی تھی اور جنگل میں منگل شروع ہو گیا تھا۔"
"کیا مطلب......؟"
"تم شاید ادھر پہلے کبھی نہیں آئے تھے........."
"پہلے سے تمھاری کیا مراد ہے.........؟"

"یعنی جب یہ پورا علاقہ ویرانہ ہی ویرانہ تھا بس کہیں کہیں کچھ کھنڈرات تھے اور کچھ نہیں....... اب کی طرح بسا اور آباد نہ تھا........"

"نہیں جب تو میں یہاں کبھی نہیں آیا....... مگر یہ آباد کب سے ہوا اور کیسے؟"

"بہت زیادہ ایسی مدت نہیں گذری....... یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ دریا سے کاٹ کر جب نہر نکالی گئی تو بنجر زمین سیراب ہوئی اور کاشت شروع ہو گئی' صدیوں سے سوئی زمین جاگ پڑی۔ زمین کی زرخیزی دیکھ کر لوگ دوڑ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا ویرانہ کاشتہ علاقے میں بدل گیا اور پھر آبادی تو ساتھ ساتھ چلتی ہے' بستیاں اور شہر تو ایسے ہی بستے ہیں' سو یہاں بھی ایسا ہی ہوا......."

"مگر تم یہاں کیوں آبسے؟"

"میں.......! تمھیں معلوم نہیں' سب کچھ تو جانتے ہو تم' یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ کاشت سے متعلق میرا کوئی تجربہ کبھی نہ تھا اور نہ اس میدان میں قدم رکھنے کا کوئی ارادہ ہی۔ صنعت و تجارت توریث میں ملی تھی' برسا برس سے یہ ہی خاندانی کاروبار چلا آرہا تھا۔ ایک صنعتی یونٹ بناسپتی گھی کا بھی تھا۔ مگر جیسا کہ تمھارے بھی علم میں ہے پچھلے کئی برسوں سے بناسپتی گھی کی بجائے مختلف اقسام کے تیل کی مانگ میں زیادہ اضافہ ہو گیا ہے' سو بناسپتی گھی کے ساتھ خوردنی تیل بھی بنانا شروع کر دیا۔ بات لمبی ہو جائے گی اور شاید تم بور بھی......... مختصراً" یہ سمجھ لو کہ سورج مکھی سے بنے ہوئے تیل کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر سوچا کہ کیوں نہ خود ہی سورج مکھی کی کاشت شروع کی جائے۔ منصوبہ ماہرین کی رائے میں سود مند اور فائدہ مند تھا' چناں چہ علاقہ کی تلاش شروع ہوئی اور یہ علاقہ اس زمانے میں نیا نیا زیر کاشت آیا تھا' یہاں گو کہ جدید خطوط پر فارمنگ شروع ہوئی تھی پھر بھی میلوں زمین غیر آباد تھی' اچھا موقع تھا سو کاشت کے میدان میں بھی قسمت آزمائی کر ڈالی اور یہ تو تم جانتے ہو کہ میں کسی بھی کام میں ہاتھ بڑے سوچ بچار بلکہ موضوع پر اگر مواد مل جائے تو اچھی طرح پڑھ پڑھا کر ڈالتا ہوں........."

"اچھا تو سورج مکھی کی کاشت پر بھی کافی پڑھ پڑھا لیا ہو گا۔"

"ہاں یہ ضروری تھا' آج کل فارمنگ اور کاشت ہر چیز ہی سائنٹیفک بنیادوں پر ہوتی ہے۔"

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وہ میری باتوں سے کچھ اکتا سا رہا ہے' سوچا کہ موضوع بدل دوں مگر پھر کچھ گھٹن کا سا احساس ہوا' کھڑکیوں کی طرف بڑھا۔ صرف وہ ایک کھڑکی جس سے ہم کچھ دیر پیشتر محراب کو دیکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے' کھلی ہوئی تھی' میں نے بقیہ کھڑکیاں بھی کھولنا شروع کر دیں اور دیکھا کہ وہ بھی اسی کام میں مشغول ہے' سوچا شاید اسے بھی گھٹن کا احساس ہوا ہے۔ کھڑکیاں جیسے ہی کھلیں پورا کمرہ خوش گوار ہوا سے بھر گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ نتھنے سکوڑ کر جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"کیوں کیا سونگھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ عجیب سی خوش بو ہے ہوا اور فضا میں' کیوں کیا تمھیں محسوس نہیں ہو رہی؟"

"ہاں آں صحیح کہتے ہو۔" میں نے فضا میں رچی بسی اور ہوا کے دوش پر سفر کرتی مانوس خوشبو کو پہچانتے

ہوئے کہا۔
"کاہے کی خوشبو ہے یہ؟"
"یوکلپٹس۔"
"کیا؟"
"یوکلپٹس یعنی سفیدے کی!"
"کیا یہاں اس کا جنگل ہے؟"
"جنگل ونگل کچھ نہیں۔ ہاں اس جنگل میں منگل کرنے میں ایں جانب کا کمال ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"سورج مکھی کی کاشت کے ساتھ یوکلپٹس کے پودے بھی لگائے تھے۔"
"تو کیا یوکلپٹس کی بھی کاشت ہوتی ہے؟"
مجھے اس کی بات پر ہنسی سی آ گئی۔ میرے چہرے بشرے سے وہ کچھ بھانپ گیا۔
"کیا کوئی غلط بات کہہ دی میں نے!!"
"میرے یار کاشت نہیں پودے لگائے جاتے ہیں پھر جب یہ پودے بڑھ کر تناور درخت بن جاتے ہیں تو ان کی لکڑی مختلف چیزوں کے بنانے میں کام آتی ہے۔"
"مثلاً"۔"
"مثلاً" کاغذ ' ماچس بنانے کے کام آتی ہے۔"
"یار بزنس مین اور صنعت کار ہر دم فایدہ اور منفعت کے بارے میں ہی سوچتا ہے' میرے خیال میں کافی نفع بخش رہی ہوگی یہ اسکیم۔"
"ہاں یہ تو ہے پودے بہت سستے ملتے ہیں اور جب بڑھ کر درخت بن جاتے ہیں تو کافی منافع بخش ہوتے ہیں کیوں کہ داشت پرداخت پر زیادہ خرچ نہیں آتا یوں شرح منافع زیادہ بیٹھتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"ہوں میں سمجھ گیا' کھنڈرات خرید کر یہ عمارت تعمیر کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی۔"
میرا ذہن اور دماغ بوجھل ہوتا جا رہا تھا اور شاید اس کا بھی' وہ بار بار جمائیاں لے رہا تھا۔
"کیوں کیا نیند آ رہی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"ہاں آں شاید۔"
"شاید کیا' تمھاری پلکیں بوجھل ہوتی جا رہی ہیں' قہوہ چلے گا.........."
"نہیں رہنے دو۔"
مگر میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے الیکٹرک کیتل کا پلگ سوئچ بورڈ میں لگا دیا' تھوڑی ہی دیر میں پانی کھولنے کی مخصوص آواز آنے لگی' اتنی دیر ہم دونوں ہی خاموش رہے۔ میں نے قہوہ تیار کر کے پیالہ اس

کی طرف بڑھایا۔ وہ واقعی اب اونگھنے سا لگا تھا۔ مگر گرم گرم قہوے کے چند گھونٹوں نے ہی اس کے اور میرے دونوں کے ذہنوں کو بیدار کرنا شروع کر دیا۔ اور پیالہ ختم ہوتے ہوتے ہم پوری طرح چاق و چوبند ہو چکے تھے۔ اور چست درست ہوتے ہی اس نے ایک بار پھر وہی موضوع چھیڑ دیا۔

"کافی عرصہ لگا ہوگا تمہیں اس میں؟"

"کا ہے میں......؟"

"اس عمارت کی تعمیر میں اور کاہے میں بھئی......!"

"ہاں بہت زیادہ' پہلے تو کھنڈرات کی کھدائی ہی بڑا مرحلہ ثابت ہوئی' بڑا وقت طلب تھا یہ مرحلہ اور بڑا وقت لگا اس میں اور پھر کھدائی کے دوران ہی ایک اور افتاد آ پڑی......"

"کیسی افتاد......؟"

"ارے بھئی کھدائی کے دوران کچھ ایسی چیزیں ملیں کہ آثار قدیمہ والے دوڑ پڑے۔"

"اچھا کیا کیا ملا تھا؟"

"ایک چیز ہو تو بتلاؤں' کافی دنوں تک تو کوئی کام ہی نہ ہو سکا تھا' بس پریس میڈیا اور آثار قدیمہ کے ماہرین' حکام کا تانتا بندھا رہتا' ایک ایک چیز کی پرکھ اور گھنٹوں مباحث کا سلسلہ چلتا۔"

"بحث و گفتگو تو بڑی دلچسپ ہوتی ہوگی۔"

"ہاں یہ تو ہے اور بڑی معلومات افزا بھی......"

"وہ کیسے؟"

"کھنڈرات سے ایسی بہت سی چیزیں برآمد ہوئی مثلاً" ہڈیوں کے پنجر' انسانی اعضا اور جانوروں کے بھی' بہت سے مختلف سکے' ہتھیار' ظروف وغیرہ اور ان پر جب انتھروپالوجی کے اور آثار قدیمہ کے ماہرین گفتگو اور بحث کرتے تو سنتا تو میں بھی تھا اور بہرحال اس سے علم میں اور معلومات میں اضافہ تو ہوتا ہی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے' کیا کیا دیکھا تم نے'......اوں...........اور آثار قدیمہ والوں نے کیا کیا بتایا تھا؟"

"بڑی لمبی چوڑی بات ہوتی تھی کہاں تک بتاؤں' کبھی سکوں کے متعلق بات ہوتی' کبھی ہڈیوں کے پنجر پر گفتگو ہوئی اور کبھی ہتھیار موضوع بحث رہتے' مثلاً" اس گفتگو سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ اسلامی سکہ سب سے پہلے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں ڈھالا گیا تھا......اس سے پہلے رومی اور قبطی سکے چلتے تھے۔"

"یہ کیسے پتا چلا تھا بھلا؟"

"جو سکے دریافت ہوئے تھے؟ اس میں کچھ اس عہد کے ہی تھے۔"

"یعنی خلیفہ عبدالملک کے عہد کے۔"

"نہیں خلیفہ عبدالملک کے عہد میں تو پہلا اسلامی سکہ ڈھالا گیا تھا مگر یہ اس دور میں بھی رائج تھا جب سالار اعظم محمد بن قاسم سندھ پر حملہ آور ہوا تھا' کچھ سکے اس عہد سے بھی پہلے کے تھے' مختلف ہندو حکمرانوں

کے زمانے کے۔"

"اسلامی سکے اور ان سکوں میں تو بہت فرق رہا ہو گا؟"

"ہاں بھئی' زمین آسمان کا فرق' ڈھلائی بنائی ہر چیز مختلف اور پھر ضرب سکہ ہی پہچان اور شناخت کے لیے کافی تھی.........."

"اچھا! کیا ضرب کندہ تھی.....؟"

"سکے کے ایک جانب بسم اللہ شریف کندہ تھی اور دوسری طرف سورہ اخلاص۔"

"اور کون سے سکے تھے اور کیسے تھے؟"

"مختلف قسم کے بہت سے سکے میرے خیال میں آمد اسلام سے پہلے کے۔ ہر سکہ دیکھ بھی نہیں سکا تھا اور نہ یہ ممکن ہی تھا' پھر یہ سب کچھ محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں تھا' بس خاص خاص چیزیں ہی یاد رہ گئی یا پھر وہ جو بہت زیادہ موضوع گفتگو اور زیر بحث رہیں........"

"مثلاً۔"

"مثلاً" ہڈیوں کا ایک پنجر' کسی جانور کا اور ماہرین کافی غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ ہڈیاں کسی ہاتھی کے سر سونڈ کی ہیں سامنے والی پیشانی کی ہڈیاں دانت وغیرہ اور انھیں ہڈیوں میں ابھی پیوست کرتل بھی تھی........"

"کرتل وہ کیا ہوتی ہے؟"

"ایک قسم کی تلوار۔"

"کس قسم کی تلوار؟"

"خم دار تلوار۔"

"یہ تلوار کس طرح کی ہوتی تھی؟"

"یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے عرب آلات حرب کے استعمال اور جنگی حکمت عملی کے معاملے میں غیر معمولی صلاحیت کے حامل تھے' بلکہ آج کی جدید جنگی حکمت عملی بہت کچھ انھیں کی بنیادوں پر استوار ہیں مثلاً" قلب' میمنہ میسرہ وغیرہ کی ترتیب' اسی طرح آلات حرب کے استعمال میں بھی وہ نت نئی ایجادات کرتے رہتے جیسے منجنیق' دبابہ' روغن نفت وغیرہ کا استعمال۔"

"یہ منجنیق تو میں جانتا ہوں' روغن نفت بھلا کیا شے تھی؟"

"یہ ایک قسم کا آتش گیر مادہ ہوتا تھا جو پچکاریوں کے ذریعہ پھینکا جاتا تھا' ایسی متعدد ایجادات تھیں جو ان کی فتوحات میں ممد و معاون ثابت ہوتیں۔ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح اس سلسلے میں بہ روئے کار لاتے۔"

"تم کچھ کرتل کے بارے میں بتلا رہے تھے۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں' کرتل بتایا نا کہ وہ ایک خم دار تلوار ہوتی تھی۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ہندو راجاؤں مہاراجاؤں

کے لشکر میں ہاتھیوں کی بہت بڑی تعداد ہوتی تھی' جب مسلمانوں نے فتوحات حاصل کیں تو ہاتھی بھی بڑی تعداد میں ان کے ہاتھ لگے۔ چناں چہ جنگ میں مروجہ استعمال کے ساتھ ساتھ اپنی افتادِ طبع' جدت طرازی کے تحت یہاں بھی ان کی فطانت اور ذہانت نے ایک بالکل نئی اور انوکھی چیز ایجاد کر ڈالی' جیسا کہ بتایا یہ خم دار تلوار ہوتی تھی کرّل' اور اس کو ہاتھیوں کی سونڈ کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا اور پورے ہاتھی کو زرہ سے ڈھانپ دیتے' کئی سو پیادہ دونوں جانب سے ان ہاتھیوں کی حفاظت کے لیے چلتے' پھر جب یہ ہاتھی غنیم کے لشکر میں گھستے تو سونڈ پر لگی ان خم دار تلواروں سے دشمن کو کاٹ کر رکھ دیتے۔"

"ذہین اختراع تھی بلاشبہ' ہاتھیوں کا جنگ میں نیا اور انوکھا استعمال۔"

"ہاں آں' ذہانت' جستجو' کھوج' علم و تحقیق بہادری اور جرأت کے ساتھ ساتھ ہم مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا .... چاردانگ عالم میں اسی لیے تو شہرہ تھا اور ہر سو ڈنکا بجتا تھا۔"

"صحیح کہتے ہو۔" اس نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا' مگر ساتھ ہی پھر جیسے کسی سوچ میں گم ہو گیا' گہری سوچ میں! .... اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے میں نے جیسے اس کے ذہن میں پلتی سوچ کو پڑھنے کی کوشش کی' مگر مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں سے لہریں سی خارج ہو کر میری آنکھوں اور ذہن میں دماغ میں نفوذ کرتی جا رہی ہوں۔ دماغ بوجھل بوجھل سا محسوس ہونے لگا اور ایک عجیب سا میٹھا میٹھا سرور تھا کہ میرے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش' مگر پپوٹے بھاری اور بوجھل پلکیں جھکتی ہی چلی گئیں ....

باہر کسی درخت کی ٹہنی پر وہ خوش الحان پرند روز کی طرح آج پھر نغمہ سرا ہوا۔

وہی نغمہ جو صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیانی وقت ہر روز گونجتا تھا' جس کی پہلی نوائے سحرخیز پر ہی میں غفلت نوم سے بیدار ہوتا تھا۔ اور پھر اس کی چند سریلی آوازوں کے بعد ہی تمام طیرِ خوش الحان نغمہ سنج ہو جاتے اور پھر تمام فضا سریلی چہکاروں سے بھر جاتی۔

میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ وہ بھی جاگ چکا ہے اور کچھ جیسے حیرت و تجسس سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

"کیسی سریلی ہے یہ آواز' کس طائر کی ہے؟"

"روز سنتا ہوں بلکہ بیداری اس آواز سے ہوتا ہوں' مگر یہ آج تک پتا نہ چل سکا کہ یہ بیدار کن بانگ خروش کس طائرِ صبح خیز کی ہے۔"

"تم نے تو شاعری سی شروع کر دی۔"

"کیفیت ہی ایسی طاری ہو جاتی ہے اس وقت۔"

"اچھا!"

"ہاں آں۔"

ایک ثانیہ وہ کچھ سوچا کیا اور پھر بولا۔

"ایک عجیب سی کیفیت تو مجھ پر بھی طاری ہو رہی ہے' ایک بالکل ہی نیا اور انوکھا احساس جسے بیان نہیں

کر سکتا۔"

اور اس کے بات ختم کرتے ہی روز کے معمول کی طرح باہر کی کل فضا پرندوں کی چہکاروں چہچہاہٹوں اور سینکڑوں قسم کے طائروں کی خوش نوائی سے بھر گئی۔ میں حسب معمول اٹھا' کمرہ سے باہر آیا اور عمارت کے باہری حصے میں پہنچ کر اس چڑھائی پر چڑھنے لگا جو عمارت کے انتہائی بلند پوائنٹ پر لے جاتی ہے۔ چاپ پر پیچھے مڑ کر دیکھا تو آہستہ خرامی کے ساتھ وہ بھی پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اوپر تک کا فاصلہ ہم دونوں نے خاموشی سے طے کیا اور جیسے ہی ہم اس بلند پوائنٹ پر پہنچے میرے تو احساسات اور کیفیات یک لخت بدل گئے اور میں تو خیر روز ہی ایسی کیفیت سے دوچار ہوتا' مگر مجھے نہ معلوم کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی شاید کسی داخلی تغیر سے دوچار ہے۔ اس بلند مقام کی جائے وقوع کچھ ایسی تھی کہ اوپر چڑھتے ہوئے منہ جانب مشرق ہوتا اور یہ وہ ساعت ہوتی کہ بطن گیتی سے آفتاب تازہ پیدا ہو رہا ہوتا' بس سحر کی آمد آمد ہوتی۔ ہمیں پہنچے ابھی چند ہی لمحے بیتے تھے کہ زمین کے اندر سے لال لال گولا طلوع ہونا شروع ہوا اور جوں جوں یہ لال طبق بلند ہوتا گیا' آسمان کا رنگ بدلتا گیا اور چند ہی لحموں میں رنگ و نور کا سیلاب سا آگیا' ایسا لگا گویا سارا عالم سونے میں ڈھک کر رہ گیا' پرندوں کی خوش الحانی' نورانی فضا' کل ماحول معطر اور مہکا ہوا' سب کچھ انتہائی مسحور کن تھا بے خودی کی حد تک مسحور کن اور میں' اور شاید وہ بھی' عالم بے خودی میں محو' مشرق سے ابھرتے سورج کو دیکھ رہے تھے اور جب تک دیکھا کیے جب تک کہ اس کی لالی معدوم اور کرن نہ پھوٹ گئی۔ پہلی شعاع مہرنے ہم دونوں کو عالم بے خودی سے چونکایا۔ میں نے ایک گہری سانس سی لی اور مجھے یوں لگا کہ میرے اندر ہولے ہولے کوئی گنگنا رہا ہے اور پھر یہ گنگناہٹ ہلکی ہلکی بڑبڑاہٹ میں بدل گئی۔

"مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"کیا؟"

" تمہارا مطلب اور کیا؟...... سورج تو روز ہی مشرق سے ابھرتا ہے۔"

"ہاں آں' صحیح کہتے ہو۔" مگر میرے وجود سے ایک آہ سرد نکلی اور اندر سے نہ معلوم کون بڑے ہی دل سوز انداز میں بولا۔

"مگر مغرب تو مشرق سے ابھرنے والے ہر سورج کو ہڑپ کر گیا۔"

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور مجھے ایسا لگا جیسے اس نے اثبات میں سر بھی ہلایا' مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ وہ اپنی شہادت کی انگلی سے اس کھجور کے درخت کی طرف اشارہ کر رہا تھا جو محراب کے قریب نہ جانے کب سے کھڑا تھا اور اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھا تم نے۔"

"کیا؟"

"وہ دیکھو۔" اس نے ایک بار انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ پہلی کرن دیکھی تم نے' وہ کھجور کی ٹہنیوں کے درمیان سے گزرتی محراب پر پڑ رہی ہے۔"

اور جب میں نے اس کے اشارے اور توجہ دلانے پر ادھر دیکھا تو کھجور کی ٹہنیوں کے درمیان سے گزر کر اب کئی شعاعیں ٹوٹی پھوٹی بوسیدہ محراب پر مچل رہی تھیں۔

"ہاں آں صحیح کہتے ہو' مگر اب تو کئی کرنیں پھوٹ نکلی ہیں' کھجور کی کئی ٹہنیوں سے گزرتی سب کی سب محراب کو روشن کر رہی ہیں۔"

"ہاں اس محراب کا رخ ہی ایسا ہے بالکل مشرق میں سیدھی سورج سمت واقع ہے۔"

"واقعی صحیح کہتے ہو۔"

اور چند ہی لمحوں میں پوری کائنات روشن ہو گئی' ساری دنیا جاگ گئی' جیسے ایک حیات تازہ دنیا کی ہر شے کو عطا ہو گئی۔ اور پیشتر اس کے کہ میں واپسی کے لیے سوچوں وہ آہستگی سے مڑا اور دھیرے دھیرے قدم رکھتا ہوا چڑھائی سے نیچے اترنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا اور ایک بار پھر ہم دونوں نشست کے کمرے میں جا پہنچے۔ مجھے محسوس ہوا کہ صبح بیدار ہونے پر رات گئے تک جاگنے کے باعث جو ایک گونا کسلمندی سی تھی وہ رخصت ہو چکی ہے۔ یہ شاید وقت صبح اور نسیم سحر کا اعجاز تھا۔ اس کے چہرے بشرے سے بھی بشاشت کا احساس عیاں تھا۔ میں نے سوچا قرب فطرت بھی کیسے خوش کن اثرات مرتب کرتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اٹھا اور اس کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا جہاں سے رات میں محراب کو دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا تھا۔ میں بھی بادل ناخواستہ اٹھا اور اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔ پوری محراب روشنی میں نہائی سامنے تھی۔ یکبارگی وہ مڑا اور ایک بار پھر وہی سوال اس کی زبان پر آگیا۔

"اس محراب کو بنانے کا خیال   تمھیں اب کیوں آیا ہے؟"

میں نے چونک کر اس کو دیکھا' کل شام سے متعدد بار وہ یہ سوال کر چکا تھا سوچا جواب دے ہی دیا جائے۔

"بس کیا بتاؤں کچھ عجیب سی بات ہوئی تھی اس دن۔"

"کس دن' کیسی عجیب بات؟"

"کچھ دن ہی پہلے کی بات ہے' شام کا وقت تھا' طبیعت میں کچھ اضمحلال سا تھا' ویسے شام کو یوں بھی طبیعت کبھی کبھی پژمردہ سی ہو جاتی ہے' ایک بے نام سی اداسی اور ایسی کیفیت اگر کسی اجنبی کی آمد کی اطلاع ملے تو ناگوار خاطر تو ہوتا ہی ہے۔"

"آیا کون تھا؟"

"مجھے اطلاع ملی کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور اس عمارت کے مالک یعنی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا'......... انھیں نشست کے کمرے یعنی اسی کمرے میں بٹھلا دیا گیا اور جب میں یہاں پہنچا تو وہ بڑی اضطرابی سی حالت اور بے چینی کے عالم میں اس وسیع و عریض ہال میں ٹہلتے تھے۔"

"کون تھے وہ؟"

"بتایا نا' میرے لیے اجنبی تھے۔"

"ہاں ہاں شاید تم نے کچھ ایسا ہی کہا تھا۔ مگر تھے کیسے وہ بزرگ؟"

"دراز قد' ایسے قد آور کہ اتنے طویل القامت لوگ اب شاید نظر بھی نہیں آتے' قابل رشک مثالی صحت ایسے صحت مند کہ سن رسیدہ تو محسوس ہی نہیں ہوتے تھے' انار دانہ جیسے دہکتے سرخ سرخ رخسار۔ ہاں ریش مبارک بالکل سفید تھی' ایسی سفید جیسے دودھ برف میں دھلی ہوئی اور سر کے بال بھی بالکل ایسے ہی تھے اور اسی سے ان کی عمر کا اندازہ کیا تھا۔"

"مگر سر کی سفیدی تو ایسی چیز نہیں کہ عمر کا صحیح اندازہ ہو سکے۔"

"یہ تو ہے' مگر پھر بھی نہ جانے ایسی کیا بات تھی ان کی پوری شخصیت میں کہ بزرگی کا ایسا تاثر ابھرتا کہ بس بیان نہیں کر سکتا...... اوں' ایک ناقابل بیان سا احساس......!"

"اچھا تو پھر جب تم ان سے ملے تو کیا ہوا......؟"

"بس کیا بتاؤں ایسی گرم جوشی سے ملے جیسے مدتوں سے شناسا ہوں' بڑھ کر معانقہ کیا اور انتہائی گرم جوشی سے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اپنے چوڑے چکلے سینے سے چمٹالیا اور اس زور سے بھینچا کہ ہڈیاں تو میری ضرور کڑکڑا گئیں مگر ان کے خون کی حدت اور گرمی میرے وجود میں سنسنا گئی' مجھے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں کسی جوان رعنا کے بازوؤں کے حصار میں ہوں' ساتھ ہی انس و محبت کا عجیب سا احساس تھا جو ان کے قرب سے پیدا ہو رہا تھا' میٹھی میٹھی محبت کی مہک سی پھوٹ رہی تھی جو مجھے اپنے وجود میں رچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور جب میں ان کے محبت بھرے گرم گرم حصار سے جدا ہوا تھا تو مجھے یوں لگا کہ محبت ان کے وجود سے کھنچ کر ان کی جان دار آنکھوں میں سمٹ آئی ہو' ایسے پیار سے دیکھا تھا کہ بس بیان نہیں کر سکتا اور جب گویا ہوئے تو پیار محبت کی شیرینی نوک زباں میں سما گئی تھی۔ ہونٹوں سے پھول سے جھڑ رہے تھے اور لہجہ ایسا نرم اور شیریں کہ کانوں میں رس سا گھل جائے۔"

"بولے کیا تھے کہا کیا تھا انھوں نے؟"

"بولے کیا تھے' سب سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا۔"

"کیا؟"

"یہ ہی کہ کیا اس عمارت کا مالک میں ہوں اور میں ان کی شخصیت کے سحر میں کچھ ایسا گرفتار تھا کہ بولنے کا ہی یارا نہ رہا تھا' گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیا تھا۔"

"پھر کیا کہا انھوں نے؟"

"فرمایا کہ یہ کھنڈرات جن پر آپ نے یہ عمارت کھڑی کی ہے' میرے آباؤاجداد کے تھے۔ صدیوں پہلے جب وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس کو زمیں بوس کر کے کھنڈر بنادیا وہ اس کے مکیں تھے' آباد تھے یہاں' پشت ہا پشت سے اور پھر عجیب سے حسرت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔"

"کیا؟"

"کہا تھا کہ کیا یہ عمارت میں ایک نظر دیکھ سکتا ہوں!"

"پھر۔"

"پھر کیا' انکار کی تو کوئی گنجائش ہی نہ تھی' سو دکھانا شروع کر دی' اور شروعات بھی اسی کمرے سے ہوئی۔"

"دیکھ کر تعریف تو بہت کی ہوگی۔"

"کاہے کی بھلا۔"

"جدید خوب صورت طرزِ تعمیر کی اور کاہے کی۔"

"کچھ بھی نہیں کہا تھا اس کے متعلق' بلکہ کوئی توجہ اور دھیان ہی نہیں دیا تھا اس طرف۔"

"پھر دیکھا کیا تھا' خاک۔" اس نے جیسے کھسیا کر کہا۔

"خاک واک نہیں'......... انھوں نے کیا دیکھا اور کیا دیکھنا چاہتے تھے وہی بتانے جا رہا ہوں'......... جیسا کہ ابھی کہا شروعات اسی کمرے سے کی تھی پھر دوسرے کمروں اور دوسرے حصوں میں گئے تھے اور ہر جگہ ٹہلتے تھے' بڑے مضبوط قدم ڈالتے ہوئے۔ کچھ دیر چلتے پھر یک دم رکتے اور پھر چلنے لگتے' پھر رک جاتے اور چند لمحے کچھ سوچتے اور اسی گہری سوچ کے عالم میں دائیں بائیں اوپر نیچے دیکھتے اور جیسے کچھ بڑبڑاتے ہوئے سے کہتے جاتے' اس جگہ دیوان خاص تھا......... یہاں پر ایک تہ خانہ تھا......... یہ غلام گردش تھی......... یہ زنان خانہ تھا......... یہ کمرہ جہاں تعمیر ہے وہاں اسلحہ خانہ تھا......... اس جگہ ساری کی ساری خواب گاہیں تھیں'......... یہاں کرسیِ عدالت لگتی تھی'......... یہ دیوانِ عام تھا'......... یہاں دربار لگا کرتا تھا........."

"کیا یہ سب کچھ صحیح تھا۔"

"میرے خیال میں.........!"

"کیسے معلوم تمہیں.........؟"

"کھنڈرات کی جب کھدائی ہو رہی تھی تب ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے بعض حصوں اور مقامات کے متعلق بتایا تھا اور جو نشان دہی کی تھی اس کی بعض تفاصیل ذہن میں تھیں اور آج بھی ہیں' سو اس سے اندازہ ہوا کہ صحیح کہتے تھے........."

"ویسے ہے یہ عجیب سی اور حیرت کی بات! پھر کیا انھوں نے پوری کی پوری عمارت دیکھی تھی....."

"ہاں' ایک ایک حصہ دیکھا تھا اندر سے باہر تک تمام کا تمام........"

"دیر تو بہت لگی ہوگی اتنی بڑی عمارت دیکھنے میں!"

"تھوڑی دیر تو لگی تھی مگر ایک عجیب اور حیرت کی بات محسوس ہوئی تھی۔"

"کیا؟"

"ان کی چستی پھرتی حیرت زا تھی' توانائی اور طاقت کی مجسم تشکیل......... حرکات سکنات میں ایسے بجلیاں

سی تڑپتیں جیسے کسی نوجوان کا قوت سے بھرپور پیکر...... ایسے تیز تیز مضبوط قدم ڈالتے ہوئے چلتے تھے کہ مجھے ان کا ساتھ دینا دشوار ہوگیا تھا...... اور جب عمارت سے نکل کر وہ اس باہری حصے کی طرف گئے تھے جہاں محراب ہے تو ان کا انداز' چال ڈھال ہر چیز ہی بدل گئی تھی۔ محراب پر پہلی نظر پڑتے ہی پہلے تو جیسے اچنبھے میں حیران و ششدر سے کھڑے رہ گئے تھے اور پھر کڑے' کمان کے تیر کی طرح چلے تھے محراب کی طرف' اور عین محراب کے سامنے جاکھڑے ہوئے تھے' مبہوت سے' عالم بے خودی میں......"

اور اس نے بھی جیسے عالم بے خودی میں ہولے سے پوچھا' عجیب سی خواب ناک آواز میں۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر وہ محراب کو ایسے دیکھا کیے تھے جیسے آنکھوں میں سمولینا اور دل میں بسالینا چاہتے ہوں۔ چہرے کی کیفیات اور بشرے سے میں ان کے داخلی جذبات اور باطنی احساسات کا اندازہ کر رہا تھا' اور پھر وہ خوشی میں ڈوبی آواز جیسے ان کی روح بول اٹھی ہو......!"

"کیسی آواز؟"

"اچھا یہ ابھی باقی ہے۔" کچھ اس انداز میں کہا تھا انھوں نے جیسے روح کی گہرائیوں سے ان کے نطق تک یہ بات آپوں آپ آگئی ہو' پھر جیسے عالم وارفتگی میں وہ محراب کے گرد چکر لگانے لگے تھے۔ اوپر سے نیچے' نیچے سے اوپر تک ایک ایک شکستہ نیم شکستہ اینٹ کا بہ غور جائزہ لیتے تھے' ایک ایک درز میں جھانکتے اور مجھ پر بھی کچھ ایسی محویت طاری تھی کہ میں بھی جیسے ایک نادیدہ قوت' ایک ان جانی سی کشش کے ہاتھوں ان کے ساتھ ساتھ چلتا چکر لگاتا تھا۔ پھر یکایک چلتے چکر لگاتے ہوئے وہ یک دم رک گئے۔ معلوم نہیں یہ وقت کی تبدیلی کے باعث ہوا تھا یا کسی نئے داخلی احساس کے تحت۔ وقت وہی تھا جب کل شام محراب کے پاس ہم پہنچے تھے۔ شفق کی لالی سے محراب کی ایک ایک اینٹ دمک رہی تھی۔ محراب کے اوپر درختوں کے جھنڈ پر بسیرا کرنے والے پرندوں کے شور اور محراب کی ذات سے گزرتے ہوئے ابابیلوں کے عمل کی تکرار نے ہم دونوں کو چونکا دیا اور چونکتے ہی وہ یک دم چکر کاٹتے رک کر محراب کی بنیاد کے پاس جا بیٹھے تھے اور پھر اپنے چوڑے چکلے ہاتھوں سے جیسے کچھ کھودنے سے لگے تھے۔ میں کہ بڑے انہماک سے ان کے اس عمل کو دیکھتا تھا' ایک بات دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا تھا"

"کیا بات؟"

"وہ صرف اپنے ہاتھوں سے اس سرعت اور تیزی سے بنیاد سے اینٹیں نکالتے تھے کہ اتنی تیزی سے کدال اور پھاوڑے سے کھود کر بھی نکالنا ممکن نہ ہوتا۔ اور پھر کچھ اینٹیں نکالنے اور ان میں سے صرف ایک اینٹ ہاتھ میں تھام کر اس عمل کو ترک کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک صرف اسی اینٹ کو دیکھا کیے تھے اور پھر اٹھ کر شفق کی روشنی میں کہ اس کی بھڑکتی ہوئی لالی اور دمک ابھی باقی تھی' اینٹ کو دیکھا اور یک دم اچھل پڑے تھے' ساتھ ہی ایسی کلکاریاں سی حلق سے نکلی تھیں' جیسے کوئی بچہ انتہائی خوشی کے عالم میں نکالتا ہے اور پھر انتہائی خوشی میں ڈوبی اور بھرائی آواز میں بولے......"

"کیا؟"

"بولے تھے کہ اس کی بنیاد میں یہ باقی ہے۔"

اور میرے یہ الفاظ سن وہ بھی جیسے کچھ اچھل سا پڑا اور پوچھا۔

"کیا تم نے بھی اسے دیکھا تھا؟"

"ہاں تن' ان کی حیرت اور خوشی دیکھ کر میں ان کے پاس بلکہ بالکل ہی نزدیک پہنچ گیا تھا' شفق کی لالی کے انعکاس سے دمکتی ہوئی اینٹ ان کے ہاتھ میں تھی اور میں نے اسی لالی میں دیکھا تھا کہ اینٹ پر کچھ کندہ ہے۔"

"اچھا......! کیا لکھا تھا؟"

"ہندسے تھے صرف' الفاظ نہیں........!"

"کیا ہندسے تھے........؟"

"۹۲ھ" میں نے انگلی سے اپنی ہتھیلی پر لکھ کر اس کو بتلایا اور اس نے بڑے معنی خیز انداز میں سر کو جنبش دی اور پوچھا۔

"پھر کیا کیا انھوں نے؟"

"ایک اور عجیب سی بات کی' کمال ہنر مندی سے اینٹ کو محراب کی بنیاد میں ٹھیک اس کی اپنی جگہ لگا دیا .... اور پھر ایسی پرالتفات اور محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا کہ میں ان کی تاب نہ لا سکا' ان کی محبت کی جوت سے روشن اور جگمگاتی جان دار آنکھوں سے نظریں ملانے کا یارا مجھ میں نہ تھا' میری نگاہیں خود بہ خود جھکتی چلی گئیں' اور پھر جب قدموں کی چاپ پر نظریں اٹھیں تو ان کا واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا' وہ عمارت سے باہر کی طرف جا رہے تھے۔ بڑی تیزی اور سرعت سے اپنی مخصوص چال چلتے اور مضبوط قدم ڈالتے مگر ان کی محبت بھری آنکھوں میں جو پیام پوشیدہ تھا اس کو میں نے پڑھ لیا تھا' سمجھ گیا تھا۔"

"میں بھی اب سمجھ گیا!"

"کیا؟"

"یہی کہ اس محراب کو تم کیوں بنانا چاہتے ہو۔"

اور میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ بھی خوشی سے دمک اٹھا تھا۔ پھر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور کمرے کی ایک ایک چیز کا بڑی تیکھی اور غائر نظروں سے جائزہ لینے لگا' ایک دیوار کے پاس جا کر ٹھٹکا سا' کچھ دیر اس دیوار پر آویزاں دونوں چیزوں کو بڑے غور و انہماک سے دیکھا کیا اور انگشت شہادت سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استعجابیہ انداز میں پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"آثار قدیمہ والوں کی دین۔"

"کیا مطلب؟"

"کھنڈرات کی کھدائی کے دوران جب نوادرات' سکے وغیرہ برآمد ہوئے تھے تو آثار قدیمہ کے محکمے نے پیش کش کی تھی کہ اگر میں چاہوں تو کچھ چیزیں اس میں سے لے سکتا ہوں' شاید ان کے قوانین کے مطابق یہ میرا حق بنتا تھا' سو میں نے اس حق کو استعمال کیا اور بس ان کو پسند کر لیا۔"

"مگر بس ان دو ہی کو کیوں؟ اور وہ بھی اس حالت میں؟"

"پتا نہیں کس جذبے کے تحت ایسا ہوا تھا' بتا نہیں سکتا۔" اور جملہ ختم ہوتے ہی جیسے میری نظر اس پر پڑی تو میں چونک پڑا' اس کی تو پوری شخصیت ہی بدلی ہوئی تھی۔ بھرے بھرے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں' چہرہ جیسے اندرونی جوش اور وفور جذبات سے تمتما رہا تھا' اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے پورے سراپے پر بجلی سی لہرا گئی اور پھر بجلی کے کوندے ہی کی مانند وہ لپکا اور لپک کر ایک ساتھ دونوں کو دیوار سے کھینچ لیا اور اب اس کے ایک ہاتھ میں دیوار پر آویزاں صدیوں پرانا ٹوٹا قلم تھا' تو دوسرے میں زنگ خوردہ دو دھاری تلوار۔

اور تب ٹوٹے قلم کو انگوٹھے اور انگلیوں میں پکڑے اور زنگ خوردہ تلوار کے دستے پر مضبوطی سے گرفت کیے وہ ایک بار پھر گویا ہوا' مگر اس بار آواز اور لہجہ دونوں ہی بدلے ہوئے' آواز ایسی جو اب تک اس کے نطق سے نہ سنی تھی۔ لہجہ میں ایک گونا تحکم تھا تو الفاظ انتہائی پرتاثیر۔

"محراب تعمیر کراؤ۔" پھر ایک لحظہ توقف کیا' قلم والے ہاتھ کو اوپر اٹھایا اور کہا۔

"مگر ساتھ ہی اس کو بھی بنواؤ........"

اور اب تلوار فضا میں لہرائی اور بولا۔

"اور اس کو صیقل کراؤ کہ قلم اور تلوار دونوں ہی کی کاٹ ہماری میراث رہی ہے۔" اور اب اس کی روشن چمک دار آنکھوں کی پتلیاں غیر متحرک سی ہو کر میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں اور وہ ٹھہر ٹھہر کر جیسے ایک ایک لفظ تول تول کر بولا' بڑے ہی پر معنی سے الفاظ...........

"پھر کبھی....... کوئی مغرب....... کسی مشرق کے سورج کو......."

اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنی بات پوری کرے' میری نظریں اور آنکھیں چندھیا سی گئیں کہ اب میرے اس کمرے میں مشرق سے ابھرتے سورج کی ان گنت کرنیں در آئیں تھیں۔

☆ ☆ ☆

محمد سعید شیخ

متاعِ کارواں

ڈوبتے سورج کی روشنی ابھی بجھی نہیں تھی جب بوڑھے، نحیف سردار نے خادموں کو حکم دیا میری چارپائی خیمے سے باہر لے چلو۔ سردار کی چارپائی خیمے سے باہر لائی گئی اور اسے تکیوں کے سہارے بستر پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بستر پر دائیں پہلو اس کا بیٹا عباس اور بائیں پہلو اس کی بہو رباب بیٹھ گئی۔ عباس نے سردار کا جھریوں بھرا ہاتھ اپنی گود میں رکھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے سہلانے لگا۔ وہ اپنی محبت اور چاہت کا لمس بوڑھی کمزور اور ابھری رگوں کے ذریعے اپنے باپ کے دل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ بائیں کندھے کے ساتھ لگی اس کی بہو نے اپنا دایاں ہاتھ بابا کی پشت پر رکھ دیا اور بائیں ہاتھ سے اپنے بوجھے ہوئے بیٹ کو سہارنے لگی جس کا بوجھ صبح سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ سردار نے اپنی سفید گھنی بھویں سکیڑیں، آنکھیں اٹھائیں اور نگاہیں دور افق پر پھیلی لالی پر مرکوز کر دیں۔ اس کے چہرے کے خد و خال میں ایک عمر کی تھکن کے آثار تھے اور پیشانی پر سوچ اور فکر کی گہری لکیروں کے نشان تھے۔ سردار کی پھیلی ٹانگوں کے آخری سروں پر جو پاؤں تھے ان کے تلوں پر پکے چھالوں کے سیاں نشان اس سفر کی طوالت کا پتا دیتے تھے، جو ان پاؤں نے اب تک طے کیا تھا۔

سردار کی مضطرب نگاہیں وسیع، پھیلے ہوئے افق پر دائیں بائیں جس منزل کے آثار تلاش کر رہی تھیں بالآخر وہ سردار کی نظر کی زد میں آ ہی گئی اور اس کے ساتھ ہی سردار کا چہرہ یوں روشن ہو گیا جیسے اس کے پیچھے چراغ جل اٹھے ہوں۔

"دیکھو۔ وہ رہی ہماری منزل جس کی نوید لے کر ہم بستی سے نکلے تھے۔" سردار کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔ سردار نے اپنے وجود کی ساری قوتیں جمع کر کے انھیں دائیں ہاتھ کی طرف موڑا اور اپنے بازو کو اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا ہاتھ افق کی جانب سیدھا ہو گیا۔ عباس نے سردار کے بازو کو سہارا دیتے ہوئے پوچھا "بابا مجھے بھی دکھاؤ۔ کہاں ہے ہماری منزل۔" "ادھر۔ میرے ہاتھ کی سیدھ میں۔ وہاں افق کی سرخی میں لپٹے سنہری مینار۔ غور سے دیکھو۔ نظریں جما کر۔ جس طرح عید کا چاند دیکھا کرتے ہیں۔" سردار نے تمتماتے چہرے اور وفور شوق سے لرزتی آواز میں کہا۔ عباس اور رباب دونوں نے افق پر اپنی نگاہیں جمائیں اور ایک لمحے کو انھیں بھی سنہری میناروں کی جھلک دکھائی دے گئی۔

"ہاں ہاں۔ ہیں وہاں سنہری مینار۔" دونوں نے سردار کی بات کی تائید کی۔ سردار نے خوش ہو کر

کہا۔ "میں نہ کہتا تھا ہم منزل کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ بس تھوڑا سفر باقی ہے۔ اب تو تم کو یقین آ گیا؟ جاؤ بلاؤ سب کو۔ انھیں دکھاؤ اپنی منزل کے آثار۔ انھیں بتاؤ کہ اپنے خوابوں کو سنبھال کر رکھیں۔ مایوس نہ ہوں۔"

"لیکن بابا ہم کب پہنچیں گے منزل پر۔ اتنے سالوں سے ہم اسی صحرا میں سفر کر رہے ہیں مگر صحرا ہے کہ ختم ہونے کو ہی نہیں آتا۔ ہمارے قبیلے کے کتنے ہی لوگ ہمیں راستے میں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اب تو رباب سے بھی چلا نہیں جاتا۔"

"مجھے پتا ہے بیٹا یہ سفر کتنا مشکل ہے۔ میں نے بہت طوفان دیکھے ہیں۔ ریت کے ان ٹیلوں نے میرے ساتھ سفر کیا ہے۔ لیکن جو لوگ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے وہ بد نصیب ہیں۔ وہ اس سرزمین کی نعمتوں سے محروم ہوں گے جن کی خوش خبریاں ہمارے بڑوں نے ہمیں دی ہیں۔" سردار کی نظریں بدستور افق پر جمی تھیں جہاں شام کی لالی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ دور وہاں تک جہاں صحرا کے آخری کنارے آسمان سے جا ملتے تھے، ریتیلے صحرا کی سنہری بے کرانی سنہری رنگ سے سرمئی رنگ میں بدل رہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے صحرا کا سینہ سانس لے رہا ہو۔ صحرا کے سینے پر ریت کے تودوں کے ابھار ہمک رہے تھے اور آسمان پر سے ستاروں نے تانک جھانک شروع کر دی تھی۔

"بیٹا یقین سے، ایمان سے بات کیا کرو۔ کل کو تم نے میری جگہ لینی ہے۔ قافلے کی رہنمائی کرنی ہے۔ اگر سردار کو ہی منزل کا یقین نہ ہو تو تم یہ سفر کیسے طے کر سکو گے۔ منزل پر کیسے پہنچ پاؤ گے؟"

"بابا مجھے آپ کی باتوں پر یقین ہے۔ آخر میں اسی سفر کے دوران پیدا ہوا، اسی میں جوان ہوا، آپ کے سارے خواب میرے اندر اتر چکے ہیں۔ جس منزل کا آپ پتا دے رہے ہیں، اس کا ہمیں یقین ہے۔ اور یہ یقین میں آیندہ آنے والی نسلوں کو ضرور منتقل کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے عباس نے اپنے باپ کا بوڑھا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

عباس کی باتوں سے سردار کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ خوشی کی لہر کے ساتھ یادوں میں اچانک بازگشت سی پیدا ہوئی اور اسے یاد آیا برسوں پہلے، جب وہ بستی چھوڑ کر، منزل کی طرف روانہ ہوئے تھے تو ایک پڑاؤ پر اسی طرح اس کے باپ نے، ایسے ہی وقت، ایسے ہی کسی مقام پر، افق پر سنہری میناروں والی منزل کی نشان دہی کی تھی اور اسے بتایا تھا۔ "بیٹا ہجرت ہمارا شعار ہے۔ ہم نے اپنی بستی اس لیے چھوڑی ہے کہ وہاں زندگی ہم پر تنگ ہو گئی تھی۔ ہماری منزل، ہماری سرزمین ادھر ہے، افق کے اس پار جہاں سنہری میناروں سے روشنیاں پھوٹتی ہیں، جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، جہاں میٹھے پانیوں کے چشمے گنگناتے ہیں، جہاں درختوں پر میٹھے پھل لگتے ہیں، جہاں آزاد ہوائیں چلتی ہیں، جہاں سکھ ہی سکھ ہیں، جہاں کوئی کسی کا حق نہیں چھینتا، جہاں سب برابر ہیں، کوئی چھوٹا بڑا نہیں، جہاں بے انصافی نہیں، جہاں کوئی محروم نہیں۔" یادوں کی محرابوں میں گونجتی یہ بازگشت سردار کی آنکھوں کی چمک اور مرجھائے ہونٹوں کی مسکان بن گئی۔ سردار نے افق سے اپنی نظریں نہیں اٹھائیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ دیر اپنی منزل کے آثار کو اپنی

آنکھوں میں رکھنا چاہتا تھا تاکہ ان کا عکس اس کے دل کے اندر اتر جائے اور اس کی بے قراری کم ہو جائے جو اپنی زندگی میں منزل پر نہ پہنچ سکنے کے احساس سے پیدا ہوتی تھی۔

شام کی لالی آہستہ آہستہ رات کے کاجل میں گھلنے لگی۔ آسمان پر ستاروں کی بارات بڑھتی گئی اور چاروں اور پھیلا صحرا ریشمی اندھیرے میں لپٹتا چلا گیا۔ سوکھی' کانٹے دار خود رو جھاڑیوں پر جگنو چمکنے لگے اور یوں لگنے لگا جیسے آسمان اور زمین دونوں کی گود ستاروں سے بھر گئی ہو۔ فضا میں خنکی بڑھتی گئی۔ "بابا آپ کا بستر اندر لے چلیں؟" عباس نے فضا میں بڑھتی ہوئی ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ وقت یہیں گزارنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں میری منزل میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس نظارے سے مجھے عجیب سا سکون اور چین ملتا ہے۔"

"ستاروں کے آثار اب زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ اتنی بے قراری کیوں محسوس کرتے ہیں بابا؟" رباب نے سردار کا کندھا محبت سے دباتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا مجھے اپنی منزل پر نہ پہنچ سکنے کا دکھ ہے۔ جب میں قافلے کو لے کر روانہ ہوا تھا تو میرے دل میں بڑی امنگیں تھیں۔ میں اپنے قبیلے کو جلد از جلد منزل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر پتا نہیں یہ کیسے ہو گیا کہ ابھی قافلہ راستے میں ہی ہے کہ میری عمر ختم ہونے کو آ گئی۔ کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے راستوں کے انتخاب میں فریب کھایا ہو' کہیں کسی سراب کے تعاقب میں غلط راہ پر نہ آ گیا ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بابا۔ آپ نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں سوچا۔" عباس نے سردار کی بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں نہیں سوچا تھا۔ اب بھی سوچ رہا ہوں کہ یہ سوچ کیسے میرے دماغ میں داخل ہو گئی۔ مجھے یاد ہے مرتے وقت میرے باپ نے مجھے بتایا تھا بیٹا اس صحرا کا سفر بڑا کٹھن ہو گا۔ تمہیں ستاروں سے مدد لینا ہو گی ورنہ راستا بھول کر بھٹکتے رہ جاؤ گے۔ میں نے ستاروں کی مدد سے اب تک کا سارا سفر طے کیا ہے۔ ہو سکتا ہے میں صحیح راستوں پر ہی سفر کرتا آیا ہوں' اسی لیے تو مجھے اپنی منزل کے نشان صاف نظر آتے ہیں۔ پھر میرے باپ نے یہ بھی بتایا تھا جس منزل کے لیے ہم اپنی بستی سے نکلے ہیں اس تک پہنچنے کے لیے بڑے سال' بڑا حوصلہ' بڑا استقلال چاہیے۔ قبیلوں' قوموں کی زندگی میں دس بیس تیس چالیس سال معمولی وقفے بن جاتے ہیں۔ کیا ہوا جو قافلہ میری عمر میں منزل تک نہیں پہنچا' اب تم جو ہو میرے خوابوں کے وارث۔ مجھے تمہاری سمجھ بوجھ' تمہاری فراست پر پورا بھروسا ہے اور پھر منزل ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ میں بے قرار ہونے کے باوجود پر امید' مطمئن ہوں۔" یہ کہتے ہوئے سردار کا سانس پھول گیا۔ عباس نے سردار کو سہارا دیا۔ خادم بھاگا بھاگا اندر گیا اور پانی کا پیالہ اٹھا لایا۔ عباس نے پانی کا پیالہ سردار کے خشک ہونٹوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ سردار نے گلے سے نیچے اتارے اور پھر ہونٹ پیالے سے علاحدہ کر لیے۔

"لگتا ہے پانی ختم ہو رہا ہے۔" سردار نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں بابا۔ ٹوبے میں پانی ختم ہو گیا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں ہم پڑاؤ اٹھالیں مگر آپ کی طبیعت اور رباب کی حالت ہمیں سفر پر چلنے سے روک رہی ہے۔"

"بارش کسی وقت بھی ہو سکتی ہے بیٹا۔ ہوا میں بارش کا پیغام موجود ہے۔ جب بارش ہو گی تو صحرا دیکھنے کے لائق ہو گا۔ میں اس وقت تک جینا چاہتا ہوں۔ یہ کانٹے دار خشک جھاڑیاں ہری بھری ہو جائیں گی' سارا صحرا سرسبز ہو جائے گا۔ کانٹوں کی نوکوں پر کونپلیں پھوٹ پڑیں گی اور شاید یہی وقت ہو تمھارے بیٹے کے آنے کا' جس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہمارے خواب تازہ ہو جائیں گے۔ ہماری مایوسیاں امیدوں میں بدل جائیں گی۔"

جب رات بھیگنے لگی تو بابا کے لیے رباب پرندوں کے گوشت کا شوربہ بنا کر لے آئی۔ سردار نے سوپ پیا تو اس کی ٹمٹماتی آنکھوں کی لو تیز ہو گئی۔ سردار کو اب ان آنکھوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ صبح تک سردار دور جہاں صحرا اور آسمان ایک دوسرے سے ہم کنار ہوتے تھے' اپنی منزل دیکھتا رہا۔ سارے قبیلے کو پتا تھا سردار کا آخری وقت آپہنچا ہے مگر سردار کی جان اس کی آنکھوں میں اٹکی ہوئی تھی۔

صبح سورج تھوڑی دیر کے لیے نکلا پھر بادلوں نے اس کو گھیر لیا۔ آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے ہوا میں ٹھنڈک آتی گئی اور شام سے پہلے پہلے صحرا میں دور دور تک بارش برسنے لگی۔ سارے صحرا کا اضطراب جیسے' ایک دم مدھم پڑ گیا اور پھر اچانک ہی خشک صحرا ہرا بھرا ہو گیا۔ پیلی خشک جھاڑیاں سرسبز ہو گئیں اور کانٹوں کی نوکوں پر ننھے منے پھول پھوٹ پڑے۔ سردار خیمے سے باہر سائبان کے سائے میں نیم دراز صحرا کی نئی صورتی دیکھ رہا تھا۔ اس کا جسم بے جان ہو رہا تھا مگر آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک اور تازگی بھر گئی تھی۔ اس کا چہرہ روشن اور پر سکون تھا۔ یہی وہ وقت تھا جس کا ایک ٹھہرا ہوا لمحہ رباب کے وجود میں تخلیق کا روپ دھار کر تکمیل کو پہنچ رہا تھا۔ خادمائیں نوکرانیاں زنانہ خیمے کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ قبیلے کی سب سیانیاں وہاں جمع تھیں۔ عباس باپ کی چارپائی کی پٹ سے چمٹا بیٹھا تھا مگر اس کے کان رباب کے خیمے سے کسی آواز کے طلوع پر لگے تھے۔ اس کا دل سینے کی دیواروں میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

بارش کی ہلکی بوندیں صحرا کی ریت پر گر رہی تھیں اور جذب ہوتی جا رہی تھیں۔ صحرا تھا کہ اس کی پیاس ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھیں۔ عباس کے ساتھ ساتھ سردار کے کان بھی اس آواز کے منتظر تھے جو امید کی آواز تھی' مستقبل کی آواز تھی' خوابوں کی آواز تھی۔ انتظار کی گھڑیاں نہ جانے کتنی لمبی ہو گئیں۔

عباس نے دیکھا کہ سردار کا ہاتھ اس کے پہلو میں متحرک ہو گیا اور گھسٹتا ہوا آیا اور بستر کے کنارے پر عباس کے ٹکے ہوئے ہاتھ پر آکر ٹھہر گیا۔ عباس نے چونک کر پہلے باپ کی آنکھوں میں اور پھر باپ کے بے جان ہاتھ کو دیکھا جو اسے تسلی دینے کو آیا تھا۔ عباس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ سردار بولنا چاہتا تھا مگر اب وہ بول نہیں سکتا تھا۔ اس کی جان تو اس کی نگاہوں میں باقی رہ گئی تھی۔ پھر قریب ہی خیمے سے نوزائیدہ بچے کی وہ آواز بلند ہوئی جسے ہر دنیا کی کوئی بھی زبان مکمل معنی نہیں پہنا سکتی تھی۔ عباس

کا دھڑکتا دل پر سکون ہو گیا اور سردار کی آنکھوں کے بجھتے دیے تھوڑی دیر کے لیے تیزی سے ٹمٹمانے لگے۔

چاروں طرف سے مبارک باد کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ قبیلے کے لوگ خوشی کے مارے ناچنے لگے۔ عباس کو اجازت ملی تو وہ خیمے کے اندر گیا۔ اس نے سب سے پہلے رباب کو بیٹے کی مبارک باد دی۔ رباب کا چہرہ ابھی تک اس کیفیت سے تمتما رہا تھا جس سے گزر کر اس نے انسان کو تخلیق دے کر کائنات کی ترتیب میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ وہ اپنی تکلیف بھول کر مسکرا رہی تھی اور خود کو کائنات کی مالک و مختار سمجھ رہی تھی۔ عباس نے اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر اس کی ہستی کو خراج تحسین پیش کیا۔ خادمہ نے ریشم میں لپٹا ننھا وجود اس کے بازوؤں میں دے دیا۔ عباس نے دیکھا اس بچے کی شکل ہو بہو اس کے باپ سے ملتی تھی جو باہر اپنے خیمے کے باہر ابھی تک اس کا منتظر تھا۔

عباس بچے کو بازوؤں میں اٹھا کر خیمے سے باہر آ گیا اور سردار کے بے جان سینے پر زندگی کی اس نشانی کو رکھ دیا۔ سردار نے اپنی نگاہوں کو حرکت دی۔ دور افق پر اپنی منزل کے سنہری میناروں سے اپنی نظریں ہٹا کر اس بچے پر مرکوز کر دیں جس کے چہرے میں اپنے دادا کی مشابہت بہت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سردار کی نظریں اپنے چہرے پر ہی ٹھہری ساکت ہو گئیں اور ان آئینوں میں منزل کے آثار اور اس چہرے کا نقش مل کر آخری عکس بن گیا اور جب عباس نے باپ کی آنکھیں اپنی انگلیوں کی پوروں سے بند کیں تو وہ تصویر بھی ان آنکھوں میں بند ہو گئی۔

اگلا روز عباس کی تاج پوشی کا دن تھا۔ صبح ہی صبح بوڑھے سردار کو قبیلے کے رواج کے مطابق صحرا میں ہی دفن کر دیا گیا اور وہاں ریت کا بڑا سا ٹیلہ بنا کر اس پر قبیلے کا پرچم لہرا دیا گیا۔ وہاں سے قریب ہی ایک دوسرے ٹیلے پر نئے سردار کا تخت سجایا گیا۔ شام ہوتے ہی سارا صحرا روشنیوں سے بھر گیا۔ سارا قبیلہ نئے سردار کی رسم تاج پوشی میں شریک تھا۔ جوان خوب صورت لڑکیاں رنگ دار اور چمکیلے لباس پہنے رقص کر رہی تھیں۔ عباس کے پہلو میں رباب اپنے ایک دن کے بیٹے کو گود میں لیے نیم دراز تھی۔ قبیلے کے تمام لوگ تازہ دم ہو چکے تھے۔ ان کے چہروں پر خوشی اور امید کی روشنی تھی۔ صحرا سر سبز ہو گیا تھا۔ ٹوبے پانیوں سے بھر گئے تھے۔ قبیلے کا وارث پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سی خوشیاں اکٹھی ہو گئیں تھیں۔

عباس کے کندھوں پر سرداری کی وہ چادر ڈالی گئی تھی جس کی زمین سبز اور جس پر سنہری کام کیا گیا تھا پھر سردار کے سر پر سونے کا وہ تاج رکھا گیا جس کے بعد سردار کا کہا حکم کا درجہ اختیار کر گیا۔ بڑی بوڑھیوں نے آ کر سردار کی بلائیں لیں۔ خوب صورت' جوان لڑکیاں ناچ ناچ کر سردار کو سلام پیش کرتی رہیں۔ ساری رات جشن کا سماں رہا۔ ڈھول' نفریاں بجتی رہیں۔ سردار کو مبارک بادی سے لاد دیا گیا۔ قریب ہی کچھ فاصلے پر بھیگی ریت کے ٹیلے پر قبیلے کا پرچم گیلا ہو کر سرنگوں رہا اور اس ٹیلے کے عقب میں سر سبز ہونے والی جھاڑیاں خوش بو اچھالتی رہیں۔

آسمان صاف ہو گیا تھا اور ستاروں کی روشنی اور چمک تیز ہو گئی تھی۔ اچانک سردار کی نگاہ اٹھی

اور دور جہاں صحرا اور آسمان کے کنارے آپس میں ملتے تھے، سنہری میناروں پر جا ٹھہری۔ یہ ایک جھلک نہیں تھی بلکہ واضح، ان کی منزل کے نشان تھے۔ بار بار آنکھیں جھپکنے کے باوجود سردار ان کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور اپنی منزل کے نشانات کی طرف بلند کرتے ہوئے بولا۔ "قبیلے والو۔ دیکھ لو۔ وہ رہی ہماری منزل۔ کتنی واضح اور کتنی قریب۔ اب آیندہ، کوئی بھی آدمی اس منزل کے بارے میں کسی شک، کسی بے یقینی کی بات نہیں کرے گا۔"

سردار کی نظروں کے تعاقب میں سب لوگوں کا رخ اسی طرف مڑ گیا اور فرطِ جذبات سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ لوگ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ وہ رہی ہماری منزل۔ وہ رہی ہماری سرزمین جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ جس کی ہمیں خوش خبری دی گئی تھی۔ سردار نے اپنے نوزائیدہ بچے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور اسے اپنے چہرے کے رخ پر بلند کر کے کہنے لگا۔

"وہ ہے ہماری منزل۔ ہماری آنے والی نسلوں کا مستقبل۔"

سردار کھڑا ہو گیا تھا۔ بیٹے کو بازوؤں میں سنبھالتے ہوئے اس نے اعلان کیا۔ "سب لوگ تیاریاں مکمل کر لیں۔ کل ہم یہاں سے اپنا پڑاؤ اٹھا لیں گے اور شام کو ستاروں کے روشن ہوتے ہی اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔"

☆ ☆ ☆

مصطفیٰ کریم

راستا اور روشنی

"ڈوروتھی! کرسمس ٹری کو یہاں سے ہٹا دو۔" صوفہ بیڈ پر لیٹی ایڈنا اپنی بہن سے بولی۔ ڈوروتھی سلگتے آتش دان کے پاس کھڑی کارنس پر رکھے کرسمس کارڈ کو مغموم تک رہی تھی۔ کرسمس کارڈ پیانو' میز اور ننھی الماری پر بھی سجے تھے۔

"کیسے ہٹا دوں۔ گملے سمیت اسے کھسکانا بھی مشکل ہے۔" ڈوروتھی نے بغیر بہن کی جانب دیکھے جواب دیا۔

"بغیر روشنی کے یہ ہیبت ناک لگ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے گھر میں تاریکی ہے۔" ایڈنا کمر کے شدید درد میں مبتلا تھی۔ بوسیدہ رسالے کے ورق جیسا اس کا چہرا پریشان تھا۔

"تمھیں ایسا نہیں محسوس کرنا چاہیے۔ کمرے میں بجلی کا بلب روشن ہے۔" ڈوروتھی بولی اور پاس کے صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں آتش دان میں اٹھتے شعلوں پر تھیں۔ ہیئر ڈریسر نے صبح کے وقت آکر دونوں بہنوں کے سر کے سفید بالوں کو سنوار دیا تھا۔ لیکن بغیر میک اپ کے دونوں کے چہرے کچھ زیادہ ہی ضعیف لگ رہے تھے۔

"یہ روشنی کس کام کی۔ کل کرسمس ہے۔ کاش ہمارے کرسمس ٹری پر روشنیاں ہوتیں اور تحفے ٹانگے جاتے۔ تم پھر کوشش تو کرو۔" ایڈنا نے درخواست کی۔

"کیا تو تھا۔ تاروں کو سلجھانے میں بار بار جھکنا اور کھڑا ہونا..... مجھ سے اتنی محنت اس عمر میں نہیں ہو سکتی۔ پلگ میں بھی کوئی خرابی ہے۔ اور تحفے؟ کسے دینے ہیں؟" ڈوروتھی تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

پانچ فٹ اونچا سرو کا درخت گملے میں لگا تھا۔ جس کے گرد فرش پر بجلی کے تار ننھے ننھے سرخ' سبز' زرد اور نیلے بلب سمیت الجھے پڑے تھے۔ قریب کی میز پر چاکلیٹ کے ڈبے' سستی کتابیں' کنگھیاں اور آئینے چمکیلے کاغذوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

"چھوٹے بھائی نے صرف کرسمس کارڈ بھیج دیا اور فون پر مبارک باد دے دی۔ وہ بھی اپنے بچوں سمیت آج نہیں آیا۔"

"ایڈنا۔ اب اس کے بچے جوان ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے گھر بسا لیے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ان کے یہاں گیا ہوگا۔ برف باری ہے۔ وہ آنا چاہتے بھی تو مشکل ہوتا۔"

"کیا بہت برف گر رہی ہے؟" ایڈنا نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دبلی پتلی اور کمبل میں سکڑی ہوئی وہ خزاں

رسیدہ چیری بلوسم کے درخت جیسی لگ رہی تھی۔

ڈوروتھی اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئی اور دبیز سرخ پردے کو ہٹا کر اس نے باہر جھانکا۔ سفید موتیوں جیسی برف ہوا میں اڑ رہی تھی۔

"بہت نہیں۔ بس اتنی کہ......"

"کہ کل وہائٹ کرسمس ہوگا۔ ہے نا......" ایڈنا نے آنکھیں کھولیں۔ ان میں بشاشت آگئی۔

"ہاں...... عین ممکن ہے۔ اخبار میں بھی یہی اطلاع تھی۔" ڈوروتھی ابھی تک کھڑکی کے پاس تھی۔ بولنے کی وجہ سے اس کی سانس دھند بن کر کھڑکی کے شیشے پر دھبہ بن گئی تھی۔

"وہائٹ کرسمس؟ باہر کے مناظر کل کتنے حسین ہوں گے۔ افسوس میں ان سے محظوظ نہیں ہوسکوں گی۔ پلنگ سے اٹھنا محال ہے۔" ایڈنا پھر اداس ہوگئی تھی۔

"اٹھ بھی سکتیں تو کہاں جاتیں؟ موٹر تو ہے نہیں ہمارے پاس۔" ڈوروتھی منہ سکیڑ کر تلخی سے بولی اور واپس آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا جسم بھاری تھا۔ صوفہ کچھ بچکا گیا۔

"چل پھر سکتی تو کل باہر نکل کر گھوم لیتی۔ لیکن...... لیکن...... اب چلنا بھی مشکل ہے۔ اکثر سوچتی ہوں ضعیفوں کے گھر میں جا کر رہوں۔"

"تم وہاں چلی جاتیں؟ میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتی۔ تم...... تم...... اپنی چھوٹی بہن کو چھوڑ کر چلی جاتیں؟ میں بھی جوان نہیں رہی ایڈنا۔ میرے پاس اتنی رقم نہیں کہ میں بھی تمہارے ساتھ ضعیفوں کے گھر میں رہنے جاؤں۔" تنہائی کے خوف سے ڈوروتھی کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش آگئی تھی۔

دونوں بہنیں چپ ہوگئیں۔ خاموشی چھا گئی۔ سناٹے میں پیانو پر رکھی قدیم گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔

"کتنی خاموشی ہے۔"

"نہیں ایڈنا خاموشی نہیں ہے۔ ہم تم باتیں کر رہے ہیں۔"

ایڈنا نے آہستہ سے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ اس کی نگاہیں کمرے میں رکھے کرسمس کارڈوں پر گھوم گئیں۔

"کتنے سارے کرسمس کارڈ آئے ہیں۔"

"جیسے سارا شہر ہمیں جانتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف پڑوسیوں سے ہماری ملاقاتیں ہوتی ہیں اور کسی سے ملنا جلنا نہیں ہوتا۔ مہینے میں دو تین بار چھوٹا بھائی فون کر دیتا ہے اور کبھی کبھی ملنے آجاتا ہے۔" ڈوروتھی شانے اچکا کر ایک بے جان ہنسی ہنس دی۔

"طاہر اور غزالہ کے کارڈ نہیں آئے؟"

"نہیں ایڈنا۔ پچھلے کرسمس میں بھی نہیں آئے تھے۔ دونوں مختلف شہروں کی یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔"

"کارڈ تو بھیج سکتے تھے۔ کرسمس ہے دونوں اسی شہر میں اپنے والدین کے پاس ہوں گے۔"

"ضروری نہیں۔ کرسمس ان کا تہوار نہیں ہے۔"

"تم نے انھیں بڑی محبت دی تھی۔ یہی موقع یاد کرنے کا ہوتا ہے" ایڈنا آنکھیں بند کیے بولی۔ وہ طاہر اور غزالہ کی بابت سوچ رہی تھی۔ جن کے گھر میں گرم مسالے کی بو ہوتی تھی اور جن کے والدین گھر میں ڈھیلے ڈھالے پاجامے پہنتے تھے۔ اسے ساری اطلاعیں ڈوروتھی سے ملا کرتی تھیں۔

"وقت کے جنگل میں یادیں گم ہو جاتی ہیں ایڈنا۔ ان کے والدین کام پر چلے جاتے تھے۔ گھر میں کسی ایسے فرد کی ضرورت تھی جو دونوں بچوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ وہ میں نے کیا۔ اس کی اجرت مجھے مل جاتی تھی۔ طاہر اور غزالہ جب بڑے ہو گئے تو ان کے گھر میں میری ضرورت نہیں رہی۔ کوئی ضروری نہیں کہ دونوں مجھے یاد رکھیں۔" ڈوروتھی اداسی سے بولی۔ وہ اپنے زرد سوئٹر کی آستینوں کو تک رہی تھی جن کے دھاگے نکل آئے تھے۔

"دوسروں کے بچے اپنے نہیں ہو سکتے ڈوروتھی۔"

"میں نے ایسا کبھی نہیں سمجھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ کنبہ مجھ پر مہربان تھا۔ طاہر اور غزالہ بھی مجھے چاہتے تھے۔ ان کے والدین نے ہمیشہ اپنائیت کا اظہار کیا تھا۔ ہر کرسمس پر دونوں بچے تحفوں سے لدے آتے تھے۔ ان کے گھر میں شراب نہیں پی جاتی تھی۔ لیکن ہمارے لیے شیری اور سوئٹ وائن کی بوتلیں، بسکٹ کے ڈبے، مفلر، جرابیں......" شیریں یادوں سے خوش ہو کر ڈوروتھی ہنسنے لگی۔

"تحفے تو اب بھی تمھارے لیے آتے ہیں۔"

"ہاں چیک کی صورت میں کوئی رقم آجاتی ہے۔ بچے جب تحفوں سمیت آتے تھے تو اس کی بات ہی جدا تھی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"ڈوروتھی رک جاؤ۔ میں ذرا کروٹ بدل لوں۔ چت لیٹے لیٹے تنگ آگئی ہوں۔" ایڈنا بولی اور کروٹ لینے کی کوشش کی۔ اس کی کمر میں زور کی ٹیس بجلی کی لہر بن کر اٹھی۔

"اف خدایا۔ ڈوروتھی۔ بس...... مدد کرو۔"

وہ ایڈنا کی جانب لپکی۔

"اف۔ ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے کمر میں خنجر پیوست کر دیا۔ ڈاکٹر کی گولیوں سے ابھی تک فائدہ نہیں ہوا ہے۔" ایڈنا کا ایک ہاتھ کمر پر تھا اور چہرے پر اذیت کی شکنیں تھیں۔

ڈوروتھی نے کروٹ بدلنے میں بہن کی مدد کی۔ اور اس کی پیٹھ سے تکیے لگا دیے۔

"تم نے میری بڑی خدمت کی ہے ڈوروتھی۔"

"میرے مقدر میں خدمت کرنا لکھا ہے۔ ماں ضعیفی میں اندھی ہو گئی۔ باپ پر فالج گرا۔ پھر چھوٹا بھائی جو عمر میں مجھ سے بارہ سال چھوٹا تھا اس کی دیکھ بھال بھی مجھے ہی کرنی پڑی...... تم نے اچھا کیا اسکول میں پڑھانے نکل گئیں۔"

"سارے الجھے میرے جانے کے بعد ہوئے ورنہ ضرور تمھارا ہاتھ بٹاتی۔"

"پھر تم بھی میری طرح نادار ہو جاتیں۔ والدین کے مرنے کے بعد بڑے بھائی نے قانون کی رو سے ساری

جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ ہمیں ایک کوڑی بھی نہیں ملی۔ خیریت ہوئی والد نے یہ گھر اپنی زندگی میں خرید کر ہمارے نام کر دیا تھا۔ ورنہ نامعلوم میں کہاں جاتی۔ تمہارا گزارا ہو ہی جاتا۔ پنشن جو ملتی ہے۔" بولتے وقت اپنے خالی ہاتھوں کو پھیلا کر ڈورو تھی اپنی مجبوری کا اظہار کرتی رہی تھی۔

"تم شادی کر سکتی تھیں۔ تمہاری اچھی شکل صورت ہے۔"

"تم کون سی بد شکل ہو۔ کیوں بن بیاہی رہ گئیں؟" اپنی تعریف سے خوش ہو کر ڈورو تھی نے ایڈنا سے پوچھا۔

"مرد ریل گاڑی ہوتے ہیں۔ اور ہم عورتیں اسٹیشن پر کھڑے مسافر۔ جب تک فیصلہ کریں سوار ہونا ہے یا نہیں ٹرین روانہ ہو جاتی ہے۔" ایڈنا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میں جیسے کسی قلعے میں محصور تھی۔ اندھی ماں پھر فالج زدہ باپ اس کے بعد چھوٹے بھائی کی دیکھ بھال۔ دل کے دروازے پر کسی نے دستک بھی دی تو مصروفیت کی وجہ سے میں نہیں سن سکی۔" ڈورو تھی نے تاسفانہ سر ہلایا۔

بہن کے بجھے ہوئے چہرے کو ایڈنا نہیں دیکھ سکی۔ چوں کہ اس کا رخ دوسری جانب دیوار کی طرف تھا' جہاں بڑے بھائی کی تصویر ٹنگی تھی۔ ایڈنا کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔ اس کے منھ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔

"کیا ابھی تک آرام نہیں آیا ہے ایڈنا؟"

"آرام؟ مشکل ہے ڈورو تھی۔ سامنے دیوار پر بڑے بھائی کی تصویر ہے۔ میں اس سے نفرت نہیں کر سکی۔ ہم دونوں میں بڑی محبت تھی۔"

"مجھے اس کی کوئی خوبی یاد نہیں۔"

"وہ بہت ذہین تھا۔ اس نے کیمبرج سے ڈگری لی تھی۔ ہمارے خاندان میں کسی نے اتنی تعلیم حاصل نہیں کی۔"

"ایسی تعلیم کس کام کی جو انسان کو لالچی بنا دے۔"

"وہ ایسا نہیں تھا ڈورو تھی۔ بیوی نے اسے بدل دیا۔" ایڈنا اپنی ناک کو ٹیشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے بولی۔ اسے بڑا بھائی شدت سے یاد آ رہا تھا۔

"پھر وہ لالچی اور بد عقل دونوں ہی ہے۔ تمہاری وجہ سے اس کی تصویر یہاں لاؤنج میں ہے۔"

"والدہ کا پیانو۔ والد کی مخصوص میز اور چمڑے کی گدے دار کرسی۔ ہمارے بچپن کی تصویریں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آبائی گھر کی بہت سی نشانیاں یہاں ہیں۔ اسی لیے میں نے بڑے بھائی کی تصویر بھی یہاں ٹانگ دی۔"

آبائی گھر کے ذکر سے ڈورو تھی کی آنکھوں کے سامنے اس کا بچپن آ گیا۔ اس وقت ان کے والدین خوش حال اور خوش و خرم تھے اور وہ اپنی ایک بہن اور بڑے بھائی کے ساتھ چہکتی پھرتی تھی۔ چھوٹا بھائی

اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا۔ کرسمس میں لندن کی سیر' برائٹین کے پومیناڈ پر ہاتھوں میں غبارے پکڑے ہوئے بھاگنا' جب زندگی کا نام مسرت تھا۔ صرف مسرت۔ بھلی یادوں کی سرشاری سے اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

"آج کرسمس کی رات ہے مجھے برے خیالوں کو دل سے نکال دینا چاہیے۔"

ڈورو تھی ماضی کے خوش گوار باغ میں پھرتے ہوئے بولی۔ ایڈنا نے بھی ہاتھ کی ہلکی جنبش سے ہاں کر دی۔

اچانک باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں بہنیں چونک پڑیں۔

"کون ہے؟" دروازے کے پاس پہنچ کر ڈورو تھی پکاری۔

"للی۔ ہم طاہر اور غزالہ ہیں۔" دونوں بھائی بہن نے کسی نامعلوم وجہ سے بہار کے ایک پھول کا نام ڈورو تھی کو دے رکھا تھا۔

"آؤ۔ آؤ۔ اندر آؤ۔ خوش آمدید۔ اتنی سردی اور برف باری میں آگئے۔" ڈورو تھی دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر سے افسردگی مٹ گئی اور چہرا دھلے ہوئے شیشے کی طرح صاف ہو گیا۔ اس نے دونوں کے سرد گالوں کو باری باری چوما۔

"ایڈنا۔ دیکھو کون آئے ہیں۔" ڈورو تھی ہال سے پکاری۔

سانولے اور نوجوان طاہر اور غزالہ دبلے پتلے تھے۔ پرانی مانوسیت کی وجہ سے دونوں کے چہرے پر مسکراہٹیں تھیں۔ انھوں نے برف سے نم اپنی ٹوپیاں' مفلر اور ڈفل کوٹ اتار دیے۔ سب لاؤنج میں آگئے۔ طاہر اور غزالہ نے ایڈنا کو کرسمس مبارک کہا۔ ایڈنا نے بھی مبارک باد کے وہی الفاظ استعمال کیے اور ہاتھ ہلا کر خوشی کا اظہار کیا۔

"یہ کرسمس کارڈ ہم لوگوں کی جانب سے ہیں اور یہ لفافہ خاص طور پر تمھارے لیے والدین نے بھیجا ہے۔" ڈورو تھی کی جانب لفافوں کو بڑھاتے ہوئے طاہر بولا۔

وہ سمجھ گئی کہ لفافے میں تیس پاؤنڈ کا چیک ہوگا۔ یہی رقم اسے کرسمس کے موقعوں پر طاہر اور غزالہ کے والدین سے تحفے میں ملتی تھی۔ ڈورو تھی کا چہرا خوشی سے تمتمانے لگا۔ اس نے چیک والے لفافے کو میز پر رکھ دیا اور کرسمس کارڈ کو کارنس پر سجا دیا۔

"بہت بہت شکریہ۔ تمھارے والدین بہت مہربان ہیں۔ ان سے ضرور کہنا۔" ڈورو تھی مسکراتے ہوئے بولی۔

ایڈنا نے مڑ کر طاہر اور غزالہ کی جانب دیکھنا چاہا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

"تمھیں کیا ہوا ایڈنا؟" غزالہ نے کسی قدر خلوص سے پوچھا۔

بھائی بہن صوفہ بیڈ کے قریب آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ جس پر کروٹ کے بل ایڈنا لیٹی تھی۔

"کمر کے درد نے مجبور کر رکھا ہے۔ دوا کھا رہی ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے بستر پر لیٹ کر آرام کرتی رہوں۔ دو ہفتے میں آرام آجائے گا۔ ڈورو تھی ذرا مدد کرو تاکہ میں ان بچوں کی جانب رخ کرلوں۔"

"اب ہم بچے نہیں ہیں۔ غزالہ یونی ورسٹی کے پہلے سال میں ہے اور میں فائنل کر رہا ہوں۔" طاہر نے ہنستے ہوئے احتجاج کیا۔

"میری نگاہ میں بچے ہی رہو گے۔ وہ دن بھول گئے جب میں تم دونوں کو چلنا سکھا رہی تھی۔" ڈوروتھی بشاشت سے بولی اور ایڈنا کی کروٹ بدلنے میں مدد کرنے لگی۔

ایڈنا کراہتے ہوئے سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔

"آؤ۔ میرے قریب آؤ۔" ایڈنا نے باری باری طاہر اور غزالہ کو چوما۔

"دونوں ہم عمر لگتے ہیں۔ ہیں نا ڈوروتھی۔"

"غزالہ اپنے بھائی سے ایک سال چھوٹی ہے۔" ڈوروتھی نے بھائی اور بہن کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

تم دونوں پچھلے کرسمس میں کیوں نہیں ہمارے پاس آئے؟" ایڈنا نے بناوٹی غصے سے پوچھا۔

"ہم سب لوگ رشتے داروں سے ملنے پاکستان گئے ہوئے تھے۔ ہم نے وہاں سے کرسمس کارڈ بھیجا تو تھا۔ کیا نہیں ملا؟"

دونوں بہنوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ڈوروتھی' ان کے لیے چائے لاؤ۔"

"میں تمھاری مدد کر دیتی ہوں۔" صوفے پر سے غزالہ اٹھتے ہوئے بولی۔

وہ اور ڈوروتھی کچن میں چلی گئیں۔ جہاں سے چند لمحوں بعد چینی کے برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں آنے لگی۔ کچھ دیر بعد چائے کے ساتھ میٹ پائی بھی آیا۔

"کشمش سے بھری نان خطائی کو میٹ پائی کیوں کہتے ہیں؟ میں کبھی سمجھ نہیں سکا۔" طاہر ایک میٹ پائی کھاتے ہوئے بولا۔

"ہم انگریزوں کی بد عقلی۔ جب ہمیں پہلی بار کشمش ملی تو ہم نے اسے میٹھا گوشت سمجھا۔" ایڈنا نے منھ بگاڑ کر مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ اس کی کمر کے پیچھے تکیہ رکھ کر اسے نیم دراز کر دیا گیا تھا۔ وہ چائے پی رہی تھی۔

"اس کرسمس ٹری میں روشنی کیوں نہیں ہے۔" غزالہ نے اپنے ہونٹوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بتاؤں۔ بجلی کے یہ تار مجھ سے نہیں سلجھتے اور نہ پلگ کو سرکٹ میں لگانے سے کچھ بنا۔" ڈوروتھی تاسفانہ بولی۔

"آؤ غزالہ ہم کوشش کرتے ہیں۔" طاہر نے کہا۔ وہ اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔

بھائی بہن نے مل کر تار کو سلجھایا اور اسے کرسمس ٹری کے چاروں طرف لپیٹ دیا۔ جب طاہر نے پلگ کو سرکٹ میں لگایا تو روشنی نہیں ہوئی۔

"للی۔ اسکرو ڈرائیور لاؤ۔ شاید پلگ میں کوئی خرابی ہے۔"

پھول کے نام سے مخاطب کیے جانے پر ڈوروتھی ہنس پڑی۔ ایڈنا بھی مسکرا دی۔ ڈوروتھی اسکرو ڈرائیور لے آئی۔ اس کی مدد سے طاہر نے پلگ کھولا۔

"دیکھو یہ تار پن سے نکلا ہوا ہے۔" طاہر نے کہا اور تار کو پن سے جوڑ دیا۔

جوں ہی اس نے پلگ کو سرکٹ میں لگایا رنگ برنگی روشنیاں کرسمس ٹری کی شاخوں پر لٹک اٹھیں۔

"ونڈر فل۔" دونوں بہنیں مارے خوشی کے بے اختیار پکار اٹھیں۔

غزالہ اٹھ کر پیانو کے پاس گئی اور اسٹول پر بیٹھ کر کرسمس کی ایک مقبول دھن بجانے لگی اور ساتھ ہی گانے بھی لگی۔

Jingle bell, Jingle bell

Jingle all the way

Oh what fun is to ride

Oh the open sleigh

ڈوروتھی نے میز پر رکھی رنگ برنگی کاغذی جھالروں کو سبھوں کے سر پر پہنا دیا۔ ایک گلابی رنگ کی جھالر اس نے خود بھی پہن لی۔ دونوں بہنوں کی عمر رفتگاں کا سیل رواں خوشیوں کی دیوار سے ٹکرا کر پیچھے کی جانب مڑ گیا۔ دونوں کی رگوں میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔ افسردگی کی راکھ میں چھپی مسرتیں چنگاریاں بن کر اڑنے لگیں۔ دونوں بہنیں غزالہ کی آواز میں آواز ملا کر گانے لگیں۔ طاہر نے بھی جھوم جھوم کر ان کے ساتھ اپنی آواز ملا دی۔

باہر اب بھی برف گر رہی تھی جو سڑک پر جلتی بجلی کی روشنی میں ہیرے کے ذروں کی طرح اڑ رہی تھی۔

بزمِ خیال

قیصر عالم

بزمِ خیال*

اور دنوں کی طرح اس دن بھی وہ دونوں برٹش کونسل بس یوں ہی چلے گئے تھے۔ اور کرتے بھی کیا۔ اسٹیشن کے ساتھ مغل سرائے میں چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہی دونوں کچھ نڈھال سے ہوگئے تھے۔ پتا نہیں کیوں جب قریبی دوست اپنے اپنے طور پر بیزار سے ہوجاتے ہیں تو خواہ مخواہ کچھ فاصلے سے چلنے لگتے ہیں۔ یونی ورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیے ہوئے حالاں کہ دونوں کو چار سال ہو چکے تھے لیکن وہ اب بھی ہفتے میں کم سے کم تین دن ضرور جامعہ کراچی جاتے، اپنے بہ تدریج بوڑھے ہوتے ہوئے استادوں سے ملتے، چائے پیتے، پرانے ساتھیوں کے بارے میں دریافت کرتے اور پھر کینٹ اسٹیشن جانے والی بس میں تھک کر بیٹھ جاتے۔ برسوں سے یہی سلسلہ چلا آرہا تھا۔ ایک کو نوکری ملتی نہیں تھی، دوسرا نوکری پر جاتا نہیں تھا۔ شوق تھا تو صرف ایک۔ برٹش کونسل اور امریکن لائبریری سے بھاری بھاری خوب صورت کتابیں ایشو کرانا اور پھر انھی کتابوں پر سر رکھ کر فریئر ہال کے لالہ زار میں شام کی ڈھلتی ہوئی دھوپ اور کوّوں کی کائیں کائیں کے درمیان ہلکی سی نیند کی جھپکی۔ چہرے پر نئی کتاب کی سخت خوشبو اگرچہ دھوپ تو روک لیتی تھی لیکن پوری طرح نیند نہیں آنے دیتی تھی۔

"یار آج وہ تمھارا امرود والا نظر نہیں آرہا۔"

"آتا ہی ہوگا۔ خواہ مخواہ اتنی کتابیں ایشو کروالیتے ہیں۔ مجھ سے تو لائبریری کی کتابیں پڑھی ہی نہیں جاتی۔ اٹھائے اٹھائے کلائیاں الگ دکھنے لگتی ہیں۔"

"چلو اٹھو یار۔ آج وہ نہیں آئے گا۔"

"سلام صاحب۔ آج آپ کی مرضی کے امرود ہیں نہیں۔ دوسری طرف نکل گیا تھا۔ کچھ نوجوان لڑکیاں......"

---

*اس بزم کے تمام کردار فرضی ہیں، کسی بھی قسم کی مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی۔

"چلو ایک آدھ تو مل ہی جائے گا۔"

"اچھا پیسے کل لے لینا۔"

"بھئی اب سیدھے تھامس اینڈ تھامس چلتے ہیں۔ شعیب اگر چلے گئے تو نئی کتابیں تلاش کرنی مشکل ہو جائیں گی۔"

"امریکن سینٹر میں سیل لگی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے مارکیز کی کوئی نئی کتاب ہی مل جائے۔"

"تم جانو..... میں تو تمھیں تھامس پر ہی ملوں گا۔"

ریگل چوک پر حسب معمول بڑی رونق تھی۔ پرانی کتابوں والے اپنی اپنی دریاں بچھائے کتابوں کی مختلف ڈھیریاں بنا رہے تھے۔ ایک سرے پر گنّے کی مشین دیوانہ وار چل رہی تھی اور تھکن اور بیزاریت سے چور لوگ تیز اوچھی موسیقی پر گھبرا گھبرا کر گنّے کا رس پی رہے تھے۔ قریب ہی فرش پر ایک اپاہج لڑکا اپنے سیدھے پاؤں کے انگوٹھے میں پنسل پھنسائے اردگرد کی افراتفری کو طرح طرح کے نقش و نگار بنا کر اور بھی الجھا رہا تھا۔ ایک کھانستا ہوا بوڑھا آدمی بلغم کا پٹاخہ درخت کی جڑ میں مار کر اپنی پھٹی ہوئی آستین سے پونچھ رہا تھا۔ شام ڈھل چکی تھی اور اندھیرا دھیرے دھیرے شوکیسوں میں جلتی ہوئی لائٹوں کو اجاگر کرتا جا رہا تھا۔ تھامس اینڈ تھامس میں شعیب ایک بوسیدہ میز کے پیچھے بیٹھا اپنے ناخن دیکھ رہا تھا۔ کچھ لوگ دکان میں ادھر ادھر کھڑے ہوئے کتابیں دیکھ رہے تھے۔

"پھر بھول گئے اس سال کا کیلنڈر! کل آپ کے دفتر فون کر کے یاد دلاؤں؟"

"کوئی نئی کتاب؟"

"آپ کے مطلب کی نہیں ہیں ویسے دیکھ لیجیے شاید کچھ مل جائے۔"

"ارے تم کب پہنچے؟"

"امریکن سینٹر بند تھا۔ شاید وائٹ واش ہو رہا تھا۔"

"تو چلو یہاں دیکھ لو۔ مارکیز کی کتابیں یہاں بھی تو ہوتی ہیں۔"

"مل تو گئی لیکن مہنگی بہت ہے۔ اب انسان......."

"ہے کتنے کی۔ چلو باقی میں دیے دیتا ہوں۔"

"آج پتا نہیں کیوں تھکن بہت ہو گئی۔ چلو سامنے ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔"

"آغاز تو بڑا اچھا کیا ہے۔ لگتا ہے کتاب جان دار ہو گی۔"

"ارے چھوڑو بھی یار۔ گھر جا کر پڑھ لینا۔ چائے تو منگواؤ۔ میں تو اب کہیں نہیں جا رہا۔ بھاڑ میں گیا گھر۔ جب تھکن اترے گی تو نکلیں گے۔ کیوں؟"

"پتا نہیں۔"

"یار میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔ تم ہو کہ کتاب ہی ہاتھ سے نہیں رکھتے۔ حد ہو گئی۔"

"یار خدا کے لیے کبھی تو پڑھنے دیا کرو۔ ناول ہی پڑھ رہا ہوں کوئی گناہ تو نہیں کر رہا۔"
"ضرور پڑھو لیکن ادب پڑھنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ یوں نہیں کہ ......"

ریسٹورنٹ میں نیم تاریکی تھی۔ زیادہ تر لوگوں کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ وہ یہاں خاصی دیر سے بیٹھے ہیں۔ کچھ لوگ بے وقت کھانا کھاتے ہوئے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ سفید لباس میں ملبوس بیرے ایک ہاتھ میں چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اور دوسرا ہاتھ جیب میں ڈالے کیرم بورڈ کی گوٹوں کی طرح ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ سیٹھ لکڑی کے ایک پرانے کاؤنٹر کے پیچھے لاپرواہی سے بیٹھا دانتوں میں خلال کر رہا تھا۔ پیسے لیتے اور گنتے وقت بھی وہ ذہنی طور پر حاضر نظر نہیں آتا تھا۔ ایک شخص بہت دیر سے اس کے برابر کھڑا اپنی گردن سے میل اتارتا پھر اس کی گولی بنا کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف پھینک دیتا۔

"تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"
"تم نے پی لی۔ ارے کچھ خدا کا خوف کرو۔ اب ایسی بھی کیا ذہنی عیاشی؟"
"تمہارے خیال میں ناول پڑھنا ایک ذہنی عیاشی ہے؟"
"وہ ہیں نا آپ کے مغربی ادب کے امام۔ ایلیٹ صاحب وہ غالباً" یہی کہتے ہیں۔"
"یار ایلیٹ نے یہ تو نہیں کہا تھا۔ میرا خیال ہے اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ ادب کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی ذہنی اور لطیف لذت حاصل ہو۔ آپ نے اور کچھ نہیں تو اس بلند نظریے کو محض عیاشی کہہ دیا۔"
"واہ بھئی۔ ایلیٹ تو تمہاری حاضر یادداشت میں زندہ رہتا ہے۔ اچھا یہ ......"
"یار میں کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ مجھے تھوڑا ناول پڑھنے دو۔"
"ادھر لاؤ یہ کتاب۔ اب جب بات شروع ہو ہی گئی ہے تو پھر یہ بتاؤ کہ کیا تم ایلیٹ کے مقرر کردہ معیارات کے تحت مغربی ادب پڑھتے ہو؟"
"نہیں اب ایسا بھی نہیں ہے لیکن بہرحال مغربی ادب کی قدر و قیمت تو وہیں کے نقاد طے کریں گے نا۔"
"بہت خوب۔ تو کیا مغرب میں تمہارے خیال میں تنقید کی کوئی مستند روایت بھی ہے؟"
"سنو ذرا چائے اور لے آنا۔ تم کچھ کھاؤ گے؟ مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ اچھا دیکھو......
عجیب آدمی ہے بات سننے سے پہلے ہی دوسری میز پر چلا گیا۔"
"ایلیٹ کیا کسی سے کم ہے؟"
"یار تم تو ہمیشہ مجھ سے اچھے student رہے ہو۔ ہم تو انگریزی میں ایم اے کرنے بس یوں ہی چلے آئے تھے۔ تم تو کلاس میں بڑے عجیب عجیب سوالات کرتے تھے۔ یاد ہے جب پروفیسر امین نے ایلیٹ کی یہ بات کہ ہیملٹ ایک artistic failure ہے کہی تھی تو آپ جناب نے کلاس ہی کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔

اب ایسی کایا پلٹی کہ یہی ایلیٹ صاحب آپ کے پیرو مرشد ہو گئے۔"
"دیکھو۔ بات بالکل سیدھی ہے۔ اس وقت ہم سب شیکسپیئر کے سحر میں مبتلا تھے۔ وہ تو بعد میں جب میں نے ایلیٹ کے مضامین پڑھے تو اندازہ ہوا کہ مغربی فکر و ادب میں ایلیٹ کتنا بنیادی آدمی ہے۔ پھر......"
"پھر یہ کہ جناب ایلیٹ کو پڑھا تو ہم نے بھی ہے لیکن مجھے تو موصوف ادب کے اتنے بڑے مسیحا نظر نہیں آتے جتنا آپ ان کو سمجھتے ہیں۔"
"مسیحا تو میں ان کو نہیں کہتا۔ ہاں البتہ......"
"اچھا چلو۔ بہ قول تمہارے مغرب کے اگر کچھ معیارات ہیں تو کیا ایلیٹ صاحب یہ بات کہتے ہیں؟"
"کیوں نہیں۔ اب ایلیٹ کا تصورِ روایت ہی لے لو۔"
"بھائی برا نہیں ماننا۔ ہم غالباً" سنجیدہ گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ مغربی ادب میں تم نے تصورِ روایت کہاں سے تلاش کر لیا؟"
"تو کیا تم ایلیٹ کے تصورِ روایت کو روایت ہی نہیں سمجھتے؟"

سامنے والی میز پر ایک شخص جو شاید پچاس کے قریب ہوگا۔ گالف کی کیپ پہنے' گلے میں لال اسکارف ڈالے چائے کی پرچ تواتر کے ساتھ میز پر اپنے ہاتھوں سے گھماتا اور پھر بڑے انہماک سے اسے گھومتے اور ساکت ہوتے دیکھتا۔

"بھائی میرے' روایت کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کا تسلسل کے ساتھ ایک قوم اور معاشرے سے عہد بہ عہد تواتر کے ساتھ منتقل ہونا۔ اب تم پوچھو گے کہ یہ چیز جسے میں روایت کہہ رہا ہوں کیا' ہوتی ہے اور کس طرح ایک عہد سے دوسرے عہد میں صحت کے ساتھ منتقل ہوتی ہے؟"
"ٹھیک ہے مانا۔ لیکن میں بات کر رہا ہوں مغربی ادب کی۔ اور مغربی ادب کی تفہیم کے سلسلے میں ایلیٹ بہرحال ایک بنیادی آدمی ہے۔"
"چلو تمہاری بات مانے لیتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ایلیٹ صاحب روایت کے بارے میں کہتے کیا ہیں؟"
"اوہو۔ تم ہمیشہ میری چائے میں چینی زیادہ ڈال دیتے ہو۔ اچھا خیر۔ ایلیٹ کے بارے میں ایک نہایت اہم بات تو یہی ہے کہ وہ عیسائی ہے اور وہ بھی سرچڑھا یعنی رومن کیتھولک۔ دوسرے وہ تاریخی شعور پر بہت زور دیتا ہے۔"

سامنے گہرے ہرے رنگ کی دیوار پر ایک بڑی سی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ شاید قیامِ پاکستان کے بعد نقلِ مکانی کرنے والے مہاجرین کے بارے میں تھی۔ تاریخ کبھی کبھی دیوار پر یوں بھی آویزاں ہو جاتی ہے۔ منجمد وقت بہنے لگتا ہے اور پھر تھوڑی ہی دیر میں آوازیں آنے لگتی ہیں۔ پاکستان زندہ باد۔ مسلم لیگ زندہ باد۔ لے کر رہیں گے پاکستان۔

پاکستان کا مطلب........

"ارے میاں کہاں کھو گئے؟"

"کچھ نہیں تمہارے ایلیٹ صاحب کے تاریخی شعور کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا۔ کیا ہے موصوف کا تاریخی شعور؟"

"ایلیٹ کہتا ہے کہ تاریخی شعور ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جہاں آدمی کو زمانیت اور لازمانیت کا احساس الگ الگ بھی ہو اور بہ یک وقت بھی۔ سمجھے!"

"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ یار برا نہ ماننا مجھے تو یہ خاصی احمقانہ سی بات لگتی ہے۔"

"کیا گھاس کھا گئے ہو۔ ارے ایلیٹ کو احمق کہہ رہے ہو!"

"میاں سامنے کی بات ہے۔ یا تو آدمی تاریخی شعور کی بات کرلے یا پھر لازمانیت کی۔ میرے بھائی تاریخ تو manifest ہی زمان میں ہوتی ہے۔ بہرحال تم بولتے رہو۔ آج تمہارا دن ہے۔"

"ایک تو تم ہر بات میں کوئی نہ کوئی فلسفیانہ موشگافی کا پہلو نکال لیتے ہو۔ ہو سکتا ہے ایلیٹ کے نزدیک زمانیت اور لازمانیت سے مراد ادیب یا شاعر کی اس پر اسرار کیفیت سے ہو جس کے تحت کوئی بھی ادب پارہ تخلیق ہوتا ہے اور......"

کئی مرتبہ چائے منگوانے سے میز پر دو چار بار المونیم کی پتلی چادر کے بنے ہوئے چینی دان اور دودھ کی کپیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ ایک پرچ میں بجھی ہوئی سگریٹ پڑی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے سیٹھ کے کاؤنٹر کی طرف جاتے۔ اپنا حق سمجھتے ہوئے ایک کے بجائے کئی خلال اٹھاتے اور دوسروں پر لاپرواہی سے نظر ڈالتے ہوئے باہر چلے جاتے۔ اب ہوٹل میں دو چار ہی لوگ رہ گئے تھے جو شاید اس لیے بیٹھے تھے کہ گھر جا کر وہ کرتے بھی کیا؟ وہی شکایتیں، بچے، شور، بیوی اور میلی چادر والا پلنگ جس سے ملحق کھڑکی سے سامنے کھمبے میں الجھے ہوئے تاروں پر نہ معلوم کب سے ایک مردہ کوا لٹکا ہوا تھا۔

"نہیں بھائی یہاں ایلیٹ صاحب غالباً غلطی پر ہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، مشرق میں ادب اور دیگر علوم و فنون کو حقیقت تک پہنچنے کا صرف ایک ذریعہ سمجھا گیا ہے، اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔"

"لیکن ایلیٹ یہ بھی تو کہتا ہے کہ ہر نسل کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے اور وہ ادب کو اپنے مخصوص مزاج کے ذریعے ہی سمجھ سکتی ہے۔"

"یار یہ آپ کے ایلیٹ صاحب بھی خوب ہیں۔ کبھی نقطۂ نظر کی بات کرتے ہیں اور کبھی اسی نقطۂ نظر کو واضح ادبی معیار کے مترادف بھی ٹھہراتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ ان ادبی معیارات کے لیے واضح اخلاقی معیارات بھی ہونے چاہییں......"

"تو بھائی مغرب میں ایلیٹ ہی تو وہ واحد مفکر ہے جو ادب کو دین اور اخلاقیات کے تحت سمجھنے کی کوشش

کرتا ہے۔ کیوں؟"

"اب میں کچھ کہوں گا تو تم برا مان جاؤ گے۔ بھائی ایلیٹ تک آتے آتے تو مغرب میں تمام اخلاقی معیارات کا دیوالیہ نکل چکا تھا۔ پھر یہ ایلیٹ صاحب کن اخلاقی معیارات کی بات کرتے ہیں۔"

اب کوئی ساڑھے سات بج رہے تھے۔ خاموشی سفید میز پوشوں پر بیٹھی اونگ رہی تھی۔ پھر اچانک ریسٹورنٹ میں فیومیگیشن والے آ گئے۔ سیٹھ سے کچھ دیر بات چیت کی۔ دو چار میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف نظریں دوڑائیں اور پھر بددلی کے ساتھ اپنا سامان فکس کرنے لگے۔

"یار یہ کہاں سے آ گئے؟"

"کیا؟ معیارات!"

"نہیں بھئی۔ وہ دیکھو 'فیومیگیشن والے۔ بس اب اپنا کام شروع کرنے ہی والے ہیں۔ میرا خیال ہے اب اٹھ لیا جائے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ رکھ لیجئے۔ آخر ہم لوگ روز ہی تو یہاں آتے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ باقی پیسے کل ایڈجسٹ کر لیجئے گا۔"

"تم نے کبھی اس سیٹھ کی ناک پر غور کیا ہے؟ خاصی عمر ہے اس کی۔ ناک کے اوپر باریک باریک سوراخ ہیں جن میں ہلکے نیلے رنگ کا میل بھرا ہوا ہے۔ مجھے تو بڑی وحشت......'

"چلو آج بس' بندر روڈ سے پکڑیں گے۔ پیدل چلنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"ہاں جناب تو پھر بتایئے اخلاقی معیارات آتے کہاں سے ہیں؟"

"سیدھے ہاتھ کی فٹ پاتھ پر چلیں گے۔ یار دیکھو یہ اخلاقیات وغیرہ تو میں جانتا نہیں ہاں اتنی بات ایلیٹ ضرور کہتا ہے کہ ہر نسل ادب کو اپنے طریقے سے پڑھتی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی بدولت....."

"لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ روایت بدلتی رہتی ہے۔ یہ کیا مذاق ہے؟"

"لیکن......"

"جی ہاں جناب یہ تضاد ہے۔ کھلا ہوا تضاد۔ بھئی ایلیٹ ڈانٹے کو پسند کرتے تھے نا۔ مگر کیا انہیں معلوم تھا کہ ڈانٹے نے اپنی Divine Comedy کے بنیادی اجزا کہاں سے لیے تھے؟"

"شاید ابنِ عربی سے۔ پھر؟"

"شاید نہیں یقیناً۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ابنِ عربی کا اسلوب بھی تو خاصا تخلیقی نوعیت کا ہے۔ ہو سکتا ہے ڈانٹے نے تخلیقی مہارت اور اسلوب کی پیروی کی ہو اور اصول لاشعوری طور پر اس کی نظم میں آ گئے ہوں۔ آدمی inspiration تو کہیں سے بھی حاصل کر سکتا ہے۔"

فٹ پاتھ کے ساتھ پرانے زمانے کی بنی ہوئی مضبوط عمارتیں کھڑی ہوئیں تھیں۔

کھمبوں پر کچھ لائٹیں جل رہی تھیں اور کچھ خراب ہونے کی وجہ سے کبھی جلتیں اور کبھی بجھ جاتیں۔ کبھی کبھی کسی عمارت کے آگے چبوترہ نما جگہ سی آجاتی جن پر ایک دو پارسی بوڑھے خاموش بیٹھے اس وقت کے کراچی کو زندہ کرنے کی کوشش کرتے جو تقسیم سے پہلے ایک صاف ستھرا شہر تھا۔ سڑکیں دھلتی تھیں اور جگہ جگہ موتیا اور گلاب کے پھول بکا کرتے تھے۔ بوڑھے لوگ بھی دراصل روایت کی طرح ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

"یار تھک گئے۔ وہ سامنے چبوترے پر بیٹھتے ہیں۔ تم نے بھی جلدی گھر جا کر کیا کرنا ہے۔"

"پان لیے تھے کیا؟ نہیں سگریٹ پینے کو دل نہیں چاہ رہا۔ وہ تمہاری کتاب کہاں ہے؟ چھو ہاں دیکھو وہ جو تم بات رہے تھے نا inspiration کی تو بات یہ نہیں ہے۔ ڈانٹے نے باقاعدہ ابن عربی سے استفادہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم جیسے آدمی کو ہٹ دھرمی زیب نہیں دیتی۔"

"ارے ذرا دیکھنا۔ کہیں یہ اپنے یزدانی صاحب تو نہیں۔ شاید اسی طرف آ رہے ہیں۔"

"یزدانی صاحب۔ آپ یہاں کیسے؟ آج کالج نہیں گئے؟"

"نہیں بھئی۔ سوچا آج گول ہی کر جاؤ۔ معلوم ہوا تھا ایلنڈ تھامس پر کچھ نئی کتابیں آئی ہوئی ہیں۔ کم بخت مہنگی اتنی ہیں کہ........."

"ہم بھی وہیں سے آ رہے ہیں۔ تھک گئے سوچا یہاں بیٹھ جائیں۔"

"چلو یہ اچھا ہوا۔ آپ مل گئے۔ گھر تو چھوڑ ہی دیں گے نا۔

"بھئی میری گاڑی کا سائلنسر پھٹ گیا ہے۔ یہاں پچھلی گلی میں بننے کے لیے دی ہے۔ عجیب مکینک ہے کہتا ہے ایک گھنٹہ لگے گا۔ چلو خیر کوئی بات نہیں۔ سگریٹ ہے تمہارے پاس۔"

جلتے بجھتے بل بورڈز کے نیچے قطار میں فٹ پاتھ کی طرف ہلکی سی جھکی ہوئی گاڑیوں اور سمندر کی طرف سے چلنے والی تیز مگر خاموش ہوا نے پورے ماحول کو خنک اور ساکت بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی پلاسٹک کا کوئی خالی تھیلا سڑک سے فضا میں بلند ہوتا اور بجلی کے بے ترتیب اور الگنیوں کی طرح لٹکتے ہوئے تاروں میں الجھ جاتا۔ دو ایک بوسیدہ عمارتوں کے گندے پائپوں پر کچھ چیلیں بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔

"بھئی کچھ یاد نہیں پڑتا آج کتنے سالوں بعد اس طرح سڑک پر تم لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ اور سناؤ کیا کر رہے ہو۔ کیا پڑھ رہے ہو؟"

"اپنے دوست سے پوچھیے۔ کچھ پڑھنے ہی نہیں دیتے۔ ہر وقت تہذیب و تاریخ کی بحث ہے اور فلسفیانہ موشگافیاں۔"

"یہ ہر سنجیدہ بات کو جو ان کے سمجھ میں نہ آئے 'فلسفیانہ موشگافی' سمجھتے ہیں۔ ذرا ان سے فلسفے کی تعریف تو پوچھیے۔"

"کیوں بھئی......."

"نہیں یزدانی صاحب یہ بات نہیں ہے۔ ابھی شام ہی کی بات ہے۔ میں اچھا خاصا ریسٹورنٹ میں بیٹھا مارکیز کا نیا ناول Of Love and other Demons دیکھ رہا تھا۔ بس یہ شروع ہوگئے۔ اچھا مغربی ادب پڑھ رہے ہو وغیرہ وغیرہ۔ بس اسی وقت سے کتاب توڑ ... طرف' اور کچھ نہیں تو ایلیٹ میں کیڑے نکال رہے ہیں۔"

"کیوں بھئی' یہ ایلیٹ پر اتنا غصہ کیوں ... ب کے سلسلے میں........"

"قطعِ کلام کی معافی چاہتا ہوں۔ یزدانی صاحب انگریزی ادب تو آپ بھی پڑھاتے ہیں۔ انھیں تو خیر چھوڑیے۔ یہ تو انگریزی ادب کے دھتی ہیں۔ کم سے کم میں اب ادب کو اور خصوصی طور پر مغربی ادب کو غیر مشروط طور پر ایک اعلیٰ ترین انسانی سرگرمی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ادب لکھنے اور پڑھنے کے آخر کچھ تو معیارات ہونے چاہییں' کیوں؟"

"بھئی بات تو معقول ہے۔"

"اچھا تو اب آپ بھی ان کی طرف داری کرنے لگے۔ خوب!"

"دیکھو بھئی بات طرف داری کی نہیں ہے۔ ہم سب دوست ہیں۔ تم لوگ تو پھر بھی تھوڑا بہت ادب پڑھ لیتے ہو۔ ہمیں تو درس و تدریس ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ اختلاف ہے کس بات پر۔"

"کچھ نہیں یہ کہتے ہیں کہ ایلیٹ نے روایت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ تضادات سے بھرا ہوا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو ہمیں ایلیٹ کو یہ کریڈٹ تو دینا چاہیے کہ کم از کم اس نے ادب کو دین اور مذہب کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش تو بہرحال کی۔"

"نہیں یزدانی صاحب۔ اصل بحث یہ نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایلیٹ نے ادب کو سمجھنے سمجھانے کے لیے دین اور مذہب کی اہمیت پر زور دیا۔ لیکن کیا اس سے پہلے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ایسے مغربی معاشرے میں جو مابعد الطبیعیات سے اپنا رشتہ چار سو سال پہلے کاٹ چکا ہو' ہم یہ دیکھیں کہ ایلیٹ کے ہاں عقاید سے مراد کیا ہے؟"

"ارے بھائی وہ ادب کا آدمی ہے تم اس کے عقاید کے پیچھے کیوں پڑ گئے......."

"دیکھا یزدانی صاحب آپ نے۔ جو آدمی تاریخی شعور کی بات کرتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ ادب میں مذہب اور عقیدہ بھی ڈال رہا ہو اس کے عقاید کی نوعیت اگر ہم نہیں دیکھیں گے تو پھر کیا......."

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اچھا تمھیں ایلیٹ کے عقاید پر کیا اعتراض ہے؟"

"دیکھیے یزدانی صاحب ایلیٹ خود کو کہتے تو رومن کیتھولک ہیں لیکن ہم آپ سب جانتے ہیں کہ پچھلے پانچ چھ سو سالوں میں عیسوی دین میں کتنی شکست و ریخت ہوئی ہے۔ درجنوں ایسی کتابیں تو میری نظر سے گزر چکی ہیں جو "اصل عیسائیت" کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ کوئی کہتا ہے Rediscover Real Christianity اور کوئی جیکب نیڈل مین کی طرح

Lost Christianity جیسی کتابیں لکھتا ہے۔ اب ایسی صورت میں کون کتنا اور کیسا عیسائی ہے' یہ بتانا ذرا مشکل کام ہے۔"

"یزدانی صاحب۔ موضوع سے ہٹ کر ادھر ادھر گھمانا ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ میاں عقاید بتاؤ عقاید۔"

"چلئے وہ بھی سن لیجئے۔ پہلی قابلِ اعتراض بات تو آپ کے ایلیٹ صاحب یہی کہتے ہیں کہ عقاید تو روایت کی تشکیل کے دوران زندہ صورت اختیار کرتے ہیں۔"

"اچھا۔ یہ تو واقعی قابلِ غور بات ہے۔ کیا واقعی ایلیٹ نے یہی بات کہی ہے۔ ہاں ہاں مجھے کچھ یاد تو آ رہا ہے۔ بھئی ان بحثوں میں پڑے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ خیر......"

"پھر یزدانی صاحب یہ مسئلہ صرف ایلیٹ تک ہی محدود نہیں۔ دراصل پورے یورپ ہی کو یہ معلوم نہیں کہ عقیدہ ہے کیا؟ ڈیکارٹ سے لے کر آپ سارتر تک آجایئے۔ مغربی فلسفی اپنے مباحث میں عقیدہ تو ایک طرف رہا' خدا ہی کے وجود سے بہ تدریج گریز و انکار کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے جب ایلیٹ یہ کہتا ہے کہ عقاید تو روایت کی تشکیل کے دوران زندہ صورت اختیار کرتے ہیں تو یہاں روایت سے موصوف کی مراد یقیناً اس روایت سے ہے جو انسانی عمل اور سرگرمی کے تحت وجود میں آتی ہے۔ اب ایسی روایت یا روایات کو' جو بنیادی طور پر انسانی نوعیت کی ہوں عقاید کی بنیاد بنانا میرے خیال میں تو کھلی ہوئی گمراہی ہے۔"

"بھئی ایلیٹ بیس ویں صدی کا آدمی ہے اور ظاہر ہے......."

"نہیں یزدانی صاحب بہت ہو گیا۔ ایلیٹ یا دوسرے مغربی فلسفیوں کی پیچیدہ اور گنجلک اصطلاحات کو اگر آپ ایک لمحے کے لیے درمیان سے ہٹا دیں تو یقین جانیے کچھ برآمد نہیں ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے جب ایلیٹ صاحب روایت کی بات کرتے ہیں تو وہ دراصل یہ کہتے ہیں کہ عقاید اور اس طرح ظاہر ہے مذہب بھی' انسانی سرگرمیوں' اعمال اور تبدیلیوں سے ارتقا پاتا ہے۔ جناب عقاید یا تو ہوتے ہیں یا نہیں۔ یہ ڈارون کی ارتقائی خرافات نہیں ہیں۔"

"چلو۔ میرا خیال ہے مکینک نے گاڑی ٹھیک کر دی ہوگی۔ باقی باتیں راستے میں کیے لیتے ہیں۔ ہاں چلو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بات تو تم بھی مانو گے کہ یورپ نے پچھلے چار سو سالوں میں بہرحال روایت یا معیار کو تلاش کرنے کی کوشش تو کی۔"

"لیکن اس کوشش کا حل کیا نکلا؟"

"کہو میاں؟ حل ہو گیا مسئلہ؟ ایک ٹانکا لگانے میں تم نے گھنٹہ بھر لے لیا۔"

دھوپ کی حدت سے تپے ہوئے چہرے والا پچاس سالہ استاد کسی گاڑی میں سے نکلی پھٹی ہوئی سیٹ پر بیٹھا شیشے کے گلاس میں چائے پی رہا تھا۔ گلی میں خاصا اندھیرا تھا۔ چاروں طرف نئی پرانی گاڑیاں بے ترتیبی سے کھڑی ہوئی تھیں۔ تیز تازہ پینٹ کی خوشبو

پوری گلی میں پھیلی ہوئی تھی۔ یزدانی صاحب کی گاڑی کے نیچے ایک میلی سی چادر بچھائے بارہ سالہ لڑکا لیٹا ہوا تھا۔ ٹانکا لگاتے وقت دھوئیں اور مختصر سی چمک کے دوران اس کا چہرا نظر آتا اور پھر وہی عارضی تاریکی۔ ویلڈنگ کی کافوری چمک میں استاد کا چہرا بھی کسی پرانی گاڑی کے بونٹ کی طرح نظر آرہا تھا۔

"صاحب آپ یہ گاڑی اب نکال دو۔ یہ پیسہ کھائے گی۔ ایک گاڑی آئی ہوئی ہے بننے کے لیے' بات کروں؟"

"یہ لو۔ استاد ابھی گاڑی کی بات نہ کرو۔ چلتی تو ہے۔ کافی ہے۔"

"آپ کی مرضی۔ میں تو...... ارے یہ سامان دکان کے اندر رکھ۔ صاحب بیس روپے اور۔"

"ایک تو یہ استاد لوگ۔ کہتے کچھ ہیں لیتے کچھ ہیں۔ چلو تم لوگ آج میرے گھر چلو۔ تمھاری بھابی بھی پوچھ رہی تھیں۔ ہاں ہاں' بعد میں گھر میں ڈراپ کردوں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔"

"یزدانی صاحب گاڑی کا انجن تو ٹائٹ لگتا ہے بس ذرا باڈی کچھ......."

"بس میاں یہی کیا غنیمت نہیں کہ چار پہیے میسر ہیں اس آشوبِ معاش میں۔ کیوں؟"

"اچھا یزدانی صاحب ایک بات بتائیے۔ ہمارے یہ دوست اور آپ بھی مغربی ادب پر اعتراضات تو بہت کرتے ہیں لیکن کیا آپ لوگوں کو شیکسپیئر سے لے کر آج تک کے پورے مغربی ادب میں جو تنوع اور وسعت ہے' نظر نہیں آتی۔"

"اس وسعت اور تنوع سے نہ تو مجھے اور نہ یزدانی صاحب کو انکار ہے لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اس پورے عرصے میں مغربی ادب نے انسانی جہات' اس کے خارج و باطن کے بارے میں ایسی کون سی شہادتیں نہیں دیں جن کے بارے میں......."

"بھائی میرے۔ بات انسانی جہات کی تفسیر و تشریح کی نہیں ہے۔ اصل مسئلہ جو مغرب اب تک طے نہیں کرپایا وہ یہ ہے کہ ادب کا معاشرے میں مقام کیا ہونا چاہیے۔ ادب کے فرائض کیا ہیں؟ اور ظاہر ہے ان سوالات کے جوابات اس وقت تک واضح طور پر نہیں دیے جاسکتے جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ آج تک مغرب کس اصول کے تحت اپنے معاشرے کی تشکیل کرتا رہا ہے۔ پھر میرے خیال میں یہ بھی طے ہونا چاہیے کہ ادیبوں کا ان اصولوں کی طرف رویّہ کیا ہوتا ہے؟۔ کیوں یزدانی صاحب۔"

یزدانی صاحب اسلامیہ کالج سے ملحقہ عامل کالونی میں رہتے تھے۔ پرانے وقتوں کے بنے ہوئے بڑے بڑے بنگلے اور حویلی نما مکان وقت کو بائی پاس کرکے اسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ شہر کے بیچ میں جہاں مین روڈ پر جدید ترین کاروں کے شوروم تھے' تقسیم سے پہلے کا یہ علاقہ عجیب لگتا تھا۔ اکثر گھروں کے اندر کشادہ صحن تھے جن میں خشک فوارے اور عمر رسیدہ درختوں کے درمیان ابھی تک پرانے زمانے کی شیورلیٹ' کورٹینا' اوپل اور

مارس مائز جیسی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ گندے پائپوں کے ساتھ بیشتر گھروں میں سیمنٹ کا گھومتا ہوا زینہ بھی اوپری منزل کی طرف جاتا ہوا نظر آتا تھا۔ بادام کے درخت بھی تھے۔ سرخ ادھ پکے ہوئے کچے بادام بھی جگہ جگہ خشک پتوں پر پڑے ہوئے تھے۔ یزدانی صاحب کا گھر بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ لال فرش 'گول کمرے' ہرے شیشے والی کھڑکیاں اور اونچی اونچی چھتیں۔

"آجاؤ بھئی۔ تم لوگوں سے کیا پردہ؟"

"السلام علیکم بھابی۔ کیسی ہیں؟"

"تم لوگ کیسے ہو بھئی۔ بہت دن بعد آئے۔ کل ہی میں ان سے پوچھ رہی......"

"اور بھابی راحیل کیسا ہے۔ کب آرہا ہے؟"

"بیگم ذرا وہ کھڑکی کھول دیجیے۔ ہم یہاں اسٹڈی ہی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ڈرائنگ روم تو نہ جانے کب سے کھلا ہی نہیں۔"

"بیٹے۔ کہہ رہا تھا کہ ایک سال اور رہ گیا ہے بس۔ کل فون آیا تھا اس کا۔ تم لوگوں کو بھی پوچھ رہا تھا۔"

"جی بس چائے پییں گے۔ نہیں نہیں کھانا نہیں۔"

"ارے کمال کرتے ہو۔ چلو تھوڑی دیر میں کھالیں گے۔ بیگم پہلے ذرا اچھی سی چائے پلوادیں۔"

"تو یزدانی صاحب کیا آج کل بھی انگریزی شاعری ہی پڑھا رہے ہیں یا تنقید کی بھی کلاسز لیتے ہیں۔"

"بھئی کچھ نہ پوچھو۔ عجیب مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ فاروقی صاحب چھٹیوں پر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی کلاسیں بھی مجھے لینی پڑ رہی ہیں۔ موصوف metaphysical poets پڑھاتے تھے۔"

"صاحب مجھے تو بڑی جان نظر آتی ہے ان شاعروں میں۔ خاص طور پر جون ڈن میں۔"

"لیجیے یزدانی صاحب۔ موصوف اب مارکیز سے ڈن تک آگئے ہیں۔ میری سمجھ میں تو آج تک یہی نہیں آیا کہ کس احمق نے ان شاعروں کو metaphysical poets کہا اور کیوں؟"

"اب تم لوگ اسی سے اندازہ لگالو کہ مغرب میں لفظ metaphysics کی کیا گت بنی۔ میرے خیال میں سب سے پہلے ڈرائیڈن نے ان شعرا کے لیے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔ ظاہر ہے یونانی علوم سے متاثر تھا۔ کلاسیکیت کا دور بھی چل رہا تھا۔ پھر ان کو ان شاعروں سے شکایت بھی کچھ عجیب قسم کی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ شاعر بجائے اپنی محبوبہ کا دل لبھانے اور اس کے حسن کی تعریف کرنے کے 'بے جا مذہبی مباحثوں میں جا پڑے۔"

"اور وہ جو ہمارے لال بجھکڑ تھے 'ڈاکٹر جانسن۔ وہ بھی تو کچھ کہہ گئے ہیں اس بارے میں۔"

"جی ہاں۔ ڈاکٹر جانسن نے یہ لفظ تعریفاً" نہیں بلکہ تحقیراً" استعمال کیا ہے۔ ان کا بس چلتا تو پوری انگریزی Love Poetry کو مارویل کی Coy Mistress کی فحش گوئی سے ملا دیتے۔"

"ویسے بھی مغرب میں Love Poetry کی ایسی کون سی روایت تھی۔ بہت ہوا تو کسی نائٹ صاحب نے

بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی مفروضاتی بلا کو ہلاک کیا۔ شہزادی کے ابا کے سامنے پیش ہوئے اور دامادی کی فرمائش پیش کردی۔ وہ تو بعد میں جنوبی فرانس کے Trabadours کے زیرِ اثر انگریزوں کے ہاں عورت مرد کا رشتا واضح ہوا جو آگے چل کر ہمیں چوسر کے ہاں جیتے جاگتے انسانی portraits کی شکل میں نظر آتا ہے۔"

"اور یزدانی صاحب شیکسپیئر کے سائنس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"دیکھو میاں۔ یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں' لمبی نظم اور اس کے سائنس پر ایک علاحدہ گفتگو ہوسکتی ہے۔ اصل مسئلہ شیکسپیئر کا کام نہیں ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آخر وہ کون سی روایات تھیں' کچھ لوگ کہتے ہیں Sennca کے اثرات تھے کچھ Plutark کی تاریخ بتاتے ہیں' لیکن بہرحال حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس کے ڈراموں میں بلکہ پورے رویئے میں ہمیں قرونِ وسطیٰ کی عیسوی کی اخلاقیات' اس کا ردِ عمل اور پھر اس جدید آدمی کے نقش و نگار بھی نظر آتے ہیں جو آج ہمارے تمھارے درمیان ہیملٹ اور لیڈی میکبتھ کی شکل میں موجود ہیں۔

"چھوڑیئے یزدانی صاحب۔ شیکسپیئر پر بات پھر کبھی کریں گے۔ ہماری اصل بات جو ہو رہی تھی وہ تو وہیں رہ گئی۔"

"کیا! میں تو بھول ہی گیا؟"

"یہی کہ ادب کا معاشرے میں مقام کیا ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں مغرب آج تک یہ طے ہی نہیں کرپایا۔"

"بھئی آپ کے دوست اس کا جواب دے تو چکے ہیں۔ انسان کی ظاہری اور باطنی جہات کی تشریح۔ کیوں' کیا آپ اس سے اتفاق نہیں کرتے؟"

"لیکن یزادانی صاحب یہ تشریح کسی اصول کے تحت ہونی چاہیے نا۔ مغرب میں کیا آپ کو کوئی مستقل اصول یا معیار نظر آتا ہے؟"

"اگر تمھاری مراد تسلسل کے ساتھ قایم کسی اصول یا معیار سے ہے تو وہ تو مغرب میں مجھے نظر نہیں آتا۔"

"پھر یہ مسئلہ کیسے طے ہوگا۔ آپ خود بتایئے۔"

موٹے موٹے صوفوں اور اونچی چھت والے گول کمرے میں شیشے کی جدید میز پورے ماحول کو شارٹ سرکٹ کر رہی تھی۔ میز پر مغربی طرز کی خوب صورت پیالیاں' ٹی کوزی والی چائے دانی' چمکتے ہوئے چمچے' بٹن دبانے والا چینی دان اور پاؤڈر کے دودھ کا ایک چھوٹا سا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ کسی قریب ہی کی بیکری سے بلب میں گرم کیے ہوئے بسکٹ' بیلے ہوئے نمک پارے' بڑے بڑے سخت کیلے اور چند سیب بھی رکھے ہوئے تھے۔ میز کے نیچے والے حصے میں انگریزی کے

پرانے رسالوں کی بے ترتیبی بتا رہی تھی کہ شاید مہینوں سے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا۔

"یزدانی صاحب۔ اسٹڈی تو ماشاءاللہ خوب بنائی آپ نے۔"

"بس میاں ایک ہی تو شوق ہے۔"

"ارے۔ یہ عسکری صاحب کی کتاب ہے۔ اتنی موٹی!"

"تمہیں نہیں معلوم۔ لاہور سے کسی نے چھاپی ہے۔ عسکری صاحب کے بیشتر مضامین شامل ہیں اس میں۔"

"ذرا میں دیکھ لوں۔"

"کام تو اچھا کیا ہے۔ بس ذرا کتابت کی غلطیاں زیادہ ہیں۔ ارے ہمیں ہی مسودہ بھیج دیتے۔ پڑھ دیتے۔"

"ارے یہ تو "جھلکیاں" سے لے کر "وقت کی راگنی" تک کے مضامین ہیں اس میں۔ اور مل جائے گی؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں؟ ارے ہاں یاد آیا۔ وہ جو تم لوگ بحث کر رہے تھے نا 'مغرب میں تلاش روایت یا معیار کی' تو وہ عسکری صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ ذرا دینا مجھے کتاب۔"

"یہ لیجئے۔ یہ اچھا ہوا۔ کوئی بتا رہا تھا کہ عسکری صاحب نے......."

"بھئی یہ آپ لوگوں نے کیا شروع کر دیا۔ میرے خیال میں کوئی زبردستی تو ہے نہیں۔ کسی نے مغربی ادب پڑھنا ہے تو پڑھے۔ اتنی پنچایت اور فلسفے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہاں بھئی سنو۔ مل گیا وہ مضمون۔ یہ ہے "مغربی ادب کی آخری منزل۔""

"بھلا بتایئے۔ یہ عسکری صاحب بھی عجیب ہیں۔ ساری زندگی مغربی ادب پڑھتے رہے' پڑھاتے رہے۔ اس پر لکھتے رہے اور اب اور کچھ نہیں تو آخری منزل کی بات کرتے ہیں۔ یہ بھی اچھی رہی۔ بھئی میں تو اسی عسکری کو مانتا ہوں جس کا تعلق ادب لکھنے اور پڑھنے سے تھا۔ بعد میں وہ شاید روایتی ہو گئے وہ' تو ہو جائیں۔ میری بلا سے۔"

"ارے میاں گھر کا بھیدی ہی تو لنکا ڈھاتا ہے۔ چلو اب میرے خیال میں ان کے مضمون سے یہ عبارت سن لو۔ ہو سکتا ہے مغربی ادب ہی کو سمجھنے میں کچھ سہولت ہو جائے۔"

"ارے یزدانی صاحب آپ پڑھیے بھی۔ ان کو تو بس بولنے کا شوق......."

"ہاں بھئی تو سنو۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں کہ:

> چودہ ویں صدی کے آخر تک ادب مذہب کا اس حد تک تابع تھا کہ چوسر نے خدا سے اس بات پر معافی مانگی تھی کہ اس کی توجہ روحانی معاملات سے ہٹ گئی اور وہ شعر کہنے لگا۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں لوگ شعر گوئی پر فخر کرنے لگے اور شاعر اپنے آپ کو سب سے بڑا درجہ دینے لگے (یہ انداز نظر دور جاہلیت میں

عرب شاعروں کا بھی تھا)......"

"ذرا ایک گلاس پانی دینا میاں۔"

"بھلا بتایئے۔ شعر کہنے پر خدا سے معافی مانگنے کی کیا تک تھی؟"

"چلیے یزدانی صاحب یہ کتاب تو میں گھر لے جا رہا ہوں۔ آپ ہمیں ویسے ہی بتایئے کہ عسکری صاحب اس سلسلے میں بنیادی بات کیا کہتے ہیں؟"

"چلو یہ ٹھیک۔ ویسے بھی ہمارے دوست کچھ زیادہ دلچسپی سے سن نہیں رہے ہیں کیوں کہ......"

"نہیں نہیں آپ کہیے۔ سنیں گے ہم کیوں نہیں سنیں گے۔"

"بھئی دیکھو عسکری صاحب سیدھی بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مغرب نے پہلے یونانی علوم وغیرہ کا تجربہ کیا لیکن ناکام رہا۔ پھر یونانی معاشرے کو معیار بنایا لیکن مغرب میں معاشرہ اپنی ایک منفرد صورت اختیار کر چکا تھا اس لیے یہ سلسلہ بھی نہ چل سکا۔ یوں سمجھو کہ شخصی آزادی اور انفرادیت نے انیس ویں صدی اور آج بیس ویں صدی تک یہ صورت اختیار کی کہ مغرب یونانی علوم' معاشرے' دینیات اور تو اور خدا کا انکار کرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا کہ آج وہاں تہذیب و ادب کے حوالے سے کوئی واضح معیار نظر نہیں آتا۔"

"یہ تو خاصی chaotic صورت حال ہے۔ کیوں؟"

"تو بھائی حضرت انسان کون سے ایسے سہل اور غیر پے چیدہ شے ہیں؟ آخر آپ لوگ کیوں ادب کو الہامی اور آسمانی معیارات کے تحت لانا چاہتے ہیں......"

"بھئی ہم نے کب یہ بات کہی ہے۔ اس موضوع پر تو آپ سے ابھی گفتگو ہوئی ہی نہیں۔ بھائی ہم تو مغرب میں تلاش روایت......"

"دیکھیے صاحب۔ میرے نزدیک ادب بنیادی طور پر ایک انسانی سرگرمی ہے۔ اور چوں کہ انسان بہ قول یونانیوں کے مزاجاً "مذہبی ہوتا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس کے تخلیق کردہ ادب میں......"

"مذہبی مباحث وغیرہ بھی آجائیں یہی کہہ رہے ہیں نا آپ۔ یعنی......"

"جناب ادیب یا شاعر ایک حساس اور سچا آدمی ہوتا ہے۔ وہ جو محسوس کرتا ہے لکھ دیتا ہے۔ اب اگر بہ قول عسکری صاحب کے وہ خارجی معیارات کی پرواہ کرنے لگے تو پھر آپ کہیں گے کہ صاحب یہ تو conformist ہیں۔ یزدانی صاحب مان لیں اس بات کو۔ ادب میں اگر originality نہیں تو پھر ......"

"ہ... صاحب ایک تو میں سچے آدمی اور سچے ادب سے تنگ آگیا ہوں۔ بھائی اور ہماری بحث ہے کس بات پر۔ اسی پر نا کہ سچ اور جھوٹ کی کسوٹی کیا ہونی چاہیے؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو مغرب بھی پچھلے چار سو سالوں سے اس چکر میں یوں ہی نہیں پڑا رہتا۔ سمجھے!"

"تو کیا آپ کی روایت کو تسلیم کر لوں؟"

"تمھارے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ مشرق کی روایت کیا ہے' ادب سے اس کا تعلق کیا ہے اور کس طرح تم خود ایک طرح سے نہ چاہتے ہوئے بھی اسی روایت کا حصہ ہو' یہ باتیں فی الحال میں کرنا نہیں چاہتا۔ کسی دن یزدانی صاحب کے ساتھ مولانا سمیع حسن کے ہاں چلے چلو۔ ساری بات وضاحت سے سمجھ میں آجائے گی۔"

"چلو وہاں بھی چلیں جائیں گے۔ ویسے یہ تو بتائیں کہ آپ کے اردو ادیب یا شاعر کون سی روایت کے تحت لکھ رہے ہیں۔ بھئی مغرب ہی کی تقلید میں لکھ رہے ہیں نا۔ پھر آپ کس روایت کی بات کرتے ہیں۔ وہ روایت ہی کیا جو ادب اور مختلف فنون میں نہ جھلکے۔"

"میں نے کہا نا میں اس موضوع پر فی الحال بات نہیں کرنا چاہتا اور پھر تم جانتے بھی کیا ہو اس روایت کے بارے........"

"بھئی یہ تم لوگوں نے کیا شروع کردیا؟ چلو کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تمھاری بھابی خاص طور پر........"

"ارے چھوڑیے بھی یزدانی صاحب۔ جب بات بنتی نظر نہیں آتی تو کہتے ہیں اس موضوع پر ابھی بات نہیں کرنا' مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ تو کوئی طریقہ........"

"ارے یار تم تو ناراض ہوگئے۔ تم کیوں کہ ادب کے ایک سنجیدہ قاری ہو اس لیے کہہ دیا تھا ورنہ شہر میں ہر کسی سے تو اس موضوع پر بات نہیں کی جاسکتی۔"

"ناراض کیا مطلب؟ پہلے تو آپ کا یہ metaphysical attitude مجھے پسند نہیں۔ اوپر سے جس نے تھوڑا بہت ادب یا چلیے مغربی ادب پڑھ رکھا ہے' چوبیس گھنٹے بس یہی ایک رٹ کہ صاحب سارا کا سارا ادب روایت سے کٹ کر لکھا گیا ہے۔ تو کیا کریں۔ جلا کر پھینک دیں سارے ادب کو۔ یا آپ کی روایت کے تحت اسے دوبارہ لکھیں۔ یار حد ہوتی ہے ہربات کی۔ میں تو........"

"یزدانی صاحب سمجھالیں آپ انھیں۔ ابھی تو میں نے کچھ کہا ہی نہیں ہے۔ یہ نہ ہو کہ انھیں بھی آندرے ژید کی طرح اپنی اعتراف شکست کا اقبالیہ بیان دینا پڑے۔ پوری بات سنتے نہیں ہیں سمجھتے ہیں کہ ہم اتنے الو کے پٹھے ہیں کہ سارے مغربی ادب کو یوں ہی reject کردیتے ہیں۔ جناب آپ سے زیادہ پڑھ رکھا ہے مغربی ادب کو اور........"

"تو اس میں تم دونوں جھگڑ کیوں رہے ہو۔ ختم کرو بات کو۔ چلو کھانے کے کمرے میں چلو تمھاری بھابی اب ناراض ہو جائیں گی۔"

"بھابی نظر نہیں آرہیں۔ کہاں گئیں؟"

"وہ دراصل راحیل کے دوست کی بہن آئی ہوئی ہے نا۔ اس کے ساتھ......"

"ارے یار۔ تم تو واقعی ناراض ہوگئے۔ کھانا شروع کرو۔"

"آپ لوگ کھائیے۔ میں لے لوں گا۔"

فرش پرانا اور غیر ہموار ہونے سے ڈائنگ ٹیبل مسلسل ہل رہی تھی۔ جگ کے

ساتھ جڑا ہوا شیشے کا گلاس بار بار ٹکراتا۔ یزدانی صاحب ہلکی سی نظر اٹھا کر میز پر پھیلی ہوئی اشیا کو دیکھتے اور پھر زور سے دونوں کہنیاں میز پر رکھ دیتے۔ شاید اس طرح وہ میز کو ہلنے سے روکنے کے لیے کرتے تھے۔ میز اتنی لمبی اور چوڑی تھی کہ اس پر بیٹھے ہوئے برسوں کے دوست بھی اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ قورما' شاہی کباب' بریانی' ماش کی دال' سلاد اور شاہی ٹکڑے ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر رکھے ہوئے تھے کہ ان میں سے بیشتر تو شاید اسی لیے نہیں کھائے جاسکے کہ وہ بیٹھی ہوئی پوزیشن میں دسترس سے باہر تھے۔ بے تکلفی کے باوجود کسی نے کسی سے کچھ مانگنے یا سرکانے کو نہیں کہا۔ شریکِ گفتگو افراد میں سے اگر بہ یک وقت دو ایک کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ شاید تیسرا دوست کچھ برا مان گیا ہے تو عموماً کھانا کسی قدر مذہبی خاموشی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ ناراض ہونے والا فرد بھی بار بار تھوڑا تھوڑا پانی پی کر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اس سے کھانا کھایا نہیں جارہا۔

"یزدانی صاحب کھانا آپ کے ہاں ہمیشہ مزے دار بنتا ہے۔ پیٹ تو بھر گیا لیکن نیت......"

"میاں تم بڑے خاموش بیٹھے ہو۔ کچھ کھایا یا ابھی تک......"

"مجھے تو آپ بس چائے پلادیں۔ دل نہیں چاہ رہا کچھ کھانے کو۔"

"یار یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ خود جو چاہو کہہ دو۔ اچھا بابا۔ یہ دیکھو۔ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔"

"تم سے ناراض ہو کر کیا میں اس شہر میں رہ سکتا ہوں۔ یہ لو۔ شاہی ٹکڑے تو چکھو۔"

"چلو خدا کا شکر ہے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ تو آئی۔ یار ویسے تم بھی بعض وقت زیادتی کر جاتے ہو۔"

"آؤ یہاں باہر ٹیرس میں بیٹھتے ہیں۔ چائے وہیں پی لیں گے۔"

"ویسے یزدانی صاحب جب بھی مشرق و مغرب کی بحث ہوتی ہے مجھے اسپنگلر کی بات ضرور یاد آتی ہے۔ صحیح کہتا ہے جناب وہ۔ ہر قوم اور تہذیب کا اپنا مزاج اور طرزِ احساس ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے قطعی مختلف۔ ایسے میں تو یہ ہماری تمھاری روایت کی بحث کچھ عجیب سی لگتی ہے اور پھر......"

"جناب اب زمانہ ہے ڈش کا' انٹرنیٹ کا' گلوبل ولیج کا۔ اب کسی اسپنگلر وغیرہ کی دال نہیں گلے گی۔ سارے مقامی کلچر اور تہذیبیں ایک طرح کی ہوتی جارہی ہیں۔ بھئی کوک پی کر' جینز پہن کر' چینل وی پر صوتی و بصری خرافات دیکھ کر اب کاہے کا طرزِ احساس میں فرق۔ ارجنٹائن سے نیوزی لینڈ تک سب یہی کر رہے ہیں' سب یہی دیکھ رہے ہیں۔ اوپر سے کسی صاحب نے End of History نام کی کتاب بھی لکھ ماری۔ چلیے قصہ ہی ختم ہوا۔"

"لیجیے یزدانی صاحب یہ ادب ودب کی بساط۔ کتاکٹ کی دکان لگاتے ہیں۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"اچھا چلو میرا خیال ہے میں تم لوگوں کو چھوڑ آؤں۔"

"ہم ٹیکسی کر لیتے ہیں اتنی رات آپ......"

"ارے نہیں بھئی۔ وعدہ بہرحال نبھانا ہماری روایت ہے۔"

سڑک سنسان ہو اور مکین درونِ در ہوں تو شہر اچھا اور کُھلا کُھلا لگنے لگتا ہے۔ یزدانی صاحب اپنی پرانی گاڑی میں بیٹھے کچھ دور دور سے نظر آرہے تھے۔ شاید یوں کہ گاڑی بڑی اور جگہ بھی کشادہ تھی۔ اتنے عرصے سے گاڑی چلاتے آئے تھے کہ ڈرائیونگ سیٹ کا حصہ ہی لگ رہے تھے۔ اسٹیرنگ گیئر ہونے کی وجہ سے وہ جب بھی گیئر راڈ کو اٹھا کر اپنی طرف کھینچتے تو دونوں ہونٹ دانتوں میں دبا لیتے۔ گاڑی میں ٹافیوں کے ریپر، جلی ہوئی ماچس کی تیلیاں اور کسی چھوٹی بچی کی لال رنگ کی ایک سینڈل بھی پڑی ہوئی تھی۔ سیٹوں پر زور سے ہاتھ لگ جائے تو اتنی دھول بہرحال نکلتی جس سے ہلکی سی کھانسی آجائے۔ ڈیش بورڈ پر بے کار کاغذات، بال بنانے کا ایک بوسیدہ برش اور میلی سی عینک پڑی ہوئی تھی۔

"بس یزدانی صاحب میرا خیال ہے آپ ہمیں یہیں مین روڈ پر اتار دیں۔ میرا گھر تو سامنے ہی ہے۔ یہ پارک کے پیچھے رہتے ہیں۔ چلے جائیں گے یہاں سے۔"

"اچھا۔ نیند سی آرہی ہے۔ دعا کرنا خیریت سے گھر پہنچ جاؤں۔"

اب تقریباً تمام دکانیں اور ہوٹل بند ہو چکے تھے۔ ایک ملباری ہوٹل میں کرسیاں پھولوں کی طرح الٹی رکھی ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے ایک رکشا کچھ اتنا زیادہ جھکا ہوا تھا جیسے کسی بھی وقت دوسری طرف گر جائے گا۔ رکشا کے نیچے ایک بچہ لیٹا ہوا کچھ ویلڈ کر رہا تھا۔ رکشا کا مالک سڑک کے کنارے اینٹوں پر اکڑوں بیٹھا گہرے دھویں والی سخت سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتا اور محبت سے اپنی حد سے زیادہ جھکی ہوئی رکشا کو دیکھتا جاتا۔ رکشا کے پیچھے گہرے لال رنگ میں دل کی تصویر بنی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا:

جمی انجینئر کی جان
کنول رانی اور ذیشان

☆ ○ ☆

تراجم

نرمل ورما / حیدر جعفری سید

ایک چیتھڑا سکھ

کیا تم نے انھیں دیکھا ہے .... ان بنگلوں کو؟ اسے لیبنیس کا شہر کہا جاتا ہے' رائے سینا کے بنگلے۔ وہاں لمبے لان میں جھاڑیوں سے گھرے ہوئے پیڑوں سے گھرے ہوئے جامن کے وہ پیڑ ہیں جو بارش کے دنوں میں پکتے ہیں' ٹپاٹپ نیچے گرتے ہیں۔ ذرا اوپر دیکھو تو بوگن ویلیا کے پھول دکھائی دیں گے' لال اور سرخ' بنگلوں کو اپنی لپٹوں میں لپیٹے ہوئے۔ لیکن اندر ٹھنڈا اندھیرا ہے' جالی کی ہری' دوہری کھڑکیاں ہیں' ایک بے خواب سا شور ہے' جو جھاڑیوں کو چھوتا ہوا اندر آتا ہے' اکیلی نوکرانی کو اپنی دوپہری اونگھ سے جگا جاتا ہے' شور' جسے سن کر چوہیا الماری کے پیچھے دبک جاتی ہے اور چھپکلی منھ اٹھا کر اسے دیکھنے لگتی ہے' جو ہر جگہ ہے..... اور کہیں نہیں ہے۔

لیکن وہ وہاں ہیں' باہر پیڑوں میں چھپے ہوئے۔ تم سنتے ہو؟ وہ ہنس رہے ہیں؟ ریہرسل کا کوئی ٹکڑا ہوا میں تیرتا ہوا یہاں چلا آتا ہے' جہاں وہ کھڑا ہے' خالی۔ گھر بھی خالی ہے .... ڈیری کا بنگلہ .... اینٹوں کی فینس سے گھرا ہوا' جس پر گھاس کا میدان ایک جاپانی پنکھے سا کھلا ہے۔

اسے معلوم ہے۔ بٹی نے اسے بنگلے کے بارے میں اتنا کچھ بتایا تھا کہ وہ جہاں چاہے گھوم سکتا ہے' آنکھیں موند کر گھوم سکتا ہے' پیڑوں کے نیچے' جھاڑیوں میں' اینٹوں کی مینڈوں پر۔ جب ڈیری کے والد دورے پر چلے جاتے تھے' گھر خالی ہو جاتا تھا' اور وہ ریہرسل کے لیے یہاں آجاتے تھے ...... اگر موسم کھلا ہو..... جیسا کہ اکثر مارچ کے دنوں میں ہو جاتا تھا۔

ڈیری کی ماں کہاں رہتی ہیں' یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ بٹی چپ رہتی تھی اور ڈیری بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے تھے۔ وہ کہتے کچھ نہیں تھے' صرف اپنے گھر بلاتے تھے لیکن وہ بیچ میں بیمار پڑ گیا اور بعد میں ریہرسل ہونے لگی اور بٹی دیر سے گھر آنے لگی اور جھگڑے کی راتوں میں ڈیری موٹر سائیکل پر چلے جاتے اور بٹی چھت کے بیچوں بیچ بیٹھی رہتی اور ہوا میں گھاس کے تنکے بکھرے رہتے' جس میں ڈیری بیئر کی بوتلیں لپیٹ کر لاتے تھے' خوشی کی رو میں کہتے تھے' یہ ہمارے لان کی گھاس ہے اور اسے ان کی ان باتوں پر رونا سا آنے لگا تھا۔

وہی گھاس اب چاروں طرف پھیلی تھی۔ وہ شام کی آخری روشنی کو پکڑ رہی تھی' بنگلے کی پہلی

دیواروں پر اترتی ہوئی ..... دور سے ان کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ریہرسل کا شور .... ایکٹروں کی آوازیں' جھاڑیوں کے پیچھے پیڑوں کی سرسراہٹ' ہنسی' ہوا میں اڑتی ہوئی باتیں' چہرے' جنھیں وہ دیکھ نہیں سکتا تھا کیوں کہ وہ لان کے دوسرے چھور پر تھے۔ جہاں زمین کا حصہ ایک پہاڑی سا اوپر اٹھ آیا تھا ...... اونٹ کے کومڑ سا....... گھاس کا ایک ٹیریس' چاروں طرف املتاس کے پیڑوں سے گھرا ہوا' دھوپ میں سلگتا ہوا ایک جھلملاتا اسٹیج جس پر نتی بھائی "سی گل" کرنا چاہتے تھے لیکن اب وہاں اسٹن برگ کا قبضہ تھا' ایک پنجرہ' پنجرے میں گھومتا ہوا ایک نادیدہ چیتا' دھوپ کے میخچوں سے باہر جھانکتا ہوا...... غراتا ہوا....... کیا تم اسے سن سکتے ہو؟

وہ سن سکتا تھا....... سن سنانے میں اپنی سانسوں کو' ہلکے بخار سے تپتی اور اوپر اٹھتی ہوئی' وہ بہت اچھے لوگ تھے' بٹی کے دوست اور خود بٹی بھی' وہ اس پر اعتماد کرنے لگے تھے' وہ اسے اکیلا چھوڑ دیتے تھے۔ وہ جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ گھوم سکتا تھا' بھٹک سکتا تھا۔ وہ گھوم رہا تھا' بھٹک رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ وہ انھیں بھول سا گیا تھا۔ وہ پیڑوں کے نیچے چل رہا تھا۔

اچانک ایک چڑیا جھاڑیوں سے اڑی اور پیڑوں کے اوپر چکر کاٹنے لگی پھر دوسری چڑیا' پھر تیسری۔ ہوا میں پھڑپھڑاتے پروں کا ریلا اٹھنے لگا۔ کسی نے اوپر سے ایک پتھر جھاڑیوں میں پھینکا تھا....... پھر ایک ساتھ ڈھیلوں کی برسات ہونے لگی۔ کون ہو سکتا ہے؟ اس نے اوپر دیکھا .... پتوں اور ٹہنیوں کے درمیان اسے احساس ہوا' جیسے کوئی اوپر بیٹھا ہے' نیچے جھانک رہا ہے۔

"کون ہے؟" اور اوپر سے آواز آئی ...... "کون؟" اسے پتا نہیں چلا' وہ اس کی آواز ہے ...... یا محض ایک گونج۔ وہ دوبارہ بولا۔ "کوئی ہے؟" اور پتوں کے بیچ چھنتی ہوئی آواز آئی .... "ہے؟"

وہ حیرت سے اوپر دیکھنے لگا لیکن تبھی کوئی دھپ سے گھاس پر نیچے کودا۔ پلک جھپکتے ہی وہ اس کے سامنے کھڑی تھی .... ایک لمبی' چھریری لڑکی۔ دھوپ کے دو چھلے اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

"تم؟"

وہ اس کے پاس چلی آئی' ایک ہاتھ میں غلیل تھی' دوسرے ہاتھ میں پتھر۔ پاؤں ننگے تھے' مٹی اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے۔ اس نے ایک نیلی فراک پہن رکھی تھی جو گھٹنوں تک آتی تھی۔ فراک کے اگلے حصے پر دونوں طرف جیبیں تھیں' جن میں اس نے ڈھیلے بھر رکھے تھے۔

اس کا منھ کھلا تھا اور آنکھیں اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"مجھے معلوم ہے' تم کون ہو؟" اس نے کہا۔

وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"You are the little cousin." "کزن۔" وہ مسکرایا اور اچانک اس کا چہرا روشن ہو اٹھا۔

وہ اس کی طرف بڑھی اور ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم الٰہ آباد سے آئے ہو؟"

"وہاں میرا گھر ہے۔" اس نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے...... میں نے سوچا تھا' میں تمھیں کبھی نہ دیکھوں گی۔"

"کیوں؟"

"ڈیری کہتے ہیں' تم کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے۔" وہ ایک لمحے جھجکی' پھر ہلکے اشتیاق سے اس کی جانب دیکھا........

"تم بیمار رہتے ہو؟"

اس کی آنکھیں اس پر ٹکی تھیں....... جنگلی' صاف اور بیہوز۔

"میں نے تمھیں ٹیکسی سے اترتے دیکھا تھا۔" اس نے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے۔ وہ چلے جاتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھتے بھی نہیں۔ لیکن تم پہلی بار آئے ہو......."

"کون چلے جاتے ہیں؟"

"وہ سب!" اس نے غلیل کی ربر جھلاتے ہوئے کہا۔ "ایکٹر' لڑکیاں' ڈیری کے دوست....... جانور!"

"وہاں جانور آتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" اس کا ہاتھ ٹھٹک گیا۔

"بیبنتھر بھی؟"

"بیبنتھر؟" اس نے شک سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا وہ تمھارے گھر آتے ہیں؟"

"نہیں...... میں نے صرف سوچا تھا۔" اس نے کہا۔

وہ اسے غور سے دیکھتی رہی....... جیسے اسے اپنی جنگلی نگاہوں پر تول رہی ہو...... ایک ان دیکھے ترازو پر۔ دشمن یا دوست...... یوں ہی کوئی گم راہ لڑکا؟ پھر اچانک اس کی یاد آئی' کوئی بہت پرانی چیز۔ دھوپ میں اس کی بھوری آنکھیں سلگنے لگیں۔

"کیا انھوں نے میرے بارے میں کچھ بتایا تھا؟"

"تم ڈیری کی بہن ہو؟"

"اور کچھ نہیں؟"

"نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔

وہ ساکت کھڑی تھی۔ وہ سن رہی تھی۔ ان کے درمیان سناٹا تھا۔ اور وہ اتنا گہرا تھا کہ اسے لگا' جیسے وہ اس کے سننے کو سن سکتا ہے' جیسے ان کی آواز پہلے اس کے پاس آتی ہو اور پھر اس کے کانوں سے چھن کر اس کے پاس.......

"تمھاری کزن کی آواز ہے......" اس نے کہا۔ "کیا نام ہے اس کا؟"

"بٹی۔" وہ ہنسنے لگی۔ "میں اس کی آواز ہمیشہ پہچان لیتی ہوں۔"

پتا نہیں کیوں...... اسے لگا' جیسے اس کے لہجے میں ایک حقارت سی بھری تھی' ایک چھچھورا سا مذاق......
اس کا منھ سوکھ گیا۔
"یہ اس کا پارٹ ہے۔" اس نے کم زور لہجے میں کہا' جیسے وہ اس طرح بچی کو بچالے گا۔
"کیسا پارٹ؟" ایک عجیب حقارت سے اس کے ہونٹ کھل گئے۔ "وہ اپنے کو دھوکا دے رہے ہیں۔"
"دھوکا؟"
"They are ruining their lives." ...... رو ئننگ کا مطلب جانتے ہو؟"
وہ ہنس رہی تھی۔
"برباد کردینا' ختم کردینا' تباہ کردینا۔" اس نے کہا۔
غلیل کا کالا پھندہ اس کی آنکھوں کے سامنے جھول رہا تھا۔ ڈرے ہوئے پنچھی پیڑوں پر گھوم رہے تھے۔ وہ چوکنا آنکھوں سے اسے چھو رہی تھی...... اور تب اسے پتا چلا' اس کی آنکھوں کی پتلیاں دھوپ میں نہیں' خود اپنی روشنی سے چمک رہی تھیں۔
"تم بھی ایکٹنگ کرتے ہو؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔
"تھیٹر جاتے ہو؟"
"ایک بار گیا تھا' ریہرسل دیکھنے۔" اس نے کہا۔ پھر ہمت کرکے پوچھا۔ "تمھیں تھیٹر پسند نہیں ہے؟"
"وہ اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔" اس کا لہجہ تھکا سا تھا' خالی' مایوس سا۔
"میں کبھی وہاں نہیں جاتی۔"
"کیوں؟"
"وہ اصلی نہیں ہے۔" اس نے کہا اتنے دھیرے سے' جیسے اسے خفیہ پوشیدہ راز بتا رہی ہو...... "وہ بہانہ کرتے ہیں۔"
"کیسا بہانہ؟" وہ متحیر سا ہو کر اسے دیکھنے لگا' روکھی آنکھیں۔ دھول آلود بال متشدد سی کلبلاتی مانسلتا' جو صرف جنگلی جانوروں میں دکھائی دیتی ہے' یا جوان ہوتی اکیلی لڑکیوں میں......
اصلی کیا ہے؟
دور سے آوازیں آتی تھیں' اوپر اٹھتی تھیں' نیچے گر جاتی تھیں' مرجاتی تھیں۔ پیچھے ان کی گونج آتی تھی' ہر آواز کو جلاتی ہوئی' ہوا میں اٹھاتی ہوئی' واپس لے جاتی ہوئی......
وہ اکیلے پڑ گئے تھے۔ وہ لوٹنا چاہتا تھا۔ لیکن تبھی اسے ایک دبی پھنکار سی سنائی دی جیسے کوئی گولی سنسناتی ہوئی کانوں کے پاس سے گزر جاتی ہے۔ یہ اس کی سانس تھی۔ وہ اس کے پاس چلی آئی تھی' ایک بلی کی طرح چپ اور چالاک قدموں سے' ہونٹ کھل گئے تھے جن کے درمیان اس کے دانت باہر نکل آئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنی غلیل کا اگلا حصہ اوپر اٹھایا اور پستول کی نلی کی طرح اس کے گلے پر

لگا دیا۔ "ہینڈز اپ!"
ایک تھرتھراتی سی کوندھ اس کی نسوں میں لپکی' اس نے آنکھیں موند لیں' مارچ کی ہوا' ریہرسل کی آوازیں' ڈوبتے سورج کی پیلی چمک ...... سب کچھ غلیل کی کالی نوک اور گلے کے اندر پھنسی سانس پر ٹھہر گیا تھا...... کیا یہ اصلی ہے؟
"ہیلو' ہیلو' ہیلو!" وہ اسے بلا رہی تھی۔ آنکھیں کھلی' تو اس کی آنکھیں دکھائی دیں' اس کے چہرے پر جھکی ہوئی' جنگلی' اجڈ' دہشت زدہ' "میں نے سوچا' تم سچ مچ مر گئے۔" وہ دھیرے دھیرے اس کے گلے کو سہلانے لگی۔ "تم صرف ایکٹنگ کر رہے تھے!"
وہ اپنے دل کی دھڑکن سن رہا تھا۔ کیا یہ لڑکی پاگل ہے' یا صرف بہانہ کر رہی ہے...... اسے چڑھا رہی ہے۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے' لیکن کہاں؟ وہ اس کا راستا روکے کھڑی تھی۔
وہ اس کے پاس آئی' دھیرے سے اس کے بالوں کو چھوا۔ "تم بالکل ٹھیک ہو۔" اس نے کہا۔ "تم چل سکتے ہو؟"
اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں' جی کڑا کر کے کہا۔ "میں گھر جاؤں گا۔"
"گھر؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "یہ گھر نہیں تو کیا ہے؟ چلو' میں تمھیں گھر دکھاتی ہوں۔" اس کے لہجے میں نرم سا اقرار تھا' جس میں زور یا زبردستی نہیں تھی ...... صرف ایک بھوکا سا بلاوا ...... جسے ٹالنا ناممکن سا جان پڑتا تھا۔
وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ...... سورج ابھی نہیں ڈوبا تھا' اور بنگلہ ایک تاش کے بنگلے کی طرح کھڑا تھا ...... اکیلا' شہر سے الگ' دھوپ میں چاندی سا چمکتا ہوا ...... اور ان کی آوازیں دور پیڑوں کے ٹیریس سے تیرتی ہوئی اس کے پاس چلی آتی تھیں۔
بنگلے کے پچھواڑے آ کر وہ ٹھٹک گئی ...... ایک برآمدے کے سامنے ...... جس کے آگے صرف نوکروں کے "آؤٹ ہاؤس" تھے ...... چھوٹے چھوٹے کوارٹر' جن کی چھتوں سے دھواں نکل رہا تھا۔
وہ بائیں طرف مڑی اور چق اٹھا کر اندر چلی گئی۔ وہ باہر ٹھٹھکا کھڑا رہا ...... دل میں شدید خواہش ہوئی کہ وہ مڑ جائے' موقع ملتے ہی اس سے اپنا پیچھا چھڑا کر بھاگ جائے ...... لیکن وہ کچھ فیصلہ کر پاتا ...... اس سے پہلے ہی اس نے چق اٹھا کر باہر جھانکا۔ "ادھر!" ...... اس نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔
اندر اندھیرا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکا۔ لڑکی نے بتی جلائی اور اچانک اس کی دونوں آنکھوں کو بھینچ لیا۔ وہ جھنجھلانے لگا۔ لیکن اس کے دونوں ہاتھ آہنی پنجوں کی طرح اس کی آنکھوں پر گڑے تھے۔
وہ ہنس رہی تھی۔ وہ سچ مچ پاگل تھی۔ وہ حتی الامکان اس کے ہاتھوں کو ہٹانے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کی انگلیاں اس کی آنکھوں پر دبتی گئیں' اور تب غصے کی رو میں اس نے اپنے ناخن اس کی بانہوں میں گڑا دیے۔

وہ جھٹک کر الگ کھڑی ہو گئی' اپنی بانہوں کو دیکھنے لگی جن پر خون کی بندکیاں ابھرنے لگی تھیں۔
"Brute!" وہ اپنے بازو کے پچھلے گوشت کو سہلا رہی تھی۔
وہ کھڑا تھا' شرم میں بھیگا ہوا' اس کے اندر کوئی چیز تھرتھرا رہی تھی۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ اس لڑکی کے ساتھ' جسے میں جانتا بھی نہیں....... اس کمرے میں' جسے کبھی دیکھا نہیں' اس گھر میں.......
لیکن اس بار لڑکی نے سچ مچ اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا' نہ بیٹھنے کی فرمائش کی' نہ اسے منانے کی کوئی کوشش۔ اس نے چق کا سرا اٹھا دیا تھا...... وہ پلنگ کے ایک سرے پر بیٹھ کر باہر دیکھ رہی تھی۔
کچھ منٹ ایسے ہی گزر گئے۔ لڑکی کی چپ کا فائدہ اٹھا کر اس نے چاروں طرف دیکھا...... وہ کمرہ نہیں تھا۔ بنگلے کے پیچھے برآمدے میں چقیں ڈال دی گئی تھیں۔ ایک پلنگ تھا' جس کے سرہانے ایک لمبا لیمپ ہرے شیڈ میں ڈھکا ہوا تھا۔ کتابوں کی الماریاں چاروں طرف کھڑی تھیں' جیسے وہ کوئی چھوٹی سی لائبریری ہو۔ پلنگ کے پاس ہی ایک میز تھی' جس پر ٹائپ رائٹر رکھا تھا..... ایک لمبا کاغذ اس میں اب بھی پھنسا تھا جیسے کوئی بیچ میں لکھتا ہوا اٹھ کر چلا گیا ہو۔
دیوار پر ایک کھونٹی تھی' جس پر نیلی سلیکس لٹک رہی تھی۔
"تم نے کچھ کہا؟" لڑکی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
"نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا' وہ صرف بولنے کا بہانہ چاہتی تھی۔
"تم اب بھی ناراض ہو؟" وہ مسکرا رہی تھی۔ "دیکھو' تم نے کیا کیا ہے؟" اس نے اپنا بازو آگے بڑھا دیا...... سانولی ننگی بانہہ' چھوٹے چھوٹے ریشوں سے بال...... جن کے درمیان اس کے ناخنوں کے نشان چمک رہے تھے۔
وہ خوف زدہ سا ہو کر اسے دیکھنے لگا....... اس بے قصور' خون کی کھرونچوں سے بانہہ کو...... ایک لمحہ کے لیے یقین نہیں ہو سکا' یہ اس کے ناخنوں کی کرامات ہے۔ وہ اپنے کو بھول سا گیا۔ اس کے پاس چلا آیا۔ اپنا ہاتھ اس کی بانہہ پر رکھ دیا۔
وہ پلک جھپکائے بغیر اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ہونٹ ذرا سے کھل گئے تھے جیسے کبھی کبھی ڈیری کے کھل جاتے تھے' لیکن ڈیری سے الگ....... وہ کہیں دور تھی۔ ماند میں چھپے جانور کی طرح چوکنی' دنیا کی ہر آواز کو اپنی آتما کی کھال پر کھنکھناتی ہوئی...... ایک لمحہ' دو لمحہ اور پھر جیسے لامحدود سے بہہ گیا...... اس کی بانہہ اس کی انگلیوں کے نیچے ڈھیلی اور بے جان پڑی تھی۔
"تمہاری آنکھیں۔" اس نے کہا۔
"کیا؟"
"وہ بالکل تمہاری بہن پر گئی ہیں۔"
"وہ میری کزن ہے۔" اس نے کہا۔
"مجھے معلوم ہے' تمہارے چاچا کی لڑکی۔"

وہ اپنی بانہہ اس کے ہاتھ کے نیچے سے سرکا کر اوپر لے آئی' لیکن اسے چھوڑا نہیں۔ اس کی ہتھیلیوں پر اس کے ہاتھ پڑے رہے' سوکھے' دھول میں سنے ہوئے' ہلکے سے گرم۔
غلیل اب بھی اس کے گلے میں لٹک رہی تھی...... چھاتی کے دو مچلتے ہوئے ابھاروں کے درمیان....... ایک کالے ٹوٹکے سی' تبتی لڑکیوں کی طرح جو اپنے گلے میں جادو منتروں کی مالا لٹکائے رہتی ہیں۔
"تم یہاں کتنے دن رہو گے؟" اس نے پوچھا۔
"چند دن اور۔" اس نے کہا۔
"پھر؟"
"میں الہ آباد لوٹ جاؤں گا۔"
اس کی آنکھیں اوپر اٹھیں۔ بہت دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "یہاں نہیں رہنا چاہو گے؟"
"وہاں میرا گھر ہے۔" اس نے کہا۔
"تمھاری کزن کا گھر بھی وہاں ہے لیکن وہ یہیں رہتی ہے۔"
"اس کی بات الگ ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہے۔"
وہ دھیرے سے ہنسی۔
"وہ سب لوٹ آتے ہیں۔"
"کہاں سے لوٹ آتے ہیں؟"
"باہر سے......" وہ ایک لمحہ اسے دیکھتی رہی۔ "باہر کی دنیا سے۔" اس نے کہا۔
روشنی اس کے بالوں پر گر رہی تھی۔ کھلے ہوئے گھنے بال اس کے دونوں کندھوں پر بکھر آئے تھے' چرایا سا چمک رہا تھا' لیکن ہیجان زدہ نہیں' ایک ٹھنڈا سفید تاپ جو جسم کی سطح پر بھاپ سا جما رہتا ہے۔
"تم کہیں باہر نہیں جاتیں؟"
"باہر کہاں؟"
"اسٹوڈیو میں۔" اس نے کہا۔ "اسکول......"
وہ آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔ اسے لگا' وہ اچانک سہم گئی ہے۔ پیچھے مڑ گئی ہے' کتابوں کی الماری کے پاس آ کر ٹھٹک گئی ہے۔
"میں نہیں جا سکتی۔" اس نے کہا۔
"کیوں؟"
"وہ کسی بھی وقت آ سکتے ہیں...... میں ہمیشہ تیار رہتی ہوں۔"
وہ سمجھا نہیں...... صرف ایک عجیب ڈر کا ذائقہ منھ میں چلا آیا۔ وہ بالکل جنگ کے پاس کھڑا تھا' کچھ بھی ہو گا' تو وہ فوراً نکل کر بھاگ سکتا ہے' لیکن وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ نہ ہلی' نہ ڈلی' یکایک اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"وہ کون؟" اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ "کون آسکتا ہے؟"
"باہر کے لوگ۔" اس نے کہا۔ "وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"
وہ دھیمے قدموں سے اس کے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا' ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ڈیڈی نے تمھیں کچھ نہیں بتایا؟"
"کس کے بارے میں؟"
"وہ باہر گئے تھے۔" اس نے کہا۔ "وہ ایک دن اچانک چلے گئے اور ہمیں کچھ بھی پتا نہیں چلا۔ تم کبھی گاؤں میں گھومے ہو' لوگوں کے درمیان؟"
"نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔
"میں بھی نہیں' وہ ان کا دکھ دور کرنے گئے تھے...... تم نے کبھی اسے دیکھا ہے؟"
"کسے؟"
"دکھ کو؟" ایک عجیب سی الجھن اس کے چہرے پر ابھر آئی۔ "میں نے تو نہیں دیکھا...... لیکن کبھی کبھی تمھاری کزن یہاں آتی ہے اور میں چھپ کر اسے دیکھتی ہوں۔ وہ یہاں آکر اکیلی بیٹھ جاتی ہے' پتا نہیں کیا سوچتی رہتی ہے اور تب مجھے لگتا کہ شاید یہ دکھ ہے۔" وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔ "اسی لیے میں کہیں نہیں جاتی۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا' نہ دکھ' نہ ڈر' نہ باہر کے لوگ۔"
وہ چپ ہوگئی۔ اسے لگا کہ وہ اپنے دھیان میں ہے اسے بھول سی گئی ہے' اکیلے لوگ کبھی کبھی اپنے آپ سے بولنے لگتے ہیں۔ انھیں کچھ بھی پتا نہیں رہتا' صرف یہ پتا رہتا ہے کہ وہ محفوظ ہیں۔ اپنی چیزوں کے درمیان بیٹھے ہیں' کتابوں کی الماری' ٹائپ رائٹر' کھونٹی پر ٹنگی ہوئی سلیکس' کبھی کبھی ہوا سے برآمدے کی چق اٹھ جاتی۔ باہر کی پیلی' دھندلاتی روشنی اندر چلی آتی' اس کے ساتھ ریسرسل کی آوازیں' پیڑوں کی سرسراہٹ' بنگلے کے سناٹے کو تھپتھپا کر واپس لوٹ جاتی' گم ہو جاتی۔ وہ ان کے ساتھ گھستا جاتا' باہر بھی' بھیتر بھی' ایک ان ہونے موہ کی آنچ میں تپتا ہوا' باہر کا اندھیرا جیسے لڑکی کی ازلی بے خوفی سے وابستہ تھا اور وہ جیسے بندھا تھا' وہ اس کے ساتھ کہیں بھی جا سکتا تھا' وہ ایک لمحے کے لیے بھول گیا' یہ وہی لڑکی ہے' جسے اس نے پاگل سمجھا تھا' جو پیڑ سے کودی تھی' غلیل سے اس کے گلے کو دبایا تھا' آنکھوں کو بھینچا تھا۔ پاگل! دل کی دو دھڑکنوں کے درمیان کون سی جگہ ہے' جو غیر پاگل ہے' وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ صرف اسے دیکھ رہا تھا' جو اس کے سامنے بیٹھی تھی' گٹھا ہوا سہما' سانولا چہرا' بھوری اور بھوکی آنکھیں' دھول آلود بال جو کندھے کے نیچے ایک کالے جھگڑے لیے تھے' گلے میں لٹکتی غلیل اور جیب میں ننھے پتھر......
وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ دبے قدموں سے اس کے پاس چلی آئی تھی اور اسے پتا بھی نہیں چلا' کب وہ آکر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کی سانسیں اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں' بل کھاتی ہوئی سانس' جسے چھوتے ہی بدن بولنے لگتا ہے۔

"کچھ دیکھو گے؟"

اس نے کچھ اتنے چپکے سے کہا گویا یہ اس کا بھرم ہو۔ اس نے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا...... وہ اس کے قریب چلی آئی' لیکن رکی نہیں۔ سیدھی کتابوں کی الماری کے پاس ٹھٹک گئی۔ کرسی کو شیلف کے پاس کھینچ لیا' اس پر چڑھ گئی' فراک کا نچلا سرا حصہ اوپر کھنچ گیا' جس کے نیچے جانگیہ کی سفید' اڑتی ہوئی جھلک دکھائی دی۔ وہ پنجوں کے بل کھڑی ہوئی کتابوں کے پیچھے کچھ ٹٹول رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کا ہاتھ باہر آیا اور اس نے دیکھا کہ اس میں چمڑے کا لمبا کیس ہے' لکڑی کا ہینڈل باہر نکلا تھا۔ وہ کرسی سے نیچے اتر آئی۔ ہینڈل کو پھناک سے پیچھے کھینچا...... اور تب اس نے دیکھا..... سرسراتے سانپ سا ایک چاقو باہر نکل آیا ہے۔

وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی...... اور وہ خالی الذہن سحرزدہ سا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ چہرے اور چاقو کے درمیان اس مسکراہٹ کو' جو ایک ٹھنڈی کوندھ سی ہوا میں ٹھہری تھی۔

"تم دیکھنا چاہو گے؟" اس نے اس کی طرف دیکھا۔ "ڈرنے کی بات نہیں ہے۔"

نہیں وہ ڈر نہیں رہا تھا' وہ اپنی جگہ کھڑا تھا۔ اسے لگا' یہ ایک سپنا ہے' جب اندر کا ڈر اپنی دھندلی حد کو پھلانگتا ہوا باہر کی چیزوں کو واضح کرنے لگتا ہے۔ چاقو' لکڑی' لان کا اندھیرا' اس کے پرے ان کی آوازیں' اچانک اسے لڑکی کی بات یاد آ گئی۔ "کیا یہ اصلی ہے؟"

"ہاں ضرور اصلی ہے' جیسے میں ہوں' اس لڑکی کے سامنے کھڑا ہوا' وہ چاقو کی دھار پر اپنی انگلیاں پھیر رہی ہے اور چاقو بھی اصلی ہے۔ میں جب چاہوں' ہاتھ آگے بڑھا کر اسے چھو سکتا ہوں' لیکن میں ایسا کرتا نہیں' مجھے لگتا ہے ذرا سا ہلوں گا تو سب کچھ ٹوٹ جائے گا' تار تار ہو جائے گا۔"

وہ بھی ساکت کھڑی تھی۔ آنکھیں اٹھائیں' تو ان میں مسکراہٹ نہیں' ایک گہری سی سوچ بھری تھی۔ وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی۔

"خوب صورت ہے یا نہیں؟" اس میں کتنا طنز تھا' وہ نہیں سمجھ سکا' پھر بھی ہلکا سا تجسس بیدار ہو گیا........ "کہاں سے ملا تمہیں؟"

"ملا نہیں' میرے پاس تھا۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "" میں اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہوں۔"

"بہت تیز لگتا ہے۔" اس نے کہا۔

"کافی تیز ہے...... دیکھو گے؟"

اس نے چاقو اٹھا کر اس کے گلے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور وہ ہنسنے لگی۔

"وہ سب ڈر جاتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"کوئی یہاں آتا ہے؟" اس نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

"پہلے آتے تھے؟" اس کے لہجے میں بہت پرانے دنوں کی تلچھٹ ابھر آئی۔ وہ میز کے سامنے چوکی پر بیٹھ گئی تھی.... چاقو میز پر رکھ دیا.... اپنی دونوں کنپٹیوں کے بیچ.... جہاں وہ ایک روشنی کے دھبے سا لیٹا تھا۔

"کون آتا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"تلاشی لینے۔" اس نے کہا۔ "وہ کسی بھی وقت تمھاری تلاشی لینے آسکتے ہیں...... معلوم ہے' تم کیا کرو گے؟"

وہ دھیان سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی' منھ کا کور ذرا سا کھل گیا تھا' اتنا کم کہ اسے مسکراہٹ نہیں کہا جا سکتا تھا' اتنا زیادہ بھی نہیں کہ لگے وہ ہنس رہی ہے...... اچانک اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کی ہتھیلیوں کو سہلانے لگی۔

"تم بیمار رہتے ہو' تمھیں کچھ بھی نہیں معلوم۔"

اس کے لہجے میں ایک عجیب سی ہمدردی تھی' جیسے وہ کہیں ذرا اوپری منزل سے کچھ دیکھ رہی ہو اور وہ نیچے کھڑا ہو' وہ اسے کچھ بتا رہی ہے جسے وہ نہیں دیکھ پا رہا ہو......

"تمھیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

اس کی آواز یکایک بہت دھیمی ہو گئی۔

"یہاں سے؟"

"دلّی سے...... " اس نے کہا۔ "اگر وہ تم سے پوچھ بیٹھے' تم یہاں کیا کر رہے ہو' تو تم کیا جواب دو گے؟"

وہ ہکا بکا سا اسے دیکھنے لگا۔

"یہاں بٹی کا گھر ہے..... " اس نے کہا۔

"بٹی کون؟" اس کا لہجہ بالکل ٹھنڈا اور نامانوس سا سنائی دیا۔

"اگر وہ تمھیں بیچ سڑک میں پکڑ لیں تو؟ تم کیا انھیں اسٹوڈیو لے جاؤ گے' یہ بٹی ہے' تمھاری کزن؟ یہ اسٹیج پر کھڑی لڑکی؟" وہ ہنس پڑی۔

"وہ تمھیں پاگل سمجھیں گے!"

اس نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا؟ اگر تم باہر ہو' تو کچھ بھی ہو سکتا ہے...... وہ تمھیں مار سکتے ہیں...... مار کر کہیں بھی پھینک سکتے ہیں۔ تمھاری لاش پڑی رہے گی' تمھیں کوئی پہچانے گا بھی نہیں کہ تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو' کہاں رہتے تھے؟" اس کی آواز دھیمی پڑنے لگی ایک پھسپھساہٹ میں بجھنے لگی' لیکن پوری طرح نہیں...... وہ ایک لو کی نوک پر موم کی طرح جمع ہو گئی تھی' جس کے ارد گرد باہر کا اندھیرا' میز پر رکھا چاقو' الماری کی کتابیں پیلی پرچھائیوں سی سکڑ گئی تھیں' خاموش نہیں' لیکن خاموشی کی طرف جھکتی ہوئی......

"اسی لیے میں کہیں نہیں جاتی۔ میں گھر میں بیٹھی رہتی ہوں۔ میں جاگتی رہتی ہوں۔ وہ کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔ وہ آتے ہی گھر کا کونا کونا چھان لیں گے' میری تلاشی لیں گے' بار بار مجھ سے پوچھیں گے کہ ڈیری کہاں ہے۔ میں انھیں ہر جگہ لے جاؤں گی' کمروں میں' باغ میں' جھاڑیوں کے پیچھے' میں ان سے کہوں گی' یہاں کوئی نہیں ہے' سارا گھر خالی ہے' یہاں میرے علاوہ کوئی نہیں رہتا...یہاں صرف میں ہوں۔"

اس کا ہاتھ چاقو پر تھا۔ چھوٹی' تنگ چھاتی اوپر نیچے ہل رہی تھی' سانسوں کے ساتھ ساتھ لرزاں لرزاں' گلے میں لٹکی غلیل کا چمڑہ ہوا میں جھول رہا تھا۔

اچانک اس نے چاقو اوپر اٹھا لیا...... جیسے وہ کوئی آئینہ ہو...... اس کے ننگے بلیڈ کی پرچھائیں اس کے چہرے پر گر رہی تھی...... وہ پاس آئی' اور دھیرے سے پھسپھسا ہو کر کہا۔ "تم دیکھو گے؟"

وہ بھراسا اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم جانا چاہتے تھے' ڈیری کہاں گئے تھے؟...... یہاں آؤ' بس اب دیکھو...... اس طرح نہیں۔اس طرح تمہیں صرف اپنی پرچھائیں دکھائی دے گی...... آگے آؤ' دیکھو...... کتنی دھوپ ہے' کھیتوں کے پیچھے' ادھر' نیچے' دھول کے نیچے دیکھو...... وہ وہاں چھپے ہیں۔" اس نے دھکا دے کر اسے اپنے پاس کھینچ لیا' اپنی گرم' جھلستی سانسوں کے نیچے' جہاں چاقو کی دھار ایک مند گندے شیشے کی طرح جھلملا رہی تھی' جیسے اس پر ایک سرخ' ڈبڈباتے سورج کی چھایا ہو' زمین پر پھیلے بے مطلب اور بے لوث دکھ کو گھیرتی ہوئی' خود اس کی آواز میں گھری ہوئی' جو کسی اندھیرے گڈھے سے باہر آ رہی تھی' ایک چپکیلی سی پھسپھساہٹ' جو چاقو کی دھار سے چھلتی ہوئی اس کی آتما کو چھیل جاتی تھی......

وہ اسے بلا رہی تھی...... پھر وہ ٹھہر گئی' اسے چھوڑ دیا' جس کی آنکھیں ہوا میں ٹھہر گئیں جیسے فلم اچانک ختم ہونے پر آنکھیں خالی پردے پر ٹھہری رہتی ہیں اور ہم اندھیرے سے اٹھ کر کھلی اور حقیقی دنیا میں آ جاتے ہیں۔

"تم ڈر گئے؟" وہ ہنس رہی تھی...... اس کے چہرے کو سہلا رہی تھی۔ "تم بیمار رہتے ہو' میں ایکٹنگ کرتی ہوں...... لیکن یہاں کوئی ڈر نہیں ہے' یہاں صرف میں ہوں' تم مجھ سے ڈرتے ہو؟"

پتا نہیں' کیوں' اس کے پیلے چہرے کو دیکھ کر اس کا گلا کچھ رندھ سا گیا' ایک عجیب سا تجسس ماتم کرنے لگا۔

"کیا یہ سچ ہے؟" اس نے ڈرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا سچ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ڈیری یہاں نہیں رہتے؟"

"تمہارا مطلب ہے...... وہ؟" اس نے باہر لان کی طرف اشارہ کیا' جہاں دلّی کی شانت اور خاموش رات پھیلی تھی۔

"ہاں' یہ سچ ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا' جیسے اسے کوئی پرانا خفیہ راز بتا رہی ہو۔

"وہ بہار کے گاؤں میں ہیں...... وہ کبھی نہیں لوٹیں گے۔"

"اور یہ ڈیری؟" اس نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ تمہارے بھائی نہیں ہیں۔"

وہ ایک ٹک دیکھتی رہی' پھر اسے اپنے پاس کھینچ لیا' اس کے ہونٹوں' آنکھوں' رخساروں کو چومنے لگی' "نہیں' یہ میرے بھائی نہیں ہیں۔" اس نے بوسوں کے درمیان سانس لیتے ہوئے کہا۔ "وہ تمہاری بی

کے lover ہیں۔"

اس نے اسے چھوڑ دیا' چق اوپر اٹھائی اور دھکا دے کر اسے باہر اندھیرے میں دھکیل دیا۔

"جاؤ' وہ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے!"

کوئی نہیں تھا۔ کوئی انتظار نہیں کر رہا تھا۔ گھاس کے ٹیریس پر سفید ہنسیا جیسا تھا' جس کی اوٹ میں پیڑ اپنی چھایاؤں کے ساتھ بنگلے کی دیوار سے سٹ گئے تھے۔ پورا لان ایک زرد روشنی میں ڈوبا تھا...... جہاں اس کی ہنسی' اس کے پیروں کے پیچھے بھاگ رہی تھی' ایک شکاری جانور کی طرح اس کی آہٹ کو سونگھتی ہوئی' اس کی دھڑکنوں کو اپنے کھروں تلے ناپتی ہوئی۔

وہ ٹھٹک گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھوا' اپنے بالوں کو' ہونٹوں کو' ہونٹوں کے بیچ لٹکتے دانتوں کو' جیسے اس کے بوسوں کے ٹکڑے اب بھی وہاں چپکے رہ گئے ہوں' اسے لگا' جیسے اس کی آواز اب بھی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے' بخار کی بے چینی سے بل کھاتی ہوئی...... اسے اپنے پاس بلاتی ہوئی' روکتی ہوئی' انسان کی آواز نہیں' بلکہ جھاڑیوں کی دھونکی گہری لمبی سانس کی طرح' جب کوئی پرندہ اچانک اندھیرے میں اڑ جاتا ہے...... لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ بلکہ' جھاڑیاں' پیڑ سب ساکت کھڑے تھے۔ اور تب ایک گھنی' نیبیاتی' ٹیس اس کی آتما کو متھنے لگی۔ لڑکی کا چہرا بار' بار اندھیرے میں چمک جاتا تھا' اس کی ویران اکیلی آنکھیں' دھول آلود بال' کتابوں کے درمیان ڈولتا چاقو..... من میں خواہش ہوئی' وہ اس کے پاس لوٹ جائے' کچھ کہے ...... جیسے اس کے اور لڑکی کے درمیان کوئی مکالمہ ہمیشہ کے لیے ادھورا رہ گیا ہے........

پھر خیال آیا' وہ باہر ہے' لڑکی کی دنیا سے باہر' جہاں سب کچھ ہو سکتا ہے' آکاش کے نیچے' پیڑوں کے نیچے' جہاں سے سارا لان نظر آتا تھا' پیلی چاندنی میں ایک ہتھیلی سا کھلا ہوا۔ ہوا چلتی تو گھاس اور پتے لرزنے لگتے' جس کے پرے پیڑوں کا ٹیریس ایک ریت کا ڈھوہ معلوم ہوتا تھا' ساکت وصامت۔

ہلکی سے کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور وہ چونک گیا۔ کوئی چل رہا تھا۔ نیچے کیاریوں میں پڑے پتے یکایک چرمرا اٹھے۔ فینس کی جھاڑیوں پر ایک چھایا سرکتی دکھائی دی۔ وہ اپنے سے کچھ کہہ رہی تھی' اندھیرے میں لفظ کھلتے تھے اور مند جاتے تھے' وہ پھاڑتی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آیا لان کے اس اجاڑ کونے میں ارا کہاں جا رہی ہے۔

وہ ٹھہر گئی تھی' فینس کے آخری سرے پر' جہاں بنگلے کی لائٹ میں اس کا سر دکھائی دیتا تھا۔ جوڑے کے بال منتشر ہو کر کانوں کے پاس جھول رہے تھے' پیشانی چمک رہی تھی اور چہرے پر ایک پیلا سا سکون تھا' ایک ہمہ تن محویت جو کسی نادیدہ آواز کو سننے میں ادھر آئی تھی۔

"Will you let me go"

کس سے پوچھ رہی ہے ...... کون ہے وہاں؟ کیا یہ اس کا پارٹ ہے' ریہرسل کا ایک ٹکڑا؟ یا شاید وہ کچھ دیر کے لیے خالی ہے ...... ناٹک کے درمیان ایک خالی وقفہ ...... جسے لانگھ کر وہ یہاں چلی آئی تھی

........لان کے ایک کونے میں' ریہرسل کی آوازوں سے دور' جہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا؟

وہ آگے بڑھ گئی' پیڑوں کے پیچھے چھپ گئی' رات کی ہزار پرچھائیوں میں ایک' اس ٹیلے کی جانب بڑھتی ہوئی' جہاں اٹھا ہوا گھاس کا اسٹیج تھا' چاندنی میں جھلملاتا ہوا' ڈیری کا اسٹیج' جس پر وہ اسٹرن برگ کا ڈراما کر رہے تھے۔

یہ حقیقی نہیں ہے۔ پاگل' دیکھا نہیں' یہ ارا تھی اور کون ہو سکتا ہے؟ وہ اپنے سے بول رہی تھی ......اپنے سے؟ وہ شاید حقیقی ہے' اکیلے میں بولنا' اپنے آپ سے بولنا........ تم کچھ بھی ہو سکتے ہو۔ کتنے سننے والے ہیں؟ پیڑ' گھاس' جھاڑیاں' وہ باہر ہیں' لیکن باہر کی دنیا میں وہ اتنے ہی اکیلے ہیں' جتنے گھر کے اندر لوگ۔ وہ سب کچھ سنتے ہیں۔

"بٹی۔"

وہ چپکے سے پیچھے آئی تھی۔ وہ پرچھائیں نہیں تھی۔ وہ حقیقی تھی۔ اس کے ہاتھ........ اس کے کپڑوں کی خوشبو' وہ اسے پکڑے تھی۔

"تم کہاں تھے؟ میں تمھیں ہر جگہ تلاش کر رہی تھی!"

وہ کچھ نہیں بولا' صرف اس کے ہاتھ پکڑے' اسے خوشی تھی وہ اندھیرے میں اس کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتی۔

"دیکھو' میں تمھارے لیے کیا لائی ہوں!"

کھلے لفافے میں سینڈوچز رکھے تھے' کھیرے اور ٹماٹر اور پنیر میں لپٹے ہوئے۔

"گھر کب چلو گے؟" اس نے کہا۔

"بس' آدھا گھنٹا اور ہے........ تم اوب تو نہیں گئے؟"

وہ اسے بتانا چاہتا تھا' جو کچھ اس نے دیکھا تھا' پھر اچانک اسے لگا' وہ دھوکا ہو گا' اسے جھٹلانا ہو گا' جو کچھ دیر پہلے اس نے محسوس کیا تھا' لوگ کیسے بیتے ہوئے واقعے کو سامنے رکھ دیتے ہیں' دیکھو میرے ساتھ یہ ہوا تھا۔

"تم یہاں ہو!" ڈیری بھاگتے ہوئے آئے تھے' ہانپ رہے تھے۔

"وہاں سب تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔"

انھوں نے بٹی کو دیکھا اور بٹی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ "دیکھو' یہاں کون کھڑا ہے؟"

ڈیری نے منھ موڑا' جہاں وہ تھا۔ وہ اسے دیکھ کر کچھ اتنا خوش ہو گئے کہ اس کے پاس آ کر اس کا سر اپنے پاس کھینچ لیا۔ ان کی بٹی کا چہرا اس کے گال سے رگڑنے لگا۔ سگریٹ اور پسینہ اور محنت کی گندھ' یہ سب ڈیری تھے اور سامنے بٹی کھڑی تھی' ہمیں دیکھ رہی تھی اور تب مجھے لگا' یہ شاید سکھ ہے........ ڈیری سے ہم کنار ہو کر بٹی کو دیکھنا........ یہاں کوئی کھیت نہیں' نہ چلچلاتی دھوپ' نہ چیلیں' نہ چاقو نہ اپنے سے بولے ہوئے اکیلے' لاوارث لفظ........

یہ سکھ ہے۔ سکھ میں کوئی نہیں دیکھتا کہ تم رو رہے ہو۔

"چلنا چاہیے۔" ڈیری نے اسے دھیرے سے الگ کر دیا اور تب اسے لگا' سکھ کتنا چھوٹا ہوتا ہے' آتا بھی نہیں کہ چلا جاتا ہے۔

"ہم ابھی آتے ہیں...... صرف لاسٹ ایکٹ باقی ہے۔" بی نے کہا۔

اس کے ہاتھ میں سینڈوچز کا لفافہ تھا' وہ انھیں جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ کھڑے ہو جاتے ہیں...... فینس کے پاس...... ایک دوسرے پر جھکے ہوئے' کچھ کہہ رہے ہیں' جسے وہ نہیں سن سکتا۔

"تمھیں نہیں معلوم' وہ کون ہیں؟" کوئی جھاڑی سے پھسپھسایا ہے۔

"وہ پیار کرتے ہیں' وہ پاگل ہیں !The are ruiningthier lives"

رو ئننگ...... برباد ہو جانا' تباہ ہو جانا' ختم ہو جانا۔

(زیرِ اشاعت ناول "ایک چتھڑا سکھ" کا ایک باب)

☆ ○ ☆

آصف فرخی

راکھ اور ستارے
(روز آؤسلانڈر کی نظمیں)

مٹھی بھر راکھ جو آگ کے طوفان سے بچ نکلی اور جس کے لیے ستاروں بھری کشتی سمندر کی موجوں پر منتظر تھی۔ شاعرہ روز آؤسلانڈر (Rose Ausländer) کا شعری پیکر خود اس کی اپنی زندگی پر بھی صادق آتا ہے۔ روز آؤسلانڈر کو اس صدی کی ہم عمر ہی نہیں، ہم زبان بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی زندگی اور شاعری پر اس عہد کا کرب اور ہولناک حقیقت نحوست بھری پرچھائیں کی طرح ڈولتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس شدید کرب سے نبرد آزما ہو کر وہ اس کا شعری اظہار کرتی ہے۔

شاید اس کے ستارے کا مقدر ہی گردش تھا۔ وہ جس مقام اور جس وقت میں پیدا ہوئی، اس کا تقاضا بھی یہی تھا۔ روز آؤسلانڈر چرنوتسکی (Chernovtsky) میں پیدا ہوئی جو اس وقت وسطی یورپ کی طاقت ور آسٹرو ہنگیرین سلطنت میں شامل تھا۔ اس کے والدین جرمن زبان بولنے والے یہودی تھے۔ وطن اور زبان کا یہ تعلق اس کی دربدری اور ابتلا کا جزو ٹھہرا۔ یورپ کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے سبب اسے عصبیت اور نسل کشی، خانماں بربادی اور ہجرت کا سامنا کرنا پڑا جس کا ملال اس کی شاعری میں نمایاں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعری کی قوت اور شعر کہنے کے عمل میں تسکین پانے کا گہرا احساس بھی واضح ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ اس کی شاعری کا موضوع ہیں، جس کی طرف وہ بار بار پلٹ کر آتی ہے۔ سیاست دوراں کی نیرنگی اور زندگی کی مشکلات کے سامنے شاعری اور زبان نجات دہندہ اور مسیحا کی طرح نظر آتے ہیں۔

نسبتاً" آسودہ حال اور مطمئن بچپن میں پہلی دراڑ اس وقت پڑی جب پہلی جنگ عظیم کے دوران اس کے خاندان کو رومانیہ کے قبضے سے بچنے کے لیے ویانا اور بوڈاپسٹ میں پناہ ڈھونڈنی پڑی۔ رازوں بھرا اور پرسکون بچپن اس کی نظموں میں عکس پاتا ہے لیکن اس اطمینان بخش دنیا میں خوف کے سائے بھی ہیں۔ جنگ کے بعد اس کا شہر رومانیہ میں شامل ہو گیا اور وہ یونی ورسٹی میں ادبیات کی تعلیم حاصل کرتی رہی۔

۱۹۲۰ء میں اس کے والد کے انتقال کے بعد اس کا خاندان مالی مشکلات کا شکار ہو گیا اور وہ اگناز آؤسلانڈر کے ساتھ نیویارک چلی گئی۔ جہاں اس کے ساتھ شادی کرلی۔ سات سال کے بعد دونوں میں طلاق ہو گئی تو روز اپنے آبائی شہر واپس چلی آئی۔ اس شہر سے ہجرت اور پھر واپسی کا یہ سلسلہ زندگی بھر چلتا رہا۔ ۱۹۳۹ء میں اس کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ یہودی نژاد ہونے کے سبب جرمنی میں اسے حقیر کی نظر سے دیکھا گیا۔ مشرقی یورپ میں یہودیوں کے حالات خراب ہونے لگے تو روز پھر امریکا چلی گئی لیکن اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے فوراً ہی واپس آگئی۔ وہ ایک کارخانے میں کام کرنے لگی اور شاعری بھی کرتی رہی۔ ۱۹۴۱ء میں شہر پر نازی افواج کے قبضے کے بعد اسے یہودیوں کے لیے مختص کردہ محلے میں رہنا پڑا جہاں وہ اور اس کی ماں مختلف مکانوں کے تہ خانوں میں تقریباً" ایک برس تک چھپتی رہیں۔ اس تمام عرصے میں وہ نظمیں لکھتی رہی جو بھوک، نحوست، زخم، خون، کفن، آگ، راکھ اور دھوئیں کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں اس ماں کا ذکر بھی ہے جس کی خاطر یہ سب تکلیفیں برداشت کی جارہی ہیں۔ ماں کا یہ روپ بعد کی نظموں میں زمین کا روپ بن جاتا ہے اور کہیں کہیں زبان کی شفا بخش قوت کا جو مادری زبان کے طور پر ایک بکھرے ہوئے وجود کو پناہ دیتی ہے، دوبارہ جوڑتی ہے اور تکمیل

عطا کرتی ہے۔

۱۹۴۴ء میں روسی افواج نے نازی غلبے کو ختم کرکے یہودی محلے کو آزاد کرالیا لیکن آزادی نے جرمن بولنے والے یہودیوں کو ایک بار پھر مشکوک اور معتوب بنادیا۔ روز کو ... ران ایک کتب خانے میں ملازمت مل گئی اور وہ ادیبوں کے ایک حلقے سے بھی منسلک ہوگئی۔

۱۹۴۶ء میں اس کے شہر کو یوکرین میں شامل کردیا گیا اور اسی سال وہ ایک بار پھر نیویارک چلی گئی۔ وہ اپنی ماں کے لیے امریکی ویزا حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی کہ اس دوران اسے ماں کی موت کی خبر ملی اور وہ شدید بیمار پڑگئی۔ ماں کی موت نے اسے شدید ذہنی صدمے میں مبتلا کردیا جس سے وہ کئی برس تک چھٹکارا حاصل نہیں کرسکی اور جس کے زیر اثر اس نے اپنی مادری زبان سے ناتا توڑلیا۔ اس پورے عرصے میں وہ انگریزی میں لکھتی اور ترجمہ کرتی رہی۔ دس برس کے بعد اس نے دوبارہ یورپ کا سفر کیا اور معروف جرمن شاعر پال سیلان (Paul Celan) سے دوبارہ تعلقات استوار کیے اور اسی کے زیر اثر دوبارہ جرمن میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن اب اس کی شاعری کا انداز یکسر بدل چکا تھا۔ اس نے وزن اور آہنگ کو فراموش کرکے آزاد مگر بے حد بلیغ اور تہ دار اسلوب اختیار کیا جس میں کفایت لفظی نمایاں ہے۔ ان چند ایک الفاظ پر انحصار اس قدر زیادہ ہے کہ نظم میں Punctuation کے نشانات کی بھی گنجایش نہیں۔ پوری نظم میں ان دھات کا سا تناؤ ہے جسے شدید کیمیائی عمل اور انتہائی حدت سے گزار کر ایک ریزہ ٹکڑے میں سمیٹ لیا گیا ہو۔ بہ ظاہر بے حد سادہ نظر آتی ہوئی یہ شاعری شدید اضطراب کی آئینہ دار ہے۔

اپنے تجربے اور اس کے شعری اظہار کے حوالے سے روز آؤسلانڈر نے خود لکھا۔ "اس ناقابل برداشت حقیقت سے نبرد آزما ہونے کے دو طریقے تھے یا تو یہ کہ مکمل طور پر مایوسی کا شکار ہوجائیں یا پھر ایک مختلف اور روحانی حقیقت سے وابستہ ہوجائیں۔ اور اپنی موت کا انتظار کرتے ہوئے ہم میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو خوابوں کی دنیا میں رہ رہے تھے' بے گھری کے دنوں میں یہی ہمارا حادثاتی گھر تھا۔ لکھنے کا مطلب تھا زندہ رہنا"۔ آخری دور کی شاعری میں روز نے براہ راست اسلوب اختیار کیا جس کی ہیئت بہ ظاہر سادہ تھی لیکن محبت' دوستی' تنہائی' جدوجہد اور موت کے تجربات کا ذکر معمولی نہیں ہے۔ اس انداز بیاں کی تہ میں گہری شدت اور درد کا ایسا احساس پنہاں ہے جو بہ مشکل قابل برداشت ہے۔ جرمن شاعری میں یہ اسلوب روز آؤسلانڈر سے مخصوص ہے۔

۱۹۶۵ء میں روز یورپ واپس آگئی اور جرمنی کے شہر ڈسل ڈورف میں رہنے لگی۔ اسی سال اس کا دوسرا شعری مجموعہ شایع ہوا اور جب ۱۹۶۸ء میں اس کا تیسرا مجموعہ شایع ہوا تو اسے نقادوں نے بے حد سراہا اور اس کی شہرت مستحکم ہوگئی۔ وہ ۱۹۸۱ء تک برابر لکھتی رہی۔ ۱۹۸۸ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۹۵ء میں اس کی نظموں کا انتخاب انگریزی ترجمے میں Mother Tongue کے نام سے شایع ہوا جس کے مترجمین Jean Boase-Beier اور Anthony Vivis ہیں۔ انھی کے ترجمے کو بنیاد بناکر چند نظموں کو اردو کا روپ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاعرہ کی زندگی اور فن کے بارے میں مندرجہ بالا معلومات کا ماخذ بھی یہی کتاب ہے۔

روز آؤسلانڈر کی شاعری سادہ نظر آتے ہوئے بھی اشارات سے بھری ہوئی اور اپنی ایک علاحدہ موسیقی کی حامل ہونے کے سبب ترجمے کے لیے قریباً" ناممکن ہے۔ الفاظ تو الفاظ روز آؤسلانڈر نے اپنے دوست پال سیلان سے یہ بھی سیکھا تھا کہ الفاظ کی آوازوں کو برتنے کے ساتھ ساتھ ان کے اردگرد کی خاموشی کو سطر کا حصہ بنادیا جائے۔ الفاظ اور خاموشی' ایک وقار کے ساتھ ساتھ شدید احساس الم' ترسیل کے عدم امکان کے ساتھ ساتھ زبان کو ربط کا اہم ترین ذریعہ سمجھنے کی کوشش' اس قدرے آزاد ترجمے میں انھی عناصر کا احساس دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آگ کے طوفان کے بعد ایک مٹھی راکھ کو سمیٹ لینے کی کوشش ہماری اس بیسویں صدی کا شعری اسلوب ہے جو روز آؤسلانڈر کی ہم عمر ہے اور ہم زبان بھی۔

لفظ

مجھے اپنی خدمت پر مامور رکھو
میری تمام عمر
مجھے اپنے اندر سانس لینے دو

مجھے تمھاری پیاس ہے
تمھیں پی جاؤں لفظ بہ لفظ
اے میرے ماخذ

تمھاری ناراض چمک
لفظ سرما

لالہ کی طرح نفیس
تم مجھ میں کھلتے ہو
لفظ بہاراں

میں تمھارے تعاقب میں
نیند میں بھی
کہ تمھارے سب خواب جان سکوں

ہم دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں
ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے۔

دام

میں کچھ کہنا چاہتی ہوں
ایک لفظ
جو سب کچھ کہہ دے

یہ نہیں
کہ میں وہ ہوں جو میں ہوں
نہ یہ کہ مجھ پر طاری کر دے
جو اہر سکے 'ملک

لفظ مجھ کو نہیں ملتے
میں چپ

چپ چاپ دام میں پھنس جاؤں
جہاں حروف کا جال
وقت کے ہاتھوں بنا ہو!

شاید

شاید آسمان ہے
اور زمین کی نظریں
اوپر کی جانب

شاید نیلا رنگ ہے
اور چمکیلا نیلا

شاید
آسمانی لفظ بھی ہیں
اور زمین کے لفظ

شاید
تمھارے لفظ ہیں
شاید میرے لفظ
شاید میں اور تم
ہمیشہ وہی لفظ

جب میں کہوں سونا
میرا مطلب لفظ سے ہے

جب میں کہوں لفظ
میرا مطلب ہے
سونا' نئی دنیا' لوگ

تم اور میں اور یہ گفتگو

آ گئے

ہم ایک بار پھر
ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیں گے

تم لکھو گے انجام

ان الفاظ کا

جن کی ابتدا ہوئی

کہاوتیں

ان کے لیے

جس کی سماعت

تمام حدود سے آگے ہے

میں نے تھام رکھا ہے

کس نے نوچ پھینکی

یہ کہکشاں

میری نظروں کے سامنے سے

میں نے اسے باندھنا چاہا تھا

سات لفظوں سے

میری آنکھیں ڈوبی جاتی ہیں

اس بارش میں

میں نے تھام رکھا ہے

کاغذ کو

کاغذ کے اس ٹکڑے کو

پرواز

پرواز کے دوران

تم کو آزادی کی جستجو ہے

جہاں لفظ
تمام کے تمام کھوئے گئے

تم نے ڈھونڈلی ہے زبان
جو نام لیتی ہے محبت کا

نظم

وہ آئے
بندوقیں اور پھٹے پرچم لیے ہوئے
چاند کو گولی ماردی اور تمام ستاروں کو
اور روشنی بجھادی
اور محبت بجھادی

اس دن ہم نے سورج کو دفن کردیا
پھر ہمیشہ کے لیے رات ہوگئی۔

راکھ

راکھ کی بارش میں
میں تمہارا نام لکھوں

یہ نام
ایک مکمل لفظ تھا

آگ نے
اسے غارت کردیا

میں نے خاک کی قبا
شعلوں پر پھینک دی

اس بے نور نظارے کے پیچھے
تمھاری آنکھیں
مجھے اپنی جانب بلاتی ہیں۔

میرے بدن میں

تم
صبح دوپہر اور رات کے وقت
ایک مختلف آدمی

میں نے تم کو پہچانا
تمھاری آنکھوں کی حرکت سے

تمھارا مسکرانا
تمھارا بولنا وعدے کرنا

تمھارے بدن کے اندر لفظ
ایک مختلف کھنک

جسے کوئی نہیں سن سکتا
جسے میں کبھی کبھی سن لیتی ہوں
اپنے بدن کے اندر

تم میں

تمہارے اوپر
سورج چاند ستارے
ان سے آگے
ختم نہ ہونے والی دنیائیں
آسمانوں سے آگے
ختم نہ ہونے والا آسمان

تمہارے اوپر
جو کچھ تمہاری آنکھیں دیکھتی ہیں
تم میں
وہ سب کچھ
جو دکھائی دیتا ہے اور
وہ جو ختم نہ ہونے والا
دکھائی نہ دینے والا

محبت

پھر کب ایک ساتھ ہوں گے
جھیل کے اندر
تم پانی بن کر

میں کنول بن کر

تم مجھ کو اٹھائے ہو گے
میں تم کو پی جاؤں گی

ہم ایک ساتھ ہوں گے
دنیا کی نظروں میں

اور ستارے بھی
حیران ہو کر تکیں گے
کہ یہ دو ہیں
جو واپس لوٹ گئے ہیں
اس خواب میں
جس نے ان کو چن لیا تھا۔

نظم

جب میں چلی جاؤں گی
سورج شاید تب بھی جلتا رہے

سیارے اسی طرح
اپنے اصولوں کے مطابق
گھومتے رہیں
اس مرکز کے گرد
جسے کوئی نہیں جانتا

گل لالہ میں
وہی رنگ و بو رہے
برف سفید کرنیں پھیلاتی رہے

جب میں چلی جاؤں
بھول جانے والی اس دنیا سے
تو کیا تم کچھ دیر کے لیے
میرے لیے
میرے لفظ ادا کر دو گے؟

ہوائی محل

ابابیلیں
بچپن کے دیس سے
اڑ گئیں

اڑ گیا
بچپن کا وہ دیس بھی

بچے
اب بوڑھے ہو گئے

اس زمین پر
جو کسی کی بھی نہیں
میں ہوائی محل بناتی ہوں
کاغذ کے محل

☆

شیخ ایاز کی نظمیں

سندھی سے ترجمہ آصف فرخی' شاہ محمد پیرزادہ

اے سدھارتھ' روک لے کشتی
میں بھی تیرے ساتھ چلوں!
میں نے بھی جمع کرلی ہے ساری زندگی
میں بھی تیرے ساتھ چلوں!
میں بھی کل سے تمھاری طرح
ہر یدارتھ کو چھوڑ بیٹھا ہوں'
گزاری ہے ہر ایک گھڑی کسی کے دھیان میں
جیسے گزاری ہے ایک صدی کسی کے دھیان میں
میرے سر پر تاج بنا دیا ہے بودھی کے درخت نے
جب کسی دیے نے اچانک جل کر
راہ میں روشنی پھیلا دی ہے'
میں نے بھی چاہا ہے تمھاری طرح
کچھ لوگوں کو دیکھ سکوں'
کشش اتنی ہے تمھارے گھاٹ کی
اچانک وہ چمک اٹھا ہے
میں کہتا ہوں میں نے نروان تلاش کرلیا
اور آگے بڑھ کر دیکھا
تو نا خدا کے ساتھ جا رہے تھے تم
کہاں' یہ میں کیسے کہہ دوں!

☆

رات ڈھل گئی
اب پانچ بج رہے ہیں
درد کے کتنے دھاگے تم نے پرو لیے ہیں،
پھولوں کے ڈھیر سے
اور کتنے پھول چن لیے ہیں
تم یہ ہار کل بھی تو گوندھ سکتے ہو
اب تو سو رہو،
سو رہو

☆

آج بو رہا ہوں کتنی بیلیں
اس لیے کہ خوش بو کے بغیر
کیسی لگیں گی یہ گلیاں!
اگر پھول کھل اٹھے
اور ہوائیں چلیں
پھر تمہارے بغیر
یہ لمحے بھی اتنے ہی اچھے لگیں گے
جیسے تم بھی میرے ساتھ ہو
جیسے تم بھی میرے ساتھ ہو

☆

واں گو!
تم نے کیا دیکھے تھے ایسے
کھیت سینکڑوں سورج مکھی کے جیسے
جو میں شفق میں دیکھتا ہوں
اور یہ کہتا ہوں:
"رات کو سورج مکھی مرجھا جاتے ہیں

تا کہ اگلے دن وہ سونا پگھلائیں سورج تلے
پھر دکھلائیں سورج تلے
جیسے اب کبھی آنکھیں نہ موندیں گے
اور نہ اس تپش میں سر جھکائیں گے"
واں گو!
شاعری میری بھی ایسی ہے' چاہے کوئی نظم ہو
یا بیت ہو
سورج تلے جیسے سورج مکھی کا کھیت ہو
آنکھ جس نے نہیں موندی
جب تلک موت کا اندھیرا
رات بن کر اس پر پھیلتا نہیں
میرے ہنر پر چھاتا نہیں

☆

آج تو دروازے کے پردے اڑ رہے ہیں
پھر بھی کوئی نہیں ہے
بس ہوا ہے!
پیڑ اگنے لگتے ہیں صبح سویرے
وہ مگر آیا نہیں
کیا صبا ہے؟
یاد کے یہ پھول مرجھا جائیں گے
تب ثبوت کیا رہے گا
کہ یہ بھی جھومے تھے کبھی
ہوا کے ساتھ ڈولے تھے کبھی!
لیکن وہ ہاتھ جو آکر انھیں توڑے
ان کی خوش بو چرائے
وہ نہیں آیا
وہ نہیں آیا!

سر کاٹو گے شہسوار

کب تلک، کب تلک

جسم روندتی رہے گی تمھاری یہ نفرت

کب تلک، کب تلک

کب تک بجتا رہے گا موت کا یہ ستار

کب تلک، کب تلک

اس کے اوپر مضراب کا ہمہ وقت وار

کب تلک، کب تلک

زندگانی کی قبا تار تار

کب تلک، کب تلک

خون کا ریلا جیسے آبشار

کب تلک، کب تلک

سننے کو نہیں ملے گی آدمیت کی پکار

کب تلک، کب تلک

اے خدا! اس خلق کو کچھ تو مت (*) دے

ہر ایک کو چھت دے

ہر ایک کو چھت دے

☆

صبح کی آواز آئی

"کون ہے؟"

میں نے جب ٹیگور کو گنگنایا

"کون ہے؟"

کوئی پرندہ چہچہایا،

---

* مت۔ عقل، سمجھ

"کون ہے؟"

پیڑوں نے بھی سر ہلایا

"کون ہے؟"

"کون ہے؟" "کون ہے؟" کسی نے پوچھ کر جادو جگایا

"کون ہے؟"

آنسو ہیں یا ندی جس نے سوال اٹھایا'

"کون ہے؟"

تم شفق میں ڈوبے جاتے ہو'
آکاش میں دریا نے کان لگایا'

"کون ہے؟"

پوچھا کسی نے جب ستارہ جگمگایا

"کون ہے؟"

یہ کہا سنسار نے "اپنا کہ پرایا؟"

"کون ہے؟"

کسی نے پھر بار بار آکر سنایا

"کون ہے؟"
ریت کے ذروں میں صداؤں کا سلسلہ سمایا'
"کون ہے؟"

رات میں سورج سمایا اور

اک آوازہ آیا'
"کون ہے؟"
"کون ہے؟"
"کون ہے؟"

☆ ☆ ☆
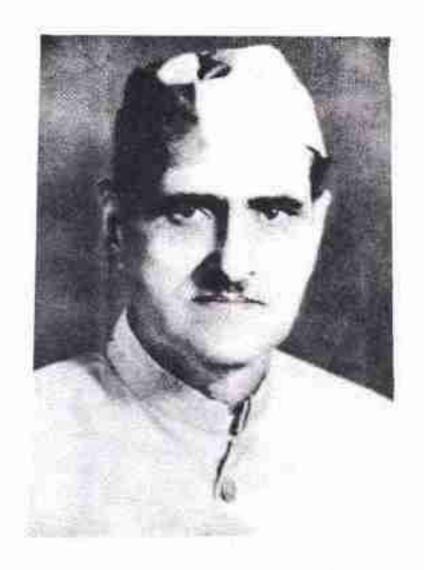
ابوالفضل صدیقی
ایک مطالعہ

ابوالفضل صدیقی

علاج بالمثل

پہلے پہلے واسطے میں آنے والے کو بیا خاکسار خاں اسم بامسمّٰی معلوم پڑتے۔ خاطر تواضع میں جسے کہتے ہیں، بچھ بچھ جاتے۔ ہونٹ حلق سے خستہ پوری اور حلوے کی طرح اترتے۔ نشست برخاست میں ریشم کے لچھے سے سرسراتے' وہ جو کہتے ہیں آنکھیں بچھانا' اس طرح ہمہ اشتیاق استقبال کرتے ہوئے سر پہ بٹھاتے۔ حاجت مندوں اور مدد خواہوں کو ان کے برتاؤں میں قاضی الحاجات کی شان نظر آتی۔ بات کرتے تو بیلے کے پھول سے منھ سے جھڑتے اور مخاطب علیہ کو بھینی بھینی خوشبو وجود کے اندر رچی محسوس ہوتی۔ ان کا خمیر نام کی مناسبت سے جیسے عطرِ گل سے اٹھایا گیا تھا۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو۔ بڑے محترم' بڑے بھاری بھرکم' خارجی تو خارجی' داخلی طور پر بھی خاکسار خاں کیا بھاری خاں تھے۔ پھر بڑے بوڑھوں میں بڑے بوڑھے' جوانوں بیچ نوجوان' بچوں کے درمیان ہوں تو ننھے منے' مکھن ملائی' بھولے بھالے۔ دوستی کے معیار پر شیر و شکر' جسے بولتے ہیں پیٹ میں اترتے خون میں رچتے' ساتھ ہی دشمنی کے معاملے میں کڑوا کریلا اور نیم چڑھا' تلخ چرائتہ' تھوہڑ' ناگ پھنی۔ پھر بے پیرے' بے مریدے' پیدائشی صرف استاد ہی استاد۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو کوئی مائی کا لال جاننے والا کبھی بات کر ہی نہ سکا۔ دشمن بھی آنکھ ملاتے تو کنکھیوں کنکھیوں میں جان کی خیر مناتے ہوئے۔ بڑے بڑے جبڑہ کلہ والوں کے تیور جھیک جاتے اور الیکٹرو پلیٹنڈ قلعی تو کچی چاندی کو ماند کرتی ہے اور سونے کا ملمع قلعی کچے سونے کو مات کرتی ہے اور یہی چینی آبدار اور اٹوٹ ہوتی ہے اور لطف یہ کہ بیا کے تعلق واسطے میں آنے والے بیا کے یک رنگ ہونے کے جہل مرکب میں مبتلا تھے' حالاں کہ بیا قوسِ قزح تھے۔ اور ہفت رنگ قوسِ قزح کے سرے پر تو سونے کا پیالہ دھرا ہوتا ہے اور بیسیوں اس دہقانِ نادان کی طرح اس ظروفِ طلائی کو اٹھا لانے کے لیے بے تحاشا دوڑے' مگر خالی ہاتھ لوٹے اور شام ہو گئی۔

"بیا" بابا کا مشدد پیارا مخفف ہے' اور بیا پیارے کیوں نہ ہوتے' منوں' چھوٹوں کے نانا دادا لگتے' لڑکوں نوخیزوں کے تایا چچا ہوتے۔ پھر لطف یہ کہ ان کے ساتھ انھیں سب کو نانی' دادی' خالہ' پھوپھی کا مزہ آتا' نوخیزوں کو لنگوٹیا والا انداز ملتا۔ صبح سے دن چڑھے تک ان کے ساتھ کھلیان والے بنجر کے میدان پر گلی ڈنڈا کھیلتے۔ دوپہر میں چوپال پر دھول دھپا ہوتا' شام کو ان کے درمیان کبڈی کی پالی جڑتی۔ رات کو آتی پاتی کے ڈراؤنے کھیل میں کسی ڈرپوک نوخیز گوئیاں کے دوش بہ دوش بستی سے دور بھوت والے

پیپل' یا چڑیل بیچھل پائی والے پا کھڑ کی پتی لیتے' ہمت بندھاتے' ڈر نکالتے جاتے۔ جب ان میدانی کھیلوں سے جی بھر جاتا تو ہفتوں حویلیوں میں گڑیاں کھیلتی بچیوں میں جا ملتے' گوئیاں اور سہیلی ہو جاتے۔ دو سمدھنوں کے بیچ گڑیوں کی منگنی بیاہ کی بات چلاتے' اور پھر رچاتے اور دھوم سے رچاتے صرف زبانی جمع خرچ کے ساتھ نہیں۔ اس وقت لڑکوں لڑکیوں کے جوڑے ملانے سے کم سنجیدہ نہ ہوتے اور یہ بات نہیں ان کپڑے لتوں کی شادیوں میں اپنی کٹھار اور گانٹھ سے جنس اور رقم فراہم کرتے۔ جملہ رسوم مہندی' برات' ولیمہ' چوتھی چالے کا کھانا دیتے۔ گاہے گاہے ہنڈ کلیا کا پروگرام ہو جاتا تو منیوں کے ساتھ چولہا پھونکتے اور ننھی امت کے ساتھ درمیان میں بیٹھ کر مزے مزے سے خود کھاتے بھی۔ بستی کے غریب گھر ہوں یا خوش حال' زچ خانوں' جھانوں کی دایہ قابلہ کی طرح خبر رکھتے۔ نوزائیدہ کو چھلے اندر پوتڑوں میں' کان میں اذان پکار کر گود میں بھر لاتے اور چوپال میں "بالک پیار" کے مزے لیتے۔ اور یہیں سے جیسے مادر زاد دوستی کی پینگیں بڑھتیں' اور نوزائیدہ ہوش سنبھالتے سنبھالتے ماں سے کم انھیں بھی نہ پہچانتا۔ پھر بچہ کا تو خاصہ ہے' متوجہ ہو جئے آپ کی جانب کھنچے گا۔ اور یہیں سے ننھی امت کے ساتھ بیا کے تعلقات کی بنیاد پڑ کر جوانی تک پہنچی چلی آرہی تھی۔ اور لڑکپن' نوجوانی اور جوانی میں پہنچ کر تعلقات کی یہ ندرت محبت کے ساتھ ساتھ عجیب سے احترام کا روپ دھار لیتی۔ آج تیسری نسل اسی نہج کے ساتھ سامنے آگئی تھی اور بیا کا یہ پبلک ریلیشننگ جوں کا توں تھا۔ رشتہ کی بھانجیوں بھتیجیوں کے پاس اور بھانجوں بھتیجوں کے باپ بن جانے کے بعد اب ان کے بچوں کی باری تھی۔ اور یہ اسی ولولے اور شان کے ساتھ ان کی نگاہ کا مرکز تھے۔ سڑسٹھ (۶۷) کھا چکے تھے' جسے کہتے ہیں ستر (۷۰) کے پیٹے میں۔ سال گرہ کے لال سوت کے پنڈے میں بڑی بوڑھیوں کی بولی میں "دو چاند کی بڑھی" "ایک بسم اللہ کی' پوری کی پوری ستر (۷۰)" گانٹھیں خیر سے لگ چکی تھیں' مگر معاملت کے سلیقہ میں دل کشی بدستور تھی۔ خصلت کے رنگ ڈھنگ میں دل آویزی جوں کی توں تھی۔ لطف تو یہ کہ خود ان میں شوخی اور لطف اندوز ہونے کی صلاحیتوں میں اک ذرا کہنگی کے آثار نہ تھے۔ ذات ویسی ہی ہمہ مقبولیت اور کل قبولیت تھی۔ نئی بھرتی پلٹن پرانی سے کم دلچسپی ان کے اندر نہ پاتی تھی۔

بیا دشمن مادر زاد' سگے بھائی کے شر قابیلی سے محفوظ و مامون تھے۔ ساتھ ہی قماش و نقرہ و فرزند و زن میں نقرہ و زن سے بھرے پرے' مگر فرزند کے میوۂ شیریں سے لذت نا آشنا۔ سونا چاندی اگلتی زرخیز زرعی اراضی سے چکوں میں پھیلے ہوئے مالک قابض اور حویلی میں محدود بڑی اچھی بیوی کی نعمت سے فیض یاب۔ چوپال کے آدھی درجن دالانوں میں خود اکیلے اور حویلی کے چو رخے دالانوں در دالانوں کی آمنے سامنے قطاروں اور مربع صحن میں ایک اکیلی بیوی' اور چشمۂ شیریں پر مور و مارو مردماں کا مجمع لگا رہتا۔ چوپال ہم نشینوں ہم چشموں سے بھری رہتی۔ دوستوں' دور اور قریب کے شناساؤں کے ساتھ گرم گسترو خو آن آرا' جان محفل۔ اپنے اور دوستوں کے دشمنوں مخالفوں کے لیے یکساں مرد میداں' وبال جاں اور شیڈول کے آخری خانہ کیفیت میں مخالفت کا اندراج نہ تھا' صرف دشمن ہی دشمن درج تھے اور جو تھے وہ

پکی روشنائی سے لکھے تھے' ان میں جلی قلم کالی سیاہی سے بنی عمام گھمن خاں کا نام نامی اندراج تھا' جو چچا زاد بہن کے شوہر بھی تھے۔ اور بات تو خیر کینہ پروری کی ہوتی تھی' لیکن پیٹ کی گہرائی میں کینہ بغیر' نہ ان کی نہ ان کی' دونوں میں سے کسی کی روٹی ہضم نہ ہو سکتی تھی اور بلا چھیڑ خوباں' وصل نہ سہی حسرت ہی سہی جب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو مزا نہ آیا تو انھیں کیسے آجاتا۔

بیا انگریزی ناقص اللغت لفظ انکل کا ترجمہ ہے۔ تایا' چچا' ماموں' خالو' پھوپھا گریبان سے لے کر پائنچہ تک تمام رشتے اکیلے بیا کے اندر سموئے ہوئے ہیں اور اپنے بیا ایک بھی بیٹے بٹی کے باپ نہ ہوتے ہوئے بھی سبھی کے سب کچھ تھے۔ اگر بستی میں کوئی ان سے زیادہ معمر ہوتا تو اس کا جی بھی انھیں بیا پکارنے کو چاہتا۔ حسنِ اخلاق اگر خاطر تواضع کی وضع داری ہے' تو بیا خوش اخلاق تھے۔ اگر تن و توش' طاقت حسنِ مرداں ہے تو بیا حسین تھے' ویسے بھی وہ بستی بلکہ نواح کے سب سے زیادہ جسیم آدمی تھے۔

ساونتی دور کے لوگ اور اسی دم توڑتے آخری وقت کی باقیات' مگر چراغِ صبح تو بڑے زور سے بھڑکتا ہے اور اس اشتعالی بھڑک کو تاریخی مورخ و محقق ہندوستانی تاریک دور کا نام دیتے ہیں اور صدی بھر کی تاریخ کا پہیہ برطانوی عمل داری کے گرد گھما کر بات وہی ڈھاک کے تین پات رکھتے ہیں۔ اور بیا اور بیا سے اگلے آدی صدی بھر کے اگلوں کا اک ذرا اٹول کر تجزیہ کیجیے تو سچ پوچھیے ایسا لگتا ہے کہ ان کا جی انگریز تو انگریز کسی بھی حکومت نوعیت کی چیز کو ماننے کو نہ چاہتا تھا' یہ اپنی عمل داری مانتے تھے۔ اور جب ذرا سا موقع ملتا اپنا ساختہ پرداختہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ لوٹ مار اگر ہوتی تو ثانوی سی اہمیت اور اچھے سکہ بند جتھا بندوں کے اصولوں کے منافی۔ انگریزی قانون مال کی کمزوری اور خود آسانی کے تحت اور قانون دیوانی کے لامتناہی طول کے سبب زرعی آراضیوں پر قبضہ کے واقعات اور فوج داریوں' چڑھائیوں کی وارداتیں بیا کی جتھا بندیوں کی خاص آماجگاہ تھے۔ ویسے کمزور ناشی اپنے زبردست مد مقابلوں کی چیرہ دستی کی داد رسی بھی پاتے رہتے۔ بیا کے جتھے چالیس چالیس کوس چاروں طرف دو تین ضلعوں کی حدود میں دیہات کے جی دار جوانوں میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ اور جس خطہ کا قضیہ ہوتا' قضیہ زمیں بر سرِ زمیں' قانون اپنے ہاتھ میں اور لاٹھی باندھ کر دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرتے۔ اس میں کبھی کبھی دودھ پانی اور پانی دودھ بھی ہو جاتا البتہ سانپ مرتا' لاٹھی نہ ٹوٹتی۔

الارض اللہ' زمین خدا کی ہے۔ اور اس حق میں تیمور و چنگیز خدا کے ہتھیار رہے' اور بیا انھیں کے ایک چھوٹے سے ایجنٹ تھے۔ یہ بات نہیں بیسیوں کمزوروں کا حق دلوانے میں انھوں نے چھوٹی چھوٹی معرکہ آرائیاں یا چڑھائی کردینے کے چوپال پر بیٹھے ہی بیٹھے خوف دلا دینے سے' دخل قبضہ کے معاملات بخیر و خوبی سرانجام دیے۔ اور جوئے الارض تقاضائے بشریت ہے اور بیا سمی سوا چھ فٹے لمبے چوڑے دیوزاد' روئیں تن اسفندیار' پیل تن رستم دوراں' تاہم آدمی تھے۔ الارض اللہ کے حق میں سب سے زیادہ انھوں نے اپنی زرعی اراضی کو اپنے سوا چھ فٹ قد' لٹھ کی طاقت اور قانونِ مال کی کمزوری سے وسعت دی۔ اور ظاہر بات ہے یہ بنی عمام کے ساتھ ہی ممکن تھا اور ان میں گھمن خاں برادرِ عم ہی سب سے زیادہ مفتوح

تھے۔

جتھا بندی' فوج داری ببا کا اسپورٹس جیسا مشغلہ تھا' اور اسپورٹس بھی بن کا نہیں' کھیتوں کا میدانی ہرنوں کا شکار والا شوق۔ اگر کوئی ماہرِ نفسیات تجزیہ کرتا تو ببا کا چھوٹی امت میں دلچسپی لینا ان کا اس دوسرے رخ کا ازالہ تھا۔ بچوں میں گھل مل کر جیسے غیر شعوری طور پر وہ اپنے جتھا بندی کے متضاد کرتوتوں کا ازالہ کرتے تھے' اور کوئی اور ہی جیسے بچ بچ خاکسار خاں ہوتے تھے۔ وہ اپنے قصبہ جیسے رقبہ اور ایسے ہی بن کے چھوٹے سے شہر کے نواحی مضافاتی تھے۔ اور مضافاتی بالکل ایک علاحدہ اور دنیا بھر سے مختلف چیز ہوا کرتے ہیں اور جائزہ لیا جائے تو قطب شمالی سے قطب جنوبی تک مماثل ہوتے ہیں۔ اور ببا ذرائع روزی کے اعتبار سے "کلیتاً" دیہاتی تھے۔ مگر دیہاتی بھی ایسے جو اپنے کھیتوں کی پیداوار شہر کی اناج کی منڈیوں' سبزی منڈیوں میں سپلائی کرکے شہر کی قربت سے بھرپور استفادہ کرتے تھے۔ ویسے شہر کے اندر بھی ببا کا جتھا موجود تھا' لیکن ناپسندیدہ سا بہادری کے بجائے دادا گیری کرنے والا۔ معیار پر پورا نہ اترتا' تاہم وہ سب کے سب استادی پر فخر کرتے اور دم بھرتے' دیہات کا سلسلہ ببا کے اپنے مسکونہ گاؤں سے شمالی مشرق تین سمتوں کو پھیلا ہوا تھا اور شہر جنوب میں واقع تھا۔ ضلع پانچ تحصیلوں اور نو پرگنوں پر تقسیم تھا اور چوبیس تھانے لگتے تھے۔ اور ببا کے حلقۂ اثر میں سرحدی اضلاع کے بارہ تھانے اور لگتے تھے اور ہر پانچویں گاؤں میں ببا کے جتھے کے دو چار ساونت پائے جاتے تھے۔ کچھ ٹھاکر' اہیر' راجپوت پر ہی منحصر نہ تھا' جی داری' بہادری' تابع داری' بے عذری شرط تھی۔ ببا کے حلقہ بگوشوں میں پچ قوم بھنگی چمار' دھانک پاسی' اور چھیلے بانکے دیہاتی پٹھان اور دیہات میں خال خال اپنی زمین داریوں پر آباد دیہاتی جلالی سید بھی زانوئے ادب تہ کیے نظر آتے تھے۔ اور حسبِ ضرورت جہاں کہیں معرکہ جڑتا ببا کے اشارے پر جمع ہو جاتے اور یہ چھٹ بھیے پچ قوم کا کے بھی سا کے کر جاتے۔

ببا مخالفوں کے بھرے بھگتے' دشمنوں کے ٹھکانے لگائے لوگ تھے' اور پولیس ایڈمنسٹریشن کے ڈھیل دیے' قانون اپنے ہاتھ میں لیے آدمی تھے۔ جن کے بہ قول اپنے پولیس خواہ مخواہ نہیں لگا کرتی۔ پھر حاصل نہ حصول اور پولیس تو وکیلوں کی طرح مختانہ شکرانہ مول ٹھہرا کر اٹھتی ہے۔ اور ببا کے یہاں معاملہ خشک تھا۔ ہاتھ تو رنگنے کے لیے تر اور کھلے ہوئے رنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوکھا رنگ تو چڑھا نہیں کرتا اور بہ فرضِ محال کبھی سوکھے رنگ کے پاؤڈر میں ہاتھ ڈال بھی دیں تو عدالت جھاڑ دیتی ہے اور ببا جیسے جمے ہوئے چٹان سے بت کو ڈنڈوت کرنے ہی میں عافیت تھی۔ مان بھی لیجیے ان کے یا ان کے کسی جتھے والے کے خلاف مدعی مستغیث پیدا ہو بھی جائے تو ثبوت کے لیے گواہ پیدا ہونا محال تھا۔ کسی ماں نے جنا ہی نہ تھا ایسا لال جو ببا کے مقابلے پر آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرتا۔

ببا کے اندھیروں کا میزان تو ببا ہی جانیں یا پھر عزرائیل نے کراما" کاتبین کی کتاب میں چپکے سے اندراج کرا دیا ہو گا' ورنہ تھانے میں رپٹیں تو اندراج ہو نہ سکیں۔ دن دھاڑے ہابیل قابیل والے زن کے نہ سہی' بابا آدم کی زمین کے معاملے میں اکثر جوئے الارض کی چڑھی ہوئی اشتہایا انتقام کا چڑھا بھوت تو

خوئے بد کو بہانہ بسیار تھا' ورنہ جتھا بندی کا شکار پارٹی جیسا شوق اصل چیز تھا۔ اندھیرے اجالے' جھٹ پٹے' پوچھٹے' راستا چلتے مخالفوں' دشمنوں کو راستے سے ہٹانا' کھیتوں کھلیانوں کے مینڈھوں' مچانوں پر سوتوں کو تھپک کر دائمی نیند سلانا' نرم نرم پیال کے ڈھیروں بچھونوں میں جوں کے توں ہمیشگی کا آرام بخشنا ان تمام کی تو شمار نہ تھی' لیکن دن دھاڑے بیچ کھیت ان کی چیتل کی شیاموں چڑھی سوا سیری' رام پوری بانسی کے پختہ جھنڈ میں سے ان کے جدّ امجد کے کسی معرکہ آرائی کے صلے میں سرکار نواب بہادر سے بہ طور خاص سرٹیفکیٹ کے طور پر اجازت ملنے پر اپنی پسند کی پختہ ترین کاٹ لینے اور شاید اس سے آیندہ سات خون معاف بھی کر دینے کے' سکھا شاہی جیسے چھ تو کر چکے تھے اور ایک ابھی اور بقایا تھا۔ ان چھ مقتولوں کے لاشے میدان سے تھانہ حلقہ تک تو پہنچے ہی پہنچے اور یہ بات نہیں بیا کے نام حسب دفعہ ۳۰۲ تعزیراتِ ہند ان میں سے رپٹ بھی اندراج ہوئی' مگر انچارج تھانہ بے چارہ کیا کرتا اس کے بھائی بھتیجے تو حلقہ میں بستے نہیں ہیں' مدعی مستغیث کے ہوتے ہیں۔ بیا کے رُو در رُو عدالت ابتدائی کمٹنگ مجسٹریٹ لیٹر بکس بیانوں تک پہنچنا تو در کنار' تھانہ دار تفتیش کنندہ سے سامنے اظہاروں تک پہنچتی ہر آنکھ چشم خفاش تھی۔ نتیجہ تھانے کا نقشہ ب اصطلاح اور میزان فائنل رپورٹ لگتا تھا۔ مقدمہ' مقدمہ' واردات سے آگے ہی نہ بڑھ پاتا۔ عدالت کمٹنگ مجسٹریٹ کا لیٹر بکس تو دور کی چیز تھی اور سیشن جج کی عدالت کالے کوسوں کی بات۔ ایک آدھ کیس کسی خلیفہ پرانے خواندہ کانسٹبلی چڑھے تھانے دار نے چکی میں موٹا موٹا دل پیس کر ابتدائی عدالت تک پہنچایا بھی تو اپنا اور عدالت' دونوں کے وقت ضایع کرنے کی وارننگ ہوئی اور بیا باعزت بری۔ بیا کے زمانے میں مجسٹریٹ بالعموم پھٹے ڈیسک کے چڑھے اہل کار ہوتے تھے لیکن ڈسٹرکٹ سیشن جج گورے اور گورے بھی کھال سے ہڈی مغز تک کے گورے وہ گورے نہیں جو انگلستان کے کوڑا پڑاؤ پر پڑے پائے جاتے تھے۔ اور گلی کے پلوں کی طرح کتے کتیاں ماں باپ کا بغیر پتا چلائے اٹھا کر یتیم خانے پہنچا دیے جاتے اور وہاں سے مونچھوں کا بھورا بھورا رونگٹا ابھرتے ابھرتے کمر پر بندوق لاد کر اور جسم پر خاکی وردی منڈھ کر ہندوستان فتح کرنے بھیج دیے جاتے۔ اور یہ اصل نسل "گورا" سا لفظ پر پورا اترتے تھے۔ ورنہ انگریز نامی جج' ایڈمنسٹریٹر' قوم اور تاج برطانیہ کی سماجی عمرانی اور حکمرانی کی نمایندگی کرتے تھے۔ مگر پھر بھی نوزائیدہ ہی رہتے تھے' محکوم ماحول سے ناواقفیت محض' کسی بوڑھے نے مرتے دم تک آنکھوں دیکھی تو بتائی نہیں' نوزائیدہ کی تیز آنکھوں کے سامنے دھند کا پردہ سا حائل رہتا ہے اور شعور' ادراک اور بصارت میں ربط نہیں ہوتا۔

سنِ ہوش تک ہی اندازہ رہتا ہے اور گورے فاضل معصوم ججوں کے سامنے ہندوستانی سوسائٹی کے متعلق باوجود سول سروس کے امتحان کی کامیابی اور لندن اسٹاف ایڈمنسٹریشن کالج کی سونے پر سہاگہ تربیت کے کچھ ایسی ہی "پردہ داری" رہتی تھی اور غریب اپنے "ہیڈ گرو" لارڈ میکالے جلد بند کی جہازی سائز پشتک سے باہر پڑھ سکنے کے کچھ کے اور بہ مشکل ہی اہل ہو سکتے تھے اور جو کچھ اس چوکھٹے کے اندر چوکور فٹ ہو جاتا تھا ویسی ہی تصویر بنا دیتے تھے۔ تاہم سنتے ہیں کہ یہ بھی اپنی بے پایاں ذہانت اور لا محدود

اختیارات کے زور سے کبھی کبھی بڑا انصاف کر گئے۔ لیکن بیا کے مقدر اور مقدرت میں غضب کا ربط ضبط تھا کہ ان کے ساتھ کبھی انصاف نہ کر سکے کیوں کہ بیا ان لکیروں کے فقیروں کی .P.W اور .D.W گواہ ثبوت اور گواہ معافی اصطلاحوں کی حقیقت پہچانتے تھے اور ان کی ان کمزوریوں سے واقف تھے' جہاں ان کے چلتے قلم کا دم رک جایا کرتا ہے۔ چناں چہ قتل کے مقدمے قایم ہو کر بھی بیا کو ان کی نوکِ قلم چھو نہ سکی۔ مگر ایک کائستھ کھوپڑی' بھرپیٹ کالی منصفی سب ججی کا چڑھا سیشن ججی تک پہنچا' مسٹر اور صاحب بہادر کے بجائے "منشی" اور "ورما" کا سابقہ لاحقہ لگا پٹواری زادہ جج آبراجا۔ جس کا نام نامی منشی سلامت رائے ورما اور باپ کا اسم گرامی کائستھ شاہی فارسی میں گرگِ باراں دیدہ ایسا کہ اساڑھ ساون بھرنیں دیکھے ہوئے تو سبھی ہوتے ہیں یہ ماگھ پوس مہاوٹیں بھی پیٹھ پر اتارے ہوئے تھا۔ چوپالوں سے دیوان خانوں تک اور گھروں چھپروں سے حویلیوں تک' اندر سے باہر تک اور باہر سے اندر تک کا واقف رازہائے درونِ پردہ' اور چھٹی چھلے تک کھائے زچہ خانوں جنامنوں کی نکوٹیاں' اچھمانیاں پیے پڑا تھا۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے' شہرۂ آفاق بیا کے پچھلے چھ مقدموں کے باعزت بری ہونے کی تو خیر سمجھے ہوئے تھا اور ساتواں مقدمۂ قتل سماعت کرنے بیٹھا۔ "گورنمنٹ پلیڈر" نے کیس پیش کرتے ہوئے پچھلے "باعزت بری" پر روشنی ڈالی اور بحث میں گڑے مردے اکھیڑے جن کی سڑنے کے باوجود بھی بو نہ پھیل سکی تھی۔ اور دن دہاڑے میدان گھسیٹ کر کٹہرے میں بھر کر تھانے سے موچری پہنچے تھے' اور سابق گورے ججوں کو تو کانوں کان خبر نہ ہو سکی تھی۔ بیا کے وکیل صفائی نے بہتیری اگر مگر کی اور آف دی ریکارڈ کا عذر کیا مگر جب جج ہی نے ڈھیل نہ دی تو کیا کرتا۔ لیکن بیا پکے پر تھے۔ انھوں نے عدالت ابتدائی کمٹنگ مجسٹریٹ کے روبہ رو حلفی بیان دیتے ہوئے گواہ پتا نہیں کیسے' دھمکا کر یا شیشہ میں اتار کر توڑ لیے اور سیشن جج کے روبہ رو پہنچ کر اپنے پچھلے مجسٹریٹ کے روبہ رو دیے ہوئے بیان سے مکر گئے' جن کی بنا پر ابتدائی سماعت میں مقدمہ قایم ہوا تھا۔ اور یہ چیز مقدمہ کی جڑ پر کلہاڑا ہوتی ہے۔ جج غریب کو الٹی سماعت میں بہرا اور قلم کو الٹا ہونا پڑا۔ مدعی تو چست رہا' پر گواہ ست رہے کہ الٹی الاپنے لگے۔ جج کے روبہ رو کچھ اس نوعیت کے بیان دیے کہ تھانے دار نے عدالتِ ابتدائی میں بیان دھمکا کر دلوائے تھے۔ جج غریب کو زہر دیں اس پہ یہ تاکید کہ پیتا ہو گا' سب کچھ سمجھتے ہوئے ان حلفی بیان بدل گواہوں پر مقدمہ چلانا پڑا۔ اور تجویز میں تحریر کیا' میں قانون کے تحت مجبور ہو کر ان پر مقدمہ قایم کر کے دروغِ حلفی کا جرم لگا رہا ہوں۔ تاہم پوری تلخی کے ساتھ بیا کے متعلق زہر اگلا اور اظہارِ رائے کرتے ہوئے اپنے حدودِ قلم سے کچھ زیادہ ہی روشنی ڈال گیا' پہچانتے ہوئے کہ بیا کس قدر پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ زہر افشاں ہوا اور جج منٹ یوں شروع کیا کہ آج ستائیس (۲۷) سال کی جوڈیشل سروس کے اندر مجھے ایک ایسے مجرم کو جو قتلِ عمد کا مرتکب ہے' پرومیجر کی خامی اور قانون کی کوتاہی کے ہاتھوں بہ مجبوری بری کرنا پڑ رہا ہے۔ ورنہ خاکسار خاں میرے نزدیک عادی مجرم' قاتل' قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا رسیا' جتھا بندی کا شایق اور لام بند ہے' اور میرے اندازہ میں تاج برطانیہ سے بغاوت کی حد تک ذہنیت رکھنے والا مجرم ہے۔ گوناگوں بڑے جرائم کے ارتکاب کے بعد بچے

رہنے کے ہتھکنڈوں میں ماہر ہے۔ اپنے خلاف شہادت گواہی ثبوت فراہم نہ ہونے کے گر سے خوب واقف ہے اور میرے نزدیک دفعہ فلاں تعزیراتِ ہند بغاوت بر مقابلہ تاج برطانیہ سرسری عدالت سے کیپٹل پنش منٹ بہ عبور دریائے شور یا پھانسی کی سزا کا مستوجب ہے' وغیرہ وغیرہ۔ اور اپنے ججمنٹ کی ایک نقل ضلعی اور ایک نقل صوبائی ایڈمنسٹریشن کو ایکشن کے لیے ارسال کی۔ مگر ۱۸۵۷ء کے بعد ایک آدھ بچ سالہ تک یہ بغاوت والی دفعہ کی دار و گیر نافذ العمل رہی تھی اور اب تو تقریباً" مفلوج و مہمل سی تعزیراتِ ہند کی کتاب کے کسی کونے کھدرے میں خاموش پڑی تھی۔ اور آج مدتوں بعد کسی عدالتی تجویز میں اس کا حوالہ آیا تھا' اور یوں بپا کا اونٹ پہاڑ تلے آیا تھا۔

بپا اک ذرا کے ذرا گھبرائے' مگر ان کے شاطر وکیل نے جج کے اس ریمارک کو خارج از تجویز (Dlete out) کرنے کی ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرادی اور تا انفصال اپیل' ضلعی اور صوبائی ایڈمنسٹریشن کے نام ایکشن لینے سے حکم امتناعی جاری کرا دیا۔ ہائی کورٹ کی فل بنچ کے ججوں نے ماتحت ڈسٹرکٹ جج کے اس ریمارک کو بیرون اختیار اور غیر متعلق قرار دیتے ہوئے خارج از تجویز قرار دیا۔ بپا اس عرصہ میں پریشان تو رہے کیوں کہ بات سات سمندر پار پہنچتی معلوم ہوتی تھی' اور بغاوت کا قانون اندھے کی لاٹھی ہوتا ہے' اس میں پولیس کے گواہ ثبوت اور توڑ پھوڑ کا دخل نہیں ہوتا۔ مدعی ملکہ وکٹوریہ اور ان کا بیٹا پوتا پورا کنبہ...... اور ان سے دو بہ دو ہونا۔ تراحم خسروانہ اور مرسی پٹیشن کے لیے بھی انھیں کے روبہ رو ہاتھ پھیلانے کی گنجائش نہیں۔ مشہور بات دادی سے لے کر آج پوتے تک کی قلم رو میں دن رہتا ہے۔ مجرم کو روپوشی فرار ممکن نہیں۔ ان کے یہاں جب بکھنگم پیلس میں ذرا کے ذرا بتیاں روشن ہوتی ہیں تو ان کے کلکٹر صاحب کے بنگلہ اور نظام کے کنگ پیلس کے لانوں پر دھوپ پھیلی ہوتی ہے۔ ادھر سورج ڈوبتا ہے تو ادھر نکل آتا ہے' اور اس چڑھتے سورج کی حکومت میں حاکم کو بھنکانا محال ہے۔ ولے بخیر گزشت' وکیل صاحب نے تو ہائی کورٹ کا آرڈر منگوا کر شکرانہ محنتانہ وصول کر لیا۔ لیکن بپا کو ایک لمحۂ فکر پیدا ہوا۔ وہ ان پڑھ جینئس تھے اور ایسے پٹے باز جن کی ہزیمت بھی دیکھنے والوں کو فتح دکھائی پڑتی ہے۔ انھوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا' جرم سا جرم بھلا' بغاوت کا پھندا سات سمندر پہنچی بات۔ ادھر اپنا میزان لگایا تو سات پشتی انتقام سات خون معاف کا میزان پورا ہو چکا تھا۔ البتہ سکھا شاہی والے تین صاف ابھی باقی تھے اور رو گئیں تن اسفندیار کو مرنا باقی تھا۔

سڑسٹھ (۶۷) کھا چکے تھے اور میزان دو چاند کے بیشی بڑھتی اور ایک بسم اللہ کی' سال گرہ کے لال سوت کے پنڈے میں سترویں گرہ لگ رہی تھی۔ مگر نسلی راجپوت جبلت انھیں بے چین کیے ہوئے تھی۔ مونچھ کے کھردرے بال ہوں یا ریشم کے سرسراتے چکنے لچھے' انھیں نچلے بیٹھنے میں یکساں چبھتے تھے۔ ماضی گد گداتا' بے چین کرتا' مگر بقیہ عمر بہ وجوہ یادِ الٰہی میں بسر کرنے کا تہیہ کر لیا' اور "ٹھاکر چوپالی" "خان مکانی" ہو کر دالان در دالان میں بیٹھ گئے۔ اور انھیں اس میں کچھ زیادہ دقّت بھی نہ ہوئی۔ بچپن کے عادی نمازی تھے اور فجر کے بلا ناغہ کے خوش قرأت مؤذن' اور اس میں تحکّم فاروقی الصلوۃ خیرم من

النوم کے اضافے کے مزے لیتے۔ آبائی چودہ سیڑھی بلند چوپال کے ساتھ جد امجد کی تعمیر مسجد بھی بغل میں تھی۔ فجر کی اذان جیسے ان کا ربانی حق تھی اور خواہ شب خون' رہزنی مار کر آئیں' یہ اپنی مسجد پہنچ کر نور ظہور کے وقت بہر صورت پکارتے اور بقیہ تمام کی تمام مؤذن اور پیش نماز کے سپرد تھیں۔ اول صف کے با جماعت نمازی اور معرکہ آرائیوں میں اول ہی صف کے مرد میداں غازی۔ لیکن اب دل اور پاؤں کے معاملے میں اک ذرا شروع شروع میں تو فرق پڑا' پھر ٹھیک ہی ہو گئے۔ صرف مسجد تک جانے کے لیے پانچ مرتبہ چوپال کی سیڑھیاں چڑھتے' اترتے۔ اور مسجد بھی کون سی ایسی دور تھی' اک پتلی سی گلی بیچ چوپال سے ملحق۔ یا پھر بستی نواح میں کہیں موت ہو جاتی تو تجہیز و تکفین میں بڑھ چڑھ کر ضرور بالضرور حصہ لیتے۔ مرنے والے اعزّا کو رسمی تعزیت عبادت سے بھی نوازتے اور مرنے والے کو آخری منزل تک پہنچاتے اور سال پیچھے جب چماروں چوڑوں کے چھپروں میں آگ لگ جایا کرتی تو چوپال سے برق رفتاری کے انداز میں اچھل کر جا پڑتے۔ پانچ سیر والی آبائی لاٹھی باندھے فائر بریگیڈ کے کپتان کی طرح جا دھمکتے۔ سورہ ابراہیم کا ورد کر کر کے آتشِ نمرود پر کنکریاں پھینکتے جاتے اور بستی بھر کے بہشتیوں کہاروں کو ڈپٹ ڈپٹ کر کنوئیں سے پانی بھر بھر کر لانے کا حکم صادر کرتے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی پانچ سیر وزنی آبائی لاٹھی سے جگہ جگہ موقع موقع سے آگ کو کوٹ کوٹ کر بجھاتے۔ اور اس وقت تو بستی والے سبھی گھروں میں سے پانی پینے کے گھڑے لاد لاد کر آ جاتے جب ببا خود دوڑ کر اپنی چوپال کا منکا کندھے پر لادے ہوئے آتے...... مگر اللہ غارت کرے ان گاؤں والی لڑائی کی شوقین عورتوں حرام خوریوں کو' کم بختوں نے ببا سے یہ بھی دونوں سعادتیں چھین لیں۔ روز کے دوپہر کے کھا پکا کر لڑائی کے معمول میں ایک نئے کوسنے کا اضافہ اور ایجاد ہوئی' اور الٹے توے کی کالک میں چھتوں پر چڑھ چڑھ کر پیشاب کر کر کے ایک دوسری پر اچھالتے اچھالتے۔

"اے حرام زادی ستر خصمی..... تیرا خریدار مرے'...... اے بارہ تالی' بیسوا تیرا پوت مرے' دودھ مٹے' اب اے رنڈی' کسبی' خدا کرے تیرے گھر ببا آئیں...... تو ببا غریب موت و آتش زدگی میں آگ بجھانے اور تجہیز و تکفین کی سعادتوں سے بھی باز آ گئے۔ اور ملا کی دوڑ مسجد تک سنی تھی اور ببا کی دوڑ مسجد تک رہ گئی۔ وسمہ خصاب تو ترک ہی کر دیا تھا' عمر بھر کے داڑھی کے چڑھے الٹے بالوں کو سیدھا کر کے اتارنے میں حقانی حجام خلیفہ کو شروع میں دقّت ہوئی پھر کچھ عرصہ بعد جب یہ مرحلہ طے ہو گیا تو دوستوں بہی خواہوں نے کہا۔

"سبحان اللہ کیا ہی نورانی بڑھاپا اترا ہے اپنے ببا پر۔"

اور جلو نٹے مخالف بولے.....

"اے سبحان اللہ کیا کہنے 'نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔"

بہرحال سبحان اللہ بھی پکار اٹھے۔

کہاوت ہے "بوڑھا نٹ' قلاباز' بھینسے چڑکا تا ہے" اور اسی طرح بوڑھا بیرسٹر' وکیل' پرانا ریٹائرڈ جج نطق جرح بحث اور تجویز فیصلے لکھنے اور سوجھ بوجھ کرنے سے عاری ہو جاتا ہے تو چیمبر پریکٹس کرنے کے نام کا

دعویٰ کرکے دفتر میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھتا ہے۔ اور ہاتھ پاؤں تھکے پٹے باز کی طرح حلقہ بگوشوں کو تو اور کچھ نہیں تھکے ہارے ہاتھ پاؤں سے بھی نہیں تو ٹی مڑی انگلیوں کے اشاروں سے خلاؤں میں داؤں پیچ' پینترے اور ضربوں کے رخ ہی بتلاتا رہتا ہے اور ہاتھ پاؤں نہیں تو زبان ہی سے اپنی بات بنائے رہتا ہے اور ببا کو یہ بے فیت کی حوالداری اور بے پستول پر پڑی' تھانے داری بھی کم سازگار نہ رہی اور اپنے رخ سے زیادہ موثر اور وقیع لگی۔ کسی پرانے صوفی بزرگ کی پڑھی ہوئی تسبیح جدِ امجد کے گوناگوں اثاث البیت میں پہنچی تھی' جس پر بیوی کو حصولِ اولاد کا وظیفہ پڑھتے پڑھتے اور حضرت سیدہ سارہ کی روح کو بخشتے بخشتے تو منھ پیٹ تک خشک ہو گیا تھا اور کشتِ آرزو چرا مرا کر رہ گئی تھی۔ اور ببا نے متبرک تسبیح اپنے ہاتھ میں پکڑلی اور توبہ استغفار کا ورد کرنے لگے۔ تاہم یہ درود و وظائف بہ مشکل ہی نوکِ زباں سے حلق تک اترتے اور چھاتی کے اندر نصب سنگِ خارا کی سیاہ چٹان سے ٹکرا کر رہ جاتے۔ ورنہ وہ تو بہتیرا چاہتے تھے کہ دل پھر جائے اور سینہ صاف آئینہ ہو جائے مگر پینتیس (۳۵) سال کی ساکھ' عدالت علاقہ کے جتھا والے جاں نثار' شاگرد کب چین سے بیٹھنے دیتے۔ داؤ پیچ جوڑ توڑ ہوتے رہتے۔ دن کو چوپال میں پانچ سات مہمان ہوتے اور رات کو آٹھ دس کا کھانا ہوتا ہی ہوتا۔ اور الارض اللہ! زمین خدا کی ہے اور ببا کے یہاں اکلِ حلال کے معاملے میں جھول نہ تھی۔ گاؤں کی اراضی کا زرخیز ترین بھی اور سب سے زیادہ لمبا چوڑا رقبہ ببا کے قبضہ و تصرّف میں تھا اور خدا کی اس زمین پر ببا کا قبضہ تفسدنا فی الارض' اپنی اسی پانچ سیر وزنی لاٹھی کا پیدا کردہ تھا جو سنتے ہیں کہ ان کے جدِ امجد نے ریاست رام پور کی بانسی کی شہر پناہ کے کسی پکے جھنڈ میں سے کسی بہادری کے مظاہرہ کے صلے میں' روہیلہ سرداروں کے وقت میں' اعزاز کے طور پر اجازت ملنے پر کاٹی تھی' اور پشتوں سے سال پیچھے پاؤ بھر کڑوا تیل پیتے پیتے اب کالی ہو رہی تھی اور وزنی بھی اب ببا کے وقت پہنچ کر وزن پانچ سیر سے اوپر سوا چھ سیر تھا۔

اور گاؤں کا پورا رقبہ اسی طرح مالک زمین دار' خود کاشت کرنے والوں بنی عمام' مولا زادوں راجپوتوں میں بٹا ہوا تھا' اور آبادی کھیت مزدوروں' چماروں' لودھوں پاسیوں پر مشتمل تھی۔ شہر کی قربت کے طفیل نقد فصلیں لیتے اور چاندی رولتے۔ زرخیز ترین' بہترین اور وسیع رقبہ خاکسار خاں کے قبضہ میں تھا' اور اس کی وسعت میں ببا کے وسیع تعلقات اور ذرائع کا بڑا دخل تھا۔ اور ظاہر بات ہے وسعتیں اپنوں ہی کے درمیان بہ آسانی پھیل سکتی ہیں' اور اس میں برادرِ عم اور عم زاد بہن کے شوہر گھمن خاں کی اراضی میں زیادہ گنجائش تھی۔ ببا خاکسار خاں کے کھیت انھیں کے آس پاس ہونے کے سبب دھوپ چھاؤں کی طرح ببا کے رقبے میں شامل ہو کر ضم ہو گئے تھے اور کھیت سے چک ہوئے تھے۔ اس میں ببا کے قوتِ بازو کے علاوہ محکمہ مال والوں کو داد و دہش' اور پٹواری نوازی کے ذرائع کا بھی ہاتھ تھا۔ لیکن ببا کھیت مزدوروں' بیگاریوں' نوکروں کے ہاتھ سے کھیتی کراتے "بٹائی نصفی" رہی اور یہاں پر نہ ببا کی جتھا بندی' قابو یافتگی کام دی اور نہ محکمہ مال والوں میں اثر و رسوخ۔ "بٹائی سولتائی" کہاوت کے بہ موجب' بٹائی دار کاشت کار اکھوئے نکلنے سے تیاری تک نوچتے رہتے اور فصل اٹھ کر گھر میں پہنچتے پہنچتے بہ مشکل ایک تہائی

چہارم تک رسائی ہو پاتی۔ پھر بھا خاکسار خاں کے یہاں مہمانوں کی قسمت بھی شامل رہتی۔ اور مشہور بات ہے مہمان اپنی روزی ساتھ لاتا ہے۔ گھر میں ہر چیز کی ریل پیل رہتی' چولھا گرم' دسترخوان پر گہما گہمی۔ ادھر برادرِ عم گھمن خان کے یہاں اپنے گھر کا افرادی خرچ زیادہ تھا' بیٹے بیٹیاں' داماد' بہوئیں اور بڑا بیٹا اپنے ہاتھ سے کھیت میں کام کرنے والا کسان۔ چھوٹا بیٹا تنوں خاں بستی کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔ پہلی نسل والے تو خیر نشانی انگوٹھا مسمی گھمن خاں سے کام چلاتے رہے' دوسری نسل والوں کے لیے یہ اپر پرائمری اسکول کا گریجویشن بستی بھر میں بہ قلم خود تک دستخطوں کی ڈگری دے کر فارغ التحصیل کرنے لگا تھا۔ تنوں خاں اپنی سرکاری درس گاہ کا فخر ثابت ہوا' بھالا تو دستخط لینے تک کو تھا' مگر اس نے کمشنری بھر کے چھبوں اضلاع میں چوتھی جماعت کا امتحان تمام اسکولوں سے زیادہ نمایاں پوزیشن اور سینکڑوں طالب علموں میں سب سے زیادہ نمبروں سے پاس کیا۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے تعلیمی محکمے سے وظیفہ ملا اور صوبائی بورڈ کی جانب سے انگریزی تعلیم کی پیش کش ہوئی۔ نقرئی تمغہ اور میرٹ سرٹیفکیٹ علاحدہ عطا ہوا۔ کمشنری بھر میں "خان بہادری" کی طرح شہرت ہوئی۔ گھمن خان نے برادری بھر میں گڑ بانٹا' میلاد شریف کے لڈو تقسیم کیے۔ یوں تو ان کی برادری میں ختنوں' شادیوں' تقریبوں کے روایتی جشن منانے کے رواج تھے' مگر گھمن خاں کے یہاں برادری بھر میں بلکہ تمام نواح میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا جشن تھا۔ سنا ہے کہ خیر سرکاری گزٹ میں تو نہیں مگر شہر کے ہفت روزہ اخبار میں بیٹے کا نام مع ولدیت کے پکی روشنائی سے چھپا۔ واہ واہ ہو گئی۔

وظیفہ کی چار پانچ روپیہ کی رقم تو کیا تھی' لیکن تمغہ' سرٹیفکیٹ' اخبار اور انگریزی اسکول میں داخلہ کی پیش کش اور پھر اس کے ساتھ سرکاری وظیفہ' گھر والوں کے لیے ایک نئی نوعیت کی خوشی اور ولولے کا سامان تھا۔ شہر کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلے کے لیے بڑے چاؤ کے ساتھ رخصت کیے گئے۔ اور بورڈنگ ہاؤس میں رہایش کا انتظام ہوا۔

ویسے تو حساب سے چوتھا درجہ پاس کر کے گئے تھے' انگریزی اسکول میں پانچویں کلاس میں داخلہ ملا۔ مگر سال بھر کی کارکردگی اور انگریزی کے علاوہ ریاضی اردو وغیرہ دوسرے مضامین میں اچھی خاصی' انٹرنس تک کی استعداد کے زیرِ نظر سالانہ امتحان کے وقت بہ طور خاص پانچویں اور چھٹے دونوں کلاس کا تاہم ایک دن اندر ڈبل امتحان دینے کی خاص اجازت عطا ہوئی اور یک دم سال اندر تنوں خاں تعلیم کی دو سیڑھیاں جست کر کے ساتویں کلاس میں آ گئے۔ اور یہاں انگریزی اسکول میں پہنچ کر دوسری شہرت نام آوری ہوئی اور شہر کے اسکول بھر میں دو چار مخصوص چمکتے طالب علموں میں گنے جانے لگے۔ اور چشمۂ شیریں مرد و مگس کے ساتھ ساتھ مور و مار کا رجوع ہونا بھی فطری جبلی امر ہے۔ تنوں خاں دیہات کے کاشت کار زادہ نوخیز تھے۔ بھوری بھینس والے اصلی گھی' اپنے گھر کے کولھو کڑھاؤ کی بنی خالص کھانڈ اور اپنے کھیت کی پیداوار گیہوں کے ہاتھ کے پسے باریک آٹے کی روٹی کھانے والے' جو شہر کے بڑے بڑے رئیس زادوں کا بھی مقدر نہیں ہوا کرتا۔

ہوسٹل کے میس اور اسکول کے رجسٹر میں تنویر خاں نام اندراج ہوا۔ اور اسکول' ہوسٹل اور پھر اپنے گاؤں میں بھی اسی نام سے پکارے جانے لگے۔ اور اسکول کا آٹھویں کلاس کا طالب علم یوں بھی سینئر اور باوقار ہوتا ہے۔ ہوسٹل میں بھی گاؤں سے لائی ہوئی جنس سے ہانڈی علاحدہ پکنے کی خوشبوئیں اڑنے لگیں۔ بازار سے ان کے لیے بکرے کا گوشت بھی اپنا علاحدہ آتا۔ اور بجز گوشت کے تمام کی تمام خالص جنس گھر کی کٹھار سے چھان پھٹک کر' پھٹنے کے ہفتے ماں اپنے ہاتھ سے سنبھالتی اور اتوار کے اتوار تنوں خاں سائیکل پر سوار ہو کر گاؤں پہنچتے اور کسی چمار کے سر پر لدوا کر لے آتے۔ تنویر خاں کا دسترخوان شہر کے اندر بھی دیہاتی انداز میں وسیع ہوا۔ خوش خوراک' خوش حال' اکل و شرب کے شائق' خوش پوش' خوش شکل بھی اور ساتھ ساتھ خوش گو' "خوش گپ" "یاران طریقت کا مجمع کمرہ پر ہونے لگا۔ اور چشمۂ شیریں رزاقِ مطلق کا وہ عطیہ ہے جس پر' مرد ماں' مور و مار سبھی جمع ہوتے ہیں۔ شہر کے یارانِ طریقت' ہوسٹل اور اسکول کے ساتھیوں سب ہی نے پالیا کہ آدمی ڈھب کے ہیں۔ اچھے اچھے کھانے پکانا میس کے باورچی نے آپوں آپ سیکھ لیے۔

مشہور بات ہے گیہوں کی روٹی ہضم کرنے کے لیے فولاد کا پیٹ ہونا چاہیے۔ بابا آدم بے چارے اسی بد ہضمی کے ہاتھوں جنت بدر ہوئے اور دنیا کی زمین پر اتر کر عمر بھر اسی کی کاشت کرتے رہے۔ یارانِ طریقت کا سرخیل رفیق شہر کے اونچے گھرانوں کی پریت جمانی والے حجام کا بیٹا تھا۔ ظاہر بات ہے ہوسٹل کا تو ساتھی نہ تھا' نہ ہو سکتا تھا' مگر ہوسٹل کے حلقہ بگوشوں میں ہمہ وقت کا حاضر باش۔ پانچویں کلاس سے ہی تنوں خاں کا کلاس فیلو ہوا اور سنتے ہیں کہ پانچویں کلاس میں فیل ہوتے ہوئے بھی پانچواں سال تھا۔ بڑا فطین اور پنج سالہ سینئر ہوتے ہوئے خوب جانا پہچانا۔ اسکول بھر میں "رفیق بھائی" ملقب اور پبلک ریلیشننگ تو اس کا آبائی پیشہ تھا اور حجام تو بڑوں کے درمیان ہی بیٹھتے ہیں اور بڑوں کو منھ چڑھے مصلح ہوتے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ اپنی اصل و حقیقت پہچانے رہتے ہیں اور توازن رکھتے اور ہموار رہتے نہایت متناسب رہتے ہیں۔ رفیق نے اس دیہات سے آئے ہوئے ساتھی کو وہ جو کہتے ہیں کہ پہلی نگاہ میں باہر سے اندر تک بھانپ لیا اور پہلے ہی روز سے اس کی طبیعت میں اپنا "لگاؤ" پیدا کر دیا۔ تنوں خاں تو پہلے سال اندر اسے پیچھے چھوڑ کر پانچویں جماعت سے ساتویں کلاس میں چڑھ گئے مگر اس کی دوستی کے نقوش دوش بہ دوش رہے اور اسکول سے لے کر ہوسٹل تک یہ سایہ کی طرح "ہاں میں ہاں" "جی میں جی" ملاتے پیٹ کے اندر اترا ساتھ رہا' اور پھر تو خون میں رچ بس گیا۔

دونوں وقت کوئی اور دوست ساتھی ہو نہ ہو دسترخوان پر رفیق ضرور ہوتا۔ میس کے کھانے کی نگرانی کا آنریری کام انجام دیتا۔ اور سب تو کمروں والے رات کو کھا پی کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جاتے' رفیق رات گئے جایا کرتا۔ اور ان شب و روز میں تنوں خاں مونچھوں کے کونڈے کی رسم سے گزر کر نوخیزی اور نوجوانی کی سرحدوں تک پہنچ گئے اور رفیق کہیں آٹھواں ساتواں یا اللہ جانے کون سا سال پانچویں کلاس میں فیل ہو کر شہر کے اندر بازار میں باپ کی دوکان پر جا بیٹھا اور حجامتیں بنانے لگا' اور باپ

دوکان سپرد کر کے جھانوں میں کسوت لٹکائے پھیری لگانے لگا۔ ادھر تنوں خاں نے انٹرنس کا بورڈ والا امتحان پاس کر لیا۔ فرسٹ ایئر کالج میں داخلہ لیا' ادھر رفیق بازار میں بال کی کھال نکالنے لگا۔

شروع شروع میں تو رفیق صبح تڑکے کا حاجتیں بناتے بناتے ایک بجے بازار کے نانبائی کی دوکان پر جا کر کھانا کھایا کرتا' مگر کالج کے ہوسٹل میس کا باورچی اسکول ہوسٹل والے کی طرح نہ تھا' ذرا اناڑی تھا' کالج سے چھوٹ کر جب تنوں خاں کمرہ پر پہنچا کرتے تو کھانا خاطر خواہ نہ ہوتا۔ مجبوراً" انھوں نے خود ہی نگرانی کے لیے وقت نکالنے کی رفیق کو ہدایت کی۔ دوکان کھلنے سے پیشتر علی الصبح رفیق سائیکل پر پہلے ہوسٹل پہنچتا' کمرہ میں سے نکال کر خاص جنس باورچی کے حوالہ کرتا جو اسکول ہوسٹل کا پرانا لگا ہوا تھا۔ ادھر تنوں خاں کلاس سے واپس پہنچے' ادھر معائنہ کرنے دکان اکیلی چھوڑ کر رفیق جا دھمکتا اور کھانا بھی ساتھ ہی کھاتا۔ سہ پہر کی دوسری کھیپ کی حجامتیں نبٹا کر' پھر ہوسٹل پہنچا کرتا اور رات گئے تک کمرہ ہی پر رہتا۔ اور کبھی کبھی خوش گپیاں کرتے کرتے تنوں خاں کے پاؤں دبانے لگتا۔ اور جب وہ سو جاتے تو چپکے سے دبے پاؤں چلا آتا۔

اور ایک دعوت دیتی ابر آلود شروع رات کے سناٹے میں رفیق نے پاؤں دباتے دباتے کوچہ بہاراں کی سیر کی دعوت دی اور یہ ترنم تو نوجوان تنوں خاں کے خون میں ہلکا ہلکا ایک عرصہ سے بپا تھا' آپوں آپ دل کی آواز کی طرح رفیق کی دعوت وجود میں گونجی۔ بات کسی خاص کے متعلق نہ تھی' دعوت عام اور صرف سیر کے لیے "حسن سر راہے" کے معائنہ والی تھی' جو کوئی ایسی ناجائز بات بھی نہیں ہے' اور تقاضائے فطرت تحریک ہے۔

ہوسٹل خیر سول لائنس کے ایریا میں تھا' شہر کے سرحدی محلہ سے گزرے تو گلی کے کتوں کی بھونکوں کے سوا سناٹا تھا۔ مگر چکلے کے نواح اور بھوبل گلی جگ مگا رہی تھی' گنگنا رہی تھی اور نواح کے چھوٹے چھوٹے مٹھائی' ربڑی' کبابوں پراٹھوں پوریوں کے دکان دار جیسے صبح سویرے والے انداز اور بوٹی بنا کرنے کے سلیقہ میں چست و درست بیٹھے تھے۔ سوئے جہاں' جاگے بھگوان' کچھ خوش فکرے دور کے جلوہ باز ابھی سرگشتی پر تھے۔ کچھ ٹھکانے گھاٹ کنارے لگ چکے تھے۔ اور ابھی تو شروع رات کا شکار تھا اور گہما گہمی تو یہاں پو پھٹنے تک رہتی ہے' کہیں دن نکلے سراں پڑتی ہے۔ اور سہ پہر سے زندگی پھر جاگ پڑتی ہے۔ رنگینی تابانی سر شام سے جھلملا کر پہر بھر رات گئے تک کوٹھے کوٹھے بجلیاں تڑپ اٹھتی ہیں' ذرے چمک اٹھتے ہیں' چہرہ چہرہ کوہِ نور ہیرا بن جاتا ہے۔

اس خطے کے تو چپہ چپہ کا رفیق محرم رازہائے درونِ پردہ تھا' اور بھوبل گلی تو سیدھی لمبی آٹھ سو چالیس گز سیدھی چلی گئی تھی' مگر آمنے سامنے نیچے سے اوپر چڑھتے ہوئے کوٹھوں کے زینوں کی سیڑھی سیڑھی نپا تلا اس کا انگلیوں پر شمار کیا ہوا تھا۔ پہلے ہی روز چڑھا دیا۔ اور پھر چل پڑے' اک دو چار دن کے تفاوت سے کسی اور پر داخل خلوت کر کے اور صاحب خانہ سے اپنے کمیشن کی چوائی پا کر' گھر جا کر آرام سے سو رہتا اور انھیں منتھی کر جاتا۔ ہوسٹل کی قیام گاہ تو خیر بڑی خاصی چیز ہے' محلہ والے اور بڑوی

بھانپ جاتے ہیں کہ مصروفیات کیا ہیں' اور اس نوعیت کی ہوں تو یہ ہر آدمی کی اپنی کمزوری سے پہلے دن پا جاتا ہے۔ ادھر رفیق کی رہنمائی میں بھوبل گلی سے کوٹھے کوٹھے ہی گیا چکلہ اور ہیرا منڈیوں کی تمام روایات گرد ہو گئیں' اور چکلہ آئین کی چول چول ہل گئی۔ ایک ماں زادی دو سگی بہنیں' ایک ہی کوٹھے یا علاحدہ علاحدہ دو کوٹھے بیٹھی دو خالہ بھانجیاں' پھوپھی بھتیجیاں' جنھیں ٹکسالی تماش بین اپنے تعلقات میں ناجائز اور محرمات تصور کرتے ہیں' اور وہ خود بھی محترز رہتی ہیں' رشتا جیسا احترام درمیان میں رہتا ہے' رفیق کی تھوڑی سی کوششوں اور تنوں خاں کے سفلے پن کی دست برد سے نہ بچ سکیں۔ اور تو اور وہ پابند نام کی' مہینہ پیچھے شہر آنے والی دیہاتی تماش بینوں والی کھلاڑنیں' بیویوں جیسی وفادار خیال کی جانے والی آشنائیں بھی چوری چھپے رات کے رات پابندی سے آزاد کرلیا کرتے' جو مہینہ میں ہر رات اپنے دیہاتی آشنا کی سرپرائز وزٹ کے دھڑکے میں بیٹھی رہتیں۔ اور بڑی بوڑھی ناکاؤں نے جب اس ناہموار پن پر ناک بھوں چڑھائی تو رفیق نے پان چھالی خرچ پاندان سے نواز کر ان کا منھ بند کرادیا۔ کہتے ہیں عشق اور مشک چھپا نہیں کرتا۔ ہوسٹل کے ساتھیوں میں بو پھیلی اور چراند پھٹ کر وارڈن تک جا پہنچی۔ خالی کمرہ پر وارڈن کے چھاپے پڑے' واللہ عالم کہتے ہیں کہ وارڈن کے معتبر آدمیوں نے تعاقب کیا۔ اور رات گئے سے فجر تک کی پوری مصروفیات کا سراغ لگالیا۔ نتیجہ ہوسٹل سے نکالا ہوا' پہلے تو اس تجربہ سے تنوں خاں ذرا جز بز ہوئے مگر یہ تو رفیق کے دل کی آواز تھی۔ نکلنے کا نوٹس تو ہفتہ بھر میعاد کا تھا' رفیق نے تیسرے ہی روز بازار میں ایک چوبارے کا کرایہ پر انتظام کردیا۔ ہوسٹل کے تنگ اکیلے کمرے سے بڑے دو کمرے والا' اور دو تین روز کھانا اپنے گھر سے اپنی ماں کے ہاتھ کا پکالا کر کھلایا۔ ناشتا بازار سے حلوہ پوری کا ہوا' اور بھلا تنوں خاں کی غیرت کیسے گوارا کرتی کہ غریب دوست پر بار ڈالیں۔ پہلا اتوار آتے ہی گاؤں پہنچے اور پندرہ واہڑے بھر کی جنس چھکڑے پر لاد کر دروازہ پر بخ دی۔ اعلیٰ چھٹی ہوئی چھنی پھٹکی جنس کا چھکڑا دروازہ پر حجامنی نے کبھی کاہے کو خواب میں دیکھا تھا۔ روز کا کنواں کھودنا اور روز کا پانی پینے والا نوعیت کا گھر اور جنس کا چھکڑا' جنس بھی اعلیٰ خود کاشت کرنے والے زمین دار کے کھانے کی نکھار والی۔ اور حجام شہروں میں حجامت بناتے اور پیام رسانی اور نویدیں پہنچانے کے علاوہ دیگیں پکانے کا جیسے کچھ اعزازی سا کام کرتے ہیں اور حجامنیاں ججمانوں کے گھروں میں بیبیوں کا ہاتھ بٹانے میں مزے دار دیگچیاں' چٹ پٹی ہانڈیاں پکانے میں طاق مشاق ہوتی ہیں اور تنوں خاں ایک دفعہ کو ماں اور بھاوج کے ہاتھ کے پکے کھانے بھول گئے۔ روزانہ دوپہر کو کالج سے واپسی پر رفیق ٹفن کیریر بھرے تیار ملتا۔ اور دسترخوان پر شریک ہوجاتا اور اسی طرح بعد مغرب ٹفن کیریر بھرا آجاتا۔

بعد مغرب' وارڈن برابر والے کمرے کے ساتھی' اور ہوسٹل کی جیسی پابندی نگرانی سے آزاد و بے لگام ہو کر نکل جاتے اور اب ہر نئی نویلی نتھ والی نوخیز کی نتھ تنوں خاں کی چٹکی سے بڑھی اور چوتھی کی دلہن کی طرح کیل پھول ان کے ہاتھوں پڑا۔ تنوں خاں کیا ہوئے بھوبل گلی کے گلہ کے سانڈ بچار ہوئے۔ ساری پرانی روایتیں چکنا چور کرکے رکھ دیں اور گلی کے آس پاس لگے مکانوں میں شجرِ ممنوعہ تک جاپہنچے۔

اور تو اور بھڑووں کے مکانوں کی کچی پکی اونچی نیچی چار دیواریاں تک رفیق کے سہارے پھاند گئے۔ اس میں خرچہ ضرور کچھ زیادہ بیٹھا مگر یہ تماش بینی کی ایک نئی قسم ہے اور "پھنالے" کی ترکیب میں بولی جاتی ہے۔ اس کے طور طریق اور لطف مزے ہی کچھ اور اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ لیکھ کے بھڑوے نکاح پڑھ کر اور شکر چھوارے لٹا کر میراثیوں کی نوخیز کنواری بیٹیوں سے شادی کرتے ہیں اور اپنی بیٹیوں کو کوٹھے بٹھا کر کسب کراتے ہیں' اور اپنی بیویوں کو پردہ نشین بیوی بنا کر پردہ بٹھاتے ہیں' اور چکلہ بھوبل گلی کے کوٹھوں سے اتری ہوئی روزی گھر آنگن میں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ اور دبے پاؤں بلی کی چال تنوں خاں رفیق کے سارے رہنمائی میں ان ایجاب و قبول کیے نکاحیوں تک جا پہنچے جو در حقیقت رقت کا بند ہوتا ہے۔ ان کا کام تو خانہ نشینی اور خام جنس سے کوٹھا آرائی ہے ان کے خسروں کا تو بے چاروں کو پتا نہیں ہوتا' مگر ساسیں بالعموم کوٹھوں کی منتظم اور نائکہ لقب ہوتی ہیں۔ ان عفیفاؤں کے شوہر علاوہ بیٹوں سے چمڑے کے جہاز چلوانے کے سائیڈ بزنس کے طور پر یا تو بالعموم پان سگریٹ کی دوکان کراتے ہیں' یا پھریکوں پر کوچوانی کر کے وقت گزاری کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مال ہاتھ آجائے تو خفیہ فروشی بھی کرتے ہیں۔ تاہم ان کے گھروں کی چار دیواریاں سربہ مہر رہتی ہیں اور رفیق کی رہنمائی میں تو "پابند" کہلانے والیوں کے جوڑ بند کھولنے کی لذت سے آشنا ہوئے تھے اور عشق کی لذت خطروں کی خار کاری اور ہجر کی خلش میں ہے اور رقابت کی چاشنی اک ذرا آملے تو کہنے ہی کیا۔ بھوبل گلی کی لذتیں تو سپاٹ بے نمک' ترت دان مہا کلیان سی تھیں' اک ذرا جان تھی تو پابند والیوں کوٹھا نشینوں کے ساتھ۔ ان کے ساتھ یہ پردہ نشین' مگر بہت شوقینیں کھلاڑنوں کی تعریف میں آتی نہ تھیں' لیکن خرچ سے ذرا تنگ اور طبیعت کی کچھ زیادہ ہی شوقین واقع ہوئی تھیں۔ نکلتی ہیں تو شاذ و نادر' چار شف سیاہ یا تام لوٹ سفید آنکھوں پر جالیاں لگے برقعے میں اور ان کے پاس تک تو لنگور کی طرح ٹوٹی پھوٹی چار دیواری پر جست لگا کر ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ جو خانگیاں لقب ہوتی ہیں ان ذات شریفوں کی ڈولیاں اڈوں نامی والی مشہور حویلیوں پر آجاتی ہیں۔ اور یہ حویلیاں تو ڈیوڑھی اور دالان اندر دالان اور لمبے چوڑے صحنوں والی ہوتی ہیں اور کچھ نہیں تو ذرا سا پردہ لحاظ رکھنا ہی پڑتا ہے اور جانتی کون کس کو نہیں' رات گئے تک پردہ دار یکے اور ڈولیاں آتی رہتی ہیں اور رات گئے سے گجر دم تک واپس ہو جاتی ہیں۔ ان تک رسائی نشان دہی کے لیے اڈے وارنی بڑی بوڑھی سے اک دو روز شہر کے اندر محلّہ اور گھر کا اتا پتا بتا کر سلسلہ جنبانی کرنی پڑتی ہے اور اسی میں ہجر و وصل کی چاشنی کے مزے آجاتے ہیں۔ لیکن ان سب کا بھاؤ بہر حال کوٹھے والیوں سے زیادہ سرخ رہتا ہے' اور اسی تناسب سے رفیق کی جوانی بھی بڑھتی اور کبھی کبھی کام کا انعام کمیشن دام دوپٹ ہو جاتا۔

بھوبل گلی کے نہ راہے والے دو رخے کوٹھے پر ایک کبوتری کہلائی جانے والی تمنی کا قبضہ تھا' یہ خانہ بدوش دیہاتی قسم کے سرکس والے نیم شعبدہ باز کرتب دکھلانے والے ہوتے ہیں۔ اور دیہات میں جہاں راجپوت' پٹھان ذرا خوش حال بستیاں ہوتی ہیں' یہ اپنے ڈیرے ڈالتے ہیں۔ اور راجپوت پٹھانوں پر بھی منحصر نہیں جس خطہ میں ذرا فصل اچھی لگ جاتی ہے یہ بھینسوں کی پیٹھ پر اپنے خیمے لادے پہنچتے ہیں اور

گاؤں سے قریب ہی کسی بنجر اکثر کھلیان کے خالی میدان پر اپنے خیمے نصب کرتے ہیں۔ کبوتریاں غضب کی لوچ دار ہوتی ہیں اور کسرتی بدن بالعموم خوب صورت ہی ہوتے ہیں اور پھر یہ تو باوجود خانہ بدوش ہونے کے جیسے نسلی طور پر قبول صورت بھی ہوتی ہیں کیوں کہ اکثر و بیشتر اونچی قومیتوں برہمن راجپوت پٹھانوں کی اولاد ہوتی ہیں۔ ویسے سب کی شادیاں ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن شہر اور چکلہ والیوں کے باپ بھائی بیٹیوں بہنوں اور بھانجیوں بھتیجیوں سے پیشہ کراتے ہیں لیکن ان کے نٹ قومیت شوہر اپنی ان بیاہی بیویوں سے کسب کراتے ہیں۔ گویا بات الٹ ہوتی ہے اور یہ کبوتری تو اڑتی پرندی تھی۔ کسی دیہاتی زمین دار بنیے کے پاس یہ چوبارہ گروی رہن دخلی تھا۔ اپنے کچہری عدالت کے کام اور مال الٹ پلٹ کرنے کے لیے قیام کے لیے رکھ لیا تھا اور اپنی آشنا کبوتری اور اس کے شوہر کو بسا دیا تھا۔ اور پوری بھوبل گلی سارے چکلے میں یہ روایت کے منافی اور برادری باہر سی چیز تھی۔ پھر کوئی اس کی طرف یوں بھی رخ نہ کرتا کہ لہجہ خانہ بدوشی اور شین قاف نادرست تھا۔ اچھا بھلا انسان مکدر ہو جاتا۔ یہ نٹ بیوی سے کسب کرانے کے سبب حقارت کے ساتھ برادری سے آؤٹ کاسٹ تھا۔ دھندا نہ چلا۔ ویسے غریب اچھی خاصی قبول صورت تھی مگر زبان اور لہجہ کی ناملوسیت صورت پر دھول ہی اڑا دیتی ہے۔ ایک رات چپکے سے بوریا بستر سمیٹ کر چنپت ہوئی۔ ایک دو روز تو بھوبل گلی اور چکلہ بھر میں چرچے چلے لیکن چند ہی روز میں ایک صبح حیرت پھیل گئی اور اس چوبارے کا تو مقدر ہی کچھ ایسا تھا۔

ایک انسٹی ٹیوشن اور تھا اس کے بھی اور اس کے بھی الٹ بالکل۔ آج ابھی صدی بھر سے بھی کم کی انگریزوں کی بسائی ہوئی آباد کی ہوئی کمایوں اور گڑھوال دو پہاڑی ڈویژنیں جو اس سے قبل تک روہیلہ سلطنت کے شمالی پہاڑی دامن میں واقع روہیلہ باغیوں اور مجرموں کا "کالا پانی" تھیں انگریز نے تسلط کے بعد سناٹوریم بنائیں۔ بنگلی بنگلی دیسی آبادی تو یہاں موقع موقع سے موجود تھی۔ پانچ سات ہزار فیٹ بلندیوں تک آب و ہوا کی برودت کے زیر نظر رانی کھیت نینی تال الموڑہ وغیرہ میں انگلینڈ امپورٹیڈ گورا فوج کے لیے چھاؤنیاں قائم کیں۔ یہاں یوں تو قدیم دیسی آباد کار کالے ہی آتے تھے لیکن صدی بھر کی رہائش کی بدولت عام طور پر کھلے گندمی رنگ کے تھے اور گورا فوج کے محروم جنس سولجر اور ان کے اتفاقی و حادثاتی اتصال سے ان میں باوجود سخت پہرہ چوکی کے چلتے پھرتے اوقات فطری طور پر اختلاط ہو ہی گیا۔ ویسے تو ایسے اختلاط کے نتائج عورت ہی کے سر منڈھے رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی مولود موقع ملنے پر نکل بھاگتے ہیں۔ اور بھوبل گلی کی اس نکڑ والی قیام گاہ میں اس نتنی سے ساز باز کر کے اور کچھ مالک بنیے کو دے دلا کر ایک اسی قبیل کی مخلوط النسل آ بسی۔ چاروں کمروں کو رنگین قلعی کرا کر مغربی وضع کے نئے فرنیچر سے آراستہ کیا۔ اور اس میں سنگل بیڈ مسہری گویا "مس" ہونے کا نمایاں سمبل تھی۔

مس پسنلانا آنوینک آف رانی کھیت کے متعلق سب سے زیادہ چمکتی پبلسٹی ان کے real sense میں مس ہونے کی تھی اور ہنوز آمد نامہ کے حرف کبیر میں جمع واحد کے صیغوں میں واحد تھیں۔ کئی روز تو اس جدید آمد کے متعلق بھوبل گلی میں چرچے رہے مگر خوشبوداری بدبوئیں پھیلیں

جیسی کسی جن کے مسکن کسی پرانے مکان کے متعلق ہوا کرتی ہیں' ساتھ ہی شہر میں باؤلے گاؤں اونٹ گیا۔ اور جب بھوبل گلی کے کوٹھے کوٹھے شروع رات میں گانے بجانے ٹھمری ترانے کی محفلیں' جلسے جڑتے تو اسی موضوع سے شروع ہوتے جو شہر کے تماش بینوں میں عام چرچا تھا اور تان اس پر ٹوٹتی کہ "مس صاحب" اچھوتی ہیں' جسے چکلے کی بولی اور تھانہ کوتوالی کی کتاب میں "نتھ پوش" اور "نتھ والی" بولا جاتا ہے۔ حالاں کہ "مس صاحب" کی ناک' نتھ' بلاق' پھول' کیل سے بے نیاز تھی۔ اور پتا نہیں شاید وہ ان سائن بورڈوں کی عبارتوں کے پڑھنے اور پڑھوانے سے لاعلم ہوں۔ مگر شہر گاؤں تھا اور گاؤں بھی باؤلا اور "مس صاحب" بہرحال اونٹ تھیں ہی تھیں اور سب سے زیادہ اونٹ یوں کہ ہنوز اچھوتی تھیں اور چھونے کے متوالے سب سے زیادہ اسی کم زوری کے حامل ہوا کرتے ہیں' تماش بینوں شوقینوں میں غلغلہ مچ گیا۔ "مس" کا سابقہ اور پسلانا کے ساتھ آتوینگ نام کا چلتا لاحقہ بڑے زور سے لبلبی دبانے اور دنا دن فیر کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ مگر بات صرف گانا بجانا پیشہ ہونے کی شتر گربگی تھی۔ چلبلی ہوئی اور رستہ چلتے سرراہے کوٹھے پر سے سنائی بھی پڑی کہ "مس صاحب" کتے مار کہ باجے کے سازوں پر ڈانس کرتی ہیں جو بولوں سے یوں بھی بے نیاز ہوتے ہیں اور بول نکلیں بھی تو خیر پکے گانوں کی طرح خواہ پلے پڑیں یا نہ پڑیں' پوری محفل جھوم جھوم جاتی ہے' لیکن یہاں یہ بھی نہیں۔ پھر "رقص" "ناچ" "مجرا" سب کا سنڈ منڈ ترجمہ اکیلا ایک "ڈانس"۔ اور سازندے اپنے یہاں' گانے والے کے گلے کے پابند ہوتے ہیں۔ "مس صاحب" کے فن میں پاؤں پنڈلیاں لال فیتے والی نیلی وردیوں کے کالے کالے سازوں کی آوازوں پر بجائے حلق زبان کے انھیں سے گلے بازی کرتی ہیں۔ سب کچھ بھینس کے آگے بین ہی بین۔ لیکن سب کچھ سہی اور سب کچھ برداشت۔ "مس صاحب" کی مس صفت اور مانع قدرت کے شوق صناعی کی اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر کا جواب بھوبل گلی کے کوٹھوں' گھر گرہستنوں کے گھروں اور اڈوں کی حویلیوں میں چکلہ بھر کے اندر چاروں طرف کہیں نہ تھا۔ اور پھر حسن اور حسن ظن جمع۔ سرخ سپید جھک گورا رنگ' کاغذی ساٹھن' مخمل سی جلد' ایک رنگ سوڈھنگ تھی۔ نرگسی گلابی' لال ڈورے والی نیلی انکھڑیاں' کسی قبول صورت دومڑی چماری پہاڑی ماں اور رستہ چلتے گھگھریا پلٹن وال ملکہ وکٹوریہ کے پوتے نسل قسم کے ہائی لینڈر اسکاٹ سولجر کے آمنے سامنے سے' سامنے پڑ جانے کا حادثاتی نتیجہ تھیں۔ صورت اور صورت حال اظہر من الشمس تھی اور بیان سے باہر اور لباس قسم مستزاد۔ سب کا سب غارت گر ایمان و آگہی' اس ترکیب کا قطع کیا ہوا کہ سارے کا سارا کھرا کنچن اور کچی چاندی' کچی چینی' چلتے چلتے پرکھ میں آجائے۔ اور خانگیاں گھر گرہستنیں خیر کالے بند برقع میں رہیں ملبوس کی قوسیں رنگتیں تو کوٹھے والیاں بھی پہچانتی ہیں اور ان کا کپڑا بھی شہر کے بزاز سے بازار سے کٹ کرا انھیں تھانوں میں سے ان کے آشناؤں کے ہاتھ سے آتا ہے' جن میں سے شہر کی اعلیٰ پایہ عفیفہ بیگمات کے لیے ان کے شوہر لے جاتے ہیں اور لطف یہ دونوں ہی بہ یک وضع' تراش خراش' غرارہ' شلوار اور ساڑھی میں رہتی ہیں۔ فرق صرف نظر آنے اور نظر نہ آنے اور آشنا اور شوہر نام کا ہوتا ہے۔ اور ایک شوہری اور کثیر الشوہری کہہ لیجیے اور

چار دیواری اور کوٹھے کی بلندی کا۔ مگر مس بسنلاتا آٹوینگ نے تو کوٹھے کا ترجمہ "فلیٹ" کیا اور کوٹھے والیاں تو کبھی اترتی نہ تھیں اور اترتیں تو کسی فن اور حسن آشنا بڑے رئیس کے یہاں "ڈبل خرچی" پر' اس رئیس کی بھیجی ہوئی سواری پر بیٹھنے کے لیے' نیچے سڑک تک آتیں۔ اور اکثر اس سواری پر پردہ پڑا ہوتا۔ بیگم روپ بھرے جایا کرتیں۔ اور حویلی والی خانگیاں ان بیبیوں کے ہم رنگ بھی ہوتیں اور نسبتاً ان کی ہم نسل بھی' انھیں کی کوئی ہوتی سوتی لگتی ہوتیں۔ کسی ایسے ویسے' ایرا غیرا نتھو خیرا کا قدم تو خانگی اڈا تو در کنار کھلا بازار کسی کوٹھے کی نچلی پہلی سیڑھی پر بھی نہ پہنچ سکتا تھا۔ مگر مس بسنلاتا آٹوینگ تو کھلے بندوں فلیٹ سے اتر کر سڑک پر نکل آتیں اور پاؤ ڈھکی پون کھلی۔ سینہ کے بالائی حصہ سے زیر ناف تک ہمہ رنگ ریشم کے ملبوس میں۔ پنڈلیوں سے رانوں کے بالائی اتار چڑھاؤ تک ساری کی ساری بالائی اور کل مکھن سامنے۔

سڑک پر چلتوں کا ذہن چکی کے پاٹوں کی طرح گھمر گھمر کرنے لگتا۔ اور اس گلی میں یا تو لینڈی کتے ہی آیا کرتے یا پھر بھانت بھانت کے تماش بین نظر آتے۔ پرانے ٹکسالی بڑے بوڑھے روایتی' نوجوان و جوان مثل پیران پختہ کار' حسن سراپے کے بے عصیاں گنہ گار۔ مس بسنلاتا کو سڑک پر جلوہ ریز دیکھ کر بوڑھے' جوان' نوجوان سبھی ٹھٹھک کر رہ جاتے اور اپنی اپنی باری پر سب کے سب جگر تھام کر بھی۔ اور پہلے ہی پندھرواڑے میں ساکھ دھاک مضبوط تر ہو گئی۔ چکلہ کی بولی میں "مس" کا صحیح مفہوم مجسم نظر آیا اور اردو میں "کنواری" کا جو بل گلی کی لغت میں اضافہ ہوا۔ اور دیہاتی کہاوت کے مطابق "گلے گلے پانی میں یقین" کے ساتھ وہ ہوا جسے ٹھیک ٹھیک معنوں میں ہونا کہتے ہیں۔ اور ان کے مداحوں کو یقین ہوا کہ "مس صاحب" واقعی مس ہیں اور کچے کچے ابھی پکانے سے چہرے نے بھی تصدیق کی کہ جس پر چاندماری کی ہلکی سی رمق بھی کہیں نظر نہ آتی تھی۔

در حقیقت کنوار پنا عورت کا بڑا چمکتا جڑاؤ زیور ہے' اور یہ ساکھ مرد کی نو عروس تک پہنچی ہوئی کمزوری ہوتی ہے۔ دور غلامی میں ہاتھ آنے والی لونڈیوں کے جسموں کی حفاظت غلاموں کے تاجر کڑی نگرانی کے ساتھ اس پہلو سے بھی کیا کرتے تھے۔ اور اس میں بھاؤ اور قیمت کا خاص دخل تھا۔ اور چکلوں ہیرا منڈیوں میں نوخیزوں الھڑ کنواریوں کے رخساروں پر ہلتی گول گول سنہری نتھنیاں ان کے اچھوتے پن کی سندیں ہوتی ہیں اور بازار میں ساکھ کی مانی ہوئی ضامن اور صورت شکل کے علاوہ قیمت کے اتار چڑھاؤ کا خاص ذریعہ۔ مس بسنلاتا آٹوینگ کے اسی ساکھ صفت پر شہر بھر کے ٹکسالی نئے پرانے تماش بین مرمٹے اور ٹکسالی پرانے مبصروں نے بھی اچھوتا کنوار پنا تو دور سے دیکھ کر بھانپ لیا۔ مگر پتھر میں جونک نہیں لگا کرتی' خواہ سنگ خارا نہ سہی' سنگ مرمر ہی کیوں نہ ہو۔ اور بہ ظاہر دیکھنے میں مس بسنلاتا نرم نرم جودھ پوری مرمر کی کان کا پتھر تھیں۔ مگر اندر سے اودھے پوری پہاڑ کی سنگ خارا چٹان تھیں۔ ویسے کھلے بازار کوٹھے پر بیٹھتی تھیں' اور حلوائی کی دکان کا جلیبیوں' امرتیوں بھرا رنگین چپ چپا سجا ہوا خوانچہ تھیں۔ شہر بھر کے مٹھائی کے شوقین عاشق مزاج مرمٹے۔ مگر سیدھا سادا جواب باثواب ملا کہ صرف ناچ گانے کا کام

کرتی ہیں'اور وہ بھی کتا مار کہ باجے کے سازندوں کی دھن پر فرانسیسی ڈانس کا فن دکھلاتی ہیں'تو جلی بلی کھسیانو بچے ان محروم ناکام تماش بینوں نے اور کچھ بس نہ چلا تو بے چاری کے نام کا دیسی زبان میں تضحیک کے ساتھ ترجمہ ہی کرلیا اور مس طمنچہ جان پستان رانی کھیت والی مشہور ہوئیں۔

مگر عاشق مزاج بھی بھانت بھانت کے ہوتے ہیں'رنڈی بازوں کی ایک قسم "بھوکے رنڈی باز" ہوتی ہے'جو چڑی مار کے لاسے کی طرح چکلہ بھوبل گلی'ہیرامنڈیوں کے خرنجوں پر سونگھتے کتوں کی طرح کسی نہ کسی بھار دار کتی کے پیچھے دور سے ہی چاٹتے سے لگے ہی رہتے ہیں۔چناں چہ جب مس طمنچہ جان گلی میں اپنا نادر چست ملبوس پہن کر چہل قدمی کے لیے ادھر سے ادھر اک ذرا فرانسیسی ڈانس کی تھرکتی ٹانگیں سیدھی درست کرنے اترا کرتیں تو کوٹھے کے دور کے جلوے کے مارے بدنصیب اور کچھ نہیں تو اک چند قدم تعاقب ہی سے سرفراز ہو لیتے۔اور پرانے ٹکسالی تماش بین تو مجبوری کا نام شکر "رنڈی ہے کہ زنخا!" لاحول بھیج کر منہ پھیر لیتے اور کنکھیوں سے دیکھتے نکلے چلے جاتے۔غرض شہر بھر میں سبھی نچلے بیٹھ رہے۔اونچے اونچے چھتیس (۳۶) پٹہ زینوں کے ایک سانس میں چڑھنے والے تماش بین'اور بھڑووں کی چار دیواریاں ایک جست میں پھاند جانے والے اکا دکا جاگی شہہ سوار'اور خانگیوں کی ڈیوڑھیاں اک دو قدم میں پار کرکے بیچ دالان داماروں کی طرح جا براجنے والے چھیلے'مگر تنوں خاں تو ان میں سے نہ تھے جو ہتھیار ڈال کر بیٹھ رہتے اور جب کہ رفیق جیسا آل راؤنڈ کپتان سپہ سالار ہم دوش تھا۔دوست کے دل کا معاملہ تھا اور بھوبل گلی'چکلہ بھرکی ہر چھوٹی بڑی مستفیض ہو چکی تھی۔یہ مس طمنچہ جان سی صرف ناچ ساز والی نکر بچ کر نکل جاتی تف تھا۔اور ناچ ساز والی تو سبھی تھیں'یاں سے واں تک بھوبل گلی میں'زیادہ سے زیادہ یہ طمنچہ جان نتھ والی جیسی تھیں'کون سی رانی کملاپتی ملکہ نورجہاں ہیں۔مان لیا بے دیکھے بھالے ہی سی نتھ والی ہیں اور چکلہ بھرکی ایک ایک نتھ والی ادھر اک دو سال اندر تنوں خاں کے ہتھے گھر بلا کر چڑھ چکی تھی اور نتھیں ان کے ہاتھ سے بڑھوا چکی تھیں۔اور خیر وہ تو بکاؤ مال تھیں'خانگی اڈوں والی کھائی کھیلی کنواریاں'شوقین رانڈ بیوائیں'اور ان سب سے زیادہ رسیا آہوئے رم دیدہ بیاہی شوہر والیاں'سدا بہار کاٹھی پنڈا درست ضعیفائیں اور نیچی نیچی چاردیواری بند گھر آنگن نشین شکر چھوارے لٹی کوٹھے والیوں کی مائیں'بچیاں'ممانیاں'لوٹ لوٹ چوتھی کے جوڑے پہن چکی تھیں اور تنوں خاں'رفیق کی رہنمائی میں کتنے ہی طرح طرح کے رقت کے بند توڑے نوجوان وحشی بیران پختہ کار تماش بین ہو چکے تھے۔یہ مس طمنچہ جان اک ذرا اوروں سے زیادہ گوری چمڑی کے تاؤ میں لال تال'انھیں ذرا دیکھنا تھا۔ اور رفیق نے بے قرار دوست کے دل کو اسی نہج پر سنبھالا اور کوکا پنڈت کے نام پر پرشاد چڑھا کر'جسے کہتے ہیں کمر سے ستو اور سرے کفن کے بجائے'ہنی مون کی صبح والا جوڑا باندھ کر سر ہتھیلی پر پیش کیے فلیٹ پر چڑھ گیا۔

فارسی مقولہ ہے زر بر سر فولاد نہی نرم شود'نیم انگریزی'نیم انگریزی نما اردو میں بات چیت کرکے اور مس طمنچہ کے خون میں سونے سے بھی بڑھ کر کشتہ طلا بہ نسخہ کلاں ہندوستانی دواخانہ دہلی والا بن کر

اتر گیا۔ جونگ پتھر میں لگنے کی معاملت کار طے کرادی۔ البتہ سرخ بھاؤ کی اور بات تھی' یہ چکلہ والی نخیائی تو نہ تھی جو دس پانچ سے چل کر اگر نکیلی نتھ والی ہوئی تو پچاس سو روپیہ کے اندر معاملت ہو جاتی یہ حقیر رقمیں تو بہ آسانی سبزی منڈی سے اپنے کھیت کے تھوک خریدار سبزی فروشوں سے اٹھالیا کرتا جو روز کے روز صبح تڑکے اپنی گاڑیاں ٹھیلے چھکڑے لے کر اس کے بھائی کے کھیتوں پر پہنچ جاتے اور ہفتہ کے ہفتہ بڑا بھائی مجریٰ محسوبی کر دیتا۔

شہر کی رہائش سکونت جہاں آگ چاہیے تو دکان پر دیا سلائی خریدو اور انگریزی پڑھائی کے بے ڈھب اخراجات! ویسے جب اٹھوارے کے اٹھوارے جنس لینے گھر جایا کرتا تو جیب خرچ' یا تعلیم کے کسی بیشی خرچ کے نام سے جتنی رقم چاہتا اینٹھ لاتا۔ اور شہر میں بھوبل گلی ہو یا خانگی اڈے' پینے پلانے کا سلسلہ تو چلتا ہی ہے' سو جب وقت ملتا تو رفیق دوپہر کے کھانے سے پیشتر چھاؤنی والے پارسی کی دکان سے پانچ روپے والی وہائٹ ہارس وسکی کی بوتل لا کر رکھ دیتا' جو آدھی شام کے کھانے پر بچ رہتی اور دونوں چلے کو رنگتے ہوئے جایا کرتے۔ مگر مس طمنچہ جان کے فلیٹ کا ریٹ پانچ ستارہ ہوٹل سے بھی دو ڈگری اونچا ان کے نکھرے مقدر کی طرح سات ستارہ بلند تھا۔ بھوبل گلی کی نتھ والیاں نوخیز میں ہوں یا نئی نویلیاں تو جماں ہوں' یا بھری بھگتی بھاری بھرکم کاٹھی پنڈا درست کسی بنی' ڈھلی لڑھکتی اترتی عمر والیاں ہوں' حساب سب جانتی ہیں کہ ایک روپیہ میں چونسٹھ پیسے ہوتے ہیں اور ہر پیسہ کو چونسٹھ تاؤ لگتے ہیں۔ اور ضرب و حاصل ضرب کے میزان پروفیسر جادو ناتھ چکروَرتی نہیں مس طمنچہ جان بھی جانتی اور لگا لیتی تھیں اور تنوں خاں تو سلیٹ پینسل پر پرائمری اسکول سے آج کالج کے کلاس تک روز لگا رہے تھے' مس طمنچہ جان نے رفیق کے پیہم اصرار پر بہت کھینچ تان کر چونسٹھ پیسے والے روپیہ کے آگے دو صفر لگا کر چونسٹھ سو اپنی قیمت کی سرکاری بولی بولی' اور رفیق کی مسلسل زبانی کوشش سے اترتے اترتے بات سولہ سو پر آکر ختم ہوئی۔ مگر یہ اعداد بھی تنوں خاں نے اسکول میں سلیٹ پینسل سے لکھ لکھ کر پونچھے سے بگاڑے تو تھے مگر دیکھنے میں کبھی نہ آئے تھے۔

تاہم رفیق نے رہنمائی کی۔ ساگ پات بھنڈی ترئی والی منڈی سے ذرا دو تین فرلانگ دور' موم پھلی' آلو' رتالو' اروی اور چنا گیہوں جنس اعلیٰ کی آڑھت منڈی تھی اور وہاں فصل کے فصل اچھے تیز بھاؤ کے انتظار میں آڑھتیوں' کوٹھی والوں کے گوداموں میں کمیشن ایجنٹ بنیوں کی تحویل میں اس کے بھائی کے کھیتوں کی خشک اجناس اسٹاک ہوتی رہتی تھیں۔ اکثر بھائی ساتھ نہ ہوتا اور تنوں خاں خود جا کر وزن کرایا کرتا اور درج کھاتا اس کی معرفت ہوتا۔ اور سولہ سو روپے کی رقم حاصل ہونے کا یہی راستا تھا جو سبزی منڈی اک ذرا اور بڑھ کر تھوڑے فاصلہ پر تھا۔ اور یہ راستا دکھاتے ہوئے پہلی نشان وہی پر تو تنوں خاں کو کالے کوسوں نظر آیا۔ مگر رہ عشق میں تو دیکھا گیا ہے منزلیں زیر قدم اور زمین کی طنابیں کھنچی رہتی ہیں اور یہ تو گویا بھر کا بیہ اور سوا قدم کی بات تھی۔ مسئلہ اک ذراسی تحریک پر حل تھا۔ البتہ رفیق کو اک ذرا چند لفظی زور خطابت کا جوہر دکھلانا پڑا۔ اپنے بالا خانے سے اناج منڈی تک کا راستا سپاٹ چکنا تھا'

سڑک چنک دار کولتار کی جاتی تھی۔ رفیق نے بخششیں سو سو، حساب جو جو کا میزان کل مفہوم سمجھایا۔ اپنی اور اپنے باپ کی استرے قینچی، دکان، پھیری کی کمائی کی نظیر پیش کی اور اپنی گانٹھ مٹھی علاحدہ اور اپنی دکھلائی اور کہا۔

"میاں خیر سے پڑھے لکھے، عاقل بالغ ہو، بھرے گودام اور کھڑے کھیتوں میں آلو، موم پھلی، ہر جنس میں دو دانوں میں سے ایک دانہ اکیلا تمھارا ہے۔ وہ تم سے اپنے دانے دانے کا مطالبہ کریں، اور میاں میں سمجھتا ہوں پہلے تو کریں گے نہیں ایسا۔ ٹھنڈے شریف النفس آدمی ہیں۔ اٹھارہ بیس برس بڑے ہیں، البتہ دنیا دیکھی ہے، اندیشہ ہے۔ لیکن اگر بہ فرضِ محال حساب مانگ بیٹھیں تو تم ان سے بیس برس اور چالیس فصلوں کا اپنا حصہ حساب طلب کر سکتے ہو۔"

اور بڑے بھائی سے حساب طلب کرنے کے الفاظ سن کر تنوں خاں کو جیسے خوف کے مارے جھری جھری سی آگئی۔ سگ باش، برادر خورد مباش کی گھریلو ماحول کی تربیت اور بڑا کتا تو اپنی گلی میں چھوٹے کتوں کی دم دبی رکھنا ہی دیکھنا گوارا کرتا ہے، اور چھوٹے کتے تو سامنا ہونے پر آپوں آپ چاروں شانے چت لیٹ جاتے ہیں اور کان ڈالے، دم دبائے، حلق بند رہتے ہیں، بڑے کتے کو غراہٹ کی بھی نوبت نہیں آتی۔ جوان سال تنوں خاں خزاں زدہ درخت کی طرح سنڈ منڈ کھڑا رہ گیا، جو روڑی سوکھی پتیاں جہاں تہاں شاخوں میں تھیں، وہ بھی جھڑ گئیں۔ اس کا مضمون کالج میں ضرور میتھمیٹکس تھا، مگر ددا سے حساب مانگنے والا جمع تفریق نہیں، علم الحساب چکرورتی والا۔

بنیا جبلت، آڑہت، امانت اور اسٹور کے معاملے میں متوازن پائی گئی ہے۔ اور معاملت رویہ میں ایک گونہ خلوص کا پہلو بہ روئے کار رہتا ہے اور اپنے آسامیوں امانتیوں کے ساتھ اپنائیت و یک دلی کا سلیقہ ساکار فرما ہوتا ہے۔ تنوں خاں اپنے باپ دادا کے پشتینی آڑہتی لالہ کوڑی مل پکوڑی مل کوٹھی والا کی آڑہت کے گودام پر پہنچے۔ کسی فصل کا وقت نہ تھا جیسا کہ کبھی کبھی ہوتا تھا اور نہ کوئی گاڑی چھکڑے ساتھ تھے جو اکثر بڑا بھائی سردار خاں گاؤں سے جنس کے سیدھے کھیتوں پر سے لاد کر شہر بھیج دیتا۔ اور چھوٹے بھائی کی شہر کی رہائش سے اتنی سہولت ہوگئی تھی کہ خود ساتھ نہ آنا پڑتا۔ تنوں خاں آڑہت پر جنس کی گاڑیوں کے ساتھ پہنچ کر وزن کرا کر کرایہ کے گودام میں بھروا دیتا۔ ایک کنجی آڑہتی کے پاس رہتی دوسری تنوں خاں کے پاس اور تالے سربہ مہر ہوجاتے۔ اور جب بازار میں جنس کی قیمت پوری گرانی تک بڑھتی تو آڑہتی کی اطلاع اور تجویز پر مال نکالے جاتے۔ گودام کے کرایہ اور نفع کی رقم پر پیسہ روپیہ کمیشن آڑہتی کا ہوتا۔ اس وقت تنوں خاں کو خلافِ امید دیکھ کر لالہ لوگ ذرا متعجب سے ہوئے اور بھی تعجب اس پر ہوا کہ انھوں نے مال نکالنے کی ہدایت کی۔ بوڑھے آڑہتی نے ذرا سمجھایا کہ اس وقت مندا ہو رہا ہے، چھ ہفتے اور رکا رہنے دیا جائے تو دام دوچند نفع کی امید ہے۔ ساتھ ہی دبی زبان سے بے وقت ضرورت کی اہمیت کے متعلق استفسار اور دریافت خیریت کیا۔ اس سوال کو تنوں خاں اڑان گھائی کر گئے۔ ان کا رخ دیکھ کر زیادہ بولنے سے بڈھے باپ کے نوجوان شریک کار بیٹوں نے روک دیا۔ کہا تنوں خاں،

سردار خاں دونوں بھائیوں کے نام سے ملا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ بڈھے نے دبی زبان سے پھر تجویز لیا کہ کم از کم بڑے بھائی کو مطلع کر دیا جائے، مگر نوجوان بیٹوں نے اس کی ضرورت نہ سمجھی۔ دوسری کنجی اگرچہ تنوں خاں کی جیب میں تھی، تاہم گودام کھلنے اور موم چپلی آلو نکالنے کی نوبت نہ آئی۔ کاغذ میں وزن اندراج تھا۔ بازار کے آج کے بھاؤ سے کل قیمت تجوری سے نکال کر ہاتھ میں دے دی اور مال لالہ کوڑی مل بکوڑی مل کوٹھی والا کے نام درج کھاتہ ہو گیا۔ صرف تنوں خاں نے کنجی حوالہ کر دی اور اس طرح دونوں کنجیاں حوالے ہو گئیں۔

اور آج شام سے ہی "ہنی مون منتھ" کی کوکھ سے نکلا گولڈن ویک نامی ہفتہ جو مس پسنلاتا آٹوینگ آف رانی کھیت کی اپنی لفظی و عملی داخلی و خارجی ترکیب تھا، شروع ہوا۔ اس کے لیے مخصوص انتظامات فلیٹ پر کیے گئے۔ مس طمنچہ جان کا ازلی سنگل بیڈ مخصوص انداز میں ڈبل درست کیا گیا۔ آنے جانے والے تو شاذ و نادر ہی تھے۔ بینڈ ماسٹر، سازندوں کا گینگ۔ ان کے علاوہ مشعلچی، باورچی، خانساماں، بیرا ایک گنجا لونڈا سبھی کچھ تھا، جسے مس صاحب انگریزی تحکمانہ انداز میں "بوائے" کہہ کر پکارتیں۔ فلیٹ سے نیچے باہر تک انتظامات رفیق کے سپرد ہوئے۔ اپنے اور تنوں خاں کے بالاخانہ کے دستور معمول کے مطابق ایک ٹفن کیریر بھر کھانا لانے کے بہ قدر چھ ٹفن کیریر بھر لانے کا انتظام، بجائے ٹفن کیریر، ٹفن باسکٹ بھر سپرد ہوا۔ بجائے وہائٹ ہارس وہسکی کی ایک بوتل یومیہ روز کے روز چھاؤنی والے پارسی کی دکان سے لانے کے، یک دم پورے کا پورا کریٹ لا کر رکھ دینے کی خدمت سپرد ہوئی۔

مگر تنوں خاں ایسے نرے لونڈے چھورے نہ تھے، نوجوان مثل پیران پختہ کار۔ دیکھا جاتا تو چکلے بھوبل کے پرانے وضع دار کھچڑی بالوں والوں سے ہٹے تماش بین نہ تھے۔ اور تین سال میں تیس تیس سال ریٹائرمنٹوں سے زیادہ کار کردہ، تجربہ کار ہو چکے تھے۔ خوان بڑا خوان پوش بڑا، کھول کر دیکھا تو ایک ایک ہی بڑا۔ مس پسنلاتا آٹوینگ آف رانی کھیت والی، اپنی خیر، خانگیاں، آشنائیں تو دور کی بات ہیں ان ادھیڑ نوچیاں بنی ہوئی جیسوں کی گرد کو پہنچی ہوئی نہ نکلیں۔ کھڑے مسالہ کا اشو اور اس میں بھی جیسے دہی میں شکر ملا دی جائے۔ صبح ہی صبح گنجا لونڈا مس صاحب کے کچن سے ناشتہ پہنچاتا رہا۔ دوپہر، رات، لنچ، ڈنر، بھر بھر چھ ٹفن کیریر رفیق دعوت کے چٹ پٹ خوشبودار، رنگ دار، میٹھے سلونے کھانے گھر سے پکوا پکوا کر پہنچاتا رہا۔ ادھر اندر ہی اندر مس طمنچہ جان وہسکی کے جاموں، پیگوں کے سہارے پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مگر پینے پلانے کے برتن کاغذی پتلے شیشے کے تھے اور سب کچھ آر پار دکھائی دے گیا۔ تنوں خاں کا دل سمجھائے نہ سمجھا۔ ویسے انھوں نے بھی اپنی پہلی نگاہ کی دیوانگی کو فرزانگی پٹی پڑھائی ضرور۔ مگر بے پڑھی ہی پورا صفحہ پڑھتے چلے گئے۔ اب تک نقلی موتی موتیوں اور جھوٹی لال پری کانچ کی جنی پڑی نتھنیوں کے بڑھانے کے تجربے کیے تھے، جو سچ مچ جھوٹی اور نقلی ہونے کے باوجود نکلی کھری تھیں۔ ویسے مس طمنچہ جان نے خرد و جنوں کا سبق پڑھا کر سمجھایا بجھایا کہ "ڈیئر انگریزی فرانسیسی میں ایسا ہی ہوتا ہے اور یوں ہی ہوا کرتی ہیں اور تم تو ماڈرن ہو۔"

گولڈن ویک کا قوسین ہفتہ بھگتا کر اور گودام بھر آلو موم پھلی کھا چبا کر نکلے تو وہسکی تو خیر کریٹ ہی بھر تھی، لیکن خمار وتمکین بھر تھا۔ وہ جو کہاوت کیا تجربہ ہے "کٹا پٹا راجپوت، ٹھاکر، لٹا لٹکا بنیا مہاجن کسی سے کہا نہیں کرتا۔ اور پھر بے چارے شکوہ شکایت کرتے بھی تو کس سے!! انھوں نے خود ہی دور سے دیکھ کر جیسے ٹھونک بجا کر بے قراری سے رفیق سے اظہار کیا تھا اور رفیق سب چارہ پرکھ کیا جانے۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ بھوبل گلی کی نتھ والیاں کورے پنڈے والی تو بجا ذرا کسی بنی پنڈے درست چست اوڑھے پہنے نوچیاں تو در کنار مس طمنچہ جان تو چکلہ گلی کی نائکاؤں کی جوتی برابر عفیفہ بھی نہ نکلیں۔ ولایتی پوڈروں، کریموں، سرخیوں، لپ اسٹکوں کے لیپ رگڑنے کا خول، رنگین ریشمین کپڑے سے ڈھکے ڈھول کا پول کھلا، تو ندامت کا مارا بیزاروں پٹا سا منھ اپنے ہاتھ سے پیٹ اٹھے اور خفت کے مارے دل کا خون ہو گیا۔ خلوت بتی کے وصل ہجر بردوش کی روئیداد بیان کرنے کو جگری دوست رفیق سے بھی نہ دل نے یارا دیا نہ منھ پڑا۔ اس کی تین سالہ رہنمائی میں بھی ایسی چوٹ نہ کھائی تھی۔ ادھر اس بے چارہ کو خود بھی اپنے کمیشن کی چوانی میں الٹی اپنی گانٹھ کٹی لگ رہی تھی۔ شاید میرٹھ والی قتل تمیزن کا واقعہ واردات جو چکلہ کی تاریخ میں بھارت اور الہ آبادہائی کورٹ کی نظیر ہے، ایسے ہی حالات کا نتیجہ ہوگی اور ایسے ہی میں دانتوں سے ناک کاٹ کر نکل جانا اور تین سکھا شاہی خون معاف ہوتے ہوں گے اور آج کے زمانے میں تو اس راستہ کا دھوکا اور اس قبیل کی ناامیدی اچھے بھلے مرد کو نامردی سے دوچار کرتی ہے، اور قحط سالی کا آنے والا اندیشہ عشق فراموش کر دیتا ہے، جو اپنی جگہ پر تھا اور ستم مستزاد تھا۔ مگر رفیق ماہر نفسیات تو البتہ نہ تھا، لیکن ہر قبیل کے ماہرین کے سروں چہروں پر ہاتھ پھیرنے کی خدمت اس کا کام پیشہ تھا۔ تنوں خاں کی شروع چند راتوں کی بے خوابی کی حد تک پہنچی دماغی پریشانی سے سر میں تیل مالش کرتے ہوئے جیسے انگلیوں ہتھیلیوں سے راستا پا گیا کہ انتشار و انفعال زیادہ اور غم جاناں اور غم دوراں دوش بہ دوش ہیں اور غم غلط کرنے کی ضرورت ہے۔ خیر چھاونی والے پارسی کی دکان نہ سہی تو شہر کی ٹھگ سے بھرا قرابہ لا کر رکھ دیا۔ پھر چج کا آدمی تھا ادھر اتری اجڑی نچی کھسنی مس طمنچہ جان سے سلسلہ جنبانی کی اور رکھائی کے ساتھ انھیں ان کا مقام دکھلایا اور احساس دلایا کہ ان کی میگزین کے تو سارے کے سارے بھرے نظر آتے کارتوس نرے کھوکھلے اور پورے کا پورا گولڈن ویک مس فائر ہی ہوتا رہا۔ یہ کہاں کی شرافت ہے؟ اور اتنی رقم میں تو چکلہ بھر کی نتھ پوشیں، نوچیاں، اڈوں بھر کی خانگیاں ساری کی ساری ایک رات خریدی جاسکتی تھیں۔ بہرحال روٹھے کو منایا اور بچھڑے کو جوڑا جاتا ہے، یہ تو منفعل روٹھے سے پڑے تھے، ایک شب انھیں تانگے پر پردہ سا تان کر بالاخانے پر لا کھڑا کیا۔ اور شکوے گلے مٹ گئے اور دید باز دید کے سلسلے چل پڑے اور تو اور تنوں خاں اور رفیق دونوں خیر پکے گانوں کے توے کے شوقین تو تھے ہی کتا مار کہ باجے کے ساز اور فرنچ ڈانس اور انگلش سازوں کے بھی پورے مبصر بن گئے۔ تاہم تنوں خاں کو آڑھتیوں کے گوداموں کی جانب سے بڑھتی ہوئی جواب طلبی کا دغدغہ وقت کے ساتھ روز افزوں ہوا، جس کے لیے اٹھارہ بیس سالہ بزرگ، باپ جیسے بڑے بھائی سے گفتن برائے گفتن کے لیے بھی ایک لفظ ان کی انٹی میں نہ تھا۔ اور پناہ

تھی تو ذرا کے ذرا مس طمنچہ جان کے رنگین سائے میں اور لال پری کے دوپٹہ کے دامن کے نیچے۔ اگرچہ جب ذکر چل پڑتا تو رفیق مضبوط دلائل و براہین سے آراستہ کر کے ہمت افزائی "فی الفور" کرتا رہتا۔ رہا ادھر فلیٹ کا خرچ یہ اب فلیٹ سے اتر کر اوپر والی سیڑھی سے نیچے سڑک کی نالی والے پہلے نہد پر آلگا تھا جو بھونپل گلی کے کوٹھوں کے بھاؤ پر اپنے سبزی منڈی والے سبزی فروشوں سے' وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے' پورا ہونے لگا۔ اور خیر اس بھاؤ طمنچہ جان بری بھی نہ تھیں کہ انگریزی تعلیم اور شہر کی رہائش کے اخراجات کے گوشوارہ میں خانہ پری ہوتی رہیں اور خانہ کیفیت میں بھری رہیں۔ اور ماں کے کرچے کی گھر بھرے چھپائی آمدنی میں سے' ہفتہ اٹھوارے جنس لینے گھر جاتا تو خوشامدے سے مانگ لیا کرتا ادھر مس صاحب بھی گولڈن ویک کی باون ہفتہ کی رقم یک مشت پا کر کچھ وسیع القلب سی ہو رہی تھیں اور انگریزی دکانوں میں تو saleکی اصطلاح سال پیچھے کا یوں بھی معمول ہے اور جیسے کچھ ان کے یہاں آج کل کچھ یوں ہی چل رہی تھی' انھوں نے دوبارہ تعلقات استوار ہونے میں گولڈن ویک کی دلکش راتوں کا سرور ماند نہ ہونے دیا۔ وسکی کا سارا مس صاحب کے کانسے پیتل کو سلور الیکٹروپلیٹڈ کی کچی چاندی بنائے رہا۔ اور چھپن چھری کے وقتوں میں تو خیر شراب گھوڑا کالا پانی تھی اور عورت مرد کی غذا' مگر آج ساری کی ساری غذا ہی غذا تھی اور اس لال پری کے زیر سایہ اچھی خاصی پرانی پچوری ہڈی' کوں چھینکی چیونٹوں کتوں نوچی پچوڑی مس طمنچہ جان کی تاریک شام رنگین شفق اور صبح کا خنداں ستارہ تھی۔ اور ان کے سایہ کے دامن میں تنوں خاں کا ہر غم غلط اور تمام اندیشوں کو چھپنے کا انداز تھا۔

وقت کی رفتار اور ہونی' ان ہونی کا چولی دامن کا ساتھ ہے' یا اللہ جانے دو نہیں ہیں ایک ہی ہیں۔ گولڈن ویک کا ہنی مون بھی بیتا اور اس کے بعد اک ذرا محرومی کا جھٹکا لے کر دو تین ہفتے اور۔ اور آڑھتیوں کے یہاں ان کی زبان میں بازار کے "سرخ بھاؤ" کا وقت آلگا۔ بڑا بھائی گاہے گاہے خود بھی خبر رکھتا تھا۔ مگر کھیت کی مٹی سے دست و گریباں' ہاتھ پاؤں سے بے اندازہ عدیم الفرصت تھا۔ شہر کی منڈیوں کے بھاؤں کی خبر اکثر تو آلو' موم پھلی' رتالو' اروی اور تمباکو کے گودام والے یا تو اپنے گماشتے گاؤں بھیج کر خبر بھجوایا اور مال نکالنے کی اجازت منگایا کرتے تھے' یا پھر گاہے گاہے ہفتہ کا دن ہوتا تو تنوں خاں کے بالا خانہ پر کہلوا دیتے' خبر پہنچوا دیتے۔ اور ادھر سے بڑا بھائی بالعموم خود پہنچ کر اپنے سامنے گودام کی وزن کشی کراتا اور چٹھا تیار کراتا اور کمیشن کرایہ گودام وضع کر کے رقم لے جایا کرتا۔ لیکن اس مرتبہ نہ تو آڑھتی کا گماشتہ پہنچا اور نہ تنوں خاں کے ذریعہ خبر ملی۔ دوسرے گاؤں والوں کے ذریعہ "تیز بھاؤ" کی خبریں اور ان کا مال بکنے کا حال معلوم کر کے' انتظار کر کے خود ہی سردار خاں کوٹھی والے آڑھتیوں کے یہاں پہنچا تو اپنے نام کے گوداموں میں اور اپنے منھ پر جھاڑو پھری دیکھی۔ تمام کا تمام مال جو اس وقت ہزار من آلو' موم پھلی جنس اعلیٰ کی صورت میں تھا' ڈیڑھ ماہ قبل فروخت ہو کر قیمت تنویر خاں کو ادا ہو کر درج کھاتہ ہو چکی تھی' اور وہ جو کہاوت ہے "بستی بستی بے باقی' جنگل جنگل باقی" بہی کھاتہ سپاٹ اور گودام خالی پڑے تھے۔ سردار خاں' تنویر خاں کو حبہ حبہ ادا ہو چکا تھا۔ اور بنیوں کے بہی کھاتے تو ہائی کورٹ تک کے مانے

ہوئے مستند مقدر کے نوشتے دستاویز ہوتے ہیں۔ ہائی کورٹوں کی نظیریں موجود ہیں' پھر لالہ پکوڑی مل کوڑی مل تو باپ دادا کے زمانے کے بیوپاری چلے آتے تھے' انگوٹھا نشانی دستاویز سے زیادہ معتبر۔ اور پھر ان کے یہاں کھاتہ امانت' بھڑسال بھی کاغذات مال میں سرکاری اندراج نام ملکیت کے مطابق دونوں بھائیوں کے نام ہی سے کھلا ہوا تھا۔ تمام ہی آڑھتی گودام والے' کوٹھی والے اپنے کرایہ اور نفع پر پیسہ روپیہ کمیشن پر کاروبار کرتے تھے۔ تار کے ذریعہ دساور کے بھاؤ سے باخبر رہتے اور راس المال کے اتار چڑھاؤ میں جیسے پیدائشی طور پر چست و درست تھے۔ بڑے بھائی سردار خاں چھوٹے بھیا تنویر خاں کے ہاتھوں سب کھاتے کٹے ہوئے دام دام بے باق بند پایئے تو سناٹے میں آگیا۔ کہاں گئی اتنی بڑی رقم؟

ویسے اس طرح کے کاروباری بنیے بڑے ٹھنڈے اور پُر خلوص غیر قوم ہوتے ہوئے بھی برادرانہ نوعیت کے ہم خیالی اور لچک گداز کے حامل ہوتے ہیں۔ لالہ پکوڑی مل بھانپ گئے کہ چھوٹا بھائی ان سے رقم اینٹھ کر کہیں عیاشی میں اڑا آیا۔ تاہم سردار نے خود کو سنبھالا اور لحاظ کیا کہ تنویر خاں کی ساکھ کو دھچکا نہ پہنچے اور بات آئی گئی کرکے اٹھ آیا۔

آڑھتی نے یہ بھی پوچھا کہ اگر سخت ضرورت ہو تو بشرہ سے اندازہ کرکے پیش کش کی کہ جتنی رقم چاہے علی الحساب اٹھالے' سود کی پرواہ نہ کر' خواہ لگے یا نہ لگے آیندہ فصل حساب ہوتا رہے گا۔ مگر اس میں بھی اس کی سادہ دیہاتی انا کو ٹھیس لگتی محسوس ہوئی۔ پشتوں سے اس کا منوں مال جس جگہ پیشگی تحویل امانت میں رہتا چلا آیا تھا' وہاں سے وہ قرض اٹھائے' اور بنیے کی بے سودی کی پیشکش شق' احسان کا چھپر محسوس ہوئی۔ حالاں کہ اس وقت ضروریات ناگزیر تھیں' بٹائی داروں کے حصہ کا پیسہ پیسہ بے باق کرنا تھا۔ نوکروں کی چڑھی تنخواہیں ادا کرنا تھیں۔ کھیت مزدوروں کی مزدوری اور مال گزاری سرکاری کے وجوب کی ادائیگی زبردست کا ٹھینگا سر پہ کھڑی تھی۔ سب ایک سے ایک بڑھ کر اٹل تھیں اور پھر سال بھر کا سارے گھر کا کپڑا بنتا تھا۔ اور ویسے کٹھار تو خیر سال پلٹ پرانی جنس سے بھری رہتی' تاہم نقد رقم تھوڑی بہت وقت پڑے علاج معالجے کے لیے گھر کے اندر گانٹھ مٹھی میں رکھی ہی جاتی ہے۔

صبح اٹھا تو لمبا بجٹ سامنے تھا اور آمدنی کی صحیح میزان کی رقم آنہ پائی انگلیوں پر گنتی میں اور اس وقت ذرا دیر میں دیوالہ ساپٹا سنائی دیا۔ دن میں تارے نظر آگئے۔ آڑھت سے اٹھا لپک کر بلا رکاب میں پاؤں ڈالے گھوڑی پر سوار ہوگیا۔ تنوں خاں کے بالا خانے پر پہنچا مگر کالج کا وقت تھا' دروازہ پر تالا پڑا ہوا تھا' اور کالج سے تو کہیں چار بجے سہ پہر کو واپسی ہوتی ہے' شہر میں کہاں انتظار کرتا۔ گاؤں کوس بھر کے فاصلے پر تھا۔ سوچ میں غرق شاہ گام چلتی گھوڑی کی پیٹھ پر لدا اک آدھ گھنٹے سے بھی کم میں چوپال پر پہنچ گیا۔

تنوں خاں نے اتنی خطیر رقم کیا کی؟ اور اب میں کیا کروں؟!....... راستے بھر بھی' اور چوپال میں پڑے ہوئے تمام دن بھی وہ دائیں بائیں پڑے ہوئے سوالوں کی آماج گاہ اس کا ذہن رہا اور وہ چوپال کی سب سے زیادہ متداخل کوٹھی میں چارپائی پر پڑا رہا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ کم از کم آج ہی تنوں خاں سے استفسار تو کیا جائے کہ اتنی بڑی رقم کہاں خرچ کی' کیا کسی کاروبار میں لگادی کیوں کہ ایسی بڑی رقم تو اسی راستے لگ

سکتی ہے۔

شام کے قریب اٹھا' گھوڑی کسی' سیدھا پھر شہر پہنچا تو تنوں خاں اور رفیق دونوں کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ مشہور ہے کہ "چور کو سوجتا (") دور سے دکھائی پڑ جاتا ہے"۔ دونوں ہی کو بزرگوار کے تیور استفساریہ نظر آئے' اور تھے بھی' تاہم بھولے دیہاتی اور محنتی کسان والے نرم ضرور تھے اور متعجب سے بھی۔ رفیق تو دونوں بھائیوں کو اکیلا چھوڑ کر چپکے سے سرک گیا۔ اور رفیق کے چھ ہفتے کے پڑھے سکھائے سبق کے آموختہ پر تنوں خاں کتب کے چٹ پٹے طالب علم کی رٹنے انٹرویو پر ڈر' خوف اور تو اور لحاظ ادب جیسے سب گرد میں لپٹی مرغی کی طرح پروں سے جھاڑ کر' مرغے کی طرح بانگ لگانے کے لیے داخلی پھرکی سی لے کر الرٹ ہو گیا۔ دلائل اور منطق مضبوط ہوں تو گونگا بھی بیرسٹر ہو جایا کرتا ہے اور تنوں خاں کو تو چھ ہفتہ سے رفیق "فی الفور" اور پر امٹ کر رہا تھا۔ حق و ناحق کا فیصلہ تھا اور پھر حق کا بھاری پلہ' ایمانی بات ہے تنوں خاں کی جانب جھکتا تھا۔ آں را حساب پاک است' از محاسبہ چہ باک' اصولی طور پر گوداموں کی موم پھلی اور آلو کا دانہ دانہ مشترک اور تنوں خاں کے حصہ کا ایک ہی تھا' مگر منطق قانون حق میں بیس سال اور چالیس فصلوں کے ایسے کتنے دانے کا حساب سردار خاں کے ذمے تھا؟ حساب جمع خرچ شام کے شام بند کرنے والے خزانچی آڈیٹروں سے نہیں جھجکا کرتے۔ تمام گھما پھرا کر جرح بحث پوری کرنے کے بعد اور سوالات کے جواب اور پھر جواب الجوابات میں قلب ماہیت ہو جانے پر بیس سال عمر میں بڑے ان پڑھ کسان بھائی کے پاس باوجود تمام تر بزرگی سن کے نوپڑھ بیس سال عمر چھوٹے بھائی کے اس بلنٹ سوالِ بے جواب کا جواب نہ تھا کہ "وہ اگر آپ کو مجھ سے ایک فصل کا حساب مانگنے کا حق ہے تو مجھے آپ سے چالیس فصلوں کا محاسبہ کرنے کا استحقاق ہے۔ لہٰذا انتالیس آپ پر بقایا ہیں۔" تھوڑے سے لفظوں کے ہیر پھیر میں بات اسی منطق کے تحت گردش کرتی رہی۔ نیز یہ کہ باپ کی آراضی میں کاغذات سرکاری کے اندر وہ نصف نصف کے قانونی مالک درج ہیں' اس پر نوبت آنے کی ضرورت تھی نہ آئی۔ اور رفیق نے تو اسے یہاں تک تیار کرا دیا تھا اگر وہ خود اپنے ہاتھ سے ہل جوت کر کھیتی کرتے ہیں تو بٹائی کے دستور قانونی کے مطابق اس کے حصے میں سے پیداوار کے نصف مالک ہو سکتے ہیں اور یوں چالیس فصل کا نہ سہی تو بیس فصل کی پیداوار کا حساب ان کے ذمہ باقی ہے' پھر وہ اکیلا دم' اور وہ ایک بیوی اور چار بچوں سے اخراجات میں شریک ہیں۔ اگر ایک فصل کی موم پھلی' آلو مانو اس نے ڈکیتی بھی مار لی تو کیا غم ہے پشت ہا پشت کی گرہستی ہے۔ ایسا کون سا کھنڈ سال کو دھکا لگ گیا جو ایک فصل بھر کی پیداوار کسی ادھنیت شریک کے حق میں پوری چلی گئی۔ بھابھی تو سوا سیر سونا اور ڈھائی سیر چاندی لاد کر خاندان میں تقریبوں میں جاتی ہیں۔

اور منطق و پیچ اکثر تلخ ہوتے ہیں اور بے جواب بھی۔ اور ہفت تلخیات کا مرکب تو گنتی ہے اور گنتی کے یاد نہیں ہے۔ کہتے ہیں جنگلی جانور بھی ادراک رکھتے ہیں اور ریچھ کے متعلق ماہرین زو آلوجسٹ کی تحقیق و یقین ہے کہ پورا بنگالی پروفیسر جادو ناتھ چکرورتی ہوتا ہے۔ اور علم الحساب

چکرورتی کی بالوں ڈھکی چلتی پھرتی اترتی چڑھتی کتاب ہوتا ہے۔ بڑا بھائی لاکھ ان پڑھ کسان سہی' کھیتوں کی پیداوار کے ساتھ ساتھ آڑھتیوں کے گوداموں کی امانت تحویل اور قیمت کا پائی پائی حساب سمجھ کر ہی رقم وصول کرتا تھا' اور کمیشن کرایہ وضع کرتا تھا۔ بازار کے بھاؤوں کے تمام اتار چڑھاؤ کا ان پڑھ شناسا تھا۔ پڑھے لکھے انگریزی داں بھائی کے سامنے باوجود تمام تر جسمانی' سماجی چند در چند فوقیتوں کے جواب بن نہ پڑا' سنانے میں آگیا۔ نقصان گراں مایہ کے ساتھ شماتت ہمسایہ تو سنی تھی' سہی نہ تھی' مگر یہاں حیرت بے پایاں کا دور دورہ تھا۔ کہاں گئی اتنی بڑی رقم؟ ہزار من جنس اعلیٰ آلو' موم پھلی کی قیمت! کہاں لے گیا؟ بیس سیر چاندی اور سوا سیر سونے بھر کا وزن!

منطق کے تمام تر اصول حتیٰ کہ وہ بھی جو فلسفی ایک کو دو ثابت کرتے ہیں اور زر اور یدہ دہنی کی حد تک پہنچی ہوئی حق گوئی کے ساتھ بولتے بھی ہیں خاموش' اور ستم مستزاد شبہ اور گومگو میں مبتلا گھر پلٹنا' کیوں کہ باوجود نوجوان کے تیوروں کا رخ پہچانتے ہوئے احتیاط کے ساتھ بات اسی کے گرد گھومتی رہی تھی کہ رقم کیا کی؟..... باپ تو برسوں سے پرانا مفلوج اور بستر پر دراز لاشہ محض تھا' سگی ماں جو اس کی اور چھوٹے بھائی کی مشترک توریث تھی' اس سے بھی آج روئیداد بیان کرنے کو منھ نہ پڑا اور محرم راز بیوی سے بھی کہنے کی ہمت نہ پڑی اور پھر بے کار تھا' یہ بے چاریاں بجز دعا کے کرتی بھی کیا۔ تاہم ٹوہ شدید رہی کہ رقم کہاں خرد برد کی اور کس راستے۔ یہ تو یقین تھا کہ کل تو کل جز بھی اب گانٹھ پلے نہیں ہے اور یہ بھی کہ ساری کی ساری یک مشت گئی ہے۔ اور گھوم پھر کر بحث و تمحیص میں پڑھے لکھے چھوٹے بھائی کا یہ جملہ کانوں کے اندر بازگشت کرتا رہا......

"ذرا دیکھیے کہ بیسویں صدی ہے' اور یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور آج کی دنیا میں کسی کو کسی کے ذاتی معاملے میں دخل در معقولات کا حق نہیں پہنچتا۔ نہایت ادب سے کہتا ہوں..."

اور سب سے بڑی بے ادبی' گستاخی' یہی جواب بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی کے معاملے میں دخل در معقولات تو معقولات' دخل در نامعقولات' اپنے حق کی تلفی اور ناحق کوشی معلوم ہو رہا تھا۔ رقم سے بھی ہزار گنا خسارہ۔ اور یہ صدیوں کا حساب کتاب بزرگ اپنے حق کے تلف میں طنزیہ تمام تر معمولات زندگی میں "چودھویں صدی ہے چودھویں" گھر گھرا کر حلق سے نکالا کرتے اور اسی مدت سن و سال کے ذریعہ بیسویں صدی کی ٹیک' اپنی "کروں" کے جواز میں نوجوان جواں سال کیا کرتے تھے اور اپنے حق ناحق سب حق کی سندیں عیسوی کے سہارے استعمال کیا کرتے تھے۔ اور جب یہ دونوں صدیاں چڑھی تھیں' تمام تر امور دنیوی میں حق ناحق کے فیصلوں پر یہ ہجری سنہ کے تقاضے کے سر تھوپ کر یہ نظیریں پیش کی جاتی تھیں۔ اور نادان بیس برس بزرگ بڑا بھائی نہ یہ تھا نہ وہ۔ وہ تو بل پھالے کھرپے ہنسلے والا کھردرا بھی نہیں جیسے کہ بالعموم ہوتے ہیں' چکنا مگر دھار دار کسان تھا۔ کھیت کی مٹی سے دست و گریباں رہ کر سونے کی کان کنی اور چاندی کی کیمیا گری کرتا تھا' جو جب سے قرنوں صدیوں کا ناپ گنتی شمار کے سانچے میں ڈھلا ہے' اس سے پہلے بابا آدم نے معلوم کرلیا تھا کہ ایک دانہ گندم کاشت کرو تو سو خوشہ والا

دانہ لیے پودا اگتا ہے۔ دو تین دن اسی طرح خواب و خور حرام سے چوپال میں پڑے گزرے۔ حویلی میں خیر کھانا کھانے گیا تو مگر بس ایسے ہی کھایا پیا تو کیا' زہر مار کیا۔ اور یہاں بھی وہی بپتی جو چھوٹے بھائی پر وہاں گزری تھی "لٹا ٹھگا بنیا مہاجن اور پٹا کٹا ٹھاکر راجپوت کسی سے کہا نہیں کرتا" اور تو اور بیوی اور ماں سے بھی برادر سلمہٗ کے کرتوت اور اس سے بھی بڑھ چڑھ کر منطق سے منطقی کی فریاد کرنے کو جی نہ چاہا۔ تاہم سرکاری سے لے کر نجی تک وجوب تو ادا کرنے ہی تھے۔ کھیتوں میں کھڑی پکی اگلی فصل کی کفالت پر اسی آڑھتی کے سامنے سود پر قرض کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ تاہم برادر سلمہٗ کی حرکت ساکھ کے تحفظ میں حق بجانب ہی رکھی۔ استفسار پر یوں ہی سا آئیں بائیں شائیں بہانہ بنانے کی کوشش کی تو منیم نے کچھ بتانے کی ذرا ڈرتے ڈرتے ہمت کی اور منیم تو سیٹھوں' آڑھتیوں کے یوں تو کمپیوٹر مشین ہوتے ہیں' مگر کمپیوٹر مشین کی جمع تفریق کے حساب کتاب کے ساتھ ریڈیو کی طرح "شر خبرے" قسم کی چیز بھی ہوتے ہیں۔ آڑھتی لالہ کوڑی مل' بکوڑی مل کے منیم جی کو مال نکالنے کے بے وقت اصرار اور ضرورت کی شدت سے' نوعیت ضرورت کے متعلق تو اسی وقت شبہ گزرا تھا' اور کام بڑھاتے بڑھاتے چھوٹے سے شہر میں اک ذرا چکر لگا کر انھوں نے نہ صرف تنوں خاں کی آج کی سخت ضرورت کا پوست کندہ سراغ لگا لیا تھا' بلکہ تنوں خاں کی اس سلسلے میں تمام تر تین سالہ ضرورتوں اور مصروفیتوں کا پتا چل گیا تھا۔ بڑے بھائی کو آڑھتی کی زبانی تمام کی تمام آنکھوں دیکھی جیسی گوش گزار کرا دیں' اور اب شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ سبزی منڈی کے سبزی فروشوں سے دس بیس سے پچاس سو کے اندر اندر لی ہوئی رقموں کا حساب بھی آپوں آپ حل ہو کر بڑے بھائی کی سمجھ میں آگیا۔ روزِ اوّل سے لے کر آج تک کی ہفتہ بھر کی روئیدادِ غم چپکے چپکے گھر میں رو رو کر ماں سے بیان کی۔ اور اتفاق سے آج پندھرواڑے کی جنس لینے تنوں خاں کا شہر سے گھر آنے کا دن تھا۔

منیب جی کی رجسٹری شدہ دستاویز اور وید گیتا جیسی سچی سنی چپکے سے بڑے بیٹے نے رو رو کر ماں سے بیان کی ماں پہلے تو خواری پر چپکے چپکے روئی۔ اور دیہاتی کہاوت ہے "چور کی ماں کنھیا کے آنے میں منہ دے کر روتی ہے۔" بیٹا دوسرے روز جنس لینے گھر آیا تو ماں نے چھان پھٹک کر جنس باندھی اور ماں والے انداز میں بھول گئی' چکلہ کا تو خیر حوالہ نہ دیا' البتہ رو رو کر باپ برابر بڑے بھائی سے گستاخی کرنے اور آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے پر مادرانہ انداز میں تادیب کی۔ موم پھلی اور آلو کے بھرے گودام پانی کے مول بہا دینے کا بھی حوالہ نہ دیا' وہ تو مابہ النزاع ہی تھے' ضرورت نہ سمجھی' تو ماں کی محبت پیار بھری آنکھیں بیٹے کی شہد بھری آنکھڑیوں کے بجائے بس بھرے ضابطہ کے تیوروں سے دوچار ہوئیں' جو ماں بیٹے کی دنیا کی تاریخ میں شاید پہلا موقع تھا۔

"دیکھو اماں یہ میرا ذاتی فعل اور میرا اپنا معاملہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں میرا اپنا مال تھا' یہ بھی جو میں آج اس کٹھار سے لے جا رہا ہوں' اور وہ بھی جو وہاں آڑھت کے گودام میں بند تھا۔ ابا پندرہ برس پہلے آدھی آراضی میرے نام منتقل کر چکے ہیں اور اس پر دو دا اپنے ہاتھ کاشت کرتے ہیں' بلاشبہ وہ میرے حصے میں

زیادہ سے زیادہ آدھ بٹائی کے حق دار تو ہو سکتے ہیں' لیکن چالیس میں سے ذکات ریٹ ایک فصل کی پیداوار کل اگر میں نے اپنے تصرف میں لے لی ہے تو چالیس فصلیں ان کے پاس رہی ہیں۔ پھر آپ یہ تو دیکھیں' میں اکیلا ایک فقط دم' اور وہ ایک بھابھی اور چار بچوں والے' پانچ دموں سے۔ اور اماں یہ تو دیکھو میرا تمھارا کئے دن کا ساتھ ہے' انھیں ساری عمر اسی آراضی سے پیدا کرنا ہے اور مال مارنا ہے میرے حصہ کا بھی۔ اور میں دنیا بھر میں نوکری کرتا آج یہاں کل وہاں خانہ بدوش پھروں گا۔ سب کچھ انھیں کے لیے تو ہے۔ ان کا کام عمر بھر کھیتی کرنا' ہل چلانا اور میرا کام یہی دو چار سال اور کتابوں سے سر کھپانا اور پھر قلم رگڑنا ہے۔ میں ان کے معاملے میں آج یا کبھی دخل دینے آیا' آتا ہوں یا آؤں گا بھی۔ آپ لوگوں کو میرے معاملہ میں دخل دینے تو درکنار دریافت کرنے کا بھی کیا حق ہے۔ میں انھیں بھی جواب دے چکا اور آپ سے بھی کہتا ہوں کہ اگر وہ مجھ سے ایک فصل کی پیداوار کا حساب مانگتے ہیں تو چالیس فصلوں کا حساب مجھے دے دیں۔ اور اگر میں چاہوں تو قانونی بٹوارہ کر کے اپنی آراضی کے جریب گٹھے علاحدہ کر سکتا ہوں' تو پھر؟ ایں ذرا سوچیں تو......."

ماں چپ رہی' بٹوارہ' جریب گٹھے پر چونکی اور گلوگیر آواز میں بولی......"بیٹا سنا ہے تم' تم کو تو نگوڑا کالا پانی پینے کی لت لگ گئی ہے' دین سے گئے......."

اور ماں کے منہ سے بات لے کر کہا......

"پہلے تو غلط سب جھوٹ' اور پھر اگر ہے' تو یہ بھی میرا ذاتی فعل ہے۔ میں کسی کے منہ میں انڈیلنے تو نہیں آتا۔ اور دین سے گیا میں' آپ میں سے کوئی نہیں۔ اٹھوارے کے اٹھوارے تمھارے گھر میں کھانے بھرے کا آٹا لینے آجاتا ہوں۔ مہمان بھی نہیں' آئے گئے ملاقاتی داخل۔ سو دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں' چاہو میرے برتن علاحدہ کر دو' ورنہ کہو تو میں خود ہی نہ کھایا کروں' اگر تمھارے ایمان میں خلل پڑتا ہے' اللہ مجھے غارت کرے اور تمھیں نیک توفیق دے میرا پیچھا چھوڑو' بابا تم لوگ......."

اللہ غارت کرے پر ماں کا دل موم کی طرح پگھل گیا اور بیٹا یہ جا وہ جا۔ دروازہ پر چھکڑا کھڑا تھا' چمار نے خود ہی جنس لادی اور شرکی جانب چھکڑا ہنکا دیا۔

مگر ممتا کی ماری اندھیاری چڑھی ماں' جو اپاہج شوہر کی بیوی ہونے کے سبب ماں کی ماں اور باپ کی باپ تھی' بے چین ہوگئی اور ماں تو نہ معلوم دل کے کس کونے میں چھپ گئی' دماغ سے باپ بیدار ہوگیا۔ اور عورت ہر وقت پر مرد کا سہارا ڈھونڈتی چلی آئی ہے۔ جواں سال بڑا بیٹا ناکام رہا تو بات ایک چنا دو دال زمین کے بٹوارے تک آ پہنچی' جو دیہات میں دلوں کے بٹوارہ کے مترادف ہوتا ہے اور محبت' یگانگت' صلۂ رحمی کی قینچی کے بعد علاحدگی' دوری' خصومت' مخالفت اور پھر کترنیں دشمنی کے مختلف النوع ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ اور اسی نوعیت کے مدارج سے بہن اپنے بھائی کے ساتھ گزر چکی تھی۔ لیکن بہن تو بہن ہوتی ہے اور مصیبت میں خدا یاد آتا ہے' یا اللہ تعالیٰ کسی طاقت کی جانب مغلوب مصیبت زدہ کی توجہ مبذول کر کے اپنا رول اسے ادا کرنے کی توفیق دیتا ہے اور یوں اپنے مسبب الاسباب ہونے کا مظاہرہ

کرتا ہے۔ اور ماں کو اپنے پیارے بھنیے خاکسار خاں یاد آئے' جو چودھویں صدی کے خاص شاکی تھے اور شاید یہی بیسویں صدی کا توڑ کر سکیں۔ مگر ان سے تو عمر بھر دشمنی کے مظاہرے اور بٹوارے کے مقدمے لڑتے رہے تھے اور اپنے شوہر کے بڑے وقت میں فوج داریاں اور آراضیوں پر دخل قبضہ کے معرکے ہوئے تھے۔ تاہم بہن کے ساتھ بچپن کے گڑیاں کھیلے سہیلے اور بھانجے کے ساتھ آتی پاتی کبڈی کھیلے ہوئے تھے۔ پھر بچپن کی دوستیاں' لڑکپن کی یاریاں' شب برات کی پھلجھڑیاں' مہتابیں' پٹاخے اور دیوالی کے میٹھے میٹھے کھلونے' دیے ہوتے ہیں' جوانی کی صبح طلوع ہوتے ہی صبح کے تارے کی طرح جھلملا کر غائب ہو جاتی ہیں اور دن کے سورج اور روز روشن کے سپرد کر جاتے ہیں۔ اور بیا میں تو آج بھی خیر صبح کے تارے ہی کی طرح سہی' مگر جھلملاہٹ نظر آتی تھی اور سردار خاں کے بعد اب اس کے دونوں ننھے منے بیٹوں کے یار تھے اور اس کی دونوں ننھی بیٹیوں کے سہیلے۔ اور انھیں معصوم بھاپ کے پردے اور ہوا کے دامن جیسی غیر مرئی سی پردوں کے سہارے بہانے' بہن نے بھائی کے سامنے دستِ استمداد بڑھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

بیا تو کئی سال سے تائب سے ہو چکے تھے۔ اور فجر کی اذان کے فاروقی تحکمانہ انداز میں ساری عمر کی قابو یافتگیوں کے مزے لوٹ لیتے تھے اور اپنی قرأت کی غنائیت سے صبح ہی صبح بستی کی فضا بھر دیتے تھے اور تمام کے تمام علائق سے بے نیاز ہو کر پانچ وقت با جماعت نماز کے جھتے بند رہ گئے تھے۔ عشا کی سترہ رکعتیں پڑھ کر جب چوپال میں آ کر بستر پر دراز ہو گئے اور حقانی خلیفہ' سونے اور جاگنے کی درمیانی حالت میں پاؤں دباتے دباتے چپکے سے پلنگ سے اتر کر چلا گیا' تو کچی نیند میں کسی کھٹکے پر چونکے۔ آنکھ کھولی تو دیکھا کہ بچپا کی بیٹی عائشہ بی کھڑی سسکیاں لے لے کر رو رہی ہے۔ باہر چبوترہ پر ڈولی رکھی ہے اور کہار کھڑے ہیں' ان کے چونکتے ہی بہن کی سسکیاں ہچکیاں ہو گئیں اور عورت کے آنسو' مرد کسی روپ میں ہو' باپ' بھائی' بیٹے' شوہر' بھانجے بھتیجے اپنے طوفان سیلاب میں ہر کسی کو بہالے جاتے ہیں' چہ جائیکہ سسکیاں ہچکیاں اور بہن کی اور بہن بھی چھوٹی۔ ٹھنڈے برفانی چارمنی وزنی سل بھائی نے بہن کی نالش فریاد پر بغیر سمجھے ہی تڑپ کر بستر سے اپنی سوا چھ سیری باپ والی لاٹھی کی جانب ہاتھ بڑھایا اور بولا.....

"کہاں چلوں؟ ہیں بہن تم کیوں آئیں؟ کسی ماما' مہری کے ہاتھ کہلا بھیجتیں! کہاں چلنا ہے؟"

غوں' غائیں' غاؤں شیر کی سی مخصوص آواز نکالی' گویا مدد کا ساتھی دستخطی معاہدہ' وعدہ کا کاغذ بہن کے ہاتھ میں دے دیا۔

"بھیا تمھارے سامنے آج عمر بھر میں ہاتھ بڑھانے آئی ہوں' دو بیٹیاں بیاہیں' ایک بیٹا بیاہا' کبھی ڈھول دھر کر حق حقوق بھات جوڑا گہنا مانگنے دنیا جہاں بھر کی رسم نہ آئی۔ آج تم پر نظر پڑی ہے۔ تواں بگڑ گیا' وہاں شہر میں (آواز اور بھی گلوگیر ہو گئی) اسے تم ہی ٹھیک کر سکتے ہو۔"

بیا تو بیا تھے اور ماموں بچپا تایا' پھوپھا' خالو والوں یاں سے واں تک سب کے بیاہی بیا اور اپنے کسی

ایک کے بھی باپ نہیں۔ ان کے اندر والا محروم "باپ" بہن کی پکار پر انگڑائی لے کر اٹھا مگر دوسرے کینہ پرور بنی عمام کمینہ دیو نے دونوں کندھے دبا کر جہاں کا تہاں بٹھا دیا۔

"اے غم کھا ذرا' آج مرتے وقت وصول ہو رہی ہے' زندگی کی قیمت عمر بھر کی حسرت پوری ہو رہی ہے۔"

تاہم بہن کو بھائی نے بس بھرے ہونٹوں تلے شہد سا چاٹتا ہوا دلاسا ہی دیا۔ مگر اندر والا پرانا کینہ کمینہ بھی حلق پیٹ سے اچھل کر نوکِ زباں تک آ گیا۔

"مگر عائشہ وہ کہاں ہیں ہمارے باپ کے داماد بہادر' ہمارے بہنوئی' خاں صاحب گھمن خاں؟؟"

بہن سٹ پٹا گئی' الفاظ کا مفہوم مع شرح بست کے اچھی طرح سمجھتی تھی' بہن بھائی' شوہر اور کون کون ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ بغلیں سی جھانک کر حلق صاف کرتے ہوئے جیسے کسی اور کے منھ سے بولی......

"ایں' وہ' واں' اوں آں تم انھیں کہہ رہے ہو' سردار کے ابو کو۔"

اور پھر ذرا چنچنی ہوئی آواز میں بولی۔

"چلو خیر تم نے پوچھا تو' عیادت خیریت کی توفیق نہ ہوئی' ویسے قبرستان قبرستان مارے مارے پھرتے ہو۔ تم تو شاید ان کے دفن میں بھی نہ آؤ۔ بہنوئی ہوتے ہوئے آج تک دس برس سے بستر پر پڑے ہیں' آنکھیں کھلی ہیں' پیشاب پاخانہ کی چوکی بستر پر لگتی ہے' مغزہ گوشت ہیں' زبان گنگ سی ہے۔"

اور اندر والے کمینہ اور کینہ نے یک جان ہو کر کہا۔

"اور خاندان کی ناک کٹانے کو عورت ذات کی ڈولی چوپال پر یہ کہار لا سکتے تھے جو کبھی پشتوں میں نہ آئی' انھیں بانسوں میں ان خان بہادر کی چارپائی باندھ کر لانے میں کیا ان کے کندھے ٹوٹ جاتے......"

بہن سمجھ گئی کہ چیز ہے انتقام' مخالفت کے بجھ ادھار و اور قرضے کے لین دین کا معاملہ ہے' یہ چکانے اور انھیں سکوں میں پھیرنے کے درپے ہیں۔ الٹے پاؤں پلٹ گئی اور دشمن کے مقابلہ پر مرتے ہوئے دشمن کی انا کو شکست دینے کی خواہش اور مدد کی قیمت سے آگاہ کیا۔ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ اور شوہر معا" سمجھ گیا۔ چٹیل بلکہ مرے گرے ٹوٹے لہراتے بنی عمام ناگ کا سر اور کچلنا چاہتا ہے اور ساری عمر کی مخاصمتوں کے انتقام کا میزان کل آخیر وقت پر "سو سنار کی ایک لوہار کی" ضرب لگانا چاہتا ہے' بنی عمام ہے نا......!

اور دوسرے روز جمعہ تھا' گھمن خان مدتوں سے کسی بھی نماز کے لیے عید گاہ میں جانے کے قابل نہ رہے تھے مگر خطبہ سے قبل خواہش کے مطابق ان کی چارپائی مسجد پہنچا دی گئی اور مسجد کے فرش پر پورے اجتماع کے اندر انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو عاق کرنے اور محروم الارث کردینے کا عام اعلان کیا۔ تمام بستی اور اطراف میں چرچے ہوئے' جتنے منھ اتنی باتیں' بعض نے اسے بڑے بیٹے سردار خاں کی سازش پر محمول کیا' کچھ نے اس کا سبب انگریزی پڑھنے بھیجے جانے اور کافر کا علم پڑھنا قرار دیا۔ چند روز چرچے ہوئے اور گاؤں کی مصروف زندگی میں موت کا مہیب عمل بھی چند ہی روز ذہنوں کی بازی گاہ رہتا

ہے' یہ تو ایک گھر کا اور ایک شخص واحد کا ذاتی' اپنے گھر کا اندر کا مسئلہ تھا۔ مگر دیہات کے اندر ہر ذات ہر ایک کی صفات ہوتی ہے اور تمام کی تمام بستی خلوص کے تحت ایک گھر ہوا کرتی ہے۔ چار دیواریاں قد آدم اور چھتیں ایک صحن سی ملی ہوتی ہیں۔ سب کے سب دوش بہ دوش و یک دل ہوتے ہیں۔ شہر کا بڑا محلہ یا ایکڑوں میں پھیلی ہوئی سول لائنس ایریا نہیں ہوتی۔ پھر مسجد کا اور جمعہ کا اعلان' خدا کے روبہ رو مخلوق خدا کے نزدیک تصور ہوتا ہے۔ دفتر رجسٹری کا تمسک یا دیوانی عدالت کا فیصلہ بے چارہ اس کی گرد کو نہیں پہنچا کرتا۔ اگرچہ اصل واقعہ کی نہ کوئی توجیہہ تھی نہ ضرورت ہی' دیہاتی بھولی بھالی سوسائٹی میں سیدھی سادی بات تھی۔ طلاق و اعاق اختیاری مگر مکروہ امور ہیں' تاہم ہر شوہر اور باپ کے اختیار میں ہیں۔ مسلمان اپنی املاک کا مالک قطعی ہے جسے چاہے دے جسے چاہے نہ دے۔ گھمن خاں نے اپنا چھوٹا بیٹا محروم الارث اور خارج از میراث کیا' تمام علاقے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جتنے منھ اتنی باتیں' ادھر انھوں نے صبح ہی صبح قانونی شکل دینے کے لیے حلقہ کے کچہری دلال منشی امبکا پرشاد کالیستھ کو بلا کر رجسٹری آفس کے اسٹامپ فروش سے جنرل اسٹامپ برائے تحریر وثیقہ عاق نامہ منگوا لیا تھا۔ اور رات گئے تک بستی اور تمام دن گاؤں نواح میں جمعہ کی نماز کے اس واقعہ کے چرچے رہے' پھر بات گاؤ آمد خر رفت ہوئی' خاموشی و فراموشی ہو گئی۔ نماز میں بیا بھی شریک جماعت تھے' ان کی نشست مسجد کے اندر جمعہ کی جماعت میں مخصوص ہوتی تھی۔ لوگوں نے گھمن خاں کے اعلان میں ان کی چارپائی کے قریب جا کر کچھ سوالات کیے اور دریافت وجوہ بھی کیے مگر مریض سے تشفی بخش جواب نہ ملا' مگر بیا چپ چاپ اپنی نشست پر باوضو بیٹھے رہے اور جماعت کھڑی ہونے پر نماز ادا کر کے اپنی چوپال پر آبیٹھے۔

رات کے شروع حصے میں بیا بچی نیند سے چونکے' چوپال کی سیڑھیوں پر کھٹ پٹ تھی۔ بستر پر اک ذرا اچک کر دیکھا' آج بجائے بمن ڈولی کے بھنوئی کی چارپائی کا بندولا کہار بانسوں میں لٹکائے نظر آئے۔ اللہ کا شکر ادا کرتے تڑپ کر بستر سے جا پڑے۔ دشمن دست سوال و دستِ استمداد بڑھائے اپنی ازلی و ابدی انا پامال کیے سامنے تھا۔ قریب پہنچ کر واجبات ادا کیے' تاہم رسمی منافقانہ الفاظ ادا نہ کیے۔ "تم کیوں آئے' مجھے بلوا بھیجتے۔" کیوں کہ وہ کبھی ایسا نہ کرتے خواہ موت ہی کا سامنا کیوں نہ ہوتا کہ گھمن خاں کے دروازہ پر جائیں۔ گھمن خاں کا سانس لیتا' مردہ سامنے تھا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی رو پڑے' تو یہ بھی آنسو لائے' مگر پتا نہیں کہ کون سے' آدمی والے یا مگرمچھ کے۔ اور یہ تو خاکسار خاں کی دلی آرزو تھی کہ رو کر عرض حال کریں' جو اس مبارک گھڑی پوری ہوئی تھی۔ تاہم اپنی فطرت کے مطابق انھوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کہاروں سے کہا کہ چارپائی اندر اپنی چارپائی کی پٹی سے پٹی ملا کر ڈال دیں اور خود نیچے والی سیڑھی پر گلی میں بیٹھے رہیں۔

ساون بھادوں تو ملتے سے تھے' مگر اس گھڑی جیٹھ اور جیٹھ اساڑھ ملے۔ دکھ درد کی ہوتیں تو فہرست بہت لمبی تھی' اندازہ ہی ہو سکا' بات چل نہ سکی ورنہ دفتر کھل جاتا تو مرغا بول جاتا' ختم نہ ہوتا۔

آمدم بر سر مطلب، گھمن خاں نے تکیے کے نیچے سے ایک سادہ براق شیٹ جنرل اسٹامپ برآمد کیا جس کے حاشیہ پر "العبد" میں ان کا نشانی انگوٹھا ثبت تھا۔ بڑھاتے ہوئے استدعا کی کہ تم اس پر "گواہ شد" میں اپنے دستخط کردو۔ ذہین خاکسار خاں معاً سمجھ گئے کہ یہ جمعہ کے اعلان کی قانونی تحریری کارروائی ہے، اور طوفان نوح والے واقعہ کی تکرار ہے کہ کنعان ان کا بیٹا نہیں ہے۔ ذرا سٹ پٹا کر سنبھلے اور جواب میں منشی ابکار پرشاد والی حلقہ کے مشیر قانونی کو مغلظات گالیاں دینے لگے۔ اسی نمک حرام کے مشورہ سے یہ کام سرانجام ہو رہا ہے! مسجد کی خبر سن کر (کالی) خود ہی سمجھانے پہنچ گیا ہوگا۔ گھمن خاں بولے۔

"نہیں نہیں میں نے خود ہی اس کے گاؤں سے صبح تڑکے بلوایا تھا اور جب مسجد پہنچا ہوں تو جنرل اسٹامپ کا کاغذ شہر سے اسٹامپ وینڈر سے آچکا تھا اور اب وثیقہ نویس سے تحریر اور رجسٹریشن باقی ہے۔ کل ہی رجسٹرار معذوری کے قانونی عذر کی بنا پر گھر آکر اقرار نامہ، عاق نامہ کی رجسٹری کرے گا اور علاقے کے سربر آوردہ ترین لوگوں کی اس پر گواہی ضروری ہے اور میں تمھارے دستخط لینے یہاں آیا ہوں......"

"ہوں تو یوں کہو یہ عاق نامہ کیا، سب قصوروں کے ساتھ میرے سامنے گواہی کے لیے آنے اور ہاتھ پھیلانے کا بھی کفارہ ہے، اور جو شاید مرتے وقت تمھیں موت کے گھونٹ سے بھی زیادہ تلخ ہے، ہے نا؟"

"دیکھو خاکسار خاں ہم تم ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، بغیر تمھاری گواہی کے رجسٹرار ایسے تمسک کو شاید قبول نہیں کرے گا۔ ویسے میں تمھارے پاس اس نامراد کو ٹھیک کرانے کے لیے بھی تمھاری بہن کے ساتھ آسکتا تھا، مگر وہ تو بہت دور نکل گیا۔ واپسی محال ہے۔ بات بھی کھوئی التجا کرکے، بد نصیب۔ ان کری سب کر گزرا اور ان کی تمام کہہ چھوڑیں۔"

خاکسار خاں نے جھینپ کے ساتھ پینترا بدلا اور بولے۔

"تو یوں کہو یہ عاق نامہ میرے سامنے ہاتھ پھیلانے کی پاداش میں بھی ہے! چہ خوش لاحول ولا قوۃ...... بھیا میرے لال خاں نے ساری عمر اونٹ بٹھائے ہیں اور ہرن ریتائے ہیں۔ یہ لونڈا کتنی دور نکل گیا۔ شہر تو اپنے گاؤں سے ایک کوس بھر پر ہے، اس کی ہماری سرحد ہے۔ کوس بھر کا آگا عرصہ سہی، دیکھیں پکڑ ملتا ہے یا نہیں........"

اور پھر آواز میں اپنائیت، رقت کا انداز پیدا ہوگیا۔

"بھائی (بیوی) تمھاری بھاوج کو سورۃ ابراہیم پڑھتے پڑھتے اور حضرت سارہ کو بخشتے چالیس برس گزر گئے رونے کا مقام ہے، ساٹھ پینسٹھ کی عمر کو جا لگیں اور آج تک نگی کوکھ ہری ہو جانے کی آس لگائے ہوئے ہے۔ ہم تو اس میٹھے پھل کے مزے ہی سے نا آشنا ہیں جس کی کڑواہٹ آج تمھارے حلق میں رچی ہوئی ہے اور تم جسے اپنے جسم سے علاحدہ کرنے کی قانونی کارروائی میں مجھ سے شرکت کی امید لے کر آئے ہو۔ میاں سمجھو تو "عاق" اور "طلاق" زبانی عمل ہیں، ان کے لیے نوک زباں سے ادا کردینا ان کا ہوجانا ہے۔ تم نے پدریت سے محروم کردیا اور بیٹا پسریت سے خارج ہوگیا۔ تمھارے اپنے بخشے ہوئے لق ودق زرخیز چک، اونچی چوپال، اثاث البیت بھری حویلی، بھرا گو خانہ اصطبل، یاں سے واں تک پھیلی سات پشتی گھر

گرہستی سے محروم ہوا اور تمھاری دعاؤں کی یاد سے "بھول" اور تو اور نو مہینے پیٹ میں اور آج انیس برس پیٹ سے باہر نکال کر پالنے والی ماں کا بیٹا بھی شاید نہ رہا۔ البتہ دکھتے درد والے دانت کی طرح اس کی زبان وہیں رکھی رہے گی۔ اور تم کہتے ہو بدنصیب شراب پینے لگا ہے' دنیا سے یوں گیا' دین سے یوں' گھر کے اندر پینے کے برتن علاحدہ نہ ہوئے تو گھر بھر کا ایمان لے بیٹھے گا' بدنصیب۔ دونوں دین سے گئے پانڈے' کھیر ملی نہ مانڈے۔ ویسے تمھیں اختیار ہے اور سادہ کاغذ اور اسٹامپ پر انگوٹھا لگا ہی چکے ہو' کل وثیقہ عاق نامہ مرتب کرا کر رجسٹری کرا دو۔ مگر میں نے تو اسے چھٹی چھلوں اندر پوتڑوں سے چوپال میں اٹھا اٹھا کر پیار کیا ہے۔ تم سے دشمنی کی خلشوں کے اور اس سے دوستی کے مزے لوٹے ہیں' اس کی سماجی موت کے کاغذ پر گواہی کس قلم سے ثبت کروں؟" آواز روہانسی ہو کر گلوگیر ہوگئی اور پھر سنبھل کر بولے۔
"بابا مجھے معاف کرو' بستی علاقے میں اور بھی روادار لوگ ہیں ان کی گواہی کرا لو نا...... جو تم کرو' تم کرو' جو میں کروں مجھے کرنے دو۔"

"ہوں یہ تو مولازادوں کا پرانا انداز ہے کہ دشمن سے ہاتھ پھیلا لو' اور دھتکار دو' ہے نا یہی خاکسار خاں' اور تم نے اپنی بہن سے کہلوا کر مجھے بلوایا اور اس وقت گھر بلا کر دھتکار کر ذلیل کیا۔"
"لاحول ولا قوۃ! یعنی عجیب آدمی ہو تو کیا میں نے تمھیں یہ ناپاک مکروہ کاغذ لے کر بلایا تھا اور یار تم بھی میرے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لیے یہ جوتا الٹا میرے منھ پر رسید کرنے آئے ہو کہ اگر آنا پڑا تو اس آن بان شان سے کہ جڑ ہی کاٹ دی نخل آرزو کی۔ دیکھو ہم تم ایک دوسرے کو خوب پہچانتے ہیں۔ یہ انتقام ہے' مجھ سے' یا پھر اپنے بیٹے سے' یا کس سے؟ بہرحال یہ انتقام ہے' تم کاغذ رجسٹری کراؤ' بہ بانگِ دہل عاق نامہ کا علاقہ بھر میں ڈھنڈورا پٹواؤ' بیٹا تمھارا ہے' میں باپ نہیں۔ البتہ اگر میرا بیٹا ہوتا تو میں ایسا نہ کرتا کہ جیتی زندگی مردہ اعلان کردوں کہ مرگیا۔ میں نے تو عمر بھر بھٹکوں کو کان پکڑ پکڑ کر سیدھی راہ دکھلائی ہے۔ بلاشبہ پچھاڑے بھی ہیں اور پھٹوں کو جوڑ پیوند بھی لگائے ہیں۔ میں نے تو دور پہنچے ہوئے پچھیرے بھی ہیں اور دسیوں کو زندگی سے دور بھی کیا ہے۔ اپنا تو عمر بھر کا یہی کھیل ہے۔ آج تم مونچھیں کھڑی کیے میرے سامنے ہاتھ پھیلانے آئے ہو اور خاکسار خاں انھیں پھر نیچا کر دکھائیں گے اور اپنی چڑھی داڑھی کھڑی مونچھیں اونچی رکھیں گے' انشاءاللہ۔ ہاتھ پہ ہاتھ مارو قولِ مرداں جان دارد......"
اور نیچے والی سیڑھی پر سے کہار اوپر آئے اور گھمن خاں کا بنڈولا اٹھا کر گھر پہنچا آئے۔

جب سے مصلّی تسبیح پکڑی اور آبائی سواچھ سیری لاٹھی کونے میں کھڑی کی تھی "خان مکانی" "ٹھاکر چوپالی" ہو کر بیا چوپال کی چودہ سیڑھیاں اتر چڑھ کر گلی بیچ بستی کی مسجد تک جایا کرتے اور موذن سے فجر کی اذان کی سعادت اور تحکّم فاروقی کا مزہ لیتے ہی مطمئن ہو جایا کرتے۔ البتہ دوپہر کا کھانا کھا کر چوپال سے ظہر کی طویل نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تو درود وظائف ذکر میں عصر پڑھ کر پلٹا کرتے اور چوپال میں بستر پر اک ذرا کے ذرا اونگھ لیا کرتے۔ تاہم چند روز سے انھیں جیسے کچھ کریدی سی تھی' کچھ اسی نوعیت کی عجب

سی آرزو جس میں حویلی کے اندر ناقص العقل بوڑھی بیوی آج تک حضرت سارہ سعدیہ کو پڑھ پڑھ کر بچپن ساٹھ کی عمر میں بخشا کرتی۔ ایسی ہی مبہم سی تمنا بیا کے دل کے کونوں کھدروں میں کہیں نامعلوم سے انداز میں رو رہا پڑتی تھی' اے کاش مجھے خالقِ کائنات نے ایک بیٹے کی نعمت سے بھی نوازا ہوتا۔ اور میری توریث کا سلسلہ بند نہ کیا ہوتا۔ اور ایک روز عصر کی نماز پڑھ کر درود وظائف ورد کر فارغ ہو کر نکلے تو سب نمازی جماعت پڑھ کر جا چکے تھے' گلی خالی تھی' یک دم ایک چھکڑا سامنے سے آتا نظر آتا اور پیچھے پیچھے اسی رفتار آہستہ آہستہ ایک سائیکل سوار ہمشیر زادہ تنوں خاں تھا اور آج ہفتہ پندھرواڑے کی جنس لینے گھر آیا تھا۔ اگرچہ شدہ شدہ کان تک عاق نامہ مرتب ہونے اور مسجد کے اعلان کا حال کان میں پہنچ چکا تھا' چھکڑا تو گزر گیا مگر تنگ گلی میں بیا بھانجے کا راستا روک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ تو آہستہ پیڈلنگ کر ہی رہا تھا' بیا نے بڑھ کر اگلا پہیہ اپنے پاؤں کے قطب لاٹ اور رائے پتھورا کیلی کے درمیان دبا لیا اور دونوں ہاتھ کے شکنجے میں دونوں ہینڈل بریک دبا لیے۔ اور حیرت ہوئی نوجوان نے بیا کی عقاب ساں آنکھوں سے آنکھیں چار کیں۔ خیر بھانجا تھا' بچپن کی آنکھیں چومے۔

''میاں ٹھہر جاؤ' تلاش میں تھا' کچھ کہنا ہے۔'' بیا نے بہ کمال نرمی کہا۔

''فرمایئے' فرمایئے' جنس لیے جا رہا ہوں' چھکڑا آگے ہے۔ شہر میں بے جا بھٹکتا پھرے گا......''

اندازِ عجلت سے بیا کا متاثر ہونا بھی فطری امر تھا' ورنہ کہتے ٹھہرو' اوپر چوپال پر بیٹھ کر بات ہو گی' اطمینان سے' مگر دو ٹوک کے لیے بیا برجستہ اور دو ٹوک بھی تھے' میٹھے تیوروں سے نوجوان کو مخاطب کرنے کے سلیقہ سے کماحقہٗ واقف بھی تھے' میاں یہ موم پھلی' آلو کی کیا مطعونیت ہے' بھائی سے بٹوارہ کی دھمکی کا کیا معاملہ ہے' مال بے بھاؤ کیوں بیچا؟..... رقم کہاں خرد برد ہوئی؟ شہر میں کیا مشاغل ہیں؟ یہ شراب نوشی کی افواہ اور کیا کیا' نہ معلوم کیا خبریں ہیں۔ کچھ سنا ڈھنڈورا پیٹ کر' تمہارے باپ نے کیا اعلان کرایا ہے؟ منوں جنس کا یہ بھرا چھکڑا تمہارا نہیں ہے' جو اماں نے کٹھار میں سے نکال کر لاد دیا ہے' یہ لوٹ کا مال ہے' اور تم پر دانہ دانہ حرام ہے۔''

بیا شاید سہولت سے بھی یہ تمام کہہ سکتے تھے' لیکن عجلت اور سہولت میں ازلی بیر ہے' ورنہ بیا بات کرنے کے فن سے بھی واقف تھے۔ اگرچہ چوپال پر مونڈھے کے اوپر آمنے سامنے بات ہوتی تو سب کی سب یوں انڈیل دیتے' مگر وہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا اور اسی رفتار بیا کو بات چلا کر گوش گزار کرنا تھی۔ اور یہ جانبین کا تجاہلِ عارفانہ تھا' ورنہ تنوں خاں بھی خوب سنے ہوئے تھے' ذرا نہ جھجکا' برجستہ دو ٹوک جواب دیا۔

''بیا میں تو اس بستی کیا سارے علاقے کا سمجھ دار بزرگ وار آدمی آپ کو سمجھتا تھا' کم از کم آپ سے ایسی بے تکی پوچھ گچھ کی توقع نہ تھی۔ دیکھیے بیا نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں' یہ میرا ذاتی معاملہ ہے' آپ کو یا کسی کو' میں سمجھتا ہوں ددا' اماں کو بھی میرے ذاتی معاملہ میں دخل در معقولات کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ بیسویں صدی ہے' دیکھیے نا اب آپ میری سائیکل کا پہیہ دبائے' شکنجہ کسے ہوئے ہیں' کہاں تک

درست ہے؟ دنیا بہت آگے گئی۔ بنیے راستا چھوڑیے' نہایت ادب سے گزارش ہے......"

ببا کے منھ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ اگر بے ادبی سے گزارش کرو گے تو کیا کرلو گے سائیکل کا پہیہ دبا کر جیاتی کردوں گا' ورنہ ہینڈ بریک سیدھا نکا سلاخ۔ مگر نیچے سے اوپر تک تمام کی تمام فولادی گرفت سائیکل کے بیرنگ اک ذرا ذرا پیچھے کو گھومتے ہی ببا کے فولادی شکنجہ سے نکل گئی' اور اک ذرا کترا کر دو پیڈلوں میں لمبی گلی کے اندر یہ جا وہ جا'...... اور گلی تو گاؤں سے باہر کھلیان کے بنجر سے ملی ہوئی تھی اور پھر کھلیان کا بنجر تو ہر گاؤں کے اندر کھیتوں چکوں سے ملحق ہوتا ہے۔ ببا چند ساعت کھڑے دیکھتے رہے' یہاں تک سائیکل اور سائیکل سوار اس لکیر میں غائب ہوتا نقطۂ موہوم ہوگیا' جہاں زمین آسمان ملتے نظر پڑتے ہیں' اور جو دور بہت دور ایسی دوری کا سلسلہ ہے جو جتنا بڑا ہو اتنا ہی دور رہتا ہے' اور وہ دیوارِ قہقہہ ہے جہاں کا گیا پلٹا نہیں۔

"ارے' ارے تو یہ بہت دور پہنچ گیا۔"

ببا دھک سے ہو گئے' اسے واپس لا کر پھر ماں کا لال اور باپ کا بیٹا بناتا ہے۔ باپ کے عاق نامہ کے تمسک کی سطر سطر پر پکی سیاہی پھیرتا ہے اور اس پر پکے سونے کی روشنائی سے وراثت نامہ تحریر کرتا ہے۔ پیچھے سے کالر گریبان پکڑ کر گھسیٹ کر بالا خانے سے چوپال پر لاتا ہے۔ ببا افتاں و خیزاں گلی میں سے چبوترہ تک چودہ سیڑھیاں نہ معلوم کس وقت چڑھ کر مونڈھے پر بیٹھ گئے۔

اور مونڈھے پر مراقبہ سا ہوا تو اتر کر اپنے مویشی خانہ اصطبل سے گزرتے' مال مویشی گھوڑی دیکھتے آراضی کے چکوں میں جا پہنچے۔ یک چکی دور تک زرخیز لہلہاتی فصل آراضی' اور وہ جریب گٹھے سے ڈالنے لگے۔ سروے نمبر اور چک چک کا حساب ان کے ذہن میں تھا اور جن جن ذرائع زبردستی اور ہتھکنڈوں سے یہ حاصل کیے تھے اور بستی کے سب سے زیادہ آراضی کے مالک اور علاقہ بھر کے سب سے زیادہ قابو یافتہ ہستی بنے تھے' سب کے سب قانونی اور خود قانونی ذرائع کا اسکرین سامنے متحرک رہا تھا کہ اتنے میں کوئی سامنے آگیا۔ چونکے تو یہ حقانی خلیفہ تھے' اور چبوترہ کے اوپر بجھے ہوئے الاؤ کی بھوبل کرید کرید کر چلم پر دھو دھو کر انگارے رکھ رہے تھے۔ حقہ بھر کر سامنے رکھا تو جیسے نیم خواب نیم بیدار کیفیت سے چونکے۔

اور صبح شام چلم بھرنا اور رات کو پاؤں دبا کر سلانا حقانی حجام کا روز کا معمول تھا اور جمعہ کے دن وسمہ خضاب' غسل کرانا' جمعہ کے جمعہ کی خدمت تھی۔ اسی میں سارا گھر ببا کے گھر سے پلتا تھا۔ اور دیہات میں برت کے حجاموں کا یہی دستور ہوتا ہے۔ خوش خبری' نوید' پیام رسانی' حجامت وغیرہ' پاؤں دبانا اور قرب کے طفیل دنیا بھر کی خبریں خاص طور پر سوتا پڑے علاقے بھر کی روداد یں آج کے ریڈیو بلٹن کی طرح سنانا۔ اور یہ بات نہیں خبروں پر کمنٹری بھی کرتا چلنا۔ آج جب حقانی حجام چوپال پر سوتا پڑے کے پاؤں دبانے بستر پر پہنچا تو ببا نے سوال کیا......

"ارے خلیفہ یہ ہمارا بھانجا نتوں خاں واں شہر میں کیا کرتا ہے...."

اور تنوں خاں اس ہفتہ عشرہ کی بستی اور علاقہ کی رنگین ترین چیز ہو رہا تھا۔ حقانی چونک پڑا۔ پہلے تو بیا کا سوال ہمارا "بھانجا" دشمن کے بیٹے کے ساتھ لگا ہوا۔ پھر کمہاروں سے کچھ سن گن گھمن خاں اور ان کی بیوی کی بھی چوپال پر ڈولی' کھٹولے کے پہنچنے کی اڑتی اڑاتی پہنچ چکی تھی' خود ہی ٹول میں تھا کہ عاق کے اعلان اور اس کا کیا تعلق ہے؟ لیکن سمجھ کام نہ کرتی تھی کہ اس چوپال سے شر اٹھا ہے یا خیر' نگریات تو تمام شر ہی شر اور مکروہ ہی مکروہ تھی۔ مگر "ہمارا بھانجا" ترکیب میں یاد کرتے ہوئے ماتھا ٹھنکا اور امید مثبت اور خیر کی نظر آئی' ویسا ہی جواب دینے کو تھا کہ بیا نے سلسلۂ کلام جاری کیا......

"سنا ہے کہ دس جماعت تو اول نمبر پڑھ چکا' چاہتا تو تھانہ دار لگ جاتا' اب سنا ہے بارہویں میں ہے' کیا نائب تحصیل دار لگنے کا ارادہ ہے' یا پھر چودھویں' سولہویں بی اے' ایل ایل بی کرکے ڈپٹی' جج وکیل بنے گا....."

پاؤں دباتے ہوئے ذہین د مزاج شناس حجام نے آقا کے منھ سے اس قسم کی گفتگو سن کر ذرا تجسس کیا ورنہ اس عشرے پندھرواڑے میں تو مسجد اور رجسٹرار کی آمد و رفت اور عاق کا موضوع بستی بھر سارے نواح میں زبان زد خاص و عام تھا۔ اور کیا بیا خاکسار خاں نہیں جانتے تھے اور حقانی حجام روز کا حاضر باش' پھر اس شب میں تھا کہ اس چوپال پر ایک رات بمن کی ڈولی اور دوسری تیسری رات گھمن خاں کی چارپائی آئی اور پھر کہاوت ہے آسمان سے تھالی گری' جھنکار کس نے نہیں سنی؟ عاق ہونے کا بستی جب سے آباد ہوئی پہلا حادثہ' مسئلہ' جس کی نوعیت دیہاتی پڑھے لکھے مسجد مکتب کے ملاں جی بھی نہ جانتے تھے۔ مگر آقا کا رخ پہچاننے والا حجام' موضوع کے علاحدہ بات کا اسی نہج پر احتیاط کے ساتھ بولتے ہوئے جواب دیا۔

"میاں تھانے دار علاحدہ تحصیل دار' جج' وکیل جب بنیں گے' بنیں گے' آج تو لچھن اچھے نہیں' واں میری برادری کا ایک اوباش لونڈا لگ گیا ہے' سارا گھر سات آدمی کا کنبہ میاں کے سر کھاتا ہے اور سب کی کھرچن میاں کے پلے پڑتی ہے۔ سنا ہے پینے پلانے پر بھی لگا لیا ہے' اور اللہ بچائے کوچہ بماراں کی سیڑھی پر بھی ڈال لیا ہے۔ اور سرکار میں زیادہ کچھ نہیں بولوں گا' دونوں ڈیوڑھیوں کا نمک خوار بر تیا۔ اور یہاں بستی کی تمام روئیدادیں' وہیں شہر کی حرکتوں کی گونجیں ہیں۔ اور سرکار آپ پڑھے لکھے سمجھ دار لوگ ہیں' میری تو کان پڑی ہیں۔ آپ بڑوں کے کنبہ برادری خاندان کا معاملہ' بڑے آدمیوں کی باتیں' بڑے ہی جانیں سمجھیں۔ اس وقت اتنی آپ نے چھیڑی تو میرے منھ پر یہ بھی آگئی' ورنہ میں کام والا' باپ دادا کا اصول رہا جہاں کی سنی' وہیں چھوڑی' ورنہ کوئی پاس نہ کھڑا ہونے دے' دو کوڑی کے پاجی ہو جائیں' آپ پھر ایک ہو جائیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے خلیفہ' پھر ہماری تو اتنی واقفیت نہیں' ویسے یہ بات نہیں' ہیں ہمارے بھی شاگرد جاننے والے' مگر تمھاری برادری کا واسطہ ہے۔ سنا ہے کہ کوئی تمھاری برادری کا لونڈا قرم لگا ہوا ہے۔ اسی نے ستیاناس مارا ہے اور سنا ہے اسی کے گھر کھانا پکتا ہے کھانے دسترخوان اور پلنگ کے مزہ پر صاحب زادہ کو ڈال دیا ہے۔"

حقانی بابا کی اس دلچسپی سے مثبت یا منفی ہونے کی شانِ نزول نہ سمجھ سکتا تھا ورنہ ان کی بات کا اسی کے مطابق جواب دیتا۔ بولا۔

"شن گن تو مجھے بھی ملی ہے۔ اب کل مہینہ کی اوزاروں پر سان دھروانے لے جاؤں گا شہر اور شام تک برادری میں گھوم پھر کر پکی خبر دوں گا۔"

اب بابا نے ذرا کھل کر بات کی۔

"یہ تنوں خاں باپ نے تو لنگوٹی کو پین لگا کر گھر سے نکال باہر کیے' سڑے گلے جو کچھ بھی ہیں' ٹوٹا برتن نھینیرے کی ٹھک پر ددھیال سے تو گئے نانھیال ہی نانھیال کے رہ گئے۔ اور ان کا ٹھکانا جو کچھ بھی اور جیسا کچھ بھی ہے' ہم ماموں ہیں۔ آج اگر ہمارے بیٹا بیٹی ہوتی تو برت بیاہ منگنی کی بات تمہارے ہی توسّل ذریعہ چلتی......."

اور اب بات کھل گئی' صبح تڑکے آنکھوں دیکھی دیکھتے شہر پہنچا۔ اوزار تو سان گر کی ٹھک پر پٹخے۔ شہر کے اندر تین قبیل کی حجام برادریاں تھیں' ٹھکانے ٹھکانے گھر گھر گیا۔ ایک تو وہ جن کا دائرہ کار وسیع تھا کچہری اور بازار جانے والے فٹ پاتھوں پر بورپے بچھا کر اوزار پھیلائے بیٹھتے۔ اور ہر راہ گیر کے' مشہور بات ہے' جس طرح سڑک کنارے بیٹھنے والا جوتے گانٹھنے والا موچی پاؤں دیکھتا ہے' یہ حجام سر اور چہرہ کے کالے سفید کھچڑی بال گنتے۔ اور صبح سے شام تک روز کا کنواں کھودنا روز کا پانی پینا کما کر گھر لے جاتے۔ دوسرے بڑے بوڑھے وہ تھے جن کی برت جمانی' پشتینی رئیس گھروں میں جیسے آبائی ریاست کی طرح توریث چلی آتی تھی۔ ان میں محتاط انداز میں اونچے طبقے کی قربت کے کام کے طفیل مصاحبت قسم کا مخصوص سلیقہ اور ہاں میں ہاں ملانے کا انداز ہوتا۔ دیوان خانہ' دیوان خانہ' بیٹھکیے' بیٹھکیے' ڈیوڑھی ڈیوڑھی دن بندھا ہوتا۔ جمعہ اتوار خاص طور پر وسمہ مہندی خضاب کے بعد حجامتیں بنوانے والوں کا دن ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان ٹھکانوں پر دوپہر کا کھانا کھاتے اور شام تک دو وقت کا بچوں کے لیے گھر باندھ کر لاتے۔ تیسری قسم بہت چھوٹی اقلیت میں تھی۔ یہ حجام خلیفہ' نائی کے بجائے خود کو "باربر" بولتے۔ بازار میں چھوٹے سے شہر کے اندر ان کی دو تین دکانیں تھیں۔ اونچی دکان پھیکا پکوان' چار شیف سامنے پیچھے دائیں بائیں ایک قد آدم بڑا' بقیہ حسب ضرورت مختلف سائز کے آئینے ایستادہ۔ یہاں پہنچ کر حجامت بنوانے والا ایسا ویسا شیشہ خانہ میں کتا پھنس جاتا۔ فٹ پاتھیوں سے منڈائی ٹھیک سولہ گنی.......پاؤڈروں کے مستی زا تصویروں والے فرانسیسی ساخت کے ڈبے "کس پروف" نامی برانڈ کریمیں' بٹلر کراپ مارک استرے کاف مین کی قینچیاں اور دیواروں پر ملکہ اور بادشاہ کی تصویریں ضرور' ساتھ ہی ساتھ بالوں کے کٹ کے مختلف تراش خراش کے نام وغیرہ وغیرہ۔ مگر حقانی خلیفہ تو استاد الاساتذہ تھے۔ ٹھک ٹھک' گھر گھر آؤ بھگت ہوئی۔ اور ہر جگہ رفیق کا ٹاپک زیرِ بحث آیا' جس کے دروازہ پر مال جنس کا بھرا چھکڑا زمین دار رئیس کی طرح انھوارے کے انھوارے آکھڑا ہوتا اور نو آدمی کا کنبہ پلتا۔ اور گھر سے شکم سیر سے اور سیر بھر اوپر سیر ہو کر' بچی بچائی چنگیوں میں سے' خوب منجھا دھلا چمک دار ٹفن کیریئر بھر بھرا کر رفیق سائیکل پر لٹکائے

لے جاتے۔ اور بالعموم عین اسی وقت تنوں خاں بھی کالج سے پہنچے ہوتے اور دسترخوان بچھ جاتا پھر بھلا تنوں خاں کیسے اکیلے کھانا گوارا کرتے۔ بغیر ساتھی کے لقمہ اٹھانا مشکل ہوتا۔

حقانی خلیفہ کو شہر کے اندر صبح شام تک کے بجائے تین دن کسی فٹ پاتھ والے روز کا کنواں روز کا پانی پینے والے برادر کے یہاں مہمان رہ کرنہ تو یک بھر بھر پتیلیاں مس طمنچہ جان کے فلیٹ پر شام کے شام پہنچی کھلیں کہ سیمرغ در قاف روزی خورد کے قائل تھے اور بہرحال مس طمنچہ جان کوہ قاف کی پری تھیں' البتہ آنکھوں دیکھی معاصرانہ چشمک میں رفیق کی دو وقت کی بجائے تین وقتی خوش خوراکی وڈپر خوری اور گھر بھر کی کچھ ایسی ہی خوان کرم گستری زیادہ گراں گزری۔ اور تمام کی تمام آنکھوں دیکھی دکھلانے میں ایک دن کے پروگرام کی بجائے تین دن شہر میں برادری والے دل جلوں نے اصرار کر کے مہمان رکھا۔ اور اگر یہ حق تھا' جہاں تک رفیق کے گھر والوں کا تعلق تھا تو اکیلے حقانی خلیفہ کا نہ کہ رفیق کے گھر بھر کا۔ اور بقیہ تمام تو فروعی مصروفیات تھیں کہ تنوں خاں۔

چوں بہ خلوت میرند
آں کار دیگر میکنند

بھلا رئیس زادے بھینسیں تو چرایا نہیں کرتے' کچھ تو کریں گے ہی کریں گے۔ گاؤں میں ہوں گے تو ہرن کا شکار' شہر میں بسیں گے تو ہرنیاں گھیریں گے۔ اور اب تو تنوں خاں کتا مارکہ باجہ کے ساز پر مس بسنلاتا آٹومیٹک کی ڈانس کرتی پنڈلیاں' رانیں اور بازو سینے کی چالیس تھرکنیں بھی سمجھنے لگے تھے اور یاقوتی دہن سے نکلے ہوئے فرانسیسی بولوں پر بھی عبور ہو گیا تھا۔ اور بڑے بھائی کو ان کا اور اپنا مقام دکھلا کر اپنا مقام بھی بنا لیا تھا۔ سنی سنائی عاق نامہ کی قانونی کارروائی اس کان سن کر اس کان اڑا دی تھی۔ اپاہج باپ اور ان پڑھ حرف شناس بڑا بھائی کیا' اور ان کی کارروائی کیا۔ حساب دوستاں در دل' اس نے ان سے چالیس فصلوں کی پیداوار کا حساب مانگا تھا' اکتالیس ابھی ان پر بقایا تھیں اور ان اعداد و شمار کو مکمل کرنے میں دخل در معقولات کرنے والے ماموں بیا کو بھی برجستہ چلتے سمجھا آیا تھا۔ ادھر مس طمنچہ جان سے بھی کھل کر sale' نرخ اور وسیع القلبی کا سلیقہ دکھلایا تھا۔ بڑے بھائی کی مرضی کا کچھ اندازہ آڑھتیوں' گودام کوٹھی والوں کو تو ہو گیا تھا اور اندیشہ تھا کہ وہاں اب بھری ہانڈی گلے نہ گلے' تاہم سبزی منڈی کے تھوک خریداروں میں بات ساکھ بنی ہوئی تھی اور اسی کے اندر اندر اب عام بھو بل گلی بھاؤ پر کوٹھوں کے بجائے مس طمنچہ جان کے فلیٹ پر کام چل رہا تھا۔ کوٹھوں کی چاندی اور فلیٹ کا سونا اب ایک نرخ تھا۔ تو کون احمق تھا کہ سونا چھوڑ کر چاندی خریدتا۔

دن کے دن شام کو پہنچنے کا پروگرام بنا کر تیسرے دن شہر سے دل جلا حقانی حجام رات گئے گاؤں پہنچا اور سیدھا بابا کی چوپال پر گیا۔ بابا دو تین راتوں سے نیند سے محروم اور بلا دبائے بدن ہاتھ کے درد سے بے چین منتظر تھے۔ ذرا آؤ بھگت سے لیا۔ جسم دبانے کے ساتھ سر پہ مالش بھی کی' تین دن کی تمام روئیداد

تفصیل وار بیان کی' اور بیا سو گئے۔ مگر معمول کے مطابق فجر کی اذان دی' جماعت پڑھ کر بالعموم بستر پر لیٹ جاتے تھے' لیکن آج انھوں نے اپنے سرہانے والی الماری کھولی' جس میں ان کی املاک کے متعلق اہم کاغذات رکھے رہتے تھے۔ گرد جھاڑ کر پہلے اپنی زرعی آراضی کے ملکیت کی فردِ حقیت نکالی۔ اور خود کاشت کا خسرہ کھتونی' اور کچھ دوسرے اہم کاغذات' سب کے سب ایک بستہ میں لپیٹے۔ گھوڑی کی زین سرہانے کھونٹی پر رکھی رہتی تھی' اتار کر زین کے قبور میں سلیقہ کے ساتھ یہ اہم تمسک رکھے۔ گھڑے سے لوٹے میں پانی بھر کے جلدی جلدی تازہ وضو کیا' چبوترہ کے نیچے ہی مبارک بھونریوں والی شائستہ گھوڑی بندھی تھی۔ بسم اللہ کر کے وہ آیت پڑھی جس میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے گھوڑوں کی قسم کھائی ہے اور زین پیٹھ پر ڈال کر کسی۔ ان کا اپنا تجربہ تھا اور مانی ہوئی بات تھی کہ اگر کسی اہم مسئلہ پر رائے اور طریقہ کار متعین کرنے میں راہِ عمل میں گومگو ہو تو بعد نمازِ فجر باوضو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر قبلہ رُو چل پڑو۔ الہام سا ہوگا اور صحیح راہِ عمل متعین ہو جائے گی۔ طلوعِ آفتاب ہوتے ہوتے بیا شہر کے راستے پر چل پڑے اور حسنِ اتفاق سے شہر گاؤں سے قبلہ رخ واقع تھا' شاید یہ مزید تائید غیبی تھی۔ اور شہر کے کوس بھر کے فاصلے میں بیچ بیچ بیا کے ذہن کے پردے کھلتے چلے گئے' جن میں سے جھانک کر تو وہ رات سوئے ہی تھے۔ انھوں نے گھوڑی کو اسٹامپ فروش کے دروازہ پر کھڑا کر دیا۔ دروازہ بے وقت کھٹکھٹانے پر رجسٹرار آفس کا اسٹامپ وینڈر سوتے سے اٹھ کر آنکھیں ملتا نکلا۔ بیا نے ہبہ نامہ کا جنرل اسٹامپ طلب کیا۔ اندر جا کر جلدی جلدی پشت پر نام اندراج کر کے لے آیا۔ قیمت ادا کر کے بیا شہر کے دوسرے محلے میں رجسٹرار آفس کے وثیقہ نویس کے دروازہ پر جا پہنچے اور وثیقہ ہبہ نامہ تحریر کرنے کے لیے زین کے قبور میں سے فردِ حقیت وغیرہ جملہ املاک غیر منقولہ کے مصدقہ سرکاری ڈاکومنٹ نکال کر حوالے کیے اور تمام کی تمام گوشوارہ خانہ زرعی آراضی مملوکہ و مقبوضہ خود اور چوپال حویلی جملہ ملکیت غیر منقولہ اور تمام مال مویشی اثاث البیت حتیٰ کہ ظروف و زیورات' غلہ ذخیرہ اندرون خانہ و فصل ایستادہ' جملہ ملکیت منقولہ بہ نام پسر خورد مسمی تنویر محمد خاں بہ ذریعہ ہبہ نامہ رجسٹری شدہ امروزہ اپنے قبضہ و تصرف سے علاحدہ کر کے پسر موصوف کے قبضہ میں دے دینے کا اقرار تحریر کیا۔ اور یہ تو خیر تحریری ہبہ نامہ تھا' زبانی کوئی چیز بھی کسی کو بخش دینے' ہدیہ کر دینے سے یا تحفہ دے دینے سے موہوب علیہ کی ملکیت قطعی اور قانونی ہو جاتی ہے۔

اور دفتر رجسٹری کھلتے کھلتے سب رجسٹرار کے روبہ رو پہلا تمسک مسمی خاکسار خاں کا ہبہ نامہ بہ حق مسمی تنویر محمد خاں پیش ہوا اور ڈبل فیس کی ادائیگی کے ذریعے فوراً رجسٹر پر اندراج کر کے حوالہ کر دیا۔ بارہ بجتے بجتے بیا گاؤں کے اندر موجود تھے اور قانونی کارروائی کے بہ بانگ دہل اعلان پر ساری بستی متعجب بھی تھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور حلقہ کا ڈھنڈورچیہ ڈھول پر اعلان کر رہا تھا' جو بہ مشکل ہی سننے والوں کی سمجھ میں گھس رہا تھا........

"ملک خدا کا' حکم حاکم بادشاہ جارج پنجم کا' اعلان رجسٹرار صاحب بہادر کا' مسمی خاکسار خاں ولد غم گسار خاں نے آج بہ ذریعہ ہبہ نامہ رجسٹری شدہ مورخہ ۱۵ر اپریل' اپنی تمام آراضی کاشتہ مملوکہ

مقبوضہ و چوپال حویلی بگو خانہ غیر منقولہ و جملہ اثاث البیت منقولہ مع تمام مویشیاں و دو رکاب مادیان، وغلہ و جملہ اجناس ذخیرہ خانہ اپنے پسر مسمی تنویر محمد خاں منتقل کر کے اپنے قبضہ و تصرف سے موہوب علیہ کے قبضہ و تصرّف میں دے دی اور واہب کو ان تمام سے آج کی تاریخ سے کوئی سروکار نہ ہوگا...... " ڈھم، ڈھم، ڈھم......

چوپال پر بستی اور نواح والوں کا جم غفیر تھا۔ اس ہنگامی و غیر یقینی انقلاب جیسے واقعہ پر دریافتِ حال کے لیے لوگ جمع تھے۔ مگر ڈھنڈورا پٹوا کر ہشاش بشاش خاکسار خاں سیدھے حویلی میں گئے اور بیوی کو نوجوان بیٹا جننے کی دلی مبارک باد دی، سیدہ سارہؓ کے حضور دعاؤں کی مقبولیت کی بشارت سنائی۔ بیٹے کا نام تنویر خاں ولد خاکسار خاں بتایا، حویلی نشین سیدھی سادی بیوی باغ باغ ہو گئی۔ اور پھر باہر آ کر چوپال کے منتظرین کو گھمن خاں کے عاق نامہ کے جواب آں غزل میں اپنے ہبہ نامہ کا تفصیلی حال سنایا۔ عاق نامہ کا ڈھنڈورا تو جنگل کی آگ کی طرح سارے گاؤں، کل علاقے میں پھیلا تھا، یہ متبنّٰی بنانے اور گرے ہوئے کو گود لینے کا واقعہ جیسے بے موسم بہار کے پھولوں کے تختوں کی طرح کھلتا چلا گیا۔ چٹیل پڑے کھیت جاگے، سنگلاخ سوتے بنجر انگڑائیاں لے اٹھے، اور حویلی کے اندر بیوی نے ڈھول دھر دیا زچہ گیریاں گائیں گئیں۔ چوپال پر منتظر لوگوں کو جو خیر خواہ ہی خواہ ہی تھے، خاکسار خاں نے نومولود جیسی خوشی کا مژدہ سناتے ہوئے ہبہ نامہ کی تفصیل بتائیں، اور ازلی دشمن گھمن خاں کی شکستِ فاش پر ساونتی فتح کا سب نے آپوں آپ اندازہ کر لیا۔ ڈھنڈورے دیہات میں کہیں برسوں میں پٹتے سنائی پڑتے ہیں اور یہ دو دن اندر دو پٹ گئے۔ عاق نامہ کا ڈھنڈورا تو جنگل کی آگ کی طرح پھیلا تھا، بپا کا ہبہ نامہ تو خزاں میں بہار کا سماں باندھ گیا...... واہ، واہ ہو گئی۔ مبارک بادیں پڑیں، جن میں مرتے مرتے ازلی دشمن و ابد تک دشمنی کا عہد کیے ہوئے گھمن خاں کی لبِ گور شکست پر اظہارِ مسرت کیا گیا۔

بپا کے رو بہ رو ابھی ایک مرحلہ ذرا عجیب سا باقی تھا، جو تفصیل میں جایئے تو جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، مگر بپا کے بائیں ہاتھ کی چھنگلی کا کھیل تھا۔ صرف اک ذرا چند سال رجعتِ قہقہری کرنا تھی۔ چوپال سے مجمع برخاست ہوتے ہی سہ پہر تک انھوں نے مہم کا پورا منصوبہ بنالیا۔ "ویسے چور چوری سے گیا تھا، ہیرا پھیری سے نہ گیا تھا۔" مگر ہیرا پھیری اب مشورہ کے لیے پرانے حلقہ بگوشوں کے چوپال پر آ کر ترکیبیں بتانے اور ضرورت ہو تو بوسہ بہ پیام گھر بیٹھے احکام ہدایتیں اور درخواستیں، عرضیاں تک جاری کرنے کی رہ گئیں تھیں۔ مگر اقبال درست تھا اور زمانہ بھی سرِ تسلیم خم کرنے والے وضع داروں کا تھا۔ لیکن آج خان مکانی، ٹھاکر چوپالی کے سامنے جو منصوبہ تھا اس کا تقاضا تھا تھوڑی سی جتھہ بندی اور ذرا سی مہم آرائی۔

انھوں نے اپنے پیش دست حقانی خلیفہ کو حکم دیا کہ آج سہ پہر چلنا ہے۔ اس کے استفساریہ انداز پر بات ہلکی سی کرتے ہوئے بولے۔

"ہاں' ہاں' ذرا چلنا ہے۔"

اور حقانی خلیفہ کو ذرا تعجب سا ہوا۔ یہاں تو مدتوں سے خان مکانی' نھاکر چوپالی تھے' اور پہلے تو تجہیز و تکفین میں شریک ہونے چوپال سے اترا کرتے اور آگ بجھوانے سورہ ابراہیم کا ورد کرتے جا پہنچتے اور اب تو اک سال دو سال سے یہ بھی نہیں۔ نماز کے لیے پانچ وقت چوپال کی سیڑھیاں اترتے ہیں' یا جمعرات کی شب حویلی میں گزارنے اندر جاتے ہیں اور جمعہ چوپال پر نہاتے ہیں۔ وسمہ خضاب پسندی' داڑھی چڑھانا تمام باتیں ترک کردی ہیں' ذرا گھونٹ سا لے کر بولے......

"میاں جانا ہے' پھر کہاں؟" زیر لب کہا۔ "خیر تو ہے؟"

"ہاں تمہیں خبر نہیں' آج فجر پڑھ کر بھی شہر گیا تھا' ورنہ تم سمجھتے ہو یہ آج ڈھنڈورے کی کارروائی یہاں گھر بیٹھے ہوگئی' رجسٹرار تو چوپال پر آیا نہیں' مجھے اپنا چوپال سے اترنے کا عہد توڑ کر خود ہی دو دروازے اور جھانکنے پڑے اور تیسرے دفتر رجسٹرار پر حاضری دینی پڑی تب کہیں جا کر یہ ڈھنڈورا پٹوایا اور پھر چلنا ہے اور تمہیں بھی' اور گاؤں کے کمہار کو بھی اپنا کالا والا گدھا لے کر اور اس علاقہ کے ڈھنڈورے کو بھی جو عاق' ہبہ' گود لینے متبنیٰ کرنے کے ڈھنڈورے دو تین دن سے پیٹ پیٹ کر کل بستی سارے علاقے کو حیرت میں ڈال رہا ہے۔"

کمہار تو بیگاری سا اور گدھا کوتل' چپ چاپ کان ڈالے ساتھ تھا۔ ڈھنڈوریا باتون بھاٹ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا' گومگو کی ترکیب کی تشریح میں تھا۔ حقانی حجام جز وقتی خدمت گار سہی' تاہم کل وقتیوں سے زیادہ قریب منہ چڑھا' ناخن لینے والا' انکھیوں سے آقا کے بشرہ کو بھانپتا اندر کا سراغ لیتا ساتھ چل رہا تھا' کیوں کہ دو دن سے ڈھنڈورے سن رہا تھا' اور آج تیسرے کا اور نئی سننے کے اندیشے میں تھا۔ ویسے کہاروں کے یہاں سے اڑتی اڑاتی بسن بھائی کی ڈولی چارپائی پر پہنچنے کی کان میں پڑ چکی تھی' البتہ ماموں بھانجے خاکسار خاں اور ننوں خاں کا گلی میں آمنا سامنا ہونے کا پتا نہ تھا۔ اور پھر بہ طور خاص بیا کے اس کو شہر میں ننوں خاں کے متعلق سی آئی ڈی کی طرح متعین کرنے کی دلچسپی معمہ تھی۔ چنگی ناکے کے قریب پہنچ کر بہانے جیسے کن سے کوئی بات حقانی سے دریافت کی' غالباً" راستا کی سمت' شاید بھوبل گلی چکلہ' کوچہ بہاراں کا راستا' اور اسی طرح حقانی نے اشارہ سے بتایا۔

اور اب بیا کا اپنی نوعیت کا عجیب سا جتھہ تنگ بھوبل گلی میں داخل ہوا۔ اور ابھی کوٹھے کوٹھے جل ترنگیں بجنی شروع ہوئی تھیں۔ ترنگ بپا ہونے میں اک ذرا دیر تھی' ٹھمری' ترانوں' شادیانوں کا وقت تھا' سوہنی کا راگ ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ ویسے بستر تو ہمہ وقت بچھے رہتے ہیں مگر آباد ہونے میں چند گھڑیوں کی دیر تھی۔ بس گلی میں یاں سے واں تک ہراس پھیل گیا۔ گدھے کے سموں اور بیا کے بھاری قدموں اور ہوشیار پوری رنگین کرخت جوتوں کی کھناہٹ سے کوٹھوں والے چونک پڑے۔ کھولیں جھروکوں سے جھانکا تو سازندوں پر مراں پڑگئی۔ کھلاڑنیں ہسٹریا کے دوروں میں مبتلا ہو گئیں۔ کباب میں ہڈی کی ذرا سی پچری بہت ہوتی ہے اور بیا تو ہڈا تھے۔ مگر ولے بغیر گزشت' اس سرے سے اس سرے تک نکلے چلے گئے

اور قافلہ مس طمنچہ جان کے فلیٹ پر جا کر رکا۔ حقانی کے سوا گدھا' کمہار' بھاٹ' ڈھول سارا تام جھام نیچے گلی میں کھڑا چھوڑ کر زینہ کی ایک ایک پاؤں میں دو دو سیڑھیاں چڑھتے بیا بلائے ناگہانی کی صورت میں جا دھمکے۔

اور ملک الموت کے علاوہ چھ فٹے چھ انچی آدمی کسی دیوزاد خطہ کے بادشاہ دنیا میں ہوں تو ہوں اپنے یہاں تو کہیں ہوتے نہیں۔ سازندوں' بینڈ ماسٹروں کے تو دیکھتے ہی لال فیتے والی نیلی پتلونیں تو سامنے سے تربتر ہو گئیں اور نکل پالش ساز بجتے بجتے ادھر ادھر ڈھلک کر جا پڑے۔ کتے مار کہ باجے والا دم کٹا کتا بھونکتے بھونکتے کوں کوں کرکے جیسے کہیں دب گیا۔ مس طمنچہ جان کی میگزین کے سنہرے دکتے چھوٹے ہوئے پانچوں کارتوس پیتل کے کھوکھے نکل کر آٹومیٹک انداز میں بکھر گئے۔ تھرکتی بلوریں پنڈلیاں لڑکھڑا گئیں' سرسری پھڑکتی رانیں بازو اور ناف سے آن کی آن میں چڑھ کر گردن تک پہنچتی گھمر گھمر کرتی چھاتیاں ساکت اور نہ معلوم کہاں غائب ہو گئیں۔ تمام کا تمام ڈانس کرتا وجود اور سب کی سرور میں ڈوبی ہستی خمار بن گئی۔ انگریزی ڈانس اور فرانسیسی نغمہ بدن اور زبان کی لکنت ہو کر رہ گیا۔ جسے محاورہ روز مرہ میں "رنگ میں بھنگ" ہونا بولتے ہیں' وہ ہو گیا۔ جیسے چابی دار کھلونے کا اسپرنگ کھل کر چند اچھ ذرا حرکت کرتا ہے' مس صاحب اک ذرا لڑکھڑاتی ڈانس کو گرتے پڑتے میں تبدیل ہوتی بہ مشکل بجائے نغمہ کے "اوئی اللہ" والے انگریزی ترجمہ کی ہلکی سی چیخ نکالی' فلکیوں اور موتیوں کی رنگین چلمن کی آڑ لے سکیں اور شاید یہاں پس پردہ خود کو محفوظ تصور کرتے ہوئے' کمایونی ہائی لینڈر اور انگریزی اینگلو انڈین بولی میں پتا نہیں' حیرت یا شکایت کے چند الفاظ بڑبڑائیں۔

کل کے ہمشیرزادہ اور آج صبح سویرے ہی سویرے کے قانونی گود لیے نوازائیدہ بیٹے تنوں خاں نے جز بز ہو کر کچھ کسمسانے اور شاید اٹھنے کا انداز بنایا تو کل تک کے صرف ماموں اور آج کے سچ مچ باپ نے اک ذرا ہاتھی کے اگلی پاؤں ناپ جیسا ہاتھ' دستِ شفقت جو رکھا تو جہاں کے تہاں چکنی مٹی کے سوکھے تودے کی طرح جمے کے جمے رہ گئے۔ اٹھ سکنا تو درکنار دباؤ سے ہل سکنے کی بھی سکت نہ تھی۔ شاید بیا طنزیہ لہجہ میں حلق سے ذرا بڑبڑائے۔

"برخوردار بیٹھے رہو' ہل نہ سکو گے'..... بے سود ہے۔"

اور اب بیا حقانی حجام سے متوجہ ہوئے۔

"خلیفہ! بھدرا کرو' ان کے پیاجی سرگباش ہوئے' یہ کل سے اناتھ ہیں۔"

ویسے تو روز کا حاضر باش اور پشتوں کا جز وقتی خادم' پشتوں کے آقا کے مزاج میں دخیل تھا' مگر وقت اور ڈھب کا بڑا شناسا تھا' لیکن اگر آقا اس گھڑی سیدھے سادے طور میں ہوتا تو اپنائیت کے انداز میں ضرور ہچر مچر کرتا' مگر بیا بہت بے ڈھب ہو رہے تھے' اگر مگر کی ہمت نہ پڑی۔ کان ڈالے تعمیل میں ہی عافیت جانی۔ تازہ سان دھرے اوزار کسوت سے نکالے' ادھر بیا نے سر پر سے دستِ شفقت ہٹا کر زیرو نمبر کی مشین کو گھاس کاٹنے کے لیے میدان خالی کر دیا۔ اور یک نہ شد دو شد اب دونوں ہاتھ برخوردار کے

کندھوں پر جما کر مٹی کے تودے کو پتھر کی چٹان کی طرح جہاں کا تہاں جمادیا۔ بہ مشکل سانس ہی لینے کی گنجائش رہ گئی۔ اور جس طرح مخصوص ڈھب کے ساتھ چنچل بچہ کی دو حجام حجامت بناتے ہیں' ایک دبائے رہتا ہے دوسرا جلدی جلدی بال کاٹتا رہتا ہے' ببا اور حقانی نے مل کر ننوں خاں کے البرٹ فیشن ریشمین بال زیرو نمبر مشین سے سامنے ڈھیر کر دیے۔ اور زیرو نمبر مشین اک ذرا ڈھنگ اور دباؤ کے ساتھ چلائی جائے تو کم بخت وہ ایجاد ہے کہ استرا تو خیر مونڈ تا ہی ہے' یہ ظالم کھنتیاں تک کھینچ لاتی ہے' اور کتائی کے ساتھ منڈائی کا ٹھیک ٹھیک کتابی معنی میں حق ادا کرتی ہے۔ سر سے فارغ ہو کر ببا نے "کھچڑی مونچھوں کو کرزنی" کرنے کا حکم دیا اور بجائے زیرو مشین کے بلڈ استرے کے استعمال کی تجویز پیش کی' اور نہ ہنسلا دور' نہ پڑوسی کی ناک' یہ بھی اوزاروں کے ساتھ سامنے آراستہ تھا۔ البتہ اس میں ذرا اذیت سی ہوئی کیوں کہ پانی صابن موجود نہ تھا' مگر ایک ہی رگڑ میں صفایا ہو گیا' اور بات ایک ٹھنڈی سسکی سے آگے نہ بڑھی۔ بھدرا کی رسم کا عمل یوں تو عام رواج کے مطابق پورا ہو چکا تھا مگر ببا تو پشتینی منوسمرتیوں کے عالم بھی تھے۔ اسلام مسلمانی تو ابھی چار پانچ پشت کی بات تھی۔

"خلیفہ بھوئیں' بھوئیں بھی لگے ہاتھوں لے لو' کی ہے تو پوری کرو۔ منوجی نے تو رواں رواں صاف کرانے کو کہا ہے' یہ ابھی نئے لونڈے برہمن ٹھاکر بنیوں نے بھوئیں جھڑوانے کی رسم نکالی ہے۔ تمھارے باپ بڑے خلیفہ تو بھوئیں بھی صاف کرتے رہے......"

اور اب آقا کے بدلے ہوئے نرم انداز سے متاثر ہو گیا اور حقانی نے بھووں پر بھی استرا پھیر کر ننوں خاں کو "کلینا" فارغ البال کر دیا اور مرفع الحال تو آج صبح ہی صبح زرخیز زرعی آراضی' اونچی چوپال' اثاث البیت بھری لق دق حویلی مویشیوں بھرا گئو خانہ' دو گھوڑیوں سے سجا اصطبل اور اپنے دل سے محبت بھری سگی ماں بخش کر ببا چکے تھے' جس کی شاید ابھی ننوں خاں کو خبر نہ تھی۔

ننوں خاں سے فارغ ہو کر ببا نے ادھر ادھر دیکھا تو مس طمنچہ جان کا باورچی' مشعلچی' بیرا خانساماں قسم کا ہرفن مولا گنجا لونڈا جسے خالص انگریزی وسط لندن کے امرا کے انداز میں مس صاحب بوائے کہہ کر آواز دیتی تھیں سہما ہوا تماشبین سامنے آگیا۔ ببا نے گالی کا سابقہ لاحقہ آگے پیچھے لگا کر حکم دیا۔

"ابے روٹی پکانے والا تو اٹھا کر لا۔"

اور خود اک ذرا بڑھ کر مس صاحب کی چار شف آئینہ سنگھار ٹیبل کے لگے مینا بازار میں سے تاک کر صرف ویسلین کی شیشی اٹھائی' اور پوری الٹے توے کی تہ بہ تہ جمی کالونچ پر الٹ کر توا حقانی خلیفہ کو بڑھا دیا۔

"ذرا پھینٹ کر ملاؤ تو اچھی طرح۔"

اور جب کالونچ کی اوپر تلے جمی تہیں ویسلین کے ساتھ اکھڑ اکھڑ کر یک ذات سیاہ تاب نایاب کریم بن گئی تو برخوردار راحت جاں طول عمرہ کے چہرۂ مبارک پر مالش کرنے کا نادری حکم دیا۔ بھدرا سے دم کٹا بندر تو آدمی ویسے ہی ہو جاتا ہے' اس میک اپ نے کل موآں لنگور بنا دیا' مگر دم نذار د تھی' لہٰذا

آرنگ اوٹنگ چھاتری' بن مانس وغیرہ کی کوئی مخلوط نسل نظر آنے لگے اور مس طمنچہ جان کا فلیٹ سرکس کا تماشا بن گیا۔

اب بیا نے فارغ ہو کر ادھر ادھر رفیق کو دیکھا کہ کون سے کونے میں دبکا ہوا ہے۔ مگر وہ تو جیسے ان کے پہنچتے ہی چھلاوہ ہو گیا تھا۔ اور مولوی اسماعیل میرٹھی کی تیسری کتاب میں پڑھا تھا۔

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ

اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

فلیٹ کے زینہ کا راستا تو بیا کے کھڑے قطب لاٹ کے سبب بند مسدود تھا' بلی کی طرح سرکتا فلیٹ کے دو رخے جھروکے تک پہنچا اور وہاں سے چھجے پر کو بندر کی طرح سرک گیا۔ اور کوٹھوں کے چھجوں چھجوں کہیں جھکا' کہیں رینگتا اور جہاں اک ذرا فاصلہ ہوا وہاں جست بھی لگاتا اوپر جھروکوں میں کھڑے صورتِ حال کے معلومات کے پرچولی لوگوں کو مس طمنچہ جان کے فلیٹ میں قضا کے مقام سے مجملاً" آگاہ کرتا ہوا ایک موقع کی کھردری سی منڈیر پر پہنچا اور جست لگائی۔ اوپر کھڑے ہووں نے سہارا دیا۔ چھت پر پہنچ کر زینے کے راستے گلی میں پہنچا اور نو دو گیارہ' سچ مچ چھلاوہ ہی ہو گیا۔ اور بیا کے ہاتھ انتقام لینے اور کھایا ہوا پھیرنے کے لیے عمر بھر نہ لگا' ورنہ سوچے ہوئے تھے توں خاں کی حجامت تو اوزاروں سے بنوائی ہے اس کی اپنی چٹکیوں کے موچنے سے خود بناؤں گا اور ان کی تو بھوئیں ہی مونڈی ہیں ان موصوف کی پلکیں تک اکھیڑنے کا پروگرام تھا۔

بڑے بڑے معرکے بھگتائے تھے' ایسا چکمہ نہ کھایا تھا۔ کوئی مخالف یوں بے لاگ بچ کر نہ نکل پایا تھا۔ بیا کا پہلے تو اک ذرا حقانی خلیفہ پر نزلہ رجوع ہوا' پھر سمجھ میں آگیا کہ وہ غریب مصروفِ حجامت اور صاحب زادہ تویر محمد خاں کی اصلاح میں منہمک تھا' اپنی کلائیاں ہی بھنبھوڑ کر رہ گئے۔ تاؤ میں بھر کر یا اللہ جانے غصے میں برخوردار کو پوٹ میں بھر لیا اور چلتے چلتے خائف کھڑی مس طمنچہ جان سے بولے۔

"مسماتیچ' کیا کروں تمھارے تو ہے ہی نہیں' ورنہ اگر چٹیا ہوتی تو کاٹ کر نہیں اکھیڑ کر ساتھ لے جاتا۔ جی میں آتا ہے یہ لمبی قلم سی ناک بھنبھوڑ کر نکل جاؤں۔ پھر تم بھی آج ہی شہر سے منھ کالا کر جاؤ' ورنہ پھر کل اتنے ہی وقت تمھاری حجامت کراؤں گا۔ رات بھر کی مہلت ہے....."

اور جسمانی قوت خواہ آن کی ہو' مگر عمل داری قایم ہونے میں کام دکھلاتی ہے' اور بیا توں خاں کی پوٹ بھرے چالیس سیڑھی زینے سے جیسے چار ڈگوں میں اتر گئے اور ان کے چہرہ کے ہم رنگ گدھے کی پیٹھ پر لاد دی۔ بھاٹ کو اشارہ کیا اور ڈھنڈورا کے ڈھول پر پہلا متوجہ کرنے والا ڈنکا پڑا۔ ڈھم ڈھم ڈھم اور چکلہ بھر تمام بھوبل گلی' ربڑی کباب' لڈو پیڑے کے متعلقہ چھوٹے سے بازار والے حلوائی کبابی اور سارے کے سارے کوٹھے والے اور والیاں ویسے ہی ہراس اور دریافتِ حال میں ہمہ تن گوش تھے۔ بیا کا ڈھنڈورے بھاٹ کو بتایا ہوا ڈھنڈورا منادی پہلی ہی دفعہ میں یاد ہو گئی' کوئی قانونی منادی تو تھی نہیں۔ بکت قسم کی چیز' جس کے ازبر کرنے میں بھاٹ یوں بھی تیز اور فی الفور ہوتے ہیں' ڈھم ڈھم ڈھم سے ہمہ تن

گوش ہو کر سنائی دیا۔

"رنڈی کا یار' سدا خوار' روسیاہ' جوتیوں کا ہار' شراب کا کٹر' بورے کا بچھونا' نالی میں منھ۔"

اور اس کبت کے ساتھ ہر مرتبہ ڈھم ڈھم ڈھول پر تھاپ اور بھوبل گلی کے اس سرے سے اس سرے تک سات پھیرے لگانے کا حکم۔ گلی کے بھوکے کوچہ گرد رنڈی باز لونڈے آگے پیچھے تالیاں پیٹتے اور اوپر کے ٹکسالی پرانے نسلی تماش بین افسوس کرتے اور نوچیاں' کسی بی نائکا میں دھک دھک ہوتی تماشا دیکھتی رہی اور نئی نویلیوں ابھی ادھر سال دو سال کی تنوں خاں کے ہاتھ کی نتھ بڑھی نوخیزیں' مس طمنچہ جان کی حسد کی ماریوں پر چھینٹے پڑے۔ مختصر سا قافلہ چکلہ اور بھوبل گلی کے اندر یہ فنکشن پورا کر کے' متعلقہ بازار سے کبت اور ڈھم ڈھم کے ساتھ گزرتا' منادی کرتا نواحی گاؤں کے راستے پر پڑ لیا۔ چکلہ بھر' پوری بھوبل گلی میں بجائے گانے بجانے' ٹھمری ترانے کے یہی موضوع گرم رہا اور بستر گرم ہونے پر بات آئی گئی ہو سکی۔ اور چھوٹا سا قصبہ' بات بھوبل گلی چکلہ سے نکل کر شہر میں آرے آرے ہو گئی کہ آج ببا شہر کے اندر وارد ہو کر واردات کر گئے۔

باؤلے گاؤں اونٹ تو انھوارے اندر ڈھنڈورے منادی کی ڈھم ڈھم ہی تھی' جو کہیں برسوں میں تحصیل دار' رجسٹرار کی آواز میں سنائی پڑتی ہے تو پڑتی ہے' یہ تو کالا گدھا آگیا۔ بستی کے قریب کھلیان کے بنجر سے سن کر پورے کا پورا گاؤں نکل پڑا۔ عصر کا وقت تھا۔ پیلی دھوپ کے سائے لمبے لمبے ہو کر میدان کھیتوں پڑ رہے تھے اور تماشا گاؤں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بہ مشکل ہی ڈھنڈورے بھاٹ کا کبت کسی گاؤں والے کی سمجھ میں آیا' جسے چکلہ بھوبل گلی والے لفظ بہ لفظ سمجھے پڑے تھے۔ نہ تنوں خاں بھیا کسی کی پہچان میں آئے۔ ببا اپنا جلوس لیے سیدھے مسجد پہنچے۔ پیش نماز مولوی صاحب کو ہدایت کی کہ تبلیغ کرنی ہے' غسل خانہ میں لے جا کر غسل کراؤ اور تنو خاں کو حوالے کیا۔ اسے مرتد سے مسلمان کرنا ہے۔ مغرب کی اذان سے پہلے پہلے ارکانِ تبلیغ ادا ہو جانے چاہئیں۔ جلدی سے جھپٹ کر گھر گئے۔ ایک بڑے صوفی کا تہمد کرتا' عمامہ گھر میں ان کی تسبیح کے ساتھ' بزرگوں سے پینچار کھا چلا آتا تھا' برآمد کر کے لے آئے اور مسجد کے غسل خانے سے برآمد ہوتے ہی مس طمنچہ جان کے یہاں کے نجس ملبوس اتار پھینکے۔

عجلت کا وقت تھا' مغرب کی اذان سے قبل قبل ارکانِ تبلیغ ادا ہو جانے تھے اور مسجد میں یوں بھی مغرب کا مجمع زیادہ ہوتا ہے اور آج اور بھی نمازی تماش بین جمع تھے۔ ببا نے حقانی خلیفہ کو حکم دیا کہ چوپال والی جو کوٹھری چھت تک گڑ کی بھیلیوں سے بھری ہے' اس میں سے نمازی گن کر بھیلیاں مسجد کے فرش پر ڈھیر کر دے۔ اور مغرب کی اذان سے قبل قبل پیش امام نے تنوں خاں کو طوطے کی طرح پانچوں کلمے پڑھائے' اور دوسرے ارکانِ ایمان ادا کرائے۔ بدھنا بھر پانی پہلے ٹونٹی سے تنوں خاں نے پیا' پھر عمائدین دیہہ نے گھونٹ بھرے۔ اتنے میں موذن نے مغرب کی اذان پکاری اور ببا کے منھ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ لو اللہ نے گواہی دی۔"

اور تنوں خاں' تنویر محمد خاں کے نام سے شریک جماعت ہوئے۔ عشا تک بستی میں چہل پہل

رہی۔ بستی کے گھر گنے گئے اور چوپال والی کوٹھری کی بھیلیاں شمار ہوئیں' اور اللہ کی شان برکت دیکھیے' گھر پیچھے بھاتی۔ ٹرے کی ایک ایک بھیلی بڑی اور' اور بچ رہیں تو چمار بھنگی وغیرہ رعایا میں برابر کی تقسیم ہوئی۔

عشا کی نماز سے نبٹ کر حویلی میں جانے کا وقت نہ تھا' صرف ایک مہمان کا کھانا بیا کے لیے اور ساتھ آیا۔ دونوں بیٹا باپ بٹی سے پٹی ملا کر چوپال میں آج عمر میں پہلی مرتبہ پاؤں پھیلا کر سوئے۔ فجر کی اذان نماز سے فارغ ہو کر باپ بیٹے کو لے کر حویلی میں ماں کے حضور پہنچا تو عورت ذات چھاتی پیٹ اٹھی' اور حقانی نمک حرام حجام کو کوسنے دینے لگی اور بیٹے کو آغوش میں بھرلیا۔ اور اندر والے دالان در دالان میں بستر جمادیا' تا آنکہ سر داڑھی' مونچھوں اور کم بخت نمک حرام نائی بچہ کے ہاتھوں ٹونیں بھنوں کے بال نہ جم آئیں' بیٹے کو بٹیا بنا کر پردہ بٹھادیا۔ بھوبل گلی چکلہ تو در کنار جہاں مداری کا تماشا ہو چکا تھا' شہر کے اندر بھی منھ دکھانے' کالج جانے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ حتیٰ کہ گاؤں کے اندر نکلنے اور اپنے کھیتوں پر نگرانی دیکھ بھال کرنے کے لیے بھی یارا نہ تھا۔

اور اب تو چک اس کے اپنے تھے۔ کھڑی فصلیں اس کی اپنی تھیں۔ بھری نجاریوں' کٹھاروں کا وہ مالک تھا۔ کوٹھی والوں آڑھتیوں کے بھرے گوداموں میں آلو' موم پھلی' رتالو' اروی' خشک جنس اور سبزی منڈی کے بیکاروں' تھوک خریداروں کے ذمہ جملہ وجوب اس کے تھے' مگر شہر میں جانے کی ہمت اور منھ اس کا نہ تھا اور یہ بیا خاکسار خاں' آڑھتیوں کوٹھی والوں' سبزی منڈی کے تھوک خریداروں میں خود سرانجام دیتے رہے۔ تنوں خاں شہر کا راستا ہی بھولے رہا۔ البتہ ذرا حلیہ درست ہوتے ہی سابق بھائی سردار خاں کی طرح کھیتوں پر نظر آتا اور کہا کرتا۔

"دو نائب تحصیل دار' تھانے دار ہو کر تو ساٹھ روپے ماہوار ملتے اور اب سال میں کئی ہزار کھیتوں سے پیدا کر لیتا ہوں۔ اور وہ سرکار کی دین تھی' یہ اللہ کی دین ہے۔"

ابوالفضل صدیقی

شاہزادہ محی الدین (عالم گیر اورنگ زیب*)

شرت پور نما تھی (ہندی مہینہ کنوار کی روشن ترین اور سال کی شفاف رات جو چودھویں تاریخ کو ہوتی ہے) اور شاہ جہانی جشن ماہتاب، شاہ جہاں آباد میں پوری تاریخ آب و تاب کے ساتھ بپا تھا۔ شاہ جہاں آباد (دہلی) شہر کا چپہ چپہ نورالعلیٰ نور بقہ نور ہو رہا تھا۔ آساڑھ ساون بھادوں تین ماہ کے دھلے نکھرے زمین و آسمان، اوپر نیلگوں چھت، نیچے زمردیں فرش، فضا مسکراتی نم ناک، موسم خنک، ہوا پیاری پیاری خوش ادا سازگار، راستے تاحد نگاہ روشن، ہموار و پر امن۔ از ولایت ہرات و غزنی تا ملک بنگال آسام، اور از کوہ گلگت سری نگر تا ملک دکن، راس کماری، مملکت عالیہ بھر کے تمام منصب دار ہفت ہزاری، پنج ہزاری، سہ ہزاری والاتبار مع خدم و چشم حسب مرتبہ شریک جشن تھے۔ شاہزادہ عالی جاہ محی الدین ملک دکن سے، شاہزادہ عالی جاہ شجاع ملک آسام و بنگال سے، شاہزادہ مراد عالی جاہ گجرات خاندیش سے وارد مرکز شاہ جہاں آباد تھے اور برادر معظم شاہزادہ دارا شکوہ ناظم دوئم وزیر اعظم اکبر آباد و مرکز و والئی راجپوتانہ کے مہمان خصوصی اپنے محلات واقع شاہ جہاں آباد میں قیام فرما تھے۔ اور آج جشن ماہتاب کے بعد دوسری شب تھی اور چاند کی پندرھویں تاریخ۔ شہنشاہ معظم، مغل اعظم، صاحب قرآں ثانی حضرت شاہ جہاں اور ملکہ معظمہ قدسیہ ارجمند بانو بیگم، ممتاز محل، تاج بی بی، قلعہ معلی میں اپنی خواب گاہ کے اندر واجبات وتر اور نوافل تہجد، نصف شب کی نمازیں پڑھ کر فارغ ہو چکے تھے اور آخر شب کی کلام پاک کی مقررہ تلاوت کر چکے تھے اور سورہ الرحمٰن شریف اور سورہ مزمل شریف پڑھ کر اذان فجر کے صدا بر گوش منتظر تھے اور کلام اللہ گردان کر کے دونوں کے سامنے دو رحلوں پر رکھے ہوئے تھے۔ شمع کافوری کی ہلکی ہلکی بھینی بھینی روشنی اور خوشبوؤں میں مغرب کے دریچوں سے افق میں ڈوبتے ہوئے چاند کی ماندی سی روشنی، اور پائیں باغ سے رات کی رانی کے مہکتے ہوئے پھولوں کی بھینی بھینی ملی جلی خوشبوؤں کے امتزاج میں نور و خوشبوؤں میں لپٹا یہ جوڑا، خطائے خوردن گندم و سزائے ہبوط آدم سے قبل قصر جنت میں جیسے آدم و حوا قبلہ و قطب رو بیٹھے نظر آ رہے تھے کہ ملکہ عالیہ نے جو قطب رخ تشریف فرما تھیں، کعبہ رو تشریف فرما شہنشاہ معظم کی جانب اجازت کلام طلب نگاہیں اٹھائیں، اور شہنشاہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت مرحمت فرمائی، ملکہ عالیہ نے مہر سکوت توڑی۔

---

* یہ ابوالفضل صدیقی کا آخری افسانہ ہے۔ افسانہ پورا کرنے کے دو دن بعد ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا جو بعد ازاں مرض الموت ثابت ہوا۔

"ظل الٰہی بفضلہ' اس مرتبہ خیر سے جشن ماہتاب بڑا کامیاب بھرپور رہا' حاضری حضوری بڑی مکمل رہی' بھی چھوٹے بڑے جمع ہیں۔ مملکت عالیہ بھر میں اللہ کا فضل ہے' سکون و امن و آشتی کا دور دورہ ہے' بڑی مبارک ساعتیں ہیں۔ لیکن جہاں پناہ' خاندان کی تاریخ تکرار سے خدانخواستہ اس کنیز کا کلیجہ دہلتا ہے' بے بے! جد امجد شہنشاہ جنت مکانی حضرت ہمایوں برادران یوسفؑ کے ہاتھوں کیسی کیسی بے وفائیوں' معافی خواہوں اور بار بار کی سرکشیوں سے دوچار ہوئے' معاذ اللہ' کن کن احسان فراموشیوں کا شکار ہوئے (زبان دبا کر) اور معالی حضرت شہنشاہ اکبر اعظم پہلے تو بیموبقال اور خان خاناں بیرم خاں کی کورنمکیوں سے یکے بعد دیگرے نبٹے اور پھر راؤ چندیلہ کی ڈکیتیوں اور اپنے محبوب وزیر اعظم ابوالفضل علامی کے قتل اور ماتم شاہی سے دوچار ہوئے (بات آئی گئی سی کرتے ہوئے) اور آخرالامر پسر عالی جاہ کے ساتھ نوبت مخالفت از آگرہ اکبر آباد تا پراگ الہ آباد پہنچی' معاذاللہ اور جہاں پناہ تو اس کنیز ناچیز سے بھی زیادہ مفصل واقف حالات ہیں۔ خاندان کی تاریخ ایسی ہی ناہموار نشانیوں سے بھری ہوئی ہے کیا عرض کروں ناقابل بیاں (لہجہ فخریہ ہو گیا) لیکن بحمداللہ میرے چاروں میرے جائے ہیں' ایک سے ایک بڑھ کر ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب نظر بد دور۔ رزم میں ایک سے ایک بڑھ کر ایک صف شکن جرنیل' بزم میں ایک سے ایک بڑھ کر ایک منصف عادل' ناظم اپنی اپنی ولایت پر قابو یافتہ۔ لیکن جہاں پناہ تاریخ خاندان کی ناہموار ہے' میرا کلیجہ دہلتا ہے' اگر ایسے مکمل حالات میں آنحضور تعین ولی عہدی اور توریث تخت نشینی کا اعلان فرمادیں تو نہایت مناسب موقع ہے۔"

اور شہنشاہ نے سنجیدگی کے ساتھ ملکہ کے منھ سے بات لے لی اور اثبات آگیں نگاہوں سے آنکھیں چار کیں اور فرمایا۔

"ملکہ عالیہ عجب توارد ہے' اس گھڑی عین یہ ہی خیال میرے دل میں بھی تھا اور سورہ رحمٰن شریف اور سورہ مزمل شریف کا فیضان اور تصرف ہے کہ آپ کی مامتا کا خلوص اس جانب سے پہلے بول پڑا۔ درحقیقت حالات جیسا کہ ملکہ عالیہ نے اندازہ کیا نہایت سازگار ہیں۔ شاہزادہ عالی جاہ محی الدین دکن سے اپنی فتوحات کا ہدف پورا کرکے اور بخیرہ خوبی امن و اماں قایم کرکے اس مرتبہ خاص آن بان شان کے ساتھ وارد ہوئے ہیں' گولکنڈہ کی کانوں کا منوں سونا اور بیجاپوری کانوں کے سیروں جواہرات شاہزادہ عالی نے برادر معظم دارا شکوہ کو نذر پیش کیے ہیں اور بہت سے مغربی ساخت کے جڑاؤ زیورات جو بیگمات دکن استعمال کرتی تھیں خواہران نسبتی بہو بیگمات' شاہزادہ دارا شکوہ کو تحفے میں پیش کیے ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہوا ہے کہ اس مرتبہ برادر معظم شاہزادہ عالی جاہ دارا شکوہ نے یہ تحفہ نذر قبول فرمالیا ہے۔ اور زیورات بیگمات نے پسند فرما کر خوشی خوشی استعمال کرلیے ہیں ورنہ اس سے قبل.....

ذرا گھونٹ لے کر

"ہر دو شاہزادگان عالی جاہ برادران حقیقی نے بہ خلوص تمام معانقہ کیا ہے اور ماواجبات تمام ادا کیے ہیں' وہ کدورتیں شکایتیں جو خروج دکن کے وقت مرکزی دور افتادہ ہدایتوں کے تحت ہوجایا کرتی تھیں اور جنھیں

شاہزادہ عالی جاہ برادران شاہزادہ دارا شکوہ کی دخل در معقولات سمجھ کر شاکی ہوجایا کرتے تھے' بالمشافہ ہونے پر ہر دو برادران کے تیوروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ازالہ ہوگیا ہے' اور یہ چغتائی خاندان میں بڑا خوش آیند امر ہے اور یک دلی و یگانگت کی بڑی صاف مثال ہے۔ دیگر امور یہ کہ اس مرتبہ چغلیاں سازشیں بھی کم ہوئیں' اگرچہ اجتماع بھرپور تھا' اور جو ہوئیں ان کا خوش اسلوبی کے ساتھ ازالہ کردیا گیا۔ ملکہ عالیہ این جانب کو آپ کی تجویز سے مکمل اتفاق ہے۔ تعین ولی عہدی اور مرکزی تخت نشینی کا اعلان فی الفور ہوجانا چاہیے اس کے لیے نہایت مناسب وقت ہے' تاہم اس اہم امر میں این جانب کو وزیر دانا سعد اللہ علامی سے خلوت خاص میں مشورہ کرنا ازبس ضروری ہے....."
اور ملکہ نے پھر اجازت طلب آنکھیں چار کیں اور فرمایا۔
"ظل الٰہی ضرور' تاہم اس کنیز ناچیز کی رائے اور تجویز کا وزیر اعظم کے روبہ رو حوالہ نہ دیں۔"
اور اتنے میں موتی مسجد کے مینار اذان سے اذان فجر بلند ہوئی اور شہنشاہ اور ملکہ کے منہ سے بہ یک وقت جل الہ شان' نکلا۔ اذان سن کر شہنشاہ نے فرمایا۔
"ملکہ عالیہ آپ کی تجویز اور این جانب کے ترجم پر اللہ تبارک تعالیٰ نے بھی شہادت دی......"
اور یہ کہتے ہوئے شہنشاہ نماز کے لیے موتی مسجد تشریف لے گئے اور ملکہ عالیہ تازہ وضو کرنے آب دار خانے میں گئیں۔

نماز فجر کے بعد شہنشاہ نے خلوت خاص میں وزیر اعظم سعد اللہ علامی کو طلب فرمایا۔ خلوت خاص قلعہ معلٰی کا تین منزلہ زیریں تہ خانہ تھا جو انجینیروں اور معماروں کی یادوں سے بھی محو ہوچکا تھا اور شہنشاہ نے جو خود ایک ماہر انجینیر بھی تھا' اپنی نگرانی خاص میں تعمیر کروایا تھا۔ وہاں اب کسی فراش کا بھی گزر نہ ہوتا' نامعلوم سا گوشہ جس کی سنگین دیواروں پر پتلی لکڑی کی سوراخ دار تہ چڑھی ہوئی تھی اور آواز بدو بالمشافہ مخاطب اور مخاطب علیہ کے درمیان رہتی تھی۔ خاص الخاص ہستیوں کو ہی وہاں باریابی ہوتی اور اہم ترین امور مملکت وزیر اعظم اور شہنشاہ کے درمیان زیر بحث آتے۔ اور شہنشاہ نے وزیر اعظم سعد اللہ علامی سے اس اہم امر میں رائے طلبی فرمائی' وزیر اعظم نے عرض کیا۔
"ظل الٰہی نے ہیچ مدان کو علامی کے خطاب عالیہ سے ملقب فرمایا ہے اور یہ اسی کا فیضان فرمان ہے کہ مردم شناسی میں شدید ہے اور دعویٰ تو نہیں رائے طلبی کے لیے حاضر ہوں لیکن دو معروضے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ کہ اس تقریب ملاقات کو پوری طرح اخفا میں رکھا جائے' دوسری یہ کہ اس ہیچ مدان کو آج مغرب تک کا وقت عطا فرمایا جائے کہ بڑی اچھی ساعت ہے اور شاہزادگان دور کے دیکھے سنے اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ بہرحال پرچول اور مہمات کے ذریعہ سمجھے ہوئے ہیں' چناں چہ ہر چار شاہزادگان عالی جاہ سے ملاقات کرنے کے مواقع دیے جائیں۔ اور آخری اور اہم ترین یہ ہے کہ ظل الٰہی یوں تو عقل کل ہیں اور ترمیم و تنسیخ کے اختیارات قدرت نے ظل الٰہی کو عطا فرمائے ہیں۔ لیکن ......" وہ کہتے کہتے اک ذرا سا رکے اور شہنشاہ نے نگاہ التفات سے اجازت کلام دی۔

"کہیے کہیے۔"

تو عرض کیا۔

"جہاں پناہ اوں' آں' ایں' پھر عرض یہ ہے کہ اس اہم امر میں میری رائے اور فیصلے پر عمل در آمد فرمایا جانا یقینی اور حتمی بھی ہو۔"

شہنشاہ نے نظر خاص سے تسلیم کیا اور آخر آخر وزیر اعظم نے عرض کی۔

"جہاں پناہ اس غلام کو سب شاہزادگان کی جائے قیام پر یوں ہی خدم و حشم بغیر علم و اطلاع' شارع عام پر تن تنہا پہنچنے کی اجازت خاص مرحمت فرمائی جائے۔"

اور یہ ذرا رقت کا بند تھا' معمولی مغل سردار اور راجپوت منصب دار اپنے دیوان خانوں سے جمعہ کے جمعہ مسجد تک آتے' یا کوچ کیا کرتے' غرض نکلا کرتے تو خدم و حشم نقیب و نقارہ اژدہام اردگرد ہوتا اور مسجد میں بھی ان کے لیے جگہ مخصوص و ممیز ہوتی' لیکن آج بہ اجازت خصوصی ہرات غزنی سے بنگال آسام اور کلکت سری نگر سے تا بہ دکن اختیار اعلی ایک معمولی سے گھوڑے پر سوار' ایک عام سے سائیس کی معیت میں تن تنہا شارع عام پر چلا جا رہا تھا۔ باد بہاری کی چال' سلامت روی میں' نہ برق نہ صرصر نہ زلزلہ' گویا ابر نیساں بے کڑک بطن صدف میں قطرہ گوہر بار ڈالنے اور بطن صدف کے منھ بھی بند تھے۔ مرکز عالم جنبش میں تھا اور عالم بے خبر۔ عوام الناس تو عوام الناس خاص الخاص بھی بے خبر تھے کہ مقدر کا فیصلہ حرکت میں ہے۔ راہ گیروں میں جس نے پہچان لیا سر بہ سجدہ ہو گیا۔ بہتیرے یوں ہی بے خیالی میں گزرے چلے گئے۔ بھلا سمجھنے کی بات ہوتی تو سمجھتے۔ اور وزیر اعظم' شاہزادہ عالی دارا شکوہ کے محل خاص پر وارد ہوئے۔ دربان نے پہچان کر اطلاع دی اور شاہزادہ عالی جاہ کیسری لباس میں' طلائی سرپیچ پر "اوم" پٹی پر "برہم" جڑا ہوا' داڑھی گھنی' جد امجد مہابلی اکبر اعظم کی سنت ماتھے پر سیندور و صندل کا تلک دھاری کیے ہوئے بر آمد ہوئے۔ آگے آگے جاٹ دائیں بائیں دو برہمن۔ پیچھے راجہ راج کنواروں کا حسب مرتبہ جلوس لیے پیشوائی فرمائی اور چشم براہ ہاتھوں ہاتھ اندر لے جا کر اس نشست خاص پر براجمان کیا جس پر ایک مرتبہ ظل الٰہی اطبا خاص کے ساتھ علیل پوتے کی عیادت کے لیے آ کر تشریف فرما ہوئے تھے۔

وزیر اعظم کچھ دیر متمکن رہے' موضوع سخن جشن ماہتاب کی کامیابی رہی۔ اکثر راجپوت سرداروں' راج کنواروں سے واقف ہی تھے جن کو نیاز حاصل نہیں تھا' ان سے تعارف کرایا' چلتے وقت اشرفیوں کا تھال اور زر و جواہرات کا خوان پیش کیا جو وزیر اعظم نے حسب دستور چھو کر نذر قبول کی اور برہمنوں کو دان کر دیا۔ گیندے کے پھولوں کے ہار پہنائے۔ وقت رخصت باہر تک مع خدم و حشم الوداع کرنے آئے۔ رخصتی مصافحہ میں شاہزادہ نے دست بوسی فرمائی اور راج کنواروں نے رکاب چومی' برہمنوں نے آشیرواد دی اور بھانڈوں نے گیت گائے' غرض تمام و کمال ما واجبات ادا ہوئے۔ تاہم یہ تقریب ملاقات نہ شاہزادہ ہی اور نہ حالی موالی مصاحبین ہی سمجھ سکے اور گو کہ یہ وزیر اعظم کی روز مرہ کی دیکھی بھالی بدعتیں تھیں' تاہم اس خاص گھڑی کچھ زیادہ ہی مکدر ہوئے۔

یہاں سے سوار ہو کر شاہزادہ عالی جاہ شجاع والیِ بنگال و آسام کے در دولت پر پہنچے' دربان نے پہچان کر اطلاع کی۔ شاہزادہ اپنے وکلا اور مصاحبین خاص الخاص کے درمیان تھا۔ استقبال کے لیے مع خدم و حشم باہر آیا اور چشم براہ اندر لے گیا' اور مقررہ جانبین شاہزادگان عالی و وزیراعظم ما واجبات ادا ہوئے۔ نشست خاص پر تشریف فرما کیا۔ کچھ دیر وہی جشن ماہتاب زیر گفتگو رہا اور عام سی باتیں ہوئیں۔ مقربین مصاحبین سے تعارف کرایا اور رخصت کرتے ہوئے عطر کیوڑہ' بنگاماتی پان کی ورق طلائی میں لپٹی گلوریاں پیش کیں جو وزیراعظم نے بہ رضا و رغبت قبول کیں۔ تھال بھر نادر زمان' بنگال' آسام کے مخصوص پانیوں میں پائے جانے والے رنگین موتیوں کا تحفہ اور شاہ جہانی اشرفیاں کے خوان اور بنگال کا مخصوص صنعتی تحفہ' ڈھاکا کی ململ کے تھان پیش کیے جو پورا تھان انگوٹھی میں سے گذر جاتا تھا۔ یہ تحفہ خاص طور پر وزیراعظم کو بہت پسند آیا۔ گلوریاں چبائیں' عطر ملا۔ شاہزادہ عالی مع خدم و حشم باہر تک چھوڑنے آئے۔ رخصتی مصافحہ میں دست بوسی کی اور بقیہ سب نے رکاب بوسی کی۔ یہاں بھی بات گومگو میں رہی' شان نزول کوئی نہ سمجھا۔ ہرچہ بادا باد شاہزادہ عالی جاہ اور وزیراعظم کے درمیان گاہے گاہے رسم سی تھی' البتہ اس تکدر کا ازالہ کلی ہو گیا جو خواہ مخواہ آئے دن کے دیکھے بھالے بھرے بھکلے شاہزادہ عالی جاہ دارا شکوہ کی تقریب ملاقات سے لے کر آئے تھے۔

اور اب شاہزادہ عالی جاہ مراد والیِ گجرات کی باری تھی۔ در دولت پر پہنچے تو دربان غائب تھا' ذرا اک ساعت توقف کیا اور سائیس کو اشارہ کیا۔ سائیس نادم خاموش سا واپس آیا' کچھ کہہ نہ سکا' تو زین سے اتر کر ڈیوڑھی پار کر کے دیوان خاص کے صحن میں جا کھڑے ہوئے سامنے دالان میں محفل اکل و شرب بپا تھی اور مجلس رقص و سرود جمی تھی۔ سب کے سب ہی نشہ میں دھت تھے اور سب سے زیادہ شاہزادہ عالی مدہوش تھے' پہچان کر ہانک لگائی۔

''آؤ وزارت پناہ شراب طہور کا وعدہ تو وعدہ قیامت ہے' آج لال پری حلال ہے' آؤ پیو۔''

شاہزادگان عالی جاہ اور وزارت پناہ کے درمیان مخصوص مقررہ روابط اور فاصلے تھے۔ وزیراعظم نے کھسیا کر لاحول پڑھی۔ شاہزادہ عالی جاہ کو تو تادیبی کلمات لاحول پڑھ کر ادا کیے ادھر شاہزادہ عالی جاہ نے ارباب نشاط کو اشارہ کیا اور شاید سب نے ایک ایک جام وزارت پناہ کی صحت کا پیا اور ساز و آواز ہوتق ہو گئے اور مجمع مرغ بے ہنگام ہو گیا' تو وزیراعظم نے شاہزادہ عالی جاہ کی بے راہ روی پر ارباب نشاط کو ڈانٹا۔

''بھاگو بدنصیبو! کم بختو! نمک حراموں! یہاں سے۔'' اور پھر لاحول پڑھی۔ شاہزادہ عالی جاہ کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے انتہائی تکدر کے ساتھ باہر آئے۔

اب دن ڈھل چکا تھا اور شاہزادہ محی الدین والی دکن کی بارگاہ کی باری تھی۔ محل خاص پر پہنچے تو پتا چلا کہ شاہزادہ عالی جاہ نماز ظہر کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے ہیں۔ مسجد سے طلب کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ خود ہی در مسجد پر پہنچے تو سامنے بیچ کی محراب میں شاہزادہ عالی جاہ والی دکن تلاوت کلام پاک

فرما رہے تھے۔ ظہر کی جماعت ہو چکی تھی اور ظہر عصر کا درمیانی سا وقت تھا۔ تلاوت کے وقت ما واجبات بھی ادا ہونے کا سوال نہ تھا اور صرف سلام علیکم پر اکتفا رہا' ظہر کا وقت ختم ہو رہا تھا' تنگ وقت پر وزیر اعظم نے نماز ظہر ادا کی۔ شاہزادہ عالی جاہ میٹھی میٹھی زیر لب قرأت میں تلاوت خاص عصر و ظہر کے درمیان پڑھتے رہے اور یہ نماز ظہر ادا کرتے رہے۔ ادھر وزیر اعظم نے نماز ظہر ختم کی' ادھر شاہزادہ عالی جاہ نے کلام پاک گردان کر کے رحل پر رکھا اور برابر والی چٹائی پر وزیر اعظم بیٹھ گئے۔ مسجد اور کلام پاک کے درمیان ما واجبات سے استثنیٰ رہا' تاہم علیک سلیک اور رسمی مزاج پرسی ہوئی اور اب صورت نشست دو چٹائیوں پر آمنے سامنے تھی اور قرآن پاک رحل پر ایستادہ درمیان میں' اور ناظم مرکز وزیر اعظم و شاہزادہ عالی جاہ والی دکن باوضو تھے۔

شاہزادہ عالی جاہ نے جشن کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے ماحول کو خوش گوار بنایا اور وزارت پناہ سے اجازت کلام طلب فرمائی اور نہایت نرم اور شستہ انداز بیاں میں لیکن در حقیقت جواب طلبی سے گریز کرتے ہوئے دریافت حال کیا۔

''ایک گروہ بھکشو کنھیا کڑی برہمنوں کا بنگال آسام کی سرحد پر پہنچا' یہ گنیش سیوک پوجک برہمن ہیں اور ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں اور چلتے پھرتے مال دار خوش حال بھک منگے ہیں۔ سرحد کی چوکی پر ان سے پروانۂ راہ داری طلب کیا۔ ظاہر بات ہے کہ پروانۂ راہ داری خیرات میں نہیں ملا کرتے اور یہ تو بدرجہ مجبوری چوکی پر پہنچے تھے۔ دریائے برہمپتر طغیانی پر تھا' ورنہ ہاتھیوں کے ذریعہ کہیں سے بھی پار کر جاتے۔ ان کم بختوں کی روک کر تلاشی لی اور قصہ مختصر یہ کہ پہرہ داروں نے لوٹ لیا۔ افتاں و خیزاں ناشی شاہ جہاں آباد کی شہر پناہ تک پہنچے تو یہاں کے پہرہ داروں نے اسی عمل کی تکرار کی جس سے سرحد کی چوکی پر دوچار ہوئے تھے۔ تاہم یہ بھک منگے مرچڑے برہم رینگتے سرکتے نگاہ بچاتے قلعہ معلیٰ کی فصیل تک جا پہنچے اور لگے زنجیر عدل کا مقام تلاش کرنے۔ لیکن یہاں کے ذکی الحس پہرہ داروں سے نہ بچ سکے۔ پکڑے گئے اور جاسوس قرار دے کر قید خانے میں ڈال دیے گئے اور حوالات میں ہیں۔ قاعدہ کی رو سے اندر تیس یوم کوتوال کو انھیں عدالت کے سامنے پیش کر دینا تھا اور عدالت سے ابتدائی جرم ثابت ہونے پر اندر پندرہ یوم' قاضی القضاۃ کے رو بہ رو نظر ثانی کے لیے پیش ہو جانا تھا اور یہاں سے بھی سزا بحال ہونے پر اندر تیس یوم وزارت پناہ کے رو بہ رو ان کی تراحم خسروانہ کے لیے پیش ہونا تھیں' لیکن آج ایک سال سے زائد عرصہ گزرا' کوتوال نے ان کی پہلی پیشی بھی نہیں کرائی اور حکومت کے حوالات میں قید و بند جھیل رہے ہیں اور حکومت ان کے اخراجات خورد و نوش سے زیر بار ہے اور یہ بدنصیب بھیک کی آمدنی اور اپنے مال مویشی سے محروم ہیں۔''

شاہزادہ عالی جاہ کا محاسبہ از کوتوال تا عدالت قاضی تھا' لیکن میزان کی ذمہ داری ناظم اعلیٰ وزیر اعظم تک پہنچتی تھی۔ وزیر اعظم کے پاس بجز خاموشی چارہ نہ تھا۔ ادھر شاہزادہ عالی جاہ نے بھی تنبیہ کا پہلو بچاتے ہوئے بات کی تھی۔ آئی گئی کر دی۔ دوسرا استفسار یہ انداز ساتھ ہی ہدایت و ہم خیالی کا سلیقہ

لیے ہوئے اطلاع دی۔

"برادر معظم شاہزادہ عالی جاہ' دارا شکوہ کے ساتھ جودھ پوری راج کنور جسونت سنگھ نامی رہتا ہے۔ یہ رانا پرتاپ' چتوڑ گڈھ والے کا ہم شیرزادہ ہے۔ راجہ مان سنگھ راٹھور نے فتح چتوڑ کے بعد یہ شادی جودھ پور سے سیاستاً" طے کرادی تھی۔ والیِ چتوڑ کے زیر ہو جانے کے بعد بھی بغاوت تو کیا مخالفت سے باز نہ آیا۔ اور یہ راج کنور جسونت سنگھ بغاوت کے جراثیم ننھیال سے تربیت میں لے کر آیا ہے۔ مثل اہل زبان فارسی پر قادر ہے اور ننھیال میں پرورش پائی ہے' جہاں اس کو مخصوص محاذ پر تربیت دی گئی ہے۔ فارسی زبان کا منشی اور بڑا فطین' ذہین اور زہریلا ہے۔ یہ شاہزادہ عالی جاہ کے اندر تناسخ اور الحاد و اشراک کی تخم ریزی اور ترویج و اشاعت کرتا ہے' اور یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ شاہزادہ عالی جاہ کے اندر چوتھی پشت میں مہابلی اکبر اعظم نے جنم لیا ہے' اور شاہزادہ عالی جاہ ابھی تشکیک میں مبتلا ہیں۔ یوں بھی مطالعہ تناسخ کے شوقین ہیں۔ ابھی حالات قابو سے باہر نہیں ہونے پائے ہیں۔ بہتر ہے کہ اس راج کنور کا تبادلہ آنحضور اپنے اختیار تمیزی سے افغانستان کسی نیابتی عہدہ پر کرا دیں۔"

وزیر اعظم نے بات کاٹ دی۔

"شاہزادہ عالی جاہ قطع کلام معاف' اور کلام آنحضور بالا' یہ بتائیے' یہ آسانی سے ممکن ہے' جب کہ آپ کے علم میں ہے کہ یہ ناظم اعلیٰ کے عمل نظامت سے بالاتر اور قاضی القضات کے اختیارات سماعت سے باہر ہیں اور میرا کوتوال اس صدائے الحاد کا تدارک نہ کر سکا۔" .... (اور وزیر اعظم ابھی ذرا دیر قبل صبح ہی صبح شاہزادہ دارا شکوہ کے باب عالی پر ہمہ وقت گونجنے والی صدائے الحاد "لا الہ" سن کر ہی آ رہے تھے)
"جسے شاہزادہ عالی دارا شکوہ لوح محفوظ کا نوشتہ سمجھتے ہیں۔ اور شاید الا اللہ کے منتظر ہیں یا پتا نہیں اس عریاں فقیر سرمد نامی کو فنافی اللہ خیال فرماتے ہیں۔" وزیر اعظم کا جواب باجواب تھا' شاہزادہ محی الدین خود بھی مذکورہ "قد نحن" کے مراعات یافتہ تھے اگرچہ کبھی اس عابد زاہد قلندر منش شاہزادہ کو ان مراعات سے فائدہ اٹھانے کی نوبت نہ آئی تھی اور شاہزادہ عالی جاہ نے فوراً" ہی ایک سوال آنکھوں ہی آنکھوں میں وزارت پناہ سے اجازت طلبی کے ساتھ اور کیا۔

"یہ چتلی قبر کے سادھو کی ہرزہ گوئی' سوئے ادبی کا کیا قصہ ہے؟"

وزیر اعظم حقارت اور تضحیک کے انداز میں ہنسے اور فرمایا۔

"شاہزادہ عالی جاہ سوئے ادبی تو کیا' ہرزہ گوئی کہئے' بلکہ لطیفہ مضحکہ (سنجیدہ ہو کر) آپ ہم سب جانتے ہیں شاہزادہ عالی جاہ دارا شکوہ گہرے تصوف کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے زیر اثر یہ فنافی اللہ وغیرہ امور میں دخیل و ضم یہ سرمد عریاں فقیر بھی در دولت پر نازل کر رکھے ہیں' اور حد ہے شاہزادہ عالی جاہ اس ضمن میں مشرکین سادھوؤں کی بھی تخصیص نہیں فرماتے۔ ایک سادھو چتلی قبر کے پہاڑوں میں کم بخت کہیں سے نازل ہو گیا' اور اپنی کٹیا بنالی۔ شہرت چل پڑی' اور خلق خدا رجوع ہو گئی۔ افواہیں اور پھر کشف و کرامات کی' پر لگا کر اڑا کرتی ہیں' شدہ شدہ شاہزادہ عالی جاہ دارا شکوہ کے کان تک پہنچی۔ دیوانہ را ہوئے

بس است۔ مشرکین حاضر باش ندیموں کے ہمراہ سادھو جی کے درشنوں کے لیے یوں ہی مخلاالطبع جا دھمکے' اور پلٹے تو عقیدت کا شکار ہو گئے۔ اور چند بار کے درشنوں میں اس درجہ چڑھی کہ جہاں پناہ سے تذکرہ فرمایا' اور یہاں تک کہ ظل الٰہی سے نیاز حاصل کرنے کی تجویز پیش کی تو اس ہیچ مدان نے اپنے فرائض منصبی کے مطابق مداخلت کی' اور شاہزادہ عالی جاہ اور ظل الٰہی دونوں سے بالمواجہ عرض کیا کہ سادھو جی تشریف لائیں ہم انھیں درباں میں موقر نشست دیں گے۔ مشہور تھا کہ سادھو جی کی کئی ہزار سال عمر ہے' اور کئی سال سے بولے نہیں ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ اور ایسے موقعوں پر مجھے تناسخ کی ترویج و اشاعت کا وسوسہ گزرتا ہے' جو باطل اور اسلام کے سخت منافی' اور قضا و قدر' روز قیامت' سزا جزا کا بطلان کرتا ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے شاہزادہ عالی جاہ دارا شکوہ مزاج ظل الٰہی میں کچھ زیادہ ہی دخیل ہو گئے ہیں۔ میں نے حد امکاں بھر مخالفت کی' لیکن نہ چلی' اور یہاں تک کہ شاہزادہ عالی جاہ نے ظل الٰہی کو بغیر روایتی خدم و حشم' اور نقارہ' علم و پرچم شاہزادہ عالی جاہ اور یہ غلام گھوڑیوں پر سوار تھے البتہ اپنے چند انھیں عقیدت مندوں مشرک راجپوت ہمرائیوں کے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ اور سادھو عیار اور کم مایہ تھا' جس کا مجھے غائبانہ اندازہ تھا۔ کم بخت اتنا بھی برداشت نہ کر سکا ظل الٰہی ہمراہ فرما تھے' خلاف امید کٹیا سے مرعوب ہو کر باہر نکل آیا' بندر کی سی اضطراری حرکتوں سے سلام و کورنش بجا لانے لگا اور مائل بہ تکلم ہوا تو ظل الٰہی نے اندازہ فرما لیا اور دریافت فرمایا۔

"سادھو جی' آپ کی عمر کیا ہے؟"

اور یا تو یہ مشہور تھا کہ سادھو جی صدیوں سے چپ ہیں' اور اسی مناسبت سے چپا مہاراج بابتے بھی تھے' اے لو وہ تو بول پڑے' اور عمر کا حساب بھی سن و سال کے اعداد و شمار کی بجائے مستند تاریخی اعتبار سے بتایا' کہا۔

"سکندر اعظم اور امیر تیمور گرگانی سے جو جج (جنگ) ہوئی ہے تو میں امیر تیمور گرگانی کی جانب سے لڑا تھا۔"

اور پیشتر اس کے کہ کوئی اس تاریخی معلومات پر کچھ کہنے پائے' برجستہ بولے۔

"اور امیر تیمور گرگانی اور حضرت محمد صاحب سے جو جج ہوئی ہے' اس لڑائی میں بھی امیر تیمور گرگانی کی رُت سے لڑا تھا۔"

شہنشاہ معظم' ظل الٰہی اس سوئے ادبی' اور بے سروپا تحقیق پر بہت جز بز ہوئے اور بد مزا ہو کر فرمایا۔

"سنا آپ نے سعد اللہ علامی' ظالم میرے جد امجد کو کافر قرار دیتا ہے۔"

"اور ظل الٰہی کا روئے سخن بہ ظاہر تو اس خاکسار کی جانب تھا' لیکن مخاطب صحیح شاہزادہ دارا شکوہ تھے جو ترکی زبان سمجھ سکتے تھے اور خیریت گزری ورنہ میرے اعماق شکم سے بے اختیار ہنسی اٹھ رہی تھی' لیکن کنکھیوں سے ظل الٰہی کی یک گونہ تلخی و تاسف کا اندازہ کر کے بہ مشکل ہنسی ضبط کی اور اپنے طور پر ظل الٰہی سے مماثل کیا اور طنزیہ استہزائیہ انداز میں عرض کیا۔"

"بجا ارشاد جہاں پناہ' اور یہ بھی غور فرمایا کہ کشف و کرامت اور علم لدنی پر عبور کے علاوہ' اور اپنے منھ اپنی کرامات و ممات بیان کرنے کے ماسوا سادھو جی کو فنون سپہ گری اور علم تاریخ دانی پر کس درجہ عبور حاصل ہے۔"

"لیکن اس ہیچ مداں کی اس بذلہ سنجی پر بھی ظل الٰہی محظوظ نہ ہوئے اور ستم بالائے ستم یہ کہ نہ سادھو جی کے اس رویہ پر شاہزادہ عالی جاہ ہی اک ذرا منفعل ہوئے۔ واپسی میں سب مختصر سے ساتھیوں نے سرنگوں' مفصل خاموشی کے ساتھ راستا طے کیا۔ اور اس تمام کے ساتھ شاہزادہ عالی جاہ دارا شکوہ کی عقیدت اپنی جگہ پر اور سادھو جی کی کُٹیا اپنی جگہ پر اور افواہیں فزوں تر ہیں۔ شہنشاہ کے ورود سعید کی افواہیں طرح طرح سے رنگ بہ رنگ اڑ رہی ہیں' اور خلق خدا دیوانی ہے۔ اس ہیچ مداں کی نظامت مفلوج ہے۔ یوں بھی قوانین کی رو سے کسی کے عقیدے' رویہ اور ذاتی معاملات میں دخل در معقولات کا حق نہیں ہے اور شاہزادگان عالی جاہ تو قطعی مستثنیٰ ہیں۔ عرض کیا نہیں' عریاں فقیر سرمد حلق پھاڑ پھاڑ کر' بے سامان دعویٰ فرعونیت کر رہا ہے' اور میری نظامت اقدام کرنے سے معذور ولاشہ محض ہے کہ شاہزادہ عالی جاہ دارا شکوہ کا ذاتی معاملہ ہے اور قدغن ہے......"

شاہزادہ محی الدین نے قطع کلام کی معافی خواہی کے ساتھ بات کاٹ دی.....

"لیکن مقتدر ہستیوں کا ذاتی معاملہ کوئی چیز نہیں ہوا کرتا اور عام و خاص طور پر قابل قبول ہوتا ہے' اور سند و نظیر بنتی ہے اور وقتی طور پر انسداد ہو جائے لیکن بالعموم دوام حاصل کرتا ہے' اب دیکھیے نا حضرت خلد آشیانی' جنت مکانی' شہنشاہ عادل جہانگیر علیہ رحمہ کے لیے شراب انگوری کہنہ اطبا نے بے بدل بدرقہ نسخہ میں تجویز فرمائی تھی' اور ان کے دور بھر شراب خانہ خراب' مملکت عالیہ بھر میں ممنوع قطعی حرام مطلق رہی اور وہ قوانین آج بھی نافذ العمل ہیں۔ ان کے دور عالیہ بھر ہسپانوی شراب ایک پارسی گبر تاجر کے اجازت نامہ خاص کے ذریعہ درآمد ہوتی رہی' ورنہ پورے ملک میں کشید کرنے پر پابندی تھی' اور بعد وفات ظل الٰہی مرحوم وہ حکمہ درآمد ختم کر دیا گیا' لیکن اس پارسی گبر ٹھیکیدار درآمد نے رقم کثیر لے کر وہ حق درآمد ایک پرتگیزی تاجر کو فروخت کر دیا اور اب تک سورت کے بندرگاہ سے ساحلی اہل کاروں کو رشوت دے کر بڑی مقدار میں شراب درآمد ہوتی ہے' اور اندرون مملکت عالیہ' بلکہ معاذ اللہ اندر حدود شہر شاہ جہاں آباد پہنچتی ہے۔ توبہ' توبہ.....!"

اور قیل و قال کی گنجایش نہ تھی۔ ابھی ابھی شراب خانہ خراب کی کارروائی شاہزادہ مراد والیِ گجرات محل خاص میں روز روشن کے اندر آنکھوں سے دیکھ کر ہی جو آرہے تھے' اور سرنگوں ہو گئے تو شاہزادہ عالی جاہ محی الدین نے زیادہ خفیف نہ کرنا چاہا' جھٹ پٹ بغیر اجازت طلبی نیا سوال کر دیا۔

"دادا حضرت! خلد آشیانی جنت مکانی شہنشاہ جہانگیر عادل کے دور عالیہ میں کچھ مغربی افرنگی تاجروں نے ساحل بنگال پر اجازت خاص کے ذریعہ کچھ تجارتی نام کی کوٹھیاں تعمیر کیں' لیکن انکشاف ہوا کہ وہ کوٹھیاں تجارتی نہ تھیں بلکہ مسیحی تبلیغ کے مرکز تھے۔ اور ہندو مسلمان بچوں کو تعلیم اور مکتب کے

نام پر عیسائی بنائے جانے کا پادریوں کا ذریعہ تھا۔ دار و گیر ہوئی جس کی اصل مسلہ محافظ خانہ اکبر آباد کے بستوں میں معائنہ کی جا سکتی ہیں۔ یہ کوٹھیاں ضبط ہو گئیں' اور پادریوں کو ملک بدر کیا گیا۔ لیکن اب تک وہ تبلیغ برقرار ہے' فرق صرف اتنا ہے کہ میدانِ عمل خانہ بدوش قبائل ہیں جو شکاری اور گلہ بانی کے بین بین زندگی بسر کر رہے ہیں اور بے ضرر سی مخلوق ہیں۔ حضرت جنت مکانی' خلد آشیانی شہنشاہ جہانگیر عادل شکار کے شوقین تھے' ان میں سے بعض پسندیدہ کو طلب فرما کر شکار اور ہانکنے میں مدد لیا کرتے تھے' اور اب فراموش ہیں اور مراعات سے بھی محروم جو انھیں شہنشاہ معظم کے دور میں تھوڑی سی حاصل تھیں۔ مسیحی مبلغوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ نیز ہندو اور مسلمان جہلا میں بنگال کے اندر ان کی مسیحی تبلیغ کے پچھلے نظاریہ کے تحت بے چینی پھیلی ہوئی ہے' .... وزارت پناہ بلا تشبیہ، اس جانب بھی ایسے ہی ایک معاملہ سے دوچار ہوئے۔ سربراہان دکن مسجدوں اور امام باڑوں میں ہمارے باغیوں کو پناہ دیتے تھے اور ہمارے نزدیک یہ متبرک عمارتیں مسجد ضرار کے عمل پاک کی مستوجب تھیں۔ لیکن مابدولت نے شعارِ فاروقیؓ پر عمل کیا۔ خود جا کر نماز ادا کی' اور محفل عزا بپا کرائی اور ساتھ ہی تنخواہ دار پیش امام اور ذاکرین متعین کر دیے اور اب پنج وقتہ نمازیں اور وقتِ خاص پر اذکارِ عزا ہوتے ہیں۔"

اور اتنے میں مینارِ اذاں سے اذانِ عصر بلند ہوئی اور جل جلالہ' جل شانہ' ادا کر کے شاہزادہ عالی جاہ اور وزیر اعظم نے خاموشی سے اذان سنی اور بعد اذان دعا پڑھ کر وزیر اعظم نے فرمایا......

"یہ لیجیے شاہزادہ عالی جاہ آپ کے تمام کلام پر حق تعالیٰ نے مہر تصدیق ثبت کی۔"

اور دونوں نے حوض پر وضو کر کے باجماعت نماز ادا کی' اور شاہزادہ محی الدین تو بعد عصر کی تسبیحات پڑھتے رہ گئے اور وزیر اعظم اپنے منتظر گھوڑے پر سوار ہو کر چل پڑے۔ نہ رخصتی الوداعی مادا جبات ہوئے اور نہ نمازیوں کو خبر ہوئی کہ کیا ماجرا تھا۔

اور وزیر اعظم سیدھے قلعہ معلی پہنچے اور سیدھا خلوتِ خاص میں قدم رنجہ فرمایا اور باریابی کے متمنی ہوئے۔ خلوت خاص میں جہاں پناہ نے قدم رنجہ فرمایا تو منتظر تھے۔ جہاں پناہ نے استفسار یہ انداز میں اجازت کلام عطا فرمائی' اور وزیر اعظم عرض پرداز ہوئے۔

"آج اس غلام کی زندگی کا اہم ترین دن تھا کہ ظل الٰہی نے اس غلام کو امور مملکت کی اہم ترین خدمت پر مامور فرما کر "حکم" فرمایا۔ تاہم میں اپنا "حق حکم" بہ ادب واپس کرتا ہوں کہ جہاں پناہ ہی نوشتہ تقدیر پر قادر ہیں اور یہ منصب عالی ظل الٰہی ہی کا ہے' ورنہ عالم الغیب اوپر خدا ہے اور عقل انسانی الوہیت کا پر تو ہے۔ کلام پاک میں آیات پاک کے ذریعہ استخارہ و عملیات مظہر حقیقت ہیں اور علوم جفر و رمل عقل انسانی کو فضل ربی ہیں۔ اور یہ غلام جب فیصلے سے قاصر رہتا ہے تو ان تمام علوم سے مدد لے کر عمل کرتا ہے۔ جہاں پناہ آنحضور شاہزادہ عالی جاہ محی الدین مرد خود آگاہ واقع ہوئے ہیں' اور انھیں کے اندر سلطنت عالیہ کی وسعتوں کے امکانات جھلکتے ہیں۔" اور وزیر اعظم نے اک ذرا گھونٹ لیا۔ چہرہ پر تشویش کے آثار نمایاں ہوئے۔ شہنشاہ نے اک ذرا نگاہ اٹھائی اور فرمایا۔

"کہیے کہیے۔"

تو وزیر اعظم کا انداز بسورتا ہوا اور لہجہ غم ناک تھا' عرض کیا۔

"لیکن عالی جاہ' ظل الٰہی' جہاں پناہ' اس کم بخت کو بارود کی سیاہی اور بھڑک' اشتعال' اور تلوار کی جھنکار اور خون کی سرخی نظر آتی ہے۔" "اور اوں' آں' ایں۔ زبان میں لکنت ہکلاہٹ پیدا ہو گئی' فرمایا۔"....... اور طویل علالت اور حوالات' تنہائی۔"

اور اتنے میں موتی مسجد کے مینار اذاں سے اذان مغرب کی صدائے اللہ اکبر بلند ہوئی اور شہنشاہ و وزیر اعظم دونوں کے منھ سے جل جلالہ' جل شانہ' نکلا اور اذان سن کر دعا بعد اذان پڑھتے ہوئے خلوت خاص سے نماز مغرب کے لیے موتی مسجد کی جانب چلے۔ راستے میں وزیر اعظم نے عرض کیا۔ "جہاں پناہ فی البدیہہ ایک شعر ہوا۔"

موذن مرحبا بروقت بولا۔ "تیری آواز مکے اور مدینے۔"

اور وزیر اعظم نے اک ذرا گردن جھکائی اور اپنے سینہ کا جائزہ لیا تو شاہزادہ محی الدین کی شبیہہ نظر آئی' سر پہ جالی کی ٹوپی جو میدان جنگ میں زرہ بکتر و آہن و خود میں غرق گھوڑے پر سوار صفیں درست کرتے ہوئے انگلیوں کا مشغلہ تھا اور دوسری مرتبہ جھکایا تو بزم میں گاڑھے کھدر میں ملبوس امور مملکت طے کرتے ہوئے' ہاتھ میں قلم اور سامنے کلام اللہ رقم کرنے کا مشغلہ کرتے ہوئے' اور دونوں ہی جوہں اور زور حیدر کے ضامن تھے۔ ذہن سے کارگر اثرات جھاڑنا چاہے' لیکن جھاڑ نہ سکے۔ بعد نماز اجازت کلام آنکھوں ہی آنکھوں میں طلب کی اور مسجد سے نکل کر زیر لب گوش گزار کیا۔

"ولی عہدی اور تخت نشینی کے اہل ظل الٰہی کے فرزند جلیل القدر شاہزادہ عالی جاہ محی الدین ہیں اور وزارت کی جانب سے شاہزادہ ممدوح کو یہ غلام' عالم گیر' کا لقب عطا فرمانے کی سفارش کرتا ہے۔"

(۳ر ستمبر ۱۹۸۷ء۔ دو بجے دوپہر)

☆ ○ ☆

ابوالفضل صدیقی

لبنیٰ

ہماری ایک چھوٹی بہن گزری ہیں۔ مگر بزرگی بہ علم است نہ بہ سن۔ کہنے کو چھوٹی لیکن در حقیقت بڑی ذی علم، خوب سوچنے اور خوب تر کہنے والی، بڑی خوش کلام و خوش اخلاق، پھر بڑی سنجیدہ اور خوش شکل بھی۔ مرنج مرنجاں، ظاہر باطن یکساں اور ستم یہ کہ جواں سال، جواں مرگ! اور ایسے جانے والے ستم بالائے ستم ہم پر یہ توڑ جاتے ہیں کہ اپنے پہلو پہلو تراشیدہ الماسی سانچے بھی کفن میں لپیٹ کر ساتھ لے جاتے ہیں، اور ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تم سا کہیں جسے، تلاش کرتا چھوڑ جاتے ہیں۔ ذی علم کے ساتھ صاحب عزم ایسی کہ کرناٹک کی گم نام ادب سر زمین سے بلند پایہ ادبی جریدہ نکالا۔ ظاہر ہے یہ جرأتِ رندانہ اقدام اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر کیا اور ممتاز شیریں کا "نیا دور" اپنے معیار اور مخصوص مزاج میں تقسیم سے قبل پنجاب اور دہلی کے اعلیٰ جرائد کے نشاۃ ثانیہ والا دوماہی جریدہ تھا۔ اگرچہ سائز میں پنجاب کے رسائل کی اصطلاح والا جہازی نہ تھا۔ تاہم کورس کی کتابوں کے طول و عرض میں کوزہ میں دریا تھا۔ ضخامت معقول، لکھائی، چھپائی، کاغذ مناسب اور ادبی تعاون نہایت معیاری، ملک بھر میں مربوط، تقریباً "بڑے بڑے سب موجود، چھوٹے سے سادہ سے سرورق پر ممتاز شیریں اور صمد شاہین چاند سورج کی جوڑی سے دمکتے ہوئے۔ اول الذکر لیڈیز فرسٹ ایٹی کیٹ کے سارے مطلق نہیں بلکہ حق بات تو یہ کہ اپنی چونکا دینے والی بالیدگی اور ارفع صلاحیتوں کی روشنی میں جھلملاتا نظر آتا ہوا اور دوسرا شروع شروع میں پرنس کنسرٹ سا لگا۔ تاہم جلدی اندازہ ہو گیا کہ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے حامل ہیں اور ادارتی کالموں سے اندازہ ہوا کہ مغربی ادب خاص طور پر انگریزی پر عبور ہے اور بعض دیگر مغربی زبانوں میں بھی شدبد ہے۔ اور پھر ماشاء اللہ ڈاکٹر صمد شاہین۔ A worthy husband of a worthy wife تحقیق ہوئے اور بر عکس "مہتاب بے قرین آفتاب" چاند سے سورج کسبِ ضیا کرتا ہوا ثابت ہوئے، اور ممتاز شیریں تو شروع ہی چند تحریروں میں شرت پورنیا کے چندرماں کی طرح افق ادب پر ابھریں تھیں اور کنوار کی نم ناک خنک چاندنی نے پسار جو لیا تو ایوان ادب پر چاندی کا پتر بن کر چڑھ گئیں اور جب ان کا مقالہ تکنیک کا تنوع سامنے آیا تو جملہ اصناف کے نثر نگار چونک پڑے۔ اور جب بھیرویں کا راگ سناتی میگھ ملہار کہانیاں نکلیں تو قارئین کی آنکھیں کھل گئیں اور کہانی لیکھکوں کے کان۔ اور آج جب یہ لکھنے بیٹھا ہوں تو چشم نم اور سر بہ گریباں ہوں کہ کہتے کہتے خود اپنی کہانی نامکمل اور لکھتے لکھتے اپنا فسانہ ناتمام چھوڑ

گئیں اور ہمارے درمیان سے بے کہے سنے اٹھ گئیں' اور نہ معلوم کتنے سخن ہائے گفتنی...... اے لو! مر بھی گئیں! یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

پنجاب کے ادبی ذرائع سے مرحومہ نے میرا پتا حاصل کیا۔ اور میرے نام "نیا دور" کا پرچہ ارسال کیا۔ ساتھ ہی ایک خط اور کچھ لکھنے کی نیاز مندانہ فرمائش کی۔ اور ایسی فرمایشیں ہم سب جانتے ہیں وعدے وعیدوں میں نوک قلم پر ٹنگی ہی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی شاید ایں ہم بر علم ہو جاتی لیکن دل سے دل کو راہ اور حسن اتفاق "خوش وقتی" اسی ہفتہ میں نے اپنا ناولٹ "دن ڈھلے" عنوان لکھ کر ختم کیا تھا اور آج ہی نوک پلک درست کرکے فارغ ہوا تھا اور موذن مرحبا بروقت بولا! شیریں کی آواز مکہ اور مدینہ ہوئی دوسرے ہی روز چلتا کردیا۔ اور میرا اندازہ یہ ہے کہ مرحومہ کو اپنی ادارتی زندگی میں چٹ پٹ کہاوت کا پہلا عملی تجربہ ہوا۔ اور ایسا نادر کسی تخلیقی اہلِ قلم کے یہاں سے شاذ ہی ہوتا ہے۔ اور مدیرانِ گرامی کی امیدوں کے منافی اور امیدوں میں انوکھا۔

مرحومہ پہلی ترسیل کے جواب میں کچھ زیادہ ہی خوش اور یک گونہ متعجب سی ہوئیں اور خوش ہو کر تعجیلِ تعمیل میں مجھے شکریہ کا جو خط لکھا' اس میں "بڑے بھائی" آداب سے خطاب کیا۔ ادھر اپنی بیس سالہ ادبی زندگی میں مدیران گرامی کے تخاطب میں ادبی خان بہادری قلمی رائے بہادری' قلمی خان خانائی' اہلِ رائے رایانی وغیرہ اقسام قبیل کے بیسیوں سابقوں لاحقوں سے سابقہ پڑچکا تھا اور بڑے بڑے میٹھے اور چکنے (تاہم سوکھے) طریقوں سے نوازا گیا تھا اور سب کے سب سر کے اوپر سے گزرے نکلے چلے گئے تھے' لیکن یہ معصومیت بھرا "بڑے بھائی" اور کسی لڑکی مدیر کے منھ سے دل میں اتر گیا۔ ایسے منھ بولے رشتے تخاطب اٹھارہویں صدی کی باتیں تھیں اور اگلے وقتوں میں سگوں کی طرح برتے جاتے تھے مگر آپ خواہ دقیانوسی کہیں یا ری ایکشنری اپنے تربیتی ماحول کے تحت یاں اپنا جی بیسویں صدی کی سلیٹ پر بعض نوشتوں کے اوپر آج بھی پونچھا پھیر دینے کو چاہتا ہے اور اٹھارہویں صدی تک کی بعض لکیریں تاج محل اور اجنتا کی طرح دل پر نقش ہیں۔ اور ادھر مرحومہ بھی صرف پہلے اظہار تشکر میں نہیں آیندہ بھی بڑے بھائی سے خطاب کرتی رہیں اور یہ خلوص کو خلوص کی آواز تھی اور مجھے بڑا خوش آیند لگا شاید اوروں کو ذرا ادبی زبان و ذہن میں (بجز جمیل جالبی کے) چھوٹا بھائی بنتے ہوئے ذرا اکھرتا ہو لیکن شیریں چھوٹی بہن ذرا نہ اکھری اور آیندہ از بنگلور تا کراچی' مراسلت و بالمشافہ میں یہی چلتی رہیں۔ میں اس زمانہ میں بھارت کے اندر فرقہ وارانہ فسادات کے خوف کے چکر میں تھا جسے ویساتی کہاوت میں "اٹھاؤ چولھا" بولتے ہیں۔ نواح بدایوں شہر سے اپنا ۵۰۰ سالہ قدیم وطن عارف پور نوادہ چھوڑ کر علی گڈھ یونی ورسٹی ایریا میں نیم پناہ گیر تھا۔ نیم پناہ گیریوں کہ خانہ مداح در چمن است و کشتی در فرنگ' ذرائع روزی وہی آبائی ضلع بدایوں میں بدستور تھے۔ لڑکے علی گڈھ یونی ورسٹی میں اور لڑکیاں گرلز کالج میں زیر تعلیم۔ اور میں اور اہلیہ میرس روڈ کے مکان ارشاد منزل وغیرہ کمپاؤنڈ میں کہیں (۴۸ء۔۴۹ء سے) نیم مستقل مقیم بچوں کی تعلیم کے افسانہ صبر و رضا کی تکمیل کر رہا تھا اور یونی ورسٹی ایریا کئی سال سے میرے بچوں کی تعلیمی بازی گاہ بنا ہوا تھا۔ اور

یوں اس ماحول میں رس بس گیا تھا۔ اب یہ خاموش گوشہ تنہائی تھا اور تاریخ سازی بے چاری تو کیا چیز ہے یونی ورسٹی میں جغرافیہ انٹ پھینکنے کے بعد سیاسی زلزلہ کا سماں تھا۔ اور انجمن حدیقۃ الشعرو انجمن اردوئے معلی اور کون کون یونی ورسٹی کے سرکاری ادارے ادھر چار پانچ سال سے "سکڑ سمٹ کر" انجمن ترقی پسند مصنفین کے چنگل میں آگئے تھے اور اشتراکی فرمائشی ادب نام کی میٹنگیں' سیاسی اشتراکی پروپیگنڈے میں ہفتہ کے ہفتہ منعقد ہوا کرتیں اور ایک پنج سالہ اندر سرخ انقلاب مارتی ڈینگیں بلند ہوتیں۔ بہر حال یونی ورسٹی ایریا اوپن سٹی تھا۔ سیشن بھر سکون سے گزرتا۔ ان ادب نام کی میٹنگوں میں بھی جا بیٹھتا' اگرچہ ان کی اصل حقیقت مولانا صلاح الدین احمد اور سر عبدالقادر مدتوں پہلے سمجھا چکے تھے۔ میرے سامنے والے مکان "حامد منزل" میں بابائے اردو افسانہ جناب سلطان حیدر جوش پیش دروازہ ہم سایہ تھے۔ بغیر آلہ سماعت والے (نہ معلوم کیوں) بھرپور ثقل سماعت کا شکار اور دوسرے کی سننے سے بے نیاز' اپنی کہنے میں مستثنیٰ اور اس پر طرہ یہ کہ ایم او اے کالج کے رشتہ والے' میں بے چارہ تو کیا چیز میرے والد کے بھی سینئر سلطان بھائی آپ اور ابوالحسن تم' ایک دوسرے کو آپ اور تم سے خطاب کرنے والے اور پھر ٹھہرے مقتدر خاندانی بزرگ اور تو اور ریٹائرڈ کلکٹر' ڈپٹی کمشنر' ان کے پاس اٹھتا بیٹھتا رہتا۔ مگر ظاہر ہے یک طرفہ سا۔ خارجی و داخلی ہر اعتبار سے یہ اس پیرانہ سالی میں بھی کبھی کبھی ویسے ہی شوخ و شنگ افسانے لکھا کرتے' جیسے جب آتش جواں تھا اور آگ بھی روشن' اور یہ بات نہیں بڑے میاں مجھ تین پشت جونیئر کو بھی سنایا کرتے۔ تھوڑا بہت وقت ان کی بلا ناغہ صحبت میں بسر ہوجاتا اور ہفتہ کے بقیہ دو تین گھنٹے شام کو مذکورہ ترقی پسند تنقیدی میٹنگوں کی تماشا گاہ میں جا بیٹھتا اور باقی تمام وقت اپنے قلم کے سہارے اپنے گھر کے اندر۔ یونی ورسٹی بند ہوتے ہی نینی تال' الموڑہ' رانی کھیت اضلاع کے کسی نواحی پہاڑی دیہاتی سستے اور ٹھنڈے مقام بھیم تال' نچیتیا' شیام کھیت میں "گرم پانی" ' کہیں "ہوا کھانے" ہم لوگ جا پڑتے۔ جہاں نہ اخبار پہنچتا نہ موٹر گاڑی کے ٹائر پہنچ سکتے۔ ہفتہ پیچھے ڈاکیہ البتہ ضرور پہنچتا اور بدایوں یا علی گڑھ کے پتے پر پہنچا ہوا کوئی ادبی رسالہ بشرطیکہ رجسٹری شدہ ہو' منتقل ہو کر پہنچا کرتا۔

اس زمانے میں اگر کسر نفسی نہ کروں تو ادبی حلقوں میں اتنا ہی جانا پہچانا تھا جتنا آج مانا جاتا ہوں۔ ملک بھر کے ادبی جرائد "اعزازی نام" سے پہنچا کرتے تھے۔ اور جب بھی' اور آج بھی یہی کاغذ (نوٹوں والا نہیں' نیوز پرنٹ رسالوں والا) اردو کے مصنف بدنصیب کا زکوٰۃ ریٹ سے بھی عشر عشیر معاوضہ مقدر تھا۔ البتہ نقدی پیشگی سالانہ چندہ وصول کردہ خوش خرید ہوں یا اعزازی' مفتی' رسائل ماہنامہ ہوا کرتے تھے اور سچ مچ رسالہ ہی۔ جھوٹ موٹ رسالہ کا نام دھر کر موٹی موٹی جلد سالنامے اور رسالے' سہ ماہی وغیرہ ادبی شال دوشالے اوڑھے کتابیں نہ ہوتے تھے' اور ہاں نہ بھڑکتے چمکتے مجموعے ہی' جس کا آج ہم مزاج نہ رسالہ ہوتا ہے اور نہ کتاب ہی۔ پاکستان "آج کل" ایڈیشن دہلی کے جواب آں غزل پر کراچی کے محکمہ اطلاعات کا نیم سرکاری نام تاہم عین سرکاری' چہارم ادبی سا مہتمم پرچہ "ماہِ نو" نکلا۔ ادارتی حکم پر تعمیل میں گاہے گاہے میں ہندوستان بیٹھے بیٹھے اس میں بھی لکھتا رہا۔ اور دور کے ڈھول سہانے' اپنے نوزائیدہ

بچے کی آواز ماں کے کانوں میں بڑی رس دار گونجتی ہے اور پاکستان تو اپنی آرزوؤں کا قبلہ تھا اور ابھی ہم بھارت نشینوں کو تو امیدوں کی آماجگاہ اور بیت المقدس سا۔

ایک افسانہ جذبات اور نام پر قابو پاکر اور ہندو کانگریس نوزائیدہ حکومت اور ہندو مہاسبھا خرافات پارٹی کے ساز باز کے سراغ سے اپنے طرزِ نگارش میں نوک پلک چست و درست سپرد قلم کیا۔ جس کے عنوان سے نفس مضمون کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایسے لٹریچر کی نہ جب اور نہ آج بھارت میں نہ دہلی، نہ بمبئی کہیں گنجائش تھی، بجز اپنی مملکت خداداد پاکستان کے جہاں مذہب اسلام، مسلم کلچر اور کیا کیا اردو زبان سبھی کچھ کے تحفظ کی دعوے دار ہو کر دنیا کا جغرافیہ بدل کر، تاریخ کا سینہ چیر کر، مسلمانوں کی تقدیر سے ورائی تھی۔ اگرچہ نکسیریں بہت پھوٹی تھیں اور پاکستان کے محکمہ اطلاعات کا رسالہ "ماہ نو" اس مشرق کا سب سے زیادہ فعال اور دور رس اثرات والا آرگن تھا، اور ان تمام کا ترجمان و تحفظ کا ضامن۔

اس زمانہ میں دہلی، کانپور اور بمبئی سے معیاری اردو جرائد نکلتے تھے، لیکن ایسے کھرے لٹریچر کی بھارت میں کھپت نہ تھی۔ جس میں "گئو ہتھیا" کا اصل مفہوم اور گئو رکشا کرنے کا پول کھولا تھا اور اصل گئو رکشا کرنے والے پیش کیے تھے اور ایسی حقیقی بات ایک ذرا سمبالک انداز میں کہی جا سکتی تھی اور میرے موضوعات اور ٹریٹ منٹ سے میرے قارئین کا مختصر سا حلقہ خوب واقف ہے اور گئو ہتھیا اقتصادی سوال بے جواب تھا جو نام نہاد گئو رکشا کرنے والوں کا منہ بند کر دیتا تھا اور ایک سچے حقیقی گئو رکشا کرنے والے کی آواز تھی اور یہی امر منھ زور زبردست کی کمزوری ہوتی ہے اور وہ ڈنڈے کی منطق پر اتر آتا ہے جو آج تک بھارت میں جاری و ساری ہے۔

مسلمان چھٹ بھئیے 'کاروباری' سستے گوشت کے تاجر قصائی قومیت 'ازکار رفتہ مویشی خرید کر کھال اور گوشت کا چنگیا بیوپار کرتے اور مسلمان گدی چھوٹے کاشت کار کھویا ماوا بنا کر شہروں میں حلوائیوں کو دودھ کی مٹھائیاں 'پیڑے' برفی' قلاقند' مداخنہ بالائی کے لڈو وغیرہ بنانے کے لیے خام مال فراہم کرتے۔ یہ جگہ جگہ نواحی پاکٹوں میں آباد تھے اور یہی دونوں کم بخت گئو رکشا کا پہلا شکار ہوئے اور اگر عقیدت کے اندھلائے سیاست دانوں کو ایک قدم بھر آگے سجھ لیتا تو پورے کا پورا کسان طبقہ ہی خسارہ کی زد میں آتا تھا جو ملک کی آبادی کا ۸۵ فیصد ہے اور جس میں بہ مشکل دو تین فیصد مسلمان ہیں ورنہ سارے کا سارا ہندو ہے۔ مگر سیاست کی بھٹکائی عقیدت بھی اندھی ہو جاتی ہے۔ دور کی تو در کنار پیش پا افتادہ دیکھنے سے بھی قاصر رہتی ہے۔ شیخ سعدیؒ سے معذرت کے ساتھ مطلب گاندھی دیگر است۔ گئو رکشا وغیرہ کچھ نہیں، مسلمان کو ہراساں کرنا اور جو ذرا سا کاروبار ان کے ہاتھوں میں تھا اور جسے بہ وجوہ اپنا ہاتھ نہ لگا سکتے تھے اس پر ضرب لگانا تھی۔

چناں چہ ابتدائی ساز باز میں عملی اقدام یہ کیا کہ جن سنگھی ظلم شعار اور مہاسبھائی شدت پسند ہندوؤں نے کانگریس نوزائیدہ حکومت سے ساز باز کر کے چھوٹے شہروں اور قصبوں کی میونسپلٹیوں میں مسلمانوں کو ہراساں کر کے مذبحے بند کرانے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے یہ ہندو اراکین کی کینہ پروری کی

بازگشت میں سیاسی غنڈہ گردی کے سارے سڑکوں پر "اسٹریٹ غنڈہ گردی کے ذریعے ہی ممکن تھا اور آفیشل غنڈہ گردی میں تو آج چالیس برس بعد بھی ملک کے اندر وہی دور دورہ ہے جو انگریز کے جاتے ہی شروع ہوا تھا۔ اور کچہریوں' دفتروں' تھانوں سے' سڑکوں سے ان تمام پر اول بدل ہوتی رہتی ہے۔

ویسے بنیا قوم اپنے حق میں میزان لانے میں کمپیوٹر واقع ہوئی ہے۔ اس طرح سود در سود میں دام دو پٹ ہوتے تھے' اس طرح ایک پتھر سے دو چڑیاں مرتی تھیں اور ایک لات دو بلیوں پر پڑتی تھیں۔ سستے گوشت کے تاجر قصائی اور غریب طبقے کے سستے گوشت خور مسلمان عوام' ایک کا روزگار کا مسئلہ اور دوسرے کی روزی کا معاملہ تھا اور سیاست کے اندھلائے بھنکائے عقیدت کے اندھے دیہاتی ہندوؤں کو یہ نظر نہ آتا تھا کہ ان کے اپنے تھان پر کھڑے از کار رفتہ نکھٹو مویشی' کار آمد مویشیوں' بیلوں اور گایوں کے برابر تا زیست کھاتے رہنے پر مجبور ہیں جنھیں غریب مسلمان ہی ٹھکانے لگا کر ان کار آمدوں کے لیے چارہ کی بہتات کرتے رہتے تھے اور چمڑے' کھالوں کی پرابلم بھی حل ہوتی تھی۔

اور یوں تو ایک سے ایک بڑا پہنچا ہوا اعداد و شمار کا ماہر پڑا تھا لیکن سیاست عقیدت کے سارے بھنکائے ہوئے تھی اور یہ نہ بتاتی تھی کہ ملک کی اقتصادیات میں اس کا کیا رول ہے۔ پھر آزاد بھارت میں ڈھائی ماہ بعد پہلی بقرعید جو آئی اس مدت میں نوزائیدہ کانگرس حکومت نے تبادلوں' معطلیوں' تنزلیوں اور برخاستگیوں کے ذریعہ کمال سرعت سے مسلمان عاملوں کو خاص طور پر' اتنا مکمل طور پر ہٹا دیا کہ یوپی کے چون اضلاع کے اندر گزٹ دیکھ لیجیے ایک بھی مسلمان کلکٹر ڈپٹی کمشنر نہ تھا اور یہی صورت ضلع ضلع ماتحت اسٹاف کی تھی جو انگریزی دور میں پندرہ فیصد مسلمان آبادی کے صوبہ میں ۳۳ فیصد سروس میں تھے۔ خود اپنے ضلع بدایوں کا سب ڈویژنل اور سٹی مجسٹریٹ مسلمان ہونے کی پاداش میں جیل میں تھا اور دوسرا اس سے زیادہ سینئر ڈپٹی کلکٹر' پیا کھنگا بندہ سنکا گردن بچا کر پاکستان بھاگ آیا تھا۔ ملک بھر میں مار کاٹ کے ساتھ ساتھ مسلم دارو گیر کا بازار گرم تھا اور اس کے لیے اپنے ۱۹۴۸ء کے بھرے بھگتے چھانٹ چھانٹ کر آفیشل غنڈے عاملی عہدہ دار جو انگریزوں نے ان پر تعینات کیے تھے' ذاتی قید میں کیے ہوئے مسلمانوں پر تعینات تھے اور جو مسلمان اہل کار چھوٹے عاملی عہدہ پر باقی تھا بھی تو وہ بدنصیب گردن پھنسنے کے اندیشے اور روٹیوں کے خسارہ میں اتنا خائف تھا کہ اپنے باس کی ہدایت پر ہندو سے بڑھ کر ہندو واقع ہو رہا تھا۔ اور بڑے بھائی' چچا وغیرہ سابن کر مسلمانوں کو بلا بلا کر مصلحت وقت یہ بتا رہا تھا کہ اس مرتبہ گائے کی قربانی نہ کی جائے اور یوں یہ چینک تمام مسلمانوں میں پھیل رہی تھی۔ ہندو عاملی اہل کاروں نے باضابطہ تھانوں سے گائے کی قربانی کرنے والے مسلمانوں کی فہرست منگوائی اور گھر سے طلب کر کے لال پیلی آنکھیں دکھلائیں اور کھل کر کہا کہ اگر گائے کی قربانی کرو گے تو ہم تمھاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں۔ اور تو اور نوزائیدہ' نو بڑھی حکومت کے جنون میں مبتلا ہو کر ہندو ڈپٹی کمشنر' کلکٹر' ایڈمنسٹریٹوں نے آزاد پیشہ ڈاکٹروں' حکیموں اور آزاد منش مسلمان رئیسوں' زمین داروں کو طلب کر کر کے اپنی گلی میں غرا غرا کر لفظ وفاداری کا مکمل ثبوت مانگا اور گائے کی قربانی نہ کرنا وفاداری کی اول شق تھی اور اس کے لیے بیشتر کاٹ کاٹ کر ڈیفنس

آف انڈیا ایکٹ کی بٹ بازی دکھلائی' پھر گائے کی قربانی نہ کرنا ہی غریب مسلمان کی بڑی محرومی تھی۔ جو ایک گائے میں سات سات شریک ہو کر سستے داموں اس فرض سے سبک دوش ہو جاتے تھے' وہی غریب یوں بھی ہٹ ہوتے تھے۔ پھر بھی جن غریبوں نے مسلمان محلوں اور نواح میں مسلم یونٹوں میں چوری چھپے یہ فرض ادا کیا وہاں ایک گائے ذبح کرنے کی پاداش میں سات کے ساتوں شرکائے قربانی کی گردنیں کٹیں اور ان سات کے ساتھ ستتر اور بے کس مسلمانوں کے گلے کٹے۔ قربانی کا گوشت اگزیبٹ نمبر ایک بنا کر تھانہ اور پھر عدالت عظمیٰ تک گا سڑا اور بقرعید کے دن مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔

اور ہمارے اپنے ضلع کا کلکٹر صاحب بہادر نامی برہمن ایک آئی سی ایس بنارسی یونی ورسٹی کا سپوت چیلا تھا' جس نے ۱۹۴۲ کے کھمبا توڑ پتھری اکھیڑ تشدد میں علی گڈھ اور بلند شہر کے ضلع کے کانگریسی نیتاؤں کو جوتے اور ڈنڈے کی منطق سے سمجھایا تھا اب انھوں نے چھانٹ کر اس کو بدایوں میں احمد شاہ ابدالی کے انتقام لینے پر تعینات کیا تھا۔

اور کون نہیں جانتا کلکٹر ڈپٹی کمشنر کا عہدہ' ملکہ وکٹوریہ کے دور سے پوتے جارج پنجم تک' تخت برطانیہ کا ضلع براہ راست نمایندہ رہا۔ اور آج تک وہیں کا وہیں قصر بکنگھم میں مقیم ساہے اور اپنے ضلع بدایوں کا ریکارڈ دیکھ لیں دس دس بیس بیس کر کے بھی اور ایک ایک دو دو کر کے بھی ۱۹۴۶ء لغایتہ ۱۹۴۸ء تا قتل گاندھی اور بعد کو بھی مسلمانوں کے قتل کی اموات چھ سات سو تک پہنچی جو درج رپٹ تھانہ ہوئیں اور اس کے بعد بھاگڑ پڑی اور ایک مدت کھوکھراپار کی بے راہ' نالی کھلی رہی اور پناہ گیرے گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے رہے۔ یہاں تک کہ شود ظالم بہ ظلم خود خراب آہستہ آہستہ گاندھی جی اپنوں کے خنجر سے قتل ہوئے اور اس دن بھی پنڈت جی کھلے منھ نہ کہہ سکے اور کہتے بھی کس منھ سے' بولے بھی تو آل انڈیا ریڈیو پر یہ بولے کہ:

"باپو کو ایک مذہبی دیوانے نے قتل کر دیا۔"

اور دیوانہ را ہوئے بس است "مذہبی دیوانہ" کی ترکیب کو مسلمان سمجھ کر ہندو ویسے ہی بغیر طیش کے مسلمانوں پر رستا چلتے پھیل پڑتے تھے۔ ہمارے شہر میں جو مسلمان جس ہندو کو نظر آیا' گاندھی جی کے قتل کا انتقام لینے پل پڑا۔ تا آنکہ پاکستان ریڈیو نے بولے سے کہا وہ قاتل تو آں جہانی کی اپنی برادری کا آدمی تھا۔

ذرائعِ روزی کے فقدان اور خطرہ جان و متحیّر کو دعوت دیتے ہیں اور جسے جہاں پناہ تھی وہاں جا چھپا۔ اور میں تو ان وجوہات کے ماسوا ۱۹۴۸ء سے علی گڈھ یونی ورسٹی ایریا میں آ بسا تھا۔ اور اپنا یہ وہ دور تھا جب شاعرانہ تعلّی حقِ عبادت ہو جایا کرتی ہے اور مکتبِ رحمان سے منتہی کی سند مل جاتی ہے اور تعارف' شہرت' نام آوری کی پا کر' میر صاحب اندر جاگ پڑتے ہیں۔ اور مستند ہے اپنا فرمایا ہوا کے مقام انا پر جا پہنچتے ہیں اور اپنا شاہکار افسانہ "گئو ہتھیا" اچھی طرح بناؤ سنگھار کر کے دنیا کے نقشے پر اپنے ہاتھ سے چپکائے ہوئے مملکتِ خداداد وطن عزیز پاکستان کے محکمہ اطلاعات کے ادبی آرگن "ماہِ نو" کو ارسال

کر دیا۔ جہاں اپنے مذہب کلچر اور سیاسی 'عمرانی' اقتصادی امور زندگانی کو پناہ تھی۔ اور قلمی بھنڈی۔ مامتا واستا تو جو کچھ ہے وہ ہم سب جانتے ہیں۔ اب تھوڑی سی انا کو پناہ اور اپنی انا کو بحمد اللہ اس راستے ٹھیس نہ پہنچی کہ کسی ایڈیٹر مسخرے کی اتنی مجال ہوئی ہو کہ اپنی کوئی تحریر کسی پہلو سے ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کر دے یا ایڈیٹ کرنے کا بھی حق استعمال کر کے چھاپے۔

ویسے روزِ اوّل سے وہ گل چیں رہا جس کی انگلی نوکِ خار سے محفوظ رہی اور پھر "کنو بھیا" تو ہندوستان کے اندر جیسا کہ میں نے بیان کیا اندیشہ سود و زیاں میں نامقبول سمجھتے ہوئے میں نے پاکستان بھیجا تھا اور سرکاری رسالے "ماہِ نو" کو لیکن سوئے اتفاق سے پاکستان سرکار و بھارت سرکار کے ہاتھ 'لیاقت نہرو پیکٹ کے بہانے مصافحہ کے لیے بڑھے ہوئے تھے۔ اگرچہ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں تاہم مجھے چھٹی حس کچھ خبریں ضرور دیتی تھی 'جو خوشی اور ناکامی دونوں میں کار فرما رہتی ہے۔ حالاں کہ دور دور بھی یہ "اندیشہ مژدہ" نہ تھا جو ہوا۔ اس افسانہ کی اشاعت کے لیے میں بہت بے چین تھا کہ ایک روز جو "نیا دور" پہنچا تو کھول کر دیکھا تو اچھل پڑا۔ "کنو بھیا" مناسب صفحات پر چمک رہا تھا (اور پھر جمیل جالبی نے اپنے "نیا دور" میں ۴۰ر سال بعد اس افسانے کو جس کو میں نے دوبارہ لکھ کر نیا روپ دیا تھا "الٹا درخت" کے عنوان سے چھاپا) اور دوسرے ہی روز شیریں کا خط ملا۔

لیاقت نہرو پیکٹ کی مجموعی سیاسی تیاریوں میں "ماہِ نو" کے سرکاری پرچہ میں آپ کا افسانہ چھپنا نامناسب تھا اور ادارہ "ماہِ نو" والوں نے ہمیں دے دیا 'اور ان کے بجائے ہم سے شکریہ اور ان کی جانب سے معذرت قبول کریں' بڑی خوشی ہوئی۔ "ماہِ نو" کی بہ نسبت "نیا دور" آزاد ادبی چھاپ والا کہیں بڑا پرچہ تھا۔ پورے برصغیر اور بیسیوں ممالک تک ادبی ساکھ والا تھا۔ میرے افسانہ کی بڑی پبلسٹی ہوئی۔ بات بڑھ کر اور ادب کے دائرہ سے نکل کر ہندوستانی حکومت کے ساتھ بے ادبی تک پہنچ گئی۔ دار و گیر اور جواب طلبی تک نوبت پہنچی خانہ تلاشی 'جامہ تلاشی' آتشیں اسلحہ کی ضبطی سے نوازا گیا اور آج پھر کچھ وہی نقشہ ہے۔ ۳۵ سال بعد لیاقت نہرو پیکٹ کے نئے ماڈل نوواردو پیکٹ کی مہمل سی ترکیب میں مصافحہ کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ منگا دیکھ رہے ہیں اور مصلحت خسرواں 'خویش میں خاموش ہیں.........

جب میں کراچی آیا تو صمد اور شیریں رسالہ بند کر چکے تھے اور بندر روڈ کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ میرے عزیز ڈاکٹر امیر حسن صدیقی کے فلیٹ سے قریب ہی جو کراچی جیسے شہر میں ہمسائیگی کہا جاتا ہے اور ڈاکٹر امیر حسن کے یہاں آتے جاتے تھے۔ اب کی تفصیلی ملاقات ان کے یہاں ہوئی۔ غائبانہ قربت تھی۔ بڑے خلوص سے ملے اور کراچی کے عام سے دستور کے مطابق اپنے گھر بلایا اور شیریں کا تذکرہ کیا۔ "نیا دور" مرحوم کی باتیں ہوئیں اور اس کے بعد دو ایک اجتماع میں ملاقات ہوئی اور پھر گھر آنے کی تکرار ہوئی۔ ان کا پتا آسان تھا اور میں قریب پیدل فاصلہ جیکب لائن میں اپنے بیٹے کے ساتھ اب مستقل مقیم تھا پھر ملنے ملانے کا شوقین ہوں البتہ چھوٹے سے شہر کا نواحی مضافاتی 'جہاں پورا شہر صبح کا جاگا رات تک جاگتا ہے۔ کراچی کے ان اوصاف سے ناواقف سا تھا کہ ایسے ہی جیسے آج یہ تحریر قلم برداشتہ لکھنے بیٹھ گیا

ہوں۔

ایک روز سہ پہر میں اٹھ کر قدم برداشتہ چل پڑا۔ اور بغیر علم و اطلاع اور بے قاعدہ مخلا بالطبع یوں ہی ان کے فلیٹ پر جا دھمکا اور گھنٹی دے بجائی۔ شیریں خود ہی آئیں۔ اگرچہ تصویر نہ دیکھی تھی مگر سمجھ گئیں۔ سن بھی چکی تھیں کہ مردِ انقلابی آگیا ہے۔ ایسا ہونق صورت اور بے وقت وارد اور کون ہو سکتا ہے۔ زیرِ لب یقیناً معذرت ہی بڑبڑائی۔ مجھے وہیں پیش دروازہ کھڑا چھوڑ کر واجبات سلام وغیرہ ادا کرتی ہوئی الٹے پاؤں پلٹ گئیں اور ابھی میں اس آمد و رفت کے چکر ہی میں ذرا متحیّر ہی سا تھا کہ ایک منٹ اندر لجاتے لجاتے معذرتی انداز میں پھر آئیں۔ ڈھیلے ڈھالے چارشف نامی بوراکٹ اور جوٹ رنگ گون' چغہ' اللہ جانے کون سا نام ڈھیلا ڈھالا کوئی ملبوس سا لپیٹے اور اپنے اوڑھنے کے تمام حقوق و مراحل پورے کر آئیں۔ اور پھر معذرتی شاید سلام وغیرہ الفاظ ادا کرتے ہوئے رہنمائی کرتی اندر لے گئیں۔ دروازوں کے کواڑ کھولے' مختصر سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا' پنکھا چلایا۔ میز پر پڑے اخبار سنبھال کر بڑھائے۔ خواہرانہ عجز و معافی خواہی میں زیرِ لب کہا "ابھی حاضر ہوتی ہوں۔" اور میں نے صبح کے پڑھے ہوئے اخباروں کا آموختہ دہرایا تہرایا۔ مختصر سے کمرہ کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ ملاقات کے کمرے میں نہیں کسی لائبریری روم میں بیٹھا ہوں۔ دیواریں' تیکھے رنگین سنہری روپہلی قیمتی کتابوں والی الماریوں سے مکمل ڈھکے ہوئے تھے۔ پھر چھوٹے سے کمرے کی نظری پیمائش کی تو جیسے فلیٹ میں ہوتے ہیں ویسا ہی تھا۔ فرنیچر کا غائر جائزہ لیا تو ڈرائنگ روم دیکھ کر چونکا جیسے پتھر کے دور کے ساختہ' جب اوزار ایجاد نہ ہوئے تھے اور جس کا مکان و کان کے اندر کسی نہج سے بھی سراغ نہ تھا' نوادرات ہی اور جسے ٹکسالی بولی میں انتظار کرتے کرتے اکتا جانے کے مفہوم میں بولتے ہیں "اُوب گیا۔" اس عرصے میں پرانے فلیٹ کی رہائش کے طفیل بندر روڈ کے شور کے باوجود میں برتن کھنکنے کی آوازوں میں تمیز کرتا رہا کہ پہلے باورچی خانے سے پھر کھانے کے حصے سے آوازیں کانوں میں پڑتی رہیں۔ اتنے میں آہستہ سے گھنٹی بجی' کوریڈر میں پھر آہٹ سنائی دی۔ کچھ کچھ بت جاہٹ اور چاپ شاید نوکر آیا۔ اور پھر کچھ اور زیادہ نمایاں کھٹ پٹ' اور شیریں آئیں آگے خود پیچھے پیچھے ملازم چائے اور لوازمات سے بھرا خوان اٹھائے۔ خیر میں نے پہچان تو لیا ابھی پون گھنٹہ قبل والی چادر گون' دولائی' اللہ جانے کس ملبوس میں سر سے پاؤں تک چارشف ڈھکی وہی خاتون جنھوں نے دروازہ پر استقبال کیا تھا وہی ہیں اپ ٹوڈیٹ ہاؤس لیڈی سے کچھ زیادہ ہی' صرف اپ ٹوڈیٹ لیڈی' جسے دیسی داستانوں کے داستان گو' یوں ہی ایک سانس میں بولے چلے جاتے ہیں کہ موئے سر سے انگشت پا تک آرائش سنگھار کا تسلسل برقرار رہے۔ ماتھے پہ چاند ٹھڈی پہ تارا' ہونٹوں کی دھڑی پہ رنگ پان' بال بال موتی پروئے' سولہ سنگھار کیے اور کیا کیا۔

اور یہ ابھی آج سے تیس سال قبل والی بات ہے جب آج کی طرح ذوق آرائش کے لیے مشاطہ گیری کے ادارے قایم نہ ہوئے تھے اور فرانس وغیرہ یورپ کے کسی ملک کے خوب صورت فرانسیسی انگریزی ترکیب نام کے ساتھ لگے بیوٹی پارلر قدم قدم پر دستیاب نہ تھے۔ ویسے ذوق آرائش نئی نویلی

گھونگھٹ اٹھی قوم کو آج سے بھی زیادہ تھا۔ تاہم خود فریبیِ حسن گرائے پر نہ ملتی تھی۔ لہٰذا نئی پردہ سے نکلی دختران قوم کو نئی نویلی بننے کے لیے ہر شام دست خود دہان خود ہونا پڑتا تھا اور جتنی ان کی نانیاں دادیاں ضبط و تحفظ خون اور ہڈی کے سلسلے میں برتتی تھیں اتنی ہی یہ بے چاریاں کھال اور بال سے چست درست رہتی تھیں اور یہ علامہ اقبال کی ہدایت پر کاربند۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

اور شیریں زیرلب معذرت سی کرتی۔ اپنے اپنے الفاظ ادا کرتی رہیں:

"وہ پہلے چائے بنائی' اوں نوکر نہ تھا' پھر ذرا کپڑے بدلے' غسل کیا۔ اوں ایں تو آپ کو انتظار کرنا پڑا۔"

اور میں اس زمانہ میں بھی شیروانی پہنا کرتا تھا اور اس وقت بھی ہم رنگ ٹوپی والی شیروانی میں تھا۔ مگر کراچی میں نووارد تھا اور یہاں کی پینٹ ڈریس' پتلون پہن کر نکلتے ہوئے ذرا جھجکتا تھا۔ شیریں وکٹورین ایج کی میموں کی طرح پورے قاعدہ کے ملبوس میں آئیں تاکہ شیروانی والے ملاقاتی کی توہین نہ ہو کہ یہ تو ساتواں بٹن بند کالر کا ہک تک لگائے تک سک سے درست ہو کر آیا ہے' اور میری ملاقات کی اس کے ذہن میں اہمیت ہے۔ خوش پوشوں شوقینوں کی یہ منطق میرے علم میں تھی۔ خود میرے والد محترم اسی نوعیت کے وکٹورین ایج کے وضع دار صاحب لوگ واقع ہوئے تھے اور کسی ملاقاتی کے سامنے گھر سے نکل کر یوں ہی سرپٹر جا بیٹھنا آدابِ ملاقات کے منافی گنتے تھے۔

ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ اگر نوکر ذرا دیر اور نہ آتا تو شیریں اس رنگین خول میں چائے کا خوان خود اٹھائے آتیں اور مشرقی تواضع کا پورا پورا حق ادا کرتیں۔ اس سے قبل صمد سے ایک اچھی جمی ہوئی ملاقات ڈاکٹر امیر حسن کے یہاں ہو چکی تھی۔ اور ایک دن ان کے سینئر کولیگ مشہور اہلِ قلم عزیز احمد کے دفتر میں' اور ایک دو اور ایسی ہی سر محفل قسم کی۔ انھوں نے ہر ملاقات میں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی جو میں نے بعد کو غور کیا کہ کراچی کا عام سا دستور ہے اور فاصلوں کے شہر میں یہ وعدہ کر کے کبھی شاذ و نادر ہی پورا ہوتا ہے۔ اور آج میری شان نزول کچھ اسی سلسلے کی تھی لیکن شاید کچھ بے وقت ہوئی اور اتنے میں صمد بھی آگئے۔ بہت خوش ہوئے اور صمد جیسے پہنچے ہوئے بزرگ تو اپنی سوسائٹی میں خال خال ہی پائے جاتے ہیں جن پر کیریکٹر کے سوائے ٹائپ کا اطلاق ہو' کئی مرتبہ ذکر آیا تھا اس وقت بیٹھے پا کر بہت خوش ہوئے۔ دونوں بیٹوں کو بلا کر بٹھالیا اور گل ریز پرویز قافیہ ردیف لف و نشر مرتب نام بتا کر تعارف کرایا۔ ویسے یہ دونوں چائے لگا کر دیکھ گئے تھے کہ کون آیا ہے بے وقوف شیروانی والا۔ اور پھر کچھ زیادہ ہی شاعرانہ مبالغہ سے میرا تعارف پیش کیا جب کہ ماں نے روشناسی بھی نہ کرائی تھی۔ بات پھر الف بے سے شروع ہوتی نظر آئی۔ مگر مجھے ذرا جلدی گھر پہنچنا تھا تخلیف تصدیعہ اور معانی ملتوی ہو گئی۔ ویسے وہ کچھ جنریشن گیپ پر شروع ہوئے تھے اور یہ اس وقت دونوں بیٹوں کے ساتھ بٹھالینے پر چلی تھی کہ پرانے لوگ اپنے بچوں کو ہر مجمع میں ساتھ لے جایا کرتے تھے اور یوں تربیت کے مراحل آیوں آپ طے ہوتے تھے اور

علم مجلسی اپنی جگہ پر ایک چیز تھا اور یہ اب سے آدھی صدی پیچھے والے ساونتوں کا طریقۂ تربیت تھا۔ مجھے تو شروع ہی سے صمد کے اندر ساونتی خوبو کا سراغ ملا تھا۔ وہ خود اپنے علاقہ کے کافی پلانٹر تھے۔ ان کے کافی کھیت کے مزدور قسم کے کام کرنے والے ان کی بیوی کو رانی کہا کرتے۔ یہ بھی صمد کی زبانی بات میں بات نکلی تو علم ہوا اور شیریں کچھ محجوب سی ہو گئیں۔

اور دوسرے ہی روز شام کو ساونتی روایات کے مطابق بازدید ملاقات کے لیے دونوں میاں بیوی میرے گھر پہنچے۔ میری بیٹی میرے گھر کی ہاؤس لیڈی تھیں۔ علی گڈھ گرل کالج کی گریجویٹ' مل کر بہت خوش ہوئے۔ خاندانی تعلقات بڑھے گاہے گاہے آنا جانا ہوگیا۔ قلم کی قربت کے ساتھ جب یہ پتا چلا کہ شیریں' مولانا محمد قاسم نانوتوی سے متاثر ہیں تو مذہبی ہم خیالی سے یہ تعلقات زیادہ استوار ہو گئے اور شاید بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کا رشتا بھی مضبوط تر ہو گیا۔

میرے کراچی پہنچنے کا شروع زمانہ تھا۔ پبلک ریلیشننگ یوں بھی ہم قلم والوں کی جبلت اور بڑی حد تک زندگی ہوتی ہے۔ جدید سے جدید تر آدمیوں اور موضوعات کی تلاش تھی۔ بہت سے غائب بالمشافہ ہو گئے۔ اور لاہور سے کراچی تک جانے پہچانے اور ان جانے ملتے چلے گئے۔ گھومتے پھرے جو ئندہ یا بندہ ایک نہ ایک آہی جاتا تھا۔ "نیا دور" بنگلور والے شیریں اور صمد تو مل گئے تھے' اب "ساقی" کے "باتیں" والے جمیل جالبی کی تلاش تھی جن کو ابھی گاؤں میں بیٹھے بیٹھے "ساقی" میں پڑھا تھا۔ ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے "ساقی" کراچی کے نیم اداریے کی باتیں سن سن کر اور مضامین "نیا دور" کراچی (فیض احمد فیض اور ایک یاد نہیں) آنکھوں دیکھی سی نوبت پہنچ چکی تھی۔ رہ رہ کر سونگھائی پڑتا تھا کہ مستقبل کا عطر فتنہ کشید ہو رہا ہے' جو آج ظاہر ہے اور جیسے دونوں ہی ازل سے ایک دوسرے کی تلاش میں تھے اور دونوں ہی بہ یک آواز لبیک پکار رہے تھے اور نووارد ازلی متلاشیوں : جمیل جالبی اور ابوالفضل صدیقی نے بہرحال ایک دوسرے کو پالیا اور بات من دیگرم تو دیگری نہ رہی۔ اپنی اپنی آدھی صدی کی قلمی زندگی کے اندر صریرِ خامہ کی شیریں مدھم مدھم چال ابھی اور چڑھی آندھی کی طرح سنسناتی تھی کہ اس میں کئی ایک پریس کی مشینوں کی گھمر گھمر گھڑگھڑاتے داخل ہوئے اور یہ بات نہیں دل کے پردوں میں اک ذرا سنکی بھی لی' پھر نہ معلوم کس وقت سرک گئے! میں بغلیں ہی جھانکتا رہ گیا۔

اے میرے ہم نشینو آواز دو کہاں ہو! اور پھر وسوسہ وہم میں مبتلا ہو گیا۔ اپنے ہی اندر چپک مقناطیسیت ناقص کھل تھی یا وہی لقل یا سیماب صفت تھے اور آج جب کہ آفتاب عمر ڈھل ڈھلا کر خطِ افق پر جا لگا ہے' اور وقت کی گھڑی کان کے بالکل ہی قریب ٹک ٹک کرتی سنائی پڑتی ہے تو دائیں بائیں کاندھا دینے کے لیے دو چار نظر آ کر تسلی سی ہوتی ہے اور جیسے یہ صبح پیری مانندِ شفق درخشاں سہارا ہیں۔ شاید کیسے نہ کیسے یہ وبال دوش کر کے شام گورِ غریباں تک پہنچائیں گے۔ اور ان چار چھ میں سے ایک ذرا زیادہ ہی آغوش وا نکلے' اپنے دسوں چھوٹے بھائی بہنوں میں برادر بزرگ ہوتے ہوئے' پتا نہیں کیوں' شاید بزرگی میں جھنین کے مزے لینے کے لیے "بڑے بھائی" تلاش کر لیے تھے۔ ادھر بڑے بھائی کو اپنا خط دائرہ

محدود و منتہی ہوتے ہوئے نقطہ مرکز میں ضم گم ہوتا نظر آ رہا ہے' اور چھہترویں بہار کا تقاضا بھی ہوتا چاہیے۔ اور کاندھا دینے والے سہارے کی تلاش قرینِ فطرت بھی ہے اور جمیل جالبی نے شاید شیریں کے منھ بولے سن کر ان دیکھے بڑے بھائی کو بڑے بھائی بنالیا اور بڑے آدمیوں کی بڑی بات یہ ان کے منھ سے سن کر اور اپنے کو دیکھ کر بڑے بھائی کو چچا غالب کی طرح۔

آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

اور یہ بونا اچک کر ان پہاڑوں کی چوٹیوں کی قطار میں جا لگا جن کی گھاٹیوں پر ابر بھی نہ تھا' اور آج تک من آنم کہ من دانم ہے۔

وہ محکمہ تعلیم کی افسر مدرسی کا کچا تختِ بادشاہی چھوڑ کے امتحانِ مقابلہ کے چھوٹے سے افسر مال تھے۔ اور آج "رجعت علی الاصل" پھر خاک اپنے خمیر کو جا پہنچی اور خداداد کشیدہ قامتی کے ساتھ ساتھ کچھ زیادہ ہی اچکتے' ابھرتے سال اندر بچہ کی طرح گھٹنیوں تھگلیوں والے دنوں میں دوڑیں لگاتے دکھائی دیے' اور کہنے کو تو چھوٹے بھائی تھے مگر قوتِ بازو والی مچھلیاں رہ رہ کر پھڑکتی نظر آئیں۔ اور نووارد کو تو شہر میں سورج کدھر سے نکلتا ہے اور کہاں غروب ہوتا ہے' رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ موصوف ادب نواز کے ساتھ ساتھ غریب نواز بھی تھے کہ ایک روز دو نوجوان کھوکھرا پار سے دھکے کھاتے پہنچ' عین وکٹوریہ ٹاور کے نیچے کھڑے' ان سے وکٹوریہ ٹاور کا پتا پوچھ رہے تھے' ان دونوں غریب الوطن نوجوانوں کو گاؤں میں بٹھالیا اور یہ دونوں ہمیشہ کے لیے ان سے منتھی ہوگئے' ان کے روزگار کا بندوبست کیا۔ ان غریب نواز اور ادب نواز کا دفتری ٹھکانا میرے گھر سے اور بھی قریب تھا۔ شیریں کے فلیٹ سے بھی اور دو فرلانگ ادھر ہی بندر روڈ پار کرتے ہی آجاتا تھا۔ اور دفتری کام نمٹا کر' کام سے فراغت پا کر دفتری وقت کی حدِ سرکاری پوری کرکے آہستہ آہستہ اسپرنگ دار کرسی پر انتظار میں جھولتے ہوتے' سلیم احمد' شمیم احمد' اکرام یا میرے انتظار میں اور ہم کو دیکھتے ہی ہونٹوں پر خوش آمدید والی مسکراہٹ کھلنے لگتی' گھڑی پر بار بار نظریں ڈالتے سوئیوں کی رفتار میں دفتری اوقات کی حدِ شرع پوری ہوتے ہی گھنٹی بجاتے اور متعلقہ اہل کار کو طلب کرتے کچھ ہدایتیں دیتے اور بس اٹھ کھڑے ہوتے۔ موڈ ہوتا تو میرے گھر کی جانب رخ ہوجاتا اور چند منٹ کے راستے ہی میں چلتے چلتے اہلِ قلم سا موڈ ہوجاتا اور افسر مال تو دفتر مال سے نکلتے ہی فائلوں میں لپٹا رہ جاتا اور پیر کالونی پہنچتے پہنچتے جیسے ہم زاد سائے کی طرح لگے' خیالی رسالہ کے شیڈو ایڈیٹر شمیم میاں بھی جیسے سایہ کی طرح کسی دیوار پکھے کے کواڑ میں سے برآمد ہوجاتے۔ بے لگام و دہانہ مرہٹوں والے منھ زور چھوٹنے سے یابو' خواہ کھڑے نوکیلے کانوں کی جانب منھ کر کے آگے سے لہراتی دم کی پیچھے جانب رخ کیے سواری کے اپنے طویلے کے کڑھے نکلے فتنہ محشر جلو میں اور قیامت رکاب' مستقبل کے تاریخ فتنہ میں' جنھوں نے "نیا دور" اور پھر آگے بڑھ کر پندرہ روزہ ادبی گزٹ کے ذریعے اداریے کے کالموں سے انتخاب ہفت کشور خطہ پنجاب کی کشت قلم پر گدھوں کے ہل چلا دیے اور پھیر دیے' جسے ٹکسالی بولی پر بولتے ہیں بھوبھل جوت کے رکھ دی اور "نیا دور" کا ڈیکلریشن ہاتھ آجانا تو بہانہ تھا۔ اگر نرگس ایکٹرس کی

آنکھوں کے بہانے "نیا دور" یوں ہاتھ نہ آتا تو کوئی پرانا دور، وہ تو نکلتا ہی نکلتا کیوں کہ یہ جمیل جالبی کے دل کی آواز تھی لیکن دل کے اندر ڈالی ہوئی انھیں صاحب زادہ بلند اختر کی تھی اور اب دونوں یک سرے یک آواز ہو رہے تھے۔

اور "نیا دور" تو صریحاً گھاٹے کا سودا تھا اور ممتاز شیریں و صہ شاہین نے از ہندوستان تا پاکستان اس ادبی مسودہ میں دھڑی دھڑی لٹ کر خود ہی بند کر دیا تھا اور سب کچھ سمجھ کر جمیل جالبی اسے اپنے سر لینے کو تیار ہو گئے۔ ویسے شاہد احمد دہلوی اس اکھاڑے کے پرانے کھاتے پیتے بجینت تھے۔ انھوں نے مشوروں میں تمام اونچ نیچ دکھائی۔ مگر اب بات اقتصادیات کے دائرہ سے نکل کر "اخلاقیات" کے جال میں آ پھنسی اور اخلاقیات بھی اخلاقیات شعر و ادب، جہاں آبگینوں کی ٹھیس بھی مخلِ سماعت ہوتی ہے اور پھر ممتاز شیریں جیسی ادب کی مقبول ترین صنف افسانہ کی خالق کے تعاون تو در کنار، آزردگی کو دعوت دے کر کسی بڑے ادبی جریدہ کا نکالنا کون سی منطق تھا۔ اگرچہ مرحومہ اس طبیعت کی آدمی نہ تھیں لیکن اور کوئی نہیں تو پریس کے ہفتہ وار ایڈیشنوں کے گرے ہاونڈوں چھوکروں سے اندیشہ تھا کہ لے اڑیں، اور بات سر منڈاتے ہی اولے پڑے ہو جائے لہٰذا ہر پہلو سے ٹھونک بجا کر طے پایا کہ ہرچہ بادا باد رسالہ نکالیں، اجازت، اطلاع کے چکر، تکلف میں نہ پڑیں۔ اندیشہ تھا کہ اگر شیریں نے اجازت نہ دی تو پھر ہم پر ادب کے ناتے لازم ہو جائے گا کہ "نیا دور" نام کا رسالہ نہ نکالیں۔

اس عرصہ میں فقیہہ شہر قطار لاہور اسکول والے اہلِ قلم تو خیریوں ہی تھے جیسے ایڈمنسٹریٹر ہو سکتے ہیں تاہم بڑے اچھے اہل الرائے اور ستھرے ذی اختیار "صاحب" "اعتماد میں آئے"، انھوں نے قانونی اور فن کارانہ، عالمی رائے دی کہ بھائی شیریں کے پاس اجازت لینے جانا ہی ان کے کئی سال کے خود اپنے چھوڑے ہوئے حق کو تسلیم کرنا ہے اور خواہ مخواہ کی ان کی حاکمیت ماننا ہے۔ پھر "نیا دور" "شیریں والے اور "نیا دور" نرگس والے میں کوئی مناسبت نہیں۔ اس کا آج اس پر کیسے اطلاق ہو سکتا ہے اور وہی بات کہ اس "نیا دور" کی قلمی و ادبی ساکھ از ہندوستان تا پاکستان قایم رکھنے اور ادبی عصمت دہلی و کرناٹک کا یہ نیا نیا دور، محافظ و امین ہے اور یوں جمیل جالبی یا شمیم احمد اس کے محسن ہیں اور تحفظِ ادب پر اہلِ قلم کا حق ہے اور فرض بھی۔

کافی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ بسم اللہ کر کے پرچہ نکالیں۔ اگرچہ شیریں جیسی قد آور اہلِ قلم اور صمد جیسے تجربہ کار مدیر و منیجر کو تعاون میں لیے بغیر کوئی بڑا ادبی جریدہ نکالنا غلط سا امر تھا۔ چہ جائیکہ ان کی آزردگی کا دھڑکا، یا کون جانے کس کل اونٹ بیٹھے حالاں کہ یہ لوگ ایسے آدمی نہ تھے لیکن خدانخواستہ قلمی مخالفت کا اندیشہ! جرأتِ رندانہ تھی اور جریدہ کے لیے نکلتے ہی سر دھڑ کی بازی .... نیک نیتی اور تحفظ کا پہلو وہ تسلیم کر لیں تو، تو خیر ایک چیز بھی تھا ورنہ اپنا مورال اپنی ہی بات تھی، اور جہاں تک یاد ہے شیریں اور صمد اس زمانہ میں کہیں باہر تھے اور ایسے معاملوں میں جو بحث و تمحیص کے ذریعے طے ہوتے ہیں خط و کتابت یا فون کال اکثر ناکام اور دو ٹوک رہتی ہے۔

جمیل جالبی نے کئی چھوٹی بڑی محفلِ مشاورت ترتیب دیں جن میں سے بعض میں 'میں خاموش تماشائی بنا شریک رہا۔ اور آخر طے ہوگیا کہ رسالہ "نیا دور" نکالا جائے اور ساتھ ہی ایک "بدعت" طے ہوئی لیکن بحمد اللہ "بدعت حسنہ اور اجتہاد" کہ "پرچہ کے تمام مندرجات نقد معاوضہ دے کر حاصل کیے جائیں گے۔" یہ پروگرام کی خاص اول شق تھی' نیز یہ کہ پہلی اشاعت کے ساتھ دوسرے ایشو کے لیے کم از کم تین پرچوں کا تخمینی مواد تیار دفتر جمع کرلیا جائے گا۔ ویسے میں غریب بیس سال سے افسانوی نثری مواد صرف ایڈیٹر صاحبان کے الداعی الخیر صرف اردو زبان کی خدمت کے کار خیر میں لکھ لکھ کر اچھے اچھے موٹے موٹے رسائل کو اپنے چھوٹے سے شہر کے دیہات میں بیٹھا' اپنے شوق کی تشنگی کی خاطر پال رہا تھا' اور بجز "آج کل" دہلی اور ادھر کچھ دنوں سے پاکستانی نقال "ماہِ نو" کے سوا بجز اعزازی پرچہ کے کسی نے آدھی چھوٹی کوڑی بھی میری جانب نہ پھینکی تھی اور آج "نیا دور" کی جملہ نگارشات معاوضہ دے کر لینے پر میں اپنے آپ کو یورپ کے کسی ملک میں محسوس کرنے لگا۔

غرض دو تین ایسے ہی بھرپور تجربہ کاروں کے اجتماع میں یہ پروگرام مرتب ہوا۔ جس میں شاہد احمد دہلوی جیسے پرانے اکھاڑے کے پٹے باز اور سینکڑوں محفلیں نکالے پینترے باز تجربہ کار شریک ہوئے جن کے زانوئے ادب کے نکالے جمیل جالبی اور شمیم جیسے چابکی استاد چابک سوار ہوگئے۔ منصوبہ بنا۔ کراچی سے حیدر آباد تک اور پنجاب میں لاہور و نواح سے فیصل آباد ادھر پشاور تک رینج زیرِ قدم و بالمشافہ اسکیم میں آیا۔ ادھر واہگہ پار سے اپنے مشرقی پاکستان تک اور دہلی سے دکن بمبئی تک خط و کتابت کے ذریعے پتے اکثر شاہد احمد سے معلوم ہوگئے اور تمام برصغیر منصوبے کی گرفت میں آگیا اور ایک انگریزی مقولہ کے مطابق چیرٹی بیگنز فرام ہوم' (اولا" خویش بعدہ درویش) تقسیم زر کے لیے پہلے لاہور سے شروع ہو کر کراچی آنا طے ہوا۔ اور اپنے شیڈو ایڈیٹر پانچ فٹے تین انچ ہر کہ بہ قامت کم تر کہتر میاں شمیم احمد قلم کی لنکا میں پورے باون گزے جیسے ہنومان جی کا قد ہے۔ یہ جیون بوٹی کی تلاش میں پورا بندھیا چل پربت اٹھائے سر پہ فٹ بھر اونچی نوٹوں کی گٹھری دھرے پورے سوا چھ فٹے' پارہ کا پارہ اور آدمی کا آدمی بنے۔ ۲ + ۲ = ۵ کے بجائے سوا چھ' میزان سندباد جہازی کی طرح سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔

اٹھارہویں صدی کے داستان گویوں کے بیان کی طرح سوداگر بچہ کی مانند چل چل چلا چل' چل چل چلا چل اور انیسویں صدی کے اوائل والے مثنوی گو شاعروں کے بقول۔

پل و راہ و مسجد و مہماں سرائے
جہاں ٹکڑا دیکھا وہیں بیٹھ جائے

سرِ عاقبت کے بوروں کے بجائے نوٹوں (لکھے ہوئے نہیں بیچ بیچ والے کرارے کھڑکھڑاتے گڈی بندھے) کی گٹھری سجائے گلی گلی اپنی دیسی ہلکی پھلکی جوتیاں چٹخاتے دروازہ دروازہ الٹے کھٹکھٹاتے بہ ظاہر مانگے تانگے نظر آئے لیکن در حقیقت برعکس کھلاتے پلاتے کچھ اس طرح کو گھر سے ستو اور سرِ دولت کی پوٹ کا ورد سر سنبھالے صدا دیتے سنائی دیے۔ بھائی لے "جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا"۔

اور تو اور سوتنھے کی طرح اپنے درہ عمر کا دستہ ہاتھ میں باندھے۔ خیر نثر نگاروں' افسانہ نویسوں کی تو ایک بات بھی تھی بے سرے' دم گلے' نیم گلے باز پاز بھاٹ پاؤ بھانڈ شاعروں کے محلّہ میں بھی جا پہنچے جو ہونگ کی داد بے داد پر یک رفتار آداب گزار ہوئے اور صرف ڈنڈ پیلتی' بیٹھکیں لگاتی لے کے سہارے مشاعرے دکھائی سنائی پڑتے ہیں' اور یہاں شمیم میاں کو دور سے بن کر آواز لگائی اور میر تقی میر کی پیروڈی کی بھی بن گیا ہے کام شاعر کا۔ غرض ادبی' ادارتی شیام سندر نے ایسی گنگا جمنی سی سریلی رو پہلی بنسی بجائی کہ گھر گھر دہائی مچ گئی۔

ڈیڑھ صدی بعد اودھ شاہی تاج کی تکرار کردی' جسے نہ دلوائے مولا دلوائے آصف الدولہ' جس کے پاس جو کچھ ہوتا اور کچھ نہیں تو مکتب کے میاں جی کے ہفتوں کا کرم خوردہ گھڑے کی تلی پر پڑا تھا وہی نکال لایا اور دروازہ پر لگی ترازو کے پلڑے پر پاسنگ پچھاڑ و چڑھا کر نوٹوں سے برابر کرلیا اور پھر بھی جس کم نصیب بے مغزے کے پاس کچھ نہ تھا بھی تو دیا گیا تھا۔ اس نے بھی مٹھی بھرنے کے لیے دام نقد کہانی ادھار بس اگلے ہی شمارہ کے لیے اور کچھ نہیں تو زبانی وعدہ قیامت ہی کرلیا اور انھوں نے اس کے نامۂ اعمال میں لکھ لیا۔ غرض ایک دفعہ کو یہاں سے وہاں تک واہ واہ ہوگئی اور بعض بعض کے تو افضل العلوم کے ان ساہو کاروں کے باپ کے وقتوں کا بنہ کھاتے میں پڑا مرا قرضہ مع سود گھر بیٹھے چک گیا۔

اور پھر اگلے تو اگلے افضل العلوم کے علم برداروں کی کیفیت الحرکاتیاں اور قلم زوریاں دیکھنے میں آئیں اور عبرت ہوئی کہ ایک مشہور افسانہ نگار نے جو ضرورت سے زیادہ کے شوقین اور خرچ سے تنگ واقع ہوئے تھے مندرجہ کاغذاتِ سرکاری سے زیادہ نہیں۔ بچارے مہتمم سے مدیرِ محترم "نیا دور" کے ایڈیٹر ثناء اللہ کو افسانہ کا تقاضا اور پتا نہیں شاید پیشگی معاوضہ کا ذکر حوالہ (کیوں کہ میری نظر سے ان غریب کا تقاضے کا خط نہیں گزرا البتہ ان کے جواب سے سمجھا) خیر ثناء اللہ کو تو وہ کیا جواب دیتے' کراچی کے ایک بڑے دانش ور کو (جو شاید ان کے پندار میں ان کے برابر کی ہستی تھے) ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ' جواب دیا۔ اور اپنے پندار میں آٹھویں آسمان سے بولے اور کچھ یوں گرجے کڑکے جسے کہاوت میں علم جہالت لٹھ گرامت بولتے ہیں اور اتنے طویل خط میں کہ اگر چاہتے تو "اکانومی آف ورڈز" اصطلاح میں ان کا ایک پورا افسانہ بھی لکھ جاتا۔ بار بار ثناء اللہ کی تعریف اور جائے رہائش دریافت فرماتے ہوئے (حالاں کہ عام ادارت میں درج تھا) اپنے نسلی تہور اور دلیری کا حوالہ دیتے ہوئے۔ ایفائے وعدہ اور نقد پیشگی معاوضہ ادھار کہانی دینے کے بجائے ثناء اللہ کے پیٹ میں خنجر بھونک دینے کی بات کہی تھی' اور اس سے پہلے ایک مشہور بھاری بھر کم افسانہ نگار اپنے مجموعہ کے ریویو کے ناہموار اور خلافِ مرضی ہونے کے جواب میں شمیم احمد سے پیٹھ پیچھے تاہم میرے روبہ رو کراچی میں کہیں سرِ بازار ایمپریس مارکیٹ کے آس پاس قلم کے بجائے لٹھ سے نبٹنے کی بات کرچکے تھے اور مجھے انیسویں صدی والے سر مشاعرہ ساونتی شاعروں والی قرابین باندھ کر آمنے سامنے بیٹھنے کی تاریخی بات یاد آگئی تھی اور جمیل جالبی نے تاریخ کا حصہ بنانے کے لیے گانٹھ باندھ لیں۔

لیکن اسکیم زرپاشی میں اندرون ملک واپسی کے بعد کراچی کے اپنے اہلِ قلم کی باری تھی۔
تو کہ ما دشمناں نظر داری

اپنے اور دوست بھی محروم نہ رہے۔ دنیا بھر سے نبٹ نبٹا کر تلی جھاڑ ہتھیلی کرنے ایک روز ایک سہانی دوپہر دیکھتا کیا ہوں شمیم احمد میرے غریب خانہ (جو اس زمانہ میں تھا بھی کچھ ایسا ہی اسم بامسمیٰ) پر بھی فارغ الاستحصال ہو ہوا کر ہنوزے جریدے نیست حوالدار شیڈو ایڈیٹری تشریف لائے۔ صورت کی تراوٹ ہی سے پہچان گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور جیب سے نکال کر بلا سان گمان پورے کا پورا سو روپیہ کا بندھا نوٹ ڈاک خانہ کے ٹکٹ کے خریدار کی طرح بڑھایا اور مجھ سے میرا افسانہ "میراث" مانگا جو میں نے پچھلی شام حلقۂ اربابِ ذوق میں سنایا تھا اور اس سے پہلے ملک کے ایک نامور افسانہ نگار بڑے سرکاری افسر کو اس کے گھر جا کر سنا چکا تھا' کیوں کہ یہ سرکاری رسالہ "ماہِ نو" نے "پکڑ" کے اندیشہ میں واپس کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد افسر موصوف نے اپنے گھر پر کھانے کے بعد رات گئے تک سن کر تعریف کی تھی اور قطعاً "پکڑ" سے مبرّا قرار دیا تھا۔ اور جب وہ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں گئے تو فحاشی کے متعلق اپنے کسی نوٹ کے ذریعہ اظہار خیال کی نظیر کا حوالہ دیا تھا اور شمیم احمد نے ادھر اس ہاتھ سے سبز نوٹ بڑھایا ادھر میں نے چپکے سے تکیہ تلے سے نکال کر اپنا افسانہ "میراث" کا مسودہ دے دیا۔ اس طرح کہ اس ہاتھ کو خبر نہ ہوئی کہ جیسے باری علیگ کی کتاب کمپنی کی حکومت اردو والوں کو بیچتے ۱۹۴۴ء میں دیکھا تھا کہ باری علیگ سامنے بیٹھے ہوتے تھے اک ذرا پیچھے کو بلا وردی سادہ کپڑوں میں بگلا بھگت بنے اور مکتبہ والے داروغہ جی نے جلد بیچے کمیشن میں (دکھائی پڑا نہیں روپیہ یا اٹھنی) اور لے کر خریدار کو گھر تک جہاں بیٹھے بیٹھے بہ خیریت پہنچنے کی ذمہ داری لے کر دکان بند ہو جانے پر اٹھ جایا کرتے تھے اور شمیم احمد جیسے نو سرباز ہتھ پھیر کی طرح چپکے سے اٹھ گئے۔ صدر بازار تک میں بھی ہو لیا تاکہ بہ خیریت بس پر سوار کرا سکوں۔

خدا خدا کر کے امنگوں آرزوؤں کے ساتھ "نیا دور" چھپ کر ہاتھ میں آیا۔ ایک ماہ سے صمد اور شیریں اس وقت کہیں باہر تھے۔ جہاں تک یاد ہے اور "نیا دور" جدید کے لیے میدان یک طرفہ' اور خالی تھا۔ جب یہ لوگ آگئے تو مختصر سی مجلسِ شوریٰ جڑی' شیڈو ایڈیٹر شمیم احمد کا نام نامی خان بہادری کے خطاب کی طرح رسالہ پر جلوہ افروز ہوا۔ اور "کتابے چند" کی طرح ثناء اللہ (یاد نہیں کہ نام نامی بھی رسالہ پر اندراج "بشرح صدارت" میں تھا یا نہیں دیکھ لیں) اسٹال اسٹال ڈھو ڈھو کر پہنچانے پر فائز ہوئے اور کچھ ایسا ہی کام مجھ ناتواں کے سپرد ہوا۔

"بڑے بھائی" ہونے کے مشترک ناتے' جس میں قلمی رشتہ داری کو مطلق دخل نہ تھا کہ جمیل جالبی بلکہ زیادہ صحیح رشتہ "نیا دور" کے بڑے بھائی اور شیریں سے بھی کچھ ایسے ہی سگے سے ہوتے ہوئے اپنی شیریں بہن کو اپنے جمیل جالبی چھوٹے بھائی کا تحفہ اعزازی جلدیں پہنچائیں۔ یاد نہیں شاید جیسا کہ عرض کیا باہر تھیں کراچی پہنچنے پر اچھی صورت دیکھ کر اعزازی جلدوں کی پاپ کی پوٹ لادے نہ ایڈیٹر نہ مؤلف' جائنٹ ایڈیٹر نہ منیجر مالک کچھ بھی نہیں تاہم بے گاری' شیریں بہن کے یہاں صرف بڑے بھائی کے

دونوں ہی (جمیل جالبی اور شیریں) کے منھ بولے رشتہ کے مشترک سہارے یاد نہیں شمیم احمد اور جمیل جالبی کی دستخطی اعزازی جلدیں لے کر میں شیریں بہن کے یہاں جا پہنچا۔

شام کا وقت تھا اور اس وقت تک شیریں اس تمام سازش سے بے خبر تھیں جو ایک مدت سے چل رہی تھی۔ معمول کی مدارات سے پیش آئیں اور درکار خیر پیچ استخارہ نیست۔ میں نے بھی پہنچتے ہی ذرا جی کڑا کر کے جلدیں بڑھادیں۔ وہ کچھ نہ سمجھیں' اور میں نے ذرا ڈرتے جھینپتے ہوئے تفصیل بیان کی۔

"یہ آپ کا "نیا دور" ہے..... ہوں' آں' اوں اور جمیل جالبی و شمیم احمد نے اسی آن بان شان کے ساتھ جاری کیا ہے۔"

تو اچھل پڑیں "" ایں کب؟"

اور جلدیں ہاتھ میں نہ لیں۔ ترشی کی لذت سے تو مرحومہ کی زبان آشنا ہی نہیں تھی' اور تلخیٔ حلق فطری امر سا' بس بکھر گئیں اور برس ہی تو پڑیں۔ آواز مدھم لیکن انداز نہایت مضبوط۔

"یہ بد دیانتی ہے!" ان کے منھ سے پہلا جملہ نکلا اور پھر جملوں کا پگھلی چاندی سا کھنکتا آبشار جاری ہوگیا۔ اور میں بے چارہ برساتی مینڈک کی طرح ٹرٹراتا ہی رہا۔ اور بتانے کی کوشش ہی کرتا رہا کہ کس طرح "نیا دور" نام کا نامور قلمی رسالہ کا ڈیکلریشن اتفاقیہ طور پر جمیل جالبی کے ہاتھ لگ گیا اور انھوں نے استادی کے ساتھ جھپٹ لیا ورنہ نرگس ایکٹریس کی تصویر کے ساتھ کہیں فٹ پاتھوں پر لوٹتا نظر آتا اور اس طرح انھوں نے از ہندوستان تا پاکستان "نیا دور" کی عظمت اور علمی وقعت بچائی وغیرہ وغیرہ' تاہم وہ اپنی ہی کہے گئیں۔ بڑی دانش ور عورت تھیں' اور تو اور انھوں نے چند سال قبل والی چوہدری برکت علی اور چوہدری نذیر احمد کے مکتبہ اردو اور ماہنامہ ادب لطیف کی نظیر پیش کی جس میں معاملہ عدالت تک پہنچا تھا اور پھر ثالثی کے ذریعہ ہزاروں کا لین دین ہوا تھا۔ اگرچہ بات بے تکی اور غیر چسپاں تھی تاہم میں پی گیا۔ اور "بجا ہے' درست ہے" سے کام لیتا رہا۔ مگر شاید ان کے کانوں میں یہ بھی نہ پہنچی۔ وہ خود ہی سوال اور خود ہی جواب ہو رہی تھیں۔ اور کسی وقت سوال ہی سوال۔ مجھے صنفِ نازک کے اس پہلو کا اندازہ تھا۔ کسی بھی سطح کی ہو' غصہ اور اپنا حق ناحق طلب کرتے ہوئے سب کی سب ایک سطح' ایک آواز پر آجاتی ہیں۔ انھیں جیسے میری بات سنی ان سنی بھی کرنے کی ضرورت نہ پڑی' اپنی ہی کہے گئیں۔ تان البتہ اس پر ٹوٹتی رہی کہ "انھیں کم از کم اخلاقاً" میری اجازت لینی تھی۔" اور اتنے اہتمام میں مجھے اسی کے اندر امید کی ذرا سی کرن نظر آئی۔ دوسری بات یہ تھی کہ بڑی موٹی معلق جلدیں میں نے میز پر رکھ دی تھیں' غصہ میں بار بار کنکھیوں سے ادھر دیکھ لیتی تھیں تو بولتے بولتے اک ذرا کے ذرا جھٹکا لگتا اور اک ذرا کے ذرا تیور مانوس ہوجاتے۔ صمد بھی موجود تھے لیکن خاموش اور مرعوب سے' پتا نہیں کہ بیوی کے رخ سے یا اپنے پیارے "نیا دور" کے رنگین ٹائیٹل اور نئے سائز سے اور مجھے ایسا لگا کہ یہ اس ہفتہ کے اجرا کے ہنگامے میں شاید کچھ سن گن پائے ہوئے ہیں اور بیوی کے رد عمل کا پیشگی اندازہ کر کے ذکر نہیں کیا ہے اور ادب کے ناتے اس وقت خوش و مطمئن ہیں کہ چلو اپنے رسالہ کا احیا ہوگیا۔ "نیا دور" کے

معاملے میں تو خاموش رہے لیکن جب بیوی کا ہاؤس لیڈی والا موڈ ہموار ہوا اور شیریں نے تواضع میں چائے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا اوں چائے تو آپ پیتے نہیں' بسکٹ لیجیے تو صمد نے دخل در معقولات کرتے ہوئے بسکٹ کی پلیٹ بڑھائی۔ ادھر مجھے موڈ صحیح ہونے کا اندازہ ہوا تو اسی حالت میں چھوڑ کر تخفیف تصدیعہ چاہتا ٹھیک سمجھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تاہم شیریں مجھے مُصرا کرتے ہوئے اپنے اس رویہ پر معذرت کے الفاظ زبان پر نہ لائیں۔ ان کا روئے سخن جمیل جالبی اور شمیم احمد کی جانب تھا جنھیں پتا نہیں کہ انھوں نے شاید معاف نہیں کیا تھا۔ جلدی جلدی دو بسکٹ چبائے اور چل پڑا تاہم اپنی برت اور شاید اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے بھی ان پر یہ قطعاً" نہ ظاہر ہونے دیا کہ ان کے اس رویّہ کا کچھ اثر لیا ہے اور پھر جو کچھ تھوڑی سی وقتی آزردگی تھی اس کو بھی دل کو سمجھا کر نکال دیا کہ بر رسولاں بلاغ باشد و بس۔ ان کے مجرم تو دراصل جمیل جالبی اور شمیم احمد تھے جن کا یہ رسالہ ہے۔ اگرچہ سوکا یہ نوٹ تو خیر رائلٹی میں اور ربع صدی کی قلمی زندگی کے اندر پہلی مرتبہ پایا تھا۔ بڑی مشکل سے دل کو سمجھایا کیوں کہ سازش میں (بشرطیکہ اس پر اس کا اطلاق ہو) تمام وقت شریک رہا ہوں حتیٰ کہ یہ ابھی جو اعزازی جلدیں لے کر آیا تھا یہ بھی سازشی انداز تھا اور پوری وکالت' اگرچہ حق بجانب تھی تاہم انداز سازشی تھا' اور اپنے اچھے تعلقات اور ان کی خوش فہمی سے فائدہ اٹھانے ہی تو آیا تھا لیکن حق کوشی میں یہ جائز ہے۔ ادب و فن کا تحفظ عین عبادت ہے دل کو سمجھاتا ہوا اور ان کے تیز تند رویہ کو جمیل جالبی اور شمیم احمد کے اوپر ڈالتا آہستہ آہستہ ٹہلتا گھر پہنچا۔

اور دوسرے ہی روز دفتر جاتے ہوئے جمیل جالبی ذرا سویرے میرے یہاں پہنچے۔ اندازہ ہوا کہ میری مہم ذرا اہم تھی۔ انھوں نے پان کی تہوں پہ تھیں لگاتے ہوئے تمام روئیداد سنی اور سب پان چبانے والے جانتے ہیں کہ ایسے وقت میں پیک روکنا اور پھر پانی پیتے مرغے کی طرح گردن اونچی کرکے ہکلا ہکلا کر پیک سنبھالتے ہوئے الفاظ ادا کرنا عین داخلِ آداب پان خوری ہے اور یہاں تو بچارے ویسے ہی بشرطیکہ موقف کمزور ہو یا تھوڑی ہمت مجبوراً" غلط بیانی سے کام لینا پڑے اچھے بھلے خواہ پان بھی منھ کے اندر نہ ہو' تو ہکلا کر کھل جاتے ہیں۔ اور اس گھڑی دو ایک سوال جو کیے تو ایسا ہی ہوتا رہا۔ تاہم آدمی سائیکالوجسٹ بھی ہیں' صمد کی مانوس نگاہوں اور ممتاز شیریں کی پر معنی تنکھیوں سے اپنے مطمئن ہونے کا مخصوص انداز "ہوں ہوں" سے ظاہر کیا جو ہم سب حواری اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اور وہی ہوا۔ وقت کا مرہم اندمالی بھی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ تسکین و صبر اور بڑی بات یہ کہ صحیح سوچ بھی عطا کرتا ہے اور سال اندر ہی "نیا دور" کی جلد میں ممتاز شیریں براجمان تھیں اور شاہکار افسانہ رکھا ہوا تھا اور صرف جمیل جالبی کی کوششوں کا نتیجہ تھا جو ایڈیٹر ناقد' محقق وغیرہ سے ہٹ کر "ماں" والے میٹھے روپ میں نمایاں مرد واقع ہوئے ہیں۔ لہٰذا قوتِ بازو والے رخ میں بہ روئے کار آتی ہے اور ناہموار میدانوں کو ہموار کرکے مردِ میداں ہو جانے میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ اور پھر بات بڑے دانشوروں کے بیچ تھی۔ جمیل جالبی' شیریں' صمد اور شمیم احمد' مٹھاس ہی مٹھاس' اور شمیم احمد کی ترشی کی آمیزش چاشنی بنتی ہی چلی گئی۔ اور

اسی "نیا دور" میں جس کی اعزازی جلدیں پیش کرنے پر شیریں نے چھوٹا بھی پسند نہ کیا تھا ان کے شاہکار افسانے زینت بنے۔

اور پھر صمد ملازمت کے سلسلے میں ترقی اور بڑے مشاہرہ پر بنکاک جانے لگے۔ خورد سال بیٹے نوخیز اور لڑکپن و نوجوانی کی بین بین عمر میں تھے اور یہ نازک دور ہر نوعیت کی قبول کے لیے نہایت زرخیز مٹی ہوتا ہے۔ برابر کے بھائی' بڑا ماں کے ہم شبیہہ' چھوٹا باپ کی نرو کاپی۔ دونوں میرے بچپن کے یار' ساتھ کے کھیلے' جو میرا خاص مشغلہ ہے' خواہ فاروق ہوں یا اپنے وقت پر خاور' محمد علی' میرا رانی' فرحا رہی ہوں یا آج خرم شیری ہوں۔

اک نہ اک ان کو تماشا چاہیے

اور یہ دونوں تو مٹھی بھر سرکتے ہی میرے بھی بزرگوار' باپ' چچا سے بن گئے تھے اور خورد سال سے نوخیزی تک پہنچتے پہنچتے مثلِ پیراں پختہ کار ذہنی نشو و نما میں ایک سے ایک بڑھ کر ماں باپ کے بیٹے' ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' سنجیدگی میں عمر سے زیادہ دم خم' جیسے برابر کے صمد جیسے دوست' اور اب گھر میں یک نہ شد دو شد' ہوگئے اور اونچے کہلائے جانے والے گھروں میں بنگلہ بنگلہ' کوٹھی کوٹھی ایسے بڑے بوڑھے چھوٹے نمونے اکثر پائے جاتے ہیں۔ اور انھیں صمد و شیریں' لاہور والے سوامی رام تیرتھ کی طرح لاہور مال روڈ کے بجائے بندر روڈ کراچی پر اکیلے چھوڑے جا رہے تھے۔ بھرے گھر میں' بھرے بازار میں کسی رشتہ دار کی سرپرستی میں اور رخصت سے چند گھنٹے قبل گیا تو ان سے بھی میرا تعارف کرایا جن کا نہ مجھے آج نام یاد ہے نہ شکل ہی۔ اور ایک ملازم سے بھی جو فلیٹ میں لڑکوں کے پاس دیے تھے۔

شیریں بہرحال ماں تھیں اور بیٹوں سے رخصت ہوتے وقت مامتا بہ روئے کار تھی' ہراساں تھیں' گاہے گاہے خبر گیری کرنے کی مجھ سے بھی رسمی سی فرمائش کی' جو میں نادم ہوں سرِراہے ہی سامنا ہوجانے پر پوری کرسکا اور پھر کراچی شہر سے دلی دیو گری تاریخی تکرار اور تغلق ایوب شاہی ذہنی مماثلت والی ہل چل عمل پذیر ہوئی اور صمد کی منسٹری اسلام آباد منتقل ہوگئی اور ہم اس چار نفری مختصر کنبہ کے خاندانی حالات سے بے خبر ہوگئے۔ خط و کتابت کا بھی کوئی بہانہ ذریعہ نہ بنا' جو "نیا دور" بنگلور سے "نیا دور" کراچی تک ہندوستان تا پاکستان چلتا رہا تھا۔ شیریں جو مشک تخلیق کرنے والی اہلِ " تھیں' بنگلور سے ہی اندازہ تھا' کراچی میں شروع میں قلم ذرا تیز ہوا۔ اور اسلام آباد پہنچ کر لکھنا لکھانا م ہے۔ اور اب تحریروں ہی میں گاہے گاہے ملاقاتیں ہو جاتیں یا اسلام آباد' اس عرصہ میں پتا' کہ صمد کے شناساؤں سے تذکرے ہو جاتے۔

اس عرصہ میں پتہ چلا کہ صمد اب کی مرتبہ ترکی چلے گئے ہیں اور بیٹے ولایت میں زیرِ تعلیم ہیں اور پھر کئی سال بعد ترکی سے واپس آنے پر لوگوں سے دریافت خیریت کے رسمی تذکرہ میں پتا چلا کہ شیریں بیمار ہیں اور اس کے بعد پھر کسی سے ایک عرصہ بعد معلوم ہوا کہ نوبت ہسپتال داخلہ تک پہنچ گئی ہے۔ پیٹ کے کینسر کا شبہ ہے۔ ساتھ ہی تفصیل میں معلوم ہوا کہ دونوں بیٹے ہنوز ولایت میں زیرِ تعلیم ہیں جو اہل

استطاعت اور صاحب رسوخ اونچے ملازم طبقہ کا عام سا رجحان اور مقدر ہے کہ ملک کے انگریز ساز تعلیمی نام کے تربیتی اداروں میں سانولا انگریز بنا کر کسی روایتی بولی میں گٹ پٹ کرنا سکھا کر یورپ کی تربیت گاہوں کے لیے خام مال تیار کرتے ہیں اور پھر یہاں پاکستان میں بنگلہ بنگلہ کا مسئلہ بناتے ہیں جو شروع میں ہر بگلہ کی آرزو ہوتی ہے (راقم الحروف کے غریب خانہ کا بھی تجربہ) اور ۔

تم ہوئے کہ ہم ہوئے کہ میر ہوئے

یہ جانے والے پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں جانتے۔ پچھلے ماہ اردو گرام آگیا تو آگیا ورنہ خبرے بازیافت اور تو اور بوا گھر اور چھوٹا عدد میاں گر بیٹھتے ہیں۔ بکنگھم پیلس کے ارد گرد ہی کسی تنگ گلی سسرال میں گھر جمائی بس جاتے ہیں اور پھر ملکہ وکٹوریہ سے سلسلہ نسب جا ملاتے ہیں اور جملہ مصدق معاف یہاں تک پہنچتے پہنچتے ابھی کئی صفحے اور کالے کرنا ہوں گے تب کہیں صمد کے نیم گورے اینگلو عربک نام پوتے پوتیوں کے اسمائے گرامی گنوائیں گے اور گوری دلہنوں کی رونمائی ہوگی۔

ہاں تو پتا چلا کہ شیریں اسپتال میں داخل ہیں اور پیٹ کے کسی عارضہ میں 'جو ہنوز اشتباہ میں ہے اور پھر ایک روز صبح کو اخبار کھولا تو صفحہ اول پر ممتاز شیریں کی تصویر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہی تھی اور اردو افسانہ کا ابھی غیر تصنیف 'غیر مطبوعہ باب بند ہوگیا تھا۔ ہونٹوں سے ٹھنڈی سسکی نکلی اور زبان پر کسی غیر معروف جواں مرگ شاعر کا شعر آگیا۔

ہم بھی بزم شرق میں کہنے کو لائے تھے اثر
اک کہانی نامکمل اک فسانہ ناتمام

اور چپٹیل نام و شکستہ دل سے ایک ضابطہ کا تعزیتی خط صمد کے نام لکھ دیا۔ بھلا ۔

خفتہ را خفتہ کند بیدار

اس چوٹ سے ۳۲ سال قبل بھرا بھر جوانی دوچار ہوئے تھے اور آج ستم بالائے ستم یہ ڈھا رہا تھا کہ صمد بے چارے کو میں صبر کی تلقین کر رہا تھا اور میں نے تو بڑا واویلا مچایا تھا' پچھلی یادوں کے مظہر دو آنسو بہہ کر رخساروں پر آگئے اور چپ رہا۔

اور اخباروں کے بعد ادبی جرائد کی باری آتی رہی۔ حسب توفیق کالے حاشیوں کے ساتھ علاحدہ نمایاں یا گنج شہیداں کی طرح اجتماعی گورستان میں دو سطری اظہار تعزیت کرتے رہے اور چھوٹے بڑے فرض اور قرض ادا کرتے رہے کہ کافی عرصہ بعد کسی ادبی جریدہ کے خاص شیریں نمبر تو درکنار کسی ایک مضمون مقالہ کا بھی مرحومہ کے متعلق انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئیں تو ایک روز ایک شوگر فیکٹری کا پہلا اور آخری پمفلٹ نما رسالہ ملا جو ہیئت اور ادارت کے اعتبار سے ادبی رسالہ بالکل نہ معلوم ہوتا تھا۔ بے دلی کے ساتھ کھولا۔ ٹائیٹل کا کاغذ کرخت' لکھائی چھپائی بھی سرکاری فارموں جیسی' اور اس میں ایک مضمون کسی لڑکی یا خاتون عذرا مختار مسعود نامی کا نظر پڑا۔ اور یہ ممتاز شیریں کے آخری وقت کے آخری لمحات سے متعلق تھا۔ نام کیا تھا' مانوس سا جانا پہچانا لگا ویسے عذرا تو اپنے ملک میں ہر پانچویں لڑکی پائی جاتی

ہے۔ ہو نہ ہو یہ محترمہ وہی ہیں جو آوازِ دوست کے ساتھ سفر نصیب رہی ہیں۔ ہانگ کانگ اور ملائیشیا وغیرہ کہاں کہاں دنیا بھر میں۔

اور پھر کوئی بھی ہوتیں یہ ۔

خوشتر' سِرِّ دلبراں اور حدیثِ دیگراں

شوق کے ساتھ پڑھنی تھی۔ صورت حال روشن ہوئی۔ دو مرتبہ پڑھا اور دو تین سوال ذہن کے اندر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت مرحومہ کو اپنا آخری وقت آجانے کا یقین تو ہو چکا تھا۔ پھر اس سے پہلے مرض کے شروع اسٹیج میں جب کینسر علاج پذیر ہوتا ہے انھیں امریکہ یورپ بیرون ملک علاج کے لیے کیوں نہ لے جایا گیا جب کہ ان کے شوہر اپنی جیب سے بھی اور اپنے رسوخ و اثرات کے ذریعے بھی اس پوزیشن میں تھے کہ آسانی کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ جواب ملا کہ ہم بھی مشرقی اور خاص طور پر پاکستانی ہندوستانی' پیٹ کے امراض اشتہا' درد وغیرہ کی اہمیت نہیں سمجھتے' چورن چٹنی' گولی بٹی' یا لال مکسچر سے اور بہت بڑھے تو ترک غذا کر کے ٹھیک ہو جاتے ہیں اور پیٹ کے کینسر کا تو شبہ بھی نہیں ہوتا اور ان لوگوں کو جب پتا چلا جب مرض لا علاج ہو چکا تھا۔ لہٰذا باہر لے جانا طلبِ مجہول تھا۔ دوسری بات کھٹکتی ہوئی یہ تھی کہ صاحب مضمون خاتون کے آگے انھوں نے اپنے باپ ماں اور بھائی بہن کیوں یاد کیے جنھیں چھوڑے ہوئے ربع صدی سے بھی اور دس برس اوپر ہو چکے تھے اور جو ہندوستان میں پتا نہیں کہ زندہ تھے بھی یا نہیں جب کہ محبت کرنے والا شوہر پاس تھا۔ جواب گومگو میں تھا۔

بہرحال مرحومہ ایک عرصہ سے بیمار تھیں اور درد شکم میں مبتلا۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں تعلقات زن و شوئی ختم ہو جاتے ہیں اور یہ تعلقات بھی میاں بیوی کی محبت کا بڑا ذریعہ ہیں اور اس وقت اس کی یا کون جانے بالکل محرومی نے کشیدگی پیدا کی ہو اور یوں ماں باپ بھائی بہنوں کی یاد آئی ہو۔ ویسے یوں بھی مرتے وقت سبھی یاد آتے ہیں' مرنے والا دشمنوں کو معاف کرتا ہے۔ جذبات نہایت نرم اور ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے وصیت کا ۲/۳ شرعِ محمدی کے قانون میں شامل پیش رفت ہوتا ہے واللہ اعلم اور آخری اور تیسرا سوال یہ تھا کہ ملک کے اندر بڑے مقتدر ادبی جرائد خواہ ماہنامہ کی صورت نہ سہی تاہم دو ماہے' سہ ماہے' سالانے' دو سالے' پنج سالہ موٹی موٹی جلدوں والے موجود ہیں یہ "قند" کو کیوں توفیق ہوئی۔ شاید فیکٹری کے شعبہ کے کسی ذرا زیادہ باذوق شاعر قسم کے اہل کار آفس سپرنٹنڈنٹ نے رعایت شکری کے اعتبار سے شکر سازی فیکٹری کا جریدہ "قند" اور مٹھاس کے معمار صفت شیریں کی مناسبت سے یہ خاص پمفلٹ نکالنے کی فیکٹری کی انتظامیہ کو ترغیب دی ہوگی۔ کیا یہ اردو کے مقتدر جرائد کے لیے شرم کی بات نہیں ہے کہ ان کے بڑے ادیب مریں تو وہ دو سطری خبریں اظہار تعزیت کر کے تو خاموش رہیں اور تجارتی صنعتی ادارے انھیں یاد کر کے نوازیں۔

آج جب سوچتا ہوں تو مرنے سے بھی جی ڈرنے لگتا ہے۔ صاحبو! ویسے حال بیگم' بیگم دانند' تو قلم عذرا مختار مسعود کبھی ملیں تو پوچھوں گا کہ انھوں نے اس عیادت کی ملاقات کا کیا تاثر لیا۔

ممتاز شیریں کی موت کے سرِ استقبال کا تذکرہ کرتے ہوئے یاد آیا۔ سلیم احمد جیسے عظیم دانش ور کے مرنے کے بعد جمیل جالبی جیسے عظیم مفکر کو کچھ کہنے کے لیے کراچی ٹیلی ویژن نے اپنے بھانڈوں اور ایکٹروں والے بیش بہا وقت میں سے بہ مشکل نکال کر صرف تین منٹ عطا کیے اور اتنے ہی پروفیسر ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کے متعلق کچھ کہنے سننے کے لیے اس روز مجھ غریب کو جس میں ڈاکٹر مرحوم کی کتابوں کے نام بھی پورے نہ گن سکا اور مورخ ادب ڈاکٹر جمیل جالبی ان دونوں کے متعلق اپنی تحقیق میں تین تین صفحات اور ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار الفاظ شامل کردیں گے تب حق ادا ہوگا۔ فعتبروا یا اولی الابصار۔ اور مرحومہ تو فکر و دانش کے آسمان کا درخشندہ ستارہ تھیں۔

سمجھ لیجیے، قصور کس کا ہے، چمگادڑ کی آنکھ کا یا سورج کا۔ تقریباً" دو سال بعد بیوی کو دفن کرکے اور دفتر سے فارغِ دوام ہوکر صمد اسلام آباد سے کراچی آئے تو نو وارد شہر والی پہلی ملاقات کے بعد پندرہ سولہ سال سے اپنے ذاتی مکان ناظم آباد بلاک نمبر ۴ میں مقیم تھا جہاں اب تک ہوں۔ میں نے بالمشافہ اظہار تعزیت کیا۔ تھوڑی دیر فضا غم ناک رہی۔ شیریں کی علالت کے متعلق رسمی سوالات ذکر اذکار ہوئے۔ ایک منی سی بچی چار پانچ سال کی ساتھ تھی۔ جوئی کا پھول سی، لکھنوی انداز میں آداب گزار ہوتی، اور متوجہ کرلیتی اور میں بچوں سے دوستی کرنے کا یوں بھی شائق ہوں اور ماہر خاص۔

ہم عمروں میں خود منی منا بچہ بن جاتا ہوں۔ معصوم ادا سے سلام کرنے کے جواب میں، میں نے سوال کیا۔ "آپ کی تعریف؟" تو بچی شرما لجا سی گئی۔ صمد انگریزی میں بولے۔ "مائی اڈاپٹڈ ڈاٹر لبنیٰ" اور پھر اسی طرح انگریزی میں میرا تعارف کرانا چاہا مگر میں نے بات کاٹ دی، ویسے یہ بات نہیں صمد اپنی گوراشاہی اردو بولتے ہوئے شیکسپیئر، ملٹن بائرن مارکہ انگریزی سے بھی کام لیتے چلتے ہیں اور میں اس کا پرانا عادی بھی تھا۔ مگر اس گھڑی سیدھے سادے اپنے دیسی موڈ میں تھا۔ منی سے میری ملاقات میں انگریزی ذرا مخل سی لگی، اور جواب میں ٹھیٹ روہیل کھنڈی قصباتی، بدایونی، بریلی، مراد آبادی عورتوں والی زبان استعمال کی۔ ناک اور ہونٹوں پر ترچھی انگلی رکھ کر پوچھا۔ "سنو تو اللہ نے تمھیں چھ چھ ہاتھ کے دو پوت دیے پھر، یہ لڑکی ذات پرایا دھن گود لینے کی کیا مار پڑ گئی تھی؟" ویسے میری آواز مردانی رہی لیکن لہجے کو کیا کرتا وہ تو زبان اور موضوع کے مطابق ہو ہی جاتا ہے۔ آدمی ذہین ہیں۔ مجھے برسوں بھرا بھگتا تھا۔ ٹھکانے سے سنبھل کر بولے۔

"بھائی! کیا کروں شیریں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ دونوں بیٹے ولایت سدھارے، بھائی ہندوستان سدھارا اور میں نے یہ نواسی بیٹی بنالی۔"

نواسی پر میں اک ذرا چونکا ہی تھا کہ انھوں نے تشریح کردی۔

"یہ میری بھانجی کی بیٹی ہے۔ اور میں نے اسے اس کی ماں سے مانگ لیا ہے، اور اب یہ ذرا سی جان میری تنہائی کی رفیق ہے اور میری ننھی پیاری بیٹی ہے۔" اور بچی کی جانب پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ لجا سی گئی۔ اور میں نے اندازہ کیا کہ بچی اپنی عمر سے آگے سمجھ دار ہے اور اپنے ریمارک پر ذرا محجوب سا تھا جو اندیشہ

ہے کہ باوجود تمام مشکل و نامانوس انداز کے اپنے متعلق طنز' تضحیک سمجھ ہی گئی ہوگی کہ بڑے میاں بکواس کر رہے ہیں اور پھر اس کے بعد تیسری چوتھی اتفاقی ملاقات میں محجوب سے خفیف ہوا۔ جب میرے اور اس کے درمیان ابھی اسی ہفتہ مزید مفصّل اور اہم تعارف ہوا اور آج یہ تحریر سپردِ قلم کرتے ہوئے اپنی پہلی ملاقات والے تمسخرانہ ڈرامائی انداز پر متاسّف ہوں' جب اس عظیم ہستی بیٹی سے حالیہ تعارف ہوا۔ اور جواب بچی نہ سہی نوخیز لڑکی ہی ہے' خیریات انھوں نے ختم کردی۔ بہت دنوں میں ملے تھے' نسائی انداز محاورہ معاف' جھوا بھر باتیں کرنے کو تھیں اور شاید بہت دنوں کے بعد ملنے کے سبب تکلف میں تخاطب کرتے ہوئے صہ "آپ" استعمال کر رہے تھے۔ ورنہ مدتوں سے "ہم تم" چلتی تھی۔ البتہ شیریں آپ اور میں تم' بھنو' بھوں بولتے تھے۔ اور تو اور صہ کے سامنے آج رہ رہ کر میرا چراغ بھی لو دے رہا تھا۔ ویسے لمبی گفتگو کے لوچ سے واقف ہیں اور متکلم کو بور نہیں ہونے دیتے خود ہی سوال خود ہی جواب کے اتار چڑھاؤ میں طاق ہیں۔ باوجود مدراسی' کرناٹکی' تلنگو یا بو لوگ ہونے کے نیبل ناک میں ایسے لسّان ہیں کہ رہ جانے والے لوگ نہیں اور شمالیوں بڑے بڑے لسّانوں میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ البتہ لہجہ کی اجنبیت' ندرت ذرا اور بات ہے ورنہ متکلّمین سنتے ہی رہنے کے جال میں پھنسے رہتے ہیں خواہ شیریں بھی لیڈیز فرسٹ کا حق لیے اپنا تمام تر علمی و ادبی سرمایہ دبائے چپ بیٹھی رہیں اور ہم جیسے کم مایہ ان سے استفادہ کے منتظر دل ہی دل میں۔

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

کہتے ان کے منتظرِ کلام رہ جائیں۔ حتیٰ کہ بھری نشست' برخاست ہو جائے' اور آج تو ایسی کوئی بات نہ تھی۔ معلوم ہوا کراچی "گھر بسانے" کے محاوراتی ارادہ کے بغیر (ورنہ چرا اور سر کے بال ابھی بچپا دوئی کھچڑی تھے) لیکن سیدھے ہمارے لغوی معنی میں سر چھپانے کے لیے چھت کی فکر میں ہیں۔ اور "مکان خریدنا ہے" میں نے رائے دی۔

"میاں یہیں کہیں ہمارے پاس پڑوس میں پڑ رہو۔ بنا بنایا معقول' ضرورت کے مطابق مکان لے لو۔" اور پراپرٹی ایجنٹ کی طرح "دلال" کی۔ "بھئی ادھر مختار زمن' ادھر شان الحق حقی' سامنے مرزا علی اظہر' پیدل فاصلہ گھڑی بھر رستا پار جمیل جالبی اور خواجہ حمید الدین شاہد اور پھر یہاں ادھر ناظم آباد کلب کے قریب ہی تمھارے دور کے ایک رشتے دار۔" (جن کی نشان دہی پر وہ میرے یہاں پہنچے تھے) مگر وہ چپ جیسے کو مگو میں رہے۔ شرما حضوری یہ بھی نہ کہا کہ وہ تو دور کے رشتے دار ہیں۔ آپ سب تو قریب کے ہیں تاہم خاموشی سے جیسے میری تجویز زیرِ غور فائل میں مارک کر کے رکھ لی' اور میں نے انھیں اک ذرا سست پا کر دوسرے پینترے سے بات کی اور نئی ضرب لگائی۔ "اور میاں ریٹائرڈ سہی' پھر ماشاء اللہ تگڑے جوانوں سے کم نہیں ہو۔ پرانے بزنس مانتے ہو۔ ابھی کل تک' جب تک یہاں رہے صدر کے بھرے بازار میں تھامس اینڈ تھامس کتابوں کی شان دار دکان چلواتے رہے۔ سیل مین سے وہ کون تھے تمھارے کوئی

عزیز رشتہ کے بھائی۔ اب صبح اٹھ کر خود جا بیٹھا کرنا۔ کوئی کتاب نکال لی۔ کرم کتابی ہو' شام تک چاٹ گئے اور وقفہ وقفہ سے گاہکوں کو نمٹاتے رہے۔ تو بابا! جانتے ہو۔ کتابوں کی دکان ہم پڑھے لکھوں کے لیے بڑے سکون اور عزت کا کاروبار ہے۔ اور کچھ نہیں تو شام کو چار پیسے کما بھی لائیں گے اور پتا نہیں چلے گا دن کدھر نکل گیا۔ اب کیا پتا وہ پرانی کتب بینی کی عادت برقرار رہے یا نہیں۔ گھر پر دن بھر پڑے پڑے بور ہو جاؤ گے اور ہم لوگ تو شام ہی کو محفل جماتے ہیں کبھی اپنے جمیل جالبی اور مختار زمن کے یہاں بیٹھک رہتی ہے۔" اور وہ پہلو بدلتے رہے ایسا اندازہ ہوا کہ میری یہ تجویز زیر غور فائل میں بھی نہ رکھی۔ حالاں کہ نہ نمک مرچ مسالے کی دکان کی تھی اور نہ باٹا کمپنی کی ایجنسی لے کر بازار میں بیٹھنے کی۔ اور میرے علم میں تھا پہلے دو چار سے مل کر اندازہ کر چکا تھا کہ عمر پنشن پر پہنچ کر خاص طور پر اسلام آباد سے کراچی نو وارد پینشنروں کو اور مراعات کے ساتھ سرکاری ڈرائیور اور گاڑی سے محروم ہو کر کراچی میں خود ڈرائیوری کرتے ہوئے زندگی کی گاڑی کھینچتے میں جان زیادہ پیاری ہو جاتی ہے۔ تاہم موصوف فردوسی اسلام کی طرح

ابھی تو میں جوان ہوں

کے پندار مرکب میں مبتلا تھے۔ لہٰذا کراچی کے ناہموار ٹریفک کی شکایت خصوصاً" ناظم آباد یا گرو مندر اور لسبیلہ پل صراتوں کو پار کرنے کی جان لیوا مشکلات جس کے بعد شمالی کراچی کے قبرستان آتے ہیں' بیان کرنے سے معترض رہے۔ بات جانبین نے دل ہی دل میں رکھی' پہلا دن تھا۔ بہت دنوں بعد ملے تھے اور تو اور بات کرنے میں آپ کا صیغہ استعمال کر رہے تھے اور اگرچہ میرے اندر یہ بات بہت کھل رہی تھی کہ شیریں کا خاص نمبر زندگی تو زندگی وفات کے بعد بھی کسی بڑے جریدہ کو نکالنے کی توفیق کیوں نہ ہوئی۔ شوگر فیکٹری سے وہ مضمون کیوں نکلا۔ مگر ذکر نہ کیا۔ یار زندہ صحبت باقی پر انحصار کیا۔

اسلام آباد' بنکاک کے کالے کوس بھی درمیان میں آ کر یادوں سے محو نہ کر سکے اور اب صمد کے مستقل کراچی پہنچ کر رہ رہ کے میرے سینہ سے ہوئے انتظار اٹھتی اور ذہن کو پرانی یادیں گدگداتیں۔ کسی سے پتا چلا کہ وہیں کلفٹن میں کوئی فلیٹ خرید لیا اور بہ قول فانی

ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

اور اب میری یادوں اور ان کے درمیان تین سال کا عرصہ حائل تھا کہ ایک روز شان الحق حقی کی سرکاری قیام گاہ واقع ڈیفنس سوسائٹی پر ان کے بیٹے پھول میاں کی شادی کی تقریب میں آمنا سامنا ہو گیا۔ بیٹی ساتھ تھی۔ تاہم تین سال میں راتوں رات ککڑی کی بیل کی طرح بڑھی نہ تھی۔ پہلی مرتبہ چار پانچ کی دیکھی تھی تو اس وقت سات آٹھ سال کی تھی۔ نہ معلوم کیوں رات کے وقت بڑے بڑے لینسوں والا جہازی سائز کا کل قسم کا چشمہ چڑھائے ہوئے تھی۔

صمد تھوڑے سی کم آمیزی کم حضوری کے رسمی سے شکوہ شکایتوں' معافی خواہی کے بعد کسی اور سے بات کرنے لگے اور بیٹی شاید کچھ اسی سے اتا پتا لگا کر اور کچھ اپنی غیر معمولی حافظہ ذہانت سے مجھے پہچان

گئی اور سلام کی معصوم ادا تو اپنی جانب متوجہ کر ہی لیتی تھی اور پھر میرے اک ذرا سے ذرا یاد دلانے پر پچھلی اور پہلی ملاقات یاد آگئی اور مجھے تو روزِ اوّل سے اندازہ تھا کہ بچی اپنی عمر سے آگے ہے اور اس وقت اور بھی میرے دریافت کرنے پر اپنے اسکول کا نام اور مقام بتایا' جماعت اور بڑی مس چھوٹی مس کے نام بتائے۔ اور اپنے فلیٹ کا نمبر اور جائے وقوع بتائی اور تو اور ہاؤس لیڈی کی طرح تواضع کے انداز میں گھر آنے کی دعوت دی۔ گھر کے حالات بتاتی رہی' نوکر کھانا پکاتا ہے اور "باپ بیٹی" دو گھر والوں کا گھر' وہ اس وقت بات چیت میں واجبات نہایت قاعدہ سے برت رہی تھی۔ اس کی تربیت میں مجھے اس صدی کے اوائل والا صمد کے اصولِ کار کا سراغ ملا کہ بزرگ جہاں کہیں جاتے محفلوں' اجتماعات میں بچوں نوخیزوں کو ساتھ لے جاتے اور یہی آج تک سمجھ دار لوگ کیا کرتے ہیں اور اس میں خوردوں' بزرگوں کے درمیان فاصلے بھی کم ہوتے رہتے ہیں اور تعلقات بھی متناسب رہتے ہیں اور جس کو آج جنریشن گیپ کی ترکیب میں بولتے ہیں وہ تو خیر فطری اور آفاقی امر ہے' تاہم عمل محتاط و متوازن رہتا ہے۔ اور مادی' زمینی ترکہ سونا چاندی دفینہ تو معدوم ہو گیا یہی کچھ توریث رہ جاتی ہے جو اچھے اعمال و عادات و خصائل کی صورت میں پالش ہو کر بڑوں سے چھوٹوں کو اگر سمجھیں تو پہنچتی ہے۔ اس کے بعد صمد سے تیسری ملاقات خواجہ حمید الدین شاہد کے یہاں ہوئی۔ یہاں بھی ادبی محفل میں مؤدّب بیٹی ساتھ تھی' بیٹی پھر اسی پیار بھرے خوب صورت انداز آداب گزاری سے پیش آئی۔ میری بہو اور بھانجی زینت دلہن میرے ساتھ تھی' بیٹی سے مل کر بہت محظوظ ہوئی اور تو اور انہیں مذکورہ اپنے گھر والی ملاقات کی یاد کی تجدید ہوئی۔ صمد پھر کسی سے باتیں کرتے رہے اور مجھ سے مختصر سے واجبات ہی ہوئے اور کم حضوری کے شکوے اور معافی ملتوی ہو گئی۔

اور پھر ہمارا آمنا سامنا ہونے میں دو ڈھائی سال کا گیپ ہے۔ کہیں ملاقات نہ ہوئی اور ہوئی تو اس ایک سال کے اندر تین مرتبہ۔ پہلی ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں' اختر حسین رائے پوری کے متعلق صہبا لکھنوی کی تالیف کی تقریب میں جو حکیم سعید کی جانب سے منعقد ہوئی تھی۔ صمد ذرا تاخیر سے پہنچے۔ پتا چلا کہ اکیلے شروع میں پہلے آچکے تھے جب محفل جڑنے نہ پائی تھی اب دوبارہ آئے تھے۔ تقریب ختم اور کھانا پینا ناشتا بڑھ سا چکا تھا۔ مدعوئین کافی' چائے پر ٹوٹے ہوئے تھے تاہم ابھی سب اندر ہی تھے۔ قریب نو بجے صمد پہنچے اور ایسے وقت پہنچنے والا تو اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ پہلے جب آئے تھے تو میں نہ پہنچ پایا تھا۔ اس وقت ان کے گرد مجمع لگ گیا اور صمد مجھے بوڑھائے ہوئے سے نظر آئے۔ تیوروں کے دم خم بھی غائب سے' ہونٹوں پر مستقل کھیلتی ہوئی مسکراہٹ بھی مرجھائی مرجھائی سی' موڈ ڈھیلا ڈھیلا' بدن چھوڑے ہوئے سوٹ سا' جیسے کسی اور کا۔ اپنوں کا مجمع لگا تو صمد رہ جانے والے لوگ نہیں' دکھ درد کی ہونے لگی۔ اور لگی لپٹی کبھی رکھی نہیں' ساری کی ساری انڈیل دیتے ہیں بچی' بھری بھگتی۔ ذرا مجبوری کے لہجے میں بتایا کھانا بھی خود پکانا پڑتا ہے۔ بچی اسکول جاتی ہے' شام کو ہوتی بھی ہے تو میں باورچی خانہ کے کام میں آنے نہیں دیتا۔ ہوم ورک میں حرج ہوتا ہے۔ اور پھر ذرا سنبھل کر بولے اور "کھانا بڑا اچھا پکا لیتا ہوں۔"

اور مجمع میں سے کمانڈر انور نے دیسی ننو کی طرح یک دم ہنہناتی کمانڈر ہا ہا والی اپنی شہر بھر میں مشہور، مسلسل قہقہہ آواز بلند کی اور ساتھ ہی مرغِ بے ہنگام والی بانگ لگائی۔

"یار کس وقت اتارتے ہو ہانڈی، ہم بھی پہنچ جایا کریں۔" اور پھر کہیں ادھر ادھر سے پڑے ہوئے دسترخوان میں سے پیسٹری، سموسہ، سینڈوچ کی ایک پلیٹ جمع کر کے بنا لائے اور چائے کی ایک پیالی خلوص تواضع کے ساتھ پیش کر دی اور میں نے ذرا سنجیدگی کے ساتھ دریافت کیا۔

"آج بیٹی کہاں ہے لائے نہیں؟"

"ہاں بھئی کچھ مہمان آ گئے تھے باتوں میں دیر ہو گئی، انھیں اٹینڈ کرتے چھوڑ آیا ورنہ وقت سے آ جاتا۔"

اور میں نے غور کیا کہ اس مخصوص پرسش احوال پر صمد کے چہرے پر خوشی کے آثار پھیل گئے اور ہمیں "کھانا بھی خود پکانا پڑتا ہے"، ان کے آغاز کلام والے شکایتی سے جملوں پر غور کر رہا تھا جو ہمیشہ سے عمر کھائے رنڈووں کا مسئلہ چلا آیا ہے۔ ویسے اگلے وقتوں میں اس سے اور ہی نتیجہ پر پہنچ جاتا تھا مگر اس وقت اس نتیجہ پر پہنچ رہا تھا کہ نواح کلفٹن جنوبی کراچی، تمام برہمنی دھرم شالہ بستی ہے اور یہاں ہم جیسے شدر ہریجن نژادوں کی پرابلم ہے کہ نوکر نہیں ملتا ورنہ شیریں کے یہاں خود بندر روڈ پر ہمیشہ نوکر رہا۔ یہاں کلفٹن میں نوکر بہتیرے بلکہ سبھی ہیں، یوں کہیے کہ ہم جیسوں کو بھاؤ نہیں پکڑ ملتا۔ اور آج نوکر اس مشاہرہ اور شرائط پر بہ مشکل ہاتھ آتے ہیں جس پے (Pay) پر اواخر انگریزی دور میں آئی سی ایس نامی اور اوائل پاکستان میں سی ایس پی صاحب بہادر پبلک سروس کمیشن کو قدم قدم پر دستیاب پڑے سے مل جایا کرتے تھے اور اب نواح کلفٹن میں انھیں کی بڑی بوڑھی باقیات بستی ہے۔ یا ان ہی کے حواریوں، خریداروں، سیٹھوں، ساہوکاروں کی آرام گاہ ہے جن کے کالے اوور کوٹوں کی تھیلے نما گہری جیبیں اور دھاری دار پتلونوں کی چست بیک پاکٹیں پچھلے اعمال کے صلہ میں سفر آخرت کے زادِ راہ کے لیے پھولی ہوئی پڑی ہیں اور صمد جیسے پر اڑے کوؤں کا ناچتے موروں کے پاس جھرمٹ میں بھانڈا پھوٹ گیا ہے اور غریب خود ٹھونکتے پکاتے اور بے چارے دست خود دہانِ خود ہیں، صورت نہ دیکھو حلوائی کی بھٹی کا پلاؤ ہو رہے ہیں اور میں ذرا قریب ہو کر بڑبڑایا۔ "کھانا بھی خود پکانا پڑتا ہے۔" "ہم نہ کہتے تھے اپنوں میں بسو، جامہ میں رہو، اس کوچۂ بہاراں میں بڑھاپے میں نہ جاؤ۔ ورنہ مسجدوں کی کمی نہیں اور ہمارے یہاں کسی کو کھانا خود پکانا نہیں پڑتا ساروں کا اللہ رازق ہے۔

اور اس سرسری سی ملاقات کے تھوڑے ہی دنوں بعد جمیل جالبی کے چھوٹے بیٹے محمد علی خاں کی شادی کی دعوت میں ملے جس میں کے ایم سی لان سارے کے سارے کے تقریباً تین ہزار مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے اور میرے بائیں ہاتھ پر شریف المجاہد دائیں جانب صمد شاہین تھے۔ دو الف لیلیٰ کی بولتی چٹانوں کے درمیان سینڈوچ تھا اور لطف بالائے لطف ضیافت کے ترمال ملنے سے قبل دونوں کے درمیان موضوعِ بحث سے ناواقفِ محض، اور پھر ظاہر ہے سیاق و سباق سے بھی بے نیاز، بزاخفش کی طرح سر ہی ہلاتا رہا۔

اتنے میں لڑکیوں کی ایک ٹولی گزری کچھ نیم انتظامیہ سی مہمان خواتین کا استقبال سا کرتی اور ان کے لیے مناسب نشستیں سنبھالتی اور ان میں سے ایک لڑکی ٹولی سے ذرا علیحدہ ہوئی کچھ اشارا سا کیا اور پھر اپنے اسی مخصوص انداز میں آداب گزار ہوئی اور صہ نے سلسلۂ کلام روک کر تعارف سا پیش کیا۔

"لبنیٰ میری بیٹی..... آداب کہہ رہی ہے۔" میں نے پہچان کر پیار بھری مسکراہٹ سے جواب دیا' اور وہ پھر اپنے جھرمٹ میں جا ملی اور ذرا دیر بعد جب کھانے ایستادہ گاہ میں پہنچا تو لبنیٰ نے تواضع کے ساتھ پہچان کر پلیٹ اور نیپکن پیش کیا اور لجائے لجائے متواضع لہجہ میں بولی۔

"کیا حاضر کروں؟"

اور اس کے بعد ابھی اس روز (۱۵ر جون ۱۹۸۴ء) ہاجرہ مسرور اور احمد علی خاں کی بیٹی کی دعوت عروسی میں بوجوہ ٹھیک وقت (شارپ ٹائم) پر "ہالی ڈے ان" پہنچا تو پورٹیکو میں احمد ندیم قاسمی نے میرا اور صہ کا ساتھ ساتھ استقبال کیا۔ اندازہ ہوا کہ قریب ہی رہتے ہیں' اور جائے رہائش سے آج تک ناواقف ہوں۔ دعوت ہال کے زینہ کی نیچے والی پہلی سیڑھی کے قریب احمد علی خان نے دوسرا اور اوپر والے پٹہ پر ہاجرہ نے تیسرا استقبال کیا اور ہاتھوں ہاتھ لے جا کر لق و دق وسیع ہال میں بٹھایا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ میں اور صہ دو مہمان اور تیسری لبنیٰ ہے۔ شاید ہم لوگ ذرا قبل از وقت پہنچنے والوں میں ہیں تاہم میزبان تو موجود ہی تھے' خوش آمدید کرنے والے۔

بیٹی نے سلام تو اسی انداز میں وہیں نیچے پورٹیکو میں کیا تھا اور اس وقت اندازہ ہوا کہ پچھلے کئی برس کی دیکھی بچی اب عمر کے اس دور میں ہے جب لڑکی نہ تو لڑکی ہو پاتی ہے اور نہ بچی ہی ہوتی ہے۔ البتہ ایک مخصوص نوعیت کی سنجیدگی اور جیسے اک ذرا سوچنے جیسا مستقل انداز تمام وجود پر نمایاں ہو جاتا ہے جو جوانی کی سرحدوں میں قدم پڑنے کا مظہر ہوتا ہے جیسے تلاش اور مستقبل کے متعلق پر چول سی۔ میں اور صہ بیٹھ گئے اور وہ میرے بائیں ہاتھ پر مڑتی ہوئی قطار کی کرسی پر زاویہ قائمہ بناتی ہوئی لجائی لجائی ذرا سکڑی سکڑی بیٹھ گئی جسے بولتے ہیں دھان پان سی۔ اور صہ اپنے پرانے حق کے مطابق شروع ہو گئے اور میں نے غور کیا کہ آج دال گل نہیں رہی ہے۔ یاد آیا' اوئے آج منہ تو خالی ہے' تکلم کی بیساکھی' سلگتا بجھتا پائپ اور سنہرا لمبا پیچے کو الٹی لو دیتا لائٹر دونوں انگلیوں اور دانتوں سے غائب ہیں' ورنہ کالے کے آگے چراغ کبھی نہیں جلا' خواہ تکنیک کا تنوع اور میگھ ملہار لکھنے والی شیریں ہی کیوں نہ ساتھ بیٹھی ہوں اور ہم جیسے لوگ ان سے آج غالب غزل سرا نہ ہوا' سننے کے منتظر ہی رہیں اور محفل تو دو گیارہ ہو جائے۔ تھوڑی دیر بعد اندازہ ہوا کہ غالباً" اے راز تو نے ترک پینا کر دیا' آج رفیق نطق اور ممیز کلام' پائپ تمباکو لائٹر کا اتحادِ ثلاثہ نہیں ہے اور "ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا۔" اور موضوع بھی کچھ ایسا ویسا ہی تھا وہ تو ذاتی اور صفاتی تمام کی تمام بہ کمال خلوص بیان کرتے چلے جانے والے لوگ ہیں اور گی لپٹی رکھنے والے نہیں' اور یات غم جاناں اور غم دوراں والی مرکب۔ میں نے دونوں گود کھلائے پرویز' گل ریز' بیٹوں کے متعلق استفسارِ خیریت کیا' اور رسمی طور پر پوچھا۔ اب تو ماشاء اللہ بڑے ہو گئے ہوں گے تو بولے۔ جی ماشاء اللہ

مجھ سے بھی بڑے' انگلستان میں پلے بڑھے۔ ایک غالباً" چھوٹے اب اسٹیٹس کے کسی جزیرہ نما (غالباً" بحرین) میں ہیں۔ دونوں کی شادیاں ہو گئیں۔ ماشاء اللہ عیال دار ہیں "اور ذکر العیش نصف العیش فتشابہ جو نکلا تو شادیوں کے تذکرے پر آ گئے لیکن انداز کچھ ایسا ہو گیا جیسے مرغ مسلم کے روسٹ میں شکر ملا دی جائے یا کیک میں ذرا سا نمک اور کعبہ و کلیسائی روئیداد بھی یہ آگے اور وہ پیچھے وہ آگے اور یہ پیچھے جیسے غٹ پٹ سے ہو کر سنانے لگے کہ کس طرح بہو بیگمیں اللہ جانے میکے سے رخصت سے پہلے رخصت ہو کر خود وہاں عدالتی شادی وغیرہ مراحل سے فارغ التحصیل ہو کر پاکستان آئیں اور انھوں (صمد) نے انھیں کس طرح مشرف بہ اسلام ہونے اور دوبارہ شرعی نکاح خوانی پر آمادہ کیا اور کراچی کے مشہور عالم اور قاضی مولوی صاحب نے خطبہ نکاح سے پہلے مشرف بہ اسلام کیا تو رسمی روایتی دعاؤں میں آمنت باللہ پڑھاتے ہوئے ایک دلہن نے معنی سمجھنے کی خواہش کی' جسے خیر مشرف بہ اسلام کرنے والے مبلغ مولوی صاحب تو اردو میں بھی شاید کیا سمجھاپاتے اور پھر زبان یار من ترکی صمد نے خود ہی عربی میں شد بد نہ سہی تاہم فطری ذہانت ہی کے ذریعہ انگریزی میں ترجمہ سا کیا تو بہو بیگم چیخ پڑیں۔ بٹ آئی ڈونٹ بلیو ان انجلس (But I don't believe in Angles) اور یہ تو پہلے سے علم تھا کہ دونوں بہوئیں مغرب کی کسی گوری نسل اور راسخ فرقہ سے متعلق ہیں اور خیر شاہی خاندان اور ملکہ معظمہ کی پوتیاں' پڑپوتیاں بھی گوریاں ہوتی ہی ہیں۔ دونوں محکمہ تعلیم میں ہیں' بتاتے رہے۔ ایک یا شاید دو مرتبہ ان کے یہاں انگلینڈ گئے۔ سب کے سب بڑی خوشی اور تواضع سے پیش آئے۔ مگر بھائی اپنی کھپت ان میں نہیں ویسے اللہ کا کرم ہے' کسی کا دست نگر نہیں۔ پھر بولتے بولتے تقاضائے بشریت اور ذوق قیام حیات و تسلسل زندگی بول پڑی۔ ننھے منے پوتے پوتیوں کا ذکر کرنے لگے تو منھ کے اندر جیسے گھی شکر گھل گیا۔ ان کے اینگلو عربک ترکیوں والے نام بتائے' اور جو وہ کہاوت ہے جس کا مفہوم ہے مہاجن کو اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے' بیٹوں سے بیزار نہ سہی تو فراموش کرکے پوتوں پوتیوں میں کھو گئے' جیسے خود اپنی زنگ خوردہ زنجیر میں ننھی منی نقرئی طلائی کڑیاں جوڑنے لگے اور ہجر میں وصل کے مزے لیتے لیتے پھر پلٹ کر پاکستان اور "بالیڈے ان" کے لق و دق دعوت ہال میں آ بیٹھے اور ذرا کھنکھار کر بولے۔

"مگر بھائی میری گزر ان میں نہیں۔ یہ بچی شیریں نے' ننھی سی جان' میری بھانجی سے لے کر پرورش کرلی تھی۔ یہ مقبول بٹ کی بیٹی ہے۔ میری بھانجی ذاکرہ گوہر مقبول بٹ کی بیٹی' مرحوم میرا بھانجی داماد تھا۔ اس کی ماں پشاور میں ٹیچر ہے۔"

صمد کی بات کاٹنا بھی جوئے شیر کے مترادف ہوتی ہے۔ تاہم میں نے کہا۔ "ایں مقبول بٹ! کون مقبول بٹ؟"

"ہاں ہاں میاں وہی کشمیری ہیرو جسے ابھی پچھلے دنوں دہلی میں اندرا حکومت نے پھانسی دے دی۔ اور اس کی ماں تو شاید ابھی ایام عدت میں ہے۔"

اور صمد تو بات کی رو میں کہتے چلے گئے۔ ابھی میرے دل میں مقبول بٹ کا زخم ذرا ہرا تھا جسے اندرا حکومت

نے انگلستان سے کسی قاتل کے بے سروپا بیان مطالبۂ رہائی پر بوکھلا کر ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ بھارت میں پھانسی دی تھی۔ اور صمد ذرا آواز درست کرتے ہوئے بولے اور بھائی ہمارے رہنما اور زعمائے حکومت اس سیاسی ظلم پر بھی خاموش رہے۔ سربراہ مملکت نے ضرور گھٹی گھٹی سی آواز میں ایک ضابطہ کا بیان دیا اور میں نے کہا بھلا ہم جیسوں کو خبر نہیں کہ اصل نسل شیر کشمیر مقبول بٹ کی بیٹی تمھارے پاس قوم کی امانت ہے۔ ابھی یہ بھی پتا نہیں کہ مقبول بٹ نے ایک بیٹی دختر قوم اور ایک بیوہ مادر وطن چھوڑی ہے اور قوم ان کی سرپرستی کی سعادت سے محروم ہے۔ وہ قوم جس کے متعلق نباض امت نے فرمایا ہے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اور یہ نیک اختر دختر کشمیر اور اندرا حکومت کے گلے میں ایک اور طوق لعنت ہے اور پیشانی پر کلنک کا ٹیکا جو کل کے مورخ کو ہاتھ آئے گا اور جزا و سزا کے باب میں دہ در دنیا اور ہفتاد در عاقبت کا ایک اور اضافہ' خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ترکمان گیٹ اور گلی قاسم جان کے خانماں برباد مظلوموں کی آہیں باب اجابت سے ٹکرا کر جو نیچے پلٹیں تو فضا ہی مکافات عمل کی لپیٹ میں آ گئی اور اندرا رانی کے سامنے ایک جواں رانڈ بہو اور ایک خورد سال پوتا کھڑا کر دیا اور لعنت اندر لعنت یہ کہ خود اندرا رانی کے ہاتھوں ان مظلوموں کو ناحق اور بے گھر کر دیا۔ اور مقبول بٹ کی بیٹی کو یتیم اور بیوہ کو رانڈ کرنے کا طوق لعنت آج اور گلے پڑا۔ شاید ابھی کچھ اور باقی ہے۔ ایک بیٹا اور' اور ظلم کے تودہ میں بارود کی چنگاری پڑ چکی ہے۔ ذیک پھوٹنے کی دیر ہے۔ اور کون جانے یتیم لبنیٰ' بیوہ ذاکرہ گوہر' مکافات عمل کا وہ سرا تماشا دیکھ لیں جس کا پہلا سین بے خانماں ترکمان گیٹ اور گلی قاسم جان والے مقتولوں کے پسماندگان نے دیکھا۔ میں بڑبڑاتا سا رہا۔ اور کنکھیوں سے دیکھا تو لڑکی اس نشست سے اٹھ کر میرے برابر آ بیٹھی تھی اور ہم محمدیؐ تو یتیمی کے ازلی آشنا ہیں۔ ہماری تو بنیاد ہی یتیمؐ کے ہاتھوں نے رکھی ہے اور میں ایک ٹھنڈی سسکی جیسی آواز سے چونکا اور دیکھا تو لبنیٰ کی ڈل گمبر کے کنول کے شہد رنگ انکھڑیوں میں دو سچے موتی جیسے سیپی کے پیٹ سے آپوں آپ ابھر کر ڈبڈبا رہے تھے۔ میں نے کاروباری انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ حکم ہے کہ یتیم کے سر پر دست شفقت رکھو تو جتنے بال ہوتے ہیں اتنی نیکیاں اللہ تعالیٰ سے ملتی ہیں اور پتا نہیں اس کی میری شاید دونوں ہی کی ایک اور جیسے ٹھنڈی سانس بولی ہے کہاں روز مکافات ہائے خدائے دیر گیر اور قطعی حکم ناطق میرے ذہن میں آیا "شہیدوں کو مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں۔" تاریخ میں روشن باب اور معاشرہ میں چراغ راہ' اور میں تو کیا اور صمد بھی شاید عنقریب ہی لبنیٰ رو پڑتی کہ صمد نے رنگ محفل کا اندازہ کر کے آواز سنبھالتے ہوئے بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا۔ بیٹی لبنیٰ اب وہ پائپ تو گھر رہ گیا اب تم ہمارے لیے نیچے سے سگریٹ ہی لا دو۔ اور لڑکی تو جیسے اس کے لیے تیار ہی بیٹھی تھی۔ معصوم ادا کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی" ڈبڈباتے آنسو اک ذرا گردن بانکپن کے ساتھ گھماتے ہوئے پی گئی اور یوں دونوں گوہر آب دار شکم سیپیوں میں پھر کسی اچھی گھڑی کے لیے اٹھا رکھے اور کڑی کمان کے تیر کی طرح یہ جا وہ جا۔ اور میرے اندر سے آواز آئی۔ شہید مرا نہیں کرتے۔ انتقام حسینی اور انعام حسینی آج تک شہر دلی کی آویزش میں

متحرک ہیں اور لڑکی نے چلتے چلتے ایک اور ٹھنڈی سانس بھری مگر یہ سردست تو صدا بہ صحرا ہی ہوگئی۔ بہ مشکل ہی ہم دونوں نے سنی اور مہمان ہال' پاکستان بھر کی اشرافیہ سے بھر چکا تھا' میر و وزیر و سفیر کے سب یک دل جمع تھے۔ پاکستان کے بابا آدم جرنلسٹ اور کالم نگار اور اماں حوا افسانہ نگار کا بلاوا' سارے کے سارے حاضر تھے اور سر جوڑے برہمن و شیخ بھی یک دل نظر آرہے تھے اور یک دسترخوان شریکِ طعام تھے مگر۔

تھا انیس شامِ فرقت دشتِ تنہائی میں کون
گونج صحرا کی فقط دم ساز ہو کر رہ گئی

بسیرہ ایوانی

جس وقت عذرا اختار مسعود عیادت کے لیے گئیں تو مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرحومہ کو اپنی موت کا یقین سا ہو چکا تھا' جیسا کہ کینسر کے موذی مرض میں دیکھا گیا ہے کہ مریض کو موت سے ایک مدت پہلے مرض کی تکلیف کے علاوہ اس اذیت سے بھی گزرنا پڑتا ہے کہ "مریں گے"! اور مستقبل قریب ہی میں کسی وقت!! تاہم الامان والحفیظ ایک ابتدائی اسٹیج پر یہ مرض قابلِ علاج بھی ہوتا ہے۔ اس وقت پر انھیں بیرونِ ملک علاج کے لیے کیوں نہ لے جایا گیا؟ جب کہ صمد اپنی مالی حیثیت سے بھی اور اگر تگ و دو کرتے تو اپنے اثر و رسوخ کے ذرائع بھی اخراجات کے کفیل ہو سکتے تھے اور پھر مرحومہ کے بیٹے مستقل انگلستان میں قیام پذیر تھے طالب علم سہی' لیکن معلومات اور راہنمائی بہ آسانی بہم پہنچا سکتے تھے۔ اور یہ نوبت کیوں آئی کہ مرحومہ ناقابلِ علاج ہو کر اسلام آباد کے ہسپتال پہنچ کر رہ گئیں۔ جواب معلوم۔ پیٹ کا لفظ اپنے معاشرہ اور زبان میں سینے کے زیریں حصہ سے دونوں پسلیوں کے درمیان کمر کولھوں تک محیط ہے' اور ہم سب مشرقی خواہ کتنے ہی سمجھ دار کیوں نہ ہوں پیٹ کے امراض کو سب سے کم اہم سمجھتے ہیں۔ ابتدا میں چورن چٹنی' گولی بٹی لال مکسچر وغیرہ سے خود ہی علاج کر کے بالعموم ٹھیک ہوتے ہیں' یا ساتھ ساتھ تقلیل تغذیہ یا اوقاتِ طعام ورنہ تبدیلیِ غذا سے تندرست ہو جاتے ہیں' گھر میں ایک کی ایک کو خبر نہیں ہو پاتی اور پیٹ کے کینسر کے موذی مرض کا علاج کا دور' بالعموم اسی خود علاجی اور کم اہم فہمی میں گزر جاتا ہے' کوئی وہ مخصوص جدید ترین ٹیسٹ جو کینسر کی نشان دہی کرتا ہے کرانے نہیں جایا کرتا۔ "بھوک نہیں ہے پیٹ میں درد سا ہے۔" "پیٹ میں تکلیف ہے' متلی ہے' آج دست آگیا وغیرہ وغیرہ اور پیٹ کے کسی حصہ کے سرطان کی جانب تو کسی کا گمان بھی نہیں جاتا اور نہ عام معالج ہی بالعموم قابلِ علاج مدارج میں اس حد کو پہنچتے نہیں اور قابلِ علاج دور تو بالعموم اسی میں گزر جاتا ہے۔

دوسرا سوال جو صمد کی جانب سوئے ظن پیدا کرتا ہے کہ مرحومہ کو اپنے میکے کے افراد شاید زندہ ہوں تو ماں باپ کیوں یاد آئے' جب کہ شوہر سرہانے تھا' صمد کے حق میں اس کا جواب یہ ملتا ہے' جو سادہ سا ہے اور آئے دن کا دیکھا بھالا تجربہ بھی کہ یہ بھی موت کے یقین کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کا جواب شاید کوئی ماہرِ نفسیات خیرہ بھی یہ دے گا کہ یہ صمد کی زوج اور زوجہ والی محرومیوں کا ماتم تھا۔ ایک عام سی

جواں سال بیوی بھی، ظاہر ہے اپنے جواں سال شوہر کے اوقات، معمولات اور جملہ نوعیت کے جذبات کی محرم ہوتی ہے، اور شیریں کو ایک طویل مدت سے صمد کی اس قسم کی محرومیوں کا بھی احساس تھا اور آیندہ عمر بھر کی مستقبل کی محرومیوں کے احساس کا ردِ عمل تھا کہ انھوں نے دوسرے اپنوں کو یاد کرکے احساس پر شدید احساس طاری کیا اور پناہ لی، ورنہ ہم عامی تو یہ کہیں گے کہ یہ آخرِ وقت مرنے والا جو ناقابلِ تکمیل آرزوئیں کرتا ہے یہ ان کا مظاہرہ تھا۔ ظاہر ہے ماں باپ، بھائی بہن سب بھی موجود ہوتے تو دکھ بوجھ نہیں جو بانٹ لیتے۔ البتہ اس غم مرگ میں ساتھ دیتے جو جیتی زندگی مرحومہ پر مسلّط تھا اور ممکن ہے صمد مرد ہوتے ہوئے اس میں کوتاہی کر گئے ہوں اور یہ مرحومہ کے آخری وقت کے بے معنی جذبات اور عام سی حسرتوں سے زیادہ نہیں اور ایسے وقت پر یہ ہوا ہی کرتا ہے اور اسی لیے قانونِ شرعِ محمدی میں، مرض الموت کی کل وصیت قابلِ پیش وقت نہیں ہے اور دور افتادہ ناقابلِ رسائی اعزا کی یاد جذباتی رویّہ اور یہ بھی مرتے وقت کی چیز ہے۔

جمیل جالبی کے یہاں تحقیق میں یہ امر بالالتزام ہے کہ حتی الوسع کسی جانے پہچانے اہلِ قلم اور ان کے درمیان کوئی امر ایسا نہ رہ جائے جو مستقبل کے قاری، طالبِ علم یا محقق کو اشتباہ یا الجھن کا باعث بنے۔ اگرچہ وہ اپنی تالیف، تصنیف، تدوین میں بھی کسی سے مشورہ کرتے نہیں دیکھے جاتے اور جو کچھ ہے ان کا اپنا کھوجا سوچا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ مرحومہ کے متعلق انھیں ذاتی تجربہ اور صفاتی معلومات کی روشنی میں کماحقہ، تاریخ کا حصہ بنانا ہی ہے۔ لہٰذا مجھے بھی اس مضمون میں ہر پہلو سے کڑی نظر رکھنی پڑ رہی ہے۔ جمیل جالبی، شمیم احمد، صمد شاہین سے معلومات اور رہنمائی لینی پڑ رہی ہے۔ البتہ تاریخوں اور سنوں سے بہ نظرِ احتیاط میں نے عمداً چشم پوشی کی ہے تاہم صحتِ واقعات میں حتی الوسع فرق نہ آنے دیا ہے اور اپنی اس تحریر کو کوئی اہم تنقیدی علمی مضمون سمجھ کر پیش کرنے کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔ یوں سمجھئے کیریکٹر اسکیچوں کے حوالوں کا باج یاج ہے اور تسلیم کرتا ہوں کہ تاریخ کا حصہ نہیں بن سکتا۔

مرحومہ طویل عرصہ تک بیمار رہیں اور دنیائے ادب کو ان کی کم نویسی کا احساس ہونے کی شاید یہ وجہ بھی رہی ہو۔ ساتھ سرطان کا موذی مرض جس کی روح فرسا اذیت، بیمار پر تو خیر جو کچھ گزرتی ہے، معاذ اللہ، تیمارداروں اور نرسوں تک کے حواس باختہ ہوجاتے ہیں جسے انگریزی میں ڈیتھ بائی انچیز (Death by Inches) کہتے ہیں۔ اب ذرا ایسے گھر کی ہوم لائف کا اندازہ کیجیے جو ایک میاں بیوی، دو افراد پر مشتمل ہے، بیوی شدید و طویل علالت میں مبتلا، اور جو دن نکلتا ہے، شدید تر اور زندگی سے بیزاری ہوتی جاتی ہے، ظاہر ہے ایسی متاہل زندگی میں موضوعِ گفتگو، گھما پھرا کر علاج اور تیمارداری ہوجائے گا اور ہر بیوی والا خاوند متاہل زندگی کے اہم اور غیر اہم مسائل بھی سمجھ سکتا ہے۔ جواں سال شوہر و بیوی کے درمیان تعلقاتِ زن و شوئی کے فطری تقاضوں سے محرومی کا بھی محرم ہے۔ ہر جو ڑا ناشتے کی میز سے، دفتر کی کرسی پر سے گزر کر، بیڈ روم کی مسہری تک دراز ہوتے ہوتے کتنے متنوع معمول کے مدراج سے گزرتا ہے۔ کسی فارسی شاعر کے بہ قول۔

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن' رفتن' استادن' نشستن' خفتن و مردن

کی گردان میں کتنے مراحل درپیش ہوتے ہیں اور یاں بس 'ایک خامشی مرے سب کے جواب میں اور اس بھیانک دھارتی خاموشی میں بھی پس منظر پر موت کی پرچھائیوں کا مہیب سناٹا سنسناتا ہوا۔ الحفیظ والامان! اور موت کے وقت کی لاعلمی میں بعد از موت معلومات کا اشتباہ کا راز پنہاں ہے اور یاں جینے کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے گھر کے اندر چاپ ابھی کہیں آس پاس ہی سانپ کی سرسراہٹ کی طرح کان کے قریب۔ مگر مجھے صمد نے بتایا' پہلے انھیں اندیشہ تو ہوا مگر شیریں تو آخری وقت تک ناامید نہ ہوئیں۔ "جب تک سانس تب تک آس۔" کہاوت کے بہ موجب مبتلائے امید رہیں۔ باوجود روح فرسا اذیت کے جینا چاہتی تھیں اور شاید شفایاب ہونا بھی' اور ناامیدی کا سراغ ہفتہ عشرہ موت سے قبل ہی معلوم ہوتا ہے۔ جس میں شاید عیادت کے لیے ایک دو مرتبہ بیگم عذرا مختار مسعود ان کے پاس ہسپتال میں گئیں۔ اور ایسے میں یا تو موت کے فرشتے دکھائی پڑنے لگتے ہیں اور حواس درست رہیں تو ناقابل تکمیل حسرتیں اور نامرادیاں سر اٹھاتی ہیں اور یہ سب زندگی سے پیار اور موت سے فرار کے ذہنی عمل در عمل کی کشاکش ہوتی ہے۔ ایک ماہر نفسیات تو یہ تجزیہ کرے گا کہ دور افتادہ بھارت میں چھوڑے ہوئے اعزّا مرحومہ کو تحت الشعور سے سرہالیس' محبت کرنے والے شوہر کی حالیہ اور پھر دائمی محرومیوں کے ردِّ عمل میں ابھرے' جن کا انھوں نے عذرا مختار مسعود کے سامنے اظہار کیا۔ اور یہ کامیاب طویل متاہل زندگی کی آرزو تھی۔ اور اپنی زندگی سے محرومی کے ساتھ ساتھ شریکِ زندگی (صمد) کی جیتے جی محرومیوں کے احساس کا ردِّ عمل تھا' اور اپنی زندگی کا ماتم بھی۔ زندگی قدرت کا سب سے عظیم عطیہ ہے خواہ ناکام ہو یا کامیاب' زندگی پیدائش کے وقت کی "بھیرویں" سے گزرتے ہوئے باگیشری اور مرتے مرتے "سوہنی" ہے۔ خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو' آرزوئیں امیدیں کلبلاتی ہی ہیں۔

اختر جمال کے مطابق بیٹوں کی دلہنوں کو مائیوں بٹھانے کی آرزو' عذرا مختار مسعود کے مطابق چھوٹے ہوئے بھارت افتادہ' اعزّا سے خدمت لینے اور تیمارداری کی آرزو دونوں ہی اور بہوؤں کی زنجیر کی کڑیاں تو اپنی زندگی کا سلسلہ جوڑتی ہیں اور اپنی زندگی انسان کو بڑی پیاری ہے۔ *اور یہ تو زیادہ سے زیادہ پون صدی ہی ساتھ دے سکتی ہے۔ اور بہوئیں ہی ساسوں کے اس سلسلہ میں کڑیاں جوڑتی چلی آئی ہیں۔ مگر۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ
کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

سانس کے ڈورے کے ساتھ امیدوں اور آرزوؤں کا رشتا ملا ہوا ہے۔ عذرا مختار مسعود کا مضمون تو مرحومہ کا اپنا آخری وقت کا ماتم ہے اور اختر جمال کے مضمون ان کے (صاحبہ مضمون کے) اپنے آنسوؤں کی آمیزش نے شرابِ دو آتشہ بنا دیا ہے۔ بہرحال ہر دو صاحبہ مضمون کے اپنے اپنے آنسو خوب ڈھلکے ہیں۔

اب جو لوگ طفلانہ نگاہوں سے صہر اور شیریں کے دلوں کو درزوں میں سے جھانکتے ہیں وہ تو بالکل ہی چھینپ اور حقیقت میں دور سے دیکھنے والوں کی ترکیب پر پورے پورے لغوی معنی میں اترتے ہیں' اور ے

ولی را ولی می شناسد

جب جلئے ہم ان کی ولایت تسلیم بھی کیے لیتے ہیں' حالاں کہ بادہ خواری کے سبب بچا غالب نہ بنے ۔ہے۔ لیکن اس جذباتی بے فکرے پن کا کیا علاج ہے کہ آنکھوں کی نمیں خالی ذہن کی رسائی سے گھر بیٹھے مانے ہوئے تخلیقی اہل قلم ہونے کے باوجود' صہر کے گھر کے اندر پہنچ کر داروغہ جی کی طرح پہلے خانہ تلاشی لی اور پھر فدوی روزنامچہ مرتب کرنے بیٹھ گئے اور صہر و شیریں جیسے محبت کرنے والے دو دلوں کے اندر اتر کر ٹانگ ٹوئیاں سی مار مار کر فدوی قتل کی تفتیش کرنے لگے' اور ان دونوں کو علمی ادبی عدالت سیشن کے سپرد کردیا' اور رشک و حسد کا جذبہ نہ معلوم کیسے تلاش کر کے ادبی الفاظ کے تمام بند توڑ دیے اور اپنے خود ساختہ قانونی لفظوں میں ادبی قتل کا نام دیا...... فعتبروا یا اولی الابصار.... بابا آدم اور اماں حوا کی شادی کے بعد پہلا قتل میاں بیوی بنانے کے جھگڑے میں ہابیل قابیل مقتول قاتل کے درمیان ہوا۔ اور دوسرا کچھ اسی نوعیت کا اب ہمارے سامنے ہوا۔ جب کہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور قریب سے آنکھوں دیکھا جیسا کہ اس مضمون سے میرے اور ان کے گھرانے کے قلبی و قریبی تعلقات سے ظاہر ہے' اور اس میں مبالغہ قطعاً" نہیں ہے' ہم نے ان میاں بیوی کو مثالی محبت کرنے والا جوڑا پایا۔ جیسے دو بیٹوں کے ماں باپ اور شادی ہوئے برسوں گزر جانے کے باوجود "ہنی مون" دور میں تھے۔ حسد اور اختلاف تو درکنار جیسا کہ بیان کیا ایک دوسرے کو فخر کے احساس میں پایا۔

اس میں شک نہیں قلمی تخلیق کے ساتھ متناسب و تواتر مناسب ابلاغ اہم امر ہے' اور اس ضمن میں بھی شیریں اتنی کوتاہ قلم اور کم نویس بھی نہیں کہ ان پر کم نویسی کا ٹھپہ لگایا جائے۔ وہ ایک نام آج عمرِ دراز میرے ذہن میں ہیں جو حال ہی میں ہمارے ادب کو طرح نو دے چکے ہیں' اور ایک پنج سالہ اندر ہماری صف اول میں لگ گئے۔ محمد حسن عسکری کے متعلق آپ کیا کہیں گے جس نے دو تین افسانے دے کر اردو ادب کو جدید تر افسانہ دیا اور پھر قلم دان بند کر کے چپکا ہو رہا اور یوں ترقی پسندوں کے نام کے ادب میں برساتی مینڈکوں والی وہ افزائش نسل ہوئی کہ غلام ربانی تاباں نے مینڈکوں کے جلوس نکلوا دیے اور جوش ملیح آبادی سے خراجِ تحسین حاصل کر کے ہی چھوڑا۔ اور اک ذرا دھوپ چمکتے ہی نہ معلوم کہاں گئے۔

یاد رکھیے مؤرخِ ادب نہ تو الزام قتل تسلیم کرے گا اور نہ شیریں کی تخلیق کو جو مشک ہی مانے گا بلکہ طبلہ عطار کا درجہ دے گا۔ البتہ اگر ایسے الزام لگانے والوں کو درخورِ اعتنانہ سمجھا اور شاید اس بنا پر تو کیا نام نہ ہو گا' ذکر کرے گا تو ظاہر ہے طفلانہ انداز ہی کہیے گا۔

حواشی

* سرِ دلبراں در حدیثِ دیگراں اختر جمال اور عذرا اصغر مسعود کے مضامین دلچسپی کے ساتھ پڑھے ...... اور پھر بیان اپنا۔ ایسی تحریروں کا انداز اور پھر اناث کے قلم سے یوں بھی جذباتی ہو جایا کرتا ہے' تاہم ایک نے نئے قلم پر قابو رکھتے ہوئے اور دوسری نے ذرا جذباتی ہو کر' خود شامل ہو کر خوب سنوارے ہیں اور کئی منفی سوالات میرے ذہن میں ابھرے لیکن "خود جوابی" کے انداز میں مثبت جواب ملتے چلے گئے۔ تاہم اگر دونوں میں سے کوئی اطمنان کے ساتھ کبھی ملیں تو استفسار کروں گا' اگرچہ بے سود ہوگا۔ تاہم ممکن ہے کہ مؤرخِ ادب کو کوئی سود مند اشارہ مل جائے۔

ابوالفضل صدیقی

کہاں کے دیر و حرم

(خود نوشت سوانح)

ان استوائی مقامات کی طرح جہاں سورج کی جاں آفریں کرنیں صبح سے دوپہر تک روحانی عکس ریزیاں کرتی ہیں' اور سہ پہر سے شام تک ابرِ رحمت کی نرم نرم پھواریں حیات پاشیاں کر کے گرمی اور نمی کے امتزاج سے لاتعداد اقسام کی نمو کو جنم دیتی ہیں' اور پھر تاروں بھرا آسمان تمام رات شبنم افشانیاں کر کے آہستہ آہستہ اس سدا بہار قدرتی چمن بندی پر فنشنگ ٹچ دے دیتا ہے' کچھ اپنی زندگی کی بھی پانچ صدیاں اسی ڈگر پر کٹی ہیں۔ اور ۱۳۲۸ سے ۱۹۵۰ء تک میری سوانح حیات کے ورق کتنے عجیب ایک دوسرے سے مطابق چلے آ رہے ہیں۔ ہر صفحہ اپنے پچھلے کو دوہراتا ہوا' جیسے ایک ہی ورق کی پوری کتاب اور میں اس روایتی قسم کے ترتیبی ماحول میں اپنی کچھ باغی سی فطرت کے ہاتھوں عجیب چوں چوں کا مربہ سا بن کر رہ گیا۔ حاکمِ وقت سے بغاوت تو خیر خاندانی خمیر سے توریث میں پہنچی تھی۔ برعکس نام نہادن زنگی کافور' صدیقی یا باغی!؟ سنِ شعور کے تیس سال میں خاندانی روایات سے بغاوت' سماج سے بغاوت! ایک وقت آیا کہ صدیقی سچ مچ باغی سا بن گیا۔

جیسے کچھ خود ساختہ قسم کی انفرادی روایات کو جنم دینے کی جدوجہد میرے لمبے چوڑے خاندان کا پشت ہا پشت سے طرۂ امتیاز چلا آ رہا تھا جس میں کچھ قبیلہ داری نظام جیسی جھلک ملتی تھی اور اس کے قیام و بقا کے لیے ہر دور میں صاحبِ سیف و قلم ہونا لازمی امر تھا۔ اور ساونتی دور میں اس کا اصل زرعی دولت تھا۔ اور یہ جاگیر جو مجھ تک حکومت کے خنجر اور وراثت کی قینچی سے کٹ چھٹ کر ایک چھوٹی سی زمین داری کی شکل میں پہنچی' سنتے ہیں کہ میرے جدِ امجد نے سید علاؤالدین کے دور میں فوجی خدمات کے سلسلے میں حاصل کی تھی۔ ۱۸۳۳ء تک اس کا بڑا حصہ مالیہ سے معاف "نان کار" چلا آ رہا تھا۔ اور غدر کے بعد تسلط کر کے ۱۸۶۶ء میں جب انگریز نے پہلا بندوبستِ اراضی کیا تو عدم وفاداری کے شبہ میں تقریباً" تمام پر ۳۳ فیصدی مالیہ مشخص کر دیا اور معافی منضبط کے ضمن میں لے لیا اور تھوڑا سا حصہ معافی دوام نان کار نسلاً" بعد نسلاً" رہ گیا جس پر آج تک مال گذاری معاف ہے۔ اور جس طرح راجپوتی قسم کی توریث میں یہ زمین داری پہنچی اسی طرح اک ذرا برہمنی طمطراق کا پہلو لیے ہوئے علمی مذاق بھی ملا۔ اور یہ چیز

خالص روہیل کھنڈی کلچر کا طرۂ امتیاز تھی جس نے اٹھارویں صدی کے وسط میں لکھنوی اور دہلوی تمدنوں کے متناسب امتزاج سے ایک علاحدہ علاقائی و مقامی سماج کی تشکیل کی' جس کی نشانیاں اب تک روہیل کھنڈ میں برقرار ہیں۔ اور روہیل کھنڈ کے ساتوں اضلاع کے قصباتی تمدن میں آج بھی نظر آجاتی ہیں اور بدایوں تو باوجود قدیم تاریخی شہر ہونے کے بہت کچھ قصبہ سا ہے' اور عارف پور نوادہ کھیڑا' بدایوں کے مضافاتی علاقہ میں قریب ترین مقام ہے۔ یہ عجیب النوع بستی ہے جو میرا آبائی مسکن ہے' محل وقوع کے اعتبار سے شہر کا محلہ کیوں کہ چنگی کی حدود سے تین فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے' اور تین پختہ سڑکوں کے جال میں آباد ہے جو گرینڈ ٹرنک روڈ کی شاخیں ہیں۔ کاغذات سرکاری میں گاؤں اور ظاہری ہیئت اور مردم شماری کے لحاظ سے چھوٹا سا قصبہ' کیوں کہ پانچ ہزار نفوس کی آبادی ہے جو اس کے قصبہ پن میں اس کی موجودہ صورت کو اور بھی اضافہ کرتی ہے۔ جدید تعلیمی اسکول اور بجلی گھر وغیرہ کی نئی عمارتوں کے ساتھ ساتھ زمیندار طبقہ کے عالی شان دیوان خانوں اور حویلیوں کی تعمیریں اور چاروں طرف دور تک پھیلا ہوا کسانوں کی جھونپڑیوں کا سلسلہ اور اس سب کا شہر سے اتنا ملحق جائے وقوع اس کو بادی النظر میں بہ یک وقت ایک عجیب قسم کے شہری' دیہاتی اور قصباتی یونٹ کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ جنوب کی جانب شہر سے آتی ہوئی مسلسل جھنجھناہٹ اور بقیہ تینوں سمت پھیلے ہوئے کھیت مشینی بے چینی اور زرعی سکون کے نادر قسم کے ٹکراؤ کا سماں سا پیش کرتے ہیں اور کھلی فضا اور سرسبز و شاداب ماحول میں کنارِ آب رکن آباد گل گشت مصلیٰ را نظر آتا ہے۔

میری روایات شاہد ہیں کہ میرا خاندان ہر دور میں علم و فن کی اعلیٰ اقدار کے ساتھ عسکری جذبات سے بھی شہر بدایوں میں ممتاز و ممیز رہا ہے اور تاریخ میں اکثر جگہ حکومت سے سرکشی کی روایات بھی ملتی ہیں جن کا سراغ ۱۸۵۷ء تک تو علم سینہ کے ذریعے ملتا ہے اور پھر گورنمنٹ گزیٹر سے تصدیق ہوتی ہے۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء کے بعد سیف نے تو میان کی تاریکی میں ایسا منھ چھپایا کہ خبث الحدید بن کر رہ گئی مگر قلم بفضلہٖ ہرنئی صبح سے اکتساب ضیا کرکے آج تک چمکتا رہا ہے۔ لیکن اپنے مخصوص رنگ میں' پچھلی عام سینہ بہ سینہ والی روایات برطرف انگریزی سامراج کے دورِ جلال میں میرے دادا چودھری احمد حسن صاحب نے غدر کی کہانی مثنوی کے انداز میں نظم کروائی اور اس کا عنوان "مثنوی شہزادی گل رخ بیگم" رکھا اور انداز بیان کچھ ایسا ہے جیسے بچوں کے لیے لکھی ہے مگر تاریخی روایات کا سہارا لے کر جس میں ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم کی داستان اور بہادر شاہ کا عوامی قسم کی حکومت بنانے کا اعلان مخصوص شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے اور معرکۂ غدر کو بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں ان تیوروں سے بیان کیا ہے جن سے ہمارا ترقی پسند اسکول آج دیکھ رہا ہے اور جب یہ مثنوی عام ہو کر حاکم ضلع تک پہنچی تو دادا صاحب قبلہ حکومت کے معتوبوں میں آگئے۔ ان سے آنریری عدالتی عہدہ چھین لیا گیا اور والد صاحب قبلہ ایم اے میں ممتاز قسم کی کامیابی حاصل کرلینے کے باوجود بھی سرکاری ملازمت کے اہل نہ سمجھے گئے۔ اور پھر سونے پر سہاگہ جب جج صاحب بدایوں کے ایک انگریز کلکٹر نے مہربان ہو کر دادا صاحب

کی مثنوی کو شاعرانہ جذباتیت پر اور والد صاحب کے بلقان وار کے چندہ اور پروپیگنڈہ کرنے کو طالب علمانہ شوخی پر محمول کرتے ہوئے والد صاحب کی ڈپٹی کلکٹری میں نامزدگی کی اور یہ زمانہ وہ تھا جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تھی لہٰذا منظوری آنے تک آنریری ڈسٹرکٹ ریکروٹنگ آفیسر کا کام سپرد کرنا چاہا تو انھوں نے پہلے تو بہت کچھ عذر لنگ پیش کیے پھر مخصوص علیگیرین قسم کی مذہبی ڈھٹائی سے اسے قبول کرنے سے انکار کیا اور معذوری یہ پیش کی کہ چوں کہ جرمنی کے ساتھ ترکی شریک ہے لہٰذا یہ چیز ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ جس کے نتیجہ میں بجائے ڈپٹی کلکٹری کے پروانہ تقرری بھیجنے کے مجسٹریٹ ضلع، جتنے دنوں یورپ میں لڑائی چلی ہمارے گھر روزانہ ایک جنگی فتنہ بھیجتا رہا۔

اور ان ناکامیوں سے سبق لینے کے بعد خاندان کے بزرگوں نے آنے والی نسل کی تربیت کی جانب بڑی گہری توجہ دی اور نئی نسل کا پہلا فرد میں تھا جسے لارڈ میکالے کی پالیسی پر حرف بہ حرف عمل کرتے ہوئے خالص انگریزی اسکول کی تربیت اور تعلیم میں دیا گیا اور کانوینٹ اسکول بھی آج کا نہیں بلکہ ۱۹۲۴ء کا جب عام طور پر ریلوں میں یورپین تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ لگائے جاتے تھے اور سنتے ہیں کہ اس سے چند سال پیشتر تک مخصوص سیرگاہیں اور پہاڑی مقامات پر بعض شاہراہیں ہندوستانیوں کے لیے ممنوع تھیں مگر پوتڑوں کے بگڑے کہیں گور تک بھی سنبھلے ہیں۔ اور بھلا یہ تو کانوینٹ اسکول کی تربیت تھی گردگاں چوں گنبد است ثابت ہوئی۔ بچپن سے ہی ایک تلخی سی رچ گئی جو آج تک برقرار ہے۔

تعلیم ختم کرکے اور اپنا بہت کچھ بچا کے گھر چلا آیا اور شاید وہاں کی مسموم فضا سے کچھ بھی نہ لایا۔ اور اب بڑے صاحب (میرا لقب جس سے میں گھر پر پکارا جاتا ہوں) اپنے جدّ نامدار کے سجادہ پر آبیٹھے۔

(۲)

زنان خانہ سے دیوان خانہ تک

اور گھر پہنچ کر اپنے طبقاتی ماحول کا جائزہ لیا تو پہلی نگاہ میں اندازہ کرلیا کہ زندگی، قابو ہی قابو ہے۔ اور اپنی دنیا میں تو جس کو جتنی زیادہ سختی کے ساتھ دبایا جاتا ہے اتنی ہی زیادہ روانی کے ساتھ وہ رس دیتا ہے اور شاید اسی کے نتیجے میں آج تک اپنے راستے پر نوکِ خار نہیں آئی ہے اور کارزارِ حیات میں فتوحات کا یک طرفہ سلسلہ چلا آرہا ہے اور اپنی شکست ناآشنا زندگی نری گل چینیوں سے ہی دوچار رہی ہے اور تصادم کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ منھ سامنے کرتے ہی پچھیاؤ پچھم میں رک گیا ہے اور پروائی پورب میں دم بہ خود ہوگئی ہے اور میں بھی اس سلسلہ کی فولادی زنجیر میں ایک چھوٹے سے کڑے کا اضافہ بن کر منسلک ہوگیا، جہاں روزانہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے صرف گھر کی بڑی بوڑھیوں کی پنج وقتہ نماز کے بعد دعائے کشائش رزق پڑھ کر چھوڑ دینے سے ہی رزاقِ مطلق بے حساب من و سلویٰ کے خوان اتارتے رہتے ہیں۔ اور بوڑھے بفضلہ صبح سے دوپہر تک حقہ کے خوشبودار دھوئیں میں دھواں دھار شاعری کرکے

اور سہ پہر سے شام تک شطرنج کے ٹنویا مرغے بٹیریں یا گیس لڑا کر' اور "ماشاء اللہ" جوان باجا بجوا کر گانا سن کر اور "چشم بدور" لڑکے شکار کھیل کر اور گھوڑے کدا کر یا پتنگیں کبوتر اڑا کر' اور سب کے سب ع "چوں میرود نداں کار دیگری کند" کر کے فساد خوردن گندم کا ازالہ کرتے رہتے ہیں۔ اور خیر سے اندر بیبیاں پان چبا چبا کر اور بہشتی زیور اور راہ نجات پڑھ پڑھ کے "کر" کا حق ادا کرتی چلی آ رہی ہیں۔ اور یہاں آدمی اقتصادیات سے بھی کچھ اسی بھاؤ پر رشتا محسوس کرتا ہے جیسا سورج کی روشنی سے' اور روٹی کا سوال تازہ ہوا کے نرخ پر حل ہو جاتا ہے' اور صبح سے شام تک پانچ چھ مرتبہ پیٹ بھرنے کے بعد لمبی ڈکار کے ساتھ الحمد اللہ کہہ دینے سے روزی کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔

اور ایک مرتبہ "بڑے مولوی صاحب" (والد صاحب قبلہ بصیر صدیقی) کی بے پناہ بندوق کی کج راہ روی کی زد میں ایک کمار کی ناک کی نوک آ گئی جو اسی تالاب پر سنگھاڑے توڑ رہا تھا جس پر "بڑے مولوی صاحب!" مرغابی کا شکار کھیل رہے تھے اور اس کا خوش نصیب باپ بندوق کی کتری ہوئی ناک سمیت تمام چہرا لہولہان جوں کا توں لے کر آیا اور "بابِ عالی" پر ناشی ہوا تو "بڑے چودھری صاحب" (تایا صاحب قبلہ) کا جذبۂ رحم دریائے سخاوت بن کر جوش پر آ گیا اور مبلغ دو روپیہ کہ نصف جس کا ایک روپیہ نقد سکہ چہرا شاہی ہوتا ہے تقریباً "ایک سیر خون کے خون بہا اور ایک راس ناک کی قیمت میں ادا کرنے کا حکم "منشی جی" (کارندہ) کو دیا' جس کی ادائیگی فوری ہوئی اور ابھی "بڑے مولوی صاحب" شکار سے پلٹنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کا حادثاتی شکار اس ناک اور بندوق کے تصادم کے اتفاقی سودے میں نفعِ عظیم حاصل کر کے ہمارے یہاں کے ع "خون شہ رنگین تر از معمار نیست" قسم کے انصاف کا قائل ہو کر رواں دواں دعائیں دیتا گھر کو گیا (جنوری ۱۹۲۱ء)۔

اور جب مسلن میاں (میرے چچا) نے اپنی ۱۹۱۵ء کی ماڈل کار کی سبک رفتاری سے ایک سال کے اندر دو آدمی کچلے تو پہلی مرتبہ تو انھوں نے پلنگ سے واپس آ کر مبلغ پندرہ (۱۵) روپے مرحوم کی بیوہ کے گھر شام کو بھجوائے اور دوسری مرتبہ تھیٹر سے پلٹ کر غسل و آرام میں پیچھے گئے پہلے علی الصبح مبلغ پچیس روپے اس کی بوڑھی ماں کو بلوا کر بہ نفس نفیس اپنے دستِ خاص سے مہلوک کی قیمتِ جاں ادا کی اور عدلِ جہانگیری دہرا کر دنیا و مافیہا میں سبک دوش و سرخ رو ہو کے دم لیا (۱۹۱۹ء۔ ۱۹۱۸ء)۔

اور وصول یابی لگان کے سلسلے میں جب بڑے منشی جی کے اشارہ پر جیون بھنگی نے بلدیو کسان کی دو پسلیاں توڑ دیں تو بڑے سرکار (دادا صاحب قبلہ) کی منظوری پر سال تمام کے لگان کی رسیدیں ہی کاٹ کر بلدیو کے گھر بھجوا دی گئیں۔ اور جب جیون بھنگی رسید لے کر گھر پہنچے تو کہا لے سالے مالا مال ہو گیا تو بھی کیا یاد کرے گا کہ پڑا تھا کسی رئیس کا ہاتھ (۱۹۲۱ء)۔

اور "بڑے صاحب" (راقم الحروف خود) نے شکار سے واپسی میں حسنِ اتفاق سے اپنے ایک باغ کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک "چور" سوکھی لکڑی کاٹتے ہوئے پکڑوالیا اور اس نے بھاگنے کا انداز بنایا تو اس کو شکاری قلی کی پگڑی میں کسوا کر اپنے تانگے کے پیچھے بندھوالیا۔ اور گھر تک ہرانہ نسل کے

تندگام و تیز رو بیل اس کو مع تانگے کے اور تانگے کو مع اس کے گھسیٹتے ہوئے ایک رفتار پہنچے تو حافظ جی نے جو دادی اماں کی قبر پر قرآن خوانی کرکے اجرت میں روٹی کھانے آیا کرتے تھے' قرآن کریم میں یہ آیا ہوا بتایا کہ "یہ چور ہے" اور تانگے کی چوٹیں اور زدوکوب تو کوئی چیز نہیں' آپ تو اس کا ہاتھ کاٹ سکتے ہیں۔ (مارچ ۱۹۳۰ء)۔

اور جب صانع حقیقی یونانی خدوخال اور فرانسیسی رنگ و روپ کا ایک مجسمہ گڑھ کر شاید دھوکے سے کسی ہندوستانی جاگیردار کی حویلی کے بجائے بھورا کمہار کے جھونپڑے میں اتار گئے اور بھائی حارث علی نے بے صبری کے ساتھ اسے بھورا کی جھونپڑی سے اٹھا کر اپنے من مندر کی حویلی میں بٹھالیا تو جس وقت بھورا نے ماموں فضیلت حسین کے سامنے ان کے بیٹے کی اس جدتِ طبع کے ساتھ حسنِ انتظام پر داد رسی چاہی تو بوڑھے ماموں بے چارے نے برجستہ اپنی تقدیر ٹھونکی اور بہت سوچ کر بولے۔ "لڑکا تھا کر بے کر بھاگا' جوانی دیوانی ہوتی ہے۔" اور پھر بھورا سے مخاطب ہو کر رقت دار آواز میں فرمایا۔ "تیرا کیا بگڑا۔ نسل خراب ہوگئی میری۔" اور پھر شکایت کے انداز میں اللہ میاں سے پناہ مانگی جو ایسے انمل بے جوڑ جوڑے اتارتے وقت نہ معلوم کیا مصلحت مدِ نظر رکھتے ہیں۔ جن سے شرفا کی نسل خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ مگر کمر بے دوس کہ مائی دوس! بے چارے خون کا سا گھونٹ پی کر خاموش ہو رہے (۱۹۲۹ء)۔

اور جب بتیا کا چھی کی نوجوان عورت بڑے چودھری صاحب کے ناک کے بال قسم کے پشتینی مقدم ننھوں ناٹر نے فارم پر پوسہ نمبر چار قسم کے گیہوں کے کھیت میں دن دھاڑے پکڑی اور اونچے اونچے گیہوں کے پودے بھی جڑ سے بالی تک ننھوں ناٹر کی جدتِ طبع سے متاثر ہو کر ہیجان میں ان کے ساتھ وجد کر اٹھے تو جس وقت اس بھونچال کی خبر حرکت فرو ہونے کے بعد کھیت سے بڑے چودھری صاحب کے کان تک پہنچی تو انھوں نے فوراً "ایک عادل حاکم کی طرح ثبوت مانگا۔ اور جب بتیا نے طوفان فرو ہونے کے بعد کی اور نشانیوں کے ساتھ گیہوں کی ہری بھری فصل کا کچلا بسترِ استراحت ننھوں ناٹر کے واردات کے ثبوت میں موقع واردات دکھا کر پیش کیا تو چودھری صاحب نے چشم دید شہادت طلب کی۔ مگر ننھوں ناٹر کے سامنے دراب نگر کے اندر ہر چشم دید شہادت ازلی اندھی اور گونگی رہی تھی۔ لہٰذا شبہ کا فایدہ ظن المومنین خیرہ کے مطابق ننھوں ناٹر کو پہنچتا تھا۔ چناں چہ کوئی مواخذہ نہ کرسکے۔ البتہ بتیا کا چھی کو بارہ دھڑی گیہوں ننھوں کی تنخواہ کے حساب میں سے اپنے یہاں سے دے دی تاکہ وہ بارہ گاؤں کے بارہ ماسیوں کو روٹی کھلا کر پنچایت کی رو سے اپنی بیوی کی واپسی عصمت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلے اور پھر شاملِ برادری ہوجائے (فروری ۱۹۳۵ء)۔

اور جب کڑے خاں پہلوان نے ملوا دھوبی کی نابالغ لونڈیا کنوریا دھوبی پاٹ کے داؤں پر اٹھا کر پٹخ دی اور جائے وقوع پر پہنچ کر "اچھے میاں" (برادرِ معظم) نے معائنہ موقع کیا اور پھر نو دس سال ننھی سی معصوم جان کنوریا کا بیان لیا جو کڑے خاں پہلوان کے غیر فطری حیا سوز فعل سے علاوہ سماجی نظریہ کے مادی طور پر بھی بری طرح زخمی تھی اور خون میں لتھڑی ہوئی تھی تو انھوں نے کڑے خاں پہلوان سے جواب

ظلبی کی اور جب کڑے خاں پہلوان نے کچھ دھینگا مشتی سی کرتے جوابات اپنی صفائی میں پیش کیے تو اچھے میاں اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گئے اور ایک تجربہ کار جورسٹ کی طرح انھوں نے دھوبی کو رائے دی کہ معاملہ بہت سنگین قسم کا ہے پولیس اور عدالت سے رجوع کرے مگر دھوبی نے گھگھیا کر مزید بدنامی اور قصبہ سے باہر تک بات پہنچنے کا اندیشہ ظاہر کیا اور پھر سماجی اعتبار سے بہت زیادہ گر جانے کا عذر پیش کیا اور دھاڑ کر رو پڑا اور صرف اچھے میاں سے ہی داد رسی چاہی تو "اچھے میاں" کی فکر رسا فلسفۂ تعزیر کے اس نادر ترین آسمان کو چھو آئی جو سولن اعظم کی پرواز نگاہ سے بالا تر رہا تھا۔

کڑے خاں پہلوان آدھی درجن آدمیوں کا ایک آدمی واقع ہوئے تھے۔ لہٰذا ماہر نفسیات جرائم و طریقۂ سزا اچھے میاں کے اشارہ پر ایک کی دو دو کے حساب سے پورے درجن بھر آدمی کڑے خاں کو چمٹ گئے اور مونجھ کی رسی میں باندھ کر برآمدے کے ستون کے ساتھ انھیں سر سے پاؤں تک برآمدے کے ستون کے ساتھ کس دیا۔ میں حیران تھا۔ ویسے ریڈی جسٹس کے مظاہرے بچپن سے اپنے دروازہ پر دیکھتا چلا آرہا تھا' لیکن دیکھنا تو یہ تھا کہ اس پہاڑ سے پہاڑ مجرم کی آج کتنی مرمت ہوگی تو اس کی سزا کی خوراک پوری ہوگی۔

مگر "اچھے میاں" کے دوسرے حکم پر جسم پر سے چست کرتا تار تار کرکے اتارا گیا اور ذرا اس اطمینان اور بدحواسی کے صدقہ جائیے کہ گلے اور بازوؤں پر بندھے ہوئے پہلوانی کے تعویذ سوئے ادبی کے خیال سے کھول لیے گئے۔ تیسرے اشارہ پر راجپوتی کاٹ کی مونچھیں بال بال اکھیڑ کر کلین شیو کیا گیا۔ اور چوتھا اشارہ پاتے ہی حجام کی وہی چنگی سر پر ناچنے لگی۔ اور ذرا ہی دیر میں البرٹ فیشن کے بال سامنے ڈھیر ہوگئے۔ بجائے استرے کے چنگی سے بھدرا مکمل کرا کے اچھے میاں نے ذرا دم لیا اور شاید یہ اندازہ لگایا کہ پہلوانی کے دم خم جہاں کے تہاں ہیں پھر حکم دیا۔ دیکھتے دیکھتے کڑے خاں پہلوان کی ستون سی ٹانگوں سے دس گزی شلوار دھجی دھجی ہو کر یار لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی اور بھرے مجمع میں وہ سر سے پاؤں تک جامۂ عریانی میں ملبوس رہ گئے۔ اور اب پھر اچھے میاں نے گہری سانس لی اور کڑے خاں پہلوان کا دمکتا ہوا جسم پر تالا' اور چھٹا حکم نہایت ہی مشرح اور عام فہم اردو میں نافذ کیا۔ صلاح عام قسم کا' یعنی اپنے نوکروں کو ہی نہیں بلکہ سب دھوبیوں کو اور سب تماشائیوں کو بھی' اور سب نے کڑے خاں پہلوان کے پیچھے جا جا کر اور تھوک تھوک کر گویا نہایت اہتمام کے ساتھ جھک جھک کر "اچھے میاں" کے حکم کی لفظ بہ لفظ تعمیل کی اور جب تقریباً" سو سوا سو آدمی یکے بعد دیگرے تھوک کر فارغ ہوئے تو "اچھے میاں" اپنی نشست سے اٹھے اور پیچھے جا کر کڑے خاں پہلوان کو پر تالا جو کمر کے زیریں حصہ سے رانوں تک تھوک میں لت پت تھا' لیکن شاید پیٹھ اور شانوں پر کچھ طاقت کی نشانیاں دیکھ لیں اور شاید یہ اندازہ کر لیا کہ پہلوانی کی مچھلیاں ابھی تک بدن میں پھڑکتی ہیں۔ ساتواں حکم اس سے بھی زیادہ گلابی اردو میں دیا۔ مگر صرف اپنے باڈی گارڈ' بہادر بھنگی کو' اور بہادر بھنگی پرانے پشتینی ملازم آقا کے تیور دیکھ کر تعمیل حکم کی رفتار ریگولیٹ کرنے والے' اپنی پیتل کی شیام والی چکنی لاٹھی کی نوک سے کٹوریا کا قرصہ گویا انھیں

سکوں میں قصاص باٹشل کی صورت میں واپس لینے لگے۔ اور اب اچھے میاں نے دوسرا راستا اختیار کیا۔ اور پھر بہادر بھنگی کو حکم دیا۔ جس پر بہادر بھنگی ذرا ایک جانب مجمع سے علاحدہ گوشہ میں گئے پاؤں سے جوتا اتارا، ذرا دھوتی کا پیچ ہٹا کر جوتے کے اندر پیشاب کیا، اور پلٹ کر نہایت اطمینان کے ساتھ ایک ہاتھ سے کڑے خاں کا جبڑا پکڑا اور بڑے زور سے دونوں رخساروں میں انگلیاں گاڑ کر منہ چیرا اور جبڑا اوپر اٹھا کر پیشاب منہ میں انڈیل دیا اور حلق سے اتارنے کے لیے آہستہ سے جھٹکا دیا۔

سب کام ایک عدالتی و سماجی مشغلہ کی صورت نہایت اطمینان کے ساتھ ڈرامائی انداز میں ہو رہا تھا۔ کڑے خاں پہلوان کے چچا بھائی وغیرہ درجن بھر خاندان کے لوگ دم بہ خود تماشائیوں میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اچھے میاں ایک چابک دست سائیکالوجسٹ کی طرح اپنی دی ہوئی ہر سزا کا اثر کڑے خاں پہلوان کے بدن اور بشرے پر بھانپتے جاتے تھے اور اب شاید انھوں نے مارک کر لیا کہ تیوروں کی بہادری اور ہاتھ پاؤں کی پہلوانی گرد ہو گئی اور سچ سچ دیکھتے ہی دیکھتے کڑے خاں پہلوان تو کچھ اور نظر آنے لگے۔ جیسے پھولے ہوئے بتاشہ پر پانی کی بوند آپڑے، اگر سب حاضرین مل کر صبح سے شام تک کڑے خاں پہلوان کی مرمت کرتے تو بھی اتنی شکست و ریخت نہ ہو پاتی اور کڑے خاں پہلوان کی سوا تین من لاش میں لپٹے ہوئے پیچ در پیچ پٹھے کبھی بڑی سے بڑی پڑی ہوئی کشتی میں اکھاڑے کے اندر بھی اتنے ڈھیلے نہ ہوئے ہوں گے جتنے بغیر ایک چانٹا مارے ہو گئے۔ اور اس کے بعد "اچھے میاں" نے ارنڈی کا تیل اور کالوچ ملا کر چہرے پر ملوانے کا حکم دیا پھر پھٹی جوتیوں کا طوق ڈال کر اور کالے گدھے پر سوار کر کے ڈھول کے ساتھ تمام قصبہ میں جلوس نکالا گیا اور ہمیشہ کے لیے قصبہ بدر کر کے اس عدالتی ڈراما کا ڈراپ سین کر دیا۔

اور اس طرح اچھے میاں نے کڑے خاں پہلوان کے گویا ساتوں پر یا کرم کر کے ان کے بدن سے اعصابی کس بل اور بانکپن نکالا، داخلی پہلوانی کا پیچ و خم نکالا اور ہمیشہ کے لیے انھیں بستی سے نکال دیا اور تعزیرات ہند کی کھلی دفعہ ۳۷۶ بے چاری حیرت سے منہ کھولے رہ گئی (ستمبر ۱۹۲۸ء)۔

(۳)

وہ تربیت گاہ جہاں اتالیق بچے کے دماغ میں یہ اصول راسخ کر دیتا ہے کہ "ظلم کے پیٹ سے احسان پیدا ہوتا ہے۔" اور سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلا کرتا وہ ماحول تشکیل کرتی ہے۔ جس ماحول میں، دماغ کے اندر یہ چیز راسخ ہو جاتی ہے کہ "میں بڑا آدمی ہوں۔" اتنا ہی زیادہ قابو یافتہ آدمی وہ ہوا بھی کرتا ہے۔ اور جو فرد زیادہ سے زیادہ افراد کو کم سے کم مواقع زندہ رہنے کے مہیا کرتا رہتا ہے وہی زیادہ سے زیادہ زندگی کا اہل ہوتا ہے۔ جہاں طرز فکر اور طریقہ کار دونوں میں وضع داری کے نام پر منافقت اور کذب، بہادری کے نام پر ظلم و فساد، خودداری کے نام پر کینہ پروری اور تکبر، اور شان و شکوہ کے نام پر باطل احساس برتری، جھوٹی شیخی اور عیاشی پلتی ہے، اور معاملت کے وقت یہ اپنی اپنی جگہ پر کارگر ترین ہتھیار سمجھے جاتے ہیں، جس زمین کے اوپر خیر جاری کا لقب پا کر شر مسلسل کے سوتے پھوٹتے ہیں اور جس کے

اندر مذہب کی آڑ میں ساونتی روایات اور سامراجی استحصال کی جڑیں پھیلتی ہیں اور ان سب کے بل پر ہر گھر اپنی اپنی نام نہاد انفرادی روایات کے سہارے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بن جاتا ہے' اور ان مسجدوں کے اندر بھی وہی فرد جس میں زیادہ سے زیادہ گردنیں اور پشتیں اپنے پیچھے جھکانے کی صلاحیت ہوتی ہے' پوراتن کر امامت کا حق دار خیال کیا جاتا ہے اور ان سب کو معاشرہ کا پاک لقب دیا جاتا ہے۔

جہاں نہ اپنی اولاد اچھی معلوم ہوتی ہے نہ پرائی جورو ہی' اور جب تک اپنی اولاد کو دوسرے کا ثابت نہ کردیں اور پرائی جورو کو اپنا نہ کرلیں دونوں چیزیں کانٹے کی طرح آنکھ میں کھٹکتی رہتی ہیں' جس گھوارے میں بیٹے کی پیدائش پر باپ منہ بسورتا ہے اور جس غم کدہ میں باپ کی موت پر بیٹا شادیانے بجاتا ہے' اور پاؤں کی جوتی تو خیر پھٹنے پر نکال کر پھینکتے ہیں مگر چہیتی بیوی دانت نکالنے سے پہلے ہی نکال باہر کرتے ہیں جہاں اکثر مائیں حادثاتی بیٹے جنتی ہیں اور بیٹی تر باپ اتفاقی واقع ہوا کرتے ہیں' جہاں دو بھائی مادر زاد دشمن پیدا ہوتے ہیں اور بہنوں کے روپ میں ناگنیں لہراتی ہیں جہاں دوست مار آستین ہوا کرتے ہیں اور اقارب نیشِ عقرب......

جہاں پورے ہفتہ دن کا نام بجز آدھی جمعرات اور پورا جمعہ آج اور کل ہی رہا کرتا ہے اور سال میں تاریخیں دس دن "یوم عاشورہ" اور تیس روزے رمضان گنتی میں آیا کرتی ہیں۔ اور صبح سے رات تک وقت کی تخصیص فجر' ظہر' عصر' مغرب اور عشا صرف پانچ ہوتی ہے۔ اور جہاں کی مسجد میں دوگانہ عیدین کے بعد اب تک امیرالمومنین سلطان عبدالحمید کی بقائے سلطنت کا خطبہ پڑھا جاتا ہے اور نماز جمعہ میں غازی انور پاشا کی صحیح سالم واپسی اور غازی کمال پاشا کی فتح کی دعائیں گونجتی ہیں مگر دیوان خانہ میں کانپور کی مسجد کے انہدام کے چرچے آج بھی بغلیں جھانک جھانک کر دیوار بہ گوش دارو سرگوشیوں میں کرنے کی عادت ہے اور شرافت' خاندانی وضع داری اور مصلحت وقت کا لحاظ اسی معیار پر ہوتا ہے جس معیار پر گھر کے اندر کنواری لڑکیوں کی عصمت کا تحفظ۔ جس کے دیوان خانہ کی اصطلاح میں عورت مرد کی غذا کہلاتی ہے اور زنان خانہ کی زبان میں شراب گھوڑا کالا پانی......

اور اس دنیا کے سکان اپنے ماحول کو بیت المقدس کی طرح عزیز رکھتے ہیں اور اپنی روایات کو آیات قرآنی کی طرح باعظمت سمجھتے ہیں' جہاں تسخیر ملک اور تنظیم زر کے معاملہ میں بندہ مزدور کے ہی اوقات تلخ نہیں بلکہ بھانجا جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے اور بیٹا گھوڑے کداتا ہے........ اور یہاں اللہ میاں اور کلکٹر صاحب' اور کلکٹر صاحب اور اللہ میاں کے درمیان نہایت سلجھا ہوا کچھ اینگلو عربک قسم کا سمجھوتا ہے اور دونوں کے درمیان نہایت سلامت روی کی چال' اپنا راستا چلا جارہا ہے۔

مگر میں نے خاص اپنے گھر کے ماحول میں اپنے عام طبقاتی ماحول کی بہ نسبت یک گونہ صحت مند قسم کا فرق پایا اور زاویہ نگاہ میں کچھ عجب مثبت منفی قسم کی چیز' اس میں شک نہیں کہ میرے بزرگ حکومت سے مرعوب بھی تھے اور انگریز کو حاکم تو سمجھتے تھے مگر سور کی طرح گھناتے بھی تھے اور ہندو کو کافر تو کہتے تھے' مگر زلفِ بتاں کی طرح پیار بھی کرتے تھے۔ ان زمین دار خاندانوں کو جنھوں نے غدر ۱۸۵۷ء یا

اس کے گرد وفاداری کے صلہ میں خطابات یا معافیات حاصل کی تھیں باوجود ان کی اعلیٰ مجلسی و معاشی پوزیشن کے انھیں اپنے سے گھٹا ہوا سمجھتے تھے اور ان زمین دار خاندانوں کو جنھوں نے بیس ویں صدی کے آخر ساٹھ سالوں یا بیس ویں صدی کے شروع میں زمین داریاں خرید کر حاصل کی تھیں یا سود بیوپار کے ذریعے پیدا کرلی تھیں' انھیں بہت ہی ذلیل خیال کرتے تھے۔ اور "نو بڑھا" کے حقیر لقب سے یاد کرتے تھے۔ جس کا عملی مظاہرہ یہ تھا کہ دوسرے زمین دار خاندانوں سے ہماری قرابتیں نہ ہوئیں اور اب تک انٹر میرج کا رواج شاذ و نادر ہے۔ اس کے علاوہ عام زمین داروں کی طرح از تحصیل دار صاحب تا جناب کلکٹر صاحب بہادر کے بنگلوں کا طواف کرنا نہ سیکھا اور ضلع بدایوں کا سب سے بڑا زمین دار خاندان ہونے کے باوجود ہم میں سے کوئی خان بہادر یا آنریری مجسٹریٹ نہ بن سکا۔

دوسرا ایک عجیب فرق ضلع کے دوسرے زمین دار خاندانوں اور میرے خاندان کے درمیان کاشت کار کے ساتھ معاملت میں ذہنیت کا ہے۔ عام طور پر یوپی اور خاص طور پر روہیل کھنڈ ڈویژن میں ہر چھوٹا بڑا زمین دار ذرا سی بھی قانونی گرفت پر اپنے شکار کو مٹا دینے پر تلا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں یک گونہ سختی کے ساتھ قانونی استحصال ضرور کیا جاتا ہے مگر بے دخلی کاشت اور قرقی تالیقے کی مثالیں تقریباً" مفقود ہیں اور بقایا لگان کی معافی ملتوی کی مثالیں ہر سال میں سینکڑوں ملتی ہیں۔ اور شاید اسی سبب سے ہمارے کاشت کاروں کے اور ہمارے درمیان ایک قسم کا اپنائیت کا رشتا ہے جو انسیت کی حد تک پہنچتا ہے۔

مجھے دیہات کے اندر ذات پات کی تقسیم کے مطابق دیہاتوں کی نفسیات کے مطالعہ کا بڑا شوق ہے اور میں نے ان طبقوں کا جن کا خون ہندو ذات پات کی تفریق کے سبب آج تک بہت کچھ خالص ہے' غائر نگاہ سے مطالعہ کیا ہے اور مجھے ان میں عجیب عجیب ڈرامائی سانچے نظر آئے ہیں' ساتھ ہی یوپی کے عام دیہاتیوں کی جبلت کا بہت بڑی حد تک محرم ہوں۔ اور زمین دار اور کسان کے سماجی اور قانونی تعلقات سے دونوں کی جو ذہنیت مرتب ہوئی ہے اس کو میں نے خوب سمجھا ہے۔ مختلف وقتوں پر ٹیننسی ایکٹ کے جو اثرات ضابطہ فوج داری پر پڑے اپنی استعداد کے مطابق میں نے انھیں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ نگار بننے سے بہت پیش تر میری اکثر کہانیوں کے ہیرو میرے اندر جنم پا گئے تھے۔ اور جوں جوں میں نے پریم چند' اقبال کا مطالعہ کیا وہ ایک عجیب پہلو سے میرے اندر رچتے گئے۔ ترقی پسند منشور کی بعض دفعات تو مجھے توریث میں ملی تھیں اور بعض میرے ماحول نے میرے شعور کے اندر میری فکر و استعداد کے مطابق تخلیق کر دیں اگر میں یہاں پر ان چیزوں کی توضیح کروں گا تو میرے افسانوں پر تبصرہ کی شکل اختیار کر جائے گی جس کا یہ موقع نہیں ہے' البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ بیش تر افسانے اسی ماحول سے لایا ہوں جو ان کے اندر جھلکتا ہے اور باصرہ ہی نہیں میں نے جیسے لامسہ کے ذریعے اپنا بیان اس حد تک پہنچاتا ہے کہ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

میں کتابیں پڑھ کر کم اور آدمی پڑھ کر زیادہ لکھتا رہا ہوں۔ والد صاحب قبلہ (بشیر صدیقی) اردو' انگریزی'

فارسی ادب پر یکساں گہری نگاہ رکھتے ہیں اور ہر سہ زبانوں میں یکساں روانی کے ساتھ نثر و نظم میں قلم اٹھاتے ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ شعر و ادب کا مطالعہ کیا اور ان کی صحبت سے سب کچھ حاصل کیا۔ بچپن عنفوان شباب میں مجھ کو اپنے دادا کا قرب حاصل رہا جو فارسی عربی کے عالم جید تھے اور پر گو قسم کے شاعر اور اسلوب والے نثر نگار' اور اس معاشرہ کے بزرگ جو فارسی میں خط و کتابت کو داخلِ وضع سمجھتے تھے اور ہمہ وقت چند بلند فکر اور خوش ذوق مصاحبوں کے ساتھ ادبی و علمی بحث میں نظر آتے تھے۔ شاعری' طب اور بدبست کو معیارِ تمدن خیال کرتے تھے۔

مجھے والد کے فیضِ صحبت میں نذیر احمد' رتن ناتھ سرشار اور مہدی افادی سے لگاؤ ہوا۔ اور اقبال' غالب' مومن اور میر کی شاعری سے طرزِ فکر کے مطابق دلچسپی پیدا ہوئی۔ عنفوانِ شباب سے تقسیم ہند تک عندلیب شادانی کی جلوت اور خلوت کی صحبتوں میں شریک رہا ہوں۔ میرے اندر تحریر میں لسانی احتیاطیں بڑی حد تک ان کی فیضِ صحبت سے پیدا ہوگئیں ساتھ ساتھ بعض علمی و فنی عقیدے جو پشت ہا پشت سے ادبی طور پر ہم سب کے اندر جاگزیں چلے آرہے ہیں ان کی بہت ہی موٹی اور عام فہم باتوں سے بدل گئے ممکن ہے کہ میرے بھاری اسٹائل پر آج کل کے بعض ناقدین ناراض ہوں مگر میں مجبور ہوں۔ پہلی چیز تو میری فنی تربیت ہے جس سے مذکورہ بالا طریقہ سے جاگزیں ہوئی ہیں۔ دوسری چیز وہ ماحول ہے اور شاید اسے بعض لوگ بہ مشکل یقین کریں کہ جو طرزِ انشا میں استعمال کرتا ہوں اور جس طرز کے ساتھ میں اپنے قلم استعمال کرتا ہوں تقریباً" اسی سے میرے گھر کے اندر روز مرہ کی بول چال ہے۔ میرے گھر کے جاہل خدمت گار اور نوکرانیاں' اناکیں' مامائیں اور بعض حاضرباش منہ چڑھے کاشت کار تک بولتے وقت بے تکان روانی کے ساتھ فارسی عربی کی تراکیب نکالتے ہیں۔

اور جب جاڑوں کی لمبی راتوں اور برسات کے طویل دنوں میں چھوٹی بڑی ٹولیاں اوقات گذاری کرنے کے لیے بیٹھ جاتی ہیں تو ہمارے درمیان اور گھروں کی طرح گاندھی' جناح' ہندوستان' پاکستان' کشمیر' کوریا' چین' جاپان نہیں ہوتا۔ نہ دال آٹے کا بھاؤ اور لٹھے ململ کی گرونی ہوتی ہے' بلکہ بالعموم کوئی علمی مسئلہ زیر بحث ہوتا ہے یا پھر شکاری مہم زیرِ غور ہوتی ہے۔ ہم سب بہن بھائیوں اور ان بچوں میں درجن بھر نئے پرانے گریجویٹ ہیں اور لڑکے لڑکیوں کو ایک سطح پر تعلیم دی گئی اور مختلف مکتب خیال کے لوگ ہیں۔ اور خواہ ہو یا نہ ہو مگر ہر ایک صاحب ذوق بنا ہوا ضرور ہے اور لڑکے تو لڑکے لڑکیاں تک شکار میں دلچسپی لیتی ہیں اور بندوق چلانے میں قدرت رکھتی ہیں اور جب کوئی تنقیدی یا تحقیقی موضوع زیر بحث آجاتا ہے تو گھنٹوں روزانہ گرما گرم بحثیں چلتیں رہتی ہیں۔ اور چوں کہ ہر ایک اپنے اپنے نظریہ کو ایمان کی طرح عزیز رکھتا ہے اس لیے نسلی خون اور تربیتی ماحول کے تقاضے کے بہ موجب کبھی کبھی تلخی کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ اور شاید لوگ یہ معلوم کرکے متعجب ہوں کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں وہ تمام کا تمام لکھنے کے دوران میں میرے' میرے والد' میری بیگم' میرے بھائی' بہنوں کے دماغ میں ساتھ ساتھ چلتا جاتا ہے۔ اور اس پر بحثیں اور تنقیدیں ہوتی چلتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں لکھتا ہوتا ہوں میری بیگم پشت سے

لگی پڑھتی جاتی ہیں بچے اور بھائی بہن جو صفحہ پورا کرتا جاتا ہوں ہاتھوں ہاتھ لے کر پڑھتے جاتے ہیں۔ اور شاید لوگ سن کر چونک پڑیں کہ بعض بعض چیزوں کے متعلق میں اپنے ان پڑھ (مگر ذہین) دیہاتی نوکروں اور حاضرباش کاشت کاروں تک سے مشورہ لے لیتا ہوں۔ اور کبھی کبھی ان سے بھی بڑے کام کی چیزیں مل جاتی ہیں۔

اپنی اپنی فکر و استعداد کے مطابق ہر ایک تعریف، نکتہ چینی اور تنقید کے ساتھ دلچسپی لیتا ہے اور اس طرح میری کہانی تیار ہوتی ہے جو کبھی کبھی کثرت تعبیرا سے شاید بگڑ بھی جاتی ہے۔ اور یہ خود نوشت لکھتے وقت تو بڑا سینسر لگا ہوا ہے۔ لفظ لفظ تولا جا رہا ہے، ترمیم و تنسیخ کی فرمائش ہو رہی ہے۔ بعض حضرات تو اسے پریس کو دینے سے اختلاف کر رہے ہیں۔

میرے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ مگر اک ذرا ٹٹولتے ہی ظاہر ہو جاتا کہ مذہب کے غلاف میں ساونتی روایات اور تھوڑی حد تک سامراجی استحصال لپٹے ہوئے ہیں۔ چناں چہ غمی، یوم عاشورہ اور عید بقرعید وغیرہ مواقع پر خیرات و انعام کی داد و دہش اور لمبی چوڑی مہمان نوازیوں کا اظہار مقصود نظر ہوتا ہے اور انھیں ذرائع سے شد آمد قدیم، دستور دیہی واجب الارض کے روایاتی قانون کے زور سے کاشت کاروں سے زائد استحصال بھی کیا جاتا ہے، اور دوسرے ہاتھ سے قومی اور مذہبی کاموں میں فراخ دلی کے ساتھ چندے دیے جاتے ہیں اور تقریباً ہر کار خیر میں حتیٰ کہ مسجد و قبر تک کی تعمیر میں جاگیردارانہ تعلی اور ہم چشموں سے بازی لے جانے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور بڑھ چڑھ کر روایات میں سنگ میل قائم کر کے دکھانا مدنظر ہوتا ہے۔ کاشت کاروں سے مقدمہ بازی کی نوبت نہیں آتی مگر خاندان میں بنی عمام سے دیوانی کی مقدمہ بازی کا جو سلسلہ ۱۹۱۴ء سے شروع ہوتا ہے وہ دو مرتبہ پرائیوی کونسل تک پہنچنے کے باوجود بھی بفضلہٖ آج تک عدالت ابتدائی میں ہے اور خیر سے تیسری پشت میں چل رہا ہے۔

مرد تو شاید عادتاً یا نہ معلوم کیوں پنج وقتہ نمازی ہیں لیکن مستورات سچے مذہبی جذبات سے صوم و صلوٰۃ کی پابند ہیں۔ میرے والد مومن پرست اور غالب پسند قسم کے شاعر ہیں اور اس صدی کے اوائل سالوں کے علی گڈھ کے گریجویٹ، انھوں نے ۱۹۱۰ء میں ایم اے اور پھر دس سال بعد ۱۹۲۰ء میں ایل ایل بی کیا اور سب کچھ کرنے کے بعد کچھ نہ کیا، اور ساری عمر بھاری قسم کے مطالعہ، شاعری اور شکار میں گزاری۔ میری بیوی میری بنت عم (میرے تایا کی سب سے چھوٹی صاحب زادی) ہیں اور میں اپنے والد کا فرزند اکبر۔ میرے تایا اور میرے والد دونوں سگے بھائیوں کی عمر میں بیس سال کا تفاوت ہے۔ خاندانی روایات کے مطابق پیدائش سے بھی قبل ان کے ساتھ میری منگنی ہو گئی تھی ان کی والدہ (یعنی میری خوش دامن اور تائی اماں) میری والدہ کی پھوپھی تھیں۔ تو گویا ہم دونوں، ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ایک بڑی نرم و نازک ہری بھری اور دوسری ذرا مضبوط اور کھردری۔ ہم دونوں کی پرورش ایک ماحول اور ایک ہی گھر کے اندر ہوئی ہے اور انھیں میری آنکھ کھلتے ہی میرا بتایا گیا تھا مگر پھر بھی میری تو گانٹھ گانٹھ میں بل ہیں، اور بل تو نہ معلوم ان میں بھی کتنے ہیں مگر شاید سیدھے سیدھے بل ہیں، وہ نجر سے

سے لوٹ تجر تک علاوہ پانچ وقت کے پانچ سات وقت کی نمازیں اور پڑھ لیتی ہیں اور یہاں بقرعید کی پڑھ کہیں پھر لوٹ عید ہی کو نوبت آتی ہے۔ وہ گلستان بوستاں' سکندر نامہ اور مثنوی مولانا روم وغیرہ تک مکتب میں پڑھی ہیں اور احادیث اور کلام پاک کا ترجمہ سمجھنے کی شاید ناکام کوشش کی ہے۔ اور شاید اسی ناکامی کے سبب غیر معمولی سنجیدہ' بڑی تیکھی زود رنج اور دیر فراموش' یک گونہ خشک اور بات بات پر لال پیلی ہوجانے والی واقع ہوئی ہیں اور ہمیشہ سنجیدگی کے ساتھ بات کرنے کی جبلت لے کر دنیا میں آئی ہیں اور یہاں کم از کم ان کی سنجیدہ بات کا سنجیدگی کے ساتھ جواب دینے کے لیے نطق کو الفاظ نہیں ملا کرتے۔ یا شاید ہم لوگ ازدواجی زندگی کے بائیس سال گزارنے کے بعد بھی اس منزل میں نہیں پہنچ پائے ہیں جب "میاں بیوی" کے درمیان سنجیدہ بات آپ سے آپ ہونے لگتی ہے۔ گھر کے معاشی یا خاندان کے مجلسی معاملات میں کسی معمولی سے مسئلہ پر جب وہ سنجیدگی کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور اس کا جواب نہایت سطحی بسا اوقات لفظوں کے الٹ پھیر سے مزاحیہ پاکر چڑ جاتی ہیں اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ شکایت کرتی ہیں' اور پھر ان کی سنجیدگی پر میرا مزاح غالب آجاتا ہے اور بات تو اڑ جاتی ہے اور میری غیر سنجیدگی کی شکایت باقی رہ جاتی ہے' البتہ اس مسلسل مذاق اور غیر سنجیدگی کی رست خیز میں دن میں ایک آدھ مرتبہ تھوڑی بہت جھڑپ ہوجاتی ہے جسے میں تو اسی دم بھول جاتا ہوں مگر وہ اللہ کی بندی دوسری جھڑپ تک یاد رکھتی ہیں اور دوسری جھڑپ کے وقت اس کا حوالہ دیتی ہیں تو بات مجھے بھی یاد آجاتی ہے اسی لیے اکثر جھڑپوں کا خاتمہ بھی مذاق پر ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اس حوالے کے ذریعے میرے موڈ کو ضرب پہنچا کر مجھے سنجیدگی کے راستے پر لگانا چاہتی ہیں' یہ جھڑپیں جیسے باریک باریک کانٹے ہیں جو گل چینی کرتے کرتے کسی کسی وقت انگلیوں کو چھو لیتے ہیں' ایک بات پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ خاندانی روایات میں نوکری تو درکنار کسب معاش کے لیے کسی بھی "کر" کا پشتوں سے سراغ نہ ملتا تھا ورنہ اور تو کسی لائق تھا نہیں یہ نیک بخت مجھ سے تھانہ داری تو کرا کر ہی چھوڑتیں۔ ایک معمولی حیثیت کی دم توڑتی زرعی جائیداد وراثت کی قینچی سے کٹ چھٹ کے ہمارے حصہ میں آئی ہے اور چوں کہ یہ ایک بڑی زمین داری کا جزو ہے لہذا اپنی تمام بڑی روایات پوری پوری ساتھ لائی ہے' بڑے اونچے مکان میں رہتے ہیں جس کی بنیادیں سنا ہے جد امجد پاتال پر لگا گئے ہیں اور کنگرے جن پر باوجود کہ مدتوں سے قلعی نہیں ہوئی ہے اب بھی میل بھرے آسمان میں گھسے دکھائی پڑتے ہیں محدود آمدنی اور لامحدود روایات' خوان بڑا' خوان پوش بڑا تو ایک ہی بڑا۔ اب تو ساری بڑائیاں اور تمام بلندیاں نیچے اتر کر جیسے کچھ کمر پر لد گئی ہیں اور دوہرے ہوئے جارہے ہیں لیکن سنبھالے ہوئے ہیں اور دور سے تنے دکھائی پڑتے ہیں۔ اب خواہ بچوں کی اعلیٰ تعلیم ہو یا مہمان داری' وضع داری جو کچھ ہے سطح نظریہ ہے کہ دکان کی بلندی کے ساتھ پکوان کے پھیکے پن اور اس معاملہ میں وہ بڑی ذکی الحس ہیں حتیٰ کہ چاہتی ہیں اس تحریر میں سے یہ سطریں حذف کردی جائیں خصوصاً" لفظ مہمان داری نکال دیا جائے البتہ زندگی میں لکھا رہے۔

وہ ہر کام صلوٰۃ الخضر کی رہنمائی میں نکالنے کی قائل ہیں اور یہاں کلیمی سے زیادہ عصا کارگر

پایا ہے مگر اس سب کا وجود ان کی سنجیدگی میری ہرزہ گوئی' ان کی ثقافیت اور میرے الحاد میں بڑا پیارا سمجھوتہ ہے اور ہمارا گھر پورب پچھم بہتی دھاروں کا بڑا پرسکون سنگم ہے۔ یوں تو وہ جانیں اور وہ اقرار تو کاہے کو ہی کریں گی مگر مجھے ان کے ساتھ داخلی اور خارجی ہر پہلو سے آج انیس سال بعد بھی وہی شغف ہے جو سر غسل میں تھا اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اسے تسلیم بھی کرتی ہیں' اگرچہ ان کی گھڑی گھڑی نمازیں میری جنسی زندگی میں مخل بھی ہوتی ہیں مگر ان کے ساتھ کبھی اس کا اظہار نہیں کرتا ہوں۔ پھر بھی میرے شغل شکار سے انھیں للّٰہی بغض ہے۔ البتہ میرے آئے دن کی مہمان داریاں برداشت کرتی ہیں اور چہرے پر تو شکن نہیں آتی دل کا حال خدا جانے۔ ادبی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی لیتی ہیں' شعر پڑھنے سے تو معذور ہیں مگر لطف اندوز پوری طرح ہو لیتی ہیں' اور میرے اس ادبی ذوق کو بڑھانے کی کوشش کرتی ہیں کہ میں کہیں کا نہ رہوں' گویا صرف قلم ہی کا ہو رہوں اور ایاز قدر خود بہ شناس' اور میں کیا شاید آپ سب بھی اچھی طرح جانتے ہیں میں جو کچھ قلم کا ہو سکتا ہوں' میرے شغل شکار سے میری بیوی نالاں ہیں اور شکاری افسانوں سے میرے سنجیدہ پڑھنے والے بور ہیں' مگر میں کبھی کبھی شکاری کہانی لکھنے پر مجبور ہوں' میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے اندر فطری طور پر ایک پہلو ذرا کج لے کر آیا تھا' یا شاید یہ میرے طبقاتی ماحول کا تقاضا تھا' مجھے یقین ہے کہ میں پیدائشی شاعر اور افسانہ نویس ضرور ہوں' ساتھ ہی ساتھ دوسرا تاریک پہلو میری فطرت کا یہ تھا کہ بچپن سے مزاج میں شوخی اور شرارت کا عنصر تھا۔ عنفوان شباب میں بعض مخصوص لوگوں کی صحبت سے دہشت پسندی' مار دھاڑ کی جانب مائل ہو گیا۔ بیس سال کی عمر میں مجھے باپ کی معقول زرعی جائیداد کا انتظام مل گیا اور وہ بھی مطلق العنانی کی شکل میں۔ اور اس زمانے میں بہت سے مجرموں سے سابقہ پڑا اور طبیعت کے اندر تباہی کا شوق سا پیدا ہو گیا۔ لیکن میرے اس شوق کو میرے شغل شکار نے آگے نہ بڑھنے دیا۔ مجھے اسپورٹس سے روحانی لگاؤ ہے' میں خوب صورت عورت کو گزرتے دیکھ اپنی نگاہ پر قابو رکھ سکتا ہوں مگر چمکتی اینڈتی گھوڑی کو دیکھ میرے خون میں ہیجان پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جیسے تیز و تند گھوڑا' آم سے لدا ہوا' درخت' اور تھلگیاں بھرتا بچہ دیکھ کر مجھ کو الہام سا ہوتا ہے۔ باغبانی کا شوق مجھ کو جنون کی حد تک تھا۔ آم کھانے سے زیادہ خود تراش تراش کر کھلانے میں اور پھر کھانے والے باذوق کی رائے معلوم کرنے میں مزا آتا ہے۔ ۱۹۳۱ء سے ۴۱ء تک میں نے درجن بھر چھوٹے بڑے باغات نصب کیے اپنے ہاتھ سے قلمیں باندھنا میرا محبوب مشغلہ ہے' باغبانی کا کتابی علم تو یوں ہی سا ہے بس اتنا ہی سمجھئے کہ باغبانی پر ایک کتاب "رموزِ باغبانی" کے نام سے لکھ کر چھپنے بھیجی ہے۔ مگر عملی کام میں سخت سے سخت مزدور اور تیز سے تیز مالی سے پیچھے رہ جانے والا نہیں ہوں۔ میری زندگی شکار' باغبانی اور افسانہ نویسی کے ایک مثلث مساوی الساقین کے درمیان گزری ہے' مہینوں اور ہفتوں مجھ کو ایک ایک شغل کا دورہ سا پڑتا ہے اور شاید ایک مشغلہ کا ردعمل دوسرا شغل اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ گلستاں بوستاں کریما تک پڑھایا گیا۔ فارسی میں خطوط نویسی (تختی پر) کرائی گئی۔ اور اردو چوں کہ مادری زبان تھی لہٰذا بغیر ہی پڑھے پڑھی پڑھائی مل گئی' پھر انگریزی کی ابتدائی تعلیم گھر پر دے کر مسوری کے کانوینٹ اسکول

میں بھیج دیا گیا۔ مگر میں نے بچپن میں شوقیہ آرائش محفل' باغ و بہار' جملہ اردو مثنویات اور شاہنامہ' الف لیلیٰ وغیرہ پڑھا اور پھر رتن ناتھ سرشار' مرزا رسوا' نذیر احمد وغیرہ کو بڑے شوق سے پڑھا۔ اور انگریزی میں استعداد ہوتے ہی الگزینڈر ڈوما' رائیڈر ہی گرڈ کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ پھر ایڈمنڈ برک' کارلائل' ایچ جی ویلز' ڈی ایچ لارنس وغیرہ کا سطحی مطالعہ کیا۔ شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے پڑھے اور پھر رسکن' فرائیڈ' موپساں اور ٹالسٹائی اور ٹیگور وغیرہ کو دیکھا اور اخیر پر کارل مارکس کو سمجھنے کی ناکام کوشش کی۔ اور ہر زمانہ میں اقبال اور پریم چند کا شیدائی بنا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر ترقی پسند نظریہ کی تخلیق اقبال کے افکار سے شروع ہوئی اور اس کی تکمیل پریم چند کے انداز میں ہوئی۔ مگر شاید اپنے مخصوص طرز فکر اور استعداد سے۔ خصوصاً" آخرالذکر سے کبھی دلی لگاؤ نہ ہوا۔

میں نے ۱۹۳۱ء سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا اور ۳۲ء۔ ۳۳ء میں اخبار "ریاست" دہلی میں چند مضامین ابوشاہد کے نام سے چھپوائے اور رسالہ صوفی میں' ایک افسانہ "رہنمائے حقیقی" کے عنوان سے پہلی مرتبہ اپنے اصلی نام سے چھپا۔ اس کے بعد میں لکھتا تو رہا یا یوں کہئے کہ اپنے آپ کو لکھنے والا سمجھتا رہا' لکھ لکھ کر یاران طریقت کو باہزاراں طمطراق سناتا رہا۔ اور جھولیوں داد پا کر فائیلوں میں لپیٹ لپیٹ کر رکھتا رہا۔ میرا افسانہ "سماج کا شکار" جو مولانا صلاح الدین احمد نے ۴۱ء کے "ادبی دنیا" کے سالنامہ میں چھاپا ۳۲ء میں لکھا گیا۔ پھر "منزل" جو شاید ۴۲ء میں چھپا اسی سال کی تخلیق ہے۔ اور پریم چند کا ماحول مجھ سے قریب نہ تھا بلکہ میں اس کا ایک چلتا ہوا پرزہ ہوں اور پریم چند کے افسانوں کا رنگین کردار' مجھے نیند بہت کم آتی ہے اور میں شکار کا رسیا ہوں۔ اور شکار کی جو تھکان میرے اور سب ساتھیوں کی رگ رگ پر تند نشہ بن کر چڑھتی ہے تو میرے اوپر اکثر بے خوابی اور کرب بن کر طاری ہوتی ہے۔ ۱۹۳۲ء سے لے کر اب تک میرے سال کے آٹھ سات مہینے جنگل اور دیہات میں کاٹنے کا اوسط رہا ہے۔ اور ہر صبح ایک تازہ ہنگامہ آرائی میں نکلتی رہی ہے اور ہر شام جنگل کی بھائیں بھائیں میں غروب ہوئی ہے۔ شروع شروع میں اس ماحول کے اندر میری نگاہ بجز شغل شکار کے کسی اور جانب نہ گئی تھی۔ یوں تو شکار کے ساتھ زمین داری اور زراعتی فارم کی دیکھ بھال کا بہانہ لگا رہتا ہے۔ اور جنگل کی بھن بھناتی خاموشی راتوں کے شکار کی تکان کے بعد بے خوابی میں پریم چند کی کہانیاں میری مسکن دوا تھیں جنھیں پڑھتے پڑھتے پچھلے پہر گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے مجھے نیند آجاتی تھی اور یہاں تک کہ اس دوا نے جو مجھے راتوں کو سکون و خواب مہیا کرتی تھی میرے دنوں میں بے خوابی پیدا کر دی۔ یوں تو دیہات میں شان نزول شکار اور شکار کے ساتھ زمین داری فارمنگ کی نگرانی کے سلسلہ میں ہوتی تھی مگر منشی جی کے دیہاتی بہروپ کا بھی پول کھل جاتا تھا۔

مگر پریم چند کی کہانیوں نے میری نگاہ مخصوص زاویہ سے دیہاتی زندگی کی جانب اٹھوائی اور پھر اس میں اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ والہانہ شوق سا بن گئی۔ لیکن پریم چند کی کہانیاں کون نہیں پڑھتا اور متاثر نہیں ہوتا۔ مگر خواہ مجھے معلوم ہو یا نہ ہو لیکن میرے اندر والے کو تو سن شعور کو پہنچتے ہی علم ہو گیا تھا کہ صدیوں سے میرے "اکلِ حلال"' "صدقِ مقال" اور "حق العباد" کی لفظی ترکیبوں میں بولتے ہوئے گھر کے

اندر کسان کی "گھسیٹ"، "لوٹ" اور "پیٹ" کے ذریعے زندگی کی تمام قدریں چمک رہی ہیں۔ اور عشرت کدہ حیات کے بربط کا ہر تار دکھیوں کی آہوں سے اکتسابِ نغمہ کرتا چلا آرہا ہے، اور کمزوروں کی نقاہتیں زور میری ہوئی ہیں۔ اور پھر پریم چند کی رہنمائی نے مفلسی کی ان تمام اندھیری راتوں کا پردہ مجھ پر چاک کر دیا جو منشی جی کا تو خیر بہروپ تھیں مگر جن کی اداس شامیں اپنے انعکاس سے میرے گھر کے اندر سحر خنداں طلوع کیے ہوئی تھیں۔ اور اپنے پاس تھوڑا بہت منشی جی کا عطیہ ہے جس نے اتنے سنگین روایاتی ماحول میں میرے اندر ننگے بھوکے دیہاتیوں سے دلچسپی پیدا کی جو انسیت کی حد تک پہنچی اور ساتھ ہی ساتھ خود مجھ پر میرا پردہ فاش کیا۔ اور منشی جی تو صرف منشی تھے، نہ زمین دار تھے نہ کسان، اور نہ خالص دیہاتی ہی۔ مگر میں تو تینوں چیزیں تھا۔ اور مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے منشی جی کی کہانیاں میری اپنی کہانیاں ہیں۔ اور شاید منشی جی کو ان میں اتنا لطف نہ آیا ہوگا جتنا مجھے پڑھ کر آیا۔ اور یہ میرے عنفوان شباب کی بات ہے جس دور میں دلچسپی بڑی رنگین ہوتی ہے اور کالی چیز بھی سرخ نظر آتی ہے اور اس عمر کا اندھیرا بھی کنواری چاندنی دکھائی پڑتا ہے اور پھر اس کے کم بخت نقوش اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ قبر تک ساتھ جاتے ہیں۔

میرے سوچنے کے طریقہ اور تربیتی ماحول میں پہلے عجیب ٹکراؤ سا ہوتا رہا جس نے میرے اندر ایک عجیب سے جذبہ کو جنم دیا جس کے نتیجہ میں پہلے پہل میں نے اپنے اور اپنے متعلقہ دیہاتیوں کے درمیان ایک نئی راہ و رسم ڈالی اور اپنے جکڑے ہوئے ماحول کے اندر اپنی فکر و استعداد کے مطابق ان کے ساتھ اشتراک عمل کی کوشش کی اور میں آج تک کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر میں افسانہ نگار نہ ہوتا تو شاید اپنے حق میں کوئی خطرناک عنصر ہوتا اور کسانوں کے حق میں بہتر وجود ہوتا۔ اور اب تو دونوں دین سے گئے پانڈے، نہ کھیر ملی نہ مانڈے۔ اپنے متعلقہ ماحول میں کسانوں سے ذہنی اور قلمی ہمدردی کر کے نہ تو انھیں غریبوں کو کوئی فائدہ پہنچا سکا اور نہ اپنے ہی طبقے میں کوئی اصلاح کر سکا۔ اور فکر رسا قلمی جہاد کے بعد کاغذ کے صفحوں، میں گم ہو کر رہ گئی۔ ورنہ قلم اٹھانے سے پہلے میں ان کے ساتھ تنگ و تاریک جھونپڑوں اور وسیع روشن کھیتوں میں نظر آیا تھا۔ اور جاڑوں کی یخ بستہ راتوں میں دھوئیں کے شامیانہ تلے الاؤ کی حیات بیز آگ کے کنارے ان کی اپنی سوانح حیات راجہ بکراجیت اور راجہ بھوج اور راجہ اندر کے کارناموں میں تو بچپن سے سنتا چلا آرہا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ بچپن ہی سے مجھے اس احساس اور ان جذبات پر افسوس اور رحم آتا تھا جو بیان کرتے وقت ان دیہاتی داستان گویوں پر اپنی کہانیوں کے ہیرو کے متعلق طاری ہوتے تھے۔ جس کا اظہار ان کے انداز داستان گوئی میں وہ تمثیل کے طور پر میری ذات سے مخاطب ہوجاتے اور کسی شہزادے، وزیر زادہ یا سوداگر بچہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی اعلیٰ و ارفع خصوصیات یا نجابتِ خاندانی، یا اقتصادی سیادت کی مطابقت ذاتی طور پر مجھ سے یا میرے ماحول سے کرتے تو میں یک گونہ طمانیتِ قلب محسوس کرتا اور میرا جذبہ دوسری شکل اختیار کر جاتا اور میں ان داستان گویوں کے متعلق کچھ اس طور سے سوچنے لگتا جیسے یہ اپنی کہانی کے ہیرو کو اپنے ہوا خواہوں اور وفاداروں کے متعلق، سوچنے کا تاثر پیش کرتے جاتے ہیں۔ میں کہانی ختم ہونے پر چل دیتا اور غلام گردش کے سامنے

کے میدان میں سے گزر کر اپنے پر دادا کے تعمیر کردہ بلند پھاٹک میں داخل ہو کر شاندار نشست گاہ کے صحن میں سے ہوتا ڈیوڑھی پار کر کے حویلی میں جا پہنچتا اور شاید یہ تاثر مکان کے مردانے حصہ میں سے گزرتے ہوئے شدید تر ہوتا جاتا لیکن حویلی میں پہنچتے ہی یک دم میرے معصوم شعور سے معدوم ہو کر صرف الاؤ کی کہانی رہ جاتی اور نہ معلوم کیوں مجھ کو ان داستان گویوں کی میٹھی میٹھی کہانیوں سے زیادہ ان تاریخی واقعات کے سننے میں لطف آتا جو ہم سب بہن بھائی متیا (پردادی) کے لحاف میں بیٹھ کر ان کی آپ بیتی ان کی زبانی سنا کرتے جو ہمیشہ خاندان پر غدر میں انگریزوں کے مظالم کے گرد گھومتی۔ اور جس وقت وہ بیان کرتے کرتے اس قسم کے بحرانی مقامات پر پہنچتیں "اور تو سب بھاگ کھڑے ہوئے' جدھر کو جس کا منھ اٹھا۔ بس۔ ارشاد حسین پکڑ لیے اور میاں اس گورے نگوڑے نے' اللہ کی مار علی کی سنوار موئے پہ جو گھوڑے کی باگ ڈور میں باندھ کر گھسیٹا تو بس میاں وہ موذی گھسیٹتا گھسیٹتا وہاں لے گیا جہاں پھانسی گڑی تھی۔ سنتے ہیں الٹی نودھے میں' بیچ سڑک پر' آم کے پیڑ ہیں اور میاں مرحوم نے جب ذرا صفائی سفارش کی تو موذی نے اللہ بخشے پانچوں کلام بارہ امام کی مار' موئے پہ میاں کہ پیشانی پر ایسا رول مارا کہ میاں کا سر کھل گیا اور خبر یہ اڑ گئی کہ دونوں سات قرآن درمیان شیطان کے کان بہرے جنت کو سدھارے۔ تو بوبو میری کیا بتاؤں تمھیں' دوڑ کے کسی نے نانا حیات بخش (پردادی کے رشتے کے نانا) کو خبر کی اور میاں نانا اللہ بخشے بڑے خیر خواہ سرکار' ملکہ کے وفادار تھے۔ اور نانا بے چارے کو تو کھانا پینا حرام تھا۔ دن رات یہی سفارش' صفائی' ضمانت' گھوڑا مار آنا" فانا" میں پہنچے' اور زندگی موت تو تم جانو اللہ کے ہاتھ ہے۔ ذریعہ' وسیلہ' حیلہ' بہانہ شرط ہے۔ نانا کی سعی سفارش ضمانت پر خیر سے چھوٹ کر گھر آئے۔ بس میاں ارشاد حسین کا تو برا حال تھا۔ زندگی کا آسرا نہ تھا۔ پھوپوں پانی پڑ گیا سمجھ لو ماں کے پیٹ سے پھر سے پیدا ہوئے۔ اور میاں بے چارے لہولہان خون نہائے اور نانا تو یہ سن کر ہی گئے تھے کہ دونوں دشمن اللہ کو پیارے ہوئے۔ بس لاشیں اٹھا لائیں ...... اور ایسے مقامات پر ان کی پھٹی آواز ساٹھ سال بعد بھی رقت سے بند ہو جاتی۔ شاید اپنے مرحوم شوہر اور بھانجے (ارشاد حسین) کی چوٹ پر' اور میرے اندر اس گورے کی جانب سے جو جذبۂ نفرت اور خشونت کی شکل میں ہوتا اس کا دھارا متیا کی رقت اور قنوطیت سے جا ملتا' تو اب میاں گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ آپا جان اور قدسی چہ چہ نکالتیں اور آنسو پی کر رہ جاتیں۔ اور میں سنتے ہی سنتے' خشونت اور رقت قنوطیت کے ملے جلے تھپیڑوں میں اچھلتا ڈوبتا گرم گرم لحاف کی تاریکیوں میں حل سا ہو جاتا اور نیند کی گنگا جمنی لہروں میں مدغم ہو جاتا۔

اور سنِ اقتدار تک پہنچتے پہنچتے میرے افسانوں کے بعض ہیرو میرے شعور کے اندر پل پل کر جوان ہو گئے اور کبھی کبھی بے تاب ہو ہو کر میرے اندر سے جھانکنے لگے۔ مگر اس وقت اپنی آبائی سیادت والی پوزیشن میں ہونے کے ساتھ ساتھ صرف ذہنی اشتراک عمل سے کوئی اصلاح تو کر ہی نہ سکتا تھا۔ البتہ گھر کے ماحول میں خدا ترسی' رحم دلی' صلح جوئی کی لفظی ترکیبوں کی آڑ میں تھوڑا بہت ان کے دکھ درد کو اپنے زاویۂ نگاہ سے پرکھا۔ مگر پہلی بہت ہی سطحی دلچسپی لیتے ہی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور صرف زبانی

اظہارِ خیال اور ہمدردی کرنے پر خاندان والوں نے ہدفِ ملامت و تضحیک بنایا۔ اور جب ذرا عملی اقدام کیا اور کسانوں کی آمد و رفت اپنے دیہاتی مکانوں میں کھول دی' ان سے بالمشافہ بات کی' ان کی شکایات براہ راست سنیں' انھیں اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی تو علاوہ خاندان کے معاصر زمین داروں تک میں کہرام مچ گیا۔ اور ہر آنکھ اور زبان مجھ سے سات پشت کی ناک کاٹ پھینکنے پر مطالبہ کرنے لگی۔ پیٹھ پیچھے تحقیر کے ساتھ تذکرے ہونے لگے۔ گھر میں خاندانی منجم پنڈت گوپی ناتھ کی اس پیش گوئی کا حوالہ بات بات پر دیا جانے لگا جو میری پیدائش کے وقت پچیس سال پیش تر انھوں نے میری جنم پترا میں لکھی تھی۔ "مولود با مردمان طبقہ اونیٰ موافقت دارد۔" رشتے کے بھائی اور گھر کے لوگ میری اس قسم کی بدعتیں دیکھ کر کہتے۔

"ارے بھائی وہ تو ان کے زائچہ میں لکھا ہے۔"

"میرے للہ کے بڑے بڑے یار' دھنئے' جولاہے اور منہیار۔"

"تقدیر میں چماروں' بھنگیوں کی ہی جو یاری لکھا کر لائے ہیں۔"

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

"چلو اچھی لیڈری ہوئی خاندانی وضع داری اور بزرگوں کی عزت کا بھی تو پاس نہیں......"

"ہوں' آپ کے معزز معاصرین۔"...... بنا' امریا چمار' منگلیا' کلبیا' بھنگی' جلما' بلونتا کسان' شبراتی جما جولاہے' کھچیزا کنجڑ' بیواسنار' کشنا ناؤ۔ کیا کہنے اچی شرافت کو بٹہ لگا دیا۔ برابر یار بنا کر بٹھاتے ہیں۔"

ایسے سخت قسم کے سادتی ماحول میں کوئی سدھار کرتا یا جذبہ اصلاح ابھارتا تو وہ میرے طبقہ سے کھلی بغاوت ہوتی اور پھر یہ چیز دستور دیہی واجب الارض شد آمد قدیم کے روایاتی آئین میں ممکن بھی نہ تھی۔ لیکن میرے اس رویہ اور زاویہ نگاہ سے مجھ کو بڑا فایدہ پہنچا۔ ہندوستان کی دیہاتی زندگی کا پورا ڈراما میری آنکھوں کے سامنے ہونے لگا اور میں نے اسے اپنی مخصوص نظر سے مشاہدہ کرکے ذہنی استفادہ کیا۔ اور باوجود تمام تر روایاتی اور قانونی استحصال کے میں خود کو ان میں سے ایک سمجھنے کی کوشش کرنے لگا اور شاید سمجھنے بھی لگا۔ اور اس میں ایک ذہنی پناہ سی محسوس کرنے لگا کہ ان کے اور اپنے سماجی اور قانونی تعلقات کو اپنی کسوٹی پر پرکھ کر دل ہی دل میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرتا رہا ہوں اور مجھے اپنی تمام پرانی روایات اور قانونی حقوق کی' جن کی بنا پر ان سے استحصال کیا جاتا تھا' حقیقت نظر آگئی۔ جس پر اردو افسانہ کے شاید سب سے بڑے نقاد مولانا صلاح الدین احمد کو حیرت ہوئی اور انھوں نے ۴۲ء میں میرے ایک افسانہ پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ "جاگیردارانہ نظام کا نمایندہ ہونے کے باوجود حیرت ہے کہ صدیقی اپنے دل میں کسان کا کلیجہ کی ٹیس کیسے محسوس کرلیتا ہے۔" اور پھر ان کو اندازہ ہوا کہ اپنی قدیم روایات کے مطابق کسانوں سے استحصال کرلینے کے بعد صدیقی رنگ محل اور شیش محل میں نہیں سوجایا کرتا۔

اور شاید مولانا کو لاہور بیٹھے ہی بیٹھے اندازہ ہوگیا تھا کہ صدیقی اپنے ریڈیو سے اٹھتی ہوئی مردہ لہروں سے زیادہ چیت کی ہولی اور بھادوں کی آل کھنڈ کے اٹھتے زندہ گیتوں میں ایسا گھل مل کر لطف لیتا ہے

جیسے کہ ان کرداروں میں سے وہ خود ایک ہے۔ (شاید روئیں تن لکھاں)......

اور شرت پور نما کی دلکش راتوں میں جب آسمان سے زمین تک فضائے بسیط میں چاندنی کی افشاں سی برستی ہے' اور زمین سے آسمان تک سونے کے فوارے سے اچھلتے ہیں اور دھان کے پکے ہوئے سنہرے روپہلے کھیت اپنی مست خوشبو سے کرہ ہوا بھر دیتے ہیں تو صدیقی اپنی خواب گاہ سے دیوانہ وار فرار ہو کر بھری برسات کی نہائی ہوئی شفاف راتوں کی شبنمی چاندنیوں میں حل سا ہو جاتا ہے۔ اور یہاں تک گم ہو کر رہ جاتا ہے کہ کندن سی رات سنہرے دن کے سامنے جھکنے لگتی ہے تو نور کے تڑکے کے مہر و ماہ کی آویزشوں میں اپنا آپا نظر آتا ہے۔

اور شریک کام نہ کرے دھوپوں تو مرے۔ جب آفتاب کے برج حمل کی کرنیں سنہری بالیوں کی تھیلیاں موتیوں سے بھر کر زمین کو گندمی خیرگیوں سے چکا دیتی ہیں اور کسان اپنے لوہے کے ہنسے اور درانتیاں لے کر اپنے تمدن پر زر کاری کی ایک اور تہہ چڑھانے کے لیے ان پر جا پڑتا ہے تو صدیقی نہ تو باغ میں لان لگاتا ہوتا ہے نہ ڈائننگ روم سے ڈبل روٹی اور شیرمال کھا کر آرام کمرہ میں قیلولہ کرتا ہوتا ہے بلکہ علی الصباح ان کے ساتھ کانکا چیت کی چلچلاتی دھوپ میں ان کے ساتھ دوپہری کو داخل ہوتا ہے اور اپنی ڈبل روٹی و شیرمال کے دانہ دانہ پر اپنی مہر لگاتا ہے۔

اور جب ساون بھادوں کی اندھیریوں میں گھنے باغوں کے اندر سنسناتی پروائی کو کالے کالے سانپ لہرا لہرا کر اپنی پھنکاروں سے مہیب تر کر دیتے ہیں تو کبھی کبھی آم کھانے کی "طلب" میں آدھی رات گزرے بستر سے بھاگ کر باغ کی تاریکی میں گم ہو جاتا ہے اور بجلی کی چمک کے سہارے ٹٹول ٹٹول کر چونسہ اور دسہری کھاتے پکڑا جاتا ہے۔ اور جاڑوں کی سلونی سنولی دوپہروں میں تا حد نظر چنے کے مخملیں سبز کاہی رقبہ پر کھنت منڈرا ساگ کھاتے بھی دیکھا گیا ہے۔

اور پھاگن چیت کی حیات آفریں گلابی دوپہروں میں جب ساری زمین رنگا رنگ مسکراہٹوں سے کھل اٹھتی ہے اور افیون کے کھیتوں میں چینی کے کٹورے مسکہ رس سے بھر کر ہرے ہرے بونڈے بن جاتے ہیں اور کھل کھلاتی ہوئی مٹی کے چپہ چپہ پر بونڈا بونڈا جھوم اٹھتا ہے اور چھلک چھلک کر کرہ ہوا تک کو نشہ اور سرور سے لبریز کر دیتا ہے اور افیون کے قدرتی اٹھتے ہوئے ابخرات سے سارا ماحول۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

گنگنا پڑتا ہے تو صدیقی اس سرور میں ڈوبی ہوئی فضا سے دور نہیں بھاگتا بلکہ کھیت کی منڈیر پر ڈٹا ہوا افیون پونچھنے والے مرد عورت بچے' مزدوروں کی نگرانی کرتا ہوتا ہے۔

افیون جمع کرنے والے مزدور' جو تمام دن نشہ میں جھومتے ہیں اور صبح سے شام تک ایک قدم پر جاگتے ایک قدم پر سوتے پنک میں کام کرتے ہیں' اور سرِ شام ہی سے اپنے افیون آلودہ کپڑوں میں نشہ زدہ دماغ سے ایسے چت ہوتے ہیں کہ صبح تک کروٹ نہیں بدلتے۔ اور اس میٹھی نیند میں بھی صدیقی ان کا

ساتھی ہوتا ہے۔ اور ع

دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

کے نشۂ پندار میں نہیں ہوتا' بلکہ سچ مچ نشہ میں ہوتا ہے۔

اور یہاں تک کہ ایک مرتبہ اپنے زراعتی فارم کے افیون کے رقبہ میں کھیت کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس ہیئتِ کذائی سے کہ سیدھے ہاتھ پر مولا بخش (میرا موٹا ڈنڈا) بائیں ہاتھ پر صفدری (میری ہاتھ چڑھی بندوق) رکھی تھی اور گھٹنے پر فائل اور ہاتھ میں قلم تھا اور میں اپنا افسانہ "شکنجہ" لکھ رہا تھا اور لکھتے لکھتے سامنے نگاہ اٹھا اٹھا کر افیون پونچھنے والے مزدوروں کا تماشا دیکھتا جاتا تھا۔ موسم بہار کی ہوا افیون کے پورے رقبہ پر ہو کر بھرپور نشہ میں بھری بہکتی بہکتی چلی آ رہی تھی اور اس کنارے سے مزدور قطار باندھے نشیلی ہوا سے بچتے بچاتے کی افیون پونچھتے ہوا کی سمت بڑھ رہے تھے اور لہرا لہرا کر گاتے چلے آ رہے تھے۔ ہوا میں سے افیون کا نشہ آہستہ آہستہ دماغ پر قابو پاتا رہا۔ قلم و کاغذ کے استغراق میں پتا نہ چلا اور بیٹھتے وقت بھی ہوا کے رخ کو بچا کر بیٹھنے کی مخصوص احتیاط نہ کی تھی' پتا ہی کسے تھا کہ افسانے میں اتنا گم ہو جاؤں گا اور اتنی دیر تک بیٹھوں گا۔ کمر کمر بلند افیون کے پودوں کی وسیع دنیا میں بیٹھا لکھتا رہا اور نشہ چپکے چپکے دماغ اور اعصاب پر مسلط ہوتا رہا۔ اور یہاں تک کہ بھاری بھاری آنکھیں' بوجھل سر کاغذ سے اٹھا' لکھتے ہی لکھتے کتنی جمائیاں لے گیا' کیا معلوم؟ بس جب ہوش آیا تو۔

مستی آنکھیں چوم رہی تھی
یعنی دنیا گھوم رہی تھی

جیسے نشست کسی مغربی ناچ گھر کے گھومنے والے فرش پر تھی' اور جب ذرا ایک انگڑائی سی لینے کی کوشش کی تو گویا Meery Go Round پر سوار تھا۔ میں جھوما۔ تاحد نظر ہرے ہرے پودے جھومے' زمردیں ماحول گھوما۔ کل دنیا رقص میں آئی۔ نیلی نیلی شفاف فضائے بسیط اترنے چڑھنے لگی۔ ساری کائنات ناچنے لگی۔ اور یہاں تک کہ بوجھل پپوٹے مخمور آنکھوں پر آ پڑے۔ ایک میٹھی سنسناہٹ پیشانی میں سے کنپٹیوں میں گدگداتی چلی گئی۔ ایک سرور ساگردن میں سے ریڑھ میں اترتا چلا گیا اور ع

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

قلم ہاتھ سے چھوٹا' کاغذ گھٹنے سے سرکا اور ہم ہری ہری گھاس سے ڈھکی منڈیر پر زمین کا گز بن کر رہ گئے اور نہ معلوم کتنی دیر فلک سیر کرنے کے بعد جب مزدوروں کی نگاہ پہنچی تو کام چھوڑ کر دوڑے پہلے تو ان کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح کانوں میں پڑیں پھر جیسے ٹیلی فون کا ریسیور کانوں کے اندر سے بھنبھنانے لگا' کچھ مبہم سی آوازیں کچھ واضح سی بھنبھناہٹ! یا بدستے دگرے دست بدستے دگرے۔ فارم کے ریسٹ ہاؤس میں لا کر ڈال دیا۔ کہیں شام تک خواب نوشیں سے بیداری نصیب ہوئی اور لوٹ صبح کو سکر سے گلوخلاصی ہوئی۔

اور اسے کمایوں اور گڑھوال کے پہاڑوں کے ٹھنڈے میٹھے چشموں کا راستا ازبر ہے اور چٹان

چٹان پر اس کی نشست کی مہریں ثبت ہیں اور جب کبھی گھر سے روٹھ کر فرصت ادب نکالنے کے لیے گینیا' بھیم تال جیسی مادر جبال آغوش میں پناہ لیتا ہے تو اس کے افکار کا دھارا چشموں سے کہیں زیادہ غنائیت کے ساتھ بہتا ہے۔ اور جہاں راتیں جب پتھریلے سبز کاہی ماحول پر اپنی اندھیریاں ڈال دیتی ہیں تو بہتے پانی کی پیہم سنسناہٹ رات کے سناٹے کے ساتھ مل کر ہو کے عالم کی تکمیل کر دیتی ہے اور یک قلم نیند اڑا دیتی ہے تو ایسا سنائی پڑتا ہے جیسے ٹھہر ٹھہر کر کوئی آواز دے رہا ہے۔ شاید سینہ سے پیہم کوئی گونج سی بلند ہو رہی ہے۔ اور نیند اڑ کر قلم ہاتھ میں آجاتا ہے' اور لکھتے لکھتے تاریک پہاڑی رات کی حدیں سنہری تاب ناک صبح سے آملتی ہیں اور ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کا نظارہ مئی جون کی صبح میں الہام سے دیتا ہے' اور کبھی کبھی ان سیاحوں کی یاد تازہ کر دیتا ہے جن کے قدموں کو اس برف بوسی کا شرف حاصل ہے اور فن کار کی روح جسدِ خاکی سے آزاد ہو کر نکلتے ہوئے سورج کی قرمزی کرنوں کے ساتھ اس بلوریں آئینہ پر مچلنے لگتی ہے۔

اور وہ تو کچھ ازل سے ہی قسمت میں حسن پرستی لکھا کر لایا تھا۔ میں نے عنفوانِ شباب کی پہلی نشیلی نگاہ اٹھاتے ہی خالص عرب شعرا والا بنتِ عم کا جیتا جاگتا' قدسی صفت رومان دیکھا' اور پھر بارگاہِ حسن کی اچھوتی یکتائیوں اور بے داغ خلوتوں میں باریاب ہو کر آتشیں رخساروں کی شراب کے خم کے خم چڑھائے اور یاقوتی ہونٹوں سے غٹاغٹ امرت کے گھونٹ چوسے اور صبح صادق کے جھٹپٹے میں نرگسی انکھڑیوں کے پیمانے گلابی صبوحی سے بھی چھلکتے دیکھے اور پچھلے پہر کے کسل میں خمار آور مرمریں بانہوں کی دونوں ہاتھوں سے ٹوٹتی انگڑائیاں بھی اور پھر گھریلو زندگی کی چکی میں حسن و رعنائی جمالیاتی احساس کی جنس ایسی پستے دیکھی ہے کہ رفیقۂ حیات خود کو گھڑی بھر میں مرغی کے درجنوں بچے نکالنے کی مشین سمجھنے لگتی ہے اور رفیق زندگی ٹکسال کی سکہ ڈھالنے والی مشین کا سانچہ۔ مگر اس پاک اتصال و اشتراک کے صلہ میں کہ مہتاب قرین آفتاب چند چہرے چودھویں کے چاند سے ملتے ہوئے 'شاہد' 'عذرا' 'آصف' 'نزہت' ''ذی النورین'' اسم بامسمی بھی پائے ہیں جنہیں دیکھ کر ہر شخص بول پڑا۔ ماشا اللہ! ایں خانہ تمام آفتاب است۔

اور میری ہوش سنبھالنے والی اولیں یادیں جس ماحول سے وابستہ ہیں وہ اندر سے باہر تک ایک رفتار کچھوے کی چال متحرک کارخانہ سا ہے۔ چھوٹی بڑی دونوں حویلیوں میں ہمہ وقت گرم باورچی خانہ چارپائیوں اور چوکیوں پر رنگا رنگ کپڑوں کے سلتے ہوئے انبار' سرخ و سفید مشفق چہروں کی مسلسل مسکراہٹوں کے گلاب اور قہقہوں کی جل ترنگیں۔ صبح' سہ پہر قرآن خوانی کی قرات کے ارغنوں اور نمازوں کی پریڈ کا پر تقدس تسلسل اور پیہم کھنکتا ہوا سروتہ ہر ایک نوکرنی انا سے لے کر گھر کی ہر چھوٹی بڑی بی بی کے ہاتھ میں۔ بارھویں بارہ وفات اور دسویں یوم عاشورہ میلاد شریف اور ذکر عزا کے ہنگامے مگر یہاں میری اپنی توجہ اور دلچسپی کا مرکز رسول جہاں بیگم (بیگم مخفی) مصنفہ ''عروس سخن'' اہلیہ ڈاکٹر رفعت حسن صدیقی پروفیسر کیمسٹری پنجاب یونی ورسٹی' میری بڑی بہن نور جہاں بیگم (بیگم نور) مصنفہ ''خضابہ دل''

اہلیہ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی' صدر شعبہ تاریخ اسلام کراچی یونی ورسٹی' میری بڑی بہن رئیس جہاں بیگم (میری بہن) اور قدسیہ بیگم (میری بنت عم اور ہونے والی دلہن) اور ان کی کالی گوری بھوری خیالی دو جن بھر سہیلیوں کا جمگھٹ تھا۔ جہاں سانولی سلونی' سنجیدہ شان دار اور بذلہ سنج اور مشفق قسم کی "بیگم آپا" رسول جہاں بیگم بھی میرے وجود سے اتنی ہی نالاں تھی جتنی برق مزاج اور مضحکہ اڑانے والی چمپئی رنگ کی "چھوٹی آپا" نور جہاں..... اور گوری چٹی کینہ پرور شریر رئیس جہاں۔" اور بھلا دایم المریض' چڑچڑی زرد رخ' سرخ ہونٹوں اور غلافی انکھڑیوں والی لالہ رخ قدسیہ بیگم سے کیسے بن سکتی تھی' کیوں کہ ہم کو بھی معلوم تھا کہ "حضرت ہماری بیگم صاحبہ آپ ہی ہونے والی ہیں۔ بی بی قدی جان۔" اور شاید انھیں بچپن کی ان معصوم رومانٹک قسم کی زبانی غلطیوں پر خفت تھی جو ان کے منھ سے "انھیں" ہمارا کہلوا کر' ہمارے منھ سے ہم کو ان کا کہلوا کر درمیانی اعزا نے ہم دونوں کو اپنی تفریح طبع کے لیے نطق عطا ہونے پر بولنا سکھایا تھا اور پیدائش سے بھی پہلے منگنی کرکے گویا عالم وجود میں آنے سے پیش تر ہی ان کا قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام ڈالا تھا۔ اور شاید یہ احساس کہ "وہ" ہماری ہیں اور "ہم" ان کے' ہمہ وقت ہمارے معصوم شعوروں میں ایک رومانٹک مجادلہ کی طرح برپا رہتا۔ مگر ہم اس پارٹی کے اندر مان نہ مان میں تیرا مہمان! کچھ تو دادی اماں کی پاپوش بردوش سفارش کے بل پر اور بہت کچھ اپنے ڈنڈے کے زور سے سمجھوتہ کیے خود ساختہ رکن تھے۔ اور ہمارے ازالہ سے یہ بے چاریاں تو کس شمار قطار میں تھیں ان کی اینگلو انڈین یا اللہ جانے بنگلو انڈین کی نو مسلم اتالیق استانی بسم اللہ بیگم بھی عاجز تھیں۔ جن بے چاری کی ولدیت اور زوجیت کا خود انھیں بھی پتا نہ تھا۔ اور جب وہ اپنی شعلہ مزاجی سے لڑکیوں کے ساتھ ہمیں بھی مرعوب کرنا چاہتیں تو ہم ان کی اس دکھتی ہوئی رگ پر نشتر چبھو کر غریب کو چپ کر دیتے' لہٰذا کشیدہ کاری کے اڈوں سے لے کر ہنڈکلیا کے چولھوں تک' اور چوڑیوں کے بکسوں سے گڑیوں کے گھروں تک ہر جگہ دخیل' اور ہر ایک کے حصہ میں نصف سے تقریباً "دوگنے کے جائز شریک تھے۔ لیڈیز میں move کرنے کا شعور تو آج تک نہ آیا۔ اور جب تو کبھی گڑیاں اغوا کیں اور کبھی کھلونے قتل کیے' اور کبھی چوڑیاں توڑیں اور کبھی زردہ کی پتیلی میں نمک ڈالا' اور قورمہ کی پتیلی میں شکر ملا کر الکیمیا کا جدید ترین تجربہ کرکے دکھایا۔ غرض اس وقت تو لڑکیوں کے اس قوسیں جمگھٹ میں ہمارا "غیر جنسی" وجود ٹھیک ٹھیک سنہری ہرنیوں کے غول میں "بھورا بندر" بنا ہوا تھا..... نالاں۔ اور نالاں ہی نالاں۔ پرانی پرانی ملازمائیں' لونڈیاں لونڈے۔ پھوپیاں۔ امیاں!! بہنیں! سب کے سب!!! اور اپنا "بدو" لقب مگر پیٹھ پیچھے......

اور باہر دیوان خانہ میں چھوٹی بڑی حیثیت کے مہمانوں کی گھومتی ہوئی زنجیر پلاؤ قورمہ دال قلیہ اور بیجھڑ یا باجرے کی روٹی اور مٹر ارہر کی دال اور سرسوں کے ساگ تک "بادہ بقدر ظرف" لیتی ہوئی۔ اس کے برابر گودام کے برابر صحن میں خریف و ربیع کی فصلوں کے پہاڑ' نجاریاں کھیتیاں نگل کر' آہستہ آہستہ اگلتی ہوئیں۔ آم' امرود' سنگھاڑے اور خربوزہ' تربوز کے ٹیلے آن کی آن میں ابھرتے اور دیکھتے دیکھتے غائب ہوتے ہوئے...... باہر سے اندر کو بہتی ہوئی دودھ شہد کی نہر' اندر سے باہر کو من و سلویٰ کے

خواتوں کا دھارا والا دشتادیوان خانہ اور زنان خانہ کے راستے پر اپنی روایاتی چال متحرک تھا۔

اور پچھواڑے اصطبل میں لارڈ سیکسن (Lordsaxon) انصاف سمند خاں' قاضی جی سیکنی' کیمیل بجلی' تازہ' قریب پون درجن نسل کشی اور سواری کے گھوڑے گھوڑیاں' رنگ برنگے نسل نسل کے آسٹریلین دیار' تھارو انگلش بریڈ' عرب' کاٹھیاواڑی اور دیسی ٹو تک' مویشی خانہ اور گؤ خانہ میں بھینسوں' گایوں اور کاشت کے بیلوں کا ایک اچھا خاصا گلہ اور یہاں سے وہاں تک دو تین روپیہ ماہوار اور خوراک پانے والے نوکروں کا ایک چھوٹا سا رسالہ جن میں کھنو شیخ شاید بارہویں پشت میں اپنی مدت ملازمت کے چالیس ویں سال سے گزر رہے تھے' اور بہادر جمعدار (بھنگی) چودھویں پشت میں اپنی بلا انقطاع ملازمت کا پچپن واں سال گزار رہے تھے۔ رفتار خاں جن کے جدِ امجد غلامی کے دور میں ٹیلے پر آباد ہوئے تھے اور شاید ان کے دادا "قحط" میں مع ان کے باپ اور ماں کے مستقل طور پر ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تھے۔ شبراتی خانساماں جن کو ایک چال روٹیاں تھوکتے اور قورمہ بھونتے پینتیس سال ہوئے تھے اور جن کا انڈے کا حلوا آج تک زبان زد خاص و عام ہے اور حاجی امام علی جو پورے رکاب دار ہیں۔

اس زمانہ میں تایا ابا اس تمام مشین کے ریگولیٹر بنے ہوئے ہمہ وقت مصروف قسم کے سکون میں اپنی مخصوص نشست پر بیٹھے نظر آتے اور والد صاحب قبلہ علی گڈھ اور لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے جب چھٹیوں میں گھر آتے تو تمام دن شکار کھیلتے یا ناول لکھتے اور پھر صبح شام اپنی ترکی قسم کی طبیعت کے جذبہ کے تحت بندوق لے کر چاند ماری کے میدان میں شاہ اٹلی کی تصویر پر نشانہ بازی کی مشق کرتے کیوں کہ یہ زمانہ بلقان وار کے عین بعد والا تھا اور مسلمانوں میں اٹلی کی جانب سے اس قدر شدید قسم کا جذبۂ منافرت متحرک تھا کہ انیلین ساخت کے مال تک کا اچھوت کی طرح بائیکاٹ تھا اور دادا صاحب قبلہ اپنے فارسی و عربی داں قسم کے بزرگوں کی چکڑی لیے علاحدہ ایک جانب کو حقوں کے دھوؤں میں بیٹھے علمی مباحثہ اور شاعری کرتے اور اس سب نظام کے تماشائی اور صبح شام کا یہ بوڑھا نازک خیال شاعر دوپہرے سہ پہر تک خدائی فوج دار بن جاتا۔ اور وہ اپنے مخصوص کمرے میں آنریری منصفی کے اجلاس کو گرم کر دیتے اور ظہر کے وقت تک دیوانی کے چھوٹے چھوٹے مقدمات فیصل کرنے کے بعد نماز کو اٹھ جاتے اور ریٹائرڈ لائف کا مجسمہ بنے دکھائی دیتے۔

اور مرزا غالب کو تو دشت دیکھ کر گھر یاد آتا مگر اس زمانہ میں ہمیں گھر کو دیکھ کر دشت یاد آیا کرتا تھا۔ اور جب دادی اماں جیٹھ' بیساکھ کی آگ برستی دوپہروں کو خس کی ٹٹیوں کی آڑ میں اپنے دالان کے اندر ماگھ پوس کی مہاوٹوں میں تبدیل کر لیتیں اور سب بچوں کو بار بار لو لگ جانے کا خوف دلا کر آرام کی تلقین کرتیں' اور پکڑ کر بند کر لیتیں تو ان کی اک ذرا آنکھ لگتے ہی بلکہ پہلے ہی خراٹے پر ہمارا سرو دم قید کے اندر دم سا گھٹنے لگتا اور ہم نہایت فن کار قسم کے قیدی کی طرح فرار ہوتے اور ہمارے پیچھے پیچھے نواب میاں ننگے پاؤں پنجوں کے بل اور تا حد نظر گرم تپتے ہوئے ماحول میں پہنچ کر ہمیں اک ذرا اطمینان کا سانس آتا۔ جہاں صالح' مجتبیٰ' احمد جان' وحیدا' نھوا' کلوا' نھا' اپنے خاندان اور بستی کے کسان مزدوروں کے

لڑکوں کی ملی جلی چکڑی ہمارے گھر کی جانب بار بار نگاہیں اٹھاتی منتظر ملتی۔ جس میں ہر ایک آزاد و بے لگام نشہ میں سرشار ہوتا اور کبھی تو باغوں کی طرف رجوع ہو کر چڑیوں کے انڈوں اور بچوں پر ریسرچ کی اسکیم بنتی' اور ساتھ ہی ساتھ کچی کیریوں پر ناشتے اور عصرانہ کا پروگرام چلتا۔ اور کبھی کبھی جنگل کی موہاریں توڑ کر موم اور شہد کی بالوشاہیوں پر' ورنہ بالعموم دھوبیوں اور کمہاروں کے آوارہ پھرتے ہوئے گدھوں اور ٹٹوؤں کی تسخیر ہوتی۔ اور بجز اغکر کے تھپیڑوں میں گھوڑے ڈال کر ہم داد شہ سواری دیتے۔ اور ساری دوپہری چڑھتے اترتے ایک دوسرے کو ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتے' اور پٹخنیاں کھا کھا کر اچھل کر چڑھتے۔ اور جب ٹھنڈا پڑجاتا اور دوپہری ڈھلے جنگل میں آدمیوں کی آمد و رفت شروع ہوجاتی تو نہایت اہتمام کے ساتھ ان کی دموں میں سوکھے ہوئے کانٹوں کا گٹھا باندھ کر اور دو ہاتھ پیچھے سے رسید کر کے اس تمام دن کے ڈرامے پر اس شیطانی نقل کے ساتھ ڈراپ سین کر کے چپکے سے گھر کو سرک آتے۔ جہاں ہمارے تمام دن اسی طرح لو اور دھوپ میں واہی تباہی پھرنے کے سبب اندر دادی اماں کے مزاج کا پارہ مئی اور جون کے "بیرومیٹر" سے بھی بہت اوپر چڑھا ہوتا۔ اور باہر بالعموم تمام دن کی روئیداد کسی دھوبی' کمہار کی نالشی آواز میں تایا ابا کے کان تک پہنچ چکی ہوتی' اور اندر سے باہر تک دادی اماں بیم مفروری کی اطلاع اور گرفتاری کے تقاضوں سے معاملہ کو ایک اور ایک گیارہ ویسے ہی بنا چکی ہوتیں اور شومئی تقدیر سے جب کبھی ہم باہر پکڑ جاتے تو ہم سے سخت جواب طلبی ہوتی۔ اور کبھی کبھی خاص اس طلبی کے دوران میں عین موقع واردات پر "موئے پہ سو درے" ہماری کوئی سواری جوں کی توں کانٹوں کا گٹھا دم میں گھسیٹتی خون میں لتھڑی اپنے بدنصیب مالک کی رہنمائی میں استغاثہ کرنے آمرتی۔ معاملہ ایک اور ایک اور ایک' ایک سو گیارہ سنگین کے ساتھ رنگین بھی ہوجاتا۔ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" صفائی کی گنجائش تو ہماری گرد آلود برگشتہ صورتوں میں بھی نہ ہوتی تھی اور پھر یہ عینی قسم کا ثبوت بغیر شہادت کے ہی بہت کافی ہوتا ہے۔ تایا ابا کی پر خشونت جھڑکیاں دیتی آواز میں اسے دیکھ کر رقت سی پیدا ہوجاتی۔ وہ معاذاللہ پکارتے۔ پھر ایک نظر یہ تمام انتظام کہ دم کے بالوں میں کس قدر کس کر ببول اور بیل کے سوکھے کانٹوں کا گٹھا باندھا ہے جس نے ٹانگیں' پٹھے اور پسلیاں اور اچھل اچھل کر پیٹھ تک بری طرح زخمی کردی ہیں۔ ایک سسکاری سی لیتے اور لاحول پڑھتے اور پھر فرماتے۔ "اور دیکھو تو بے ایمانوں نے کرایہ کتنا معقول ادا کیا ہے' چہ چہ چہ! بے چارہ بے زبان۔ خدا ہی سمجھے گا موذیو! توبہ توبہ!!" اور پھر ہماری جانب شعلہ ساں آنکھوں سے دیکھتے اور دانت کٹکٹاتے اور کوئی حاضر باش ندیم بالعموم امانت اللہ یا قاضی وقار اللہ' یا محمد عمر میں سے کوئی بڑبڑا پڑتا' "ہوں ارے ہم تو سو بات کی ایک بات یہ کہتے ہیں کہ سالے چھوڑ کیوں دیتے ہیں مرنے کے لیے' اور پھر روتے پھرتے ہیں کہ تمام دن رگیدا۔ اور تیسرے پہر کو دم میں جھانکڑا باندھ دیتے ہیں۔"

"ہوں!..... اور لونڈے تو لونڈے ہیں جھانکڑ نہ باندھیں گے تو کیا راتب کے توبڑے چڑھائیں گے۔" اور پھر ہم سے پر خشونت آواز میں مخاطب ہو کر کہتے۔ "جاؤ بھاگو جو پھر کبھی ایسا کیا تو تم ہی جانو گے۔" اور ہم دوسری ہی آنے والی صبح اور دوپہری میں خار و خشت کو ٹکوے کی کھجلی کا مژدہ سناتے دکھائی دیتے اور جھلتے

ہوئے میدانوں میں بگولوں اور بھوتوں کے درمیان اپنا میدان کار زار گرم کر دیتے اور تپتے ہوئے آسمان کے نیچے بالو کے جلتے ہوئے قلعوں کے زیر سایہ زندگی کی حرکت اور حرارت کے جوہر دکھاتے اور برسات شروع ہونے پر بستی سے ملحق تالاب میں بانسوں پانی کے اندر غوطے لگاتے اور اچھل اچھل کر بار بار اس کا طول و عرض طے کرتے' ننھی ننھی مچھلیاں پکڑتے' کنول کے پھول چن چن کر لاتے سارسوں کے انڈے نکال نکال کر پوسٹ مارٹم کر کے دیکھتے' اور گھر پر دادی اماں اور تایا ابا' دونوں۔

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا

میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا کو بہ کو

اور اسی زمانے میں غلیل کے غلوں سے اڑتی چڑیوں کے بازو توڑتے توڑتے گھر کی مینار کا لگا ہارن مرغیوں کے پوٹے پھاڑتے اور مکان کے کواڑوں کے شیشے چکنا چور کرتے۔ اور کبھی کبھی جب طبیعت زیادہ موزوں ہوتی تو مسجد کے پیش امام کی گھٹی چندیا پر بھی ایک آدھ غلہ ٹیا دیتے۔ اور جب آٹھ نو سال کی عمر میں والد صاحب قبلہ باضابطہ سائنٹفک ٹریننگ دلوانے کے لیے اپنے کالج کی چھٹیوں میں گھر آتے وقت ہمارے لیے ہوائی بندوق اور چکردار زین لائے تو انھیں استاد شامت خاں چابک سوار اور استاد رضا خاں شکاری' دونوں کی زبانی یہ معلوم کر کے شاید سخت نا امیدی ہوئی کہ صاحب زادے بے دھڑک بارہ بور بندوق چلاتے ہیں۔ اور کچھ اپنے ہی اصطبل کے قاضی جی اور سمند خاں انگلش و آسٹریلین ویلروں کی ننگی پیٹھوں پر منحصر نہیں' بلکہ قصبہ اور ارد گرد کے گاؤں کا کوئی چھوٹا بڑا گھوڑا' خچر' ٹٹو ایسا نہیں ہے جس کی پیٹھ پر' دم اور سر دونوں جانب کو منہ کر کے بے لگام داد شہہ سواری نہ دے چکے ہوں۔ اور ہر سواری میں دو چار پنختیاں کھا کر اور فی الفور اچھل کر پھر سواری نہ لے چکے ہوں۔ چکر دار زین اور ہوائی بندوق کے کھلونوں سے بہت آگے کھیل چکے ہیں۔

اور اس سے کچھ پہلے سال میں دس پانچ مرتبہ بیک وقت قصبہ کے ہر کنوئیں میں پھٹی جوتیاں' کھجوڑے پلے اور گوبر پھینک کر جو بیس گھنٹہ ساری بستی کو پیاسا رکھا ہے اور ہم کو شوخ تر بنانے کے لیے عین اسی موقع پر پیاؤ اور چوپالوں کے گھروں میں شاشیدن کے مصدر کی عملی گردان کر دی ہے۔ اور دوسرے تیسرے پنگھٹ پر ہندو عورتوں کے گھڑے چھو کر ناپاک کر دینا اپنا محبوب مشغلہ تھا۔ اور نہ معلوم ایسے کتنے جرائم کی فہرست تایا ابا کے سامنے پیش ہوتی۔ مگر دادی اماں کے دوپٹہ کے دامن میں ہم کو اتنی مکمل پناہ تھی کہ ہمارے سنگین سے سنگین جرم پر تعزیر کا پنجہ تو درکنار پیشی کے پروانہ کی بھی رسائی ممکن نہ تھی۔ اور یہاں تک کہ "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد!" جب کبھی دادا میاں والی بھرتو بندوق کی بارود کی پوری پونڈ والی کپی ہاتھ آجاتی تو ہم نہایت فن کارانہ انداز سے داد آتش بازی دیتے۔ ترکیب کتنی سائنٹفک کتنی سادہ اور عام فہم تھی اور عمل کس قدر سریع اور مہیب کپی کی ذات کھول کر ایک پتلی لمبی لکیر کی شکل میں دور تک بارود بکھیرتے اور پھر کسی درخت یا دیوار کی آڑ میں محفوظ مقام پر کھڑے ہو کر اس سرے سے چنگاری دکھا دیتے۔ اور ایک آگ کا سانپ سا دوڑ کر کپی کے منہ میں گھس جاتا' پورے

سو فیر بارود کا ایک دھماکا' اور در و دیوار ہل جاتے۔ اور ایک مرتبہ کو ساری عمر کی شب براتوں کا ایک ساتھ مزہ آجاتا مگر یہ دھماکا تو اپنی غمازی میلوں سے کردیتا اور یہ تو گھر کے اردگرد ہی میدان سڑک یا باغ میں ہوتا تھا اور مزے آنے کے چند منٹ کے اندر گرفتاری' کن پکڑی سب ہی کچھ ہو جاتی اور گھر کے اندر ہمارے بال بال بچنے میں نذریں اترتیں' اور ہم کو آیندہ خطرے سے بچنے کے لیے تادیب ہوتی۔ مگر خطرہ تھا تو بارود کے لیے ہمارے لیے کیا خطرہ ہو سکتا تھا بھلا! اور شاید اسی لیے بارود زیادہ حفاظت کے ساتھ بند کر کے رکھی جاتی۔ مگر واہ ری بے غیرتی ابھی کل گرم کیے ہوئے کان ٹھنڈے بھی نہ ہوئے تھے کہ دوسرے ہی روز بے پوری ساخت کے بھرتو طمنچہ پر ٹوپیاں چٹخاتے سنائی پڑتی۔ یا کارتوس کاٹ کر اور بارود نکال کر رائفل اور بندوق کی بارودوں شعلہ کے رنگوں میں فرق دیکھتے ہوئے اور کل کے نیلے کان پھر سرخ کیے جاتے۔ سامان ڈبل لاک میں بند کیا جاتا۔ مگر ہماری دسترس سے کب باہر ہو سکتا تھا۔ دو تین دن بعد پھر ایک نہ ایک جدید تجربہ کر دکھاتے۔ اور یوں تو ہر روز' روز عید سے زیادہ شوخ اور ہر شب شب برات سے زیادہ درخشاں گزرتی مگر جب سچ مچ شب برات آتی تو ہم دو ہفتہ پیشتر سے نہایت اہتمام کے ساتھ تیاریوں میں لگ جاتے۔ جاں باز منچلے ساتھی سر ہتھیلی پر رکھ کر منسن پتاس پیستے اور جانوں پر کھیل کھیل کر پیدا کرتے' رنگین شعلہ والی بارودیں بناتے ہزاروں ہوائی ہوائیاں تیار ہوتی اور یہ سب کام مکان کے کسی دور افتادہ ویران گوشے میں گھر والوں کی نگاہ سے پوشیدہ نہایت خفیہ انجام پاتا جیسے کسی زمانہ میں بنگال کے دہشت پسند اپنی بم سازی کرتے ہوں گے۔ اور یہاں تک کہ ع

میرے فتنے جامہ عقل و خرد کا تار و پو

ایک رام پوری ساخت کی بندوق کی نال میرے ہاتھ میں پھٹی جس نے نال اور ہاتھوں کے درمیان رہنے والے فوراینڈ نامی پرزے کی لکڑی اور لوہے کو ریزہ ریزہ کردیا' اور تھوڑا گوشت میرے بائیں ہاتھ کا بھی لے گئی' اور یہ یوں ہوا کہ ایک تجربہ کے سلسلے میں جب ایک رات والد صاحب نے ذکر کیا کہ ولایتی کارخانوں میں جتنی بندوقیں بنتی ہیں وہ سب پہلے گورنمنٹ ٹیسٹنگ ہاؤسز میں ٹیسٹ کرنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں اور جب ٹیسٹ ہو جاتی ہیں تو بازار میں بھیجی جاتی ہیں۔ اور ٹیسٹ کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جس قسم کے بارود کے استعمال کے لیے بندوق بنائی جاتی ہے اسی بارود سے پوری نال بھر کر آگ لگا دی جاتی ہے۔ اور جب تقریباً" پچاس گنی بارود کی یک دم جھوک اٹھالیتی ہے تو بازار میں ڈھائی ڈرام یعنی ایک مرتبہ میں ایک کارتوس استعمال کرنے کے قابل سمجھی جاتی ہے' ہم نے خیال کیا کہ جب پچاس گنا بارود کی جھوک ولایتی ساخت کی بندوق اٹھالیتی ہے تو رام پوری ساخت کی نال تین گنی بارود کی جھوک تو ضرور اٹھالے گی اور تین کارتوس ادھیڑ کر اور تینوں کی بارود ایک میں ٹھونس کر اور اوپر سے ایک بارہ بور کی گولی اٹکا کر اپنے ہی کندھے پر تجربہ کر کے دیکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نال پھٹی مگر واہ ری سخت جانی' ابھی ہاتھ کی پٹی بھی نہ کھلنے پائی کہ زخمی ہاتھ پر ٹیک کر دوسری ولایتی بندوق سے مکان کی تیسری منزل پر کھڑے ہو کر اڑتے ہوئے کبوتروں پر داد نشانہ بازی دے رہے تھے۔ اور اس سے پہلے کتب کے میاں جی کی تمباکو نوشی کی بڑھتی ہوئی

طلب کو متوازن رکھنے کے لیے چلم میں لال مرچیں بھر کر پلائی ہیں جس کے خمار میں میاں جی نے ایسی ایسی فرمایشی درہ بازیاں کی ہیں کہ آج بھی جب پروائی چلتی ہے تو مرحوم کی جلاد شکل اللہ بخشے پیٹھ سے سامنے اچھل کر آجاتی ہے۔ خرید و فروخت کرتے وقت خوانچہ والوں کے خوانچوں میں تھوک دینا' لڑھکا دینا' اور کبھی کبھی لٹوا دینا خرید کے نرمس کا اہم جز تھا۔ اور اس کے دو سال ہی بعد جس دن پرچہ خراب ہوا اسی دن سر شام ہی مشن اسکول کے دفتر کا تالا توڑ کر امتحان کی بغیر لکھی ہوئی تقریباً "کوری کاپی نکال لی ہے اور بعد امتحان کی بھری ہوئی اس کی جگہ رکھ دی ہے اور جب اسکول کے چوکیدار نے پکڑا ہے تو وہ شاید ہاتھ تو اس لیے نہ لگا سکا کہ قوم کا بھنگی تھا اور ہم چھو جاتے' اور شور اس لیے نہ مچا سکا کہ ایک ڈانٹ پلا کر حلق بند کر دیا تھا۔

اور میرے والد مجھ کو اپنے عنوانِ شباب کے شوق کا کھلونا بنائے ہوئے تھے۔ جب گھر پر ہوتے تو لباس اور تربیت میں بڑی توجہ دیتے' شہر کے اندر ہر جلسہ اور پارٹی میں بھانت بھانت کے انگریزی لباس پہنا کر اور نہایت ہی شریف و نجیب شکل بنا کر لے جاتے جہاں ہم اپنے آپ کو اس بہروپ میں سمو کر نہایت ہی سنجیدہ نیک بخت صالح شریف النفس اور عقل مند اور سعید بچہ نظر پڑتے اور اپنے باپ کے اقتدار اور اپنے لباس اور صورت شکل کی وجہ سے حاضرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے' اور پھر اپنی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی سے مجمع پر چھا جاتے۔ اور یہ ۱۹۱۶ء کا دسمبر تھا۔ اور حکیم اجمل خاں کے متعلق ان کی قوم نے دعویٔ نبوت نہ کیا تھا اور وہ خالی حاذق الملک تھے۔ والد صاحب قبلہ کئی ماہ سے دہلی میں ان کے زیرِ علاج تھے۔ تایا صاحب قبلہ کے ساتھ انھیں دیکھنے دہلی گیا اور پہنچنے کے دوسرے روز والد صاحب اور تایا صاحب کے ساتھ حکیم صاحب کے مطب میں پہنچا۔ اس وقت والد صاحب نے مجھے ترکی ملاحوں کا لباس پہنا رکھا تھا جو شاید انھوں نے کریمین وار کی تصویروں سے دیکھ کر لکھنؤ کے مشہور ٹیلر رام لال اینڈ سنز میں نمونہ دے کر تیار کرایا تھا۔ حکیم صاحب کے مطب کا کاروبار جما ہوا تھا' اور جب حکیم صاحب والد صاحب قبلہ سے رجوع ہو کر حال وغیرہ سن چکے اور نسخہ میں ترمیم تنسیخ کر چکے تو میں نہایت آزادی سے اپنی نشست سے اٹھ کر ان کے قریب پہنچ گیا اور میں نے نہایت بے باکی سے سوال کیا...... "حکیم صاحب! ہمارے والد کو آپ کب اچھا کریں گے؟"

حکیم صاحب نے مجھ کو سر سے پاؤں تک پڑتالا پھر مسکرا کر والد صاحب کی طرف دیکھا۔ میری حکیم صاحب سے پہلی ملاقات تھی' مگر وہ شاید پہنچتے ہی سمجھ گئے تھے کہ میں کون ہوں' اور ذرا ٹھہر کر فرمایا۔ "بیٹا ہم علاج کرتے ہیں۔ اور اچھا خدا کرتا ہے۔"

اور یقیناً' میں اور کچھ' شاید کچھ قضا و قدر کے مسئلہ پر بولتا مگر تایا صاحب نے آنکھ سے اشارہ کر دیا' اور چپ رہا۔ حکیم صاحب نے شفقت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ پھیرا' اور بار بار والد صاحب کی جانب دیکھ کر ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہا' اس وقت میری عمر آٹھ سال سے کم تھی۔

اور میں نے چودہ پندرہ سال کی عمر میں پکھاڑا سے آسٹریلین ویلروں' اور عرب پونیوں کے ایک

ایک سواری میں اتنے اتنے کس بل توڑے ہیں کہ شام کو منزل ماندہ گروہ بے چارے تو دانا اور راتب چھوڑ گئے ہیں اور میں نے کم بخت ان سائیسوں کی بھی تکان کا کچھ کچھ اندازہ کیا ہے جو پو قدمے رکاب کے ساتھ ساتھ پوری سواری اپنے پاؤں پر دوڑتے رہے جب اپنی نیند تکان سے رگ رگ توڑ کر حرام کردیتی ہے۔

اور پھر ایک وقت آیا جب میں نے ہمہ وقت ٹکرا کر ریزہ ریزہ کردینے والی جبلت والے چٹان سے وحشی بھینسوں کے سنگین کھوپڑے پاش پاش کیے اور پھاڑتے' الٹتے جنگلی سوروں کے آہنی جبڑے ریزہ ریزہ کیے اور نیل سانبھر کی اچھلتی کودتی دیواریں ڈھائیں اور چشم آہو والی خوب صورت عینکیں چڑھائے ہرنوں چکاروں کی ٹانگیں ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اوپر دوڑتی ہوئی چھلانگوں میں بھر کس کیں' اور ہر سال سینکڑوں من گوشت جنگل سے بستی میں گھسیٹ کرلایا' اور ڈھیر لگوا لگوا کر بنوایا۔ اور لوٹتے وقت دیہاتیوں کو بوٹی بوٹی ہڈی ہڈی پر بیچ بیچ کتوں کی طرح لڑتے اور غرغش کرنے کا تماشا دیکھا اور آدم خور بھیڑیوں اور لکڑبھگوں کی کچلیاں جھاڑ جھاڑ کر اور کھالیں سونت سونت کر ساری عمران کے پوستین اپنے جوتوں سے مسلے' اور ایک انگریزی مقولہ ہے کہ ایک بلی کی سات جانیں ہوتی ہیں...... اگر ان تمام بپتخنیوں کو بھی اپنے اوپر بیتے ہوئے حادثات میں شمار کرکے اپنی سوانح حیات میں لکھ لوں جو پانچ سال کی عمر سے لے کر بارہ سال کی عمر تک گھوڑوں' گدھوں' خچروں کی پیٹھوں پر کھائی ہیں تو شاید اس بلی کے سامنے ہزار جانیں شمار ہوں گی' کیوں کہ اس زمانہ میں جمعہ نہاتے وقت غسل خانہ میں جب ہم خود غور کرتے تو بھی نہ بتا سکتے کہ کون سی چیخ کا نیل کون سا ہے اور کون سی سوجن کس چوٹ کی ہے۔ مگر ایک مرتبہ شکار میں ایک آدم خور نے اور ایک مرتبہ ایک زخمی سور نے اور ایک دفعہ آوارہ کتے نے مجھ پر چارج کیا۔ اور میں نے ہر مرتبہ اپنی جبلتی چابک دستی سے کام لیتے ہوئے کہربائی سرعت کے ساتھ ترکی بہ ترکی جوابی حملہ ہی کے زور سے اپنا ڈیفنس کیا۔ اور ایک مرتبہ نیل کے شکار میں ساتھ کھیلتے ہوئے میرے بہنوئی سے ان کی بندوق میرے پیچھے سے حادثاتی طور پر چل گئی اور گولی کا شعلہ داہنے کان کے محاذ سے تین چار انچ بچا ہوا رخسار اور آنکھ کو لپیٹ دیتا سن سے نکلا چلا گیا تو میں نے پلٹ کر وہیں ان سے ساری عمر بندوق ہاتھ میں نہ لینے کا عہد کرا کر چھوڑا (۱۹۳۱ء)۔ مجھ کو سانپ مارنے کا بڑا شوق ہے اور شاید غیر شعوری طور پر اس کی عملی شکل یہ ہے کہ میں نے سانپوں سے متعلق ایک ناول بازگشت لکھا ہے جو ہنوز محتاج اشاعت ہے اور غالباً" جو بندہ یا بندہ تمام سیزن میں سانپوں کو مارنے کے لیے اور سانپ مجھ کو مارنے کے لیے تلاش کرتے پھرتے ہیں' اور اس خطرناک شوق کے سلسلہ میں عمر میں دو ایک ایسے بھی حادثے سے دوچار ہوا ہوں کہ سانپ کے ساتھ لاٹھی بھی ٹوٹنے سے بچی' اور کبھی سانپ تو صاف گیا مگر لاٹھی کی خیریت گزر گئی۔

مگر بلی تیندوے سے بھی زیادہ سخت جان جب ثابت ہوئی جب شدھ کھدر میں لپٹے ہوئے لارڈ کلایو اور جنرل ڈائر کے نئے نئے دور جلال میں مجھ پر بغیر لائسنس ہتھیار رکھنے کے الزام میں گھر کی دو سو سنگین بردار تلنگوں نے تلاشی لی۔ مگر مسلسل نو گھنٹہ خانہ تلاشی لینے کے بعد گھر سے بغیر لائسنسی تو در کنار لائسنسی ہتھیار بھی برآمد نہ کرسکے اور اس کے بعد غالباً" بلی میں سات شیروں کی جانیں سمٹ کر جب

آئی تھیں جب مجھ پر ایک مرتبہ مزاحمت بکار سرکار' ایک مرتبہ اقدام قتل' ایک مرتبہ مداخلت بے جا' ایک مرتبہ ڈکیتی کا مقدمہ دائر ہوا۔ اور نہ معلوم کتنی مرتبہ بغاوت کی قسم کا الزام عاید کرکے محکمہ قیام امن اور پبلک سیفٹی آرڈیننس کے نوٹس جاری کیے گئے۔ (۱۹۴۷ء لغایت ۱۹۵۰ء)۔

میں نے غم نداری بز بخر کے لطیفہ کے مطابق درجن درجن ڈیڑھ ڈیڑھ درجن شکاری کتے پالے اور ان کے لیے گلہ گلہ بھر بکریاں' جن کے دودھ کی لسی کیلیفورنین اور افغان اور اینشلین اور ٹرکی باونڈوں کی غیر معمولی مغرور المزاجی اور رام پور باونڈوں کی شورش مزاجی کو اعتدال پر رکھتی تھی۔ اور ہر سال ان کے نوجوان پلوں کو "موتمار" کرنے کے لیے (چیرنے پھاڑنے کی تعلیم دینے کو) بیسیوں آوارہ بلیوں کے بچے جمع کر کرکے اور ان کے سامنے چھوڑ کر پھڑوائے۔ اور گلی کی پھرنے والی دودھ پلاتی آوارہ کتیوں کے پلوں کو مروا مروا کر اپنے شکاری پلوں کو دودھ پلانے پر لگانا ہر سال کا محبوب اور کامیاب مشغلہ تھا۔ اور یہاں تک کہ میری بیگم نے اس شوق کی شدت کے زمانے میں شاید کتوں کی نجاست سے متنفر ہو کر طنزیہ و مزاحیہ میرا لقب "خواجہ سگ پرست" رکھ دیا تھا۔

غرض ع۔ کھپ چکی ہے جس میں بارش' ڈس چکی ہے جس کو دھوپ' اور جب ساون بھادوں مل کر برکھا رت کا جشن شباب مناتے ہیں اور کل کائنات کو غرق آب کردیتے ہیں تو ع۔ فتنۂ محشر جلو میں اور قیامت در رکاب' چھ چھ آٹھ آٹھ گھنٹہ ایک رکاب گھوڑوں' کتوں اور برچھوں کے ساتھ' خرگوشوں' گیدڑوں لومڑیوں اور سوروں پر دھوتال برستے مینہ میں اسپ گشتہ اور سگ بستہ کے پورے زوروں سے بجلی کی طرح ٹوٹتا رہتا ہوں...... اور راجپوتانہ کے ریگ زار سے براہ راست اڑے ہوئے ریتے کا ہر ذرہ میری آنکھوں ناک کان اور حلق کی ہر نالی کا راستا اچھی طرح پہچان جاتا ہے۔ اور جیٹھ بیساکھ کی دوزخیں دوپہروں میں لپٹیں چھوڑتی زمین پر سارا سارا دن کالے ہرنوں کی "عمر بھر کی بے قراری کو سامان قرار" فراہم کرتا ہوتا ہوں۔ اور میں نے بہار کی صبح کی ابھرتی ہوئی مخصوص سنسناہٹ میں گاؤں کے قریب کے کھیتوں سے بھورے بھیڑیے کا وہ گریہ (رونے کی آواز) بھی سنا ہے جو نوجوان شباب زادوں کی فولادی رگوں میں گرم گرم خون کی روانی کو ست کردیتا ہے اور میرے خون میں بارہ سنگھے کی اس وحشت خیز ہوک سے بھی بارہا گدگدی پیدا ہوئی ہے جو شکار کیمپ کے بے در و دیوار سے کپڑے کے گھر میں لحاف کے اندر دبکے ہونے کے باوجود' صرف اپنی ہیبت انگیز صوتی کیفیت سے نئے شکاری رنگروٹوں کے سینوں میں ارتعاش پیدا کردیتی ہے اور مارچ اپریل کی بھائیں بھائیں کرتی جنگلی رات میں مچان پر سے شیر کے آنے کا وہ کھسکتا' رینگتا' کالا کالا سایہ چلتا انداز بھی دیکھا ہے جو اس ماحول میں شکاری پر بھوت کے قسم کا خوف طاری کرکے ہولا دیتا ہے۔

اور غالباً "سیدھی طبقہ زمہریر سے چلی ہوئی ہیت جب کائنات کو منجمد کردیتی ہیں تو وہ اکثر کسی ترائی میں جھیل کے کنارے شکاری کیمپ میں ہماری ہم نفس ہوتی ہیں اور ع

رزق را روزی رساں پر می دہد

ہر سال جاڑوں میں سائبیریا اور چین کے ٹنڈرراز اور کشمیر اور تبت اور مانسا کی جھیلوں اور دلدلوں سے عجیب عجیب قسم کے فلیور کا گوشت 'قاز' مرغابی 'کلنگ کے رنگا رنگ ریشمی پروں میں لپٹا ہوا اڑتا ہے اور ہزاروں میل ایک پرواز اڑ کر میری پلیٹوں میں آگرتا ہے جس کی لذت کو کام و دہن اگلے سیزن تک سیب کی قاش اور آم کی پھانک کے مزے کی طرح یاد کر کے چٹخارے لیتے رہتے ہیں۔ اور ہر خارِ صحرا میرے تلووں کو ہی نہیں پہچانتا ہے بلکہ پنڈلیوں رانوں اور کلائیوں تک سے خوب آشنا ہے' اور خارِ صحرا ہی پر منحصر نہیں جھیلوں کے پانی میں شیطان کی طرح پھیلی ہوئی کنسیلی اور خارش زا بیلیں بھی' اور ان کے سایہ میں بج بجاتی ہوئی جونکیں بھی جو پنڈلیوں کا خون پی پی کر انگلی برابر موٹی ہو ہو کر چھوٹتی ہیں۔ اور پنڈلیوں اور رانوں پر ہفتوں کیچڑپانی میں میلوں کی مسافت طے کرنے کی یاد اپنی میٹھی میٹھی خارش سے تازہ کرتی رہتی ہیں۔ اور گنے کی پتی کی دھاروں کی وہ خلشیں بھی "رگ رگ میں نیشِ شیریں" کا مزا دیتی ہیں جو بٹیر کے جال لگا کر ہانکا کرتے ہوئے جسم پر چاقو کی سی خراشوں کی شکل میں گل کاریاں کرتی ہیں۔

اور مفلس کی جوانی اور جاڑوں کی چاندنی ساتھ ساتھ دیکھنے میں آتی ہیں' جب ہم کرسمس کی انگلستانی قسم کی ہندوستانی راتوں میں چڑیا کے شکار کو نکلتے ہیں' اور اپنے پیر کتوں کو کنار (زکام) ہو جانے کے اندیشہ میں ساتھ لے جانا خلافِ احتیاط سمجھتے ہیں اور ان کے بجائے شکاری مزدور سوائی اجرت پر لے جاتے ہیں' اور جب فضائے بسیط میں اڑتی ہوئی بلند پرواز سائبیرین اور چینی قازوں کے بازو توڑ دیتے ہیں' اور وہ کٹ کٹ کر پانی میں گرتی ہیں تو یہ مزدور تلوار کی دھار کی طرح کاٹتے ہوئے یخ پانی میں پیر کتوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ اچھل کر جست لگاتے ہیں اور تھر تھراتے ہردوں کے گھنگھرو بجاتے ہوئے ہمارا شکار نکال کر لاتے ہیں اور گرمی میں دوڑنے کے بعد جس شدت سے کرے باونڈ ہانپتے ہیں اس سے زیادہ زور کے ساتھ یہ آدمی سردی میں کانپتے ہیں اور ہر ہر حرکتِ ارتعاش سے مجھ کو ایک ایک ڈراماٹی سانچہ بم پہنچاتے ہیں اور ہمارے اسپینیل اس وقت اپنے اون کے ڈھیر جیسے قدرتی لبادے پر ایک ایک روئی کی دبیز جھول اوڑھے کسی تاریک و گرم گوشہ میں محوِ خواب ہوتے ہیں اور ہم سب سوئٹروں اور السٹروں میں لپٹے اور بعض بعض دو آؤنس برانڈی پیٹ میں بھرے اسپورٹ کے نشہ کے ساتھ شراب دو آتشہ بنے ہوتے ہیں۔

اور اپنی زندگی کی دلچسپ ترین گھڑیوں میں سے طویل ترین مدت ۱۹۳۵ء کے اس موسم گرما کی ہے جو میں نے ڈاکٹر شادانی کے ساتھ بھیم تال کی جنت کہسار میں بسر کیا...... ع

سری راتیں نگاروں میں' مرے دن عیش خانوں میں

سارا سارا دن بھیم تال کی بلوریں سطح پر بوٹنگ اور مچھلی کے شکار کے دوران میں بوٹنگ کرتے وقت ڈاکٹر صاحب مریخ کے دورے سے نکل کر یک دم مشتری کے سایہ میں جا پڑتے اور سطح آب پر ان کی رنگین شاعری ان کے مخصوص خداداد لحنِ داؤدی قسم کے ترنم میں گونج اٹھتی تو ماحول ساکت ہو جاتا۔ جھیل کے تھپیڑے کہیں گہرائیوں میں چلے جاتے۔ میرے ہاتھ چپوؤں پر چلتے ہی چلتے جیسے سرور سا محسوس کرنے لگتے اور ہماری ولایتی ساخت کی کشتی اتنی سبک رفتاری سے تیرنے لگتی کہ پانی میں حل ہوتی معلوم ہوتی۔ عامر

میاں' اور نشاط بی بی (ڈاکٹر صاحب کے دونوں بچے) دونوں میرے دائیں بائیں دو کروبیاں نظر آتے' اور سامنے کی پشت پر بیگم شادانی شاعری کی یونانی دیوی۔ اور اس والہانہ کیف کو کہستانی فضائے ہفت رنگ جیسے خود بہ خود گنگنا کر توڑ دیتی اور ڈاکٹر شادانی کے نغمہ کے زیر و بم میں ایک وقت وہ آتا کہ ہر چیز ان کی لے میں لے ملا دیتی۔ اور "پہاڑ کی برکھا رت" سناتے وقت تو سچ مچ نور کی پھواریں سی پڑنے لگتیں۔ اور بیگم شادانی "سنوریتا" کے بجائے آسمان سے اترا ہوا مشتری کا مجسمہ معلوم ہونے لگتیں۔ اور ہماری کشتی کرہ ماہتاب کے کسی سیمیں سمندر میں کھیتی محسوس ہوتی۔ اور جب کبھی ڈاکٹر صاحب اور والد صاحب قبلہ کو فن عروض اور قواعد کی ڈنڈ بیٹھک اور کشتی میں لڑتی بحثوں سے اور شعر کی تقطیع کی سوکھی لکڑیاں سی توڑتی گفتگو سے تھک کر تکان اتارنے کے لیے میں کالے تیتروں' یا چکوروں کی آواز پر بندوق لے کر چتروں کی کان یا گھنے جنگل والی پہاڑ پر نکل جاتا تو یہ دونوں وہیں پر برآمدہ میں بیٹھے ہوئے اپنی بحث بھی جاری رکھتے اور اپنی اپنی دوربینوں سے میری نقل و حرکت بھی دیکھتے جاتے اور اشعار کے درمیان میری بندوق کے دھماکے سن سن کر محظوظ بھی ہوتے جاتے۔ اور ۴۸ء لغایت ۵۲ء وہ صبحیں جو جذبی کے ساتھ طلوع ہوتی رہیں۔ اور اختر انصاری کے ساتھ غروب اور ۱۹۴۰ء کے بعد قلمی زندگی میں وہ بہت سی جنگلی بھن بھناتی راتیں بھی جن کے دن شکار میں کٹے اور پھر جن کی حدیں افسانہ نگاری کرتے کرتے دوسری صبح سے آملیں' اور صبح کے ڈانڈے شکار کی دوڑ دھوپ میں شام سے مل کر افسانہ نگاری میں غائب ہو کر مجھ کو "مشقِ سخن اور چکی کی مشقت" کی زنجیر کے سپرد کر گئے۔ اور اس سے پیشتر برسوں وہ گرما گرم دن جو رضا خاں شکاری استاد کے ساتھ' درید و برید شکست و بہ بست میں زندگی کو حرکت سے اور حرکت کو زندگی سے ٹکرا کر جلا دینے میں بسر ہوئے' اور وہ سہانی کٹتی ہوئی راتیں جو ان کے ساتھ شعر و نغمہ کے آبشاروں میں نہاتے ہی نہاتے جل ترنگ بجاتی نورانی صباحوں میں چمک اٹھتیں۔ آج بھی عمرِ مسیح و خضر پر خندہ زن ہیں۔

غرض۔

بے تابیاں سمیٹ کے سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو مرا دل بنا دیا

اور وہ اس جہاں کا باسی ہے

جہاں قوم کو سر چھپانے کے لیے تنگ و تار گور جیسے جھونپڑے بھی نہیں اور بد قوے عالی شان جگمگاتے محلوں میں بستے ہیں۔ جہاں بندروں کو چنے چبانے اور چیونٹوں کو شکر چٹانے اور کوؤں کو بھات کھلانے اور سانپوں کو دودھ پلانے کے لیے اندر مہاراج کالی کالی گھٹائیں اٹھاتے ہیں اور سیہ کار تاجروں کی کوٹھیاں اور تجوریاں بھرنے کے لیے دھرتی ماتا کی چھاتی جل تھل بھر دیتے ہیں اور خدائے اعظم برہما ہندوستانی دواخانہ دہلی میں' کشتہ طلاء کلاں پھونکتے پھونکتے اور امریکی ڈالر پر تہ بہ تہ طمع کاری کرنے کے

لیے طبقات ارض کی تاریک کانوں میں سونے کی کیمیا گری کرتے ہیں۔ جہاں کی قبریں ریشم کے غلافوں میں لپٹی جاتی ہیں اور آدمی ستر پوشی کے لیے پتا تلاش کرتا پھرتا ہے۔ جہاں پستہ بادام ہون کنڈ میں جلایا جاتا ہے۔ اور چنے گیہوں کو پستہ بادام کے بھاؤ پر لانے کے لیے زمین کی تاریکی میں بند کیا جاتا ہے اور بھوک اور فاقہ کے ہیضہ اور طاعون کی وبا میں جب ہر دانہ جواہر' جواہر مہرہ خطائی اور "امرت دھارا" خواص کا حامل ہو جاتا ہے تو دوا کے طور پر باہر نکالا جاتا ہے۔ جہاں پرانی دنیا چھوڑ نئی دنیا تک نٹوں کی طرح خالی پیٹ کا ڈھول بجا بجا کر اور بھانڈوں کی طرح دانت نکال کر دو دو دانہ بھیک کا توشہ جمع کرنے کے بعد بھی بھوکے پیٹوں کی آواز ۳۰۳ کے تڑاخے سے دبانی پڑتی ہے اور تقسیم رزق میں مقدار اور تعداد کا توازن برقرار رکھنے کے لیے میکائیل عزرائیل کی مسیحا نفسی سے اکتسابِ قوت کر کے روٹی کا سوال گولی کھلا کر حل کرتے ہیں۔ اور جہاں سویلین بہروپئے فری فوبیا کے جنون میں بکارِ خویش ہشیار مین پاور موبلائزیشن کی بنیادی تحریک کے نام سے مزدوروں میں سو سالہ پرانا بے گار کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

جہاں کا مفتی ایک پیالہ قورمہ کے بدلے انسان کا لہو حلال ہونے کا فتویٰ دیتا ہے اور جہاں کا قاضی چند روپہلی ٹھیکریاں اجرت پا کر سولن کی لاش در عدالت گھسیٹتا ہے اور جہاں کے بیمار ایک ایک گرین کونین اور دو دو پتے بنفشہ کے لیے ایڑیاں رگڑتے ہیں اور جہاں کے ہسپتالوں کا سول سرجن سول لائنس کے بازوؤں کی عالی عصبیت کو وٹامن کے انجیکشنوں کی پوری اے' بی' سی' ڈی سے قوت دے کر ڈسٹرکٹ جیل کے معمل میں ان کے ہائی ڈروفوبیا کے جراثیم کلچر کرنے جاتا ہے تاکہ حکومت کے کلبی جنون کی بماریں زنجیر کا تسلسل سولین عہدہ داروں میں وبا کی طرح پھیلتا رہے اور ان کا ظلمہ عوام کو بدستور وارن ہسٹنگیز والے دانتوں سے بھنبھوڑ کر نت نئے گل کھلاتا رہا ہے۔

جہاں فن کار کا قلم صفحۂ قرطاس پر چلتے چلتے پکڑ کر تختۂ دار پر چڑھا دیا جاتا ہے' اور زندہ بھی نہیں مردہ ادیبوں و شاعروں کی ہڈیاں قبر سے اکھیڑ اکھیڑ کر تختہ دار پر لٹکائی جاتی ہیں۔ اور جہاں اردو کا جادو سر چھوڑ زبان پر چڑھا اس ٹھاٹ سے بولتا ہے کہ اس کی مخالفت بھی اسی میں کر کے جس شاخ پر بیٹھے ہیں اسی کو کاٹنے کی منہ بولتی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ جہاں دیوِ حکومت کے آہنی پنجہ سے صحافت اور خطابت کے گلے گھونٹ گھونٹ کر دونوں بے چاروں سے معاہدہ لکھوایا جاتا ہے ع "میری زباں جلا دو گر اف کروں زباں سے" اور اگر اک ذرا گرفت سے نکل کر کوئی منصور انا الحق پکار اٹھتا ہے تو دار سنگین پر کھنچا دکھائی دیتا ہے اور جہاں ضرورت مند اہل قلم کے مسودات دولت مند ناشر اس طرح ٹٹول ٹٹول کر پڑتالتا ہے جس طرح بھیڑوں کی منڈی میں ہر قصاب بھیڑ بکریوں کے بالوں میں ہاتھ گڑا گڑا کر تخمینہ کرتا ہے۔ اور جہاں نما افسر محنتی کلرک پر اس طرح سوار ہو جاتا ہے جیسے اپنی گلی میں بڑا کتا کمزور کتے پر۔ جہاں تعلیم کے اخراجات برہمن کلاس کی استطاعت سے باہر ہو کر دیوتاؤں کی حیثیت تک پہنچ چکے ہیں۔ جس سرزمین پر علم جہالت کی تاریکیوں میں پناہ لیتا ہے' اور جہالت علم کے اسکرین پر ناچتی ہے' جس کی لغت میں جذباتیت کے معنی تدبر لکھے ہوتے ہیں اور جس کے کوڈ میں پختہ کاری کی کمینٹری جرم ہے' جس جگہ سڑے گلے پھونس

کے ڈھیر کا نظام ہمالیہ اور بندھیا چل کی طرح اٹل نظر آتا ہے اور جس کے تاج محل اور اجنتا چور بازاری اور استحصال بالجبر ہیں' اور قطب مینار اور پنھورا لاٹ بھوک اور فاقہ!..... جہاں آدمی کا خون شیر مادر ہے اور رشوت پاک تبادلہ۔ جس کے قمار خانے عدالتیں ہیں اور عدالتیں نیلام گھر۔ جہاں کے مکتب کا نصاب غلامی اور جیب تراشی کی تعلیم دیتا ہے اور چار دیواری کی تربیت توکل اور قناعت کی افیون گھٹی میں ڈالتی ہے' اور جس کا چرچ منافرت اور فساد کا خمیر اٹھاتا ہے جہاں دوسروں کے نوشتہ تقدیر مٹا مٹا کر اپنی تقدیر میں لکھ لیے جاتے ہیں جس کا انڈسٹریل ٹروس اور فیکٹری ایکٹ مزدور کو مشین کے چکر میں لوہے کے پرزوں کی طرح فٹ کر کے بھول جاتا ہے اور لینڈ ریفارم ایکٹ ایگری کلچرسٹ ریلیف ایکٹ بھوکے کسانوں کو رومن غلاموں کی طرح مٹی میں ملا کر چھوڑتا ہے' جس کی جمہوریت کے پردوں میں سے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی دراز دستی کے بل پر چند کے حق میں آئین وضع ہو کر نکلتے ہیں اور جہاں کی مجالس آئین ساز محتاجوں کی جیبیں کترنے کا اور کم زوروں سے محنت لینے کا ضابطہ بناتی ہیں۔ جس سرزمین کا جغرافیہ قینچی کے پھلوں سے مرتب ہوا ہے اور تاریخ سنگین کی نوک سے لکھی جا رہی ہے غرض۔

زمینِ حشر فانی' کیا قیامت ہے معاذاللہ
مجھے اپنے وطن کی سی زمیں معلوم ہوتی ہے

وہ کیوں لکھتا ہے

یوں کہ بابائے افسانہ تو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ دیکھو یہ ہے کسان مزدور کی تاریک دنیا۔ یہ ہے سماج کے اجارہ داروں کی اندھیر نگری اور سیاست کے جاگیرداروں کا چوپٹ راج۔ اور آؤ تم بھی میرے ساتھ دیپک روشن کرو اور اپنی پرکاش سے بھٹکوں کو راستا دکھاؤ۔ بھولوں کی رہبری کرو اور ساحل سے بیٹھ کر رزم خیروشیر دیکھنے والا پریم چند ہر بھنور میں سے خیر کو ساحل کی راہ بتاتا ہے۔

اور اس کا مقتدی صدیقی! وہ تو خود ہی اس طوفان کا چڑھاؤ ہے اور خود ہی اتار اور آپ ہی تماشا اور خود ہی تماشائی۔ صدیقی سب کے ناسوروں کے ساتھ اپنی پٹیاں بھی ہٹا ہٹا کر جراحوں کو بدگوشت چھانٹنے کی دعوت دیتا ہے' اور خود اپنے سینہ کی نمائش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

کیوں اہل حشر ہے کوئی نقاد سوز دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے

اور اپنی دنیا کی سیر کی دعوت دیتا ہے آؤ ذرا دیکھو ہماری خوب صورت و خوش نظام دنیا۔ حکومت کے کلبی جتویوں' افسر شاہی گنڈوں اور سیاسی خنزیروں کی دنیا' بھنبھوڑتی' چچوڑتی' منکراتی الٹتی' ہزار سالہ طول غلامی کے مارے لتاڑے نوبو ہے سفارت کاروں اور اناڑی بے تال بے مردنگ کن سرے سیاست کار بھنڈیلوں کے ہاتھ لگی اندھے کی بٹیا اور یہ بھنڈیلے نوبو ہے سفارت کار نام' کرہ ارض کے عظیم نام کے جنت نشان جمہوریہ پر قابض اور دس کروڑ نفوس کو اقلیت کا نام دے کر دوزخ مقام و زندہ در گور کیے ہوئے معدوم۔

اور اپنے خطے کی سب سے بڑی اکثریت کا شبھ لقب ہری جن اور ہری کے ان بیٹوں کا ارزل شدر مقدر وہی جو متوفی اپنے قلم سے لکھ مرے ہیں مگر گنتی کا میزان بشرح صدر سب کا سب اپنے حق میں ہڑپ۔ جہاں چند جاگیرداروں زمین داروں کی گرجوں سے دھرتی ماتا کی چھاتی دہلتی ہے اور جس کی بازگشت بھوکے کسانوں کی انتڑیوں کی آوازوں میں قرقراتی ہے اور نوزائیدہ سرمایہ داروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی پچکاریوں سے مزدور کا نیا نیا چنڈو خانہ ابھی گرم ہے اور یاں سے واں تک سب کا سب مہاجن کی کال کوٹھری میں بند بھی کھاتوں کے اندر اپنے آپ چل کر بے ڈکار ہضم ہوتا رہتا ہے اور سود در سود کے افق تا افق پھیلے میدان میں منزل اصل کبھی نہیں آپاتی۔ جہاں جونکیں چوستے چوستے آدمی کے اندر اپنا وطن مالوف بنالیتی ہیں اور جوئیں چپٹے چپٹے اپنی گھیریاں اور گمندیں کھیندیں کر کر کے انسانی خون کی رو میں شریک و سہیم ہوجاتی ہیں۔ ہماری دنیا میں آدمی اور مشین' مشین اور آدمی کے درمیان من توشدی تو من شدی زوج و زوجہ والا راسخ سمجھوتہ ہے' اور لوہے فولاد اور گوشت پوست ہڈی کے درمیان آقا کنیز والا پیارا رشتہ۔ جہاں بہت سوں کے ہاتھوں چند کی جیبیں تو خیر خودکار انداز میں بھرتی ہیں لیکن چپکے چپکے انٹیاں بھی سرک سرک کر گرم ہوتی رہتی ہیں۔ کمین گاہوں میں دبکے بھیڑیے اور رنگے سیار بھی اپنا شکار اچھل کر دبوچتے ہیں اور دن دہاڑے در میدان تیندوے بھی جھپٹ کر ٹینٹوا پکڑ لیتے ہیں۔

ہماری دنیا میں دھڑدھڑاتے کارخانوں اور گھمر گھمر کرتی فیکٹریوں میں جنگل کا قانون چلتا ہے اور ہمارے جگمگاتے شہر نادریافت صحرا میں تاریک و غیرذی زرع چٹیل ریگ زار۔ دیکھتے ہیں تو ہمارے شہر آؤ اور اپنی شہریت دیکھو جہاں کے کلچر میں بابا آدم کے اگیری کلچر سے ترقی ہو کر قابیل کی عمل داری ہے اور ہابیل کی لاش بے گور و کفن ہے۔ اپنے کھیتوں کے ورقِ نقرہ کے لق و دق افق تا افق ملائے میدانوں پر توریث کے شہسوار اور روایات کے چابک دست' عوام کی کھوپڑیوں سے پولو کھیلتے ہیں اور کسان کے کاسہ سر سے چوگان بازیاں ہوتی ہیں۔ اپنے وطن کے سورج کے گرد اپنی سرزمین سونے کی کیلی پر گردش کرتی ہے اور بڑے رسان رسان شام کے ڈانڈے صبح سے اور صبح کی حدیں شام سے ملتی رہتی ہیں اور رات تو رات دن دہاڑے بھی اندھیریاں پڑتی ہیں اور جتھ پھیریاں ہوتی ہیں۔ آؤ سنو ہماری باتیں جہاں بولتی زبان خالص اردو میں بولتی ہے لیکن سبھے کان شدھ ہندی میں سنتے ہیں۔ اور آؤ دیکھو اپنا سرکس اغزال پاشکستہ کی معذوری کا تماشا۔ کیا بے کسی کا سناٹا ہے۔ جھپٹتے ہوئے گرے ہاؤنڈ کی راہ وفاصلہ رسائی' مڑ مڑ کر دیکھتی ہے اور ذوقِ حفظِ زندگی بھی کھو بیٹھتی ہے اور موت و زندگی کی دوڑ میں مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی دل ہی دل میں فیصلہ کرتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ تماشا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ راہ فرار مسدود اور دروازہ گریز' بند پاکر' یہ ٹوٹی ٹانگ ہرنی پلٹ پڑتی ہے تو بپھری شیرنی بھی ہوجاتی ہے اور تعاقب کرنے والے شکاری کے منہ پر اپنے زخمی پنجہ سے لپوتا رسید کرتی ہے تو ایوان تاریخ کی کتاب کا شیرازہ' ورق ورق بکھر جاتا ہے اور مورخ لکھتے لکھتے بڑبڑا اٹھتا ہے ع ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ گرا میں' اور آج اپنے شعور کے نہاں خانہ سے شمع تاریخ کی لو پیچھے سے منعکس ہو کر اگلوں کی "بیتیوں' ہونیوں" کا اسٹیج سامنے کردیتی ہے تو

خاموش بائسکوپ والے سینما اسکرین کی طرح گھور اندھیرے میں کاٹ ابھرتے ہیں اور نوشتۂ تقدیر کی صورت ماضی اور مستقبل کا مقدر سامنے آتا ہے۔ ہم ہیں تاریخ کا جواب۔ ہم ہیں معاشرہ کی آبرو اور آج ہم ہیں مکافاتِ عمل کی بے کسی۔ اور تاریخ کی گالی..... اسکین پر رہ رہ کر جگمگاتا ہے۔ اور آج تمہارے انجام و نتیجہ اعمال کے پینٹ اندھیرے کے سہارے دس کروڑ کی گنتی بے گنتی بے شمع امید جلائے بیٹھے ہیں اور اس چنگاری کے وعدہ مقدس کے منتظر ہیں جو تم جیسوں کا وہی مقدر چلی آتی ہے اور ظالموں کا مقسوم ازل ہے۔ آج اپنی بلا جوئے شیر خالی تیشہ و سنگِ گراں ہی زندگی عبارت ہے اور اسی لو کے سہارے اپنا تاریک عقوبت کدہ صبح درخشاں ہے کہ۔

شود ظالم بہ ظلم خود خراب آہستہ آہستہ
رود از دشنہ قصاب آب آہستہ آہستہ

دل کے کونوں کھدروں سے رہ رہ کر کہربائی تڑپ سی بھڑک اٹھتی ہے اور چھاتی کے بیچوں بیچ ایک چراغ سا روشن ہے جس کی حرارت سے یہ جسدِ خاکی مرمریں حمام بادگرد کی طرح گرم ہے اور مستقبل کا ظلمت کدہ جفائے یارانِ وطن کے دم قدم سے کھلی کتاب ہے' آئیں ذرا پڑھیں کارگاہ حیات کا چکر چکر' زندگی کا شوشہ شوشہ' نکتہ نکتہ منجم کی کتاب کی طرح لفظ بہ لفظ واضح پڑھنے میں آئے گا۔ اب چچا غالب کے میزان میں شاید ع

اس سال حساب کو برق آفتاب ہے

اور بابا اقبال کے بہ قول دیار مغرب کے بعد اب دیار مشرق کی باری ہے اور ہماری تہذیب اپنے خنجر سے خود کشی کرے گی چناں چہ۔

کہانی اپنی روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اس کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اور آج نو صدی بعد استاد داغ دہلوی کی طرح ہم پر بھی یہ عقدہ کھلا کہ ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستان سے دور۔ *

☆ ○ ☆

* عارف پور نوادہ و داراب نگر ضلع بدایوں' بھیم تال و گیٹھا ضلع نینی تال اور علی گڈھ یونی ورسٹی ضیاء الدین کمپاؤنڈ' میرس روڈ' ۴۶ء لغایتہ ۵۳ء قیام ہندوستان کی آپ بیتی و جگ بیتی' بھری بھگتی' آنکھوں دیکھی کے تاثرات' جب اپنا پانچ سو سالہ قدیم آبائی وطن چھوڑ کر علی گڈھ یونی ورسٹی اریا اور ضلع نینی تال کے دیہاتی کہستانی نامعلوم سے مقامات میں کانگریس حکومت اور آفیشل گنڈہ گردی کے ہاتھوں وقت وقت روپوش سا رہا۔ علی گڈھ میرس روڈ پر خانہ بدوش سا تھا اور نیم مستقل سکونت۔ بیٹے اور بیٹیاں یونی ورسٹی اور گرلز کالج میں زیرِ تعلیم تھے اور میں کبھی عارف پور نوادہ مضافات بدایوں' کبھی میرس روڈ ضیاء الدین کمپاؤنڈ کے مکانوں میں کھلے قلم ہاؤس اریسٹ سا۔ یونی ورسٹی کے سرکاری ادارے انجمن

حلقہ ارباب ذوق، حلقۂ اربابِ...

حلقۂ الشعرا اور انجمن اردوئے معلی وغیرہ سب کے سب یونی ورسٹی کی انجمن ترقی پسند مصنفین میں ضم ہو گئے تھے۔ پڑھ کر ایک اچھی بھری محفل میں سنایا' جیسا کہ دستور ہے مثبت منفی تنقید سے نوازا گیا۔ اس زمانے میں دہلی اور بمبئی سے کئی اور ایک کانپور سے معیاری ادبی جریدہ نکلتا تھا' ہر جگہ نقول ارسال کیں' لیکن کانگریس حکومت کا دور جلال تھا' کسی کی ہمت اشاعت' بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی نہ ہوئی' بلکہ مسلمان بھائی مدیران نے ایسا لکھنا تو درکنار یوں سوچنا بھی خلاف مصلحت سمجھ کر نصیحت فرمائی۔ ۵۳ء میں ہجرت کی تو اس مسودہ کو بھی دبا لایا۔ اب حاضر خدمت ہے' گر قبول افتد......

دستخط ابوالفضل صدیقی

☆ ☆ ☆

ابوالفضل صدیقی کے خطوط
ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام

(۱)

نواب شاہ
23-2-62

برادرم' سلام مسنون

آپ کا ملفوف کراچی سے چل کر یہاں ملا۔ حالات کا آپ کو پہلے سے بھی کچھ کچھ اندازہ ہے حالاں کہ میں سمجھتا ہوں کہ جتنا اندازہ ہے اس سے کہیں زیادہ شدید ہیں۔

میاں ایک مرض کا نام سنتے چلے آئے تھے جوالبقر اور ایک بیماری جوالکلب سننے میں آئی تھی۔ اول الذکر میں مریض گائے بیل کی طرح پُرخور ہو جایا کرتا ہے اور آخر الذکر میں خواہ کتنی ہی مرتبہ کیوں نہ کھائے احساس اشتہا تسکین نہیں پاتا۔ ادھر چند سال سے ایک وبا پھیلی ہوئی ہے جس کو جوالارض کہتے ہیں اس میں مذکورہ بالا دونوں بیماریوں کی علامات یک جا ہوتی ہیں اور بفضلہٖ' اس میں اپنی پوری قوم مبتلا ہے اور چوں کہ میرے اندر اس کے جراثیم توریثی تھے لہٰذا میں بھی اس کے اندر لپٹ گیا۔ حالاں کہ ایک مرتبہ معالجین نے ایسا علاج کردیا تھا کہ "مرض رہے نہ مریض" لیکن نہ معلوم کس مصلحت کے تحت ظالموں نے آکسیجن چڑھادی کہ سسکنے لگے اور جب تک سانس آئے چلا چلا کر مارتے ہیں' مار مار کر چلاتے ہیں اور نہ مارتے ہیں نہ جلاتے ہیں' حالاں کہ اب اپنی نوبت یہ ہے کہ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی......

اٹھارہ ماہ سے آسمان زمین کے درمیان ٹنگا ہوا ہوں' اور جیسے عالم برزخ میں قلابازیاں کھا رہا ہوں ...... تین سال ہوئے دھرتی ماتا کے آنچل سے ایک چسکی مل گئی تھی' اب ہونٹ چاٹ چاٹ کر پھر منہ ٹپکاتا ہوں اور بس اسی کا ہو کر رہ گیا ہوں کوئی کام ہی نہ کرسکا۔ کاغذ پٹواری کے خانے ہی پر نہیں کرلتے' بھلا کوئی سنجیدہ چیز قلم سے کیسے نکل سکتی ہے۔ تمھاری شکایت سر آنکھوں پر بھلا ایسے پیارے شاکی کاہے کو ملیں گے۔ مگر پیارے بھائی میں کیا کروں کوئی نئی چیز ابھارنا تو درکنار ایک دو بڑی اچھی چیزیں پڑی ہوئی ہیں

بس اک ذرا نوک پلک درست کرنا ہیں، مگر اس کے لیے بھی یہاں طبیعت حاضر نہیں، لہٰذا اگر تمھارا ہفتہ ہمارے اسی نظام شمسی والا ہفتہ ہے تو معذرت خواہ ہوں لیکن اگر "نیا دور" والا ہفتہ ہے جس کا ناپ غالباً چچا غالب والے سال سے لیا گیا ہے جس میں "تم سلامت رہو ہزار برس" تو یقین رکھو کہ کچھ حاضر کردوں گا۔ ابھی تک تو یہی پتا نہیں کہ یہاں نواب شاہ کب تک قیام کرنا پڑے اور کتنی مصروفیت رہے۔

خدا کرے ثنا اللہ بہ خیریت پلٹیں، اخبار میں تصویر دے دو اور انعام کا اعلان کردو، آدمی خوش رو ہیں کہیں کہانیوں والے شہزادہ کی طرح پریاں اڑا کر نہ لے گئی ہوں۔

دھارا کا تراشا نہیں پہنچا۔ بعد میں کراچی آؤں گا ملنے کی کوشش کروں گا۔

تمھارا بھائی
ابوالفضل صدیقی

(۲)

IV-F-4/7
ناظم آباد کراچی۔ ۱۸

۱۹ر اگست ۱۹۷۱ء

میاں! خط ملا۔ عین انتظار میں۔ تنہائی اور بھی گہری ہوگئی، گھر کے اندر سے شاہد اور باہر سے تم ہفتہ بھر کے اندر اندر رخصت ہوگئے۔ تمھاری نیلی مورس دروازہ سے نکلنا بند ہوگئی، اور میری سفید مورس دروازہ پر چپ چاپ کھڑی ہے۔ دائرہ اندر اور باہر ہمیشہ سے محدود تھا شمیم نے کچھ عرصہ سے عدم دلچسپی جیسا رویہ اختیار کرلیا تھا اور جو کسر تھی پوری ہوگئی...... اس ماہ کے اواخر تک خیر سے شادی ہونا طے ہوچکی ہے۔ ویسے ارادہ کرکے غالباً میرے گھر تو وہ مدتوں سے نہیں آئے ہیں۔ محلہ میں حبیب وغیرہ کے یہاں آتے تھے تو شرما حضوری صدا لگا جایا کرتے ہیں۔ وہ مضمون میری تحویل میں ہے اس سلسلہ میں میں نے انھیں (شمیم کو) متعدد بار فون کیا تو بتایا کہ نسیم درانی ان کے پاس ادھر تو نئے نکلنے والے رسالہ کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر آتے رہے اور مشورہ کرتے رہے، اب ایک عرصہ سے نہیں آئے ہیں۔ آئیں تو انھیں لے کر سفارش کرتے اور مضمون حاصل کرنے میرے گھر آئیں۔ اس دوران میں ایک مرتبہ تنہا آئے بھی لیکن اس وقت تک نسیم انھیں نہیں ملے تھے، چناں چہ مضمون ہنوز میرے پاس ہے...... آپ

تخلیق کے کرب اور پھر ایسی تخلیق جیسی آپ کے اور ضیا جالندھری کے کیریکٹر اسکیچ ہیں کے خوب محرم ہیں۔ بڑے خوب صورت کھلونے بنائے ہیں، جنھیں پڑھ کر سب بہت محظوظ ہوں گے اور سب سے زیادہ میں خود۔ ان کی اشاعت میں تاخیر ہونی نہیں چاہیے تھی اور اب مجھے یہ التوا کھل رہا ہے۔ اس میں بہت کچھ آپ کی مصروفیت کو جو عدم دلچسپی تک پہنچ گئی، دخل ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ کام سرانجام کر کے گئے۔

مولانا صلاح الدین احمد والا کیریکٹر اسکیچ پچھلی یادوں کے مواد پر پھر شروع کر دیا ہے۔ اگر کاغذ اچھا مل گیا تو پھر سے لکھ لوں گا۔ وہاں صورت حال کیسی رہی، برادری نے پذیرائی کے کون کون سے بہروپ بھرے حالاں کہ نجیب الطرفین پٹھان ہو لیکن شیخ کی محبت نے فطرت کا کچھ حصہ پالیا ہے، رنگ اتنا پختہ ہے کہ چڑھنے کا سوال نہیں۔

ایک ضروری کام یہ ہے کہ ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا ایک مضمون جمیلہ بی علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ یونی ورسٹی سے متعلق لے گئی تھیں۔ پیہم تقاضوں کے باوجود انھوں نے واپس نہیں کیا تو پچھلی مرتبہ جب الطاف قریشی مدیر اردو ڈائجسٹ آئے تو میں نے ان سے کہا کہ ان سے بالمشافہ مل کر مضمون واپس لے لیں، انھیں اپنے رسالہ میں شایع کرنے میں دلچسپی تھی۔ لیکن وہ بھی غالباً" حاصل نہ کر سکے اس سلسلے میں جمیلہ بی کو بھی کئی خطوط یاد دہانی کے تحریر کیے، لیکن ایک آدھ کا جواب ملا کہ عنقریب روانہ کردوں گی بقیہ کا جواب نہیں ملا۔ آپ ان سے وہ مضمون واپس لے کر الطاف قریشی کو فون کردیں کہ آ کر لے جائیں۔ یہ ذمہ داری آپ کی ہے ورنہ مضمون غدر بود ہو جانے کا امکان ہے۔

مہینے پیچھے ایک خط کا تبادلہ ہو جایا کرے تو کیسا ہے۔ کیا خیال ہے؟ اس خط کے جواب کا ستمبر کے شروع میں منتظر رہوں گا۔ دلہن سے آداب گزرایے۔ بچے یاد کرتے ہیں دعا والسلام۔ نذر خاص طور سے سلام کہہ رہا ہے۔

نیاز مند
ابوالفضل صدیقی

(۳)

IV-F-4/7
ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

۲۴ اکتوبر (۸ بجے شام)

میاں! ۲۰ر تاریخ کا مکتوب ملا۔ کراچی آمد کی خبر کے ساتھ علم فضل کی سرابندی کی تقریب سن کر

درِ دولت پر وفورِ مسرت میں مع نذر کے حاضر ہوا۔ اور بے نیل مرام واپس آیا۔ رات گئے تک میں اور دلہن منتظر رہے کہ آمد کی خبر سن کر ضرور آئیں گے۔ بہرحال رسمی اور گفتنی نہیں ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ مبارک باد دینے کو نہیں منھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ میں تو گراں ہائے مایہ ہی سمجھے ہوئے تھا یہ حضرت تو مخفی بھی نکلے۔ پھر اللہ اللہ یہ بھاری پن بھی یہ تو بارگاہِ علم و فضل میں سوءِ ادبی ہے کہ اس خط میں بھی اظہار نہیں کیا ہے' اور اس گہرائی کو دیکھیے کہ چار پانچ برس سے دبائے پڑے رہے۔ میری دعا ہے کہ ایسے ہی سہرے در سہرے بندھتے رہیں۔ اور تم اصل پر پلیٹ پلٹ کر ایسی ہی تاریخ سازی کرتے رہو' ڈاکٹر جمیل جالبی۔

نذر الحسن ٹھیک ہیں عنقریب آپ کو خط لکھیں گے۔ نسیم درّانی کے پاس نذر الحسن' شمس زبیری اور ان کے ایک شریک کار صاحب زادہ کے ذریعہ متعدد بار تحریکیں کرائیں کہ جمیل جالبی اور ضیا جالندھری والے مضامین لے جائیں لیکن صدائے برنخاست۔ لیجیے آپ کے خط سے مزید معلوم ہوا کہ آپ کو بھی ملے تھے۔ اور ابھی تک اتنا بھرم اللہ تعالیٰ نے بنائے رکھا ہے کہ کسی ایڈیٹر کے دروازہ پر مسودہ کا خوانچہ لگا کر صدا نہیں دی ہے' اور یہ بھی آرزو بفضلہٖ باقی ہے کہ کوئی مسخرہ ایڈیٹر کوئی چیز واپس کردے۔ اور اول درجے کے ایڈیٹروں کو چالیس سال سے بھگتا رہا ہوں' سمجھ کام نہیں کرتی کہ کیا راز ہے' ان دو مخصوص تحریروں کے متعلق......

ساتھ ہی ساتھ میں نے سنا ہے کہ ادبی پرچوں کے لیے نیوز پرنٹ بھی نہیں مل رہا ہے' ایک ساتھ ستر صفحہ کا ماہنامہ نوعیت کا پرچہ "الفاظ یا حروف" نامی نسیم درّانی نے نکالا ہے' جس کی زیارت آج تک نہیں ہوئی' پھر یہ بھی سنا ہے کہ اشتہارات بالکل نہیں ملتے اور سب سے زیادہ معتبر بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ آج کل سیاسی حالات کے سبب "جیوڑا نکل گیا ہے۔" پڑھنے والے پڑھوانے والے اور شاید لکھنے والے اور لکھوانے والے سب کے سب شدید سیاسی خلفشار کا شکار ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کی نشست ختم ہونے پر بجائے ادبی بات چیت کے یہ ہی سیاسی موضوع چل پڑتا ہے۔ پتا نہیں کہ وہاں آپ کو ان چیزوں سے دو چار ہونے کے مواقع ہیں یا نہیں یا صرف اجلاس کی کرسی اور گھر کی مسہری و میز تک ہی محدود ہیں۔ میں نے پچھلے خط میں استفسار کیا تھا' لاہور میں آپ کا سوآگت کیسا ہوا اور آپ کی روٹی کیسے ہضم ہوتی ہے' کیوں کہ بغیر قلم چلائے آپ کو تخمہ ہو جاتا ہے۔ جمیلہ بی تو ہفتے میں ایک آدھ بار ملتی ہی ہوں گی اور کن کن لوگوں کے ساتھ گزرتی ہے؟ جمیلہ بی کو میری دعائیں اور ان کی ننھی منی بیٹی کو پیار اور سردار صاحب کو سلام پہنچا دیں۔

میری تندرستی بہتر ہے۔ وہ ہاتھ کا درد کبھی گھٹ جاتا ہے کبھی بڑھ جاتا ہے' نیند بدستور کم ہے اور اشتہا بالکل مفقود تاہم جی رہا ہوں۔ پچھلے ماہ کے اواخر میں ضیا سرکاری کام سے [illegible] میرے لیے ولایتی کاغذ لائے ہیں۔ لکھنے بیٹھا تو مدتوں بعد لکھنے کا مزہ آگیا۔ [illegible] تھا۔ کاغذ دیکھ کر کچھ ہمت بڑی دس بارہ صفحے یک قلم سر سرا کر نکل گئے لیکن اب [illegible]

مشورہ کا محتاج ہوں۔ شمیم احمد نے آنا جانا بالکل چھوڑ دیا ہے اور بجتی ہونا بھی چاہیے۔ ٹیلی فون پر جھوٹے سچے وعدے کر رہے ہیں پھٹکتے نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ گہری آزردگی ہے۔

دلہن کو میری دعائیں کہہ دیجئے اور فرحا کو خوب بھینچ کر پیار کر دیجئے۔ خاور کا داخلہ وہاں کس کالج میں کرایا ہے؟ دعائیں۔ اب کراچی کب تک؟ شاہد کوئٹہ میں۔ زینت دلہن سلام کہتی ہیں اور مٹھائی مانگتی ہیں۔ مبارک باد کا پان لیے اس روز رات گئے تک منتظر رہیں۔ اب مبارک باد بھیج رہی ہیں۔

جواب مفصل دیں۔ اور مہینہ پندرھواڑے اگر کوئی موضوع نہ بھی ہو تو بھی ایک کارڈ ضائع کر دیا کریں' ہم دونوں ہے نا؟ فقط والسلام

آپ کا بھائی
ابوالفضل صدیقی

(۴)

بیت القدس
IV-F-4/7 ناظم آباد

۲ر دسمبر ۱۹۷۱ء' کراچی

برادر عزیز سلام مسنون!

جواب محبت ملا' لیکن اتنے دنوں بعد کہ جس سرور کے تحت لکھا تھا اس میں دھیما پن پیدا ہو چکا تھا' تاہم مہمیز ہو گیا۔ خان صاحب ظہیر خاں کے یہاں عید ملنے گیا تھا' بر سبیل تذکرہ معلوم ہوا کہ خاور میاں سلمہ' آئے ہیں۔

تمہارا اور ضیا جالندھری کا اسکیچ ہنوز دونوں مسودے میری تحویل میں ہیں' سمجھ کام نہیں کرتی کہ کس نوعیت کی منافقت کام کر رہی ہے۔ بہرحال چالیس سال کے قلمی تجربہ میں پہلی مرتبہ دوچار ہوا ہوں' اور مفت میں' تمہارے خواہ مخواہ شرما جانے سے' قلم اپنا اور رسالہ اپنا اور دونوں ہی ایک سے ایک بڑھ کر۔ اور میری کسی بھی تحریر کے متعلق جو "نیا دور" میں چھپے گی' کوئی مسخرہ کہہ بھی کیا سکتا ہے۔ جب سے "نیا دور" نکلا ہے' تین اشاعتیں چھوڑ کر ہر شمارہ میں دھرا ہوتا ہوں' پھر جمیل جالبی اور ضیا جالندھری یا کسی کے بھی متعلق لکھنے کے لیے کہاں جاؤں مجھے وہ لونڈا نہایت چھچھورا' اتھلا اور علمی اعتبار سے بہت سطحی نظر آتا ہے۔ موٹا سا رسالہ نکال لینا اور بات ہے' پنجاب میں تو اچھے سے اچھے ایڈیٹر کی پہچان یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ کم علم اور ڈفر ہو۔ غور کیجئے شمس زبیری اور نذر نے تحریک کی تو پہلے دونوں مضمون منگائے اس کے بعد پیہم تحریکوں کے بعد بھی لینے نہیں آیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ سیاسی انتشار کا سبب بھی

ہو سکتا ہے' تاہم ادبی رسائل نکل ہی رہے ہیں۔

سیاسی انتشار پر یاد آیا' پچھلی عید پر جو تم نے دو سیاروں کی ایک دوسرے کی کشش کے ذریعہ چلنے والی بات کہی تھی وہ جب سے اب تک خون میں رچی ہوئی ہے اور اب تو کسی کسی وقت کالے سانپ کے پھن کی طرح روح پر ضرب مارتی ہے۔ اللہ خیر کرے۔

باقی سب حالات بدستور ہیں۔ زینت سلام کہتی ہے۔ شاہد کوئٹہ ہیں۔ اس ماہ کے وسط تک چند روز کے لیے آنے کا ارادہ ہے۔ جواب جلدی جلدی لکھتے رہا کیجیے۔ دلہن کو دعائیں۔ فرحا کو پیار۔ باقی تینوں بچوں کو پیار فقط

تمہارا

ابوالفضل صدیقی

(۵)

IV-F-4/7 ناظم آباد

کراچی

7-3-72

برادر عزیز سلام مسنون

بہت عرصہ سے خط و کتابت بند ہے جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے ہی آپ کے اس خط کی رسید نہیں دی جس میں آپ نے کیریکٹر اسکیچ کے مسودات فقیر محمد ملازم کے حوالہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ آپ کو جعفری صاحب کے خط کے ذریعہ پتا چلا تھا کہ وہ مسودات میں نے خود جا کر جعفری صاحب کے حوالے کیے۔ فقیر محمد کے بس کا روگ نہ تھا اور میں تو صرف جعفری صاحب سے بھی مطمئن نہیں ہوں' میرا جی چاہتا تھا کہ بالمشافہ کاتب صاحبان کو سمجھا کر حوالہ کرتا۔ چناں چہ اسی خواہش کے تحت میں نے جعفری صاحب کو تاکید کی تھی کہ کتابت کے دوران کاتب صاحبان میرے پاس آتے جاتے رہیں تاکہ اغلاط کم سے کم ہوں' ورنہ پھر ہم دو پر غیر معمولی محنت پڑتی ہے اور کتابت بھی خراب ہوتی ہے۔ ویسے یہ کاتب برادران میری تحریر کو کافی کام یابی کے ساتھ پڑھتے ہیں' لیکن پھر بھی اتنی نہیں کہ ان پر اطمینان کے ساتھ اعتماد کر سکیں۔ میرا ارادہ ہے کہ دو ایک روز میں جعفری صاحب کے پاس جا کر دریافت حال کروں اور کم از کم تھوڑی کتابت دیکھ لوں۔

آپ کراچی کب آ رہے ہیں؟ حلقہ میں کبھی کبھی ڈاکٹر احسن فاروقی آتے ہیں ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ "نیا دور" سے انھوں نے اپنی دلچسپیاں ہٹالی ہیں۔ کچھ اس طرح کی بات کر رہے تھے کہ جیسے

شدہ ترتیب میں جمیل صاحب نے میری مرضی کے خلاف ردو بدل کیا۔

میرے لیٹر ہیڈ ختم ہو گئے ہیں۔ آپ نے دو تین سال قبل کہاں سے چھپوا کر دیے تھے۔ میں نے جعفری صاحب کو ڈائی اور کاغذ دیا تھا' مگر انھوں نے دوسرے تیسرے روز واپس کر دیا اور کہا کہ "نیا دور" سے جس پریس کا تعلق ہے وہاں ڈائی کا کام نہیں ہوتا۔ اگر آپ انھیں ہدایت بھیج دیں اور جگہ بتا دیں تو چھپ جائیں۔

لاہور میں کیسی گزر رہی ہے' لکھئے۔ شاہد کوئٹہ میں ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ اپریل کے شروع میں کوئٹہ جاؤں گا اور ممیتہ بیس روز قیام کروں گا۔ بچوں کے امتحان کے بعد زینت اور بچے پوری تعطیلیں گزاریں گے۔ زینت اور نذر سلام کہتے ہیں۔ جواب کا منتظر ہوں۔ دو ناولٹ لکھے ہیں' ایک افسانہ ان کے علاوہ اور لکھا تھا جو "نقوش" میں آ رہا ہے۔ فقط والسلام۔

نیاز مند

ابوالفضل صدیقی

(۶)

کوئٹہ

تاریخ : 16/5/72

میاں! اپریل کی ۳ر تاریخ کو یہاں پہنچا ہوں اور شاہد کے ساتھ نامعلوم مدت تک قیام پذیر ہوں کل زینت اور دونوں بچے بھی پہنچ رہے ہیں اور غالباً" وسط جون تک عذرا اور محمد میاں بھی آئیں گے۔

جب میں یہاں پہنچا تھا تو اردگرد کی پہاڑوں کی چوٹیوں میں برف جھلملاتی تھی۔ اس کے بعد مئی میں موسم میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی' لیکن اب ہفتہ بھر سے سردی بڑھ گئی' یہ خط لیٹے لیٹے رضائی میں دبکے ہی دبکے لکھ رہا ہوں اور دو بجے دن کا وقت ہے۔ جون آ گیا لیکن دھوپ' آج بھی خوش گوار ہے۔ رات کو بند کمرے میں موٹا کمبل اوڑھا جاتا ہے۔

"نیا دور" کا کیا بنا؟ اس ایشو میں کیا کیا آ رہا ہے؟ تمھارا انشیا جالندھری کا خاکہ؟ یہاں ادبی ہنگامے بہت گرم ہیں۔ خاص طور مجھے بہت نوازا اور اظہار پذیرائی کیا۔ ایک مکرانی شاعر عطا شاد کا کلام سن کر حیرت ہوئی۔ مادری زبان مکرانی بلوچی ہے' مزاج غالبا" خداداد اردو...... مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ اردو کا مطالعہ بھی کچھ ایسا بہت گہرا نہیں ہے لیکن طبیعت نہایت ستھری اور جدت سے بھرپور ہے۔

کراچی کب تک پہنچ رہے ہو۔ شاہد سلام کہتے ہیں' بچوں کو پیار' دلہن کو دعائیں جمیلہ ملیں تو سلام پہنچا دینا۔

والسلام

دعا گو' ابوالفضل صدیقی

(۷)

تاریخ : 5/6/72

میاں! ۳۰ر مئی کا مکتوب ملا۔ لیکن کراچی والا خط نہیں ملا۔ بہر حال تم ہی سے اتنے عرصہ سے مفارقت ہے ایک آدھا خط اور سہی۔ کوئٹہ در حقیقت اچھی جگہ ہے لیکن آب و ہوا کی خشکی کسی کسی وقت ناقابل برداشت ہو جاتی ہے' اس ہفتے میں بھی ایک دو دن ایسے گذرے اور اس سے پیشتر بھی کہ رات کے کسی حصہ میں آنکھ کھلی تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ نتھنوں میں بلاٹنگ پیپر کی دو بتیاں بنا کر ٹھونس دی ہیں اور حلق میں میخ' سانس منہ کے راستے لی جا رہی ہے اور کسی کسی دن ستم بالائے ستم یہ کہ پیاس بالکل نہیں ہے۔ اب بتلایئے کہ کس ذریعہ سے مقابلہ کیا جائے اس خشک طوفان کا جو جسم و جاں میں بپا ہے' بستر سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں اور ٹہلنے لگتے ہیں۔ حلق تر کرنے کے لیے پانی چوستے ہیں' پھر لیٹتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد پھر اسی کیفیت کی تکرار ہوتی ہے۔ زیتون کا تیل نتھنوں میں ڈالتے ہیں' چکنائی سے حلق میں خراش سی ہو جاتی ہے۔ تاہم خشکی کو کچھ سکون ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کبھی آنکھ کھلتی ہے تو مذکورہ کیفیت کے ساتھ شدید تشنگی بھی محسوس ہوتی ہے۔ بات' خواہ یقین کرو یا نہ کرو کی سطح کی ہے اس ہفتے میں ایک مرتبہ رات کے بارہ بجے میں نے پے بہ پے سات بڑے گلاس بھر بھر کر پیئے۔ معدہ مشک کی طرح بھر گیا' لیکن تشنگی بدستور رہی۔ البتہ نیند آگئی۔ تمہارے علم میں ہے کہ ایک مدت سے مجھے بھوک کا احساس مفقود ہو گیا ہے لیکن وقت پر مخصوص مقدار کھا لیتا ہوں اور ہضم ہو جاتی ہے۔ یہ صورت یہاں بھی بدستور ہے۔ تاہم خارجی طور پر بہتر نظر آتا ہوں' لیکن جسمانی طاقت میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ گھنٹہ بھر روزانہ چلتا پھرتا بھی ہوں۔

میاں اردو کی سرگرمیاں پہلے ہی سے بہت نمایاں تھیں' اسی دوران حکومت بلوچستان نے اردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا۔ تمام دفاتر میں اردو میں کام ہونے لگا' حتیٰ کہ اسٹیٹ بینک میں بھی صوبائی حکومت کے دفاتر سے اردو ہی میں مراسلت ہونے لگی۔ صوبائی وزرا کرتا شلوار پہن کر دفتر میں براجنے لگے۔ کل وزیر اعلیٰ سردار مینگل نے سیرت نبویؐ کے ایک جلسے کو صدارت بخشی جو یہاں کی ادبی تنظیم حلقہ احباب قلم کی جانب سے منعقد ہوا تھا۔ علاقائی زبانوں کی نعتیں بھی پڑھی گئیں اور سلام بھی' لیکن سب کے ترجمے ساتھ پڑھے گئے اور حیرت ہے کہ اکثر منظوم تھے۔ وزارت پناہ نے بڑی شستہ اردو میں مختصر سی تقریر کی۔ سفید کرتا پاجامہ اور واسکٹ زیب تن کیے ہوئے تھے' سر پہ جناح کیپ تھی۔

یہاں کئی اور شعرا سے بھی ملاقات ہوئی۔ نور محمد ہمدم اور عابد علی عابد پٹھان شعرا بڑے خوش فکر اور خوش گو ہیں۔ خیر یہ تو دونوں پروفیسر اور لیکچرر ہیں' ایک نوجوان لالہ جن کے خد و خال میں ابھی طفلی و

جوانی گلے ملتی دکھائی پڑتی ہیں اور ستم یہ کہ تھانہ دار ہیں، بڑے ہی خوش گو اور خوش ذوق ہیں۔ ہادی تخلص ہے اور ارشد امروہوی کے شاگرد ہیں۔ ارشد امروہوی ۱۹۲۲ء سے کوئٹہ میں آباد تھے اور یہاں پٹھانوں بلوچوں میں ذوق شعری انھیں کی ذات کا مرہون ہے۔ دو سال قبل ان کا انتقال ہوا ہے، پرسوں ان کی دوسری برسی کے سلسلے میں مشاعرہ تھا، اچھا رہا۔ متعدد پنجابی شعرا بھی ہیں، زیادہ تر کالجوں اور اسکولوں کے استاد، اور سینئر طلبا...... ایک خاص اسپرٹ ان پنجابی اور بلوچ پٹھان شعرائے اردو کے درمیان کمپیٹیشن جیسی ہے اور بلوچ پٹھان شعرا ان پنجابی شعرا سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے محسوس ہوتے ہیں جس کا پنجابی شعرا کو احساس ہے اور اہل زبان شعرا و ادبا مونچھیں نیچی کیے تماشائی ہیں اور کبھی کبھی بلوچ پٹھانوں کو بار ہیں دے دیتے ہیں۔ میری آمد پر حلقۂ احباب قلم اور بلوچ اکیڈمی نے مل کر ایک شام منائی تھی، تقریباً" ڈھائی گھنٹے سوال جواب ہوئے، کوئٹہ اور مضافات کا ہر اہل قلم شریک ہوا۔ اہل زبان اور زبان داں کے متعلق بہت سے سوالات ان لوگوں نے خاص طور پر کیے اور میں نے وہی جواب دیے جو تمہارا مخصوص نظریہ ہے۔ میں نے اندازہ کیا کہ اس کے بعد ان سب کا کامپلیکس بہت بڑی حد تک دور ہو گیا اور مدت بعد مطمئن ہو گئے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاہد احمد دہلوی مرحوم میدان میں آنے کے بعد اگر یہ رویہ اختیار کرتے تو آج حالات دوسرے ہوتے، بلکہ یہاں تک کہ تقسیم کے بعد مہاجروں کے ساتھ جو عام ذہنی مائزیشن تمام تر معمولات زندگی میں ہوا وہ بھی اس حد تک نہ ہوتا اور اردو زبان کو بہت فایدہ بھی پہنچتا۔ لیکن اس زمانہ میں ۴۷ء کا تصور ہی نہ ہو سکتا تھا۔

میں نے ایک بڑی ہی چٹ پٹی کہانی یہاں پہنچ کر لکھی ہے۔ اپنی نوعیت کی (ہر اعتبار سے) نادر۔ پتا نہیں کہ تم نے "نقوش" حالیہ نمبر میں میری کہانی "سرخ حبابوں کی چھتری" پڑھی یا نہیں۔ آپ اس کو خود بھی پڑھیں اور جمیلہ کو بھی توجہ دلائیں اور ان سے کہیں کہ اس کا تقابل اس قبیلہ کی بلونت سنگھ کی کہانیوں سے کر کے مجھے اپنی رائے لکھیں۔ انھیں میری دعائیں پہنچا دیں اور عاشی کو پیار۔

سب بچے اور زینت، شاہد آداب گزار ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ انشاء اللہ وسط تک ان لوگوں کے ساتھ کراچی پہنچوں گا۔ آپ اس مسئلہ پر غور کریں کوئٹہ کے قرار واقعی دو چار اچھے شعرا کی "نیا دور" کے ذریعہ ہمت افزائی کرنے کی ضرورت ہے؟ اور پھر مجھے لکھیں۔ ان میں سے بعض کی ایسی خواہش ہے اور انھیں فنی طور پر بھی قابل اعتنا سمجھتا ہوں اور سیاسی طور پر آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ جواب کا منتظر رہوں گا، فقط والسلام، دلہن کو دعائیں، سب بچوں کو پیار اور اپنی فرحا کو گود میں اٹھا کر......

دعا گو

ابوالفضل صدیقی

(۸)

IV-F-4/7
ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

۶ر اگست ۱۹۷۲ء

میاں! کوئٹہ سے ۲۲ر جولائی کو چلا' اس سے پیش تر ۱۵ر جولائی کا ریزویشن کرایا تھا لیکن یہ ہفتہ کراچی میں تاریخ سازی کا تھا للذا مجبوراً "۱۳ر ۱۴ر تاریخ کو روانگی کا ارادہ ترک کر کے ریزویشن کینسل کرا دیا۔ دوسرا ریزویشن ۲۲ر جولائی کا ملا اور اس مبارک تاریخ میں روانہ ہو کر ۲۳ر کی صبح کو جب کوٹری پہنچ کر کراچی کا اخبار خریدا تو پڑھا کہ اسکولوں کی تعطیل میں ۷ر اگست تک کی توسیع کردی گئی ہے۔ اگر چالیس سال پہلے والی عمر ہوتی تو اسباب اتار کر وہیں کوٹری کے اسٹیشن پر بیٹھا رہتا اور جوں ہی یہ گاڑی (بولان میل) کراچی مسافروں کو اتار کر کوٹری واپس آتی جھٹ سے سوار ہو کر کوئٹہ پلٹ جاتا۔ افسوس تو یہ تھا کہ جب چلے ہیں تو کوئٹہ میں موسم بہت اچھا ہو گیا تھا اور ۲۳ر تاریخ کو کراچی پہنچ کر اچھی طرح سفر کی تکان بھی نہ اتار پائے تھے کہ سر منڈواتے ہی اولے پڑے' کراچی میں پھر ہفتہ کرفیو آ گیا جب کہ کوئٹہ میں اردو کی حمایت میں برہمن اور شیخ دونوں کے ملے جلے جلوس نکلتے چھوڑ آیا تھا۔ مشاعروں محفلوں سے شہر کی کوئی رات خالی نہ ہوتی تھی' بلوچستانی اردو پانے پر جشن منا رہے تھے' جیسے ربانی عطیہ آسمان سے ان کے ملک پر نازل ہو رہا ہے' سنگلاخ خشک چٹانیں کوہ طور ہو رہی تھیں۔

تمھارا وہ خط میں نے بہ حفاظت رکھ لیا ہے جس میں تم نے ایک ماہر منجم کی طرح کراچی کے متعلق پیشین گوئی کی ہے' یعنی وہ جو کچھ جولائی میں پیش آیا مئی میں بتا دیا تھا۔ اب خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ تمھاری یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہو جو تم نے بر سبیلِ تذکرہ کی تھی' جب ۷۰ء میں عید ملنے گیا تھا کہ "یہ دو سیارے ہیں' ایک کی گردش سے دوسرا گھوم رہا ہے' ایک گرا تو دوسرا بھی گر جائے گا۔" اس وقت ایک سیارہ کا گرنا یوں ہی دور رس مفکرین کے واہموں میں تھا' اور یہ واہمہ اندیشہ کی حد تک بھی نہ پہنچا تھا۔ لیکن ان ہونی ہوئی اور خاکم بدہن دوسرا سیارہ بھی فلائنگ شاٹ کی زخمی قاز کی طرح پتا ہوا گرتا نظر آ رہا ہے ...... مر کر بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔ لینڈ ریفارم سے مقابلہ اور کاٹ کے لیے سندھ کے زمین داروں نے پیش بندیاں اور حفظ ماتقدم کر لیے تھے' انھیں خطوط پر خال خال مہاجر زمین داروں نے بھی عمل کیا تھا' لیکن قانونی فایدہ صرف سندھی زمین دار اٹھا سکے۔ مہاجر زمین داروں کے مقابلہ پر لاقانونیت کا سیلاب ہے۔ ماحول ناسازگار تو ہمیشہ سے ہی تھا' اور صریحاً" بے بس تھے اب تو ستر سالہ اور چالیس سالہ پنجابی آباد کار بھی متزلزل سے ہیں۔ جن میں سے اکثر کے دادا اور سب کے باپ پنجاب چھوڑ

کر سندھ کی بنجر آراضیوں پر آباد ہوئے تھے اور گلہ بانی کے دور میں سے گزرتے ہوئے سندھ کو کھیتی کرنے کا سبق دیا تھا۔ تفاصیل جب ملوگے تو زبانی بتاؤں گا۔ میرے چھوٹے بھائی ابو مسلم جن سے آپ کی ملاقات ہے' ۵۲ء میں سندھ میں آباد ہوئے تھے اور ملازمت ترک کرکے سترہ سال سے نواب شاہ میں بڑی کامیاب وکالت کر رہے تھے اور زمین داری کا کل کام سنبھالے ہوئے تھے' فضا دیکھ کر ۷۲ء میں مستقلاً سکونت ترک کرکے کراچی آ پڑے۔ محمد میاں بھی تمہیں معلوم ہے ۶۸ء سے نواب شاہ میں جا بسے تھے۔ وہاں جمنے کی ہر کوشش کرکے اور ناکام ہو کر پہلے ہی چلے آئے تھے۔ اب صورت حال یہ رہی کہ میں تو ۳ر اپریل کو کوئٹہ پہنچ گیا تھا اور تقریباً ۱۵ر ہفتہ بعد کراچی واپس آیا اور یہ پورا دور مسلم اور محمد میاں کو سندھ کی گرمی میں نواب شاہ' سانگھڑ اور حیدر آباد زمین داری کی سڑی گلی لاش کو دفنانے میں لگا۔ اور سب کچھ مرضی کے مطابق کاغذات میں لکھ جانے کے باوجود بات وہی ڈھاک کے تین پات رہی۔ اس فصل ربیع میں کوڑی وصول نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ جس ٹھیکے دار نے باغ کی بہار انبہ کا ٹھیکہ لیا تھا وہ بھی بھری فصل چھوڑ کر جان بچا کر بھاگ گیا۔ سندھی ہاری تو خیر شہزادے ہو رہے ہیں' پنجابی ہاری بھی جنھیں ہم نے خود لاکر زمینوں پر آباد کیا تھا' بٹائی اور مالیہ دیتے ہوئے آنکھیں دکھلا رہے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں میں نے یوں لکھ ماریں کہ کبھی کبھی ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ دوستوں کے حلقہ میں تم اور ایک دو میرے حالات کے متعلق بھائی والے انداز میں سوچتے محسوس ہوتے ہیں۔ شہر نواب شاہ میں مہاجروں نے خارجی طور پر بھی نہایت دلیری کے ساتھ دفاع کیا ہے' پھر بھی سخت پینک ہے اور ہر فرد پابہ رکاب بیٹھا ہوا ہے۔ مسلم اور محمد میاں مہینہ میں ایک دو بار آتے جاتے رہے بس۔ تم ملوگے تو جھوآ جھر باتیں کروں گا۔ ہر مادی شے بے حقیقت اور بے گانی نظر آتی ہے۔ کراچی میں ایک معتبر ہاؤسنگ سوسائٹی میں میرے سب خاندان والوں نے اور میں نے بھی پلاٹ خریدے تھے' جن کی دو دو تین تین قسطیں بھردی تھیں' اب مزید قسط بھرنے کو جی نہیں چاہتا۔ پتا نہیں لالۂ صحرائی کی منزل گور تک پہنچتے پہنچتے ابھی کہاں کہاں پڑاؤ کرے گی۔ اچھا باقی سب زبانی ہوگی......

کوئٹہ میں تین بڑے اچھے ناولٹ لکھے' جن میں سے ایک ابھی اسی ہفتہ کراچی پہنچ کر ختم کیا۔ ایک اور اسی دوران "نقوش" میں نکلا "سرخ حبابوں کی چھتری" تم نے دیکھا ہوگا۔ شمیم احمد ملے تھے' ان سے کچھ "نیا دور" (آنے والے) کے متعلق علم ہوا تھا لیکن واضح نہیں۔ پتا نہیں کہ "نیا دور" کے مالی حالات کیسے ہیں؟ کوئٹہ سے اپنے لیے بہت سا کپڑا خرید لایا ہوں' اتنا کہ سلائی کے داموں کا بھی' کئی شیروانیوں کی سلائی کا سوال ہے' کیا "نیا دور" تین چار شیروانیوں کی سلائی سے مدد کر سکے گا؟ اب تو کارتوسوں کی خریداری کا سوال نہیں ہے' بندوق غالباً ہمیشہ کے لیے توڑ کر رکھ دینی پڑے گی' پچھلے سال کے شروع سیزن کے خریدے کارتوس ویسے ہی رکھے ہیں' ڈبوں کی مہر نہیں ٹوٹی۔

تم کراچی کب تک پہنچ رہے ہو...... شاہد ابھی تک کوئٹہ میں ہی جمے ہوئے ہیں۔ ۲۲ر تاریخ کو چھٹی پر ہمارے ساتھ آئے تھے اور آج ۶ر تاریخ کو جا رہے ہیں۔ کوئٹہ میں خاص طور پر سردیوں میں تنہائی

اور بیکاری بہت کھلتی ہے۔ لیکن یہاں ہیڈ آفس میں حالات ناسازگار اور غیر یقینی ہیں۔

ضیا جالندھری والا مضمون کہاں گیا؟ اور کب چھپ رہا ہے' غالباً "نیا دور" میں چھپے گا۔ میرے متعلق ایک مختصر سا مضمون ایک صاحب زادہ قیصر پرویز مفتی نے کوئٹہ کے قیام کے تجربات پر سپرد قلم کیا ہے' یہ انڈسٹریل بینک میں کاسٹ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ خاصی ہلکی پھلکی خوب صورت چیز ہے۔ یہ میں تمھیں پڑھنے کے لیے دینا چاہتا ہوں' یہ صاحب جاڑوں میں شاہد کے مکان میں ان کے ساتھ مقیم تھے اور میرے ساتھ بھی اس وقت قیام پذیر رہے جب تک کہ زینت اور بچے نہیں پہنچ گئے یعنی اوائل اپریل سے اواخری تک ہم پیالہ ہم نوالہ رہے۔ تم مضمون پڑھنا اور پھر رائے قایم کرنا کہ اشاعت کے قابل ہے یا نہیں۔ خط کا جواب اور کراچی آنے کی متوقع تاریخوں سے مطلع کرنا۔ باقی بالمشافہ۔

تمھارا بھائی

ابوالفضل صدیقی

(۹)

میاں! مفصل خط ملا۔ لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ "نیا دور" کب تک نکل رہا ہے۔ اور اس میں کیا کیا آرہا ہے' نیز یہ کہ تمھارا کیریکٹر اسکیچ اور "ضیا" کا کب تک نکل رہے ہیں۔ مجھے کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ تم نے ایک مرتبہ مجھ سے یہ کہا تھا کہ "نیا دور" کا یہ شمارہ طویل کہانی نمبر ہے۔ "اردو" میں ڈاکٹر عندلیب شادانی والے خاکہ کی کتابت ہو چکی تھی' بلکہ طباعت کی ابتدائی منازل بھی طے ہو چکی تھیں اور مولانا صلاح الدین احمد والا زیر کتابت تھا۔

• سردست تو وسط جولائی تک قیام کا ارادہ ہے' آگے کا حال خدا جانے۔ محمد میاں' مسلم دونوں نواب شاہ ہیں۔ لینڈ ریفارم کے ناخوش گوار کام میں انتہائی پریشانی اور مصروفیت میں رہے۔ مسلم کے بچے اور دلہن کراچی آگئے ہیں' لہٰذا مسلم اور محمد میاں کے ساتھ (نواب شاہ) میں عذرا اور دونوں بچوں کو رہنا پڑا۔ جب کہ کوئٹہ میں شاہد کا مکان جو چار کمروں اور دو برآمدوں پر مشتمل ہے چشم براہ رہا۔ اندازہ ہے کہ جولائی کے شروع تک انھیں بھی زمین داری کی تجہیز و تکفین کے فرض سے سبک دوشی حاصل ہو جائے گی تو پھر یہ لوگ آئیں گے۔ اس وقت قطعی فیصلہ کروں گا کہ مجھے اپنے قیام کی مدت مزید بڑھانا چاہیے یا زینت کے ساتھ وسط جولائی میں کراچی واپس جانا چاہیے۔

ایک جلد "ساقی" "شاہد احمد دہلوی نمبر" کی اگر وہاں آپ کے پاس ہو تو بھیج دیجئے۔

شاہد اور زینت سلام کہتے ہیں۔ فرحا' خاور اور محمد علی کو پیار۔ دولہن کو دعائیں۔

فقط

ابوالفضل صدیقی

مکرر آنکہ بلوچی اردو شعرا و ادبا کو تھوڑا روشناس کرانے کے لیے رسالہ کون سا استعمال کیا جائے۔ "نیا دور" کے ذریعے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ پتا نہیں "ساقی" کا کیا ہو رہا ہے۔ شمس زبیری کہاں ہیں؟

(۱۰)

میاں! از رخصت ہو کر دوسرے روز روانہ ہو گیا اور ۲ر تاریخ کو کوئٹہ پہنچا۔ ابھی تک تکان اچھی طرح نہیں اتری ہے۔ پرسوں شام کوئٹہ کے ایک ادبی ادارہ انجمن احباب قلم کی جانب سے اسلامیہ اسکول کے ہال میں یوم النبیؐ کی تقریب تھی۔ پچھلے سال بھی اس جلسہ میں شریک ہوا تھا' صدارت اس دور کے وزیر اعلیٰ سردار عطا اللہ مینگل کر رہے تھے۔ اس مرتبہ ذرا تاخیر سے پہنچا۔ دیکھا تو اپنے پروفیسر کرار حسین جلوہ فرما ہیں۔ میرے داخل ہوتے ہی مجتبیٰ حسین نے مخصوص طور پر لیا اور مجھے اپنے قریب بٹھایا۔ پروفیسر کرار حسین نے باوجود کرسی صدارت پر ہونے کے مخصوص مجلسی سلام کیا۔ جلسہ ختم ہونے پر پروفیسر صاحب نے توجہ خاص سے نوازا' اور خاص خاص لوگوں سے تعارف کرایا' جن میں سے بعض بعض میرے پچھلے سال کے شناسا بھی تھے۔ چلتے وقت بکمال خلوص و انکسار مجھے میری جائے قیام تک چھوڑنے کے لیے لفٹ کی پیشکش کی ساتھ ہی کل یعنی ۴ر تاریخ کو گیارہ بجے کوئٹہ یونی ورسٹی آنے کی فرمائش کی۔ لہٰذا کل ۱۱ بجے کوئٹہ یونی ورسٹی پہنچا۔ پہلے مجتبیٰ صاحب نے اپنے طلبا و طالبات کے مجمع میں بٹھایا۔ ایک دوسرے پروفیسر سے یونی ورسٹی میں میرے لیے آفیشل پروگرام منعقد کرنے کا پروگرام بنانے کی اسکیم کا اظہار کیا۔ اس کے بعد پروفیسر کرار حسین کے کمرے میں لے گئے تقریباً" دو گھنٹہ نشست رہی۔

پروفیسر کرار حسین ہمہ خلوص و مجسم انکسار ہیں۔ تکلم کے وقت ہونٹوں سے بیلے کے نیم شگفتہ پھول جھڑتے ہیں' کہیں سن لیا تھا کہ میں نے تمہارا اسکیچ لکھا ہے' استفسار کیا تو بکمال خلوص پڑھنے کے اشتیاق کا اظہار کیا۔ اپنے اساتذہ کو بلوا بلوا کر میرا تعارف کراتے رہے۔ تمہارے ذکر میں میں نے کہا کہ آپ کے پرانے شاگرد تو آپ کا نام باوضو لیتے ہیں۔ چہرا تمتما اٹھا۔ بہت خوش ہوئے۔ مجھے تم سے شکایت ہے کہ تم لوگوں نے مجھے اس پیکرِ خلوص و انکسار اور علم کے سمندر سے اب تک اتنے قریب نہیں آنے دیا جتنے تم لوگ خود تھے۔ ویسے میری ان کی دور کی ملاقات تھی' کل انھوں نے جسے کہتے ہیں سر آنکھوں پر لے کر پذیرائی کی۔ اس انداز نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔

مجتبیٰ صاحب بھی پیش پیش تھے۔ ویسے مجتبیٰ صاحب ہمارے بڑے شارپ معاصرین میں تھے' لیکن کل اور پرسوں کی طویل صحبت میں مجھے کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ چھوٹا ہوا کارتوس ہو رہے ہیں۔ خارجی اعتبار سے تو خیر وہ روایتی چیز ہے لیکن مجھے داخلی اعتبار سے بھی وہ بات محسوس ہوئی جس کو انگریزی میں

(spent-up) ہو جاتا کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ادبی دنیا سے قطعاً "کلیتاً" قطع تعلق کر لیا ہے بس میاں جی رہ گئے ہیں۔

بہرحال دونوں ہی کا اندازِ پذیرائی مجھے بہت بھایا۔ لیکن ساتھ ہی' یہ پا کر افسوس ہوا کہ دونوں ہی ذہنی طور پر نامطمئن ہیں اور اب ماحول کو ناسازگار محسوس کرتے ہیں۔

"آوازِ دوست" والے مضمون کو شامل کر سکے یا نہیں۔ وہ نظرِ ثانی کا محتاج تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ تم نے کر لی ہوگی۔ جواب ضرور دینا۔ فقط والسلام۔

نیازکشِ دیرینہ
ابوالفضل صدیقی
معرفت شاہد حسن صدیقی
ریسرچ آفیسر اسٹیٹ بینک آف پاکستان
کوئٹہ
۵ار جون ۷۳ء

(۱۱)

۱۳ار جون ۷۳ء

میاں! ۱۰ار جون کا خط ملا تھا۔ "آوازِ دوست" کے متعلق جو تحریر میں نے آپ کے حوالے کی تھی' جیسا کہ ظاہر ہے اور میں نے کہا بھی تھا کہ میں اس سے مطمئن نہیں ہوں اور آپ کو اس پر مخصوص توجہ دینی پڑے گی۔ بہرحال دیر آید درست آید اگلے شمارہ تک وقت کافی ہے۔ میں خالق مصنف کی اس کم زوری کا شناسا ہوں' معاصر عزیز مخصوص جذبہ کے ساتھ میرے پاس لے کر آئے تھے اور جیسا کہ میں نے اپنی اس تحریر میں اظہارِ خیال بھی کیا ہے کہ ہر پہلو سے قابلِ اعتنا تصنیف ہے۔ ویسے اپنی اس تحریر میں میں نے اس کا رشتہ "جنگ آمد" اور بیگم اختر ریاض وغیرہ کی کتابوں سے ملایا ہے۔ لیکن جب غور سے پڑھا تو یہ اپنی نوعیت کی منفرد چیز ہے' علاوہ تیکھے اسلوب کے' اس کی تاریخی قدر و قیمت اپنی جگہ پر اہم ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کا یہ پہلو ہمارے اذہان کے لیے خوش آیند ہے۔ اگرچہ ہم لوگ سیاسی آدمی نہیں ہیں' تاہم تخمیر میں "جناح لیگی" ہیں یہ پہلو ہماری گھریلو تربیت کا جز بن کر ہمارے خون میں رچا ہوا ہے۔ ویسے ہم سے پہلی والی نسل کا تربیتی ماحول خالصتاً "مذہبی تھا لیکن ہمارے اندر اس چیز نے مسلم لیگ کے جدید تر خیال سے جلا پا کر داخلہ لیا۔ میرے اندازہ میں یہ نیم سیاسی' نیم مذہبی تربیت بھی انھیں کٹ کنوں پر ہوئی جن میں میلاد شریف' محرم اور فاتحہ درود' خیر خیرات ہوتے چلے آ رہے تھے۔ ممکن ہے علی گڈھ والوں نے مسلم لیگ کے کام کو سنجیدگی کے ساتھ ہاتھ میں لیا ہو (شاید اس بچ نے جس سے معاصر عزیز متعلق ہیں'

ورنہ اس سے پہلے والا بچ بالکل غیر سنجیدہ تھا) لیکن یوپی کے قصباتی تمدن میں یہ سیاسی فیشن کے طور پر داخل ہوا۔ زیادہ سے زیادہ تو نیفانڈا اریا و چنگی کے حلقوں کے الیکشن کے جذبے سے' ورنہ بیشتر لوگوں کی دلچسپیاں وہی تھیں جو مرغ بٹیر لڑانے' پچیسی شطرنج کھیلنے یا گھوڑے اور گرے ہاؤنڈ دوڑانے کے سلسلے میں ہوا کرتی تھیں...... تاہم پاکستان بن ہی گیا تو اس کے ساتھ وہ محبت بھی ابھر آئی جو فرنچ لیڈر حادثاتی طور پر پھنسے پر استقرار حمل کی پیدائش' بیٹے کے ساتھ فطری ہوا کرتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہم مہاجروں اور پاکستان کے درمیان ہے۔ چناں چہ سمجھ دار مہاجر کبھی نہیں کہتا کہ ہم نے پاکستان بنانے میں غلطی کی۔ اور اب میرا تو نظریہ یہ ہے کہ پچھلے پونے دو سو برس کے حالات کا فطری اور ناگزیر ولا بد نتیجہ تھا۔ اور کسی نہ کسی شکل میں ہو کر رہتا ہے۔ تاہم علی گڑھ کا یہ بچ اس معاملہ میں بہت سنجیدہ تھا جس سے مصنف متعلق ہے' تاہم ان غریبوں کے وہم و گماں میں بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی اور اس صورت میں منڈھ دیا جائے گا۔ "لے کے رہیں گے پاکستان" "بٹ کے رہے گا ہندوستان" کے نعرہ میں شاید جناح صاحب کا مطلب معدی کچھ اور تھا' چناں چہ موصوف دو مرتبہ چھسلے' ایک مرتبہ "پیرٹی" پر اور دوسری مرتبہ "گروپنگ" پر' لیکن کانگریس مسلمانوں کو کچھ نہ دینا چاہتی تھی اور جس طرح سولہ کروڑ راون والوں کے حقوق بارہ کروڑ رام والوں کو ہضم کرا کر انھیں "ہریجن" کے پیارے لقب پر ٹرخایا اسی طرح نو کروڑ مسلمانوں کو بھی ایک قوم کا نعرہ مار کر زنار پوشوں کا غلام بنانا چاہتی تھی۔ اور یہ راز مدتوں سے مسلمان پا گیا تھا۔ گاندھی جی کی ساری عظمت کا راز اسی میں ہے کہ انھوں نے ہندو اقلیت کو شودر اکثریت کے اوپر حاوی کر دیا۔ چناں چہ کانگریس کے اسی جذبہ کے تحت انتقاماً" اور انتظاماً" بھانڈوں کو ہاتھی بخش دیا اس خیال سے کہ "اپنے آپ ہو جائے گی" لیکن کیسے ہی نہ کیسے ہاتھی مرتب کرلیا۔ بہرحال پاکستان بنانے والوں اور پھر چلانے والوں کی سیاسی تربیت مطلق نہ ہوئی تھی اور نہ ہی یہ اتنی تھوڑی مدت میں ممکن تھی۔ اتنا بڑا اور اتنا عجیب انقلاب لانے کے لیے پانچ سات سال کی مدت بہت کم ہے۔ ہمارے اکثر شہروں میں مسلم لیگ کے اعلیٰ عہدہ دار خان بہادر' سر' آنریری مجسٹریٹ' ہوا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک ضمنی الیکشن کے موقع علی گڑھ کے طلبا کا یہ گروہ' جس سے معاصر عزیز متعلق ہیں' کنونسنگ کے لیے پہنچا تو انھوں نے ایک نعرہ لگایا "ڈاؤن ڈاؤن ود برٹش کراؤن"۔ تو ہمارے شہر کے سکریٹری مسلم لیگ نے سر پیٹ لیا اور استعفیٰ پیش کر دیا۔ موصوف سیکنڈ کلاس آنریری مجسٹریٹ تھے اور خان صاحب کا خطاب تھا' اور امید لگائے ہوئے تھے کہ اگلے نوروز پر خان بہادری اور فرسٹ کلاس اختیارات آجائیں گے۔ ضلع کے صدر سکریٹری دوران جنگ بھر رنگروٹ اور وردیاں مفت سپلائی کرتے رہے۔ بجز علی گڑھ کے پاکستان بنانے کی ذہنی تربیت کا سراغ کہیں اور نہیں ملتا۔ تاہم انھیں یہ یقین نہ تھا کہ ہماری جنسری کے شعبدہ پر اتنی جلدی آم کا پودا پروان چڑھ کر اس پر پکا آم بھی لگ جائے گا۔

آپ نے "آواز دوست" پڑھی ہوگی۔ خوب صورت فن کے علاوہ میٹر کے اعتبار سے بجز ایک پہلو کے بے داغ کتاب ہے اور ہر جگہ مصنف "رام تیور" رہا ہے اور وہ کج پہلو وہی ہے جو ہر پنجابی کا لیاقت

علی خاں کے متعلق ہے۔ خواہ وہ موچی گیٹ کا' دادا ہو یا نواب گورمانی اور غلام محمد یا ابن انشا یا کوئی اور ......ہو۔

خون میرا وہ سمجھتے تھے حلال
تھا جو میں ذریت شبیر سے

اس خط میں بہت سی بکواس کر گیا۔ بہرحال تم اس خط کو بھی چھانٹ کر ایڈیٹ کر لینا۔ "آواز دوست" کے متعلق مجھے اپنی اس تحریر میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کتاب پورے ایک مبسوط مضمون کا تقاضا کر رہی ہے۔ میری رائے میں تم یہ کتاب' وہ تحریر خود بھی پڑھ لو اور شمیم احمد کو بھی پڑھواؤ۔

یہاں موسم اس ہفتہ تکلیف دہ رہا۔ خصوصاً" راتیں۔ ریت چھنی' بدن میں سوئیاں چبھیں' نیندیں حرام رہیں۔ شاہد اور زینت دلہن سلام کہتے ہیں۔ فرحا کو پیار۔ فقط والسلام۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ابوالفضل صدیقی اور ان کا فن

ادب کی کسی صنف میں قدم رکھنا تو آسان ہے لیکن اس میں کوئی انفرادی نشان بنا لینا بہت مشکل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انفرادیت' خواہ اس کا تعلق لفظیات سے ہو یا معنیات سے یا دونوں سے 'تیز مشاہدہ' دراک ذہن' حساس طبیعت' وسیع تجربہ اور مسلسل ریاضت چاہتی ہے۔ ادب خصوصاً" تخلیقی ادب میں ریاضت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق کسی صنف ادب کے فنی لوازم و اجزائے ترکیبی سے آگہی اور زبان و بیان کے اصول و قواعد سے واقفیت سے ہے۔ اس قسم کی ریاضت تخلیق کے نام پر نوک پلک سے درست تحریروں کا انبار تو لگا سکتی ہے لیکن ادب پارے یا کسی ادیب و شاعر کو تادیر زندہ رکھنے کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ ریاضت کی دوسری قسم وہ ہے جو پہلی قسم کی ریاضت سے بے نیاز تو نہیں گزر سکتی لیکن اس سے آگے بڑھ کر' وہ جذبے کی شدت' احساس کی گرمی' تجربے کی ندرت اور نئی نئی لسانی تشکیلات کو اپنا راہنما بناتی ہے۔ چناں چہ اس قسم کی ریاضت' جس صنف ادب کو ہاتھ لگاتی ہے' اس میں اس کی تخلیقات خواہ مقدار میں حقیر کیوں نہ ہوں' معیار کے لحاظ سے پُروقار اور بلند پایہ ہوں گی۔ قاری کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوں گی اور اپنے مداحوں کا ایک حلقہ ضرور بنا لیں گی۔ دیر تک پڑھی جائیں گی تادیر زندہ رہیں گی۔ اپنے تعارف کے لیے ناقدین کی محتاج نہ ہوں گی بلکہ ناقدین ان کی طرف متوجہ ہونے پر خود کو مجبور پائیں گے۔ وہ ضرور انھیں پڑھیں گے' اور موضوع گفتگو بنا کر علمی و ادبی حلقوں میں اپنا بھرم قایم کریں گے۔

اردو کے ممتاز افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی' ان تخلیقی فن کاروں میں ہیں جن کا تعلق دوسری قسم کی ریاضتِ فن سے ہے۔ دو چار سال نہیں پورے ساٹھ سال افسانے کے میدان میں ان کا قلم چلتا رہا۔ نام اور کام بھی گاہے ماہے یہاں وہاں چھپتا رہا اور پسندیدگی کی نگاہ سے بھی دیکھا گیا۔ لیکن انھوں نے نہ تو کبھی اپنا ڈھول پیٹا اور نہ دوسروں سے اس کا اہتمام کروایا۔ وفات سے چند ماہ پہلے انجمن ترقی اردو کی طرف سے ان کے ساتھ ایک شام ضرور منائی گئی ورنہ اس قسم کے تشہیری جلسے جلوس سے وہ ہمیشہ دور رہے۔ البتہ جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے' ستایش و صلہ سے بے نیاز رہ کر عمر بھر لکھتے رہے حتیٰ کہ جس دن ان پر فالج کا جان لیوا حملہ ہوا اس دن بھی ایک افسانے کی بُنت میں لگے ہوئے تھے۔ ان کا لکھنا کسی کاروباری ضرورت یا خواہ مخواہ مصنف کہلوانے اور بارسوخ حلقوں میں باریابی کے لیے نہ تھا بلکہ اس ذوق و

شوق اور میلان طبعی کا نتیجہ تھا جو انھیں فطرت کی جانب سے عطا ہوا تھا اور جس میں مسلسل مشق و ریاضت نے ایسی جلا پیدا کردی تھی کہ ان کے افسانوں میں ان کی ذات و صفات کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔

ابوالفضل صدیقی کے فکر و فن میں اور بھی خوبیاں ہیں لیکن بہ حیثیت افسانہ نگار جو چیز انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کے افسانوں کی موضوعاتی انفرادیت و بوقلمونی ہے۔ ان کے افسانے بہ حیثیت مجموعی یوپی کے خاص خاص اضلاع خصوصاً" علاقہ روہیل کھنڈ کے جاگیردارنہ تمدن اور قصباتی زندگی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ چناں چہ اس زندگی کے سماجی مشغلوں' خاندانی رنجشوں' مقدمہ بازیوں لٹھ بندوں کی چڑھائیوں' کھیت کھلیان کی لڑائیوں' عشق و عاشقی کی وارداتوں' شکاریوں کی گھاتوں اور نشانہ بازیوں' جنگلی جانوروں کی کلیلوں اور طراریوں' زمینداروں کی زیادتیوں' کسانوں اور باریوں کی بدحالیوں' الھڑ لڑکیوں کی شوخیوں اور کھلنڈرے نوجوانوں کی شرارتوں کا جتنا سچا' جان دار خوب صورت اور بھرپور عکس ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں میں ملتا ہے' ان کے ہم عصر کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں نظر نہیں آتا۔ یہ موضوعات ان کی کہانیوں کے خاص الخاص موضوعات ہیں اور انھوں نے اپنی کہانیوں میں ان موضوعات کو اس انداز سے سمویا ہے کہ انھیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

قصبے اور گاؤں کی زندگی کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں کے ساتھ' ان موضوعات کی تخصیص مناسب نہیں۔ اعظم کریوی اور پریم چند سے لے کر احمد ندیم قاسمی اور غلام الثقلین نقوی تک متعدد افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں میں قصبات اور دیہات کی زندگی کو نہایت کامیابی سے جگہ دی ہے۔ یقیناً ایسا ہی ہے لیکن اول تو ان کے مطالعے اور مشاہدات کے مواقع و مراکز بہ اعتبار ماحول' ایک دوسرے سے بہت الگ ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کے افسانوں یا ناولوں کا قدرے گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو صاف اندازہ ہوگا کہ بلحاظ تفصیلات و کیفیات اور اثر و تاثرات' ان سب کے افسانوں کی فضا جدا جدا ہے۔ اس کا سبب ہے۔ ان سب نے قصبے اور گاؤں کی زندگی کو اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کسانوں مزدوروں' وڈیروں' چودھریوں' پٹواریوں' تھانے داروں' سپاہیوں اور سرکاری اہل کاروں کی باہم آویزش و آمیزش اور اس آویزش و آمیزش کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ ان کے رویوں اور ریشہ دوانیوں پر ہر ایک نے اپنے اپنے انداز سے نگاہ ڈالی ہے۔ واقعات و مشاغل کے اعتبار سے اپنے اپنے مزاج کے مطابق الگ الگ اجزا کا انتخاب کیا ہے اور اپنے اپنے جذباتی لگاؤ اور ادراک و احساس کے زیر اثر اپنے اپنے انداز سے اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے۔ خصوصاً" ابوالفضل صدیقی نے اپنی کہانیوں میں دیہی اور قصباتی زندگی کے جن گوشوں کو ہاتھ لگایا ہے اور جس انداز خاص سے ان کی تصویریں اتاری ہیں' وہ کسی اور کی تصویروں سے بہت مختلف ہیں' اتنی مختلف کہ ہزار تصویروں کے درمیان بھی آسانی سے پہچانی جاسکتی ہیں۔

افسانے کے ایک فنی نکتے اور اس میں ابوالفضل صدیقی کی اولیت و خصوصیت کا ذکر بھی' اس جگہ

ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اردو میں مختصر افسانے کے ساتھ ساتھ طویل مختصر افسانہ کی اصطلاح بھی اب خاصی پرانی ہو چکی ہے اور اس سے انکار نہیں کہ اس کی متعدد مثالیں نظر آتی ہیں لیکن ابوالفضل صدیقی کے سوا کوئی ایسا افسانہ نگار نظر نہیں آتا جس کے افسانوں پر پوری طرح اس اصطلاح کا اطلاق ہو سکے یا جسے حقیقی معنوں میں طویل مختصر افسانہ نگار کہا جا سکے۔ چناں چہ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کے مطالعے سے جہاں قاری کے ذہن پر مختصر افسانے اور طویل مختصر افسانے کا فرق واضح ہو جاتا ہے وہیں اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی کا بنیادی تعلق مختصر افسانے سے نہیں' بہت طویل مختصر افسانے سے ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے چار طویل مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ "چار ناولٹ" کے نام سے بھی شایع ہوا ہے لیکن ان چاروں کا تانا بانا کچھ اس انداز کا ہے کہ وہ ناولٹ نہیں طویل مختصر افسانے ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ غالباً" یہی وجہ ہے کہ اس کے مبصرین و ناقدین حتیٰ کہ دیباچہ نگار نے بھی انھیں طویل مختصر افسانے ہی کا نام دیا ہے۔

ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "اہرام" ۱۹۴۳ء میں چھپا تھا۔ پھر بعد میں چار افسانے چار ناولٹ کے نام سے مشتاق بک ڈپو کراچی کی معرفت منظر عام پر آئے۔ ۱۹۸۶ء میں ان کے تین افسانوی مجموعے "انصاف" "آئینہ" اور "جوالا مکھ" ایک ساتھ 'مکتبہ اسلوب کراچی کے زیر اہتمام شایع ہوئے ہیں۔ پہلا مجموعہ "اہرام" میری نظر سے نہیں گزرا بقیہ چار مجموعوں کے افسانوں کے کردار' کہانی' فنی مواد اور قامت پر غور کرتا ہوں تو انھیں طویل مختصر افسانہ ہی کہنا پڑتا ہے۔ ایک بھی مختصر افسانے کے ذیل میں نہیں آتا۔ پہلے مجموعے یعنی چار ناولٹ کا سب سے مختصر افسانہ 36 x 23 سائز کے چھبیس سطری مسطر پر پورے اڑتیس صفحوں پر محیط ہے۔ باقی تین افسانے باون' چھپتر اور نوے صفحات پر مشتمل ہیں۔ "انصاف" اور "آئینہ" کے افسانوں کا طول اس سے بھی زیادہ ہے۔ مختصر سے مختصر افسانہ چھپتر صفحات پر مشتمل ہے اور طویل ترین کے صفحات کی تعداد ایک سو بتیس ہے۔ "جوالا مکھ" کے افسانے قدرے مختصر ہیں پھر بھی بیشتر کی طوالت چالیس صفحات سے کم نہیں ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں کہنا پڑتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی کے افسانے اپنی قامت اور فنی برتاؤ دونوں لحاظ سے طویل مختصر افسانہ ہی کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس اعتبار سے وہ اردو کے پہلے اور واحد افسانہ نگار ہیں جو طویل مختصر افسانہ کے نہایت کامیاب علم بردار کہے جا سکتے ہیں۔

ابوالفضل صدیقی کے طویل مختصر افسانے' اپنے اندر حسن و تاثیر کا ایک پہلو رکھتے ہیں۔ اس پہلو کی جانب ان کے بعض ناقدین نے بھی توجہ دلائی ہے لیکن میں ان سے ذرا ہٹ کر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اتنی بات تو بہت واضح ہے کہ فکشن سے متعلق سارا ادب' خواہ وہ داستان و ناول کی شکل میں ہو یا ڈرامہ اور افسانے کی صورت میں' اپنی مقبولیت و اثر پذیری کے لیے خوب صورت پیرایہ اظہار اور دل کش زبان و بیان کا محتاج ہے۔ کردار اور واقعہ نگاری' جذبات و محسوسات کی مصوری' موضوع و مواد کا نیا پن اور مقصد و مطمح نظر کا ابلاغ' سب کی کام یابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ایک افسانہ نگار زبان کے استعمال یا

اظہار خیال پر کتنا قادر ہے۔ ابوالفضل صدیقی اردو کے ان ادیبوں اور افسانہ نگاروں میں ہیں جنھیں زبان و بیان پر معمولی نہیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ ہر بات اور ہر واقعہ 'ایسے دل آویز و لذیز اور سادہ و پُرکار انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ دل میں اترتا چلا جاتا ہے نتیجتاً" افسانے کی طوالت قاری کے ذہن پر بار نہیں گزرتی بلکہ لطف و انبساط کا سرمایہ بن جاتی ہے۔ لطف بیاں سے قطع نظر' ان کے افسانوں میں' مختلف مقامات کی منظر کشی' کرداروں کی گفتگو اور واقعات کی تفصیل کی معرفت' منفرد و مرکب الفاظ اور محاورات اور ضرب الامثال کا ایک ایسا بڑا ذخیرہ جگہ پا گیا ہے کہ نظیر' میر انیس اور جوش کی یاد دلاتا ہے۔ میں نے اردو لغت کے لیے الفاظ و اسناد کی تلاش میں ابوالفضل صدیقی کے تین افسانوی مجموعے "انصاف" "" آئینہ " اور "جوالا مکھ " پڑھے اور پڑھوائے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تنہا ابوالفضل صدیقی نے الفاظ کا جتنا بڑا ذخیرہ اردو کو دیا ہے شاید ہی ان کے ہم عصر کسی اور افسانہ نگار نے دیا ہو۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

ابوالفضل صدیقی کا ناول "زخمِ دل"

بیسویں صدی کے منفرد اور صاحبِ طرز افسانہ نگاروں کی فہرست بنائی جائے تو اس میں ابوالفضل صدیقی کا نام اس لیے ضرور شامل ہوگا کہ ابوالفضل نے ایک طرف اردو داستان گوئی کی روایت، ٹیکنیک اور مزاج کے وہ عناصر اپنے افسانوں کے مزاج اور بنت میں جذب کیے ہیں جن سے کہانی میں دلچسپی و اثر آفرینی دوچند ہوجاتی ہے اور دوسری طرف جدید دور کی افسانہ نگاری کی ٹیکنیک، تاریخی شعور، تہذیبی مزاج، سماجی مسائل اور ترقی پسند نقطۂ نظر کا ایسا امتزاج کیا ہے جو کسی دوسرے افسانہ نگار کے ہاں اس طور پر نظر نہیں آتا۔ پریم چند کے ہاں گاؤں اور غریب طبقے کی زندگی کہانی میں ضرور ابھرتی ہے لیکن ابوالفضل کے ہاں فرد کی یہ کہانی پورے گاؤں، وہاں کی پوری زندگی، طبقاتی کشمکش، جبر و استحصال اور ناانصافیوں کی ایسی بھرپور تصویر سامنے لاتی ہے جس سے ان کہانیوں کا دامن بے حد وسیع ہوجاتا ہے اور گاؤں دیہات کی پوری جیتی جاگتی زندگی، اپنے سارے تضاد کے ساتھ، بھرپور انداز میں نظروں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ یہ کام ابوالفضل صدیقی نے جزئیات نگاری سے لیا ہے اور اس فنی چابک دستی سے لیا ہے کہ کوئی دوسرا ان کو نہیں پہنچتا۔ اب جب کہ ان کی وفات (ستمبر ۱۹۸۷ء) کے بعد ان کا سارا کام کتابی صورت میں مرتب و شائع ہوگیا ہے، ضروری ہے کہ ہم اور نئی نسل ان کہانیوں کو دوبارہ پڑھیں اور دیکھیں کہ وہ اس صدی کے دوسرے افسانہ نگاروں سے کیسے اور کہاں مختلف ہیں اور انھوں نے فی الحقیقت اردو افسانے کو کیا دیا ہے؟ ان کی متعدد کہانیاں ایسی ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ، کنول کی طرح، آہستہ آہستہ کھل رہی ہیں اور ہمارے لیے اور زیادہ دلچسپ، گہری اور زیادہ پرکشش ہوگئی ہیں۔ "چڑھتا سورج" "گلاب خاص" "جوالا مکھ" "انصاف" "باپ" "ستاروں کی چال" "آخری رسوم کی ادائیگی" "بھیا دیوج" وغیرہ وغیرہ اس کی خوب صورت مثالیں ہیں۔ ابوالفضل صدیقی نے اپنے افسانے جم کر، محنت و توجہ سے لکھے ہیں اور وہ قاری سے بھی جم کر پڑھنے کا تقاضا کرتے ہیں۔

زیرِ نظر ناول "زخمِ دل" ابوالفضل صدیقی کی شاہکار تحریر ہے۔ پچیس سال پہلے جب میں نے اسے پڑھا تھا تو اس کی دلچسپی میں کھو گیا تھا لیکن اب جو دوبارہ پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ یہ ناول نہ صرف اپنے موضوع...... زن، زر، زمین، کے بارے میں ایک منفرد ناول ہے بلکہ ٹیکنیک، اسلوب اور بنت کے اعتبار سے بھی اردو ادب کا ایک بڑا ناول ہے۔ ناول کا مرکزی کردار چترا، کنور نہال رائے کی جواں سال

تیسری بیوی ہے۔ بوڑھے شوہر کا ٹھنڈا وجود' اس کی ابھرتی جوانی کے تقاضے پورا کرنے سے قاصر ہے اور وہ اپنے جوان دیور کنور الفت رائے کو' اپنی چترائی سے' اپنے دام الفت میں گرفتار کر لیتی ہیں اور اس طرح یہ مثلث پورے گھر اور سارے سماج کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور یہ المیہ اجتماعی المیہ بن جاتا ہے جسے ابوالفضل صدیقی نے اپنے پر اثر بیانیہ اور دل کو کھرچ دینے والے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ ناول جاگیردارانہ نظام اور اس کے کلچر کی نمایندہ کہانی بن جاتا ہے۔ جزئیات نگاری کے ساتھ ایک واقعے کے اندر سے دوسرا واقعہ جنم لیتا ہے اور ہر نیا واقعہ ایک طرف کہانی کو رنگا رنگی عطا کرتا ہے اور ساتھ ہی ناول نگار کی اپنے فن پر گرفت اور واقعات کی کڑیوں کو جوڑ کر پلاٹ سے مربوط کر دینے کی غیر معمولی صلاحیت کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ اس میں انسانی فطرت' سماج کے ریت اور رواج' صدیوں پرانا زمین داری نظام' انسانی نفسیات' جنسی تقاضے' پیشہ ور افراد کی نکتہ رسی اور قانونی موشگافیاں کہانی کو ایک فطری رنگ عطا کرتی ہیں۔

ابوالفضل صدیقی کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا تھا' جب ان کا طنزیہ مضمون "ہمارے ایم ایل اے نینی تال میں" دیوان سنگھ مفتون کے ہفت روزہ "ریاست" دہلی میں شایع ہوا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں ان کی باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز ہوا جب ان کا پہلا افسانہ مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی رسالے "ادبی دنیا" لاہور کے سالنامے میں مولانا کے توصیفی نوٹ کے ساتھ شایع ہوا۔ اس کے بعد سے مرتے دم تک وہ طویل و مختصر افسانے' ناولٹ اور ناول لکھتے رہے۔ انھوں نے اپنا آخری افسانہ ستمبر ۱۹۸۷ء میں' فالج کا حملہ ہونے سے آدھ گھنٹے پہلے' مکمل کیا تھا۔ اپنے تخلیقی دور کے ان پچاس سالوں میں ان کے افسانے' ناولٹ' طویل کہانیاں اور ناول قسط وار' برصغیر کے بڑے اور اہم ادبی رسالوں مثلاً "ادبی دنیا" لاہور' "ساقی" دہلی' "شاہکار" لاہور' "نیرنگ خیال" لاہور' "ادب لطیف" لاہور' "ہمایوں" لاہور' "شاعر" آگرہ و بمبئی' "ماہ نو" کراچی' "آج کل" دہلی' "نقوش" لاہور' "سیپ" کراچی اور سہ ماہی "نیا دور" کراچی۔ (یہ ناول: "زخم دل" بھی قسط وار "نیا دور" میں شایع ہوا تھا) میں شایع ہوتے رہے لیکن مزاج کی بے نیازی کے باعث ان کا سارا کام کتابی صورت میں ان کی زندگی میں شایع نہ ہو سکا۔ ابوالفضل کی وفات کے بعد ان کے ادبی جانشین اور معروف افسانہ نگار نذر الحسن صدیقی نے ان بکھرے موتیوں کو جمع کیا اور ایک ایک کر کے کتابی صورت میں شایع کیا۔ ابوالفضل صدیقی کے اب تک آٹھ مجموعے .... "احرام" "انصاف" "جوالا مکھ" "گلاب خاص" "آئینہ" "دن ڈھلے" "ستاروں کی چال" "عہد ساز لوگ" شایع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے تین ناول "تعزیر" "سرور" "ترنگ" بھی شایع ہو چکے ہیں۔ ان کے چار ناولٹ بھی اسی نام سے ان کی زندگی میں شایع ہوئے تھے اور اب یہ ناول "زخم دل" "فضلی سنز کراچی سے شایع ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔

ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ براہ راست اس زندگی سے اخذ کی گئی ہیں جسے انھوں نے خود گزارا یا خود دیکھا' برتا اور بسر کیا ہے اور جن کے باطن سے حقیقی زندگی کی

زندہ تصویریں' اپنے پورے تہذیبی اور سماجی نقش و نگار کے ساتھ' ابھر کر ہمارے شعور کو روشن کر دیتی ہیں۔ اتنے بڑے کینوس پر' جزئیات اور زبان و بیاں پر کامل قدرت کے ساتھ' حقیقی زندگی کی سچی کہانیاں لکھنے والا اس ڈھنگ کا کوئی دوسرا فکشن نگار مجھے نظر نہیں آتا۔ ابوالفضل صدیقی اردو فکشن کی تاریخ کے ایک اہم کردار ہیں اور "زخم دل" ان کا نمایندہ ناول ہے۔

صادق حسین

ابوالفضل صدیقی

ابوالفضل صدیقی افسانہ نگار نہ ہوتے تو عین ممکن ہے کہ وہ کسی درخت کی چھاؤں میں "آلتی پالتی مارے" آنکھیں بند کیے "گیان دھیان میں ڈوبے رہتے۔ آنکھیں نیم وا کرتے تو عقیدت مندوں میں زیرلب تبسم کی شیرینی بانٹ کر پھر غور و فکر کی دنیا میں ڈوب جاتے۔ بات میں بات نکلتی ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ افسانہ لکھنے کا فن اس شخص کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اسے جاگیردارانہ نظام ورثے میں ملا مگر اس کی قلندرانہ طبیعت نے وہ ماحول دل سے قبول نہ کیا۔ جب دل کا تذکرہ ہو تو ایک خیال فی البدیہہ آتا ہے کہ اس شخص کے سینے میں تڑپنے پھڑکنے والا دل تھا۔ یہ شخص کسی کو دکھ میں دیکھتا تو اس کی آنکھیں نم ناک ہو جاتیں۔

برسوں پہلے کی بات ہے' میں نے کراچی کے حلقۂ ارباب ذوق میں ایک افسانہ پڑھ کر سنایا۔ محفل برخاست ہوئی تو کسی نے عقب سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ابوالفضل صدیقی سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس نے مجھے گلے سے لگالیا۔ وہ لمحہ بہت خوب صورت تھا۔ اس ساعت کی کوکھ سے ایک محبت جنم لے کر لاکھوں لمحات پر پھیل گئی۔ خلوص کا یہ رشتہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد تھا۔

ابوالفضل صدیقی میرا افسانہ "بونے" پڑھ کر از راہ محبت مجھے "بونے" کہہ کر پکارتے۔ چناں چہ جب میں ان کے گھر جاتا تو ان کی بچی اندر جا کر کہتی "بونے آئے ہیں۔" یوں بھی اکثر اوقات ہماری گفتگو افسانوں کے کرداروں کے حوالے سے ہوتی۔ ایک دن ابوالفضل صدیقی نے پوچھا "گابو درزن کس حال میں ہے؟" میں چپ ہوگیا۔ گابو درزن کی چتا جان لیوا تھی۔ "گابو درزن اب ہے کہاں؟" ابوالفضل صدیقی نے دریافت کیا۔ "وہ گھر سے نکل کر ندی کی طرف جا رہی تھی۔" میں نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے یاد ہے گابو کی ماں نے ندی میں کود کر جان دے دی تھی مگر گابو ایسا ہرگز نہیں کرسکتی۔" ابوالفضل صدیقی بولے۔ ان کی روشن اور چمک دار آنکھیں بھر آئیں۔

ان دنوں میں گابو درزن کا افسانہ لکھ رہا تھا۔ سانولے رنگ کی گابو جب ہنستی تو اس کے چٹے چٹے دانت بھلے لگتے۔ وہ ٹھمک ٹھمک کر چلتی تو اس کی پازیبوں کی جھنکار سن کر راہ چلتے رک رک جاتے۔ اس کی آواز بڑی سریلی تھی۔ جب وہ ڈھولک پر ماہیا گاتی تو سننے والے دل تھام کے رہ جاتے۔ سب جانتے تھے کہ

اس کا شوہر بشیرا درزی ہر روز اسے پیٹتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دو بیٹیوں کی ماں بن چکی تھی اور بشیرے درزی کو ایک بیٹے کی سخت ضرورت تھی۔ گابو درزن زار و قطار روتی۔ آنچل پھیلا کر خدا سے ایک ننھے منے بیٹے کی بھیک مانگتی۔ اس کی دعائیں قبول نہ ہوئیں۔ ابو الفضل صدیقی کو اس بات کا دکھ تھا کہ گابو درزن احتجاج کیوں نہیں کرتی۔ وہ صدیوں سے بشیرے کے مظالم کیوں برداشت کر رہی ہے۔ اب تو اسے میدان عمل میں اتر کر بشیرے کا آمرانہ رویہ تہس نہس کر دینا چاہیے۔

ابو الفضل صدیقی داستان اور افسانے کے ملاپ کا ایک ناقابل فراموش نام ہے۔ اس نے اپنے افسانوں میں دیہات کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ وہ دیہات' جن کی فضاؤں میں اس نے آزاد زندگی گزاری۔ اس وقت انگریزوں کا راج تھا۔ سیاسی اعتبار سے تو وہ آزاد نہ تھے تاہم انھوں نے اپنے علاقے میں آزاد زندگی بسر کی۔ ان کا دستر خوان وسیع تھا اور شکار کے منصوبے وسیع تر۔ وہ مچان پر بیٹھ کر شکار کھیلنے کے قائل نہ تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جنگل کے بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر' نشانہ باندھنا اور پھر بندوق کی لبلبی دبانے کا نام شکار ہے۔

ابو الفضل صدیقی نے جنگلوں کے دشوار گزار راستے طے کر کے جنگلی جانوروں پر افسانے لکھے۔ "ماتما کا ٹکراؤ" میں مادہ بھیڑیے کو افسانے کا کردار بنا کر ممتا کے جذبے کو امر کر دیا۔ چیتے اور شیر کا شکار کھیلنے والا یہ شخص جب ایک ہرنی کا قصہ سناتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ اس کی بندوق کی گولی سے ایک ہرنی زخمی ہو کر گر پڑی۔ ہرنی' بے کسی کے عالم میں نم ناک آنکھوں سے شکاری کی طرف دیکھنے لگی۔ نیلے آسمان میں تیرتے بادلوں کے سفید ٹکڑے تھم گئے۔ ہوائیں خاموش ہو گئیں۔ سناٹا چھا گیا۔ اگر وہ ہرنی بول سکتی تو زندگی کی بھیک مانگتی۔ اس کا بھی ایک گھر ہو گا' بچے ہوں گے۔ ضرب کاری تھی۔ وہ مر رہی تھی۔ شکاری نے ترس کھا کر اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ دم واپسیں' ہرنی نے شکاری کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا' جن میں دکھ تھا' درد تھا اور ظلم کے خلاف ایک خاموش احتجاج۔ اس ہرنی کی یاد نے عمر بھر ابو الفضل صدیقی کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے "آج بھی مجھے اس ہرنی کی التجا کرتی آنکھیں یاد آتی ہیں تو میری روح کانپ جاتی ہے۔" جب بھی وہ یہ قصہ دہراتے' ان کی آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں۔

ابو الفضل صدیقی کی شریک حیات کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے اپنی بیوی کا فوٹو دکھایا۔ ایک باوقار خاتون جسے دیکھو تو ادب سے نگاہیں جھک جائیں۔ انھوں نے دبے دبے لفظوں میں اعتراف کیا کہ جو آدمی شکار' کتب بینی اور افسانہ نویسی میں کھویا رہے' اس کے پاس گھر گرہستی کے لیے وقت کہاں؟ اس احساس نے ان کے دل پر ایک زخم لگایا تھا۔ موسم بہار میں جب پھول کھلتے اور فضا میں خوشبو پھیلتی تو یہ زخم ہرا ہو جاتا۔

ان دنوں میں کراچی کے انٹیلیجینس اسکول میں رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ماضی میں وہ جگہ فن جاسوسی کی تربیت گاہ ہو مگر اس وقت تو وہ علاقہ سرکاری ملازمین کی رہائش گاہوں کے لیے مخصوص تھا۔

ہمارے گھر کے دروازے ابوالفضل صدیقی کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ وہ جب تشریف لاتے سب سے پہلے آواز دیتے "نرگس کہاں ہو؟" یہ میری بیٹی کا نام تھا۔ وہ سچ مچ نرگس تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ کم زبان۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ ابوالفضل صدیقی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ ایک دن ابوالفضل صدیقی تشریف لائے تو گھر میں وہ چہل پہل نہ تھی۔ میرے بال بچے چند دنوں کے لیے راول پنڈی چلے گئے تھے۔

ابوالفضل صدیقی نے کہا۔ "میں نے ایک دکان میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تصنیف "سیر کہسار" کی دونوں جلدیں دیکھی ہیں۔ چوتھا ایڈیشن جو منشی نول کشور نے ۱۹۳۴ء میں طبع کیا تھا۔ فوراً خرید لو۔"

ہم نے دروازہ بند کیا۔ "سیر کہسار" کی دونوں جلدیں صدر سے خرید کر گھر لائے۔ ابوالفضل صدیقی' گاؤ تکیے سے ٹیک لگا'' "سیر کہسار" پڑھ کر سنانے لگے' مزے لے لے کر' تلفظ کے پورے احترام کے ساتھ۔ کھنکتی ہوئی آواز کے زیر و بم نے سماں باندھ دیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے داستان گوئی کا عہد لوٹ آیا ہو۔ پہلی جلد کے ۴۹۶ صفحات تھے۔ ابوالفضل صدیقی نے اس ایک نشست میں پچاس صفحے پڑھ ڈالے۔ چائے کی طلب ہوئی تو ہم دونوں نے مل کر چائے بنائی۔ پانی ابالنے اور دودھ کھولانے میں چند فنی دشواریاں پیش آئیں۔ ہاتھوں کی انگلیوں کے کونے جلا کر ان دشواریوں پر قابو پالیا گیا۔

"آج اس گھر میں کتنی آزادی ہے۔" ابوالفضل صدیقی نے چائے کی چسکی لے کر کہا۔

"آہستہ بولو۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ بیگم کو پتا چل گیا تو قیامت آجائے گی۔"

میرا جواب سن کر ابوالفضل صدیقی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ لمحات' ہنستے مسکراتے بڑی تیزی سے گزر گئے۔ ہمیں پتا نہ چلا کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ محفل برخاست ہوتی تو میں ابوالفضل صدیقی کو Lovers' Bridge کی طرف جانے والی کوئنز روڈ تک پہنچا کے واپس آجاتا۔ سنا ہے کہ جب کراچی میں بسنے والے بے لوث تھے تو یہ پل محبت کرنے والوں کی پناہ گاہ تھا۔

" تمہارے شہر میں بھی کوئی Lovers' Bridge ہوتا ہے؟" ایک دن ابوالفضل صدیقی نے پوچھا۔

"نہیں۔"

" ہر بستی میں Lovers' Bridge ہوتا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی رنگ میں اس پل سے گزرتا ہے۔ اس سفر کے لیے جذبوں کا کندن' زاد راہ ہوتا ہے۔ مسافر چوک جائے تو پل سے نیچے گر جاتا ہے اور پھر زندہ بچ جائے تو مرتے دم تک اسے بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔"

اس رات ہم کوئنز روڈ کے پاس پہنچے تو وہاں چند افراد ایک گھوڑا گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ وہ گھوڑا گاڑی اکبر کوچوان کی تھی۔ وہ مکرانی نوجوان وہاں سواریوں کا انتظار کیا کرتا تھا۔ جب بھی اس سے مڈھ بھیڑ ہوتی ابوالفضل صدیقی دو چار لفظوں کی مصری دے کر اسے نہال کر دیتے۔ وہ زندگی کی راہوں سے

چپ چاپ گزر جانے کے قائل نہ تھے۔ فرمایا کرتے تھے۔ "جو شخص محنت کشوں سے دوستی نہ کرے وہ افسانہ نہیں لکھ سکتا۔"

ایک شام اکبر کوچوان نے کہا تھا۔ "سائیں! میری تو اکیلی جان ہے۔ آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اگر میں اس ملک کا بادشاہ بن جاؤں تو کراچی شہر کے سب کوچوانوں کو ہر روز سیخ کباب کھلاؤں۔ ان کے گھوڑوں کی نعل بندی کی اجرت سرکاری خزانے سے ادا کروں۔"

اس رات' اکبر کوچوان' بگھی کا سائبان کھول کر پچھلی نشست پر سو گیا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں سڑک پر پڑا چابک نظر آ رہا تھا۔ گھوڑا گردن جھکائے کھڑا تھا۔ اب اکبر کوچوان کو سواریوں کا انتظار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے شہر کی روشنیاں بجھ گئی ہوں۔ ابو الفضل صدیقی' چپ چاپ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں قدم قدم چلتا گھر پہنچا۔ در و دیوار سے وحشت برسنے لگی۔ دوسرے دن ابو الفضل صدیقی نے مجھ سے کہا۔ "تم اکبر کوچوان کا افسانہ لکھنا۔"

ایک دن ابو الفضل صدیقی اور میں' کراچی کے صدر میں ایک فٹ پاتھ پر جا رہے تھے۔ اچانک انھیں کوئی خیال آیا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اسی راستے پر واپس چل پڑے اور پھر یکایک ایک جگہ رک گئے۔ دفعتا" ایک زیر مرمت عمارت کی چوتھی منزل سے ایک سریا زناٹے سے آیا اور میرے سر کے بالوں کو چھوتا' فٹ پاتھ پر جا پڑا۔ دھڑام' کھلبلی مچ گئی۔ ابو الفضل صدیقی نے شور مچا دیا "مر گیا۔ مر گیا۔ اسپتال لے چلو۔" لوگ ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ابو الفضل صدیقی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "زندہ ہو؟" میں نے اثبات میں سر ہلا لیا تو وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "اگر تم مر جاتے تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔" یہ حادثہ انھیں کئی دنوں تک نہ بھولا۔ جب ملتے مجھے گلے سے لگا لیتے اور میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتے جن میں محبتوں کی بھیڑ لگی ہوتی۔

میں سرکاری ملازمت چھوڑ کر ایک برطانوی کمپنی میں چلا گیا۔ بین الاقوامی شہرت کا وہ ادارہ بھاری بھرکم مشینری فروخت کرتا تھا۔ اس ملازمت کے ابتدائی دنوں میں جب میں کل پرزوں کی بات کرتا تو ابو الفضل صدیقی کہتے۔ "میاں! لوہے کی صحبت میں لوہا نہ بن جانا۔ خوشبو اور پھولوں کی دنیا سے کنی کاٹ کر کدھر جا رہے ہو۔"

چند برس کے بعد برطانوی کمپنی نے ترقی دے کر میرا تبادلہ لاہور کر دیا۔ ابو الفضل صدیقی لاہور آئے تو مجھے ساتھ لے کر' ادبی دنیا' کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین احمد سے ملے۔ دوران گفتگو میں مولانا نے ابو الفضل صدیقی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میاں! پہلے تو محبوبہ پردہ نشیں تھی۔ لب بام نظر آئی تو غزل ہو گئی۔ چلمن کے پیچھے کھڑے دیکھا تو افسانہ بن گیا۔ اب تو وہ بن سنور کے سڑکوں پر آ گئی ہے' افسانہ کس پر لکھو گے؟" ابو الفضل صدیقی اس محترم شخصیت کے سامنے کچھ نہ بولے۔ راستے میں نہایت خوب صورت لفظوں میں مولانا کے علم و فن کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "افسانے کے موضوعات تو ہمارے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ بات حسن انتخاب کی ہے۔ افسانہ نگار کو بہت دکھ بھوگنے پڑتے

ہیں تب جا کر کہیں افسانہ پیدا ہوتا ہے۔"

ابوالفضل صدیقی واپس کراچی چلے گئے۔ ہماری خط و کتابت بڑی شرمیلی تھی۔ احباب کراچی سے لاہور آتے تو ابوالفضل صدیقی کی صحت و سلامتی کی خبر مل جاتی۔ کوئی دوست لاہور سے کراچی جاتا تو ابوالفضل صدیقی ہماری خیر و عافیت دریافت کر لیتے۔ سیانے کہتے ہیں کہ خط میں نصف ملاقات ہو جاتی ہے۔ پیغام رسانی کے اس طریقے سے ہماری پوری ملاقات ہو جاتی تھی۔

ایک عرصے کے بعد ابوالفضل صدیقی کا ایک خط ملا' جس کے ہر لفظ نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ میری بیٹی نرگس کا طرابلس میں اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ وہ شادی کے بعد ہنستی مسکراتی اس دیس کو روانہ ہوئی اور اب اس کا تابوت بے جان کارگو کے ساتھ آ رہا تھا۔ ابوالفضل صدیقی کے اس خط میں آنسوؤں کے موتی بکھرے پڑے تھے۔ لفظوں کی آنکھوں سے بہتے آنسو بڑے درد آشنا ہوتے ہیں۔

ابوالفضل صدیقی تھک جاتے تو ایک پیڑ کی گھنی چھاؤں میں ستا لیتے۔ یہ پیڑ ڈاکٹر جمیل جالبی تھے۔ اس پیڑ کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں۔ اس کے پتے سدا سر سبز رہتے ہیں۔ سردی ہو یا گرمی' بہار ہو یا خزاں' اس پیڑ سے ایک خوشبو آتی رہتی ہے۔ یہ خوشبو ابوالفضل صدیقی کو نت نیا افسانہ لکھنے کے لیے اکساتی۔ اس خوشبو نے آخری دم تک ابوالفضل صدیقی کا ساتھ دے کر محبت اور خلوص کے رشتوں کی آبرو قایم رکھی۔

ابوالفضل صدیقی زمین سے پیار کرتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دھرتی کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ وہ جانتے تھے' کس مٹی میں آم کی گٹھلی دبا دو تو کتنے عرصے میں وہ گٹھلی اپنا سینہ چیر کر اپنے اوپر ایک درخت کھڑا کر لے گی۔ بور کب آتا ہے۔ کیری کب نمودار ہوتی ہے۔ جالی کب پڑتی ہے۔ تب وہ ایک پیڑ کی منتخب ٹہنی میں پیوند لگا کر پرانی نسل کے وجود سے نئی نسل کے پُر امید مستقبل کی ابتدا کرنا بھی جانتے تھے۔ انھیں اس بات کا علم تھا کہ نے کا سینہ چیر دیتے ہیں تو کیوں اس کے اندر سے سوز و گداز کے چشمے اُبل پڑتے ہیں۔

دوسروں کا درد اپنا درد سمجھنے والا' لفظوں کا بادشاہ' روہیل کھنڈ سے آیا اور محبتوں کی سوغاتیں بانٹ کر چپ چاپ چلا گیا۔ وہاں' جہاں سب کو جانا ہے۔ جانے سے پہلے جو کچھ اس نے قلم سے لکھا اور زبان سے کہا وہ تو اب ایک امانت ہے' جسے اہل درد آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرنا اپنا مقدس فریضہ سمجھتے ہیں۔

ضیا جالندھری

مجسم محبت......ابوالفضل صدیقی

ابوالفضل صدیقی کو اگر اپنا دوست کہوں تو یہ ایک طرح کی بے ادبی لگتی ہے کہ وہ عمر میں مجھ سے پندرہ بیس سال بڑے تھے۔ ان سے ہم عمر دوستوں والی بے تکلفی نہ تھی۔ اور انھیں بڑا کہنے سے یوں جھجکتا ہوں کہ زندگی میں وہ شاید یہ بات پسند نہ کرتے تھے۔ ہرچند وہ مجھے "میاں" کہہ کر خطاب کرتے تھے لیکن خود کو ہمیشہ میرا ہم عصر گردانتے تھے۔ اور یہ اس حد تک درست بھی ہے کہ ہماری تحریریں (ان کے افسانے اور میری نظمیں) تقریباً" ایک ہی وقت میں "ادبی دنیا" لاہور میں چھپنا شروع ہوئی تھیں' اور اس سے میں ان کے نام سے آشنا ہوا تھا (رسالوں کی دنیا سے)۔ پھر جب ۱۹۴۷ء میں' میں اور میرا دوست اور ساتھی اعجاز حسین بٹالوی آل انڈیا ریڈیو کے دلی اسٹیشن پر ہندوستانی تقریروں کے شعبے سے منسلک تھے تو اعجاز نے انھیں ایک پروگرام میں حصہ لینے کے لیے دلی آنے کی دعوت دی۔ وہ آئے تو ہم نے انھیں اس تصور سے بالکل مختلف پایا جو ان کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں تھا۔ مگر ہوا یوں کہ جتنی حیرت انھیں دیکھ کر مجھے ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ مجھ سے مل کر انھیں ہوئی بلکہ لطیفہ یہ ہوا کہ جب اعجاز نے ان سے میرا تعارف کروایا تو وہ میرے نام کو میرے والد صاحب کا نام سمجھے اور کہنے لگے کہ اچھا آپ ضیا جالندھری صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ اور یہ اس لیے کہ وہ مجھے اپنا ہم عصر نہیں اپنا ہم سن بھی سمجھے تھے یا شاید اس سے بھی زیادہ۔

بہرحال وہاں ان سے ایسے ملاقات ہوئی تھی اور پھر آزادی کے بعد ہم پاکستان آگئے اور وہ وہیں بھارت میں رہ گئے۔ کچھ عرصے بعد عجیب بات یہ ہوئی کہ آزادی کے بعد ہندوستان سے پہلا خط جو میرے نام آیا وہ صدیقی صاحب کا تھا۔ وہ ان حادثات اور فسادات کے بعد جن سے دونوں ملکوں میں قیامت صغرا بپا تھی وہ میری اور اپنے احباب کی خیریت جاننا چاہتے تھے۔ یہ خط دیکھ کر پہلی دفعہ ان سے عجیب قسم کی یگانگت اور محبت کا احساس ہوا مگر پھر یہ بات بھی بھول گئی۔

پھر وہ پاکستان آگئے' لاہور آئے تو تلاش کرکے ملے' مگر ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع اس کے بہت بعد ملا۔ ۱۹۵۶ء میں ملازمت کے سلسلے میں کراچی گیا تو وہاں کے اور ادیبوں سے جہاں ملاقاتیں بڑھیں' صدیقی صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوتیں' مگر جلد ہی احساس ہوگیا کہ ان سے تعلقات اب صرف ادب کے دائرے تک محدود نہیں رہے۔ کراچی میں' میں جس دفتر میں کام کرتا تھا' وہ صدر میں مسجدِ خضرا

کے سامنے تھا۔ اس وقت تک کراچی میں صدر کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ کراچی میں رہنے والوں کا اکثر اس طرف آنا ہوتا تھا۔ صدیقی صاحب جب بھی صدر آتے دفتر تشریف لاتے اور کچھ دیر ضرور بیٹھتے۔ گفتگو ادب کے دائرے سے نکل کر عام حالات پر تبصرے تک پہنچتی اور پھر رفتہ رفتہ ذاتی بلکہ گھریلو مسائل تک جا نکلتی۔ اکثر مہاجرین کی طرح ان کے بھی بہت سے مسائل تھے۔ روہیل کھنڈ کے اچھے کھاتے پیتے زمین دار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ادھر آ گئے تھے۔ کہیں الاٹمنٹ کے مسائل تھے' کہیں بچوں کے لیے روزگار کی تلاش۔ ۱۹۵۶ء میں میرے کراچی پہنچتے تک ان میں سے بہت سی مشکلوں پر قابو پا چکے تھے' لیکن زندگی ہے تو اس کی الجھنیں بھی ساتھ چلتی ہی رہتی ہیں۔ جو مسئلہ بھی ہوتا اس کا تفصیل سے ذکر کرتے اور مجھ سے قریبی رشتہ داروں کی طرح اپنے گھریلو مسائل پر بھی مشورہ کرتے۔ میں ہرچند ان مسائل میں کافی بودا تھا' مگر ان کے ساتھ ان کے مسائل پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرتا اور اکثر نا قابل قبول مشورے دیتا۔ ان دنوں ہمارے مشترک دوست الطاف گوہر بھی مشرقی پاکستان سے کراچی آ گئے۔ یہ ان سے بہت خوش تھے۔ الطاف گوہر ان دنوں کراچی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ ان کا وطیرہ یہ تھا کہ اگر کسی کا کوئی کام کرتے تو اس طرح کہ کام کرنے والے کو یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ انھوں نے اس کے ساتھ کوئی نیکی کی ہے بلکہ جس کا کام کرتے کچھ اس انداز سے کرتے کہ الٹا اس کو ناراض کر دیتے۔ ابوالفضل صدیقی شاید ان چند خوش نصیبوں میں سے تھے کہ جب ان کے ایک آدھ مسئلے کو انھوں نے حل کیا تو اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ صدیقی صاحب اس کے بعد ہمیشہ ان کے مداح اور گرویدہ رہے۔

صدیقی صاحب سے ملاقاتیں بڑھیں تو ان کے رشتے داروں اور عزیزوں سے بھی میل ملاپ ہوا۔ اور یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ ان کے یہاں اعزہ اور رشتہ داروں میں وہ یگانگت اور محبت اپنی پوری شدت سے موجود تھی جو زمانہ حاضر میں معاشرے سے اٹھتی جا رہی ہے۔ ان کے بچوں کی شادیاں بھی اپنے عزیزوں ہی میں ہوئی ہیں اور یہ دوہرے تہرے رشتے اتنے گہرے ہیں کہ ان کی بنت کے تانے بانے شمار کرنے میں مجھے دقت ہوتی تھی۔ آج کل جنریشن گیپ (generation gap) کا بہت ذکر ہے' مگر صدیقی صاحب کے پورے خاندان میں بزرگوں کا ادب جس طرح کیا جاتا ہے وہ ہماری مشرقی روایت کی ایک خوب صورت مثال ہے۔ حتیٰ کہ پوتے پوتیوں' نواسے نواسیوں کے متعلق اہم فیصلے بھی ان سے پوچھے بغیر نہ ہو سکتے تھے۔ اور انھیں ہمہ وقت ایک ایک کی جس طرح فکر رہتی تھی اس سے ان کے اس گہرے لگاؤ کا اندازہ ہوتا جو ان کو ان سب سے تھا۔ وہ اپنے بڑے بیٹے شاہد کے ساتھ رہتے تھے جو اب اسٹیٹ بینک میں افسر ہیں۔ زینت بہن یعنی شاہد کی بیوی (جو ان کی فرسٹ کزن بھی ہیں یعنی صدیقی صاحب کی حقیقی بھانجی) صدیقی صاحب کا اس طرح خیال رکھتی تھیں کہ بیٹی بھی باپ کا کیا خیال رکھے گی۔ صدیقی صاحب کی بیٹی عذرا بھی عزیزوں میں ہی بیاہی گئی ہیں (حقیقی بھانجے سرفراز محمد میاں سے)۔ عذرا کی صحت کے متعلق وہ ہمیشہ بہت متفکر رہتے تھے۔ ان کے گھرانے میں ادب سے شغف ان کے علاوہ دوسرے بہت سے عزیزوں کو بھی ہے۔ ان کے والد صاحب قبلہ ابوالحسن صدیقی بصیر بدایونی شاعر و ادیب تھے' مخزن

وغیرہ جیسے رسالوں میں لکھنے والے۔ اردو' فارسی' انگریزی میں شعر کہتے۔ چھوٹے بھائی ابو مسلم صدیقی بھی ایک زمانے میں "ادبی دنیا" "عالم گیر" وغیرہ میں باقاعدگی سے لکھتے تھے' مگر اس روایت کو زیادہ خلوص اور محنت سے آگے بڑھانے میں ان کے بھتیجے نذر الحسن صدیقی جو خود ایک اچھے افسانہ نگار ہیں' سب سے آگے ہیں۔

ناظم آباد کے جس گھر میں صدیقی صاحب رہتے تھے' اس کے ڈرائنگ روم میں ان کی بیوی کی تصویر تھی۔ مرحومہ کا ذکر بڑی اپنائیت اور محبت سے کرتے تھے اور ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کی تفصیل بھی بیان کرتے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی بتاتے کہ اپنی جوانی کا بیشتر حصہ انھوں نے اپنے گھر کے مردانے حصے میں گزارا۔ مہینوں زنانے میں جانے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ اس زمانے کی تہذیب و روایت کے مطابق صدیقی صاحب مردانے ہی میں رہتے' دن کو بھی رات کو بھی۔ وہیں مجلس لگتی۔ وہیں شکار کے پروگرام بنتے۔ وہیں زمینوں کے معاملے طے ہوتے' علاقے کے مسائل حل ہوتے۔ جب تک ان کے والد حیات تھے کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ زمین دار تو تھے ہی مگر جیسا اوپر بیان کیا شاعر و ادیب بھی تھے۔ ادب سے لگاؤ صدیقی صاحب کو انھیں سے ورثے میں ملا تھا۔ صدیقی صاحب نہ صرف اپنے ذاتی گھریلو حالات کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے' بلکہ میرے ذاتی گھریلو معاملات میں بھی بہت مثل قریبی عزیزوں کے دلچسپی لیتے۔ میری بیوی اور بچیوں سے ان کے تپاک کا یہ حال تھا کہ وہ سب بھی ان کو بے حد چاہتے تھے۔ ان کی ذرا سی تکلیف پر صدیقی صاحب نہ صرف خود پریشان ہو جاتے بلکہ میرے درپے ہو جاتے۔ ان کے یہاں کوئی تقریب ہو تو اس میں شامل نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور پھر باقاعدہ عزیزوں رشتے داروں کی طرح ان کی طرف سے مٹھائی اور تحائف پہنچتے رہتے' یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اور اس رسم کو نبھانا وہ جب بھی نہ بھولے جب میں اسلام آباد آچکا تھا۔ ان کے پوتے کی منگنی پر ہم کراچی نہ جاسکے جس کی انھوں نے بہت شکایت کی' مگر ہمارے حصے کی مٹھائی اسلام آباد ضرور بھیجی۔ اس طرح ان کے گھر میں جب بھی خوشی کی کوئی تقریب ہوتی وہ ضرور یاد کیا کرتے۔

انھیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ سڑسٹھ برس کی عمر میں وفات پاجائیں گے۔ ان کی پیدائش پر ان کے والد نے ایک مشہور مقامی جیوتشی پنڈت گوپی ناتھ سے ان کا زائچہ بنوایا تھا اور بہ قول صدیقی صاحب ان کی زندگی کے بعض اہم واقعے اس زائچے کے عین مطابق پیش آئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنا اثاثہ بچوں میں اپنی وفات سے پہلے ہی تقسیم کردیں' پسماندگان کو جو کچھ کہنا سننا ہے وہ اس سال لگنے سے پہلے ہی کہہ سن لیں پھر مہلت ملے یا نہ ملے۔ ایک دن اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ کچھ اپنے پاس بھی رکھ لیں کیوں کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ جوتشیوں کا جوتش غلط ہو جائے اور آپ ۶۷ برس کی عمر کے بعد بھی زندہ رہیں تو پھر آپ تو بچوں کے محتاج ہو جائیں گے۔ اس بات پر بہت ہنسے کہنے لگے کہ تم عمر میں تو چھوٹے ہو' مگر بات بوڑھوں ایسی کرتے ہو۔ خیر اس کے بعد جب ملتے کہتے کہ شاید یہ آخری ملاقات ہو' مگر قدرت کے معاملات میں کون دخل دے سکتا ہے۔ وہ موت کا انتظار کرتے

رہے اور کئی سال تک کرتے رہے اور پھر ماشاء اللہ دھڑلے سے جیتے رہے' ایک دو سال نہیں بلکہ دو دہائیاں۔ بعد میں اکثر کہتے کہ اور جوتشیوں نے سب درست بتایا تھا' یہ موت کے مسئلے میں چوک گئے۔ یہ مسئلہ شاید ان کے نجوم سے بھی آگے تھا۔ جینز (genes) کے ماہرین کہتے ہیں کہ پیدائش کے وقت انسان کی موت بھی اسی طرح طے ہوجاتی ہے جیسے کمپیوٹر کا پروگرام۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی حادثہ راستے میں آلے ورنہ انسان کے جسم اور دماغ کے خلیوں کے معائنے سے ماہرین یہ تک بتا سکتے ہیں کہ کس کی عمر کتنی ہوگی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ صدیقی صاحب بلا کے وضع دار تھے۔ یہاں تک کے لباس کے معاملے میں وہ گھر سے شیروانی اور اسی کپڑے کی دوپلی پہنے بغیر گھر سے نہ نکلتے تھے۔ کراچی کی گرمی اور اس میں وہ اسی لباس میں میرے دفتر آتے تھے۔ بار بار پانی پیتے مگر مجال ہے کہ ٹوپی اتار لیں یا شیروانی کے بٹن کھول لیں۔ ہاں آخر عمر میں اس وضع میں کچھ فرق ضرور آگیا تھا۔ میں نے ایک آدھ بار انھیں اپنے گھر سے باہر ململ کے کرتے اور شلوار میں بھی دیکھا' مگر ٹوپی کے بغیر نہیں۔ ہاں شیروانی نہ ہو تو قراقلی یا مخمل کی دوپلی پہنتے۔ ان کے پاس نہ جانے کتنی شیروانیاں تھیں۔ بیسیوں تو ضرور ہوں گی۔ میں روز ایک نئی شیروانی میں دیکھتا تھا۔ انھیں بہت سی چیزیں جمع کرنے کا جنون تھا۔ دو چیزوں سے انھیں خاص شغف تھا۔ ایک تو بندوقیں دوسرے فونٹین پین وغیرہ۔ ہر قسم کی بندوقیں ان کے پاس تھیں' اور نہ جانے کتنی۔ شکار تو اب نام ہی کو رہ گیا تھا' مگر ایک ایک بندوق کے شجرہ نسب سے کارگزاری تک ماہرانہ تفسیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بعض اوقات گھنٹوں ان بندوقوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہوں اور اس طرح سے اپنی رفاقت نبھاتا ہوں۔ اسی طرح ان کے پاس بے شمار فونٹین پین' بال پوائنٹ وغیرہ تھے۔ ایک دن مجھے کچھ پین دکھلائے۔ کوئی ڈیڑھ سو کے قریب تو ایک مخصوص ڈبے میں رکھے تھے جو انھوں نے اسی مقصد کے لیے بنوایا تھا۔ ہر ملک ہر میک کے پین' ایک سے ایک قیمتی' پچھلی نسل کے نئی نسل کے۔ مختلف قسم کی نبوں والے' بال پوائنٹ وغیرہ وغیرہ۔ جب بھی لکھنے بیٹھتے بڑی احتیاط سے ان میں سے اس دن کے قلم کا انتخاب کرتے۔ طریقہ انتخاب بھی عجیب و غریب تھا' ایک ایک پین کو کچھ دیر ہاتھ میں لے کر لکھتے پھر ان میں سے ایک پسند کر لیتے اور اس دن اسی قلم سے لکھتے اور جتنی باقاعدگی سے وہ لکھتے تھے اس پر حیرت ہوتی تھی۔ انھوں نے زندگی میں بہت لکھا' ہم ایسے تساہل پسند تو حیرت ہی کر سکتے ہیں۔ ناول' افسانے' کہانیاں' خاکے' تاریخی واقعات غرض کہ آغاز عمر سے جو لکھنا شروع کیا تو آخر عمر تک دم نہیں لیا۔

صدیقی صاحب گفتگو کے دل دادہ تھے۔ پہروں ہندوستان میں اپنی زمین داری کے زمانے کی داستانیں سناتے۔ اپنے بزرگوں کی' اپنے بچپن' اپنی جوانی کی باتیں کرتے۔ اپنے شکار کے قصے سناتے اور ہر بات اتنی تفصیل سے جزئیات کے ساتھ بیان کرتے کہ نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ اسلام سے دلی لگاؤ تھا اور دو قومی نظریے کے سلسلے میں مسلمانوں کی منزل بہ منزل مساعی کا بڑے جوش و خروش سے تذکرہ کرتے۔ اکثر بیان کے دوران کوئی نامانوس لفظ یا محاورہ استعمال کرتے تو اس لفظ یا محاورے کی وضاحت کرتے اور اس کے محل استعمال پر بحث کرتے۔ ان کی تحریریں پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ان کی کہانیاں

جزئیات اور تفاصیل کے خزانے ہیں۔ مرحوم گفتگو میں بھی اسی طرح منظر کشی کرتے تھے۔

زبان پر انھیں قابل رشک عبور تھا اور اکثر ایسے الفاظ استعمال کرتے جو کسی مخصوص ماحول یا وقت پر ہی بولے جا سکتے تھے۔ لیکن اہلِ زباں ہونے کے علاوہ' اس زبان دانی کے باوجود زبان کے مسئلے میں بہت فراخ دل تھے۔ اردو کے عاشق تھے اور اس کے نفاذ کے لیے بیتاب۔ ایک دفعہ میرے دفتر آئے تو کہنے لگے۔ "دیکھو مولانا صلاح الدین احمد نے کمالِ جرأت اور حوصلے کا اظہار کیا ہے۔ صدر پاکستان جنرل ایوب خاں نے لاہور میں ایک جلسہ عام میں اپنے خطاب کا آغاز پنجابی زبان میں کیا تو مولانا اٹھے اور کہنے لگے کہ جناب آپ پاکستان کے صدر ہیں' پنجاب کے نہیں اور ملک کی زبان اردو ہے۔ آپ تقریر اردو میں کریں۔" صدیقی صاحب کی یہ بات سن کر میں نے کہا کہ اگر صدر پاکستان پنجاب میں پنجابیوں سے پنجابی زبان میں خطاب کرتا ہے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ اول تو صدر کی بات ان تک زیادہ آسانی سے پہنچ جائے گی۔ دوسرے میں زبان کے بارے میں مخالفت کے رویے کے خلاف ہوں کیوں کہ میں سمجھتا ہو کہ علاقائی زبانوں کی ترقی سے قومی زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ فائدہ ہی پہنچتا ہے' ہمیں پاکستان کی سب زبانوں کی ترقی کی کوشش کرنی چاہیے۔ صدیقی صاحب یہ سن کر کچھ بجھ سے گئے اور اس روز جو گئے تو کئی مہینے ملاقات نہ ہوئی۔ اور یہ بات مجھے مدتوں بعد ان کا وہ خاکہ پڑھ کر جو انھوں نے مجھ پر لکھا تھا معلوم ہوئی کہ وہ یہ طے کر کے گئے تھے کہ اب وہ چھ مہینے مجھ سے بات تک نہ کریں گے۔ مگر اردو سے اس شدید محبت کے باوجود تنگ دل یا متعصب قطعاً" نہ تھے۔ ایک بار حلقۂ اربابِ ذوق میں کسی تحریر میں کسی لفظ کے بارے میں بحث ہو رہی تھی' میں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ میں ابھی بات کر ہی رہا تھا کہ مسٹر دہلوی نے مجھے ٹوکا کہ آپ تو پنجابی ہیں' آپ اس بحث میں دخل نہ دیں تو بہتر ہو گا۔ یہ سن کر صدیقی صاحب کے تیور یک دم بگڑ گئے۔ مسٹر دہلوی سے خطاب کر کے پوچھا۔ "کیوں صاحب مجھے اردو آتی ہے یا نہیں۔" "مسٹر دہلوی نے کہا۔ کیوں نہیں صاحب' آپ تو اہلِ زباں ہیں آپ کی تحریریں پڑھ کر تو ہم قلم سیدھا کرتے ہیں۔ اس پر ان سے کہنے لگے کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں جو کچھ لکھتا ہو ضیا جالندھری کو جا کر سناتا ہوں' وہ صاد کرتے ہیں تو چھپواتا ہوں۔ جہاں وہ نشان دہی کرتے ہیں۔ بدل دیتا ہوں۔ یہ سن کر مسٹر دہلوی تو چپ ہو گئے' مگر میں حیران کہ ایسا واقعہ تو کبھی پیش نہ آیا تھا۔ وہ مجھے اپنی تحریریں سناتے تو ضرور تھے مگر اس لیے نہیں کہ میں کسی لفظ کے بارے میں مشورہ دیتا۔ میں تو صرف ان سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ جلسے کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ حضور یہ میں نے کب نشان دہی کی تھی' تو ہنسے اور کہنے لگے بھئی میں تو زبان کے سلسلے میں پنجابیوں کا قائل ہوں۔ اقبال' ظفر علی خاں سے لے کر آج تک کتنے لکھنے والے ہیں جنھوں نے اردو کو اتنی ترقی دی ہے' اس کی جھولی اعلیٰ ادب سے بھر دی ہے اور پھر بھی سچی بات یہ ہے کہ میرے افسانوں کی پذیرائی بھی مولانا صلاح الدین احمد نے کی' انھوں نے ہی میری کہانیاں "ادبی دنیا" میں شایع کیں اور آج جو میں ادبی دنیا میں کچھ ہوں تو انھیں کی حوصلہ افزائی کے سبب ہوں۔ یہ جو اردو کے اجارہ دار اردو کو صوبوں' علاقوں اور خانوں میں بانٹتے ہیں تو مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے۔

صدیقی صاحب کراچی میں حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسوں میں باقاعدگی سے آتے تھے اور اکثر حلقے کے جلسوں میں اپنی کہانیاں بھی پڑھا کرتے تھے اور حلقے کے نوجوان نقاد ان پر جو تنقید کرتے تھے اس کو نہایت تحمل سے سنا بھی کرتے تھے۔ حلقے میں شعروں پر بے ساختہ داد کا رواج نہ تھا۔ غزل یا نظم ختم ہونے پر اس کے محاسن و نقائص پر رائے کا اظہار کیا جاتا تھا' مگر صدیقی صاحب اکثر کسی شعر یا مصرع پر بے طرح پھڑک کر داد دیتے تھے۔ وہ اچھے شعر یا اپنی پسند کے شعر سن کر ضبط نہ کرسکتے تھے۔ یہ ان کی عمر بھر کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ اسی تربیت سے متعلق ایک واقعہ یاد آیا۔ ن م راشد کے انتقال کی خبر لندن سے آئی تو حلقہ اربابِ ذوق کے اجلاس میں قراردادِ تعزیت پیش ہوئی۔ حاضرین نے دعائے مغفرت کی اور قرارداد منظور ہوئی کہ آیندہ ہفتے ایک خصوصی نشست ہوگی جس میں راشد پر مضامین پڑھے جائیں گے۔ اس ہفتے کے دوران یہ خبر ملی کہ راشد کو دفنایا نہیں گیا بلکہ اس کی وصیت کے مطابق اسے نذرِ آتش کیا گیا تھا۔ اس کا بڑا شدید ردِ عمل ہوا۔ آیندہ ہفتے جب ہم ہفتہ وار نشست کے لیے پہنچے تو معلوم ہوا کہ پروگرام تبدیل کردیا گیا۔ مگر اس روز سب سے دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ صدیقی صاحب نے اس بات پر اصرار کیا کہ گزشتہ ہفتے کی روئداد میں دعائے مغفرت پڑھنے والوں کی فہرست میں سے ان کا نام خارج کیا جائے کیوں کہ وہ اس غیر اسلامی فعل کے بعد خود کو دعائے مغفرت میں شامل نہیں کرنا چاہتے۔

ایک روز دفتر آئے تو میں کچھ بجھا بجھا سا بیٹھا تھا۔ وجہ پوچھی تو میں نے بتایا کہ اخبار میں خبر پڑھی ہے کہ احمد شاہ بخاری پطرس کے صاحبزادے ہارون بخاری نے ہمارے دوست الطاف گوہر پر الزام لگائے ہیں جن میں پاکستان دشمنی بھی شامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ روز پیشتر ان کی بیوی نے کھانے کی محفل میں الطاف گوہر کو پاکستان کے خلاف باتیں کرنے پر ٹوکا تھا۔ ان دنوں الطاف گوہر حکومتِ وقت کے عتاب میں تھے۔ ملازمت سے الگ کیے جاچکے تھے اور ان پر کچھ مقدمے قایم کیے گئے تھے۔ اس پریشانی میں اس قسم کی الزام تراشی پر اور وہ بھی پطرس کے بیٹے کی طرف سے یقیناً اداس کرنے والی تھی۔ صدیقی صاحب سن کر کہنے لگے۔ دیکھو میاں خدا کسی کو آزمایش میں نہ ڈالے۔ تمھیں کیا پتا کہ ہارون نے یہ بیان خود دیا ہے یا ان سے دلوایا گیا ہے۔ ان کی اس بات سے میں اور بھی پریشان ہوا۔ اتفاق سے اس زمانے کے انٹیلی جینس کے سربراہ کی ایک عزیزہ وزارتِ اطلاعات میں کسی زمانے میں ہماری شریکِ کار رہ چکی تھیں' ایک جگہ مل گئیں تو ان سے ذکر آیا کہ تمھارے بزرگ لوگوں سے کس طرح بیان حاصل کرتے ہیں۔ ان محترمہ نے یقین دلایا کہ یہ قیاس غلط تھا۔ کیوں کہ اس ایک واقعے کی وہ خود گواہ تھیں۔ ٹیلی فون انھوں نے ہی اٹھایا تھا اور ہارون بخاری کے کہنے پر اپنے بزرگ پولیس کے سربراہ سے بات کروائی تھی۔ انھوں نے فون پر اپنے بزرگ کو بار بار یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ آپ یہ ساری بات لکھ کر دینے کو تیار ہیں' بعد میں آپ اپنے اس بیان سے انحراف تو نہیں کریں گے اور کیا آپ کے پاس اس کے گواہ موجود ہیں۔ بہرحال بعد میں جب عدالت نے الطاف گوہر کو اس الزام سے بری کیا تو صدیقی صاحب بچوں کی طرح خوش تھے۔

مجھے کئی سال کراچی رہنے کے باوجود سرکاری رہایش گاہ میں رہنا نصیب نہ ہوا تھا۔ میری آدھی

سے زیادہ تنخواہ گھر کے کرائے میں چلی جاتی تھی۔ میں نے سرکاری کوارٹر کے لیے عرضی دے رکھی تھی' مگر امیدواروں کی فہرست میں میرا نام آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہی ہٹتا جا رہا تھا۔ جب عرضی دی تو میرا نمبر چار سو سے اوپر تھا۔ اس وقت اسٹیٹ آفس کے سربراہ کمانڈر واقف تھے۔ جب بھی ان کے دفتر گیا وہ بڑے تپاک سے ملے' بہت محبت سے باتیں کیں مگر میرا نام پیچھے کھسکتا کھسکتا چھ سو سے اور پھر سات سو سے بھی پیچھے چلا گیا۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگے ایمرجنسی کیس بہت آگئے ہیں اور مشورہ دیا کہ تم بھی بیوی کو تپ دق ہونے یا کینسر ہونے کا سرٹیفکیٹ لے آؤ تو تمھارا نام بھی ایمرجنسی لسٹ میں آجائے گا۔ یہ سن کر میں نے اسٹیٹ آفس جانا چھوڑ دیا مگر صدیقی میری اس مشکل پر بہت پریشان رہتے تھے۔ ایک دن آئے تو مسکرا رہے تھے کہنے لگے تو تمھارے لیے سرکاری مکان کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہ وہ کس طرح کہنے لگے کہ میں اسٹیٹ آفس کے کلرک سے بات کر آیا ہوں' تمھیں الاٹمنٹ دینے کو تیار ہو گیا' مگر وہ اس کے لیے صرف اتنے پیسے مانگتا ہے جتنا تم اپنے مکان کا ایک مہینے کا کرایہ ادا کرتے ہو۔ میں ہنس پڑا اور یہ بات آئی گئی ہو گئی' کیوں کہ اس قسم کے سودے کے لیے ہم دونوں میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

ایک دن آئے تو ایک خط میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ کسی بین الاقوامی اشاعت کے ادارے کی طرف سے تھا۔ مشہور ادیبوں کا "ہو از ہو" (Who is Who) یک جا شایع کر رہے تھے۔ انھوں نے صدیقی صاحب سے ان کے کوائف اور مختصر سوانح کا تقاضا کیا تھا تاکہ وہ اسے اپنی آیندہ اشاعت میں شامل کر سکیں۔ اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ ہر چند شایع ہونے والی کتاب کی قیمت بہت زیادہ تھی لیکن ان مصنّفین کو جن کے حالات اس میں چھپیں گے آدھی قیمت پر دی جائیں گی۔ اپنی اس عالمی شہرت پر بہت خوش نظر آرہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بین الاقوامی شعرا کے "ہو از ہو" میں کچھ عرصہ پہلے میرے کوائف بھی شایع ہو چکے ہیں' اور اس کتاب کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہ اشاعت گھروں کا ایک بین الاقوامی چکر ہے اور یہ لوگ مصنّفین کے نام ادھر ادھر سے حاصل کر لیتے ہیں اور اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ کسی معیار کا خیال رکھتے ہوں' ان کا مقصد محض نفع کمانا ہوتا ہے کیوں کہ ان میں جتنے نام چھپتے ہیں ان میں سے اگر آدھے بھی کتاب خرید لیں تو یہ کافی پیسے بنا لیتے ہیں۔ اس پر ہنسے اور کہنے لگے کوائف تو بھیجیں' پھر کتاب خریدنے نہ خریدنے کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ بعد میں انھوں نے وہ کتاب منگوائی۔ پبلشر نے کتاب کے ساتھ ایک میڈل اور ایک سرٹیفکیٹ بھی بھیجا تھا جس کو انھوں نے بہ طور سند اپنے پاس رکھ لیا۔ صدیقی صاحب صف اول کے افسانہ نگار تھے' اور اپنے انداز میں لاثانی' ایسے کہ ان جیسا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا' مگر نقادوں نے نہ معلوم کیوں ان پر بہت کم لکھا' شاید یہ ہی وجہ تھی کہ ایسی باتوں پر بچوں کی طرح خوش ہو جایا کرتے تھے۔

ایک دن کراچی کے ایک ہوٹل میں کوئی ادبی تقریب تھی۔ ایک ڈائجسٹ کے ایڈیٹر ان کے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے دور سے اپنے دفتر کا ایک کلرک ادھر آتے دیکھا تو اچانک اٹھ کر صدیقی صاحب سے اجازت مانگی اور چلے گئے۔ صدیقی صاحب نے میرا ہاتھ زور سے دبایا اور کہا ذرا تماشا دیکھو۔ اتنے میں وہ

کلرک صدیقی صاحب کے پاس آکر بیٹھا' رسمی نیازمندی کے اظہار کے بعد خیر خیریت پوچھی اور ان کے زانو پر ایک لفافہ رکھ کر چلا گیا۔ انھوں نے لفافہ اٹھا کر کھولے بغیر جیب میں ڈال لیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہے تو کہنے لگے کہ یہ مدیر اپنے رسالے میں میرے شائع شدہ افسانوں میں سے کوئی انتخاب کرکے اپنے ڈائجسٹ میں چھاپ لیتا ہے اور پھر اس کا کوئی آدمی آکر میرے آگے لفافہ رکھ دیتا ہے' اس میں چار پانچ سو روپے ہوتے ہیں' مگر آج تک اس سلسلے میں نہ میری مدیر سے کوئی بات ہوئی ہے' نہ ان کے آدمی سے۔ یہ ایک خاموش مفاہمت ہے جو روایت کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

صدیقی صاحب سے اپنے قرب اور محبت کا مجھے پوری طرح احساس اس وقت ہوا جب میرا تبادلہ کراچی سے اسلام آباد ہو گیا۔ ہرچند نجومی کی بات غلط ہو گئی تھی' اور صدیقی صاحب میرے اس تبادلے کے بعد ایک عشرے سے زیادہ حیات رہے مگر نہ جانے ان کو کیوں یہ وہم ہو گیا تھا کہ خدا جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ بار بار میرے کراچی چھوڑنے پر اظہار افسوس کرتے۔ کئی بار ان کی آنکھیں نم آلود دیکھیں تو میں بہت رنجیدہ ہو گیا۔ کراچی میں' میں نے کم و بیش بیس برس گذارے تھے۔ اس شہر میں میری جڑیں کتنی دور تک چلی گئی تھیں' اس کا احساس تو اس وقت ہوا جب ان جڑوں کو وہاں سے اکھیڑنا پڑا۔ کتنے دوست تھے جن سے مدتوں ملاقات نہ ہوئی تھی تو یہ خیال رہتا کہ جب چاہیں گے مل لیں گے' مگر ان سے ملنا اب گاہے گاہے ہو سکے گا اور وہ بھی یقینی نہیں' گہرے ملال کا باعث بنا ہوا تھا۔ جن شخصیتوں کے ساتھ صبح شام اٹھنا بیٹھنا تھا ان میں سے تین کم از کم ایسے اشخاص ضرور تھے جن کو چھوڑنے کا رنج برداشت کرنا واقعی بڑی ہمت کا کام تھا۔ ان میں میرے پرانے دوست اور دم ساز حمید نسیم تھے۔ ادبی محفلوں کی جان اور میرے نہایت ہی محبوب دوست سلیم احمد تھے اور صدیقی صاحب۔ جب انھوں نے پہلے پہل میرے تبادلے کی خبر سنی تو ماربل کا ایک خوب صورت قد آدم لیمپ اسٹینڈ اٹھا لائے۔ کہنے لگے کہ اس کو جب بھی روشن کرو گے تو میری یاد آئے گی۔ پھر میری اسلام آباد روانگی سے ایک دن پہلے جب میں سامان سفر باندھ چکا تھا تو فرمایا یہاں میں نے نواب شاہ سے نہایت ہی اعلیٰ قسموں کے بارہ آم کے پودے تمھارے لیے منگوائے ہیں وہ کل ساتھ لے جانا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور اسلام آباد میں میرے پاس ایک مکان تو ہو گا مگر کوئی باغ نہیں ہو گا جس میں آموں کے اتنے پیڑ لگانے کی گنجائش ہو اور پھر راول پنڈی اسلام آباد میں یوں بھی آم نہیں لگتے۔ یہ سن کر بگڑ گئے کہنے لگے کہ تم زیادہ کرائے سے ڈرتے ہو تو گملوں کا کرایہ میں ادا کر دوں گا۔ بہت منت سماجت کے بعد اور یہ وعدہ لے کر کہ پھر جب کبھی کراچی آؤں گا تو لے جاؤں گا' وہ میری بات مان تو گئے مگر اگلے دن جب میں ٹرین میں سوار ہو رہا تھا تو دیکھا کہ دو گملے میرے سامان کے ساتھ آموں کے پودوں کے رکھے ہیں۔ معلوم ہوا کہ صدیقی صاحب نے رکھ دیے ہیں۔ کہنے لگے کہ سنو یہ دو پودے تو لگوا ہی دینا۔ تمھارے بچے جب کبھی یہ آم کھائیں گے تو یاد کریں گے کہ ان کے ابا کے کوئی دوست ایسے بھی تھے جو ان کے لیے سنہری اور میٹھے خواب دیکھتے تھے۔

اسلام آباد متعین ہونے کے بعد میں کئی بار کراچی گیا۔ مگر یہ دورے بہت مختصر ہوتے تھے۔ ایک

دن کے لیے وہاں قیام رہتا تھا اور اس میں بھی بے شمار کام۔ مگر میں کسی نہ کسی طرح اتنا وقت ضرور نکال لیتا تھا کہ خواہ چند منٹ کے لیے ہی کیوں نہ ہو حمید نسیم' سلیم احمد اور صدیقی صاحب سے میری ملاقات ضرور ہو جائے۔ مگر ہر ملاقات پر صدیقی صاحب خوش ہونے کی بجائے آزردہ ہو جاتے اور سخت شکایت کرتے کہ اتنے کم وقت کے لیے کیوں آئے ہو۔ اگر کھانے کا وقت قریب ہوتا تو میری کوئی معذرت قبول نہ ہوتی' کھانا کھائے بغیر وہاں سے اٹھنے کی اجازت نہ دیتے۔ ہر ملاقات میں جلدی جلدی وہ پچھلی ملاقات سے اس ملاقات تک کے اپنے حالات سے آگاہ کرتے اور میرے اور میری بیوی بچوں کے بارے میں سوال کرتے رہتے۔ ان سے ہر ملاقات کے بعد میں جب ان کے گھر سے نکلتا تو عجیب پشیمانی کا شکار رہا کرتا کہ ان کے لیے اس سے زیادہ وقت کیوں نہ نکال سکا۔

غالباً" ۱۹۸۳ء میں اکیڈمی آف لیٹرز (اکادمی ادبیات پاکستان) نے اپنے سالانہ جلسے میں انھیں اسلام آباد آنے کی دعوت دی تو پہلی بار انھوں نے پاکستان کا یہ دارالحکومت دیکھا۔ یہ شہر انھیں بہت پسند آیا۔ دو دن تو اجلاس کی گہما گہمی میں گذر گئے۔ تیسرے روز ان کی واپسی تھی مگر وہ ابھی چند روز اور یہاں ٹھہرنا چاہتے تھے۔ پی آئی اے کے دفتر گئے کہ واپسی کے ٹکٹ میں دو ایک روز کی تاخیر کروائی جائے۔ وہاں معلوم ہوا کہ اکادمی ادبیات پاکستان نے چوں کہ ادیبوں کی اجتماعی طور پر بکنگ کروائی تھی' واپسی کی تاریخ میں صرف اسی صورت میں تبدیل کی جاسکتی تھی کہ واپسی کا نصف کرایہ اپنی جیب سے ادا کریں۔ سو صدیقی صاحب نے یہ جرمانہ بھی بہ خوشی ادا کیا اور یہاں رک گئے۔ میرے یہاں آئے تو گھر اور بچوں کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور اپنے ان آموں کے پودوں کو تو درختوں کی صورت میں دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوئے۔

پھر دوسرے سال بھی اکادمی کے جلسے میں آئے۔ اب کے عزیزی نذر الحسن صدیقی بھی ساتھ تھے اور شاید یہ سالانہ ملاقات جاری رہتی' مگر پھر انھیں علالت نے آلیا۔ اب طبیعت بحال نہیں رہتی تھی۔ اب بھی جب ممکن ہوتا پیدل چلتے' مگر تھکان محسوس کرنے لگے تھے۔ ایک آدھ بار گر پڑے کچھ چوٹیں بھی آئیں اور کراچی سے یہی خبریں آنے لگیں کہ اب صحت ساتھ نہیں دے رہی۔ مگر قلم پر بفضلہ ویسی ہی جوانی چڑھی ہوئی تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی تند۔

مارچ ۱۹۸۷ء میں مسقط (عمان) میں اردو کا ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں ہندوستان پاکستان کے شعرا کو مدعو کیا گیا تھا۔ میرا اس قسم کے بین الاقوامی مشاعروں میں جانا بہت کم ہوتا ہے۔ بہر حال اس مشاعرے میں شرکت کے لیے عمان جاتے ہوئے کراچی راستے میں پڑتا تھا' سو کراچی میں صدیقی صاحب سے ملنے جب پہنچا تو وہ اپنے کمرے میں گئے اور واپسی پر ایک شریری سی شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک دعوت نامہ میرے سامنے رکھا۔ میں نے دیکھا تو وہ انجمن ترقی اردو کراچی کی طرف سے ایک خصوصی مجلس میں شرکت کا دعوت نامہ تھا۔ اور وہ خصوصی مجلس ابوالفضل صدیقی صاحب کی عظیم ادبی خدمات کے اعتراف میں منعقد کی جارہی تھی' جس میں مشہور ادیب اور نقاد انھیں خراج عقیدت پیش کرنے والے

تھے۔ اس تقریب کی تاریخ ۲۹ر مارچ ۱۹۸۷ء تھی۔ میں نے صدیقی صاحب سے کہا کہ میں عمان سے اس تاریخ تک واپس آجاؤں گا اور اس تقریب میں شرکت کروں گا۔ انھیں یقین نہ آیا۔ کہنے لگے یہ کیسے ممکن ہے اور اگر تم اس میں شامل ہو جاؤ تو میری خوشی دوبالا ہو جائے گی۔ پھر اس تقریب میں ۲۹ر مارچ کو میں ان سے بہت پہلے اس ہال میں پہنچ گیا جہاں وہ جلسہ منعقد ہونا تھا۔ وہ تو اس روز برات کے دولہا تھے۔ بڑے اہتمام سے لائے گئے، مگر مجھے دیکھ کر بڑی محبت سے آکر لپٹ گئے۔ اور جب تک انھیں ڈائس پر بلا نہیں لیا گیا وہ ایک پل کو مجھ سے علاحدہ نہ ہوئے۔ اس دوران میں نے انھیں بتایا کہ میں اجلاس کے آخر تک نہ ٹھہر سکوں گا۔ مجھے اپنے داماد کے ساتھ ایک ضروری کام سے ایک جگہ پہنچنا تھا۔ ان کے فن اور شخصیت پر نہایت پُر مغز اور دلچسپ مقالے سنے اور پھر میں نے اشارے سے ان سے اجازت طلب کی۔ انھوں نے اجازت دی تو میں چلا آیا۔ اس جلسے کی صدارت مشہور شاعر اور دانش ور جگن ناتھ آزاد کر رہے تھے۔ اس دن میں نے انھیں آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ بجے بنے سنورے دولہا کی طرح بیٹھے ہوئے اور ہال ان کے مداحوں سے بھرا ہوا، ان کی ذات اور تخلیقات پر مقالے اور مضامین سن رہا تھا۔

پھر میں اسلام آباد آگیا۔ پچھلے بارہ سال میں جب سے میں اسلام آباد آیا ہوں صدیقی صاحب نے سینکڑوں خطوط لکھے ہوں گے۔ مجھ سے سستی ضرور ہوئی مگر ان کی طرف سے کبھی دیر نہ ہوئی، ہمیشہ باقاعدگی سے خط لکھتے رہے۔ اپنی علالت کا ذکر ہمیشہ بہت سرسری کرتے۔ پھر سنا کہ زیادہ علیل ہو گئے ہیں اور اس کے بعد خبر آئی کہ ہسپتال میں داخل ہو گئے ہیں۔ میں ان دنوں عارضہ قلب کے علاج کے لیے لندن چلا گیا تھا، شفقت میرے ساتھ تھیں اور بچیاں کراچی میں۔ وہ ان کو دیکھنے ہسپتال گئیں، مگر وہ انھیں نہ پہچان سکے، بچیوں نے فون پر مجھے بتایا تھا۔ اگلے روز لندن میں ایک مشاعرہ تھا، میں بھی شریک تھا۔ وہاں اچانک اسٹیج سے صدیقی صاحب کے انتقال کی خبر دی گئی اور اردو کے اس عظیم ادیب، صاحب طرز افسانہ نگار کی یاد و احترام میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ میری دنیا یہ خبر سن کر زیر و زبر ہو گئی۔ مگر اس دو منٹ کی خاموشی کے دوران صدیقی صاحب کی آواز، وہ آواز جو اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی تھی بڑی صاف اور واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھے مجھے اور شفقت کو اپنے اس خاکے کی آخری سطریں سنا رہے تھے جو انھوں نے بڑی محبت سے مجھ پر لکھا تھا۔

"اور اب تو کسی کسی وقت میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اس شام کے جھٹپٹے میں چپکے چپکے سرک کر سو جاؤں اور پھر شاید مستقبل قریب میں جس دن میری ہونی کی انہونی میاں کے کان میں پڑے تو اور کچھ نہیں ہونٹوں سے ایک ٹھنڈی سسکی روکے نہ رکے اور آنکھوں سے ایک ایک گرم گرم آنسو ڈھلک ہی پڑے۔" ..... ہونی کی انہونی میرے کان میں پڑ گئی، ایک ٹھنڈی سسکی نہیں صدیقی صاحب میرے اندر طوفان بپا ہے۔ گرم گرم آنسوؤں کا سیل ہے جو امڈا چلا آرہا ہے، مگر ضبط کیے بیٹھا ہوں۔

مشاعرے سے واپس آتے ہی شاہد بھائی کو تعزیت کا خط لکھا۔ پھر جب صحت آباد ہو کر ایک بار جب اسلام آباد سے کراچی گیا تو دل بڑا ہی بوجھل اور طبیعت بہت پژمردہ تھی۔ ان کے گھر کے گیٹ پر پہنچا

تو قدم اندر کو نہ اٹھتے تھے۔ وہ میری آواز سنتے ہی بے قرار ہو کر باہر آجاتے تھے۔ اپنے محبت بھرے سینے سے چمٹا لیتے۔ اندر جا کر بیٹھا 'شاہد بھائی' عزیزی نذرالحسن' زینت بہن سب سے تعزیت کی 'مگر الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

"شاہد بھائی یہ کیا ہوگیا۔" بس اتنا ہی کہہ سکا۔ نظر ڈرائنگ روم سے ملحق ان کے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ کمرہ خالی تھا' ان کا صاف شفاف بستر سے آراستہ پلنگ خالی تھا۔ میری نظریں کمرے میں بھٹکنے لگیں' وہاں پلنگ سے ملحق اسٹول پر رکھا وہ صندوقچہ بھی اب نہ تھا جس میں سینکڑوں قلم انھوں نے جمع کیے ہوئے تھے' جن سے انھوں نے "بھوکے" "شکنجہ" "دفینہ" "ارتھی" "باپ" "بھیا دیوج" "چڑھتا سورج" "جوالا مکھ" "میراث" "گلاب خاص" "ستاروں کی چال" "آخری رسوم کی ادائیگی" "لی گئے" "انصاف" "آئینہ" اور نہ جانے ایسی کتنی ہی لازوال کہانیاں لکھیں اور ادب اردو کو مالا مال کر گئے۔ کافی دیر وہاں بیٹھا اور پھر بوجھل قدموں سے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آگیا اور جب گاڑی میں بیٹھنے لگا تو پیچھے سے کسی نے بڑی میٹھی اور پیار بھری آواز میں پکارا۔

"میاں۔"

میں سُن سا ہوگیا' اک جھرجھری سی آئی۔ چند لمحے سکتے کے عالم میں رہا' پھر سوچا کہ اس طرح اور ایسی محبت سے پکارنے والا اب کہاں؟

☆ ○ ☆

نذر الحسن صدیقی

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم

وہ میرا ساتھی تھا اور ساتھی بھی کیسا۔ قول تھمے جنم جنم کا' ہر ہر لمحے اور پل پل کا۔ یوں تو جب اس کے بچپن نے چار سال چار ماہ کی مدت پوری کی تب ہی صحیح معنوں میں میرا اور اس کا ساتھ ہوا' مگر ۲۴ ستمبر ۱۹۰۸ء کی اس نم ناک اور درخشاں صبح ہی کو مجھے اس کا ساتھ سونپ دیا گیا تھا' جب اس کے اجداد کی بسائی ہوئی عارف پور نوادہ نامی بستی کی اس حویلی میں صبح انبساط طلوع ہوئی' جہاں ایک نئے فرد کی آمد کے انتظار میں فرد فرد نے پوری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی تھی۔

اور جب جھپکتے ہوئے تارے بھی ماند سے پڑنے لگے تھے اور دیوان خانے میں حقوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان شعر و شاعری اور غپ بازی کرتے ہوئے مردوں کے ذہن بوجھل سے ہو کر اونگھنے سے لگے تھے اور اندر زنان خانے میں پان چباتی بیبیوں کے ورد کرتے ہوئے ہونٹوں کی پیہم جنبش اور تسبیح کے دانوں پر دوڑتی انگلیوں کی مسلسل حرکت جیسے ایک ہی عمل کا روپ دھار گئیں تھیں' اور جب رات کی تاریکی کے ڈانڈے سپیدہ سحر سے جا ملے تھے اور شب کی سیاہی پر کافور صبح غالب آچلی تھی تو زنان خانے سے لے کر دیوان خانے تک اس بھری پری حویلی کے اندرونی دالان سے نوید مسرت لیے ایک باندی دوڑتی ہوئی ملگجے ملگجے اجالے میں لق و دق صحن میں آکھڑی ہوئی۔ ایک غلغلہ بلند ہوا' مبارک و سلامت کا شور اٹھا' بالا خانے کی چھت پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے بندوق داغ دی' پوری بستی میں جاگ ہو گئی۔

ماما ئیں' خادمائیں' مغلانیاں' پشتینی نوکر حویلی کے اندر' اور باہر سائیس' گوالے' مستحقین فقیر فقرا' ہر کوئی خوشی کے عالم میں بھاگتا دوڑتا باب عالی پر جا کھڑا ہوا' چودھری احمد حسن نے اپنے بیٹے ابوالحسن کے یہاں فرزند تولد ہونے کی خوشی میں اشرفیاں لٹائیں' ہر ایک کو انعام و اکرام سے نوازا۔ حویلی میں نوبتیں بجیں' مدتوں دن دن بھر حویلی میں عید کا سا سماں رہتا اور ہر رات جیسے شب برات جگمگاتی۔

اور کچھ دن بعد گہوارے میں ہاتھ پیر مارتے ننھے منے اس ساتھی پر میں نے بھی ایک نظر ڈالی' انگوٹھا چوستا اپنا یہ ساتھی مجھے بہت ہی پیارا اور بڑا ہی بھلا لگا۔ بلند و بالا پیشانی اقبال مندی کی علامت' چمکتی ہوئی تیز ذہانت اور شرارت سے بھرپور آنکھیں' سرخ سپید میدہ اور شہاب میں جیسا گندھا رنگ آنکھوں کو چکا چوند کرتا ہوا' بھرے بھرے ہاتھ اور پاؤں' وہ سب کی آنکھوں کا تارا بنا گھر بھر میں گود گود اور باہر ہاتھوں ہاتھ پھرا کرتا۔ یوں تو اس رنگین کھلونے کے سب ہی گرویدہ تھے مگر "میا" اور "بیا" کی بات ہی کچھ

اور تھی۔

"میا" (فریدالنسا) اس کی پر دادی تھیں' اس کے پر دادا چودھری محمد علی کی دوسری شریک حیات۔ کہنے کو تو وہ اس کی حقیقی پر دادی بی بی عصمت کی سوکن تھیں مگر ہر اس احساس اور جذبے سے فی الحقیقت ماورا تھیں جسے لوگ "سوتیا ڈاہ" کے نام سے جانتے ہیں۔ "میا" (تمیز النسا) ان کی اکلوتی اولاد تھیں جو بے چاری بھرا بھر جوانی شادی کے سال اندر ہی بیوہ ہو گئیں تھیں اور اب مستقل طور پر ماں کے پاس ہی رہتیں۔ دونوں ہی ماں بیٹیاں محبت و الفت کا ایسا پیکر تھیں جس کی مثالیں ہماری جیتی جاگتی دنیا میں تو ملتی نہیں' ہاں تاریخ اور قصہ کہانیوں میں کہیں خال خال نظر آجائیں تو آجائیں۔

اس کے والد ابوالحسن کی پیدائش پر جب جوان بیوہ "بیا" بچے کے ہنڈولے پر پہنچی تھیں تو ممتا بڑی زور سے خون میں سنسنا پڑی تھی اور جب گھمر گھمر کرتے ہوئے خون کی سنسناہٹ سینے میں جا آسودہ ہوئی تھی تو جیسے کوثر و تسنیم کی لہریں سی چڑھتے اترنے لگی تھیں اور پھر ممتا کی بتیسوں دھاریں باہر آپڑی تھیں۔ بیوہ لڑکی نے جوش ممتا سے پھٹتے ہوئے سینے سے تو مولود کو اٹھا کر چمٹا لیا تھا اور پوری زندگی واقعی ماں بن کر ہی پالا تھا اور ماں جیسا ہی پیار دیا تھا۔ اپنے حصہ کی کل جائیداد اپنی زندگی ہی میں اس کے نام لکھ دی تھی۔ میرا یہ ساتھی انھیں ابوالحسن کا فرزند اکبر تھا پھر بھلا کیوں "بیا" کی آنکھوں کا تارا اور جگر گوشہ نہ ہوتا۔

اور پھر جب اس کا گھٹنیوں چلنا اور ہلکیاں بھرتا بچپن لڑکپن کی سرحدوں کو چھونے لگا تھا تو میں نے غور کیا کہ میرے ساتھی نے بڑے اچھے ہاتھ پاؤں نکالے ہیں۔ قد کاٹھی میں اپنے تمام ہم عمر ساتھیوں میں مٹھی بھر اونچا اور نکلتا ہوا' چوڑے چکلے شانے اور چوڑا ہاڑ' بھرا ہوا چکلا سینہ۔ چال ڈھال بشرہ اور تیوروں میں ایک مخصوص انداز بانکپن۔ ہمہ وقت تیز چمکتی ہوئی آنکھوں سے ذہانت اور شرارت جھانکتی ہوئی اور واقعی اس کی نت نئی عجیب و غریب شرارتوں سے گھر والے ہی نہیں پوری بستی نالاں رہتی۔ اس زمانہ میں اس کا ذہن نئی نئی شرارتیں نہ صرف سوچتا بلکہ عملی طور پر بھی ان کا مظاہرہ کرتا رہتا۔

پھاٹک کے باہر طرح طرح کی مٹھائیوں سے آراستہ خوانچہ سجائے' مٹھائی والا پہنچا ہے' اس کی آواز پر میرا ساتھی بھی پھاٹک سے باہر نکلا ہے۔ مٹھائی والا پھاٹک سے ذرا دور خوانچہ ٹکائے ہوئے ہے' لڑکے بالے بچوں کی اور گرد بھیڑ ہے' وہ ترچھا ترچھا خوانچے کی جانب دیکھتا چلا جا رہا ہے اور جب ذرا نزدیک پہنچتا ہے تو تھوڑا سا پرے تھوک کی پچکاری مارتا ہے۔ خوانچہ والا کہ ہندو ہے خوانچہ چھوڑ چھاڑ چیختا پیٹتا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے دھرم سے تو چاہے دور پرے ہی سہی' مسلمان لڑکے کے تھوک دینے سے تمام مٹھائی "بھرشٹ" ہو گئی۔ وہ داد رسی اور فریاد لے کر پھاٹک پر پہنچا۔ دادا تک شکایت پہنچی۔ انھوں نے نوکر سے کہا اس خوانچے والے سے کہو میرے بچے کو کچھ نہ کہے' اس کو پورے خوانچے کے پیسے دے کر ساری مٹھائی خرید لو۔ خوانچہ بھر مٹھائی امرتیاں' برفی' قلاقند' طرح طرح کے لڈو گھر میں آگئی۔ سب بچے خوش خوش مزے مزے سے مٹھائی کھا رہے ہیں اور وہ شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا ہے

"دیکھا ہم نے سب کو کیسی مٹھائی کھلائی ایں۔" جیٹھ بیساکھ کی جلتی ابلتی دوپہر میں تمام گھر والے خس کی ٹٹیوں کی نم ناک اور عطر بیز ٹھنڈک میں پناہ گزیں ہیں۔ چھت پر لٹکے ہوئے وزنی پنکھے کی چرخ چوں نیند میں غلطاں ذہنوں پر لوریوں کی طرح اثر انداز ہو رہی ہے' مگر میرا یہ ساتھی اس اندھیرے کمرے میں آنکھیں کھولے ٹکر ٹکر چھت کو تک رہا ہے' نیند اس سے کوسوں دور ہے اور پھر جب خس کی خوشبو میں بسے ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے میں لیٹے لوگوں کے خراٹے فضا میں گونجنے لگتے تو وہ چپکے سے اٹھتا بلی کی سی چال چلتا' چارپائیوں' مسہریوں کے درمیان میں سے نکلتا' اونگھتے ہوئے ہوئے پنکھا قلی کی نظریں بچاتا دروازے تک جا پہنچتا۔ مگر کواڑوں کی چرخ چوں کے خوف سے دروازہ نہ کھولتا۔ وزنی کواڑ کو ایک جانب سے اٹھا کر چول سے اوپر کرتا اور پھر آڑا ترچھا ہو کر اس کے درمیان سے نکل جاتا' مگر باہر نکل کر چول کو دوبارہ اپنی جگہ پر نہ بٹھا پایا ہوتا کہ دیکھتا کہ اس کا چھوٹا بھائی نواب اس کے نقش قدم پر چلتا اس کے بنائے ہوئے اسی راستے سے باہر آرہا ہے۔ اب دونوں بھائی باہر ہوتے۔ وہ بڑی رسان اور آہستگی سے چول کو اپنی جگہ پر بٹھاتا۔ دونوں بھائی ڈیوڑھی پار کر کے چبوترے پر جا پہنچتے۔ چبوترے کے سامنے سڑک کی دوسری جانب سرس کے بوڑھے چھتناور درخت تلے' بستی کے کسان' کاشت کاروں' کھیت مزدوروں' نائیوں' فقیروں کے لڑکے' ستارا' حمیدہ' تنھوا' کلوا وغیرہ پوری چکڑی کی چکڑی میاں لوگوں کی منتظر ہوتی۔ دونوں جلتی ابلتی گرم دوپہر میں اس چکڑی کی لیڈری کرتے ہوئے' تیز لو کے آگ جیسے تھپڑ کھاتے ہوئے' کھیت کھلیانوں کو پار کرتے ہوئے سامنے ساغر تال تک جا پہنچتے۔

ساغر تال کا کنارہ بھی لو اور تپش کے مارے سنسان پڑا ہوتا۔ کپڑے دھوتے وقت دھوبیوں کے گلوں سے کورس کے انداز میں نکلتی "اچھوا" "اچھوا" کی آوازیں بھی نہ معلوم کہاں گم ہوتیں۔ ہاں کنارے کنارے نصب کائی جمے پتھروں پر کہیں کہیں گیلے اور کہیں ادھ دھلے کپڑے پڑے ہوتے اور دھوبی کہیں دور گرمی دھوپ اور لو سے بچنے کی خاطر کسی درخت کی چھاؤں میں آسودہ ہوتے اور ان کے گدھے بھی شاید اپنی اپنی پناہ گاہوں کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہے ہوتے۔ اس کے ساتھی ان میں سے کسی ایک کو پکڑ لاتے اور پھر دونوں بھائی باری باری کبھی سیدھے منھ اور کبھی دم کی جانب منھ کر کے اس آگ برساتی دوپہر میں پورا دن سواری کرتے اور جب اس کو یہ احساس ہو جاتا کہ اب دوپہر ڈھلنے والی ہے تو وہ کسی ساتھی کو جھانکڑ کاٹ لانے کا حکم دیتا اور پھر گدھے کی پیٹھ سے اتر کر جھانکڑ اس کی دم میں بندھوا دیتا اور پھر دو ڈنڈے رسید کرواتا۔ گدھا بھاگتا' جھانکڑ کم اس کے پیروں اور سموں میں چبھتے اور وہ اور تیز دوڑتا اور جتنی تیز دوڑتا جھانکڑ اس سے زیادہ تیزی سے چبھتے۔

ابھی دوپہر پوری نہ ڈھلی ہوتی' دھوپ میں تپش اور تمازت بھی ابھی باقی ہوتی اور لو بھی نہ گری ہوتی' وہ وقت کا اندازہ کر کے حویلی کا رخ کرتا اور اپنے بھائی کے ساتھ دروازے میں اسی طرح راستا بنا کر' ٹھنڈے کمرے میں داخل ہو کر وہ دونوں چپکے سے اپنے اپنے پلنگوں پر جا کر دراز ہو جاتے۔ شام بڑے دھوبی باب عالی پر شکایت لے کر حاضر ہوتا' اب والد صاحب قبلہ بھی کچہری سے واپس آچکے ہوتے'

باہر چبوترے پر سب کے سب جمع ہوتے' کوئی کاشت کار یا نوکر عموماً" دھوبی کو جھوٹا کہہ کر لعن طعن کرتا اور گھڑک کر بھگانا چاہتا مگر اتنے میں پھاٹک کے سامنے سے گدھا خود مبینہ ثبوت فراہم کرتا' لہولہان بھاگتا نظر آجاتا۔ باہر طلبی ہوتی' مگر اتنے میں اس کو اندر سن گن مل گئی ہوتی اور ایسی حالت میں تو "میا" یا "بیا" دونوں میں سے کوئی اس کی پناہ گاہ ہوتیں۔

باہر چبوترے پر حلیم کی دیگیں چڑھی ہیں' تقریباً" آدھی رات کے وہ حویلی سے باہر چبوترہ پر چپکے سے پہنچ جاتا ہے۔ کچھ لوگ چبوترے پر سوئے ہوئے ہیں کچھ نوکر چاکر حقہ پی رہے ہیں اور گپ بازی کر رہے ہیں۔ حلیم کی دیگوں پر لمبے لمبے کفگیر چلاتے ہوئے باورچی بھی آپس میں باتوں میں کھوئے ہیں۔ جو لوگ سو گئے ہیں' وہ ان کی پنیوں کے نیچے سے بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے ان کے جوتے جمع کرتا ہے اور باورچیوں کی آنکھوں میں بہ قول شخصے جیسے دھول جھونک کر تمام کے تمام جوتے دیگوں میں ڈال چپکے سے حویلی میں سرک جاتا ہے۔ اور جب زردہ کی دیگیں پک رہی ہیں تو وہ پہلے اندر حویلی میں سانور (نمک) کی ساری کلھیاں جمع کرتا اور پھر تمام کلھیوں کی سانور زردہ کی دیگوں میں چشم زدن میں انڈیل کر اندر بھاگ جاتا۔

اور ایک مرتبہ جب وہ اپنی خالہ کے گھر گیا تو دیکھا کہ پورا گھر خالی تھا اور اندرونی دالان میں ایک پلنگ پر خالہ کا زیور کھلا پڑا تھا۔ اس نے طلائی پچلڑی اٹھائی اور باہر اصطبل میں پہنچ گیا۔ ایک پنڈیا (بھینس کا بچہ) کے گلے کو طلائی پچلڑی سے آراستہ کردیا۔ پورے دن طلائی پچلڑی کا ڈھنڈوا پڑا رہا مگر اس اللہ کے بندے نے اصل بات کسی کو نہ بتائی' کئی نوکروں' خادماؤں بے چاروں سے جواب طلبی ہوئی ڈانٹ پھٹکار اور مار پڑی' وہ پھر بھی کچھ نہ بولا۔ دن مندے کوئی ملازم باہر اصطبل میں جانوروں کو سانی دانہ چارہ ڈالنے گیا تو دیکھا کہ پچلڑی پنڈیا کے گلے میں جھول رہی ہے۔ خالہ کو جب خبر پہنچی تو انھوں فوراً" میرے شریر ساتھی کا نام لیا اور کہا کہ ایسی شرارتیں بھلا اس کے سوا اور کون کرسکتا ہے اور اس نے بھی بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اس کا ذمہ قبول کیا کہ میں تو خالہ کو ذرا سبق دینا چاہتا تھا' اکیلے گھر میں پوٹلیا بھر زیور آخر کیوں کھلا چھوڑ گئی تھیں!

اور ایک دن جب مکتب کے ملاں جی کے لیے کھانا نکل رہا تھا تو وہ سینی اٹھائے ہوئے باورچی خانے میں پہنچا اور کہا کہ کھانا لے کر آج وہ جائے گا' ساتھ پڑھنے والے ہم بھائیوں کو ایک گونا تعجب بھی ہوا' وہ تو دوسروں سے کام لینے کا عادی تھا' خود تو کبھی پھلی نہ پھوڑتا' یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے سب سوچتے ہوئے مکتب چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ سینی اٹھائے خود بھی پہنچ گیا' خوان اٹھا کر مولوی صاحب نے کھانا شروع کیا اس نے ایک پلیٹ بہ طور خاص مولوی صاحب کی طرف بڑھادی اور کہا یہ کھائیے' یہ نئی ترکاری ہے' ہمارے میاں بھائی لکھنؤ گئے تھے وہاں سے لائے ہیں۔

"اچھا ہاں!...... کیا ترکاری ہے۔" مولوی صاحب نے پلیٹ کی طرف بڑے ذوق و شوق سے منہ چلاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ کالے کالے کالی مرچوں سے ذرا بڑے چکنے چکنے تلے ہوئے سے دانے چمک رہے

تھے۔

"جی مولوی صاحب' یہ گپتالو کی ترکاری ہے' یہ یہاں پیدا نہیں ہوتی۔"

اور مولوی صاحب نے بڑے اشتیاق سے ایک بڑا نوالہ توڑا اور پھر "گپتالو" کی ترکاری بھر اس کو منھ میں رکھ لیا' مگر یک دم جیسے بھری سی کٹ گئی' کوئی انتہائی کڑوی کسیلی سی چیز حلق میں پھنس سی گئی اور رندھے ہوئے حلق سے مشکل تمام نکلا........

"ارے کم بخت کیا کھلا دیا مجھ کو' کیا زہر دے دیا بد بخت........!"

اور وہ کہتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ "پپیتے کے بیج........ پپیتے کے بیج۔"

پپیتا ان دنوں اتنا عام پھل نہ تھا' معدودے چند لوگ ہی اس کے نام اور شکل سے واقف تھے۔

اور وہ بارود کی بھری ہوئی کپیاں چپکے سے اڑا لیتا' کپی کا منھ کھول بارود کی باریک سی لکیر بنا کر دور تک یا ہر چبوترے پر لے جاتا اور پھر دوسرے سرے پر کپی رکھ دیتا' جس میں کافی مقدار میں بارود باقی ہوتی۔ بارود کی لکیر میں ماچس کی تیلی دکھا دور بھاگ جاتا۔ آگ کی پتلی سی لکیر بل کھاتی ہوئی تیزی سے کپی کی طرف بڑھتی اور جب کپی کے منھ پر پہنچتی تو الحفیظ والاماں' پوری حویلی بارود کے دھماکے سے لرز اٹھتی اور اس کو شب برات کی آتش بازی چھوڑنے میں اتنا مزہ نہ آتا' جتنا اس خطرناک کھیل میں۔

اور یہ تو روزانہ کا معمول بن گیا تھا' اس کی ہر صبح ایک نئی شرارت لیے نکلتی اور شام کسی دوسری شرارت کی ادھیڑبن اور منصوبہ بندی میں گذرتی۔ اس کی یہ نت نئی شرارتیں جہاں کچھ لوگوں کو تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتیں وہاں کبھی کبھی کچھ لوگوں کی دل آزاری اور تکلیف کا بھی باعث بن جایا کرتیں۔ اور بیٹے کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر چودھری ابوالحسن ایڈووکیٹ کو تشویش اور فکر لاحق ہوئی کہ یہ تیز طرار بچہ کہیں بگڑ نہ جائے اور وہ طور طریقے نہ اپنا بیٹھے جو عموماً" زمین داروں کے بچے بے جا لاڈ پیار اور صحیح تربیت نہ ہونے کے باعث اپنا بیٹھتے ہیں اور پھر مختلف "لتوں" میں پڑ کر مستقلاً" کردار کی کج روی کا شکار ہو کر رہ جایا کرتے ہیں۔ انھوں نے اسی لیے نوجوانی کی سرحد میں قدم رکھنے سے پہلے بیٹے کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ وہ ایم او کالج علی گڈھ سے فارغ التحصیل تھے' ایم اے اور پھر ایل ایل بی کر چکے تھے۔ اس زمانہ میں اتنے تعلیم یافتہ لوگ جاگیردار اور زمین دار طبقہ میں بہت ہی کم ملتے۔ انتہائی ذہین اور خلاق ذہن کے مالک تھے' ہر سہ اصناف ادب' شاعری' افسانے اور ناول پر یکساں قدرت کے ساتھ تینوں زبانوں اردو' فارسی اور انگریزی میں قلم اٹھانے پر قادر تھے۔ بھاری مطالعہ کرتے جس نے ان کے ذہن' فکر و خیال کو بہت وسعت دے دی تھی۔ وہ جلد ہی بھانپ گئے کہ بیٹے کو صحیح تربیت کی ضرورت ہے' چناں چہ انھوں نے بیٹے کو مستقل طور پر اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دیا۔ جہاں کہیں بھی اور جس سے بھی ملنے جاتے اس کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ اس زمانے کے مروجہ فیشن کے مطابق اعلا سے اعلا لباس زیب تن کرواتے' مجلسی آداب' نشست و برخاست' بات چیت غرض کہ ہر بات پر خصوصی توجہ دیتے۔ گھنٹوں شکار میں اپنے ساتھ رکھتے اور مسلسل اسکولنگ کرتے رہتے اور جب تھوڑی عمر ذرا اور سرکی تو ادب' شاعری' ناول اور

افسانے پر بات کرتے اور یوں اس ذہین شریر لڑکے کو باپ کے فیض تربیت سے سنجیدہ گفتاری اور مثبت فکر و سوچ عطا ہونا شروع ہوئی اور جب باپ نے یہ اندازہ کرلیا کہ وہ بیٹے کے ذہن اور دماغ کو صحیح خطوط پر ڈھالنے میں کامیاب ہو چکے ہیں تو انھوں نے بیٹے کو بدایوں کے مشن اسکول سے اٹھا کر سینٹ جارجز کالج مسوری میں داخل کرا دیا' جہاں اس زمانے میں صرف انگریزوں اور نیم انگریزوں کے بچے ہی تعلیم حاصل کرنے کے اہل خیال کیے جاتے تھے۔

سینٹ جارجز مسوری سے تعلیم حاصل کرکے جب وہ گھر پلٹا تو آغاز جوانی کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگیا۔ گو کہ وہ انگریزی درس گاہ اور خالصتاً انگریزی ماحول سے تعلیم پا کر پلٹا تھا' مگر گھر کا ماحول چوں کہ نیم ساونتی کٹر مذہبی قسم کا تھا اور پھر والد صاحب قبلہ کی تربیت کے نقوش اتنے گہرے مرتسم ہو چکے تھے کہ انگریزی تعلیم اور ماحول کا رنگ زیادہ نہ چڑھ سکا۔ حالاں کہ والد صاحب قبلہ خود اپنی ظاہری وضع قطع اور لباس کے معاملے میں خاصے تجدد پسند واقع ہوئے تھے' مگر ان کے اندر ایک پکا' سچا اور باشرع مسلمان چھپا بیٹھا تھا۔ نماز تو کسی صورت اور حالت میں قضا نہ ہوتی' چاہے جنگل میں شکار ہی کیوں نہ کھیل رہے ہوں' جھوٹ کا کوئی کلمہ کبھی زبان سے نہ نکلتا۔

گھر پہنچتے ہی کئی گاؤں پر مشتمل آبائی جاگیر کا کام اس کو سونپ دیا گیا۔ یہ جاگیر اس کے مورث اعلا شیخ مہتاب صدیقی کو ان کی اعلا فوجی خدمات کے صلے میں سلطان سید علاؤالدین نے ضلع بدایوں میں "از بھرتانہ تا بھرتول" عطا کی تھی اور چودھری کے خطاب سے نوازا تھا۔ شیخ مہتاب صدیقی جن دنوں سلطان دلی پر حکمراں تھا قصبہ تیرہ سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے تھے اور اپنی اعلا کارگزاریوں بالخصوص فوجی مہارت اور کارکردگی کے باعث سلطان کی ناک کا بال بن گئے تھے اور جب سلطان دلی کا تخت و تاج چھوڑ اپنے آخری ایام میں بدایوں میں جا بسا تھا تو وہ بھی یہیں کے ہو رہے تھے۔

شیخ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک دن ان کا گذر اس دور کے ایک مشہور صوفی بزرگ حضرت خواجہ صلاح الدین کی خانقاہ کی جانب ہوا' شیخ نے سوچا حضرت کی خدمت میں حاضری دیں' حضرت اس وقت جذب کے عالم میں تھے اور ایسے عالم میں کوئی بھی حضرت کے سامنے جانے کی ہمت نہ کرتا۔ حضرت نے جب جذب و مستی کے عالم میں شیخ کو اپنے روبہ رو پایا تو ایک نوع کی جلال کی کیفیت میں بولے۔ "بول کیا چاہتا ہے۔" اور شیخ کہ عرصہ سے ازدواجی زندگی گذارنے کے باوجود اولاد جیسی نعمت سے محروم تھے فوراً عرض مدعا زبان پر لے آئے۔ حضرت نے شیخ کو اپنے قریب آنے کا حکم دیا اور فرمایا "میری پیٹھ سے اپنی پیٹھ رگڑ۔" اور اس عمل کے بعد اللہ کے حکم سے اولاد سے سرفراز ہونے کی بشارت فرمائی اور کہا کہ تیری ساری اولاد اور اس کے بعد ان کی تمام نسل ہمیشہ میری مرید رہے گی۔" چناں چہ آج تک چودھری حضرات خواجہ صلاح الدین کے مرید ہیں اور کسی دوسرے پیر سے بیعت نہیں ہوتے۔ حضرت کا مزار بلرام پور میں کاس گنج کے قریب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شیخ مہتاب صدیقی کو پانچ بیٹوں سے نوازا' اویس' عارف' قاسم' محبت اور یسین۔

اویس نے کھیڑہ بزرگ اور عارف نے عارف پور نو آبادہ نامی بستیاں بسائیں نو آبادہ کثرتِ استعمال سے نوادہ بن گیا' قاسم نے قاسم پور بسایا۔ باقی دو بھائیوں یٰسین اور محبت کی بسائی ہوئی بستیاں آباد نہ رہ سکیں۔ کھیڑہ اور نوادہ دونوں ایک دوسرے سے ملحق بستیاں تھیں اور ایک سڑک جو بدایوں کو بریلی سے ملاتی اور گرانڈ ٹرک روڈ کی ایک شاخ ہے ان دونوں بستیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی۔

عارف پور نوادہ کے متمول اور اس بستی کے سب سے بڑے اور خوش حال زمین دار چودھری احمد حسن کی جاگیر کے وارث ان کے دو بیٹے چودھری محمد حسن اور چودھری ابوالحسن تھے اور چودھری ابوالحسن کا حصہ چودھری محمد حسن سے کچھ ذرا سوایا تھا کیوں کہ "بیا" نے اپنی جائیداد اپنی زندگی ہی میں ابوالحسن کے نام لکھ دی تھی۔ یہ جاگیر کئی گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی' نوادہ جو رہائشی بستی تھی' وہاں زرعی زمینوں کے علاوہ کئی باغات بھی تھے' مگر اس بستی سے تقریباً" نو کوس کے فاصلے پر "داراب نگر" "کلیا" "فقیر آباد" "اعظم گنج منڈھیا" "احمد نگر گونمیا" نامی گاؤں میں ان دونوں بھائیوں کی جاگیر پھیلی ہوئی تھی' جس میں "داراب نگر" "کلینا" پورے کا پورا گاؤں ان دونوں بھائیوں کی ملکیت تھا اور کوئی دو سرا چپہ بھر زمین کا بھی اس میں شریک نہ تھا۔

میرے ساتھی نے اس نو عمری میں اس تمام جاگیر کا کام و انتظام جس خوش اسلوبی سے سنبھالا اس نے ضلع بھر کے بزرگ اور جہاں دیدہ زمین داروں تک کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ حالاں کہ اس کی عمر وہ تھی کہ اس عمر میں زمین دار بچے عموماً" مرغے اور بٹیریں لڑاتے' گنجفے' چوسر' پچیسی یا شطرنج کی بازیاں جماتے' پتنگ یا کنکوے اڑاتے مجروں کی محفلیں سجاتے یا زیادہ سے زیادہ گھوڑے کداتے' غپ بازی کرتے یا شعر و شاعری کرتے نظر آتے مگر اس نے جس بالغ نظری اور انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اس کی مثال دور دور تک کہیں نہ ملتی تھی۔ اس کی رعیت نے اسے "بڑے صاحب" کا خطاب دیا اور وہ دور دور تک خاص و عام میں اسی نام سے پکارا جاتا۔ قدرت نے بڑی فیاضی سے اسے بعض اعلا صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ قد' کاٹھی' ہاڑ' جسم' بھاری جبڑے کلے خارجی طور پر جہاں اس کی شخصیت میں ایک گونا وقار اور رعب اور دبدبے کا باعث بنے' وہاں اس کی تیز دور بیں آنکھوں نے' بے پناہ قوت مشاہدہ اور ذہانت نے' دیہات گاؤں کے ماحول' وہاں کے لوگوں کی بود و باش' رہائش' ان کی سماجی زندگی' رسم و رواج' رہن سہن' جذبات و احساسات' ان کے آپس میں روابط۔ زمین اس کی کاشت و پرداخت' باغ بانی' جمادات و نباتات' جانوروں پرندوں' جنگلی درندوں کی عادات' حرکات و سکنات' خصلت و جبلت کا گہرا اور وسیع مطالعہ شروع کیا۔ اس کی نگاہیں ہر چیز کا بڑا گہرا اور تفصیلی جائزہ لیا کرتیں اور ہر چیز کی تہہ تک پہنچ جایا کرتیں' وہ ان گوشوں تک پہنچتیں جو عموماً" لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ وہ دیہاتی نفسیات کا بڑا سچا محرم تھا اور دیہاتی زندگی کے ایک ایک کل پرزے دیہاتیوں اور کاشت کاروں کی نفسیات سے اس کو ایسی آگاہی تھی جس کی مثالیں بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

عمر کا انیسواں سال اس کی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل تھا کہ اس سال ہی وہ رشتہ ازدواج میں

منسلک ہوا' تایا کی بیٹی قدسیہ بیگم اس کی شریک حیات بنیں۔ ٹھیکرے کی منگی یہ بنت عم جب اس کی زندگی میں آئیں تو خوشیوں اور رنگ و نور کا سیلاب امڈ آیا۔ شادی کے موقع پر نہ صرف اپنی بستی بلکہ آس پاس کی تمام دوسری بستیوں اور گاؤں والوں کے لیے دعوت عام تھی۔ ہندو جاتی کے لیے ہندو رسویا کے ذریعے کھانے کا علاحدہ انتظام تھا۔ پکوان' پوری کچوری' کٹھل آلو اور انواع و اقسام کی دوسری ترکاریاں' طرح طرح کے بھوجن اور دوسری طرف پلاؤ' بریانی' زردہ' قورمہ' متنجن' مضافر وغیرہ غرض کہ کئی دن تک شادی کا جشن چلا' کھانوں کی ریل پیل رہی ٹوکروں آتش بازیاں چھٹیں۔

قدسیہ بیگم اس کی اہلیہ بڑی دین دار خاتون تھیں' اس زمانہ کی خواتین کی طرح مکتب کی تعلیم یافتہ' گلستاں بوستاں اور آمد نامہ پڑھی ہوئیں۔ قرآن شریف کے علاوہ حدیث اور فقہ میں بھی واجبی واجبی سوجھ بوجھ تھی۔ پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ تہجد بھی بڑی پابندی سے پڑھا کرتیں اور اس کے علاوہ چاشت اور اشراق کی بھی ادا کیا کرتیں۔ مزاج میں بلا کی سنجیدگی تھی اور ادھر میرے ساتھی کی طبیعت میں شوخی رچی بسی تھی اور پھر تو جوانی ہی میں زمین داری کا اختیار کلی مل جانے کے سبب تحکمانہ اور جارحانہ انداز بھی زیادہ ابھر آیا تھا اور اس پر مستزاد اس کے دیگر مشاغل اور شوق' شکار کا اور کتے پالنے کا شوق۔ مزاج' طبیعتوں اور مشاغل کا یہ بعد کبھی کبھی گھریلو زندگی میں ٹکراؤ کا باعث بن جایا کرتا اور ٹھن جایا کرتی۔ "ہنٹر" "روبر" نامی کتوں کے گھر کے اندر آنے پر وہ معترض ہوتیں اور مہینوں شکار میں گھر سے میلوں دور جنگلوں کی خاک چھاننے سے نالاں۔ مگر شکار کا شوق بھی ادب و شاعری کے شوق کی طرح اس کو ورثہ میں ملا تھا' جو بہ قول شخصے پوتڑوں سے اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اور آغاز جوانی ہی میں جاگیر کا انتظام سنبھالنے کے باعث شکار کا شوق اور تیز ہو گیا تھا اور اس کو پورا کرنے کے بھرپور مواقع بھی میسر آ گئے تھے۔ وہ قادر انداز اور بڑا ہی تیز دست شکاری تھا' اچھے اچھے تیز بندوق چلانے والے اس کی تیز دستی کا مقابلہ نہ کر سکتے اپنے حلقہ زمین داری کے علاوہ وہ کوسوں میلوں دوسرے علاقوں میں بھی شکار کھیلتا اور دوسرے اضلاع میں جا کر مہینوں کیمپ کرتا۔ میدانی ہرن مارنے میں اس کو ملکہ حاصل تھا مگر مرغابی اور قاز کے شکار میں بھی خاصی مہارت حاصل تھی۔ جاڑوں کی یخ بستہ راتوں میں جب لوگ لحافوں میں دبکے ہوتے' وہ عموماً "ساغر تال' بنی ساگر' ترہ تال' سلو گریا کسی اور جھیل یا تال کنارے قاز یا مرغابی کے شکار کے لیے بنائے ہوئے گڑھوں میں' جسم کو برف کے تیروں کی طرح چھیدتی "سیت" سے لاپرواہ عموماً" اپنے دونوں بھائیوں نواب (ابوالمولید) اور ابو مسلم کے ساتھ بیٹھا ہوتا اور اگر راتیں چاندنی ہیں تو اوپر سے گزرتے ہوئے قاز یا مرغابیوں کے جھنڈوں پر فلائنگ شاٹس کا مظاہرہ کرتا اور اگر راتیں اندھیری ہوتیں تو صرف قازوں کی قیں قیں پر ہی نشانہ لگاتا' "وہ بڑی کامیابی سے آواز پر نشانہ لگایا کرتا۔

اس کی یہ تیز دستی اور قادر انداز نشانہ بازی کئی مرتبہ ڈاکوؤں کے ان منصوبوں کو خاک میں ملاتی رہی جو وہ خوش حال زمین داروں کی اس بستی کو لوٹنے کے لیے بناتے رہتے۔ اور ایک مرتبہ پہر بھر رات ڈھلے جب اس کی خالہ زاد بہن "بیگم" نے ڈاکوؤں کو دیکھ کر اس کو مدد کے لیے پکارا تو سنسان رات میں یہ

آواز صحن میں لیٹے میرے ساتھی کے کان میں پڑی۔ گرمیوں کا زمانہ تھا' وہ یوں ہی تہمد اور بنیان میں بستر کے نیچے پٹی سے رکھی ہوئی بندوق اٹھا کر چل پڑا وہ بستر کے نیچے پٹی سے بندوق رکھے بنا کبھی نہ سوتا' یہ اس کی عادت بن چکی تھی اس کے بغیر اسے نیند ہی نہ آتی۔ اور لمبے چوڑے گلیارے اور گلیاں پار کر کے اس نے بمن کی حویلی کی "انٹیا" پر پہنچ کر کڑک دار ڈپٹ نکالی اور ڈاکوؤں کو للکارا تو ڈاکو بھاگ کھڑے ہوئے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اب اس کے مورچہ سنبھالنے کے بعد اس کی بندوق کا مقابلہ کرنے کی کسی کی ہمت نہیں۔ کچھ دن بعد اس کے ایک شناسا احاق نے جس کا ایسے لوگوں سے ربط ضبط تھا یوں رات برات موقع بے موقع نکل جانے پر اس کو تنبیہہ کی اور بتایا کہ اس گلیارے کے بیچ جس سے وہ اس رات گذرا تھا' ڈاکوؤں نے ایک ماہر نشانہ باز برگد کے پیڑ پر خاص اس مقصد کے لیے بٹھایا تھا کہ پہلے تم سے راستے ہی میں نپٹ لیں اور پھر اطمینان سے پورا گاؤں لوٹ لیں۔ مگر وہ تو خیریت گذری کہ ڈاکو تم کو تہمد اور بنیان کے حلیے میں نہ پہچان پائے' ہاں مگر یہ تعجب ہے کہ بندوق اس کو کیوں نظر نہ آئی؟ تب میرے ساتھی نے بتایا کہ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ بندوق اپنی بغل میں ہاتھ کی پوری لمبائی میں چھپا کر اور ٹانگ سے چپکا کر چلتا ہے۔

شکار کے علاوہ اس کو باغبانی اور کاشت سے ذاتی دلچسپی تھی' خاص طور پر آم کا تو وہ بڑا ہی دل دادہ تھا۔ کئی باغات اپنی ذاتی نگرانی میں نوادہ اور داراب نگر میں لگوائے تھے جن میں انواع و اقسام کی قلمیں ملیح آباد سے اپنی ذاتی نگہداشت میں تیار کروا کر لایا تھا' خود قلمیں باندھنے میں بھی ملکہ حاصل تھا' چناں چہ خود بھی ایک آم کا موجد تھا' جس کا نام اپنے آبائی قصبے کے نام پر "قند عارف" رکھا تھا۔ وہ آموں کی مختلف النوع اقسام ان کی ہمہ صفت خوبیوں' کیف' رس' ذائقے' کا بڑا اچھا شناسا تھا۔ یہاں تک کہ آم کا پتہ اندھیرے میں سونگھ کر اس کی قسم اور نام بتا دیا کرتا۔ یہ صرف معروف اور مشہور زمانہ آموں ثمر بہشت چونسہ' لنگڑا' دسہری' سپیدہ ملیح آبادی تک ہی محدود نہ تھا بلکہ دیگر تمام آموں خاص الخاص شاہ آباد' شربتی بگرین' آمن ابراہیم پور' زرد آلو' رومان کاننا' برائڈ آف رشیا' غرض کہ تمام آموں کو وہ اسی طرح پہچان لیا کرتا۔

کاشت کے معاملے میں اس کا تجربہ اور معلومات کسی ذہین اور تجربہ کار کسان سے کم نہ تھا' کیوں کہ وہ "تلائی" "گزائی" زمین تیار کرنے' ہل چلانے اور بیج ڈالنے سے لے کر فصل تیار ہونے اور پھر کٹ جانے' کھلیانوں میں پیر پڑ جانے "دائیں چلانے" "سیلائی" کرنے تک ہمہ وقت اپنے کسانوں اور کاشت کاروں کے ساتھ رہا کرتا اور ہر چیز کا بڑا تفصیلی جائزہ لیتا رہتا اور سب کچھ ذہن اور دماغ کے پردے پر محفوظ ہوتا رہتا۔ گنے اور افیون کی کاشت پر اس نے خصوصی توجہ دی تھی' بالخصوص گنے کی کاشت پر چناں چہ اس سلسلے میں ضلع بھر میں سب سے اچھا گنا پیدا کرنے کا انعام بھی حاصل کیا تھا۔

شکار' کاشت کاری' باغبانی کے علاوہ وہ گھوڑوں کا بڑا گرویدہ تھا' لڑکپن اور نوجوانی میں اس کو بڑے بڑے اچھے گھوڑوں اور ان کی داشت پرداخت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ گھر کے اصطبل

میں ایک سے ایک اعلا نسل کا اچھے سے اچھا گھوڑا موجود تھا اور پھر دادا کا نسل کشی کا اپنا اسٹڈ تھا' جہاں تھارو انگلش بریڈ' اسٹریلین ویلر' عرب' غرض کہ ولایتی اور دیسی متعدد قسم کے سانڈ افزائش نسل کے لیے موجود تھے اور دادا کی فیض تربیت سے گھوڑوں سے متعلق علوم و معلومات کا یہ خزینہ اس کو منتقل ہو گیا۔ وہ صرف گھوڑے کی چال دیکھ کر اس کے عیوب اور خوبیاں بتا دیا کرتا۔ اچھے گھوڑے کو دیکھ کر وہ بے چین ہو اٹھتا اور اس کے وجود میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ وہ گھوڑے گھوڑیوں کی ایک ایک "بھونری" چکر اس کے سعد یا نحس ہونے اور ان کے اثرات کو اچھی طرح جانتا اور خوب پہچانتا تھا۔ اور اس کے متعلق بڑی اچھی پرکھ رکھتا تھا۔ وہ گھوڑے گھوڑیوں کی عادات و خصلات' جبلت' ان کی رنگ و نسل کو بڑے بڑے کتابوں پڑھے اکتسابی علم رکھنے والوں سے بہتر سمجھتا تھا۔

گو کہ وہ بڑے رعب اور دبدبے کا حامل تھا' مگر اس کے باوجود اپنی رعایا سے بڑی مخصوص اپنائیت اور انسیت رکھتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے الاؤ کے گرد آگ تاپتے ہوئے کسانوں کے ساتھ بیٹھ کر کبھی کبھی رات گئے تک ان کے قصے اور کہانیاں داستان گو کے مخصوص انداز میں سنا کرتا۔ گاؤں کے فرد فرد اور گھر گھر کا حال اسے معلوم رہتا۔ وہ اپنی رعایا پر کسی قسم کی دھونس اور دھاندلی برداشت نہ کرتا اس کے علقہ زمین داری میں بڑے بڑے گرگ باراں دیدہ قسم کے تھانے داروں کے دخل اندازی کرتے ہوئے پر جلتے۔ بڑے بڑے فوج داری قسم کے واقعات وہ فوری کے فوری "ریڈی جسٹس" کے ذریعے خود ہی نمٹا دیا کرتا اور پولیس تھانے کچہری تک کی نوبت ہی نہ آپاتی۔ اس کی مرضی اور منشا کے بغیر اس کے علاقے میں کوئی تفتیش مکمل نہ ہو پاتی اور نہ پولیس کو کوئی گواہ ہی میسر آسکتا' بالخصوص اس کی رعایا اور کاشت کاروں سے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے بات نہ کر سکتا۔

دیہاتی زندگی وہاں کی بود و باش' طرز معاشرت' ماحول' دیہاتیوں کاشت کاروں کی نفسیات' حسیات' جذبات و احساسات کا یہ گہرا مطالعہ اور مشاہدہ جب اس کے تخلیقی جوہر سے جا ملا تو وہ بڑی حقیقی جان دار' جیتی جاگتی زندگی اور زندہ کرداروں پر مبنی کہانیاں تخلیق کرنے لگا جس کو اس کے سحر نگار اور منفرد اسلوب نے بڑا ہی پُرکار اور اثر انگیز بنا دیا۔ والد صاحب قبلہ کی تربیت کے نتائج سامنے آنے لگے اور وہ باپ دادا کی ادبی میراث کا صحیح معنوں میں وارث ٹھہرا۔ اس نے جس گھر میں آنکھ کھولی اور جس ماحول میں وہ پروان چڑھا تھا' وہاں والد صاحب قبلہ کے علاوہ اس کے دادا چودھری احمد حسن بھی اردو فارسی اور عربی کے جید عالم تھے اور اس زمانے کے مخصوص شعرا میں جو خط و کتابت بھی منظوم کیا کرتے' انھوں نے ۱۸۵۷ء کے معرکے کو مثنوی کے انداز میں نظم کیا تھا اور اس کا نام "مثنوی گل رخ بیگم" رکھا تھا۔ گھر میں تمام دن رات علمی و شعری محفلیں بپا رہتیں۔ دو پھوپھی زاد بہنیں رسول جہاں بیگم مخفی بدایونی اور نور جہاں بیگم نور بدایونی شاعرہ تھیں' چھوٹے بھائی ابو مسلم تنقیدی مضامین لکھتے' چھوٹی بہن قیصر جہاں قیصر شعر کہتیں' شفیق اور نفیس مضامین لکھتیں۔ آخری الذکر آج بھی فاطمہ انیس کے نام سے بھارت میں مسلسل افسانے اور ناول لکھ رہی ہیں۔ منجھلے بھائی ابو المؤید نے بھی بعد میں شعر و شاعری کی اور سعید تخلص

کیا۔ دو اور بہنیں رئیس جہاں اور قمر جہاں اعلا شعری اور ادبی ذوق کی حامل تھیں اور اول الذکر اپنے آخری ایام میں شعر کہنے لگی تھیں۔ اس کا پہلا افسانہ "سماج کا شکار" ۱۹۴۱ء کے "ادبی دنیا" لاہور میں چھپا تھا اور تب ہی سے ناقدین فن کو اس میں سے ایک بڑا تخلیق کار اور افسانہ نگار جھانکتا نظر آنے لگا تھا۔

اور جب میرا یہ ساتھی تھک ہار کر شکار سے واپس آتا تو تھکن کے باعث الٹا رد عمل یہ ہوتا کہ نیند اچٹ جایا کرتی اور وہ کاغذ لے کر کوئی نہ کوئی نئی کہانی تخلیق کرنا شروع کر دیتا اور یوں شکار کے شوق میں سے افسانہ نگاری کے شوق نے اپنا حصہ بانٹنا شروع کر دیا اور اگر کبھی وہ گھر سے دور جنگل یا شکار گاہ میں کسی شکاری مہم میں مصروف ہوتا تو کبھی تازہ افسانے کی فرمائش میں کسی رسالے کے ایڈیٹر کا خط یا تار پہنچتا تو اس کی تلاش میں شکار گاہ اور جنگل کی طرف آدمی دوڑائے جاتے اور وہ گھر پلٹ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی نئی تخلیق میں سرگرداں ہو جاتا۔ افسانہ نگاری کا یہ فزوں تر ہوتا شوق اس کی اہلیہ کو سب سے زیادہ بھایا کیوں کہ اس کا زیادہ تر وقت بیوی بچوں کے درمیان گذرنا شروع ہو گیا۔

اور اس کی زندگی کے شب و روز اسی نہج اور ڈگر پر گزرتے رہے' جیسے بندھے ٹکے معمولات کا ایک عمل' یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء کا پر آشوب دور آگیا' ملک کے دیگر حصوں کی طرح اس کا ضلع بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر آبائی رہائشی قصبہ عارف پور نوادہ چوں کہ مسلم اکثریت کی بستی تھی اور اس کے متعلق اطراف میں ہندو آبادیوں میں ایک خوف پایا جاتا تھا' اس لیے کبھی اس طرف کسی کی آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اور اس کے حلقہ زمین داری میں جو دیگر گاؤں تھے وہاں دو ایک مسلمان گھرانوں کے علاوہ ساری کی ساری ہندو جاتی آبادی تھی' مگر وہاں راعی اور رعایا والا معاملہ تھا اور اس کے رعب اور دبدبے کے باعث کبھی بھی کوئی سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکا' ہاں حکام ضلع نے ضرور اس کے خاندانی مسلم لیگی پس منظر کے باعث متعصبانہ اور معاندانہ رویہ اختیار کیا' بالخصوص کلکٹر شکلا نے۔ اور انھیں کانگریسی ذہنیت رکھنے والے حکام ضلع کی ایما اور پشت پناہی پر ایک کانگریسی نیتا صاحب سنگھ نے جو "کنور گانواں" نامی گاؤں کا باشندہ تھا' جو اسی اطراف میں واقع تھا جہاں اس کی زمین داری کے گاؤں آباد تھے' کسانوں اور کاشت کاروں کو بغاوت پر اکسایا مگر ہمیشہ منھ کی کھانی پڑی اور جب کلکٹر شکلا نے ایک بار اس سے کہا کہ اس کا پچھلا ریکارڈ کچھ اچھا نہیں' مطلب اس کے خاندانی مسلم لیگی پس منظر سے تھا تو اس نے سر اجلاس برجستہ اور برملا کلکٹر صاحب بہادر سے سوال کیا "حضور پچھلی ہسٹری ہمارے وزیر مال سرشان مکھم چھینی' سردار بلدیو سنگھ' شیاما پرشاد مکرجی' بریگیڈیر عثمان کی کیا ہے اور ان آئی سی ایس افسروں کی کیا ہے جو آزادی سے پہلے اپنے گورے آقاؤں کے ایک اشارے پر ترنگے نچواتے اور گاندھی کیمپوں میں نیتاؤں کی ٹوپیوں میں ریتا بھروا کر ان کی جوتے کاری کروایا کرتے تھے۔" بڑا خراب زمانہ تھا' بالخصوص پرانے مسلم لیگی مسلمانوں کے لیے تو کانگریسی عاملی عہدیداروں نے عرصہ دنیا تنگ کر رکھا تھا اور کسی مسلمان سے سر اجلاس کلکٹر کے دوبدو ایسی باتیں کرنے کی خواب و خیال میں بھی امید نہ کی جا سکتی تھی۔ اجلاس میں سناٹا چھا گیا' خصوصاً" اجلاس میں موجود مسلمان وکیل اور دیگر لوگ خائف ہو گئے' مگر میرے

ساتھی نے تو اپنی فطرت اور ضمیر کے مطابق کسی سے ڈرنا اور دبنا سیکھا ہی نہ تھا۔

اور اسی پر آشوب دور میں اس کو اپنے بچوں خصوصاً" بڑے بیٹے شاہد اور بڑی بٹی عذرا کی تعلیم کے سلسلے میں بدایوں سے علی گڈھ منتقل ہونا پڑا۔ اور جب تعلیم کے اخراجات اپنے عروج پر تھے تو توریث کی قینچی سے کتر بیونت ہوتی زمین داری بھی ساتھ چھوڑنے لگی۔ ۱۹۵۰ء میں کانگریسی حکومت نے مسلمان زمین داروں کو زک پہنچانے خاص طور پر ان کے صدیوں کے جمے اثر و رسوخ کو ختم کرنے کے لیے خاتمہ زمین داری کا اعلان کر دیا۔ یہ بڑا ہی المیہ تھا اور مسلمان زمین داروں کے لیے ایک بڑا چیلنج' کیوں کہ زمین داروں میں عموماً" نوکری کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر میرے ساتھی نے بڑے حوصلے اور پامردی کے ساتھ اس چیلنج کا مقابلہ کیا اور "سیر خود کاشت" کے ذریعہ ہی تعلیم کے اخراجات اور علی گڈھ کی رہائش کا خرچہ برداشت کیا اور یوں بڑے بیٹے شاہد کو اکنامکس میں ایم اے اور بٹی عذرا کو علی گڈھ یونی ورسٹی سے گریجویشن کروایا۔ چھوٹا بیٹا آصف اور چھوٹی بٹی نزہت ابھی کالج کی اعلا تعلیم کے قابل نہ ہوئے تھے۔ اور ایم اے کرانے کے بعد جب اس کو یہ اندازہ ہوا کہ ہندوستان کی زمین اب مسلمانوں پر تنگ ہوتی جا رہی ہے' بالخصوص روزگار اور معاش کے دروازے ان پر بند کیے جا رہے ہیں تو اس نے بیٹے کو پاکستان بھیج دیا۔ اور خود اپنے آبائی قصبے کی رہائش چھوڑ کر شہر کے مکان واقع چھ سڑکہ پر منتقل ہو گیا کیوں کہ آصف اور نزہت کی تعلیم میں وہاں کی رہائش سے سہولت ہوتی تھی۔

بڑے بیٹے شاہد کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد اس کی شریک حیات دونوں بیٹوں کے ہمراہ جون ۱۹۵۳ء میں ہجرت کر کے پاکستان روانہ ہو گئیں اور یہ واقعہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ بن گیا' سخت گرم موسم میں ریگستان کا سفر' موسم کی سختی اور سفر کی صعوبتوں کو کوئی بھی برداشت نہ کر سکا۔ سب کے سب تیز بخار میں جلتے بھنتے اس کے چھوٹے بھائی ابو مسلم کے یہاں میرپور خاص اترے۔ پہلا تار ان سب کی بیماریوں کا ملا اور دوسرے روز دوسرا تار وہ روح فرسا خبر لے کر آیا جس کو سنانے کی اسے کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ اور جب ساتھ کے کھیلے دوست اور اس کے بہنوئی چودھری محمد صالح نے بڑا ہی کڑا کر کے اس کو یہ خبر سنائی تو اس کی دنیا زیر و زبر ہو گئی' کائنات اندھیر ہو گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر بلک بلک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بیوی کی موت پر رویا اور شریک حیات کا یوں بچھڑ جانا اس کے لیے بہت بڑا المیہ ثابت ہوا جس نے اس کے مزاج تک کو بدل ڈالا۔

اور پھر وہ اپنی آبائی بستی' وطن جاگیر سب کچھ چھوڑ خود بھی ہجرت کر آیا اور اس رات جب وہ اپنے والد' بھائی بہنوں سے ملنے اپنی آبائی حویلی پہنچا تو اس کی بے چین نظریں کبھی حویلی کی چھت پر پھیلی اونچی منڈیروں کے درمیان جھنکنے لگتیں اور کبھی بالا خانے کی اونچی چھت پر چڑھتی حویلی کے آسمان میں کچھ کنگوروں پر جا پہنچتیں جن کا کلس چڑھتے چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا اور پھر وہاں سے نظر جو اتری تو دالان در دالان گذرتی "ملحقہ صحنچیوں کو پار کرتی موٹے موٹے تھاموں اور پکھوں سے جیسے لپٹ کر رہ گئی۔ میں نے غور کیا کہ وہ بڑے اندرونی کرب میں مبتلا ہے اور یہ ہجرت کا کرب تھا جو اس کو دیوان

خانے، زنان خانے، ملحقہ صحنچیوں اور دالان در دالان لیے پھر رہا تھا اور اس کی بے چین نظریں حویلی کے بام و در، دیواروں اور پکھوں سے لپٹ لپٹ کر پیار کر رہی تھیں، یہاں اس کا نھلگیاں بھرتا بچپن لڑکپن سے گلے ملا تھا اور جہاں اس کے لڑکپن پر جوانی کی سحر طلوع ہوئی تھی۔ اور جب وہ حویلی سے باہر آ کر نئی منزل کی جانب چل پڑا تو گردن موڑ موڑ کر اور تیوڑا تیوڑا کر اپنی آبائی حویلی کو دیکھتا جاتا جس کے کنگورے بدایوں شہر کی کوٹ والی سڑک سے ہی نظر آجایا کرتے۔

ہجرت کے بعد وہ کراچی میں جیکب لائنز کے ایک کوارٹر میں اپنے بچوں کے ساتھ رہنے لگا، شہر بڑا تھا، مسائل بڑے اور بہت تھے اور اس کے لیے تو زمین کی طنابیں اس لق ودق شہر کی دھڑ دھڑاتی زندگی میں سکڑ سی گئی تھیں۔ لق و دق روشن فضا والی حویلی کی رہائش محدود ہو کر صرف دو کمروں میں سمٹ آئی تھی، وہاں بڑی قابو یافتہ زندگی تھی، لامحدود وسائل تھے اور یہاں ہر چیز کا قطر سکڑا ہوا اور محدود تھا، بہت ہی چھوٹا، جہاں ہر چیز کی سمائی صرف کوارٹر کے دو کمروں میں ہو جاتی، وہاں روزی کا سوال بہ قول خود اس کے تازہ ہوا کے بھاؤ اور سورج کی روشنی کے نرخ پر حل ہو جایا کرتا اور یہاں کسب معاش ہی سب سے بڑا مسئلہ تھی، وہاں انھاروں ناجوں کا ڈھیر تولا کھیتل بھمار کی "برکت ہے برکت" کی آواز کے ساتھ ترازوں کے پلڑوں سے نکل کر اونچی اونچی چھتوں سے باتیں کرتا نظر آتا اور یہاں دو وقت کا آٹا بھی مول آیا کرتا۔ بڑا بیٹا شاہد اور بیٹی عذرا نوکری کر کے گھر کا بار اٹھاتے چھوٹا بیٹا آصف اور بیٹی نزہت ابھی کالج میں زیر تعلیم تھے اور خود اس کے لیے تو نوکری کرنا شاید ناممکن سی بات تھی کیوں کہ یہ اس کی تربیت اور مزاج کے خلاف تھی۔ اس نے جس طرح کی زندگی گذاری تھی اس کے بعد خود اس کے لیے کسی کی حاکیت قبول کرنا ممکن نہ ہوتا۔

رفتہ رفتہ اس نے خود کو کراچی کی تیز مشینی زندگی کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی مگر ذہنی طور پر وہ اپنے بھرپور اور قوی ماضی سے رشتانہ توڑ پایا۔ جب وہ رات کو بستر پر دراز ہوتا تو اکثر و بیشتر نیند اچٹ جایا کرتی، وہ عموماً نیند کی کمی کا شکار رہا کرتا اور جب نیند نہ آتی تو ذہن کے نہاں خانوں سے نکل کر نہ معلوم کب کب کے ماضی کے واقعات، کردار اور لوگ ذہن و دماغ کے پردے پر چمکنے لگتے، یادوں کی یورش ہوتی، وہ بے چین ہو اٹھتا اور یہ بے چینی بڑھ کر تخلیقی کرب سے جا ملتی اور پھر وہ ان واقعات، کرداروں کو کہانی کا روپ دے کر زندہ جاوید بنانے لگتا اور اس طرح اس نے کتنی ہی لازوال کہانیاں تخلیق کیں۔

جن نامساعد حالات میں میرے ساتھی نے کراچی میں گذر بسر کی وہ اس کے لیے واقعی ایک بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے مگر اس نے بڑی پامردی اور استقلال کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کیا۔ اس نے جس طرح کی زندگی گذاری تھی اس میں اور موجودہ زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ایسے میں جی چھوڑ جاتا، مگر اس نے تو ہمت ہارنا سیکھا ہی نہ تھا۔ بڑے بیٹے شاہد کی اچھی ملازمت لے تک و دو جاری رکھی، آصف اور نزہت کی تعلیم کو مکمل کیا، شاہد اور عذرا کی شادیاں کیں، شاہد کی حقیقی بھانجی

زینت سے اور عذرا کی اسی بہن رئیس جہاں کے بیٹے محمد میاں (سرفراز) سے۔ پھر حالات آہستہ آہستہ بدلتے گئے۔ بیٹے بیٹیوں نے اپنے قوت بازو اور محنت سے خوب خوب ترقیاں کیں اور وہ جیکب لائنز کے کوارٹر کی رہائش چھوڑ اپنے ذاتی مکان ناظم نمبر ۳ میں منتقل ہوگیا جو اس نے اپنی ذاتی نگہداشت میں تعمیر کروایا تھا اور جس کا نام اپنی مرحومہ اہلیہ کے نام پر "بیت القدسی" رکھا تھا۔ اسی گھر سے چھوٹی بیٹی نزہت کو رخصت کر کے وہ اپنے آخری فرض سے سبک دوش ہوا جس کی شادی منجھلی بہن قمر جہان کے بیٹے قاسم صالح (ہمایوں) سے کی۔ چھوٹا بیٹا آصف اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلا گیا اور وہیں کا ہو رہا۔ پھر وہ پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں والا ہو گیا' وجاہت' ندیم پوتے شایان' شیما' شازیہ' ارم' نواسے نواسیاں' خوب خوب اور ہر ہر طرح اولاد کا سکھ چین دیکھا اور برتا۔ زندگی میں ایک بار پھر خوشیوں اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ مگر میں کبھی کبھی محسوس کرتا کہ وہ کبھی کبھار ملول ہو جایا کرتا جب اسے چھوٹے بیٹے آصف کا خیال آتا۔ خصوصاً" اس کے شادی نہ کرنے پر وہ اکثر فکر مند رہا کرتا۔

لکھنے لکھانے کے علاوہ میرا ساتھی زیادہ تر وقت دوستوں کے ساتھ گذارا کرتا' وہ اپنے تمام دوستوں کو ٹوٹ کر چاہتا' گھنٹوں اور پہروں ان کے ساتھ بڑے خلوص اور اپنائیت کے ساتھ بیٹھتا۔ ان سے بات چیت کرنے میں اس کے پورے وجود سے خوشی پھوٹی پڑتی' چاہے وہ جمیل جالبی ہوں یا ضیا جالندھری' مختار زمن' سید انور یا شمیم احمد' وہ ان سب کو اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں سے چاہتا۔ ہر شام مختار زمن کے یہاں نشست رہتی۔ جمیل جالبی کے یہاں گھنٹوں اور پہروں بیٹھتا۔ شمیم احمد کے یہاں آنا جانا رہتا اور جب تک ضیا جالندھری کراچی رہے ان کے یہاں مستقل آنا جاتا' کبھی حلقہ ارباب ذوق کی نشست سے پہلے اور کبھی نشست کے بعد۔

وہ اپنے رکھ رکھاؤ انداز' لباس وضع قطع' گفتگو' مجلسی آداب غرض کہ ہر نوع اور طریقے سے اس تہذیب اور ان اقدار کا نمائندہ تھا جو اب مٹ چکی ہیں۔ اپنے تمام دوستوں کی بیویوں کو پرانے زمانے کے بزرگوں کی طرح "دلہن" کہہ کر مخاطب کرتا اور دوران گفتگو اکثر وہ الفاظ استعمال کرتا جن کے معنی' مفاہیم اور محل استعمال سے آج کی نئی نسل تقریباً" بے بہرہ ہے' مثلاً" ایک بار میں نے دیکھا اس نے ہاجرہ مسرور کو فون کیا اور فون پر جس طرح وہ ان سے مخاطب ہوا اس کو سن کر میں چونک پڑا' اس نے کہا "بنو میں بول رہا ہوں' ابوالفضل۔" اور میں سوچتا رہ گیا کہ میرے ساتھی کے علاوہ اور کتنے لوگ ہوں گے جو اب بھی "بنو" استعمال کرتے ہوں گے۔

وہ اپنے دوستوں کے بچوں سے بڑے پیار' محبت و شفقت سے ملتا۔ بچے ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہے تھے' بچوں کو دیکھ کر اس کے مزاج کی شوخی اور ظرافت عود کر آتی اور وہ خود بھی ان کے ساتھ مل کر "بچہ" بن جایا کرتا اور ان کی شرارتوں اور ہنگامہ خیزی میں شریک ہو جاتا' ہنسی مذاق اور ٹھٹھول کرتا' ضیا جالندھری کی صبا ہوں یا نین تارا' جمیل جالبی کے خاور' محمد علی' سمیرا ہوں یا فرح مختار زمن کی سیما اور شمیم احمد کے سلمان یا نعمان ہوں اور پھر خاور میاں کی فلزہ یا دانیال' ان تمام کے لیے ان کے بچپن میں

وہ ہنگاموں، شرارتوں اور ہنسی مذاق کا ذریعہ رہا۔ وہ خود کو ازراہ شوخی و مذاق اپنے بھتیجوں ندیم، نور، میرے بیٹوں شہریار، خرم، جمال عمیر سے خود کو "چھوٹا بھائی" کہلواتا اور یہ تمام بچے بڑی سنجیدگی سے اس کو چھوٹا بھائی ہی کہہ کر مخاطب ہوتے۔

کراچی کی تیز مشینی زندگی میں جہاں لوگ دو قدم بھی پیدل چلنا گوارا نہیں کرتے، وہ میلوں پیدل چلا کرتا۔ اپنے گھر سے اکثر و بیشتر وہ جمیل جالبی کے گھر تک یا اپنی بیٹی عذرا کے گھر، اے بلاک ڈی سلوا ٹاؤن تک وہ پیدل ہی آیا جایا کرتا۔ مگر میں نے غور کیا ادھر چند سالوں سے قویٰ میں اضمحلال آچلا تھا۔ اب وہ صرف ایک طرف ہی پیدل جاپاتا، واپس پیدل آنے میں گرتی ہوئی صحت اور کمزوری مانع ہونے لگی تھی، جو دن بہ دن بڑھتی ہی چلی گئی۔ دو ایک مرتبہ بیماریوں کا شدید حملہ بھی ہوا، مگر اس کے مضبوط اعصاب اور قویٰ یہ تمام حملے اٹھا گئے تاہم کمزوری بڑھتی ہی گئی، مگر لکھنا اسی شد و مد سے جاری رہا۔ دماغی اور ذہنی طور پر میرا ساتھی ویسا ہی چاق و چوبند کسا بنا تھا اور اس کے معمولات میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا تھا۔ علی الصبح اٹھ کر جب کہ گھر کے دوسرے افراد سو رہے ہوتے وہ نماز فجر پڑھ کر خود توس تیار کرتا اور ایک کپ چائے بناتا اور ناشتا کر کے لکھنے بیٹھ جاتا۔ دس گیارہ بجے کے درمیان عموماً "کھانا کھاتا، صحت میں انحطاط کے ساتھ ساتھ میں نے غور کیا کہ اس کی غذا میں بھی نمایاں کمی آچلی تھی۔ وہ خوش خوراک اور اچھی غذا کھانے والا تھا مگر اب خوراک میں نمایاں فرق تھا، جو اچھی علامت نہ تھی اور آخر وہی ہوا جس سے میں خوف زدہ تھا۔

۳ر ستمبر ۱۹۸۷ء کی صبح کو وہ حسب معمول اٹھا، نماز کے بعد ناشتا خود تیار کر کے کیا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی نئی کہانی "اورنگ زیب" لکھ رہا تھا۔ مگر میں نے غور کیا کہ آج وہ معمول سے ہٹ کر اور اپنی عادت کے خلاف بار بار چائے پی رہا ہے۔ وہ چائے پورے دن میں صرف ایک بار پیا کرتا یا گاہے بہ گاہے شام کو پی لیا کرتا، مگر آج اندر سے نہ جانے کیا چیز تھی جو بار بار چائے کی طلب اور خواہش ابھار رہی تھی اور پھر ستم یہ کہ وہ چائے میں چینی گھول گھول کر پی رہا تھا۔ ذیابیطس کا جب سے حملہ ہوا تھا، وہ چینی بالکل نہ پیتا تھا، پرہیز کرنے میں بھی میرا ساتھی بڑا کٹر تھا۔ مگر آج نہ معلوم اس کا جسم کس شکست و ریخت سے دوچار تھا کہ وہ بار بار اسی عمل کو دہراتا رہا۔ کہانی ختم ہوئی اور مگر اس کے ساتھ وہ بھی ٹوٹ کر ختم ہو گیا .... بہ مشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالے بٹورے رہا، زبان ٹوٹنے لگی۔ اس کی نواسی اور پوتے ڈاکٹر ندیم کی دلہن ڈاکٹر شیما نے جب حالت دگرگوں دیکھی تو دریافت حال کیا اور اس نے لکھ کر دیا "۲ بجے سے زبان زیادہ ٹوٹ گئی ہے۔" انگلیوں میں لرزش تھی، پوروں کی گرفت ڈھیلی ہو چلی تھی، لفظوں کے انبار اور ڈھیر لگانے والے کے الفاظ شکستہ ہو رہے تھے، مگر ہمت اب بھی باقی تھی اور یہ ہی ہمت اور قوت ارادی تھی کہ اس نے چھڑی پکڑی اور اپنے آپ کو جیسے خود سہارا دیتے ہوئے، آپ اپنے پاؤں چل کر گاڑی تک گیا اور پھر خود ہی حنیف ہسپتال کی سیڑھیاں چڑھ کر انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں جا کر دراز ہو گیا اور یوں دراز ہوا کہ پھر نہ اٹھا۔

ڈاکٹروں نے دیکھا' معائنہ کیا' ٹیسٹوں اور جانچ کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا' علاج بھی فوری شروع ہو گیا' مگر مرض کی شدت بڑھتی ہی گئی' زبان زیادہ ٹوٹتی گئی' نطق ساتھ چھوڑتا گیا' عزیز رشتے داروں کو خبر ہوئی۔ اپنے بھتیجے نذر الحسن کو لکھ کر بتایا "افسانہ الماری کے اوپر رکھا ہے۔" تخلیق کار کے اپنی تخلیق کے متعلق یہ آخری الفاظ تھے' تخلیق کار کو اپنی تخلیق کی کتنی فکر تھی!...... صبح ہوتے ہوتے لڑکھڑاتی زبان کے الفاظ سمجھ میں نہ آتے تھے۔ قلم کار نے قلم مانگا' مگر پون صدی سے بھی زیادہ عرصے کے اپنے اس ساتھی کو نہ تھام سکا۔ نذر الحسن نے بڑھ کر کانپتی انگلیوں کو سہارا دینا چاہا' کاغذ کے ایک ٹکڑے پر بنتی بگڑتی لکیروں نے کچھ الفاظ کا روپ دھارا اور اس کے علیل وجود کی پکار نے اس کے آخری الفاظ کو یہ مشکل تمام کاغذ پر منتقل کیا۔ "جمیل جالبی" یہ تھے آخری الفاظ جو قلم کار اور قلم کے آخری ملاپ کے نتیجہ میں وجود میں آئے تھے۔

جمیل جالبی کو خبر ہوئی' مختار زمن' شمیم احمد' مشفق خواجہ' سجاد میر' حمید الدین شاہد' شکیل عادل زادہ سب کو خبر ہوئی' دوست احباب آتے اور اس کی پر نور داڑھی پر آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلتیں' وہ اشک بار ہوتا' دوستوں کی محفلوں میں ہزاروں افسانے زبانی سنا دینے والا انھیں دوستوں کے جھمگٹے میں بڑی بے زبانی اور بے بسی سے ان سب کے چہروں کی طرف دیکھتا۔ مختار زمن' جمیل جالبی' شمیم احمد ڈبڈباتی آنکھوں سے ہاتھ تھام لیتے' بڑے پیار سے ہاتھ دباتے اور وہ پھر رو پڑتا۔ وہ موت سے نہ ڈرتا تھا اور نہ کبھی کسی تکلیف سے گھبرایا۔ وہ دوسروں کے سہارے زندہ رہنا نہ چاہتا تھا' وہ کسی سے کوئی خدمت نہ چاہتا تھا۔ یہ ہی اس کی آخری خواہش اور تمنا تھی۔

اور واقعی حنیف ہسپتال کا انتہائی نگہداشت کا یہ یونٹ اس کے بیٹے بیٹیوں' پوتے' نواسے نواسیوں' بھتیجے بھتیجیوں' بھانجے بھانجیوں غرض کہ تمام عزیز و اقارب سے بھرا رہتا' مگر وہ ہر قسم کی تیمارداری سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ ۳ر ستمبر کی شب اس کی بھانجی طلعت جو سوپ بنا کر لائی تھی بہ مشکل اس کے دو گھونٹ حلق سے اترے تھے اور پھر کوئی بھی غذا حلق سے نہ اتری تھی' نلکیوں کے ذریعے دوائیں اور تھوڑی بہت غذا جسم میں پہنچائی جاتی جو روح تن کا رشتا برقرار رکھے ہوئے تھی' حوائج ضروری کی ضرورت نہ رہی تھی' پیشاب اگر تھوڑا بہت ہوتا بھی تو اس کے لیے کیتھیڈرل لگا دیا گیا تھا۔ ہفتہ بھر یہ ہی کیفیت رہی۔ دماغ ابھی ماؤف نہ ہوا تھا۔ اشاروں سے بات بھی کرتا' پہچانتا بھی' مگر حالت بگڑتی ہی گئی دواؤں نے کچھ کام نہ کیا۔ اسی دوران چھوٹا بیٹا آصف لندن سے پہنچ گیا۔ آخر دم مدتوں سے بچھڑے بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں کھولیں اور تادیر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھا کیا۔ پھر رفتہ رفتہ ادب و دانش کا منبع روشن دماغ بھی ماؤف ہو گیا۔ مسلسل اور مستقل بے ہوشی طاری ہو گئی' کبھی کبھار آنکھیں کھولتا ایک لحظہ کے لیے' مگر یوں محسوس ہوتا کہ جیسے اب پہچان اور شناخت ختم ہو چکی ہے' تنفس اکھڑ چکا تھا۔ مانیٹر پر کبھی نبض کی رفتار مدہم ہو جاتی اور کبھی تیز۔ خون کے دباؤ کا گراف بھی چڑھتا اترتا رہتا۔ سانس زیادہ الجھنے لگی' زندگی کا گراف تیزی سے نیچے آنا شروع ہوتا' موت اور زندگی ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے'

وہ سنبھالا لیتا' عزیزو اقارب کے چہروں پر امید و بیم کی کیفیت طاری رہتی۔ زندگی و موت کی یہ کشاکش جاری رہی۔ وہ بڑی پامردی سے موت کا مقابلہ کرتا رہا' جب جب موت کا حملہ شدید ہوتا' وہ سنبھل سنبھل جاتا' مگر موت اور زندگی کی اس جنگ میں جیت تو ہمیشہ موت کی ہی ہوئی ہے اور ہمیشہ کی طرح زندگی یہاں بھی ہار گئی۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ء کو ٹھیک اس وقت جب وہ خود آپ اپنے پیروں چل کر اسپتال پہنچا تھا' یعنی دو بج کر ۲۵ منٹ پر موت کی اٹل حقیقت نے میرے ساتھی کو شکست دے دی' روح و تن کا رشتہ ختم ہو گیا۔

عزیزو اقارب' دوست احباب میت گھر لے آئے اور اس کے جسد خاکی کو اس کمرے کے سامنے رکھ دیا جو پچھلے چوبیس برسوں سے اس کا مسکن رہا تھا۔ اس کی میت کے سرہانے ٹنگی اس شیلڈ کے الفاظ روشن نگینوں کی طرح چمک رہے تھے جو ابھی چند ماہ پیشتر ہی انجمن ترقی اردو نے اس کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک ادبی جلسے میں پیش کی تھی۔ "انجمن ترقی اردو جناب ابوالفضل صدیقی کو ان کی پچاس سالہ خدمات اردو کے صلے میں خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔" گھر میں کہرام بپا تھا' دوست عزیز برادری والے عارف پور نوادہ کے چودھریوں کے اس عظیم فرزند کے رخصت ہو جانے پر نوحہ کناں تھے۔

اور پھر "آخری رسوم کی ادائیگی" جیسی لازوال کہانی کے تخلیق کار کی خود اپنی آخری رسوم کی ادائیگی کی تیاریاں شروع ہو گئیں' اور جب عزیز رشتے دار' دوست احباب اس کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے آخری سفر پر لیے جاتے تھے تو کہیں سے ایک ندا آئی "کس کی میت ہے کہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے لیے جاتے ہو؟" جنازے کے جلوس میں سے کوئی بولا "ابوالفضل صدیقی" کو........

وہ ندا پھر آئی اور کہا "جنازہ ٹھہراؤ کہ لوگ کچھ پوچھنے آئے ہیں......

وہ پوچھتے ہیں کہ گھوڑی اگر "تین تیرہ" اور "سیاہ تالو" ہو تو کیسی ہوتی ہے۔

"تنگ توڑ" ' "گندہ بغل" ' "آنسو ڈھال" ' "ستارہ پیشانی" ' "مینڈھا سینگی" ' "ناگ سانپن" بھوتریاں کیسی ہوتی ہیں اور ان کا کیا مطلب ہوتا ہے ...... اور گھوڑے کی چھاتی پر اور گلے پر اگر "دیو من" اور "کنٹھہ من" ہو اور کوکھ اور ماتھے پر "فصلی" اور "گنگاپات" تو گھوڑا کیسا ہو گا؟.......

"دیوٹھان" کا تیوہار کسان کب مناتے ہیں؟

"دستور دیہی واجب الارض شد آمد قدیم" کا کیا مطلب ہے؟

مگر جواب کون دیتا' جواب دینے والے ہونٹوں پر تو ابدی سکوت اور خاموشی کی مہر ثبت ہو چکی تھی۔

پھر یہ کوس رحلت پاپوش نگر کے قبرستان جا پہنچا' جہاں گیس کی لالٹینوں کی روشنی میں اس کے پیاروں نے اس کو قبر میں اتار دیا' کہ یہیں کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے رب عظیم نے اس کا خاکی وجود تشکیل دیا تھا۔

کمرہ سنسان تھا' کل گھر میں سناٹا تھا' عجیب سی ویرانی تھی کہ پورے گھر پر محیط محسوس ہوتی تھی' مگر اس سکوت اور سناٹے کو کبھی کبھی ایک آواز توڑتی' ہلکی ہلکی بڑی ہی رسیلی اور دلاویز.........

"صریر خامہ"

مجھے ایک جھرجھری سی آئی' آنسوؤں کے قطرے ٹپ ٹپ گرنے لگے' میں نے دیکھا فرش پر روشنائی کے قطرے گر کر پھیل گئے تھے' وہ روشنائی جو اس نے کچھ ہی دن پہلے اپنا آخری افسانہ "اورنگ زیب" لکھتے وقت ڈالی تھی۔

اور یوں اپنے ساتھی کی دائمی جدائی کے بعد میرا وجود بھی ہمیشہ کے لیے خالی ہو گیا' میں کہ جس کی قسم خالق ارض والسموات نے کھائی۔

"ن والقلم وما یسطرون ○"

اب آپ سے رخصت ہوتا ہوں.........!

☆ ☆ ☆

مبین مرزا

دھواں ہوتے منظروں کا سفر

(ابوالفضل صدیقی کا فن)

یہ اس زمانے کی بات ہے جب انسان نے صرف اپنی سوچ ہی کو اپنے ہونے کی دلیل نہیں بنایا تھا (*۱) اور نہ ہی اس وقت تک وہ زندگی کی سچائیوں کو انفرادی قسم کی حقیقت سمجھتا تھا (*۲)' اسے اپنے اردگرد ایک دنیا آباد نظر آتی تھی' اور ساتھ ہی اسے اپنے داخل میں بھی ایک وسیع دنیا کے ہونے کا ادراک تھا۔ وہ ان دونوں دنیاؤں کی حقیقت کو اپنی اپنی جگہ تسلیم کرتا اور ان کے مابین تعلق کو بہ خوبی سمجھتا تھا۔ اس وقت بھی ان دنیاؤں کے حوالے سے اس کا ذہن مختلف قسم کے سوال اٹھاتا تھا اور ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں وہ پریشان اور مضطرب بھی رہتا تھا' لیکن خیال و فکر کے ان اندھیرے راستوں پر وہ کبھی نہیں نکلا تھا جو اسے ایسی منزل تک لے جائیں جہاں پہنچ کر وہ خارج ہی نہیں اپنے داخل کی بھی ساری حقیقتوں کی نفی کر دے........ نفی کرنا تو دور کی بات ہے وہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آفاق و انفس کے ارتباط ہی سے وہ اپنے جسم و جاں کی اکائی کا شعور حاصل کرتا تھا۔ گرد و پیش کے حالات اور رشتے اس کے نزدیک جیتی جاگتی حقیقتیں تھیں جن کے بغیر اس کے نزدیک زندگی کے کوئی معنی نہیں تھے۔ جی ہاں' یہ وہی زمانہ تھا جب وہ ہنسنے رونے' سونے جاگنے اور کھانے پینے کی طرح دوسروں کے دکھ سکھ کو اپنا سمجھ کر ان میں شریک ہونا زندگی کا لازمہ سمجھتا تھا۔ دوسروں کو اپنے احساس و ادراک میں شامل کرنے اور ان کے شعور اور تجربے میں شامل ہونے کی خواہش ہی اسے داستان گوئی اور فسانہ طرازی کی طرف لے کر آئی تھی۔

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی موضوعات پر لکھی جانے والی کہانیاں خواہ کسی بھی پیرایۂ بیاں میں سنائی گئی ہوں' وہ ایک خاص تہذیب اور اس کے پیدا کردہ معاشرے کی بہرحال عکاس ہوتی ہیں۔ تاہم اس کا انحصار لکھنے والے پر ہے کہ وہ خود کس درجے میں زندگی کرتا ہے اور اپنی تہذیبی اور معاشرتی روح کو گرفت کرنے کے لیے اس کے اندر کتنا گہرا اتر سکتا ہے۔ ادب اور آرٹ کے نظریاتی وظائف سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر تہذیب و ثقافت ہمیشہ چند ایسے فن کار پیدا کرتی آئی ہے جو اس کے نقوش تراشتے اور سنوارتے ہی نہیں محفوظ بھی کرتے ہیں۔ امتدادِ وقت اور مرورِ زمانہ کی منزلوں سے

گزرتے ہوئے معاشروں اور قوموں کے تہذیبی اور ثقافتی نقش و نگار بگڑتے اور بدلتے چلے جاتے ہیں۔ تخلیقی فن کار ہی معاشرے کا وہ فرد ہوتا ہے جو آتی ہوئی تبدیلی کے قدموں کی آہٹ دور ہی سے جان لیتا ہے۔ یہ اسی کا دل ہوتا ہے جس میں معدوم ہوتے تہذیبی نقوش پناہ حاصل کرتے ہیں اور یہ اسی کا قلم و موقلم ہوتا ہے جو تبدیلی کے اس سفر کی روداد رقم کرتے ہوئے مٹتے تمدن کے نقش و نگار کو تاریخ کے تناظر میں ایک نئی معنویت عطا کرتا ہے۔

ابوالفضل صدیقی کا شمار ہمارے افسانوی ادب کے انھی تخلیقی فن کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہماری تہذیب کے ایسے ہی ادوار کی روداد قلم بند کی ہے۔ ان کی کہانیاں' ناولٹ اور ناول ہمیں ہماری گم ہوتی ہوئی حویلیوں' دالانوں' گلیوں' محلوں' بنوں' دیہاتوں اور شہروں کی وہ داستان سناتے ہیں جس میں ہم خود کو اپنی تہذیب و تاریخ کے دوراہوں پر کھڑے اور اجنبی راستوں کی جانب نکلتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ ٹالسٹائی کے ناولوں اور چیخوف کے افسانوں کی طرح ابوالفضل صدیقی کی کہانیاں بھی ہمارے رنج سفر کی ایسی داستان ہیں جو بہ یک وقت دو متوازی خطوط پر چلتی ہے۔ ایک طرف یہ معاشرے کے تناظر میں فرد کی سرگزشت سناتی ہے اور دوسری طرف فرد کی زد میں آئے معاشرے کی چِتا۔ کہانی کا یہ مزاج و انداز یوں تو ۴۰ء' ۵۰ء اور کسی قدر ۶۰ء کی دہائیوں کے اردو فکشن میں عام طور پر نظر آتا ہے جو بعد ازاں کہانی کے نئے trends کے تحت بدلتا چلا گیا ہے لیکن ابوالفضل صدیقی کے پورے فنی کیریر میں کہانی کا سفر انھی دو خطوط پر جاری دکھائی دیتا ہے لہٰذا ان کے اس اسلوب کو سمجھے بغیر ہم ان کی فنی نکتہ طرازیوں اور تخلیقی باریکیوں کی صحیح معنوں میں داد ہرگز نہیں دے سکتے۔

دیکھا جائے تو اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں فکشن کے مطالعے کی باقاعدہ ریت اب تک نہیں پڑ سکی۔ تقسیم ہند کے زمانے اور موضوعات کو اگر ہم استثنا سمجھ لیں تو پھر بس اتنا ہوا ہے کہ بعض شخصیات کے زیر اثر ہمارے ہاں فکشن کا چلن ذرا سا عام ہوا اور ان شخصیات کے منظر سے رخصت ہونے کے ساتھ ہی یہ چلن بھی رخصت ہو گیا۔ اب دیکھیے تو ایک ایسا معاشرہ جس کی ذوقی اور ادبی تربیت غزل کے ایجاز و اختصار اور رمز آفرینی کے زیرِ سایہ ہوئی ہو' اس کی ناول سے بے اعتنائی کچھ ایسے اچنبے کی بات بھی نہیں ہے۔ پھر دوسرے یہ کہ ہمارے ہاں ایسے کتنے فکشن نگار رہے ہیں جنھوں نے عوامی مزاج کی تربیت کو بھی ملحوظ رکھا ہو...... یعنی تخلیقی اور فنی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی ہو کہ وہ افرادِ معاشرہ کے مزاج میں کہانی کے ذریعے زندگی کے معنی دریافت کرنے کا ذوق پیدا کریں۔ کہانی اور زندگی میں وہ ربط تلاش کرنے کی خواہش لوگوں میں اجاگر کریں جو تخلیقی ادب کا جواز ہے اور جس کی بدولت انسانی فکر و تجربہ کا بیش قیمت سرمایہ ہر پرانی نسل اپنی نسل نو کو صدیوں سے مسلسل منتقل کرتی آرہی ہے۔ اول تو خیر یہ تگ و دو کی ہی نہیں گئی اور اگر کچھ لوگوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی بھی ہے تو یہ وہ لوگ تھے جنھیں زندگی اور اس کے عمیق مسائل سے کچھ ایسی دلچسپی نہیں تھی۔ انھوں نے entertaining موضوعات پر لکھا' عوام کو تفریح کا سامان فراہم کیا اور مقبول ہوئے۔ اب ان لوگوں کا مسئلہ نہیں مشغلہ

تھا اور مشغلہ بھی فارغ وقت کا' سوانھوں نے جو کچھ کیا وہ اسی کی استعداد رکھتے تھے۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں سنجیدہ فکشن نگاروں کے مقابلے میں popular لکھنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی۔ ہمارے دوسرے بڑے فکشن نگاروں کی طرح ابوالفضل صدیقی کا شمار کسی بھی دور میں popular لکھنے والوں میں نہیں ہوا۔ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ اولاً" یہ کہ وہ ایک خاص طرح کے ماحول' تہذیب اور معاشرتی اقدار کے پروردہ تھے۔ چوں کہ ہر تخلیق کار اپنی ہی زندگی لکھتا ہے اس لیے انھوں نے جس زندگی کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا اور جس تہذیب و معاشرت کو portray کیا اس کی کچھ ایسی popular appeal نہیں ہے۔ ثانیاً" جیسا کہ میں نے سطور بالا میں اشارہ کیا کہ ان کی کہانی بہ یک وقت دو متوازی خطوط پر سفر کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی کہانی کی داد دینے کے لیے فہم و ادراک کی جو صلاحیت درکار ہوتی ہے اس کی بھی ارزانی عامۃ الناس میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا ادب کی دنیا میں قابل احترام مرتبہ و مقام رکھنے کے باوجود ابوالفضل صدیقی مقبول و معروف افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی صف میں کھڑے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ تو ہوئی عوامی ذوق کی بات لیکن دوسری طرف جو صورت حال ہم دیکھتے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک اور توجہ طلب ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ناقدین فن نے بھی حیرت انگیز حد تک انھیں نظرانداز کیا ہے۔ لیکن کیوں؟ اس کی کوئی معقول وجہ غور کرنے کے باوجود سمجھ میں نہیں آتی۔ حالاں کہ جہاں تک ابوالفضل صدیقی کے فن کا تعلق ہے تو یہ بات نہایت وثوق سے بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اردو فکشن کی تاریخ میں ان سے صرف نظر کرنا ایسا ہی ہے جیسے تاریخ و معاشرت کے ایک عہد اور اردو فکشن کے ایک منفرد اسلوب کو فراموش کردیا جائے۔ آخر پھر انھیں نظرانداز کیے جانے کا سبب کیا ہے؟ ہر پھر کر وہی گھسی پٹی بات کہ وہ پی آر کے آدمی نہیں تھے اور ان کی کوئی لابی نہیں تھی اس لیے نظریاتی کشتیوں میں بیٹھ کر ادب کے سمندر کی سیر کرنے والے نقادان فن نے اس جزیرے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کے باب میں اس طرح کا جواب دیتے ہوئے کیا ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنی ادبی بددیانتی کا اعتراف کرتے اور اس کی تلافی کے خواہاں ہوتے ہیں؟ یا اب ایسی باتیں بھی محض فیشن کے طور پر کرکے ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری ساری کوتاہیوں کا ازالہ ہوگیا؟ ہمارے عہد کی تنقید کو ندامتوں کے کوچے سے نکل کر راہ وقار و اعتبار میں قدم رکھنے سے پہلے ان سوالوں کا جواب ایک بار تو بہرحال دینا ہی ہوگا۔

ابوالفضل صدیقی سے میری شناسائی کے حوالے یوں تو اس سے پہلے اور بھی کئی تھے لیکن تفصیلی تعارف کا ذریعہ ان کی کہانی "باپ" بنی۔ میں نے یہ کہانی ۶۰ء کی دہائی کے ایک انتخاب میں پڑھی تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کہانی نے مجھ پر شدید اثر کیا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مجھے پوری طرح اس کہانی نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ کوڑھی باپ' سفاک زمانے اور اس زمانے کے ہاتھوں مجبور ہوتے بیٹے کی کردار نگاری' مختلف مدارج سے گزر کر انجام کو پہنچتا المیہ' تقدیر کی سفاکی' دو باپوں یعنی باپ اور بیٹے (بیٹے کے خود بہ حیثیت باپ مسائل) کی جذباتی کشاکش اور معاشرتی ماحول کی عکاسی پر افسانہ نگار کی

جو بے مثال گرفت تھی' میں اس پر بار بار غور کرتا اور رہ رہ کر داد دیتا تھا۔ چناں چہ یہی کہانی میرے لیے ابوالفضل صدیقی کے بالاستیعاب مطالعے کا جواز ثابت ہوئی اور اس کے بعد میں نے خاصا وقت ان کی کہانیوں کے ساتھ گزارا ...... اور اس مضمون کی شانِ نزول وہی محسوسات اور خیالات ہیں جو اس مطالعے کا حاصل ہیں۔

زندگی کا ایک عرصہ ابوالفضل صدیقی نے دیہات میں گزارا تھا۔ زمین داری اور شکار کا شوق دونوں وراثتیں انھیں اپنے آباواجداد سے منتقل ہوئی تھیں۔ چناں چہ انھی دونوں کے ساتھ پہلے ان کی زندگی کے سنہرے دن بیتے اور پھرباقی زندگی انھی کی یادوں کی نذر ہوئی۔ ان کے فکروخیال کی ۸۰ فیصد سے زائد دنیا انھی کے موضوعات ومسائل سے آباد ہے۔ دیہات اور اس کا نظام حیات ہمارے افسانوی ادب کا مستقل موضوع رہا ہے۔ پریم چند' اوپندر ناتھ اشک' ابوالفضل صدیقی' بلونت سنگھ' سید رفیق حسین' سید محمد اشرف' غلام الثقلین نقوی' احمد ندیم قاسمی' عبداللہ حسین اور غشایاد تک ہر عہد اس موضوع کو کہانی میں زندہ رکھنے کے لیے اپنے نمایندے پیش کرتا آیا ہے۔

شہروں کی طلسماتی فضا اور سحر آفریں زندگی اپنی جگہ لیکن دیہات کی زندگی بھی اک نگارِ ہشت پہلو سے کم نہیں ہوا کرتی۔ پوری زندگی کو لکھنا تو خیر کب کسی کو نصیب ہوا ہے' یہی بہت ہے کہ لکھنے والا زندگی کے جس پہلو پر قلم اٹھائے اسے ایسی خلاقی کے ساتھ پیش کرے کہ تحریر لمسِ حیات سے معمور نظر آئے۔ یہ تو درست ہے کہ دیہات کی طرزِ حیات کے جن گوشوں پر ہمارے ہاں کہانیاں لکھی گئی ہیں وہ اپنی تفصیلات کے ساتھ محفوظ ہوگئے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ دیہاتی زندگی کی روح کو اس کی کلّیت میں گرفت کرنے کی کوشش زیادہ بھرپور طور پر نہیں ہوپائی اور جو ہوئی ہے اس میں خاطر خواہ کام یابی بھی ہمیں نظر نہیں آتی۔ اب مثال کے طور پر آپ پریم چند کے ناول اور افسانے یک جا کرکے دیکھیے تو دیہاتی زندگی کی جو تصویر بنتی نظر آئے گی اس میں دیہات کی اپر کلاس کی غیر معمولی طور پر کم موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ تصویر ادھوری رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اوپندر ناتھ اشک نے کئی حصوں پر مشتمل ناولوں کے سلسلے "گرتی دیواریں" کے ابتدائی حصے میں بالخصوص اور کئی ایک دوسری کہانیوں میں بھی اس کلّیت کو گرفت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے ہاں باریک بینی کا غیر معمولی فقدان ان کی بنائی ہوئی تصویر میں گہرائی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ رفیق حسین اور سید محمد اشرف کے ہاں دیہات اور جنگل ہم آمیز ہوجاتے ہیں نتیجتاً" دیہات کی روح سے اس کی اپنی اصل اور خالص شکل میں ملاقات ممکن نہیں ہوپاتی۔ ابوالفضل صدیقی البتہ ایک ایسے فن کار ہیں جن کا قلم دیہات اور اس کی زندگی کی نقشا کشی اس کے پورے پیش منظر اور پس منظر کے ساتھ کرتا ہے۔ ان کی نظر قریب اور دور کے مناظر اور ان کی باریکیاں بہ یک وقت اور یکساں سہولت سے دیکھتی ہے اور ان کا قلم ان مناظر کو جیتا جاگتا دکھانے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ دیہات کی تہذیب' معاشرت' نظامِ اقدار سے لے کر اس کے باسیوں کی ذہنیت' مزاج اور آبائی اور خاندانی مسائل اور ان کے نسل در نسل اثرات تک کا کوئی پہلو ایسا نظر نہیں

آتا جو ان کی نگاہوں سے او جھل رہ گیا ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں مسلمان' ہندو اور سکھ عقاید اور معاشرتی اقدار کا بھی کوئی اختصاص نہیں ہے بلکہ ان کے کردار اور کہانی کے واقعات اپنے سیاق و سباق کے تسلسل میں سفر کرتے ہیں۔ لہٰذا کہانی کار ان کے عقیدہ و مذہب اور مشرب و مسلک کی بنیاد پر ان سے کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھتا۔ وہ لوگوں کو ان کی بنیادی انسانی حیثیت میں دیکھتا ہے اور اسی جہت سے ان کی روداد حیات لکھتا ہے۔ دوسری ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ابوالفضل صدیقی نے کسی عقیدے اور مسلک کی کہانی نہیں لکھی بلکہ ان کی کہانیوں کا موضوع اس برصغیر کی دیہاتی زندگی ہے کہ ایک طویل عرصے تک وسیع المشربی اور انسان دوستی جس کی ثقافت کے بنیادی اجزائے ترکیبی رہے ہیں۔ چناں چہ ان کی کہانیوں میں اکثر و بیشتر ایک ایسا معاشرہ ہمیں ملتا ہے جس میں مختلف عقاید کے افراد اپنے اپنے موقف کے ساتھ آزادانہ اور معاشرتی سطح پر باہم مربوط زندگی گزارتے ہیں۔ اس پہلو سے بہ نگاہِ غائر جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر کی دیہاتی زندگی کی کہانی ہمارے ہاں ابوالفضل صدیقی سے بہتر کوئی دوسرا کہانی کار نہیں لکھ سکا ہے۔

"کھری" اور "درد کا حد سے گزر جانا" جیسی مختصر کہانیاں ہوں یا "باپ" "گلاب خاص" "بھیا دیوج" "چڑھتا سورج" جیسی ذرا بڑی کہانیاں یا "دن ڈھلے" "سود در سود" ایسے طویل مختصر افسانے یا "گل زمین" "علاج بالمثل" اور "مفرداتِ خصوصی" ایسے ناولٹ یا "ترنگ" اور "زخم دل" ایسے ناول' سب کہانیوں میں جو ایک بات مشترک دیکھی جا سکتی ہے' وہ ہے انسانی تعلقات اور رشتوں کے زندہ اور فعال ہونے کا احساس۔ ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں کے تار و پود میں ہمیں جیتے جاگتے انسانی رشتے کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ یہ رشتے صرف اور صرف محبت' الفت اور اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانی عظمت اور اشرف المخلوقیت کی داستانیں نہیں سناتے بلکہ محبت کے ساتھ نفرت' الفت کے ساتھ مخاصمت اور اخوت کے ساتھ خود غرضی کے جراثیم بھی ان کے خون میں گردش کرتے ہیں۔ حرص' ہوس' غصہ' رنج' خلش اور شرمساری کے جذبات بھی ان کرداروں کے رویوں میں اسی طرح کام کرتے ہیں جیسے خود ہماری زندگی میں۔ "کھری" کے ممال کا کردار آپ دیکھ لیجیے۔ پہلے افلاس اور مجبوری اس دین دار آدمی سے کیا کرواتی ہے اور پھر عدالت میں جھوٹے بیان کے بعد وہی نمازی ممال کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ "باپ" کے بارے میں تو پہلے ہی میں اپنے تاثرات بیان کر چکا ہوں۔ "گلاب خاص" کو دیکھیے' بااختیار زمین دار' بے کس مالی' اس کی بیٹی اور پھر خود فاروقی صاحب کیسے جیتے جاگتے کردار ہیں اور کس طرح اپنی اپنی سطح پر انسانی ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح "علاج بالمثل" "بھیا دیوج" "ترنگ" سب کہانیوں میں آپ کو ایسے ہی زندہ کردار اپنے اپنے دکھ سکھ' محبت نفرت' ایثار ہوس' سربلندی اور شرمساری کے ساتھ زیست کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی کا فن دراصل انسانی کرداروں کو ان کے گرد و پیش کی صورتِ حال' ان کے باہمی رشتوں اور خود اُن پر ان رشتوں کے اثرات اور تقدیر کی راہوں پر ان کی مسافت کی روداد قلم بند کرنے ہی سے عبارت ہے ...... یہ ابوالفضل صدیقی کی ہنرمندی ہے جو ان

کرداروں کو اس طرح prototypes بنا دیتی ہے کہ انفرادی داخلی کیفیت اور بہ یک وقت متنوع بلکہ متضاد احساسات کے زیرِ اثر زندہ رہنے والے یہ لوگ اپنی اپنی جگہ مختلف shades of life نظر آتے ہیں۔ یہ وہی shades ہیں جن کی چھوٹ ہماری تاریخ کے ایک پورے دور پر پڑتی ہے۔ جی ہاں' بیس ویں صدی کے اوائل میں ہماری اخلاقی' معاشرتی صورتِ حال اور برطانوی نظامِ حکومت کے زیرِ اثر کام کرنے والے اداروں مثلاً" پولیس' عدالت' تحصیل وغیرہ کا سماج میں نفوذ اور اس کے رویوں کی تشکیل میں ان کے کردار کا تاریخی حقایق کی روشنی میں جائزہ لیجئے تو ابوالفضل صدیقی کے کرداروں کی پورے ایک عہد سے relevance آپ کے سامنے آجائے گی۔

انیس ویں صدی کے اہم اور معروف برطانوی کہانی کاروں جین آسٹن' چارلس ڈکنس' ولیم تھیکرے اور جارج ایلیٹ کو انگریزی تنقید' معاشرت نگاری اور حقیقت پسندی کے عنوان سے بر کیٹ کرتی ہے۔ خصوصاً "جین آسٹن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کہانی بنتے' بڑھاتے اور اسے منطقی انجام تک پہنچاتے ہوئے کسی بھی موقع پر اپنی گرد و پیش کی زندگی سے صرفِ نظر نہیں کرتی اور یہ کہ اس کے ناولوں میں انیس ویں صدی کے انگلستان کو سانس لیتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے(۳*)۔ ہمیں بیس ویں صدی کے اوائل کے ہندوستانی دیہات کی کچھ ایسی ہی کیفیت ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں میں ملتی ہے۔ حقیقت نگاری ان کے ہاں پریم چند کے اثرات کے تحت آئی ہے کہ اس زمانے میں معاشرتی حقایق کو کہانی میں پیش کرنے کے چلن کو عام کرنے میں پریم چند' منٹو اور عصمت کے افسانوں ہی نے اپنے اپنے انداز سے اہم کردار ادا کیا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر سماجی موضوعات اور مسائل نے ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں میں راہ پانے کا جواز ہی حاصل نہیں کیا بلکہ فکری سطح پر ان کے شعور نے ان مسائل سے رجوع کرنے کے لیے اپنا ایک زاویۂ نگاہ بھی وضع کیا۔ جس طرح جارج ایلیٹ کے ہاں ہمیں صوبائی اور علاقائی زندگی کے امتیازات کا احساس ہوتا ہے(۴*) اسی طرح ابوالفضل صدیقی کے ہاں روہیل کھنڈ اور اس کے قرب و جوار کی زندگی اپنی مقامی شناخت کے ساتھ نظر آتی ہے۔

ابوالفضل صدیقی کے فن کا ایک اہم امتیاز ان کی جزئیات نگاری ہے۔ کرداروں کے مزاج نفسیاتی عوامل' علاقائی نظامِ اقدار' تہذیبی رویّے' خارجی ماحول اور اشیا کی جو تفصیلات ہمیں ان کی کہانیوں میں ملتی ہیں وہ اردو کے کسی اور کہانی کار کے ہاں ایسی فراوانی اور باریک بینی کے ساتھ نظر نہیں آتیں۔ ابوالفضل صدیقی نے بیش تر کہانیاں بیانیہ میں لکھی ہیں اور بیانیہ پر ان کی گرفت کا کمال یہ ہے کہ کسی موقع پر ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کہانی کار طول بیانی کا شوقین یا اختصارِ بیاں کے ہنر سے نابلد ہے۔ اس کے برعکس ان کی کہانیوں میں ایسی داستاں طرازی اور بیانیہ پر فن کارانہ قدرت کا تاثر ابھرتا ہے جیسے ایک عظیم مصور اپنے خیال کو تصویر کرتے ہوئے جانتا ہے کہ اسے کتنے اور کون کون سے رنگ درکار ہوں گے اور کن کن رنگوں کے ہم آمیز ہونے پر یہ تصویر قوتِ گویائی حاصل کرلے گی۔

ابوالفضل صدیقی کی جزئیات نگاری کو بعض ناقدین ان کے فن کی ایسی کم زوری بتاتے ہیں جو

قاری کو گراں ہی نہیں گزرتی بلکہ اسے کہانی سے دور بھی لے جاتی ہے۔ چناں چہ کہانی کا تاثر اگر زائل نہیں ہوتا تو کم زور ضرور پڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تفصیل بیانی ہی کا وصف ہے جو ان کی کہانی میں داستانوی فن کی سی روانی پیدا کرتا ہے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں تبصرے ان کے اس فنی وصف پر غور کیے بغیر قدرے عجلت میں کیے گئے ہیں۔ میرے خیال میں ابوالفضل صدیقی کی اس تفصیل بیانی اور جزئیات نگاری کا محرک واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری ہے۔ کہانی کار کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ گرد و پیش کی حقیقی زندگی کو من و عن اس کی تمام تر جزئیات اور بوقلمونی کے ساتھ کہانی میں سمو دینا چاہتا ہے' سو یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے بیان اور تصویر کشی میں تفصیلات کا دائرہ وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس فنی خصوصیت کی داد اپنی جگہ لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سماجی حقیقت نگاری کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ اسی وقت تک اپنی اہمیت اور کشش برقرار رکھ سکتی ہے جب تک قاری کے گرد و پیش کا معاشرتی ماحول اور زندگی انھی حقائق کو subscribe کرتے ہیں 'جنھیں کہانی کار نے پیش کیا ہے۔ جس روز معاشرے کے مسائل اور حقائق بدلتے ہیں اسی روز سماجی واقعیت و حقیقت کے اسلوب میں لکھی گئی کہانی out dated ہو جاتی ہے۔ پریم چند کی کہانیوں کی گیرائی اور گہرائی اپنی جگہ لیکن حقیقت کا جو عنصر ایک زمانے میں ان کی کہانیوں کی جان اور ان کے فن کی معراج تھا' آج ہمارے زمانے میں اس کی کوئی social relevance باقی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ کہ "کفن" جیسی کہانی جو کبھی پڑھنے والوں کا دامنِ دل کھینچتی تھی' اب صرف اپنی فنی خوبیوں کی بنا پر محض ذرا سی دیر کے لیے توجہ طلب کر کے رہ جاتی ہے۔ یہ محض ایک پریم چند ہی کا مسئلہ نہیں ہے آپ پوری ترقی پسند تحریک کے المیے پر غور کیجیے تو اس تحریک کی ادب میں ایک خاص وقفے کے بعد ناکامی کے جو بنیادی عوامل سامنے آئیں گے ان میں اسی نوع کی سیاسی و معاشی واقعیت پسندی اور سماجی حقیقت نگاری پر پُرزور اصرار بھی شامل ہوگا۔ ادب کی ماہیت کو محض وقتی مقصدیت اور افادیت تک محدود کرنے کا آخرکار منطقی انجام اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ ابوالفضل صدیقی کی بھی کئی کہانیاں اسی سماجی حقیقت نگاری کے غلبے کی وجہ سے اپنے تخلیقی سفر کے اختتام کو پہنچ کر اب صرف محققوں اور ایم اے' پی ایچ ڈی کے مقالہ نگاروں کے مطلب کی چیز ہو کر رہ گئی ہوں گی لیکن ان کی بعض کہانیاں آج بھی زندہ ہیں اور کل بھی اردو ادب کے زندہ سرمایے کا حصہ ہوں گی۔ مثال کے طور پر "بھیا دیوج" "چڑھتا سورج" "گلاب خاص" "جوالا مکھ" "گل زمین" "علاج بالمثل" اور "سود در سود" ایسی کہانیوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کہانیوں کے زندہ بچ رہنے کی وجہ ان میں پیش کیے گئے معاشرتی حقائق کا غلغلہ نہیں ہے بلکہ ان کا اصل جوہر انسانی جذبہ و احساس کی وہ ازلی و ابدی سچائی ہے جو کبھی dated ہوتی ہے اور نہ جس پر کسی میگنا کارٹا کے اصول و ضوابط کے مہیب سائے منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ہماری ملاقات ان انسانوں سے ہوتی ہے جو شناسائی کے لمحہ بھر بعد ہی دل کی کیفیت اور روح کا احوال ہم سے share کرنے لگتے ہیں' جن سے مل کر اور جنھیں جان کر ہمیں خود اپنے زندہ ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا بلکہ زیست ہمارے لیے ایک بامعنی سرگرمی بن جاتی ہے۔

ابوالفضل صدیقی کے دونوں ناول "ترنگ" اور "زخم دل" فنی اعتبار سے انیس ویں صدی کے مغربی ناول کی تکنیک پر لکھے گئے ہیں یعنی آغاز' وسط اور اختتام کے فارمولے پر اور دونوں ناولوں میں یہ نکتہ مشترک ہے کہ طربیہ سے المیہ کی طرف سفر کرتے ہیں۔ بادی النظر میں دونوں ناولوں کی کہانی مختلف ہے لیکن دونوں کہانیاں ایک ہی طرح انجام پذیر ہوتی ہیں اور کم و بیش ایک ہی طرح کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ موضوعاتی اختلاف کے باوجود مجھے یہ دونوں ناول ایک دوسرے کی توسیع معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ دونوں ناول دو علاحدہ مسائل کے گرد بنی ہوئی کہانیاں ضرور ہیں لیکن دونوں کا منبع بھی ایک ہے اور مقصد بھی ایک۔ ابوالفضل صدیقی ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ ان کی دوسری کہانیوں کی طرح ان دونوں ناولوں میں بھی ہمیں سماجی مسئلہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک فرد کی زندگی میں جب کوئی انسانی سماجی مسئلہ یا جذباتی بحران پیدا ہوتا ہے تو پورے گھر پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اور پھر معاشرہ اس صورت حال کے تناظر میں کس طرح اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ یہ دونوں ناول ایک ہی فرد اور ایک ہی گھر کی کہانیاں تو نہیں ہیں لیکن ایک ہی معاشرے کی کہانیاں ضرور ہیں۔ اس لیے اگر ہم دونوں کہانیوں کو ملا کر پڑھتے ہیں تو ایک سماج کی زیادہ مکمل تصویر اور اس کا ایک زیادہ روشن منظرنامہ ہمارے سامنے آتا ہے۔

"ترنگ" ایک ایسے زمین دار گھرانے کی کہانی ہے جو خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ دیہات بھر میں شیوراج سنگھ کی ایک ساکھ ہے۔ اس کے گھر میں موسموں کا اناج بھرا رہتا ہے۔ آڑھتی اس کی فصل کا انتظار کرتے ہیں اور اچھے داموں اس سے سودا کرتے ہیں۔ اس کے عزیز' دوست اور ہم چشم سبھی اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ خوش حالی اور عزت و اطمینان کی علامت ہے۔ اس کا جواں سال بیٹا ہرپال سنگھ اس کا مضبوط بازو ہے۔ لیکن ایک روز ہرپال اپنے اصطبل کے چابک سوار استاد کے ساتھ کوکین سے متعارف ہوتا ہے۔ بس ٹھیک اسی دن شیوراج سنگھ کی حویلی کے دروازے پر بدقسمتی آکر دستک دیتی ہے اور پھر اس کا گھرانہ تباہی و بربادی کی ایک کے بعد دوسری منزل سے گزرتا چلا جاتا ہے تا آں کہ دل دوز اور المناک انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ نشے کی عادت ایک کڑیل جوان کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ کر کس طرح کھوکھلا کرتی ہے اور ایک فرد کی وجہ سے پورا گھرانہ کیسی کیسی رسوائیوں' ذلتوں اور کیسے کیسے صدموں اور عذابوں سے گزرتا ہے' ان سارے مراحل و مسائل کو ابوالفضل صدیقی نے "ترنگ" کی کہانی میں بڑی خوبی اور صراحت سے پیش کیا ہے۔

اس ناول میں کہانی کار کا ذہن رسا انسان کی قوتِ ارادی کی شکست کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے بسی کی نفسیات' دیہاتی زندگی میں فرد کی آزادی اور سماجی رویوں کی تہہ میں گہرا اترتا ہے۔ اس کی باریک بیں نگاہ زندگی کے بعض مخفی گوشوں تک پہنچ جاتی ہے اور اس کا جادو نگار قلم ایک ایسی جیتی جاگتی دنیا کا نقشا کھینچتا ہے جو ہمیں اپنے گرد و پیش کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

ابوالفضل صدیقی نے اس ناول میں ایک فرد کے المیے کو ایسی وسعت اور گہرائی میں پیش کیا ہے کہ

وہ اس انسانی pathos سے ہم آمیز ہو گیا ہے جو تقدیر کے آگے انسان کی مجبوری اور بے بسی سے عبارت ہے اور تہذیب و معاشرت کی تفریق سے قطع نظر پوری انسانیت کا المیہ ہے۔ اس نوع کے ساتی موضوعات کو پورے معاشرے کے سیاق و سباق کے ساتھ نبھانا یقیناً بے حد مشکل کام ہے لیکن ابوالفضل صدیقی نے اسے خوب نبھایا ہے۔ کہانی کی تعمیر اور مصنف کا اسلوب اکائی بن کر وحدتِ تاثر پیدا کرتے ہیں اور ناول کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوصف "ترنگ" میں ہرپال سنگھ کو جس طرح نشے کی طرف مائل ہوتے اور یکے بعد دیگرے مختلف نشوں میں مبتلا ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے وہ ابوالفضل صدیقی کی خوب صورت نثر اور ناول کے دلچسپ story element کے باوجود کسی قدر contrived بلکہ artificial سا لگتا ہے۔ اس ناول میں بیان کی گئی کہانی کا ایک اہم عنصر تقدیر کا سفر ہے لیکن کم و بیش وہ سارا حصہ جس میں ہرپال سنگھ کو ایک کے بعد دوسرے نشے میں مبتلا ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے وہ کردار کی تقدیر کے عمل کو ظاہر کرنے کی بجائے مصنف کی منشا اور ناول کے موضوع اور کہانی کے سفر کی مجبوری کا اظہار کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں یہ بات بہت شدت سے راسخ ہے کہ اسے ناول کے ہیرو کو پہلے لازماً "کوکین" افیم' چرس' بھنگ' سلفہ' شراب یعنی دیہات میں دستیاب تمام نشوں کا بُری طرح عادی بنا کر دکھانا ہے اور پھر اس نشے کی لت کو کہانی کی ٹریجڈی میں منقلب کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہرپال سنگھ کی زندگی میں پہلے چابک سوار' پھر وید' پھر سادھو اور پھر منشی گل قندی لعل یکے بعد دیگرے نشے کی نئی لت لیے چلے آتے ہیں۔ گویا سب کو اپنے اپنے پروگرام دے کر قطار میں بٹھادیا گیا ہے اور سمجھادیا گیا ہے کہ جب ایک آدمی اپنا رول ختم کرکے ہرپال کی زندگی سے خارج ہوگا تو اس کے فوراً" بعد دوسرا آدمی نئے نشے کے ساتھ entery دے گا۔ لہٰذا اسی پروگرام کے تحت ہر آدمی اپنا کام کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کا دیہات کہ جسے integrated اور closed سوسائٹی کی مثال سمجھا جاتا ہے' وہ اس ناول کے پہلے نصف میں اپنے اسی وصف سے عاری نظر آتا ہے۔ ہرپال سنگھ نشے کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے' اس کے سنگی ساتھی' ماں باپ حتیٰ کہ بیوی تک یہ شناخت کرنے میں ناکام رہتے ہیں کہ اس کے اٹھنے بیٹھنے' کھانے پینے' سونے جاگنے' ہنسنے بولنے غرض زندگی کے سارے معمولات میں ایک نمایاں تبدیلی آتی جارہی ہے۔ حقیقتِ حال اس وقت کھلتی ہے جب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک مربوط معاشرہ جس میں افراد ایک دوسرے کی زندگی پر اثرانداز ہی نہیں ہوتے بلکہ زندگی کا اہم جزو ہوتے ہیں' اس میں بے خبری اور لاتعلقی کی یہ صورتِ حال واضح طور پر imitative محسوس ہوتی ہے۔ دوسری بات' یہ راز معلوم ہونے کے بعد آس پاس کے لوگ خصوصاً" ہرپال کے ہم عمر دوست جو اس لت کے عادی نہیں ہیں' وہ بھی اسے نشے سے نجات دلانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ڈھکے چھپے انداز میں اسے نشہ فراہم کرنے کا سامان کرتے ہیں۔ دیہاتی زندگی ہو یا شہری' یہ رویہ اپنی عمومیت میں انسانی سرشت کے خلاف ہے۔ کوئی قریبی عزیز' رشتے دار یا دوست تو دور کی بات ہے اگر انسان کسی اجنبی کو بھی ایسی اذیت میں مبتلا دیکھتا ہے تو اس کا پہلا ردِ عمل یہ

ہوتا ہے کہ وہ دلدل سے نکلنے میں اس شخص کی ہر ممکن مدد کرے۔ لیکن چوں کہ مصنف کا مقصود یہ ہے کہ وہ ہیرو کو سرتاپا نشے کی لت میں مبتلا دکھائے' چناں چہ چابک سوار' وید اور سادھو کے ساتھ ساتھ دوست' احباب' خارجی حالات سب کے سب تقدیر کے نام پر اسے نشے کی فراہمی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ چوں کہ یہ ساری صورتِ حال غیر فطری اور خلافِ عقل معلوم ہوتی ہے اسی لیے نشے کی وجہ سے ہرپال کو گھلتا اور پژمردہ ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی حقیقی ٹریجڈی کا احساس ہمارے دل پر اثر نہیں کرتا بلکہ ایک طرح کی ناگواری کے ساتھ ہمارا ذہن اس معاشرے کی integrity کے بارے میں بار بار بعض سوالات اٹھاتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہرپال سنگھ شراب چوانے اور رکھنے کے جرم میں آخری بار جیل جاتا ہے اور تقدیر کی عمل داری پوری شدت سے کہانی میں رونما ہوتی ہے تو یک بہ یک انسانی جذبے کے تحت ہیرو' اس کی بیوی' بچے اور ماں باپ کے لیے ہماری سوچ اور احساس از خود دکھ کی شدید کیفیت سے مملو ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس مقام پر آخر ناول کے ہیرو اور اس کے پورے گھرانے کا المیہ' جبر تقدیر کے آفاقی منظرنامے کا ایک شدید تر اور دل گداز رخ پیش کرتے ہوئے انسان کا ازلی و ابدی pathos پوری شدت کے ساتھ ہمارے اندر اجاگر کرتا ہے۔ اس ٹریجڈی کو ناول نگار نے ایسے حقیقی رنگوں میں پیش کیا ہے کہ ہم خود کو اس سے relate کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اختتامیہ تک آتے آتے ابوالفضل صدیقی نے جس طرح کہانی کو twist کیا اور جو treatment دیا ہے وہ اسے مصورِ غم اور ان کی تقلید میں لکھے جانے والے الم انگیز ناول کی سطح اور عمومیت سے نہایت بلند کردیتا ہے۔ میرے نزدیک "ترنگ" کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی نظریاتی چھاپ یا کسی سابقہ فنی یا اسلوبیاتی تجربے کی یاد دلانے کی بجائے انسانی دکھ کے ایک حقیقی اور اجتماعی تجربے میں ہمیں احساس کی شدید ترنگ و تاز کے ساتھ شامل کرلیتا ہے۔

ابوالفضل صدیقی کے فن کی یہی خوبی ان کے دوسرے ناول "زخم دل" میں ایک دوسری جہت سے ظاہر ہوئی ہے۔ اس ناول میں جب الفت رائے بھائی کی عدم موجودگی میں بھاوج کے چونکا دینے والے التفات و انداز سے اس کی طرف مائل ہوتا ہے اور دونوں کے مابین ناجائز مراسم استوار ہوتے ہیں تو یہ ساری صورتِ حال خالص انسانی جبلتوں کے ردِ عمل میں رونما ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دیہات ہی کے پس منظر میں لکھا ہوا یہ ناول جذبات کی دلدل میں دھنستے ہوئے دو ایسے افراد کی کہانی ہے جو اپنی معاشرتی اقدار' اخلاقیات اور نظامِ زیست کے اصولوں کو پاؤں تلے روندتے ہوئے داد عیش کی گزرگاہوں پر رواں ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہی اصلِ حیات ہے لیکن وقت کا دستِ سفاک جب اس فریب کا پردہ چاک کرتا ہے تو انھیں پتا چلتا ہے کہ وہ دل و نظر کی جنت میں نہیں بلکہ جسم و جنس کی اس دلدل میں تھے جو انسانوں کو جیتے جی جہنم کی طرف لے جانے والا بھیانک مگر پُر فریب راستا ہے...... لیکن جب یہ راز کھلا اس وقت تک جسم کی ہوس کا منہ زور گھوڑا اپنی شاطرانہ چالوں سے عقل کے بادشاہ کو مات دے چکا تھا اور بربادی الفت رائے اور چترا کا مقدر بن چکی تھی۔ اپنی بُنت' ٹیکنیک' اسلوب اور کہانی کی نامیاتی وحدت کے اعتبار سے یہ ناول ابوالفضل صدیقی کی شاہکار تخلیقات میں شمار ہوتا ہے۔

اس ناول میں انسان کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کے خروش اور جسمانی سنسناہٹوں کو بے مثال فن کاری کے ساتھ ناول نگار نے جیتے جاگتے کرداروں میں ڈھال دیا ہے۔ جذبات کے منھ زور دریا کی لہروں پر جسم کی ناؤ کھیتے ہوئے ناول کے ہیرو اور ہیروئن الیۂ تقدیر کے Black Sea کی طرف تیزی سے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی سرشاری کے لمحات کا تسلسل' زندگی کی حقیقتیں (مثلاً" معاشرتی اخلاقیات' بھاوج کا شوہر' دیور کی ہونے والی بیوی) وقتاً" فوقتاً" منقطع کرتی ہیں تو ان کے اندر تشویش اور خوف کے مہیب سائے سرسراتے ہیں اور ان کی بے راہ روی آسیب بن کر انھیں ڈرانے لگتی ہے۔ انسان کا خمیر چوں کہ اصلاً" خیر سے اٹھا ہے اس لیے ایسے موقعوں پر ان کی روحیں غیر فطری اعمال پر چیخ چیخ کر احتجاج کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کیفیت کے بیان میں ناول نگار فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اگر انسان کی روح مردہ نہیں ہوئی ہے تو بد فطرتی اور گھناؤنے پن کا احساس اسے کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ نفسانی خواہشات کا اسیر ہونے کے باوجود انسان اپنی معاشرتی اقدار اور سماجی ضابطۂ اخلاق کو علی الاعلان by pass کرکے مادر پدر آزادی اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ اصل میں مشرقی تہذیب و تمدن کی روح کا احوال ہے جہاں معاشرہ فرد کی خواہشات' اس کے افکار اور اقدامات پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ یہاں تقابلی موازنے کے لیے فلابیئر کی مادام بواری کو دیکھیے۔ مغربی تہذیب کی پروردہ مادام بواری کے ناجائز مراسم کی راہ میں اس کا معاشرہ اور تہذیب نہ صرف یہ کہ حائل نہیں ہوتے بلکہ اس ناول میں بعض مقامات پر ہم ان دونوں institutions ہی کو اس کی زندگی میں غیر حاضر پاتے ہیں۔ اس کے برعکس "زخم دل" کی چترا کے رویے سے بار بار ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرہ اور اس کی اقدار اس کے اطراف میں پوری طرح active ہیں اور خود اس کی سرگرمیوں کو determine بھی کرتی ہیں۔ مزید برآں ایک اور اہم فرق مشرق و مغرب کی تہذیبوں کے پروردہ افراد کے مابین دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ فلابیئر جس بے چین اور ناآسودہ روح کو مادام بواری کی صورت میں ناول کی ہیروئن بنا کر پیش کرتا ہے وہ اپنے کردار و عمل سے خود کو سوسائٹی کا گم شدہ فرد ثابت کرتی ہے۔ اس کا psycho analysis کیجئے تو پتا چلتا ہے کہ اس کی بے راہ روی ایک درجے پر پہنچ کر اپنی تلاش اور اپنے وجود کے اثبات و اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہی مغربی تہذیب کا انتہائی الیہ اور اس کے افراد کی بدقسمتی کی آخری منزل ہے کہ خود اپنی جستجو میں بھی ان کی ساری تگ و دو فقط گوشت پوست کے وجود پر آکر ختم ہو جاتی ہے اور پورا انسان محض جسمانی (بلکہ جنسی) سرگرمی سے denote ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس ابوالفضل صدیقی کی ہیروئن دیور کے ساتھ جنسی تلذذ محض غیر تسلی بخش ازدواجی زندگی کی وجہ سے حاصل کرتی ہے۔ اس کا کل مسئلہ ایک خاص عمر کی جنسی اشتہا کی تسکین ہے نہ کہ معاشرے میں گم شدہ اپنی شخصیت کی تلاش۔ وہ معاشرے سے متحارب نہیں مربوط ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دیور کے ساتھ مل کر شوہر کو زہر دینے کا منصوبہ تو وہ بنا لیتی ہے لیکن جب اس منصوبے پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ اس کے لیے تیار نہیں ہو پاتی۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ وہ جانتی ہے کہ اس کی ازدواجی حیثیت معاشرتی نظام میں اس کے مقام اور

شناخت کا نہایت معتبر ذریعہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ معاشرے کے اصولوں کو نظرانداز کر کے اور ضابطوں سے ماورا ہو کر باوقار زندگی ممکن نہیں ہے۔ چناں چہ وہ گرد و پیش کے حالات کے تناظر میں داو عیش کی راہ نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہاں "مادام بواری" اور "زخم دل" کی ہیروئنوں کے موازنے سے میرا مقصود فلابیئر یا ابوالفضل صدیقی کو چھوٹا یا بڑا ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ مطمع نظر صرف دونوں تہذیبوں کے مابین اُن اقدار کی مغایرت اور معاشرے میں ان کے نفوذ کی نشان دہی ہے جو تہذیبوں کی تشکیل اور افراد کے رویوں کا تعین کرتی ہیں۔

ابوالفضل صدیقی کے دونوں ناول "ترنگ" اور "زخم دل" ایک ایسے زوال آمادہ معاشرے کی کہانیاں ہیں جس کا اپنے افراد سے رشتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے اور جس کی سماجی اور اخلاقی اقدار ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ نظام معاشرت کو چلانے والے افراد اور ادارے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو فراموش کر رہے ہیں۔ وہ افراد اور گھرانے جنھیں تہذیب کی علامت اور معاشرے کا اعتبار سمجھا جاتا ہے، خود بے راہ روی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ذاتی مفاد اور نفس پرستی کا رجحان معاشرے کے وجود میں سرطان کی طرح پھیل رہا ہے۔ دونوں ناول معاشرے کو شکستگی کے عمل سے گزرتے اور disintegration کا شکار ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ اس کے بین بین معاشرے کے کچھ ایسے افراد بھی ان کہانیوں میں آتے ہیں جن کے ہاں پرانی تہذیب و اقدار کا شعور و احساس ابھی زندہ ہے۔ مثال کے طور پر "ترنگ" میں ہرپال کا باپ شیوراج سنگھ، ہرپال کی ماں، اس کی بیوی اور اس کا منھ بولا بھائی وشنو سنگھ اور اسی طرح "زخم دل" میں الفت رائے کا باپ، اس کی بیوی جو ابھی رخصت ہو کر سسرال نہیں آئی۔ یہ کردار صبر، ضبط، وضع داری اور وفا شعاری کی مختلف منزلوں سے خاموشی اور استقامت کے ساتھ گزرتے ہوئے اپنے اپنے تئیں معاشرے کی گم راہیوں کا کفارہ ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ دکھوں کی دیمک انھیں اندر ہی اندر کھوکھلا کیے جاتی ہے اور وہ تقدیر کی مار سہتے ہوئے موت کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ تمثیلی معنوں میں یہ کردار ان اکھڑتی ہوئی سانسوں کی مانند ہیں جو ایک مرتی ہوئی تہذیب کے سینے میں اٹکی ہوئی ہیں اور اس کے وجود میں زندگی کی ختم ہوتی ہوئی رمق کی علامت ہیں۔ دونوں ناولوں کا اختتام انسانی زندگی کے انتہائی المیے پر ہوتا ہے اور شدید دکھ کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ابوالفضل صدیقی کی ویسے تو کئی کہانیاں Tragedy is more real and more severe than pleasure in life کا تاثر دیتی ہیں لیکن ان دونوں ناولوں کے اختتامیہ میں جس طرح انسانی دکھ کو اس کی تقدیر، موت اور انسانی تہذیب و معاشرت کی شکست و ریخت سے آمیز کیا گیا ہے، وہ بے مثال ہے۔

ایسے معاشروں میں کہ جہاں انسان اپنے وجود کا اثبات محض اپنی سوچ کے ذریعے نہیں کرتا اور اپنی زندگی کی سچائیوں کو اپنی انفرادی حقیقت نہیں سمجھتا، اس کے داخل اور خارج کی دنیا میں آباد رہتی ہیں...... اور یہ دنیائیں خواہ زوال پذیری کی کسی بھی منزل میں ہوں، ان کی کہانی بیان کرنے کے لیے ابوالفضل صدیقی جیسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں جو اپنی معاشرتی روح کا احوال اور اپنی تہذیب کے دھواں

ہوتے منظروں کے سفر کی روداد ہی نہیں سناتے بلکہ اپنی سوشل ہسٹری کو infrastructure بھی فراہم کرتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں نوبل انعام قبول کرتے ہوئے سولژے نتسن نے کہا تھا :

> ادب انسان کی یادوں کا ایک خزینہ ہے جو انسانی تجربے کی ناقابلِ تردید سچائیوں کی صورت میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ادب ہی تاریخ و روایت کے چراغ کو ہر طرح کے کذب و ریا کی زد سے باہر روشن اور ہمہ قسم تخریب سے محفوظ رکھتا ہے۔

نتسن کا یہ قول تہذیب و اقدار کے دائروں میں زیست کرتے انسانی معاشروں کی کہانیاں لکھنے والے ابوالفضل صدیقی ایسے فن کاروں کی نگارشات ہی پر صادق آتا ہے۔

حواشی

*۱۔ ڈیکارٹ۔ I think therefore I am

*۲۔ گیرے کار۔

*۳۔ دیکھیے Sense And Sensibility

اور Pride And Prejudice

*۴۔ دیکھیے Middle March

☆ ○ ☆